

READING SECTION

Online Library For Pakistan

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھارت میں جاسوسی کرنے والے
پاکستانی سرفروش کی سچی داستان

Bhopal

Bombay

عازمی



پاک

ڈاٹ کام

READING SECTION

Online Library For Pakistan

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابوشجاع ابووقار

رائل نیپال ایئر لائنز کے جہاز نے کھٹمنڈو ایئر پورٹ پر ٹھیک چار بجے رن وے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ میں کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس وقت میں حقیقتاً ڈرا ہوا تھا۔ خوف کی لہریں میرے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔ میری نظریں ایئر پورٹ بلڈنگ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لگی ہوئی تھیں۔ ہر لمحے یہی خیال گزرتا کہ اب پولیس کی جیپ نمودار ہوگی۔ پائلٹ جہاز کو ٹیکسی وے پر ہی روک لے گا اور پولیس مجھے گرفتار کر کے لے جائے گی۔ اگرچہ ایسے مرحلے پہلے بھی گئی ہار مجھ پر گزر چکے تھے۔ لیکن ساڑھے تین سال تک مسلسل زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے کے بعد میں اب ذہنی طور پر ٹوٹ چھوٹ چکا تھا اور اب تو بات یہاں تک آن پہنچی تھی کہ ایک طرف آزادی، اپنا وطن، اپنا گھر اور گھر والے اور دوسری طرف تھر ڈوگری ٹارچر کے ساتھ اذیت ناک موت اور ان دونوں کے بیچ محض چند منٹوں کا فرق تھا۔ محض چند منٹوں کا۔ قسمت نے زندگی کی بازی کھیلنے ہوئے مجھے ہمیشہ تین اکے دیئے لیکن ہر بار تو تین اکے نہیں ملتے اب تو یہ آخری داؤ تھا۔ اگر بازی ایسی پڑ گئی تو..... خوف کی لہر نے مجھے ایک جھکایا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سب کچھ اس قادر مطلق پر چھوڑ دیا جس کی طاقت اور قدرت کی کوئی حد نہیں۔ انسان اس کے سوا کچھ ہی کیا سکتا ہے۔ انسانی جدوجہد کی ایک حد ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ رب ذوالجلال والا کرام کی رضا کا محتاج اور طلبگار ہوتا ہے۔ مجھ پر ایک غنودگی سی چھا گئی تھی۔ اچانک ایئر ہوسٹس کی مدد آواز مجھے غنودگی سے باہر لے آئی۔ سیفٹی بیلٹس کھولنے کی اجازت مل گئی تھی۔ جہاز ہالیڈ کی برف پوش چوٹیوں کو نیچے چھوڑتا ہوا بلند ہو رہا تھا۔ ماؤنٹ ایورسٹ دائیں طرف صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جہاز کے اکثر مسافر یہ چوٹی دیکھنے کیلئے جہاز سے اسی جانب کی کھڑکیوں کی طرف آ چکے تھے لیکن میرا ذہن ماضی کی طرف جا رہا تھا۔ ساڑھے تین سال (یعنی 1158 دن) اور ان 1158 دنوں میں بیٹے ہوئے ان گنت واقعات ایک تیز رفتار فلم کی طرح میرے ذہن کے پردے سے گزر گئے۔ جلد ہی پیرا ڈسٹم ہو گئے۔ ایئر ہوسٹس نے بتایا کہ اب ہم بنگلہ دیش پر گزر رہے ہیں اور دریائے کرناٹکی کا ڈیلٹا ہمارے نیچے ہے۔ ڈیلٹا درجنوں ٹائٹوں میں تقسیم میلوں تک پھیلا ہوا تھا اور شام کے ڈھلنے ہوئے سورج کی ترچھی شعاعوں نے دریائے کرناٹکی کی درجنوں شاخوں میں ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ شاید ایسے ہی کسی منظر کی وجہ سے شیخ مجیب الرحمن کو مشرقی پاکستان علیحدہ کر کے بنگلہ دیش بنانے کیلئے ہمارا دیش، تمارا دیش، سارا دیش کہنا پڑا۔ لیکن یہ تو محض عکس تھا فریب نظر تھا جسے سچ سمجھ کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو دو ٹوٹ کر دیا گیا۔ اس وقت بنگلہ دیش بننے کی سال بیت چکے تھے۔ لیکن مشرقی پاکستان کے لئے لفظ بنگلہ دیش میرے دماغ میں کہیں فٹ نہیں ہوتا تھا اور آج بھی یہی حال ہے کہ چاہے کتنوں کو برا لگے میں اس خطہ زمین کو سابق مشرقی پاکستان ہی کہتا ہوں۔ جیسے دوری اور جدائی سے خون کے رشتے نہیں ٹوٹتے، ویسے ہی اس خطہ زمین کو سابق مشرقی پاکستان کہنے سے اپنا نیت کا ایک دن دیکھا رعب محسوس ہوتا ہے اپنا پھر سابق ہو گیا..... رشتہ قائم رہے تو سابق پھر اپنا ہو سکتا ہے..... انشا اللہ۔

بنکاک تک کا سفر چھ گھنٹے کا تھا۔ ذہن نے ماضی میں چھلانگ لگائی اور جہاں آن کے رکا وہ 16 دسمبر 1971ء کا محسوس دن تھا۔

میں تریبلڈ ڈیم بنانے والی کمپنی TUV (تریبلڈ جوائنٹ ونچر) میں اسسٹنٹس پبلک ریلیشنز آفسیئر تھا۔ معقول تنخواہ تھی، کمپنی نے بہت سی سہولتیں دے رکھی تھیں اور زندگی نہایت سکون سے گزر رہی تھی۔ بھارت سے ہماری جنگ جاری تھی، ذرائع ابلاغ کامیابی کے بڑے بڑے دعوے کر رہے تھے۔ کبھی چینٹی امداد اور کبھی چھٹے امریکی بحری بیڑے کی تقریب آمد کے مزے سنانے جارہے تھے۔ UNO میں ہزاروں سال تک جنگ جاری رکھنے کے دعوے کئے جارہے تھے۔ جنگ بند کرنے کیلئے پولینڈ کی قرارداد جسے عالمی طاقتوں کی حمایت حاصل تھی، ہمارے وفد کے سربراہ نے چھاڑ دی تھی۔ یہ محسوس کرایا جا رہا تھا کہ چند دنوں میں بھارت گھٹنے ٹیک دے گا اور جنگ بندی کے عوض مقبوضہ کشمیر پیشتر ہی میں رکھ کر ہمیں پیش کر دے گا۔ جنرل نیازی ان دنوں مشرقی کمان کے سربراہ تھے ان کے اس دعوے کی بڑی تشہیر کی گئی کہ بھارتی افواج کو واپس ان کی سرحدوں میں دھکیل دیا گیا ہے اور بھارتی ٹینک میری لاش پر ہی گزر کر ڈھا کہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ان خوش کن دعوؤں سے بہلائے گئے دل پر بی بی کی یہ خبر بجلی بن کر گری کہ 16 دسمبر 1971ء کو پاکستانی افواج ہتھیار ڈالنے کا معاہدہ کر چکی ہیں اور جنرل نیازی نے اس رسم کی ادائیگی کے لئے اپنے پرانے ساتھی بھارتی جنرل اروڑہ کو دعوت دی ہے۔ یقین جانئے کہ پہلے تو اس خبر کو کچھ ماننے پر دل کا ہی نہیں کہ مسلمان ہندوؤں کے آگے ہتھیار ڈالیں گے۔ محمد بن قاسم کا چند ہزار جوانوں کے ساتھ راجہ داہر کو شکست دینا، محمود غزنوی کے 17 حملے، جن میں ہزاروں کی تعداد کبھی بھی 10 ہزار سے زیادہ تھی، ہندوستان بھر کے راجاؤں کی لاکھوں کی افواج کو ہر بار شکست دینا اور سومات تا تک جا پہنچنا اور بے شمار زرو جو ہر کو ٹھکر کر سومات کے بت کو پاش پاش کر کے تاریخ میں خود کو بت فروش کے بجائے بت شکن کہلانا، ہندوؤں کی سب سے بہادر ذات راجپوتوں کی سب سے اعلیٰ نسل سورج ہنسی کی جو دھابائی سے شہنشاہ اکبر کا شادی کرنا، جبکہ ہندوؤں کے دھرم کے مطابق ان پر مسلمان کا سایہ پڑنے سے بھی وہ ناپاک (بھرشٹ) ہو جاتے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کا راجہ جے چند کو 4 مرتبہ شکست دینا اور ہر بار اس سے اپنے پاؤں دھلوانے کے اسے چھوڑ دینا۔ وہ قوم جمدیہ کی گلیوں سے نکل کر ایک طرف افریقہ کو فتح کر کے یورپ میں اسپین اور البانیہ تک جا پہنچی اور دوسری طرف ایران، افغانستان، ہندوستان، مشرقی روس کی ریاستوں کو فتح کر کے ملائیشیا اور انڈونیشیا تک اپنی حکمرانی کے جھنڈے گاڑے، وہ قوم جس میں حضرت خالد بن ولید، طارق بن زیاد، ہموئی بن نصیر، نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور ٹیپو سلطان جیسے دجر جنم پیدا ہوئے جن کا نام سنتے ہی غیر مسلم حکمران خوف سے کانپنے لگ جاتے تھے اس قوم کی سب سے بڑی سلطنت میں مسلمان افواج کی سب سے بڑی تعداد اس قوم کے سامنے ہتھیار ڈالنے کو مجبور ہوئی جس پر ہزاروں سال تک مسلمانوں نے حکمرانی کی تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ میں 1400 برس کی کامیابیوں کے تسلسل میں یکلخت یہ ناکامی اور اتنی بڑی ناکامی جس نے پاکستان کو دو ٹوٹ کر دیا۔ یہ ناکامی بلا جواز تھی اس کی وجہ ہمیشہ کی طرح خدایوں کا کردار تھا۔

جعفر از دیں، بنگال، صادق ملت، از ننگ وطن

مسلمان کو جب کبھی ہزیمت کا سامنا ہوا اس کی وجہ محض اور محض خدایوں کا کردار تھا اور 1971ء میں تو مشرقی پاکستان کے بھولے بھالے عوام کو خدایا لیڈروں نے کچھ ایسا بہکا دیا تھا کہ وہ مغربی پاکستانیوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے اور پھر سب کچھ لٹ جانے کے بعد جب انہیں ہوش آیا تو انہی خدایا لیڈروں کا جو شر کیا گیا، وہ سب جانتے ہیں۔

اصل موضوع سے میں کافی دور آ گیا ہوں لیکن اپنی داستان لکھنے کا میرا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اپنی نوجوان نسل کو بتاؤں کہ مذہب سے دوری ہمیں کہاں لے آئی ہے۔ ہم جھکتے ہوئے کہیں اتنی دور نکل جائیں کہ واپسی ممکن نہ ہو، آپس میں دست و گریباں ہونے کے بجائے ہمیں ان طاقتوں کی گرفت سے نہ صرف نکلنا ہے بلکہ انہیں نیست و نابود بھی کرنا ہے اور اسی میں ہماری بقا ہے۔ غیر مسلم تو میں اپنے ہر ہرجے سے ہمیں اسلام سے دور لے جا رہی ہیں جس طرح اسپین جہاں مسلمانوں نے 8 سو برس حکمرانی کی وہاں آج ایک بھی اسپینی مسلمان نہیں ہے۔ اسی طرح غیر مسلم تو میں جانتی ہوں کہ دنیا بھر سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جائے یا پھر وہ صرف نام کے ہی مسلمان رہ جائیں۔ نام کے بھی کہاں وقار سے وہی، جمیل سے جی اور عقیل سے اکی بن جائیں۔ صرف ایک واقعہ کی مختصری تشریح کے بعد اصل موضوع پر آ رہا ہوں۔ خانہ کعبہ میں بعثت رسول ﷺ کے وقت پیٹنکروں بت رکھے ہوئے تھے جن میں دو بڑے بت لات اور منات تھے یہ دوسرے بتوں کے سردار سمجھے جاتے تھے۔

بت پرستی ہندسے نکل کر حجاز اور مکہ تک جا پہنچی تھی۔ سو کے عدد کو فارسی میں صد، عربی میں میت اور انگریزی میں ہنڈرڈ کہتے ہیں سو سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ ایک منات نامی بت خانہ کعبہ میں تھا، اس سے سو گنا طاقتور (ہندوؤں کے مطابق) سومات تھا۔ سومات کا بت مندر کے ایک خاص کمرے میں ہوا میں معلق تھا اور اس کمرے کا فرش، چھت اور دیوار میں مہنگی سی لوہے کی بنی ہوئی تھیں اور سومات کے بت کو اس طرح معلق کیا گیا تھا کہ چھت اور فرش کی مہنگی سی کشش سے وہ ہوا میں بغیر کسی سہارے کے نظر آئے۔ اسی وجہ سے اسے بتوں کا سردار کہا جاتا تھا۔ ہندومت جو طاقت کو اپنا دھرم سمجھتا ہے سومات ان کا خدا تھا اور اس کا سوا حصہ خانہ کعبہ میں منات نام سے تھا۔ محمود غزنوی نے جو گناہ کئے تھے۔ سومات کو تو ڈرکراں نے ان گناہوں کا نگارہ ادا کر دیا۔ محمود غزنوی واپسی پر اپنے ہمراہ سومات کا دروازہ لے گیا تھا جو کابل کے عجائب گھر میں 1948ء تک موجود تھا۔ بھارتی وزیر اعظم نہرو کی خواہش پر کابل کے اس وقت کے بادشاہ ظاہر شاہ نے وہ دروازہ بھارت کو واپس کر دیا اور اس دروازے کو لگا کر بھارت نے سومات مندر کی تعمیر شروع کی جس کی بہت تشہیر کی گئی۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان شہید نے بھی ایک پریس کانفرنس میں پاکستانی قوم سے اپیل کی کہ جس تاریخ کو سومات کی تعمیر نو شروع ہوئی، اس روز پیدا ہونے والے ہر بچے کا نام محمود رکھا جائے۔

ذرا غم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اب آتا ہوں اپنی داستان کی طرف۔ دنیا بھر میں صرف مسلمانوں کو مارشل ریس یعنی جنگجو قوم کہا جاتا ہے۔ اسی مارشل ریس کی سب سے بڑی سلطنت کے دو ٹوٹ ہونے اور دنیا بھر میں مسلمان فوجیوں کی سب سے بڑی تعداد کے ہندوؤں کے آگے ہتھیار ڈالنے کا واقعہ کوئی معمولی صدمہ نہ تھا۔ اس صدمے کا اتنا اثر ہوا کہ میں حالت جنون میں انتہائی تیز رفتاری سے اپنی گاڑی میں بغیر کسی منزل کے (تریبلڈ) نکل گیا۔ جب ذرا حواس سمجھنے تو میں جہلم سے بھی آگے آ چکا تھا۔ اس وقت میری ایک ہی خواہش تھی کہ میری گاڑی ٹکرا جائے اور میں مر جاؤں۔ حواس ذرا سمجھنے تو سوچا کہ مایوسی گناہ ہے۔ بجائے اس کے کہ میں اپنی جان بلا مقصد ضائع کروں کیوں نہ اسے ملک و ملت کے مفاد پر چھوڑ کر کروں۔

کمپنی کا جنرل نیجیر اور میں چونکہ ایک ہی فتر میں بیٹھے تھے اس لئے دن میں کئی بار اس سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ غالباً 20 یا 21 دسمبر کو وہ میرے کمرے میں آیا اور کہا کہ میں تمہیں لڑکے کے پیدا ہونے کی مبارک باد دوں یا پاکستان کے دو ٹوٹ ہونے اور شکست کھانے کا فسوس کروں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ تو مومن کی تاریخ میں اتار چڑھاؤ میں 34 برس کا عرصہ کوئی حقیقت یا فیصلہ کن اثر نہیں رکھتا۔ 6 برس قبل اسی بھارت کو ہم نے ایسی شکست دی کہ دوران جنگ اس کے نمائندے نے اقوام متحدہ میں کہا تھا کہ ہم ابھی اور اسی وقت جنگ بندی کے لئے تیار ہیں۔ جنگ بندی کے فوراً بعد معاہدہ تاشقند پر دستخط ہونے کے بعد بھارتی وزیر اعظم اپنی مکمل شکست سے بچنے کی خوشی برداشت نہ کرتے ہوئے وہیں مر گیا۔ 65ء کی جنگ میں پاکستانی سرحد سے 24 میل دور بھارتی حکومت نے اپنا دار الحکومت دہلی سے الہ آباد منتقل کر دیا۔ بغیر اعلان جنگ کے حملہ کرنے والے بھارتی بارڈر سے صرف 14 میل کے فاصلے پر لاہور اور 8 میل کے فاصلے پر سیالکوٹ جیسے اہم شہروں تک بھی نہ پہنچ سکے جبکہ اس وقت ان کے کمانڈر انچیف نے اعلان کیا تھا کہ 6 ستمبر 65ء (جس کی صبح 4 بجے بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تھا) کی سہ پہر کو لاہور جنم خانہ میں چھوٹا پیگ بیٹوں گا۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں جھب جھبیاں کی چھاؤنی پر ہمارا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ قصور سیکٹر میں بھارتی سرحد میں 11 میل اندر ہم نے ان کے خاصے بڑے شہر ٹھیم کرن (اس شہر میں 4 سینما تھے) پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہم نے بھارتی ایئر فورس کے 300 سے زیادہ جہازوں کو ہوائی جنگ میں باہوائی اڈوں پر کھڑے کھڑے ہی تباہ کر دیا تھا۔ ہمارے ایک اکیلے ہواباز محمود عالم نے سرگودھا کے ہوائی اڈے پر حملہ کرنے والے چھگ 19 جہازوں کو 45 سیکنڈ میں 19 سے کمتر جہاز F-86 سے تباہ کر دیا تھا۔ اس وقت ہماری ساری قوم ایک تھی۔ جیسے ہاتھ کی چار انگلیاں اور انگوٹھ مل کر گھونڈ بن جاتا ہے۔ ہم اس وقت الگ الگ نہیں تھے بلکہ پوری قوم ایک گھونڈ بن چکی تھی۔ بھارتی تو پاکستانی گھونڈ سے ایسا ڈرتا ہے کہ شہید ملت لیاقت علی خان نے بھارت کو صرف گھونڈ دکھایا ہی تھا کہ بھارت ڈر کر اپنی فوجوں کو بارڈر سے بہت پیچھے ہٹا کر لے گیا لیکن فسوس اب ہماری قوم سیاسی لیڈروں کے بہکاوے میں آ کر تقسیم ہو گئی تھی جس کا نتیجہ ہمیں اس شکست کی صورت میں ملا۔ میں نے جنرل نیجیر کو کہا کہ تم مجھے بچنے کی پیدائش کی مبارک دو کیونکہ یہ بچہ ایک نئی بحری نوید لے کر آیا ہے۔

کہنے کو تو میں دل کو بہت ڈھارس دیتا تھا لیکن قابو میں آئی نہیں رہا تھا۔ بالآخر جنوری 72ء کے دوسرے عشرے میں، میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ایک ماہ کا ٹائٹل بیورو پر کر کے میں اپنی فیملی کو اپنے آبائی گاؤں میں چھوڑ کر لاہور پہنچا اور افواج پاکستان کے ایک انتہائی حساس ادارے میں جا کر خود کو کسی بھی قسم کے خطرناک کام کو کرنے کے لئے رضا کارانہ طور پر پیش کر دیا۔

ادارے کے حکام پہلے تو حیران ہوئے کہ اس مایوسی کے دور میں ایک سو بیلیں اس طرح خود کو بطور رضا کار پیش کر رہا ہے۔ قریب 20 روز میرے مختلف اقسام کے اترو ہوئے رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنے ذرائع سے میرے پورے ماضی کو کھنگال ڈالا۔ جب وہ پورے طور پر مطمئن ہو گئے تو انہوں نے مجھے درپیش آنے والی مشکلات، زندگی کے خطرے اور پکڑے جانے کی صورت میں انتہائی تشدد سے ڈرانا چاہا، کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ اس ادارے کے لئے کام کرنے کا میرا ارادہ اگر محض ایک وقتی جنوں سے ہو تو میں واپس لوٹ جاؤں۔ لیکن میری ثابت قدمی سے جب انہوں نے دیکھا کہ میں وقتی جنوں کا شکار نہیں بلکہ اپنے وطن کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو دل کی گہرائیوں سے تیار ہوں تو پہلی ملاقات سے ایک ماہ کے اندر مجھے باقاعدہ طور پر ادارے میں شامل کر لیا گیا اور ایک ہفتے کے اندر میری تربیت شروع کر دی گئی۔

میری تربیت کیلئے چھ ماہ کی مدت مقرر کی گئی تھی جو میں نے چار ماہ اور چند روز میں مکمل کی۔ ملکی سلامتی کے پیش نظر تربیت کی تفصیلات میں نہ جاسکوں گا۔ مختصر اصراف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ بے پناہ جسمانی مشقت، جو ڈوا اور Static and Mobile Surveillance کے طریقے سکھائے گئے۔ اور اگر خود پھنس جاؤں تو ان سے بچنے کے طریقے بھی۔ اور سب سے اہم کہ اس دوران مجھے مکمل طور پر ایک بھارتی شہری بنا دیا گیا۔ ان کے طور طریقے، رسم و رواج، زبان اور سیاسی اور معاشرتی زندگی کے علاوہ بھارتی افواج کے متعلق تمام معلومات بھی ازیر کردی گئیں۔ ان کی ٹرینوں، بسوں کے اڈوں، شہروں، صوبوں، غرض کہ ہر وہ بات جس کی ایک پڑھے لکھے بھارتی سے توقع کی جاسکتی ہے وہ اس طرح میرے دماغ میں بٹھادی گئی کہ میں ایک مکمل بھارتی شہری کا روپ دھار گیا۔ اس کے بعد تشدد برداشت کرنے کی تربیت اور جسمانی اذیت پوری کی گئی یہ دیکھنے کے لئے کہ میں کس حد تک تشدد برداشت کر سکتا ہوں۔ پھر وائرلیس Operate کرنا، چھاؤنیوں اور فوجی پڑاؤ پر حملے، معلومات کے حصول کے طریقے، غرض کہ ہر پہلو سے مجھے اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے تیار کر دیا گیا۔

میری زندگی کی سب سے پہلی ملازمت سابق مشرقی پاکستان چٹا گنگ میں ایک معروف چائے کی کمپنی میں چائے کی بیکنگ کی تھی۔ مجھے بھارت میں پوشیدگی فراہم کرنے کے لئے وہ بہت کام آئی۔ میں کھلی چائے کے ایک تاجر کے طور پر ہر چھاؤنی میں جا سکتا تھا۔ میں یہی میں نیوٹاگ پاؤڈر کا رہائشی تھا۔ یہاں تک مکمل انتظام تھا کہ اگر کوئی میرے دیئے ہوئے ایڈریس سے میرا پوچھے تو اسے پتہ چلتا کہ وہ چوچو پڑا (میرا اکور کے دوران نام) یہاں رہتا ہے اور چائے کا کاروبار کرتا ہے۔

تربیت کا آخری حصہ پاکستانی چھاؤنی سے مطلوبہ معلومات حاصل کرنا تھیں اور یہی میرا امتحان تھا۔ جس میں، میں نے نہ صرف مطلوبہ معلومات ہی حاصل کیں بلکہ اس کیلئے بعض حساس خفیہ راز بھی معلوم کر کے اپنے اساتذہ کو دیئے۔ چنانچہ مجھے گروپ لیڈر کے طور پر سلیکٹ کر لیا گیا۔ میرے گروپ میں 4 ساتھی تھے جو افواج پاکستان میں مختلف کاموں کے ماہر تھے۔ یہ وائرلیس ٹیکنیشن، بلاسٹنگ کے ماہر، دوران مشن خطرے کو بھانپنے والے یعنی ہماری نگرانی کرنے اور کہیں پھنس جائیں تو ڈسٹن کو زیر کرنے یا ہلاک کرنے والے تھے۔ غرض کہ یہ ایک مکمل گروپ تھا۔ بحیثیت گروپ لیڈر کہ وہ میرا حکم ماننے کے پابند تھے اور خود اپنے فیصلے سے کوئی کام سرانجام دینے کی انہیں اجازت نہ تھی۔ ہم سب نے الگ الگ رہنا تھا اور وہ میرے بغیر آپس میں رابطہ نہ کر سکتے تھے۔ مجھے ان سب کی رہائش کا علم رکھنا تھا لیکن انہیں میری رہائش کا علم نہیں ہونا چاہئے تھا، بھارت میں اپنے ہمدردوں سے رابطہ کرنے کی صرف مجھے اجازت تھی۔ غرض کہ ہم پانچ افراد کی یہ چھوٹی سے فوج اپنے مشن کے لئے بالکل تیار تھی اور ہمیں 24 گھنٹے کے نوٹس پر اپنے مشن پر روانہ ہونا تھا۔ ایک بات مزید کہ ہم پانچوں کو پہلی بار تربیت مکمل ہونے کے بعد ہی چند گھنٹوں کیلئے ملا لیا گیا۔ ایک دوسرے کے متعلق تفصیلی معلومات کسی کو نہ تھیں۔ یہ ایسی مہم کیلئے انتہائی اہم ہوتا ہے تاکہ اگر کوئی دشمن کی گرفت میں آجائے تو تشدد برداشت نہ کرنے کی صورت میں بھی باقی ساتھیوں کے متعلق نہ بتا سکے۔

غازی

آخری کام جو اپنے رازوں اور ساتھیوں کی حفاظت کیلئے کیا گیا تھا وہ ہماری ایک ایک داڑھ نکال کر اس کی جگہ سخت پلاسٹک کی داڑھ لگا دی گئی تھی کہ جب تشدد برداشت کرنے کی سکت نہ رہ جائے تو داڑھ کو نکال کر چبا جاؤ، داڑھ میں سانا نڈھ بھرا ہوا تھا۔ دشمن کو راز بتانے کے خدار کھلانے سے بدرجہا بہتر ہے کہ موت کو گلے لگا کے شہید ہو جاؤ تا کہ آئندہ نسلیں تم پر فخر کر سکیں۔ یہی تھی ہماری تربیت اور جذبہ جس کے تحت ہمیں اپنے مشن کی تکمیل کیلئے تیار کیا گیا تھا۔ ہم جسمانی اور ذہنی طور پر اپنے مشن پر جانے کیلئے بالکل تیار تھے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد بھارت اپنی 80 فیصد سے زیادہ فوج مغربی پاکستان کے بارڈر پر لے آیا تھا۔ نیلی جنس رپورٹس سے معلوم ہوا تھا کہ سابقہ مشرقی پاکستان کے بعد بھارت پاکستان کے اس مشکل دور سے فائدہ اٹھا کر مغربی پاکستان کو بھی نکل جانا چاہتا ہے۔ بھارت کو اپنی افواج سے زیادہ اس وقت کے روں سے کئے گئے دفاعی معاہدے پر بہت غرور اور بھروسہ تھا جس کے تحت بھارت پر حملہ روں پر حملہ سمجھا جاتا تھا۔ پاکستانی افواج نے دوران جنگ اسی بھارت اور روں کے مابین اسی معاہدے کی وجہ سے محض دفاعی جنگ لڑی اور بھارت کو اسی وجہ سے بھرپور موقع مل گیا کہ وہ مغربی پاکستان کی دفاعی لحاظ سے کمزور مقامات پر بھرپور حملہ کر کے پاکستانی حدود میں داخل ہو جائے۔ چنانچہ جنگ بندی کے وقت مغربی پاکستان کا پانچ ہزار مربع میل علاقہ بھارت کے قبضے میں جا چکا تھا۔ افواج پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری پاکستانی قوم مایوسی کا شکار تھی۔ ہمارا گروپ اسٹینڈ بائی پوزیشن میں تھا کہ ہمیں تین دن کی رخصت دی گئی اور ہدایت کی گئی کہ اپنا سب سامان گھر چھوڑ کر آئیں۔ صرف جوتوں کا ایک جوڑا جو پہنا ہوا اور دو جوڑے پینٹ قمیص لائیں جن پر کوئی بھی ایسا نشان نہ ہو کہ وہ پاکستان کے رہنے ہوئے ہیں۔ یہ چھٹی ہمارے لئے روانگی کا گرین سگنل تھی۔ مجھ سے کاغذات پر اپنے ورثا کے نام لکھوائے گئے۔ جن کی ایک کاپی مجھے اپنے ورثا کو دینے کیلئے دے دی گئی۔ میرے باقی چاروں ساتھیوں تو باقاعدہ فوجی تھے اور پہلے سے ہی یہ کاغذات مکمل کر چکے تھے۔ کاغذات میں دوران مشن مرنے کی صورت میں ورثا کیلئے معقول رقم اور مزید ہوتیوں دینے کا وعدہ تھا۔ اس وقت میری والدہ بقیہ حیات تھیں۔ بیوی اور چہرہ ماہ کا لڑکا تھا۔ میں نے ورثا میں پہلے والدہ کا نام لکھا اور بی ۴ میں بیوی اور بچے کا اور تین روزہ چھٹی پر روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے خود کو مائل رکھنے کی پوری کوشش کی۔ میری بیوی تو کچھ نہ بچھڑکی لیکن والدہ نے میری اندرونی کیفیت کو کچھ کچھ سمجھنا چاہا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی یہ نہ بتایا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں۔ انہیں تو صرف یہ علم تھا کہ میں لاہور میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہوں۔ روانگی سے چند لمحے قبل میں نے والدہ کو بندھانے میں کاغذات دیئے اور کہا کہ انہیں سنبھال کر رکھیں۔ والدہ مرحوم کی قبر پر حاضری دی اور گھنٹوں بیٹھا رہا۔ روانگی کے وقت والدہ، بیوی اور بچے سے اس طرح ملا جیسے شاید آئندہ ملاقات نصیب نہ ہو۔ میری جو اندرونی کیفیت تھی اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن میں نے حتی الامکان یہ کوشش کی کہ چہرے پر کوئی تاثر ظاہر نہ ہونے پائے۔ والدہ اور بیوی کو میں نے یہ بتایا تھا کہ کمپنی کی طرف سے مجھے شاید چند ماہ کے لئے سری لنکا جانا پڑے۔ اس لئے میری طرف سے خطوط آنے میں دیر ہو سکتی ہے۔ میں فون پر فخر والوں سے آپ کی خیریت معلوم کر لیا کروں گا اور میرے دفتر کے آدی میری تنخواہ پہنچا کریں گے اور میری خیریت سے آپ کو آگاہ کر دیا کریں گے۔

یہ سب باتیں میں نے اپنے سینئرز کی ہدایت کے عین مطابق کی تھیں۔ گھر والوں کو یہ انتظام عجیب سا لگ رہا تھا، لیکن میں نے انہیں سوال کرنے کا موقع نہ دیا اور شام کو سات بجے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ اگلے صبح 8 بجے ہمیں رپورٹ کرنی تھی۔

لاہور میں ہمیں ایک بند چپ میں آنکھوں پر پٹی باندھ کے لے جایا گیا اور جب پٹی کھلی تو ہم ایک ہال میں موجود تھے جہاں بہت سی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہاں ہمارے سینئرز بھی تھے۔ چند ہی لمحوں بعد سو بیلیں ڈریس میں ایک صاحب داخل ہوئے جنہیں ہمارے سینئرز نے ایڑیاں بجا کر سلوٹ کیا۔ ان صاحب نے فردا فردا ہم سب سے مصافحہ کیا۔ ٹریڈنگ کی کامیاب تکمیل پر مبارکباد دی اور کہا کہ آپ 5 افراد جس مشن پر جا رہے ہیں اس کی کامیاب تکمیل سے پاکستان کو بہت مدد ملے گی۔ اس لئے روح کی گہرائیوں سے اپنے مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانا اور اس دوران اگر غدراری کی زندگی اور شہادت میں سے کسی کو چھننا پڑے تو شہادت کو قبول کرنا کیونکہ موت تو یقیناً ایک روز آتی ہے۔ ہمارا دشمن اتنا مکار ہے کہ زندہ رکھے اور عیش و عشرت کے چھوٹے وعدے کر کے راز لگوا لیتا اس کا مذہب ہے اور سب راز جاننے کے بعد وہ تمہیں چھوڑے گا نہیں بلکہ اذیت ناک موت سے ہمکنار کرے گا۔ ایک واقعہ جو انہوں نے بیان کیا میں انتہائی مختصر الفاظ میں بیان کروں گا۔

سلطان ٹیپو شہید کے ساتھ غدراری کرنے والے میر صادق کو انگریزوں نے جاگیر اور ساتویں پشت تک وظیفے سے نوازا تھا۔ وظیفے کی ادائیگی سرنگاپٹم کے خزانے سے ہوتی تھی۔ انگریزوں نے صرف حکومت میں اعلیٰ افسر ہوتے تھے۔ دیگر امور حکومت کیلئے ہندوستانی ملازم ہی ہوتے تھے۔ برٹش ریل تیار کر کے یہ حقیقت کتنی عجیب اور فسوسناک ہے کہ 1857ء میں جنگ آزادی سے لے کر 1947ء میں آزادی ملنے تک پورے برصغیر میں انگریزوں کو ملازمت کی تعداد کبھی بھی 2500 سے زیادہ نہ رہی اور یہ 2500 انگریز اپنے ہندوستانی ملازموں کے بل بوتے پر (جن میں 80 فیصد ہندو ہوتے تھے) پورے برصغیر پر دھڑلے سے حکومت کرتے رہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ میر صادق کے ورثا کو وظیفے کی ادائیگی کے لئے جب پیکار پڑتی تھی تو چیرا سی (بالکل آج کل کی عدالتوں میں رائج طریقے کے مطابق) اونچی آواز میں پکارتا تھا کہ میر صادق غدار کے ورثا حاضر ہوں، جیسے شہید ہمیشہ زندہ رہتا ہے ویسے ہی غدار کی غدراری اس کے مرنے سے ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ پشت در پشت اس کی اولاد کو یاد دلاتی رہتی ہے کہ تمہارے اجداد میں ایک غدار تھا۔ انہوں نے ایک مثال دی کہ بہادر شاہ ظفر کا سر حکیم احسن جس نے بہادر شاہ کو گرفتار کروا لیا تھا اس کی اولاد تقسیم ہند کے بعد نقل مکانی کر کے کراچی آ گئی ہے اور سرکاری ملازمت اور تجارت میں مصروف ہے لیکن وہ لوگ اپنے جدا جدا حکیم احسن کا نام نہیں لیتے اور اگر کسی کو اس کا علم ہو تو اسے نہایت عاجزی سے کہتے ہیں کہ اس بات کی تشہیر نہ کریں۔

اس مختصری تقریر یہ صحیح ہے بعد وہ ہم پانچوں سے بغل گیر ہوئے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم سب کی جسمانی اور ساتھ لائے ہوئے ایک ایک جوڑے کی بھرپور تلاش لی گئی۔ سگریٹ، ماچس، بٹوے سب لے لئے گئے اور بھارتی سگریٹ، ماچس اور بٹوے دیئے گئے۔ ہمارے ایئر بیگ لے کر ایسے ایئر بیگ دیئے گئے جن پر میڈان انڈیا لکھا ہوا تھا۔ ہماری نقلی داڑھیوں دو ڈاکٹروں نے ہنوں کے ساتھ لگا کیں۔ ان کے ساتھ کچھ ایسا بھی لگایا گیا ہوا تھا جس سے وہ نہایت مضبوطی سے چپک گئیں۔ ہم سب کو پانچ پانچ ہزار کی بھارتی کرنسی دی گئی اور مجھے ایک کاغذ دیا گیا۔ جس پر دلی، آگرہ اور بمبئی کے کچھ پتے درج تھے۔ کوڈورڈ بھی لکھا ہوا تھا۔ یہ ان بھارتی ہمدردوں کے پتے تھے جن سے رابطہ کرنے پر مجھے روپے اور دیگر مطلوبہ اشیا مل سکتی تھیں۔ مجھے یہ ایڈریس اور نام یاد کرنے تھے۔ جس مشن پر ہم جا رہے تھے اس میں ایک نہیں بلکہ درجنوں کام تھے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی اہم نوعیت کی معلومات اور وہاں کے حالات کو دیکھتے ہوئے جو کام بھی ملتی بھلائی کے لئے مناسب نظر آئے وہ کرنے کی اجازت دی گئی تھی یعنی ہمارا کوئی ایک مخصوص مشن نہ تھا بلکہ ہمیں دشمن کے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کرنی تھیں اور موقع ملنے پر اسے زنج کرنا تھا۔

مزید برآں مجھے ایک خصوصی مشن دیا گیا تھا اور وہ تھا انڈین آرمی ہیڈ کوارٹر دہلی میں چیف آف انڈین آرمی کے دفتر کے کسی ملازم کو پلانٹ کرنا۔ ان دنوں فوٹو کاپی مشینیں نہیں تھیں اس لئے جو کچھ بھی ٹائپ کیا جاتا تھا کاربن پیپر سے اس کی کاپیاں بنائی جاتی تھیں۔ کاربن کو اگر ایک یا دو بار استعمال کیا جائے تو اس پر ٹائپ کی گئی عبارت بخوبی پڑھی جا سکتی ہے۔ اگر اس طرح استعمال شدہ کاربن دی کی ٹوکری میں چپینک دیئے جائیں اور صفائی کرنے والا دفتر کے اوقات کے بعد دوران صفائی وہ کاربن نکال کر ہمیں دے دے تو بہت ہی اہم معلومات ہمیں مل سکتی تھیں۔ علاوہ ازیں بریگیڈیئر اور اس سے اوپر کے عہدے دار تحفظ کے لئے ریف ہیڈ پر جو کچھ بھی لکھتے تھے اس سے اگلا خلی صفحہ ضائع کر دیتے تھے تاکہ قلم کے زور سے تحریر کے نقوش جو خلی صفحے پر آ جاتے ہیں وہ کسی کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ یہ بڑے ریک کے افسران خالی صفحے دو یا تین ٹکڑے کر کے دی کی ٹوکری میں چپینک دیتے تھے اور وہ دی کی ٹوکریاں ہمارے لئے خزانے سے کم تھیں۔ میرے خصوصی مشن میں چیف آف آرمی اسٹاف کے ٹائپسٹ اور دفتر کے دوسرے ٹائپسٹ کلرکوں اور صفائی کرنے والوں کو دوسرے درجے یا کسی بھی جائز یا ناجائز طریقے سے پلانٹ کرنا اور مطلوبہ کاربن، پھٹے ہوئے سادہ کاغذ حاصل کرنا شامل تھا۔ ایک بار جب کوئی یہ کام لے تو پھر آئندہ اس سے مکمل معلومات حاصل کرنا مشکل نہ تھا۔

بھارت اور پاکستان میں اس وقت حساس محکموں میں یہ طریقہ رائج تھا کہ جاسوس کو شکل اور جسمانی لحاظ سے ایسا ہونا چاہئے کہ ضرورت پڑنے پر 100 افراد میں بھی گم ہو سکے۔ اس دور میں دونوں ممالک کے جاسوس فقیر، مجذوب، لٹک بیا بالکل نچلے درجے کا کام کرنے والوں کا روپ دھار کر دشمن ملک میں کام کرتے تھے۔

پاکستان اور بھارت کے حساس محکموں کے افسران کی تربیت امریکاٹ لینڈیاں میں اور اکثر ایک ہی وقت میں ہوتی تھی۔ نتیجتاً دونوں ممالک کے افسران ایک ہی طرز کی تربیت دیتے تھے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے آج کل امریکہ پاکستان اور بھارت دونوں کی افواج کے ساتھ جنگی مشقیں کرتا ہے اور اس کا اندرونی مقصد ہماری افواج کی صلاحیت جاننا ہوتا ہے۔ پاکستانی افواج کے متعلق اہم معلومات اسرائیل کو دی جاتی تھیں جو بالواسطہ بھارت کو پہنچ جاتی ہیں۔ تین دہائی پہلے تک یہ انتہائی حساس فریضہ پاکستانی سول افسران انجام دیتے تھے۔ بعد میں یہ کام پاکستانی سیاست دانوں نے سنبھال لیا یعنی دشمن کو اپنی خفیہ معلومات مہیا کرنا، ورنہ کسی فوجی نے کچھ تو ہم پرستوں کی فہرست بھارت کو نہیں دی اور نہ ہی کسی فوجی نے بھارتی ٹینکوں پر بیچہ کر پاکستان میں داخل ہونے کی بات کی۔ کسی فوجی نے یہ اعلان نہیں کیا کہ پاکستان کے پاس ایٹم بم موجود ہے اور نہ ہی کسی فوجی نے بھارت انتہائی پسندیدہ قوم کا درجہ دیا۔ یہ ”ٹیک کام“ صرف سیاست دان ہی کر رہے ہیں۔

میں اپنے قد کاٹھ اور شکل و صورت سے کسی پہلو سے بھی بھارتی نہیں لگتا تھا اور سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں میں مجھے دھوڑھوڑا لینا بہت آسان تھا۔ مجھے بھارت کی اونچی سوسائٹی میں گھل مل جانا اور نیچے درجے کے ہوٹل میں قیام کرنا تھا۔ غالباً میں پہلا شخص تھا جسے یہ مشن سونپا گیا کیونکہ اپنے غیر معمولی قد کاٹھ اور شکل و شبہات کی وجہ سے مجھے پاکستانی جاسوس سمجھے جانے کا کم سے کم امکان تھا۔ پاکستان کی طرح بھارتی پولیس اور سی بی آئی والے بھی صرف نچلے درجے کے ہوٹلوں پر ہی ریڈ کرتے ہیں۔ فوراً یا فوراً اشارہ ہوٹلوں میں داخل ہونے کی ان میں بھی جرأت نہیں ہوتی۔ تربیلا میں ملازمت کے دوران وہاں غیر ملکی افسران اور ان کی فیملیوں کے لئے بے گلوبوں میں میری رسائی تھی۔ میں اس دور کے مقبول ترین بال روم ڈانس جیسے اسکوئر، والٹز اور راک اینڈ رول میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ بھارت میں قیام کے دوران ان خرافات سے مجھے بڑی مدد ملی۔

بھارت میں چوڑا فینٹی بڑی مشہور ہے۔ یہ پنجابی، بڑے قد کاٹھ والے اور نہایت سفید رنگ کے ہیں اس لئے مجھے نوڈو چوڑا کا نام دیا گیا۔ اس فینٹی نے کاروبار صنعت اور فلم انڈسٹری میں خاص نام کمایا ہے اور یہ سارے بھارت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح میرے دیگر ساتھیوں کو بھی مختلف ہندو نام الاٹ کئے گئے۔

آئندہ بطور میں مشن کے واقعات ایک تسلسل کے ساتھ آ رہے ہیں۔ اس سے پہلے چند سطروں میں ایک وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک جاسوس کے لئے اپنی زندگی سے زیادہ اہم اپنے مشن کی تکمیل ہے۔ بھارت میں ہندو نام کے ساتھ داخل ہو کر مجھے خالصتاً ایک ہندو کے روپ میں اپنا کام کرنا تھا اور اس کے لئے مجھے وہ بھی کرنا پڑا جس کی اسلام میں ممانعت ہے۔ مجھے وطن عزیز کی سلامتی کے لئے جوشن سونپے گئے تھے، انہیں ہر قیمت پر مکمل کرنا تھا۔ اس دوران مجھ سے جو غیر شرعی اور غیر اسلامی حرکات ہوئیں ان کے لئے میں صرف اس ذات کے سامنے جوابدہ ہوں جو رحمن اور رحیم ہے۔

ہمیں دوران تربیت والی رہائش گاہ پر لایا گیا۔ وہاں ایک بار پھر مشن کی بریفنگ اور احتیاطی تدابیر دہرائی گئیں۔ ستمبر 3 بجے ہمیں دو پرائیویٹ کاروں میں لاہور اسٹیشن لایا گیا۔ بھیس پر اور ہر قصور رکٹ پہلے ہی خرید لئے گئے تھے۔ ہم سب سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بالکل انجلی بن کر داخل ہوئے۔ ہمارے دو سینئر زمینی ہمارے ہمراہ تھے۔ ایک دوسرے سے بات چیت کی قطعاً ممانعت تھی۔ رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہم بھیس پر پہنچے، وہاں ایک سیف ہاؤس میں ہمارے کھانے اور سونے کا انتظام تھا۔ اس سیف ہاؤس کے ایک حصے میں چیچ پکار کی آوازیں آتی تھیں۔ سینئر نے ہمیں بتایا کہ کچھ بھارتی ہیں جو بارڈر کراس کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ ان کی تفتیش کی جا رہی ہے۔

سیف ہاؤس کے مستقل رہائشی بالکل خاموشی سے ہماری مطلوبہ اشیا ہمیں پہنچا رہے تھے اور اگر ہم کوئی سوال کرتے تو محض مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے۔ دوسری صبح نوحہ کیے ہم نے بھیس پر سے کوچ کیا اور تین چھپوں میں ہمارا قافلہ روانہ ہوا۔ ہمیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ ہمیں کہا لے جایا جا رہا ہے۔ سفر مسلسل جاری رہا۔ یہ کبھی نہر کی پگڈنڈی پر اور کبھی بچی اور ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر جاری رہا۔ غروب آفتاب کے قریب ہم خیموں کے ایک پڑاؤ میں پہنچے جہاں پاکستانی بارڈر فورس کے جوانوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ وہاں ہمیں ہمارے سینئر نے بتایا کہ ہم بہاول نگر میں منڈی صادق گج کے قریب بارڈر سے صرف 2 کلومیٹر کی دوری پر ہیں۔

وہاں دو اجنبی دیہاتیوں سے ہمیں ملایا گیا۔ ٹھیک دس روز بعد دلی میں گیارہ بجے دن ان میں سے ایک نے مجھے ملنا تھا۔ میٹنگ کا مقام تفصیلاً مجھے سمجھا دیا گیا۔ یہ دونوں دیہاتی اور کے ایک معروف اگٹلر کے کارندے تھے اور ہفتے میں دو بار اسی راستے سے بھارت جاتے تھے اور پانچ، چار اور الپنچ وغیرہ لاتے تھے۔ پاکستان کی طرف سے انہیں بارڈر سے گزرنے اور واپس آنے کی سہولت دی گئی تھی جس کے عوض وہ پہلے سے گئے ہوئے گروپس کی ڈاک وغیرہ لاتے اور لے جاتے تھے۔ یہ دو اجنبی محض ہمارے گروپ کے لئے وقف تھے اور ان کو یہ ڈیوٹی سونپی گئی تھی کہ ہمیں وقت مقررہ پر سرحد پار کرنا نہیں اور قریب ترین بھارتی ریلوے اسٹیشن ہنومان گڑھ تک پہنچا دیں۔ انہیں پیسے بھی دیئے گئے کہ وہ ہنومان گڑھ سے اجیر شریف تک کے ٹکٹ خرید کر ہمیں دے دیں۔ ہمیں ٹکٹ دے کر وہ فوراً واپس ہندوستانی بارڈر کے قریب گاؤں مرزا پور پہنچ جائیں۔ جہاں دو افراد انہیں ملیں گے جو اگلی شام تک ان کے ہمراہ رہیں گے۔ ادھر ہمیں علیحدگی میں ہنومان سے بھٹنڈہ کے ٹکٹ دیئے گئے تاکہ مخالف سمت میں جانے والی گاڑی میں سوار ہوں جو اجیر شریف جانے والی گاڑی سے چند ہرہ میں منڈ پھلے ہی آ جاتی ہے۔ یہ سب احتیاطی اور احتیاطی تدابیر ہماری حفاظت کے لئے کی گئی تھیں۔ ہم نے گھڑیاں بھی لے لی گئی تھیں اور صرف ایک گھڑی مجھے دی گئی تھی جو بھارت میں مہیا تھی۔ اس وقت اس کی قیمت بھارت میں تقریباً تین سو روپے تھی۔

رات کا کھانا ساڑھے آٹھ بجے تک کھالیا گیا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد ہمیں ایک ایک سیاہ لمبا ڈرویز اور ایک ایک سیاہ رنگ کی پورے بازوؤں کی بنیان دی گئی۔ ہم نے بوٹ بھی اتارے اور کپڑوں کے ہمراہ اپنے بیگوں میں رکھ لئے۔ اب ہمارے سینئر ز ہمارے ساتھ خوش گپیاں کر رہے تھے لیکن وہ محض ہماری بینشن دور کرنے کے لئے تھیں ورنہ ان کے چہروں سے بھی پریشانی عیاں تھی۔

ان دنوں جنگ کے بعد ہم بینر فائر کی حالت میں تھے۔ پاسورٹ اور ویزا نام کی کوئی شے تھی۔ بارڈر پر دونوں اطراف افواج کا اجتماع تھا، عین ممکن تھا کہ بارڈر کراسنگ کے دوران ہی دشمن ہمیں گولیوں سے اڑا دیتا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ بھارت نے بارڈر کے قریب پاکستانی بی آر نی فہر کی طرح ایک نہر بنائی ہے جو خاصی گہری ہے۔ پاکستان کی طرف وہ دھلوان ہے جبکہ بھارت کی طرف وہ بالکل سیدھی ہے۔ ہمیں وہ نہر اور آواز پیدائے تیر کر عبور کرنی ہے۔ اس کی ٹریڈنگ ہمیں خوب اچھی طرح دی گئی تھی۔ ہنومان گڑھ اسٹیشن بارڈر سے 8 میل کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں دو تین گاؤں پڑھتے تھے۔ ہمیں ان سے دور رہ کر اور گاؤں کے کتوں سے بچ کر بھاگتے ہوئے جانا تھا اس وقت مجھے احساس ہوا کہ دوران تربیت مجھے گیارہ میل مسلسل دوڑنے کی پریکٹس کیوں کرائی گئی تھی۔ اسٹیشن کے قریب پہنچ کر ہمیں بنیان اور انڈر ویز اتار کے عام شہری لباس پہن لینا تھا اور دونوں اجنبی گاؤں کو فوری واپس بھیج دینا تھا۔ بھٹنڈہ تک دوران سفر وہ الگ الگ ڈبوں میں بیٹھا تھا اور ایک دوسرے سے بات چیت ہرگز نہیں کرنی تھی۔ یہ آخری ہدایات تھیں۔ ٹھیک دس بجے ہمیں مسلسل گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ ہماری بارڈر فورس نے پڑاؤ سے دونوں طرف تقریباً 1/2 کلومیٹر کے فاصلے سے دشمن پر فائرنگ شروع کر دی تھی اور دشمن کو جوابی فائرنگ میں مصروف کر دیا تھا۔ یہ فائرنگ ہمارے لئے گرین سگنل تھی۔ سینئر نے ہمیں گلے لگایا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریر تھیں۔ ان کے آخری الفاظ کچھ اس طرح تھے۔

غازی

"Wish You Gods Help and best of luck

اپنی ذہنی حالت کے بارے میں، میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ بارڈر کراس کرنے کی ٹینشن اور مشن کی اہمیت دونوں یکساں تھیں۔ گھر اور ٹیلی کا خیال ذہن سے بالکل نکل چکا تھا۔ ہمیں ایک ایک 30 یورکار یا اورا اور ایک ایک سو گولیاں واٹر پروف پیکٹ میں دی گئی تھیں۔ جنہیں ہم نے اپنے بیگوں میں رکھ لیا تھا۔ نہر عبور کرنے کے دوران بیگوں کو سر پر باندھنے کیلئے رساں بھی دی گئی تھیں۔ سوادیں بچے میں بارڈر کی جانب بڑھنے کا حکم ملا اور ہم سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے اپنے گائیڈز کے ہمراہ بارڈر کی طرف چل پڑے۔

یہ تقریباً 100 کلومیٹر کا علاقہ پانی، ہسرنکڈوں اور کچڑ سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے تقریباً 80 میل کا علاقہ بھاگتے ہوئے طے کیا اور بقیہ بیگتے ہوئے۔ کچڑ اور سرکڈوں سے ہمارے جسم ٹی اور ریشاںوں سے بھر گئے تھے۔

ہمیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ ہم کب بھارت میں داخل ہوں گے کیونکہ سرحد کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ ہم بس آگے ہی بڑھتے جا رہے تھے کہ گائیڈ نے کہا کہ نہر آگئی ہے۔

ہم ایک ایک کر کے نہر میں اتر گئے۔ گولیاں دونوں طرف سے تزاخ تزاخ چل رہی تھیں۔ نہر کو ہم نے کھڑی پوزیشن میں تیر کر عبور کیا۔ بھارت کی طرف سے کنارا پانی سے خاصا اونچا اور 90 رقبے کا تھا۔ اس پر چڑھنے میں دقت ہوئی۔ اس کنارے پر پگڈنڈی بھی تھی جس پر پی ایس ایف (بھارت کی بارڈر سیکورٹی فورس) گشت کرتی تھی۔ ہمیں جلد از جلد اس پگڈنڈی کو عبور کر کے کھیتوں کی طرف دوڑنا تھا۔ احتیاطی تدابیر کے مطابق پگڈنڈی پر ہمیں اگلے قدموں چلنا تھا تاکہ اگر کوئی ہمارے پاس کے نشان دیکھے بھی تو یہ سمجھے کہ کچھ لوگ بھارت سے پاکستان کی طرف گئے ہیں۔ پگڈنڈی سے اگلے قدموں کر کے ہم کھیتوں کی طرف بھاگے۔ کھیتوں کی منڈیوں پر ہم تیز سے تیز بھاگتے گئے۔ کھیتوں میں ڈیرے بنے ہوئے تھے۔ ہم ان ڈیروں سے حتی الوسع دور رہنے کی کوشش کر رہے تھے اس وجہ سے ہمیں کئی بار ایک کھیت عبور کر کے کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب جانا پڑا تاکہ کیونکہ ڈیروں پر پالتو کتے ہوتے ہیں۔

غرضیکہ صرف ایک جگہ منٹ آرام کر کے ہم نے اپنا سفر جاری رکھا اور نومان گڑھ اسٹیشن سے تقریباً آدھا کلومیٹر پہلے ایک نہر آئی۔ ہم نہر میں کود پڑے۔ اچھی طرح سے نہانے اور جسم کی آلودگی دور کی، انڈرویز اور بنیان سے جان چھڑائی اور سوہیلین لباس پہنچ لئے۔ گائیڈز نے ہمارے لئے ٹکٹ لینے جانا تھا لیکن میں نے نہیں روک دیا اور کہا کہ پیسے تم رکھ لو اور اندھیرے میں واپس اس گاؤں میں پہنچ جاؤ جہاں تمہارا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس دوران میں نے اپنا ریو لوڈ کر لیا تھا۔ وہ دونوں اسی وقت واپس روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنے ایک ساتھی کو ان کے پیچھے یہ دیکھنے کیلئے بھیجا کہ وہ واقعی واپس جا رہے ہیں یا کہیں چھپ گئے ہیں۔ اسمگلروں سے ہر بات ممکن ہے۔ میں نے ساتھی کو بھی ریو لوڈ کرنے کو کہا کہ اگر یہ ذرا بھی ادھر ادھر ہونے کی کوشش کریں تو فوراً گولی مار دینا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد میرا ساتھی واپس آیا اور بتایا کہ وہ اسی راستے پر بھاگتے ہوئے جا رہے تھے۔

اسی اثنا میں دوسری گاڑی کے وکیل کی آواز آئی اور ہم نے اسٹیشن کی راہ لی۔ یہ بھٹنڈہ جانے والی گاڑی تھی۔ بالکل چھوٹا سا اسٹیشن تھا، ابھی ہلکا ہلکا جالا ہوا تھا۔ ہم چار ساتھی اسٹیشن سے ذرا فاصلے سے پڑی کی دوسری جانب چلے گئے اور پانچواں ساتھی ٹکٹ لینے اسٹیشن کی طرف چلا گیا۔ گاڑی غالباً ایک یا دو منٹ وہاں رکی۔ ہمارے ساتھی نے ٹکٹ لیکر گاڑی کی دوسری طرف سے ہمیں اشارہ کیا اور ہم دوسری جانب سے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ہمارا ساتھی دروازے کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے دروازے سے گزرتے ہوئے ساتھیوں کو ٹکٹ تمہاریا اور ہم چاروں اجنبی بن کے ایک ہی ڈبے میں بیٹھ گئے۔ تقریباً پون گھنٹے بعد گنگا گھر آیا۔ یہ خاصا بڑا اسٹیشن تھا۔ ہم ایک ایک کر کے اترے۔ اسٹال سے پوریاں اور چائے کا ناشتا کیا اور دو الگ الگ ڈبوں میں بیٹھ گئے۔ اب ہماری منزل بھٹنڈہ جنگل تھا، جہاں سے ہم نے دہلی کیلئے گاڑی پکڑنی تھی۔

بھٹنڈہ مغربی بھارت کا بہت بڑا جنگل ہے۔ گاڑی بھٹنڈہ پہنچی تو ہم اسٹیشن سے ایک ایک کر کے باہر آ گئے۔ اب ہم سرحد سے خاصی دور آ گئے تھے اور بارڈر کراس کرنے کی ٹینشن بھی کچھ کم ہو گئی تھی۔ شہر چھوٹا سا تھا۔ ہم نے بازار سے سگریٹ اور شیونگ کا سامان وغیرہ خریدا۔ وائرلیس سیٹ بھی پریشانی کا موجب بن رہا تھا۔ وائرلیس اور باقی سامان ایک ہی جگہ میں تھا اور اسے سنبھالنے کے ذمہ دار کو ہر بار ریگ کھولتے وقت گھبراہٹ ہوتی تھی۔ لہذا ہم نے ایک بیگ وائرلیس سیٹ رکھنے کیلئے خرید اور باقی سامان تک کے سفر کے دوران اس بیگ کی نگرانی ہم سب نے بانٹ لی۔ شہر کے ایک ہوٹل سے ہم نے کھانا کھایا اور پھر اسٹیشن کی طرف پلٹ آئے۔ ویننگ روم میں ہم نے شیو بنائی، نہانے اور حلیہ درست کیا۔ میں نے ساتھیوں کے مشوروں سے فیصلہ کیا کہ بجائے کسی ایک سپر بس یا پنجاب میل کے ہم فاسٹ پینجر میں دہلی تک کا سفر کریں گے تاکہ راستے میں مختلف اسٹیشنوں پر رکتے ہوئے جہاں تک ممکن ہو وہاں کے حالات سے باخبر ہو سکیں۔

فاسٹ پینجر سپر 3 بجے دہلی کیلئے چلتی تھی۔ ہم نے سینکڑوں کلاس کے ٹکٹ لئے۔ بھٹنڈہ اسٹیشن سے ہم نے ایک ملٹری ٹرین دیکھی جو یقیناً بارڈر کی طرف جا رہی تھی۔ ہماری گاڑی پلٹ فارم پر آگئی اور ہم ایک ڈبے کا انتخاب کر کے اسی میں اٹھ بیٹھ گئے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ وائرلیس کا بیگ اوپر کی رتھ پر رکھا جائے اور جس کی ڈیوٹی ہو وہ اس پر سر رکھ کر خود کو سوتا ظاہر کرے۔ ٹرین مقررہ وقت پر روانہ ہوئی۔ پینجر ٹرین ہونے کی وجہ سے کچھ مسافروں کی اکثریت تھی۔ ایک عجیب بات محسوس ہوئی کہ کچھ مسافر بھی خاموش اور مایوس سے دکھائی دے رہے تھے۔ ورنہ کھسوں کی تو عادت ہے کہ جہاں بھی دو کچھ موجود ہوں وہاں قہقہے اور اونچی آواز میں باتیں لازمی ہو جاتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ بھارتی پنجاب کے کچھ بھی اپنی آزادی کی منزل 71 کی جنگ سے وابستہ کر بیٹھے تھے اور ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا یا پھر وہ ہمیں ہندو سمجھ کے غناط اور متفر سے تھے۔ میں نے دو تین بار ان سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار نہایت مختصر جواب ملا۔ ہم نے بھٹنڈہ سے براہ راست دہلی جانے کیلئے پہلے جالندھر اور پھر دہلی جانے کو ترجیح دی کیونکہ ہمارے سفر کے دوران تین بڑی چھاؤنیاں جالندھر، لدھیانہ اور انبالہ آئی تھیں۔ ان چھاؤنیوں کے اسٹیشنوں پر کانی چہل پہل تھی۔ دہلی سے امرتسر جانے والی ٹرینوں میں بھارتی ایف آئی یو (Field Intelligence Unit) کے آدی مسافروں کی چیکنگ کرتے بھی دکھائی دیئے۔ اس کی لازماً وجہ شرقی پاکستان سے قید ہونے والے پاکستانی جنگی قیدیوں کے بھارت کے POW کیس سے فرار کے درجنوں واقعات تھے۔ 16 دسمبر 1971ء کو پاکستان کے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں فوجیوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ ان میں سے کچھ برما کی طرف اور بیشتر بھارتی سرحدوں میں داخل ہو گئے تھے اور چھپتے چھپاتے پاکستان کے پنجاب بارڈر کی طرف جا رہے تھے۔ انہیں ہی پکڑنے کیلئے بھارتی پنجاب میں امرتسر کی جانب جانے والی ٹرینوں کی چیکنگ کی جاتی تھی۔

بھٹنڈہ سے دہلی کے سفر کے دوران ہم نے تین اور ملٹری اسٹیشن ٹرینیں دیکھیں۔ ایک تو بھٹنڈہ اسٹیشن پر کھڑی تھی اور ڈیڑھ گھنٹے پہلے فرانس کے بنے ہوئے AMX-13 اور روسی PT-76 ٹینک، دو مارٹو ہیں، ہوٹیز اور CAT TIGER میزائل کی بیٹریاں لدی ہوئی تھیں۔ ان ٹرینوں کو باقی سب ٹرینوں پر فوقیت دے کر TROUGH کیا جاتا تھا۔ ان ٹرینوں کے پاکستانی سرحد کی جانب جانے سے بھارتی عزائم کا صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ مغربی پاکستان پر فوجی دباؤ بڑھا رہا ہے اور سابقہ مشرقی پاکستان سے فوجیں ہٹا کر مغربی پاکستان کی سرحد پر جمع کر رہا ہے۔ روسی ساختہ PT-76 ٹینک AMPHIBIOUS یعنی پانی میں تیرنے والے ٹینک ہیں۔ سیز فائر کے بعد ان مخصوص ٹینکوں کو پاکستانی بارڈر پر لانے سے بھارتی ارادے صاف ظاہر ہو رہے تھے۔ ایک ٹرین میں بھارتی فوجی سوار تھے۔ صرف آدھے دن میں ہم نے 4 فوجی ٹرینیں دیکھی تھیں۔ میں نے ان ٹرینوں اور ان کے کارگو کو اچھی طرح ذہن میں ٹھہرایا تاکہ اپنی پہلی رپورٹ میں ان کا ذکر کر سکوں۔

رات تقریباً ساڑھے نو بجے ٹرین شاہدرہ اسٹیشن پر رکی (دہلی میں بھی جتنا کے مغربی جانب شاہدرہ اسٹیشن ہے۔ بالکل لاہور والے شاہدرہ اسٹیشن کی طرح) ہم نے اسی اسٹیشن پر گاڑی کو چھوڑا اور دو ٹیکسیاں لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق سبزی سٹری اسٹیشن کے قریب گھنٹہ گھر چوک میں ہم نے دو معمولی ہوٹلوں میں قیام کیا۔ چونکہ بھارت میں شناختی کارڈ رائج نہیں ہیں اس لئے ان ہوٹلوں میں کمرے حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں آئی۔ وہاں ہم سب نے خود کو معمولی کاروباری کی حیثیت سے متعارف کرایا اور بتایا کہ ہم گرو نو اچ کے چھوٹے شہروں سے خریداری کیلئے آئے ہیں۔

ہماری بارڈر کراس کرنے کی ٹینشن میں بھی خاصی کمی آچکی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو دو دو کی ٹولیوں میں دہلی میں گھومنے پھرنے کی اجازت دی۔ ہوٹلوں میں ہم نے داخلے کے راستے کے علاوہ کسی ایمرٹسی کے لئے دوسرے راستے بھی تلاش کر لئے تھے۔ ہمارا قیام پہلی منزلوں پر تھا اور ایک منزل سے کودنا ہمارے لئے کوئی دشواری نہ تھا۔

دوسرے روز میرے چاروں ساتھی گھومنے پھرنے نکل گئے۔ میں نے انہیں ہدایت کی کہ وہ کم از کم چار عدد ریڈی میڈ پتلونیں، قمیضیں اور جوڑے ضرور لیں اور ضرورت کا دیگر سامان بھی جو انہوں نے شام تک خرید لیا۔ دشواری مجھے پیش آئی، میرے لمبے قد کی وجہ سے مجھے ریڈی میڈ کپڑے نہ مل سکے۔ میں نے کنات ہلیس میں بھی تقریباً سب دکائیں چھان ماریں۔ صرف ایک سفاری سوٹ میرے سائز کا مل سکا۔ چنانچہ میں نے چار عدد تھری پیس سوٹ ایک ڈز سوٹ اور قیضوں کا کپڑا خرید کر اسی دکان سے ارجنٹ سلوانے کا آرڈر دیا۔ بوٹ میرے سائز کے بڑی مشکل سے ملے۔ پاکستان میں طے شدہ پروگرام کے مطابق اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں قیام کرنا اور مختلف کلبوں خصوصاً جیم خانہ اور سرور کلب میں بھی جانا تھا، لہذا وہاں کے ماحول کے مطابق مجھے کپڑے خریدنے تھے۔

ہم نے دو دن دہلی میں گھوم پھر کر گزارے اور نئی دہلی اور پرانی دہلی کے مختلف رہائشی علاقے دیکھے۔ میرے ساتھیوں کو پرانی دہلی میں اور مجھے نئی دہلی میں قیام کرنا تھا۔ پاکستان سے آنے والے کانٹیکٹ سے ملنے کی جگہ بھی دیکھیں اور وہاں سے نکلنے کے مختلف راستے بھی ذہن نشین کر لئے۔

دو روز بعد میں نے ساتھیوں کو مختلف اوقات میں کاروشن ہوٹل میں چیک ان ہونے کا کہا اور خود دوپہی ہوٹل کا رخ کیا۔ نیو راشا ہوٹل پاکستان سے ہی ہمارے قیام کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ نئی دہلی میں اس ہوٹل کے قریب ہی فائیو اسٹار شو کا اور اکبر ہوٹل تھے اور بھارتی بری، بحری اور ہوائی افواج کے ہیڈ کوارٹر بھی اسی علاقے میں تھے۔

ہم سب مختلف اوقات میں پاکستانی سفارت خانے کے سامنے سے بھی گزرے۔ پاکستانی سفارت خانہ اسلامی طرز تعمیر کا بہت اچھا نمونہ تھا تاکہ ہم ان دنوں بالکل اجزا ہوا تھا۔ لوگوں نے پتھر مارا کر بیشتر شیشے وغیرہ توڑ دیئے تھے۔ سفارت خانہ بند تھا اور پولیس کا ایک ہی سپاہی نگری ساہبرہ دے رہا تھا۔ ہمیں اب انتظار تھا اپنے کانٹیکٹ کا جسے ہماری روانگی کے دو دن بعد ملنا تھا اور ڈاک دینی تھی جس میں مزید ہدایات ہمیں ملتی تھیں۔ اس دوران ہمیں اپنا ہوم ورک کرنا تھا۔

میں نے اپنے دو ساتھیوں کو جھانسی بھیجا۔ جھانسی سے پہلا اسٹیشن باہینا ہے۔ ان دو اسٹیشنوں کے درمیان بھارت کی فرسٹ آرمرڈ کور کا ایک ٹینک ڈویژن اور نمبر 10 آرمرڈ بریگیڈ میں تھی۔ میرے ساتھیوں کے ذمے یہ کام تھا کہ جھانسی میں کوئی معقول ہوٹل دیکھیں اور معلوم کریں کہ کور ہیڈ کوارٹر تک جانے کے لئے ٹیکسی یا کوئی سواری مل سکتی ہے۔ جھانسی کا پرانا قلعہ بھی فوج کے زیر استعمال تھا۔ اس کے متعلق بھی اگر کوئی مفید اطلاع مل سکتی، تو حاصل کریں۔

میں نے اپنے دوسرے دو ساتھیوں کو اگر بھیجا کہ وہاں پر فوجی چھاؤنی کے متعلق جو بھی معلومات مل سکتی ہوں وہ حاصل کریں۔ خود اپنے لئے میں نے آرمی، نیول اور ایئر ہیڈ کوارٹر میں داخل ہونے کا راستہ ڈھونڈنا تھا۔ یہ ہمارا ایک طرح سے ہوم ورک تھا جسے ہم نے کانٹیکٹ کے آنے سے پہلے مکمل کرنا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے ہمدرد دوستوں کے ٹھکانے بھی دیکھنے تھے تاکہ بوقت ضرورت ان ٹھکانوں کو تلاش نہ کرنا پڑے۔ غرضیکہ دلی میں دو دن کے قیام کے بعد ہم نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ اپنے ساتھیوں کو میں نے چار دن کے اندر واپس آنے کا کہا تھا۔ چوتھے روز مقررہ وقت پر ہمیں کنات سرکس کے ایک ریستورنٹ میں طے شدہ وقت پر ملنا تھا۔

میں نے اپنی اکثر شاہین اشوکا ہوٹل میں گزارنی شروع کر دیں۔ وہاں شام گہری ہوتی، ہلکی وغیرہ ہلکی لوگ آنا شروع کر دیتے ہیں۔ گرمی کی وجہ سے ان مکمل ایئر کنڈیشنڈ ہوٹلوں میں گہما گہمی بڑھ جاتی تھی اور میں نے ان ہی لوگوں میں سے اپنے مطلب کے لوگ تلاش کرنے تھے۔

میرا کام اونچی سو سائٹی کے ان ہوٹلوں میں کسی سے جان بوجھ کر ٹکرا جانا اور آئی ایم سواری کہہ کر تعارف حاصل کرنا اور پھر ان کی ڈھوت پر ان ہی لوگوں میں سے اپنے مطلب کے لوگ تلاش کرنا تھا۔

یہاں اس طور سے راہ رسم پیدا کرنا ایک معمولی بات تھی۔ خاص طور پر جبکہ وہ مخمور ہوں۔ ایک آدھ گھنٹے میں ہی بالکل اجنبی لوگ خاصے فری ہو جاتے ہیں۔ میں نے وہاں خود کو کھلی جانے کا ایک بیو پاری ظاہر کیا جو کلکتہ سے چائے، مہینی منگواتا تھا اور پانی کپہنی میں بلینڈ کر کے چائے کے بیو پاریوں کو پینچتا تھا۔ میں نے چائے کی بلینڈنگ چٹا کا ٹنگ میں ملازمت کے دوران سیکھی تھی۔ بلینڈنگ کا مطلب ہے مختلف اقسام کی چائے کی درجہ بندی کر کے اور مختلف وزن میں انہیں ملا کر چائے کا ایک مخصوص معیار تیار کرنا۔ لیٹن، بروک ہاٹڈ اور اصفہانی اسی طرح اپنے بلینڈ تیار کرتے ہیں۔ دارجلنگ کی اور نیچ پیکو چائے کا شمار دنیا کی بہترین چائے میں ہوتا ہے۔ یہاں پر میرا کام یہ تھا کہ ایک برانڈ اپنی چائے کا بناؤں اور اسے تقریباً نصف قیمت پر چھاؤنیوں میں فروخت کروں۔ چھاؤنیوں میں فوجی جوانوں اور NCO's کے لئے لنگر کی چائے کھلی جانے ہی استعمال کی جاتی ہے۔ ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں (ADOS) یعنی اسٹنٹ ڈائریکٹر آف سپلائی تک رسائی کی صورت میں، میں پورے ڈویژن کے لنگروں کے لئے چائے کی فروخت کا آرڈر لے سکتا تھا۔ اسی طرح بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بھی اس کے پلائی کے تحت مجھے آرڈر مل سکتے تھے اور اسی طرح میری رسائی افسران اعلیٰ تک ہو سکتی تھی۔

اشوکا اور اکبر ہوٹل میں، میں کسی ایسے موقع کی تلاش میں جاتا تھا کہ کسی اعلیٰ فوجی افسر تک رسائی ہو جائے اور اس طرح چھاؤنیوں میں چائے کے آرڈر حاصل کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے اس اعلیٰ سو سائٹی میں افسران اعلیٰ بننے تک شوہر کا دل اپنی بیوی سے بھر جاتا ہے اور بیوی ڈھلتی جوانی کی آخری بہاریں لوٹنے کے لئے بے تاب ہوتی ہے۔ اعلیٰ ہندو معاشرے اور خصوصاً فوج میں مغربی اثرات اتنے بڑھ چکے تھے کہ اکثر جوڑے آتے تو اکٹھے تھے لیکن واپس الگ الگ جاتے تھے اور ان کی یہی کمزوری میری کامیابی کا راستہ آسان کرنے والی تھی۔

اس دوران میرے چاروں ساتھی بھی واپس لوٹ آئے اور نہایت مفید معلومات لائے۔ اگرچہ چھاؤنی تقریباً خالی تھی اور چھاؤنی میں مقیم بیشتر فوجی مغربی پاکستان کی سرحد پر گئے ہوئے تھے۔ جاٹ رجمنٹ اور سکھ رجمنٹ کی دو دو ہٹالین موجود تھیں۔ ادھر جھانسی اور باہینا کے درمیان آرمرڈ ڈویژن کے علاقے میں کسی سوہیلین کا داخلہ کافی خطرناک تھا اور مکمل تحقیق اور تلاش کے بعد ہی کسی کو اس علاقے میں جانے کی اجازت تھی۔ جھانسی کے قلعے میں ایڈویشن ڈپو تھا اور وہاں سیکورٹی بہت سخت تھی۔ بہر حال ہم فامیس دیکھنے اور محض سیر و تفریح کے لئے تو ڈٹن ملک میں آئے نہیں تھے۔ اپنے مشن کی تکمیل میں جو بھی رکاوٹیں تھیں ہمیں انہیں بہر حال دور کرنا تھا۔

اب ہم اپنے کانٹیکٹ کے منتظر تھے۔ مقررہ تاریخ کی رات میں مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ مجھے سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ کانٹیکٹ سے صرف میں ہی ملوں اور زیادہ سے زیادہ 15 منٹ تک مقررہ جگہ پر انتظار کروں۔ اگر کانٹیکٹ نہ آئے تو فوراً وہاں سے غائب ہو جاؤں اور ٹھیک ایک ہفتے بعد اسی جگہ اور اسی وقت پھر 15 منٹ انتظار کروں۔

غازی

میں طے شدہ وقت سے قریب 10 منٹ پہلے اس مقررہ جگہ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ جگہ خاصی گنجان تھی۔ میں نے قریب ہی ایک بک اسٹال پر مختلف رسالے دیکھنے شروع کئے۔ مقررہ وقت سے 5 منٹ پہلے ہی مجھے کانٹیک دکھائی دیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی پہچان اور سب خیریت کے لئے لباس پر مخصوص رنگ کے رومال لگائے ہوئے تھے۔ دوسری چیکنگ کے لئے نظریں ملنے کے بعد مجھے اپنے دائیں بازو کو ایک مخصوص حرکت دینی تھی جس کے جواب میں کانٹیک نے بھی ایک مخصوص حرکت کرنی تھی۔ دونوں طرف سے مثبت حرکات کا مطلب ”سب اچھا“ تھا جبکہ کسی خطرے کی صورت میں ہمیں رومالوں کو ہاتھ میں پکڑنا اور دوسری قسم کی جسمانی حرکات کرنا تھیں۔ میں ان طریقوں کی وضاحت اس لئے نہیں کروں گا کہ بہت ممکن ہے کہ اب بھی یہی طریقے رائج ہوں اور یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ میں نے ایک رسالہ خرید اور واپس چل پڑا۔ کانٹیک مجھ سے چند قدم پیچھے تھا۔ آگے ایک فروٹ کی دکان تھی۔ میں نے مختلف فروٹ دیکھنے اور دام پوچھنے شروع کئے۔ کانٹیک میرے بالکل قریب آن کھڑا ہوا اور اس نے بھی پھلوں کے دام پوچھنا شروع کئے۔ میں پکڑے کا ایک ٹھیلہ امرا لے گیا تھا (ان دنوں پلاسٹک کے شاپرز نہیں ہوتے تھے) میں نے پہلے دو کلو آم لئے، دکاندار نے کانٹیک کے لفافے میں ڈال کر مجھے دیئے جو میں نے تھیلے میں ڈال لئے۔ میں اب بائیں ہاتھ میں ٹھیلہ پکڑے ہوئے تھا۔ (کانٹیک میری بائیں جانب کھڑا تھا) میں نے پیچی دکھانے کو کہا۔ جوہی دکاندار پیچی اٹھا لے کر واپس گھوما، کانٹیک نے ایک پیکٹ انتہائی تیزی اور پھرتی سے میرے تھیلے میں ڈال دیا۔ میں نے کچھ لمبی لی اور دام دے کر واپس چل پڑا۔ کانٹیک نے بھی یقیناً مرے جانے کے بعد کچھ فروٹ ضرور خریدا ہوگا۔ قریب ہی سے میں ایک ٹمپو میں سوار ہو گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد ٹمپو چھوڑا اور بس پکڑ لی۔ پھر بس چھوڑی اور دوبارہ ٹمپو میں بیٹھ گیا اور اپنی رہائش تک پہنچنے پہنچنے میں نے تقریباً تین گنا زیادہ سفر کیا تاکہ اگر میری نگرانی ہو رہی ہو تو وہ بھٹک جائیں۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے دروازہ اچھی طرح سے بند کر لیا اور پیکٹ کھولا۔ پیکٹ میں 5 صفحات تھے جن کی ایک طرف ہندی میں لکھا ہوا تھا اور 10 ہزار بھارتی روپے تھے۔ میں نے موم بتی جلائی اور صفحات کے سادہ اطراف کو موم بتی سے گرمی پہنچائی۔ آہستہ آہستہ نارنجی رنگ کے حروف ابجد نے شروع ہوئے اور 15 منٹ میں سارے صفحات کی خفیہ روشنائی سے لکھی عبارت نمایاں ہو گئی۔ یہ 5 صفحات ہم پانچوں کے لئے تھے۔ خیریت سے بارڈر کراس کرنے اور دہلی پہنچنے کی مبارک باد دی گئی تھی، حوصلے بڑھانے کے لئے الفاظ کی چھکی تھی اور مجھے ایک نئے مشن کو سب پر فوقیت دے کر فوری طور پر مکمل کرنے کا حکم ملا تھا۔ ڈاک ملنے کی رسید اور حالات کا سرسری جائزہ اور اب تک کے کام کو لکھنے کی ہدایت تھی۔ میں نے جواب لکھنے کے لئے پہلے سے تیار کردہ خفیہ روشنائی سے دو صفحات لکھے اور دو ورقوں کی دوسری جانب انگلش نظموں کے کچھ حصے لکھے۔ خفیہ روشنائی اب کوئی بھی نہیں اور آج کل تو Micro Films کے ذریعے کاسٹ پین کے سرے جتنی جگہ میں چاہیں سے زائد صفحات منتقل کئے جاسکتے ہیں۔ جو خفیہ روشنائی ہم استعمال کرتے تھے وہ بیاز یا ہین یا لیوم کا پانی ہوتا تھا۔ اس سے کانٹیک پر لکھا جائے تو سو کھٹے کے بعد کانٹیک پر کوئی نشان نہیں رہتا اور جب اسی کانٹیک کو گرمی پہنچائی جاتی تو لکھے ہوئے الفاظ نمایاں ہو جاتے ہیں۔

مجھے اگلے دن کانٹیک کو ایک دوسری جگہ 10 بجے ملانا اور اپنا پیکٹ اس کے حوالے کرنا تھا۔ دوسرے دن ٹھیک 10 بجے ہم مقررہ جگہ پر ملے اور میں نے اپنا پیکٹ اس کے حوالے کر دیا۔ ساتھیوں کے لئے خط میں نے کانٹیک کے واپس جانے کے بعد دیئے۔ ہم سب اپنے وطن سے اس پہلے رابطے پر بہت خوش تھے۔ ان پانچ دنوں نے ہمارے حوصلے اور بڑھادیئے تھے۔ ہم نے پھر ایک بار اپنے مشن کی تکمیل کے لئے تجدید عہد کیا۔ میں واپس اپنے ہوٹل آ گیا اور نئے مشن کی تکمیل کیلئے تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ میں نے لیٹن گرین لیبل اور بروک بائزر لیبل کے چھ چھٹن لئے اور رات کو ان کی پلیننگ کی اور انہیں اندازاً آدھا کلو کے پیکٹوں میں باندھ کر سلسلوں ٹیپ سے بند کر دیا۔ میں مشن کی عملی تکمیل کیلئے دہلی سے باہر جا رہا تھا اور رات بھر مختلف تریک میسوں کو چتا رہا۔ دوسرے دن میں نے ساتھیوں کو ابھار دیا۔ ٹرانس میٹرز جو ان کے آگرہ اور جھانسی جانے کے دوران میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا انہیں واپس کیا۔ ہوٹل واپس آ کر میں جلد ہی گہری نیند سو گیا..... اگلے روز صبح مجھے روانہ ہو جانا تھا۔

میں نے کانٹیک کو ایک نئی جگہ اور بعد گوہر کا وقت دیا اور بارہویں روز ملنے کو کہا۔ میں چاہتا تھا کہ ان 12 دنوں میں اپنی نئی ذمہ داریوں کی مفصل رپورٹ بنا کر بھیج دوں۔ اپنی غیر موجودگی میں، میں نے ٹرانس میٹروالے ساتھی کو نائب مقرر کیا۔ یہ چاروں مختلف ہوٹلوں میں بٹھیرے تھے اور پھر میں نے انہیں کارونیش میں منتقل کر دیا تھا، اس لئے انہیں ہوٹل کے باہر ایک دوسرے سے رابطہ کرنے کی بھی اجازت دے دی تھی۔

آپ نے محسوس کیا، ہوگا کہ مجھے جو ہدایات پاکستان سے روانگی کے وقت دی گئی تھیں میں نے ان میں کچھ ردوبدل کر دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں بیچہ کر بھارت کے اندرونی حالات کا صحیح اندازہ بالکل نہیں ہو سکتا تھا۔ 71ء میں سابق مشرقی پاکستان میں بھارت کی ناقابل یقین کامیابی نے انہیں کچھ زیادہ ہی خود اعتماد بنا دیا تھا۔ دہلی میں چند روزہ قیام کے دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ وہاں سیکورٹی زیادہ سخت نہیں تھی۔ یہ ایک کاسمو پولیٹن شہر ہے اور یہاں بھارت کے ہر علاقے کے لوگ رہتے ہیں۔ جن سے انہیں خطرہ ہو سکتا تھا انہیں وہ شکست دے کر تقریباً مردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ مختصر یہ عرض کروں کہ میں نے حالات کو دیکھتے ہوئے ہدایات سے ہٹ کر کچھ تبدیلیاں کی تھیں۔ یہ تبدیلیاں محض رہائش اور بارڈر کے کانٹیک کو واپس بھیجنے تک تھیں کیونکہ بارڈر کراس کرنے کے بعد مشن کی کامیابی اور ساتھیوں کا تحفظ میری ذمہ داری تھی۔

مجھے احمد نگر جانا تھا۔ پاکستان میں برہننگ میں بھی بنایا گیا تھا کہ احمد نگر بھارت آؤ اور یعنی ٹینکوں کی ٹریڈنگ کا مرکز ہے۔ اس ٹریڈنگ سینٹر میں آرٹوڈ کے جوانوں کو نہ صرف موجودہ ٹینکوں اور ان کی گنوں کے چلانے کی مشق کرائی جاتی ہے بلکہ روس سے درآمد شدہ ٹی۔ سیریز کے نئے ٹینکوں کا استعمال بھی سکھایا جاتا ہے۔

شادیوں میں ہوائی فائرنگ کرنے والے ماہر نشانچی ہرگز نہیں ہو سکتے۔ دوران جنگ سامنے سے آتی ہوئی ہزاروں لاکھوں گولیوں، بھوں، گرد و غبار، دھواں، رات یا دن کی تیز یا بغیر پانی، کچھڑ اور بارش میں اسلحہ کا ٹھیک ٹھیک استعمال اور نشانہ لگانا، اسلحہ کو کھولنا، صاف کرنا اور پھر جوڑ کر ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانے والا ہی ماہر کہا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو ماننے سے میں کبھی انکار نہیں کروں گا کہ بھارتی افواج اگر تربیت میں ہم سے بہتر نہیں تو کتنے بھی نہیں۔ لیکن برصغیر پر مسلمانوں کی ہزار سالہ حکمرانی نے انہیں کم ہمت بنا دیا تھا۔ 65ء کی جنگ میں عددی لحاظ سے بہت کم پاکستانی افواج نے ان کے چھکے چھڑا دیئے تھے لیکن 71ء کی جنگ میں پاکستان کو دو ٹکڑے کر کے 90 ہزار پاکستانی افواج کو قیدی بنا کر ان کے مردہ حوصلوں میں پھر جان پڑ گئی تھی اور اٹھند بھارت کا خواب وہ پھر دیکھنے لگ گئے تھے۔

میرا مشن یہ تھا کہ میں احمد نگر کے ٹریڈنگ سینٹر میں جا کر نئے درآمدی ٹینکوں کے متعلق مکمل معلومات حاصل کروں کہ آرٹوڈ کی کون کون سی رجمنٹ یہاں ٹریڈنگ حاصل کر رہی ہے اور کن ٹینکوں پر۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کروں کہ ٹریڈنگ مکمل کرنے کے بعد یہ رجمنٹس کہاں جائیں گی اور کن انجینٹری ڈویژنز کے ساتھ ان کو شامل کیا جائے گا۔

مجھے پوری طرح احساس تھا کہ یہ معلومات پاکستان کیلئے کتنی اہم ہیں۔ بھارت کے پاس ملک میں ساختہ وجہیت نامی ٹینک بھی تھے جو بہت وزنی اور نقل و حرکت میں سست تھے۔ 65ء میں بھارتی کمانڈر ان چیف جنرل چوہدری کو ان ٹینکوں پر بہت غور و رکھا اور انہیں ”سیاہ تھی“ کا نام دیا گیا تھا۔ دیکھنے میں یہ پھاڑ جیسا ٹینک ”ٹیٹی ہوئی بلخ“ ثابت ہوا۔ بھارت کے پاس ان کے علاوہ فرانسیسی ساختہ AMX-13، روسی PT-76 اور روسی ٹی۔ سیریز کے بہتر کارکردگی کے ٹینک تھے۔

ٹریڈنگ کے بعد ان ٹینکوں کی رجمنٹس کو ہند پاک بارڈر پر تعینات کیا جانا تھا۔ پاکستان کے لئے ان ٹینکوں کی کارکردگی سے متعلق معلومات اور سرحد پر ان کی تعیناتی کی جگہ سے آگاہی بہت ضروری تھی۔ مثلاً اگر ٹی۔57 بھارتی ٹینک کے سامنے ہم اپنے جنگ عظیم دوئم کے فرسودہ ٹریننگ ٹینک تو سوائے اپنے ٹینکوں کی تباہی کے کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ اس وقت ٹی۔57 کے سامنے پاکستانی کامریک سے ملے ہوئے ”M“ سیریز کے نئے ٹینک اور ٹینٹن ٹینک لانے تھے اور اسی وجہ سے مجھے یہ اہم مشن سونپا گیا تھا۔

احمد نگر، بمبئی سے تقریباً پانچ سو کلو میٹر پہلے گوداوری دریا کے قریب بالکل الگ تھلگ جگہ پر واقع ہے۔ اس کے گرد و نواح میں بھی کوئی بڑی صنعت یا بڑا شہر نہیں ہے۔ گوداوری دریا کی ایک نہر احمد نگر کے بالکل قریب سے گزرتی ہے۔ یہ علاقہ ٹینکوں کی تربیت کے لئے بہت موزوں ہے۔ یہاں اونچے نیچے ٹیلے، ریت، کچھڑ اور پانی کی موجودگی سے ٹینکوں کے استعمال کی ہر طرح کی تربیت ہو سکتی ہے۔

قریب بیس بائیس گھنٹے کے سفر کے بعد میں احمد نگر پہنچا اور ایک ٹھیک ٹھاک ہوٹل میں کمرہ لے لیا۔ میرا اہم مسلمان ممنوعہ حدود میں داخل ہونا تھا جہاں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر اور ڈویژن ہیڈ کوارٹر تھے۔ ٹریڈنگ کے علاقے میں داخل ہونا اول تو فضول تھا اور دوسرے تقریباً ناممکن۔ میں نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر اور پھر اس کے توسط سے ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں پہنچنے کے لئے اپنی پلیننگ ڈچانے کا سہارا لیا اور دونوں جگہوں پر IC-2 اور ADOS تک پہنچ گیا اور ٹکر کیلئے اپنی چائے پیش کی۔ میں نے انہیں اپنا بمبئی کانٹیکوٹا پارٹس کا ایڈریس (بزنس کارڈ میں نے دہلی سے ہی بنوائے تھے) دیا اور احمد نگر میں ہوٹل میں رہائش کا بھی بتا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری چائے کی کوائٹی اور قیمت ان کے لئے باعث کیش ہوگی۔

ان دنوں ہیڈ کوارٹر میں جاتے ہوئے میں نے ڈویژن اور رجمنٹ کے نشانات کی شناخت کی۔ وہ سب تقریباً ایک ہی ڈویژن اور رجمنٹ کے لئے تھے جن کا وہ ہیڈ کوارٹر تھا اور مجھے تلاش تھی ٹریڈنگ لینے والوں کی۔

شام کو میں شہر میں گھومنے نکل گیا۔ میں نے سائیکل رکشہ لے لیا اور سارا شہر گھمانے کا کہا۔ ٹریڈنگ سینٹر کی جانب جہاں شہر کی حدود ختم ہوتی ہیں وہاں میں نے چھادنی سے باہر شراب خانے دیکھے اور فوجی جوانوں کو اندر جاتے اور باہر نکلنے دیکھا۔ میں ایک شراب خانے میں داخل ہوا اور ٹریڈنگ کے دوران چونکہ مجھے بھارت کی سب رجمنٹوں کے نشانات اذیر کرائے گئے تھے اس لئے میں نے فوراً پہچان لیا کہ یہ سب مختلف ٹینک رجمنٹوں کے جوان تھے۔

بھارت میں اس وقت فوجیوں کو ہر روز 2 اونس شراب راشن میں مفت ملتی تھی۔ ظاہر ہے دو اونس شراب سے ان کا نشہ پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے چھادنی کے گرد شراب خانے بنے ہوئے تھے جہاں دسی شراب ملتی تھی اور وہیں پر فوجی اپنی بقیہ ضرورت پوری کرتے تھے۔ میں نے ان شراب کے نشے میں جھومتے فوجیوں سے اپنے مطلب کی باتیں اگلوٹانے کا منصوبہ بنایا اور واپس ہوٹل لوٹ آیا۔

اگلے دن میں پھر اے ڈی او اور آئی سی کے دفاتر میں گیا۔ میری چائے کے نمونے ابھی وہیں پڑے تھے۔ دونوں جگہوں سے مجھے کہا گیا کہ ایک ہفتے کے اندر وہ فیصلہ کریں گے کہ میری چائے خریدی جائے یا نہیں۔ اور اگر فیصلہ میرے حق میں ہو گیا تو مجھے پلائی جاری رکھنے کی ضمانت کے طور پر زر بیعانہ بھی جمع کروانا پڑے گا۔ اور میرے ساتھ باقاعدہ معاہدہ کیا جائے گا کہ کب سے میں پلائی شروع کروں۔ دفتر کے کلرکوں وغیرہ کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں ADOS اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں (یہ بریگیڈ وہاں کے ڈویژن کے تحت نہیں تھا) IC-2 اور ایڈ جوائسٹ سے رابطہ بڑھانا یوں کہہ لیجئے کہ انہیں خوش کرنا ہوگا۔

ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں لقب

میں نے اے ڈی او کے دفتر کے ایک ذرا زیادہ ہی کھنڈر سے قسم کے کلرک کو شام کو اپنے ہوٹل میں گپ شپ کرنے کے علاوہ خوش کرنے کے حوالے سے بات چیت کرنے کی دعوت دی۔ اس نے ہوٹل میں آنے سے معذرت کر لی کیونکہ شہر میں کئی قبہ خانے ہونے کی وجہ سے کئی ہوٹل فوجیوں کے لئے علاقہ ممنوع قرار دیئے گئے تھے اور F.I.U. اور ملٹری پولیس والے فوجیوں کو ان ممنوعہ علاقوں سے پکڑنے کے لئے گھومتے پھرتے تھے اور ایک فوجی کلرک کو شہر کے ایک ہوٹل میں ایک اجنبی سولین کے ساتھ دیکھ کر وہ شک کر سکتے تھے۔ میں نے اسے کہا کہ پھر چھادنی کے باہر شراب خانوں میں سے کسی ایک پر مل لے۔ وہ مان گیا اور مجھے ایک شراب خانے کی لوکیشن سمجھائی کہ وہاں 8 بجے شام ملے گا۔ اسے دعوت دینے سے میرا ایک مقصد حل ہو گیا کہ میں ان شراب خانوں میں اجنبی بن کر نہ جاؤں بلکہ کوئی فوجی بھی ہمراہ ہو۔ ایک بار وہاں متعارف ہو گیا تو پھر وہاں دوسروں سے اپنے مطلب کی باتیں اگلوٹانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوگی۔

شام پونے آٹھ سے بھی پہلے میں وہاں پہنچ گیا اور باہر ٹیلے لگا۔ دروازے سے اندر دیکھا تو وہ پہلے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور اس کی میز پر پہنچ گیا۔ اس نے پرتپاک غیر مقدم کیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ آرڈر کرے میں نے وہاں پر مہیا سب سے اچھی شراب کی پوری بوتل لانے کو کہا۔ چند لمحوں میں اس نے زہی سا احتجاج کیا جس پر میں نے کہا کہ تم فوجی، ملازم پیشہ اور قلیل تنخواہ پانے والے ہو، جبکہ میں کاروباری آدمی ہوں۔ دوران سے نوشی اس کے دو تین واقف کار بھی آگئے اور انہیں بھی میں نے اپنی ٹیبل پر بلا لیا۔ شراب خانے کے اس ہال میں مختلف ٹینک رجمنٹوں کے جوان اور NCO موجود تھے اور بہت نفل غپاڑا کئے ہوئے تھے۔ مجھے ایسے ہی ماحول کی تلاش تھی۔ میں خاصا چوکنا تھا لیکن اس رات سوائے ادھر ادھر کی باتوں اور ہنسنے ہنسانے کے کوئی بات نہ کی۔ وہاں پر معلوم ہوا کہ یہ سب سے معقول شراب خانہ ہے اور تمام شراب خانے رات بارہ بجے لازمی طور پر بند ہو جاتے ہیں۔ کھانے کے لئے بھی سب کی پسند کا آرڈر میں نے دیا اور جب ہم اٹھے تو وہ 3 بوتلیں ڈکار چکے تھے۔

اکادار کئے آ جا رہے تھے۔ وہ اپنی موج تریگ میں چھادنی کی طرف چلے گئے جبکہ میں نے ایک رکشہ پر ہوٹل کی راہ لی۔ وہاں کا ماحول دیکھ کر میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اگلی شام سے میں اپنے کام کا آغاز کروں گا۔

اگلی شام میں 7 بجے ہی وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت بھی شراب خانے میں خاصے گا ہک تھے۔ گزشتہ رات کی بڑی بپ کی وجہ سے وہیں نے بڑی خوش اخلاقی سے مجھے خالی ٹیبل پر لاٹھا یا اور اسی شراب کی بوتل لے آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں گلاس ہاتھ میں تھامے اٹھا اور ایک ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے جان بوجھ کر لڑکھڑایا اور گلاس ایک فوجی پرائیڈل دیا۔ اس ٹیبل پر پانچ فوجی بیٹھے تھے۔ وہ مجھے گھورنے لگے، میں نے معذرت کی، مسکرایا اور پھر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولیں میں نے کہا کہ بمبئی سے آیا ہوں آپ ہی کی چھادنی میں ADOS سے کاروباری سلسلے میں مل چکا ہوں۔ آپ کا مہمان ہوں لیکن اب آپ پانچوں میرے مہمان ہیں۔ شرابی انداز میں، میں نے میرے کو کہا کہ میری ٹیبل سے میری بوتل اور دو اور بوتلیں اسی ٹیبل پر لے آئے۔

ہر جگہ پر نچلے درجے کے رینک کے فوجی اور جوان عموماً بہت محدود و سوچ رکھتے ہیں اور پھر جب ADOS جو کہ لیٹننٹ کرنل کے عہدے کا ہوتا ہے، سے ملنے والے کاروباری فیض ایسے رینکس میں بے تکلفی سے پیشہ جاتے تو وہ خاصے مودب ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے پہلے تو میرا مہمان بننے سے انکار کیا لیکن جب میں نے بے تکلفی سے انہیں ”یار۔ یار“ کہنا شروع کیا تو ان کی جھجک ختم ہو گئی اور دوستانہ ماحول پیدا ہو گیا اور تھوڑی دیر میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ میرے ساتھ ٹھٹھا مذاق کرنے لگے۔ میں نے نہایت ہوشیاری سے گفتگو کا رخ اپنے چائے کے کاروبار، بھارتی بنگال کی چائے اور پھر سابقہ مشرقی پاکستان سے چائے بھارت میں اسمگل ہونے کی طرف پھیرا۔

غازی

میں نے انہیں کہا کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ ہماری فوج نے پاکستانی فوج سے ڈھا کہ میں ہتھیار کیوں ڈالوائے اگر وہ پورے مشرقی پاکستان پر قبضہ کر لیتے تو اٹھند بھارت کا آدھا خواب بچ ہو جاتا اور ہمارے دیس کی سرحدوں میں وسعت بھی آجاتی۔ آپ 90 ہزار پاکستانی فوجیوں کو قیدی بنا کے لے آئے۔ نہ معلوم پاکستان انہیں واپس لے گیا نہیں، اب تو وہ آپ پر محض خوراک وغیرہ کا بوجھ بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ ہٹنے لگے۔ ان میں سے جو ذرا سمجھدار دکھائی دیتا تھا وہ بولا۔ ”صاحب ہم نقصان میں ہرگز نہیں بلکہ بہت فائدے میں ہیں۔ 90 ہزار پاکستانی فوجی ہماری قیدی ہیں۔ اس شکست سے باقی ماندہ مغربی پاکستان کی کمروٹ ہو چکی ہے اور آپ کو ہم بہت جلد دکھا دیں گے کہ وہ پاکستان بھی ہمارے قبضے میں آجائے گا۔ میں اجنا لے کر رہنے والا ہوں، فوج میں 9 سال سے ٹینک رجمنٹ میں ہوں ہم شرتا تھی ہیں اور پشاور کے رہنے والے ہیں۔ میرے سو گرگاشی پتا بھی فوجی تھے جو 65ء کی جنگ میں امر ہو گئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ پوربی (مشرقی) پاکستان کے مقابلے میں پچھی (مغربی) پاکستان کو فتح کرنا آسان ہے۔ اسلئے کہ پچھی پاکستان کے مغرب میں افغانستان ہمارا دوست ہے۔ آدھے سے زیادہ کشمیر پر ہمارا قبضہ ہے جہاں ہم بلندی پر ہیں۔ ہم نے اسی مقصد کے حصول کیلئے 65ء میں پچھی پاکستان میں جنگ لڑی تھی، کہ افغانستان ایک تک آگے بڑھ کر قبضہ کر لے گا اور اپنے بارڈر سے آگے بڑھ کر ہم گوجرانوالہ تک کا علاقہ فتح کر لیں گے۔ ادھر کشمیر سے ہماری فوجیں کجرات، میر پور اور مری کے راستے آگے بڑھ کر سارے پاکستان کا تیا پانچ کر دیں گی۔ پاکستان کی فوجیں بیک وقت تین محاذوں پر لڑنے کے قابل نہیں، اس کے مقابلے میں پوربی پاکستان میں دریاؤں کی بہتا اور درلدی علاقوں کی وجہ سے لڑنا اور فتح حاصل کرنا زیادہ مشکل ہے۔ پھر برابھی ہمارا ایسا دوست نہیں جو اس وقت ہماری مدد کرے۔ اب پوربی پاکستان میں پاکستانی فوجوں سے ہتھیار ڈالوا کر اور قیدی بنا کر ہم انہیں اپنے دیس میں لے آئے۔ پوربی پاکستان سے ہمارا فوجی معاہدہ ہے کہ وہ 20 سال تک 2 ڈویژن سے زیادہ فوج نہیں رکھے گا۔ ہمارے زیر احسان مجیب کی وہاں حکومت ہے۔ اب پچھی پاکستان کی فوج ہم سے لڑنے سے پہلے سو بارسو لے گی کہ بھارت کے علاقے میں 90 ہزار مسلح فوجی قیدی ہیں اور منقریب آپ کو ہم ایک اور بڑی فتح کی خبر دیں گے۔“

شراب کے نشے میں اس نے خاصی واہی تباہی بکی اور میں سوچ رہا تھا کہ محض چند ہزار غیر ملکی مسلمان فوجیوں کے بل بوتے پر ہزار سال تک حکومت کرنے والی قوم کو یہ ہزار سال غلام قوم کا فر دایسے بڑھ چڑھ کر لٹکا رہا ہے۔ اپنوں کی غداری کی وجہ سے ایک شکست نے ہماری ہزار سال فتوحات اور حکمرانی کی وہشت کو چور چور کر دیا تھا۔ جوش سے میرا خون تو اپنے لگا تھا کہ بول کو تو ذکر اس کے کڑے سے اسے جنم واصل کروں لیکن مصلحت اور حصول مقصد کی وجہ سے میں تا صرف خاموش رہا بلکہ اس کا ان بڑھکوں میں ساتھ بھی دتا رہا۔

بات اب جنگ کی طرف آچکی تھی تو میں نے پوچھا کہ مشرقی پاکستان کو جو ہمارے سو گرگاشی پتا کے کہنے کے مطابق فتح کرنا مشکل تھا تم نے اتنی آسانی سے کیوں فتح کر لیا۔ اس نے کہا کہ ”جس ملک کا صدر شرابی کبابی اور زانی ہو۔ جنگی عملاتے کا کرکنا ڈر بجائے جنگی چالیں سوچنے کے رقیہ ہو سئل ڈھا کہ میں رہائش پذیر لڑکیوں کو جبراً اٹھواتا ہوں اور جس کی وجہ سے دو درجن سے زائد لڑکیوں نے دو منزلہ چھت سے کود کر اپنا جانی خود کشی کی ہو۔ جس ملک میں جمہوریت نام کی کوئی چیز نہ ہو، اسے شکست نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا۔ وہ فوجی بڑھا دکھا اور جنگی معلومات پر خاصی دسترس رکھتا تھا۔ میں نے اس کی گفتگو کی بڑی تحریف کی، نشے میں ہونے کی وجہ سے اور ایک سو بیس سے اپنی تحریف سن کر وہ خوشی سے پھول گیا اور کہنے لگا کہ ہماری سرکار غیر ملکیوں سے جو صلہ لیتی ہے وہ خاصی چھان چھانک کر اور اپنے اولین مقصد (اٹھند بھارت) کے حصول کے لئے کارآمد جان کر لیتی ہے۔ روس ہمارا سچا دوست ہے۔ جنگ سے عین قبل اس نے ہمارے ساتھ دفاعی معاہدہ کیا۔ U.N.O میں کشمیر کے مسئلے کو ہیڈ ہو گیا۔ 62 میں چین کے ساتھ ہماری جنگ محض ہماری ایک چال تھی کہ امریکی اسلحہ مفت میں مل سکے۔ روس سے دوستی کے باوجود ہم نے صرف کسی ایک ملک سے اپنے ہتھیاروں کے حصول کی واہنگی نہیں رکھی۔ ہم نے برطانیہ، فرانس، پولینڈ اور یوگوسلاویہ سے بھی ہتھیار لئے۔ اس نے کہا کہ 65ء کی جنگ کے بعد روس نے ہمیں میزائل بوٹس دیں جو ہم نے فوراً ہی لے لیں۔ ویسی ہی میزائل بوٹس چین نے پاکستان کو دینی چاہیں جسے پاکستان نیوی کی اعلیٰ سطحی ٹیم نے لینے سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ ان میں انٹرو اور جو انوں کے رہائشی کمرے الگ الگ نہ تھے بلکہ ایک ساتھ تھے۔ اپنی روی میزائل بوٹس نے ہی پاکستان کے Destroyer خیر کے چند کھوں میں کڑے کر دیئے۔ فرانس AMX-13 کی گولہ پیکٹنے کی رینج 16 کلومیٹر ہے۔ PT-76 قسم کے پانی میں تیرنے والے ٹینک فرانس نے بھی بنائے ہیں لیکن پاکستان صرف ایک ملک امریکہ پر انحصار کرتا ہے اور امریکہ خود غاصب ہے۔ ریڈیٹو انڈین کے ملک پر اقوام یورپ نے قبضہ کیا اور پھر خانہ جنگی کے بعد مختلف 51 ریاستوں میں بٹ کر حکومت کرنے لگے اور ریڈیٹو انڈین کو Preservation تک محدود کر دیا اور آج ریڈیٹو انڈین صرف فلموں یا قومی تہواروں پر سیاہوں کا دل بہلاتے نظر آتے ہیں ہم نے اپنی دفاعی انڈسٹری لگانیں اور بحری جہاز، ہوائی جہاز اور ٹینک تک بنائے لگے۔ جبکہ پاکستان ایک چھپ تک نہ بنا سکا۔“

اس کی یہ سب باتیں خجروں کی طرح میرے سینے میں پوست ہو رہی تھیں لیکن میں خاموش تھا۔ وہ تو کامیابی اور شراب کے نشے میں بول رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھے آئینہ دکھا رہا ہے اور ان سطور میں وہی آئینہ میں قوم کو دکھانا چاہتا ہوں۔ ہم بھی وہی ہیں، دشمن بھی وہی ہے اور اس کے عزائم بھی وہی ہیں۔ پرتھوی اور اگنی میزائل اس کے جارحانہ عزائم کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ تو بڑا دلچسپ اور لالچ اور کام کی ذات پاک ہے جس نے اس آدھے پاکستان کو اپنی پناہ میں رکھا ہوا ہے ورنہ ہم نے تو اپنی بڑی بادی میں کوئی کسرت نہیں چھوڑی۔ میں ڈاکٹر عبدالقادر خان کو دعائیں دیتا ہوں جس نے وطن کی محبت میں انتھک محنت کر کے جان کی پروا کے بغیر اور راروں ڈالر کی پیشکش کو مسترد کر کے پاکستان کو ایٹمی طاقت بنا دیا ورنہ بھارت تو 74ء میں ایٹمی دھماکہ پاکستانی سرحدوں کے قریب کر چکا تھا۔ ہمارے نیوکلیر پاروں بننے کی وجہ سے ہی بھارت تلملا رہا ہے۔ ورنہ اس نے تو مغربی پاکستان کو بھی سابقہ مشرقی پاکستان کی طرح تر نوالہ سمجھ لیا تھا۔

اپنی طرف سے بھی چند سطور پیش کرتا ہوں۔ پاکستان جیسا معاشی طور پر ترقی یافتہ دیوالیہ ملک قرض لے لے کر جو معاشی کر رہا ہے کیا ہم اس کے متحمل ہو سکتے ہیں؟ حکومت جو گاڑیاں منگواتی ہے وہ مرسیڈز 550 اور بلٹ پروف ہوتی ہیں۔ کیا سوڈن کسی اور دنیا کا ملک ہے جہاں کا وزیر اعظم سائیکل پر فخر جاتا ہے۔ جس کی بیوی لوکل بسوں میں بیٹھ کر شاپنگ کرنے جاتی ہے۔ ویٹام کا آجھانی صدر ہو جی منہ کھڑاویں ہمیں کر غیر ملکی وفد سے ملتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتا تھا کیونکہ اس نے اپنی سال بھر کی تنخواہ ملکی خزانے کو دے دی تھی اور جو خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ وہ صدارتی محل کے باغ میں ایک جھونپڑا بنا کر اس میں رہائش پذیر تھا اس لئے کہ اس کا ملک صدارتی محل کے اخراجات پورے کرنے کا متحمل نہ تھا۔

اپنے ہمسایوں کی طرف ہی دیکھئے۔ تیل اور معدنی وسائل سے مالا مال ایران امریکہ اور یورپی ممالک کی پابندیوں کے باوجود تا صرف زندہ ہے بلکہ خوش حال بھی۔ میں نے خود سابق صدر اکبر ہاشمی رفسنجانی کو تہران کے ہاشیرین ہوٹل کی لابی میں دو تین ساتھیوں کے ہمراہ Snacks کھاتے دیکھا تھا اور مجھے اچھا لگتا تھا۔ ہوا کے تلو پلوپس نے ہوٹل کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور نہ ہی سیکورٹی کا کوئی فرد وہاں موجود تھا۔ ہوٹل کے باہر ایک سیاہ کار کھڑی تھی، مرسیڈز 200 جس پر ایران کے قومی اور صدارتی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ایک ڈرائیور تھا اور ایک باوردی فوجی غالباً ملٹری سیکورٹی۔ انٹریک رو کی گئی اور نہ کوئی اور حفاظتی بندوبست تھا۔ عام لوگوں کی طرح وہ ہوٹل آئے کھانا کھایا، بل ادا کیا اور واپس چلے گئے۔ تہران میں کئی شاہی محلات ہونے کے باوجود صدر مملکت ایک عام سے 4 کمروں کے مکان میں رہتا تھا۔

دوسری طرف بھارت میں دیکھئے۔ آزادی اور خودمختاری کے 50 سال گزرنے کے باوجود وہاں کوئی پرائم منسٹرا ہاؤس نہیں بنایا گیا۔ جواہر لعل نہرو، اندرا گاندھی، نئے گاندھی ایک عام سی پرائیویٹ کونپنی میں رہتے تھے۔ وہاں کوئی نیا پارلیمنٹ ہاؤس نہیں بنایا گیا۔ انگریزوں کے دور کا پارلیمنٹ ہاؤس ہی زیر استعمال ہے۔ نیا صدارتی محل بھی کوئی نہیں بنا۔ راشٹری جھون یعنی صدارتی رہائش گاہ انگریزوں کے دور کا انٹریک لاج ہے جو کسی طرح بھی لاہور کے گورنر ہاؤس اور کراچی کے سابق گورنر اور صدر کی رہائش گاہ سے بہتر نہیں۔

وہاں صدر ہو یا وزیر اعظم، غیر ملکی سربراہ ہو یا کوئی وی آئی پی، سب بھارت کی بنی ہوئی ماروٹی یا ہندوستان نام کی گاڑی میں سفر کرتے ہیں۔ وہاں سرکاری ٹریفک گزرتے وقت عوامی ٹریفک روکی نہیں جاتی۔ صرف ایک سوال جس کا جواب آپ کا دل اور ضمیر دے سکتا ہے۔ آزادی کے باون برسوں میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ اور بھارت نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ پاکستان کا ہر فرد غیر ملکی کا تیرہ ہزار روپے کا مقروض ہے۔ جبکہ 900 ملین کی آبادی والے ہمارے ہمسائے ملک بھارت کے افراد کے ذمے کتنا قرض ہے؟ خدا را اپنے گریبان میں جھانکتے جواب آپ کو خود مل جائے گا۔

اس حوالدار نے مجھے بتایا کہ وہ بی اے ہے اور منقریب اس کی ترقی ہونے والی ہے۔ اس کی جہز ناچ اور تارنخ سے واہنگی کی وجہ سے میں نے اس سے اپنے مطلب کی بات نہ پوچھنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اسی اثنا میں کل والے کلرک صاحب بھی تشریف لے آئے اور میں ان سے معذرت کر کے کل والے کلرک کے ساتھ جا بیٹھتا تاکہ ADOS کے کلرک کے ساتھ مجھے دیکھ کر اس حوالدار کو میرے متعلق اگر کوئی شک ہو تو وہ ختم ہو جائے۔ آج کی شام بھی مجھے بیکار جاتی دکھائی دی۔ اب تک میری اتنی ہی کامیابی تھی کہ اس شراب خانے میں، میں جانا پہچانا جاتا ہوں۔ اگلے دن میں نے ADOS کے دفتر میں کچھ وقت گزارا اور ہوٹل واپس لوٹ آیا۔ آج کی شام میرا ارادہ تھا کہ میں کسی دوسرے شراب خانے میں جاؤں۔ شام کے 6 بجے کے قریب میں رکشہ لے کر چل پڑا اور ایک دوسرے شراب خانے میں داخل ہو گیا۔

اس شراب خانے میں، میں نے فوجیوں کی خاصی تعداد دیکھی، سکھ ہو اور شراب پی رہا ہو تو اس سے کوئی بات اگلو مانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ پھر پنجابی زبان بھی ان کے قریب ہونے کا بڑا ذریعہ ہے۔ یہاں سستی قسم کی شراب مہیا تھی۔ میں نے اسی کی بوتل منگوائی۔ کوئی خالی میز تھی لہذا ایک ٹیبل پر جہاں 4 سکھ بیٹھے ہوئے پی رہے تھے میں نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پنجابی میں پوچھا کہ اگر اجازت ہو تو بیٹھ جاؤں۔ دو تین سکھ بیک وقت بولے، جم بیٹھو جی اور میں چند منٹوں میں ان کے ساتھ گھل مل گیا۔

پنجابی زبان نے ہمیں بہت جلد بے تکلف کر دیا۔ میں نے دو میز بوتلوں کا آرڈر دیا۔ انہوں نے بہت انکار کیا اور کہا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں لیکن میں نے دو بوتلوں کا آرڈر دے ہی دیا۔ میں نے مختصر آئینہ بتایا کہ میں یہی سب سے کس کام کے لئے یہاں آیا ہوں۔ ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتا دیا کہ میں پنجاب کی چو پڑا ٹیبل سے ہوں اور میری مادری زبان پنجابی ہے اور ہم دراصل لدھیانہ کے رہنے والے ہیں۔ درحقیقت میرا تہیال بھی تقسیم ہند سے قبل لدھیانہ میں رہتا تھا اور میں نے لدھیانہ کے محلوں اور سڑکوں کے نام یاد کر لئے تھے۔ یہی میں تو سب سے بہت ہی مخصوص اردو ناما ہندی بولنے میں چاہے وہ پنجابی ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ یہاں ٹھہرے پنجابی میں بات کر رہے تھے اور مجھے اپنے ہم زبانوں سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔

بس جی پھر کیا تھا، چاروں سکھ ”بے نونہال اور مست سری اکال“ ہو گئے۔ اب جو باتیں شروع ہوئیں تو میں نے ان کے گلاس ہالاب بھر دیئے۔ پانی ملائے بغیر سردار صاحبان انہیں ڈکار گئے۔ میں نے پھر گلاس بھرے، میری خواہش تھی کہ یہ جلد نشے میں ہو جائیں تو میں ان سے اپنے مقصد کی باتیں جان سکوں۔ جب انہیں اچھی خاصی چڑھ گئی تو میں نے کہا کہ ”آپ یہاں کتنے عرصے کی ٹریڈنگ کے لئے آئے ہیں؟“ ان میں سے دو کی وردیوں کے نشانوں سے معلوم ہوا کہ وہ دونوں ایک ہی رجمنٹ سے تھے۔ باقی دو مختلف رجمنٹوں سے تھے۔ ایک ہی رجمنٹ کے دو سکھوں نے کہا کہ ”وہ 3 ماہ کی ٹریڈنگ کیلئے آئے ہیں اور صرف 25 دن کے بعد ان کی ٹریڈنگ مکمل ہو جائے گی۔“ میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا کہ ”صرف 3 ماہ میں ٹینک چلانے کی ٹریڈنگ مکمل ہو جاتی ہے؟“ انہوں نے کہا کہ ”نہیں جی نئے رگروٹ کے لئے تو ٹریڈنگ بہت وقت لیتی ہے، ہم تو نئے ٹینکوں کی ٹریڈنگ حاصل کرنے آئے ہیں۔“ میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا کہ ”نئے ٹینکوں سے آپ کی مراد کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق تو ہمارے پاس رومی ٹینک ہیں۔“ وہ نشے میں جھومتے ہوئے کہنے لگا کہ ”بناو جی جیسے سوئٹروں کے ماڈل ہر سال بدلتے ہیں لیکن نام وہی رہتا ہے۔ اسی طرح سال دو سال بعد ہی قسم کے ٹینک بن جاتے ہیں۔“ میں نے کہا کہ ”ہمارے پاس تو رومی ٹینک ہیں۔“ وہ کہنے لگا ”جنگ ہمارے پاس ٹی سیریز کے ٹینک ہیں اور اب نئے ٹی سیریز کے ٹینک آئے ہیں، شراب کے نشے میں اس نے ٹی سیریز کے نئے ٹینکوں کے نمبر بھی بتا دیئے۔“ میں نے فوراً ہی یہ نمبر ذہن میں محفوظ کئے اور گفتگو جاری رکھتے ہوئے پوچھا کہ ”آپ کی ٹریڈنگ ختم کر کے اپنے رجمنٹ سینٹر میں جائیں گے یا چھٹی پر گھر جائیں گے،“ جواب آیا کہ ”پہلے رجمنٹ سینٹر میں جائیں گے اور پھر وہاں سے جہاں رجمنٹ Deploy ہوگی۔“

میں نے کہا کہ ”سردار جی میں چاہنے کا کاروباری آدمی ہوں۔ مجھے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں خود کو کبھی نشے میں چور ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ میرا کوئی سوال انہیں شک میں نہ ڈال دے۔ اسی کھ نے کہا ”مجھو لے بادشاہ، ہر انڈسٹری ڈویژن کے ساتھ ایک یا دو ٹینک رجمنٹس ہوتی ہیں۔ جس انڈسٹری ڈویژن کے ساتھ ہماری رجمنٹ منسلک ہے وہ فاضلکا ہیڈورکس کے قریب ہے۔“ اس نے مزید سمجھاتے ہوئے کہا کہ ”آٹومٹری والے پہلے ہمارا راستہ صاف کرتے ہیں اور پھر کبھی ہم ٹینک والے آگے اور انڈسٹری پیچھے اور کبھی انڈسٹری والے آگے اور ہم پیچھے، یوں دشمن کی صفوں میں گھس جاتے ہیں۔“

یوں میں نے باقی تینوں سے بھی خاصی اچھی معلومات حاصل کیں کہ T-57 کے علاوہ اسی سیریز کے جدید روسی ٹینک اور فرانس AMX-13 اور P.T-76 ٹینک بھی مغربی پاکستان کے بارڈر پر متعین انڈسٹری ڈویژن کے ساتھ منسلک ہیں۔ جو تعینات میں نے حاصل کیں۔ وہ بوجہ میں یہاں بیان نہیں کر سکتا۔ بہر حال بہت کارآمد معلومات حاصل ہوئیں۔ میں نے ان کے کھانے کا آرڈر دیا اور رات ساڑھے گیارہ بجے ہم اگلے روز پھر ملنے کا وعدہ کر کے اپنی اپنی راہ پر چل دیئے۔ میں نے ہوٹل پہنچ کر ان سب اہم اطلاعات کو اپنے کوڈ میں درج کر لیا۔ یہ میری پہلی کامیابی تھی اور میں بہت خوش تھا۔ اگلی شام مزید معلومات حاصل کرنے کا پروگرام بنا کے گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی پہلی مفصل رپورٹ ایسی سمجھوں کہ میرے سینئر خوشی سے اچھل پڑیں۔

اگلی صبح میں نے جب گزشتہ رات کی معلومات کا دوبارہ جائزہ لیا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ کامیابی بہت معمولی تھی۔ میں اب تک صرف 3 ٹینک رجمنٹوں کے متعلق جان رکھا تھا۔ اول تو مجھے ان شرابی سکھوں سے حاصل شدہ معلومات کا موازنہ کرنا تھا تاکہ میری رپورٹ شک و شبہ سے بالاتر ہو اور اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ مجھے نہ صرف ان رجمنٹوں کے متعلق معلومات حاصل کرنی تھیں جو 71ء کی جنگ کے بعد یہاں سے ٹریڈنگ حاصل کر کے جا چکی تھیں بلکہ ان تین رجمنٹوں کے علاوہ وہاں جو دوسری رجمنٹس ٹریڈنگ لے رہی تھیں، ان کے متعلق بھی مکمل جانکاری حاصل کرنی تھی۔ جب میں نے اپنے پورے مشن کا جائزہ لیا تو یہ معلومات بہت معمولی محسوس ہوئیں۔

احمد نگر میں زیر تربیت رجمنٹس صرف تین ماہ میں ٹریڈنگ مکمل کر کے واپس چلی جاتی تھیں۔ ان کی واپسی سے پہلے ہی نئی رجمنٹس کے جوان وہاں پہنچ جاتے تھے اور یہ سلسلہ 71ء کی جنگ کے بعد مسلسل جاری تھا۔ اس سلسلے کی کڑیاں شروع سے ملا کر ایک مفصل رپورٹ تیار کرنی تھی۔

بریگیڈ ہیڈ کوارٹر جو اس ٹریڈنگ کا ذمہ دار تھا، اس کے دفتر میں یا ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں یقیناً کوئی ایسی فائل ہوتی چاہئے تھی جس سے مجھے تمام معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ احمد نگر ایک طرح سے Transit Camp کی طرح تھا اور وہاں آنے والوں کی فائل یا معلومات مجھے اول دونوں ہیڈ کوارٹرز کے دفاتر سے، دو ٹیمپ کمانڈنٹ کے دفتر سے اور سوم لنگر سے ملنے کی امید تھی۔ میں نے ان تینوں ذرائع میں سے کب کمانڈنٹ کے دفتر کا انتخاب کیا کیونکہ ڈویژن اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بیسیوں دیگر کام ہوتے ہیں جبکہ کب کمانڈنٹ صرف وہاں آنے والوں کی رہائش، آمد، واپسی اور خوراک کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ میرے تجزیے کے مطابق مجھے اس دفتر سے معلومات سے بھری ایک مکمل فائل ملنے کی امید تھی۔

غازی

کیپ کماٹنٹ کے دفتر تک رسائی کیلئے میں نے ADOS کے کلرک کا انتخاب کیا۔ جب ایک بار فیصلہ کر لیا تو فوراً ہی تیار ہو کر ADOS کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ سیکورٹی اور پیکنگ کے مرحلے سے گزر کر میں اس کلرک بادشاہ کے پاس جا پہنچا۔ گزشتہ رات نہ ملنے کا عذر یہ کیا کہ طبیعت نامناسب تھی۔ ADOS کے دفتر میں چونکہ مقامی ٹھیکیدار ٹینڈر دینے، سپلائی اور رقم کی وصولی کیلئے اکثر آتے رہتے ہیں اور کلرک صاحبان سے دوسرے ٹینڈر دینے والوں کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہیں، اس لئے یہ دفتر غیر فوجی افراد سے بھرا ہوتا ہے۔ مجھ پر بھی کوئی شک نہیں کر سکتا تھا۔ چونکہ میں ظاہر آجائے کی فروخت کیلئے وہاں آیا تھا، لہذا متعلقہ کلرک سے دفتر کی اوقات میں ملنے اور رابطہ بڑھانے میں مجھے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ میں توقع کی تلاش میں تھا اور جلد ہی مجھے وہ موقع مل گیا، جب کھانے کے وقفے میں وہ مجھے کہیں لے گیا۔ وہاں ہم ایک الگ تھلگ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ میں نے اسے کہا کہ میں تم سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنی جانے یہاں بیٹھ گیا ہوں اور ہرگز مایوس واپس نہیں جانا چاہتا۔ تم نے مجھ سے پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ بغیر رابطہ بڑھانے اور افسران کو خوش کرنے کا تم نہیں ہو سکتا۔ مجھے کھل کر بتاؤ کہ یہاں کن کن کو خوش کرنا پڑے گا۔ وہ کہنے لگا کہ آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ جہاں ایک ہی چیز کی سپلائی کرنے والے کئی ہوں گے تو پھر وہاں افسران کی خوشنودی تو حاصل کرنا ہی ہوتی ہے یہاں پر ADOS اور DADOS کے علاوہ لنگر انچارج اور..... میں نے فوراً ہی لقمہ دیا کہ کیپ کماٹنٹ کو بھی خوش کرنا ہوگا۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے اسے کہا کہ یہ سب میں تمہارے ذمہ لگتا ہوں کہ مجھے لنگر انچارج اور کیپ کماٹنٹ سے ملوادو۔ اگر میں اپنی جانے یہاں فروخت کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کا سہرا تمہارے سر ہوگا اور تم بھی بہت فائدے میں رہو گے۔ یہ کہتے کہتے میں نے دو ہزار روپے چیکے سے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ وہ پہلے تو انکار کرتا رہا لیکن اس کا انکار محض رسمی تھا۔ میں نے ڈرا زور دیا تو اس نے وہ روپے جیب میں ڈال لئے۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ محض پیشگی ہے، تم میرا کام کرو اور میں تمہیں مستقل خوش کرتا رہوں گا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کے کہنے کے مطابق آپ کی جانے کی کوئی بہت اعلیٰ ہے اور قیمت کم ہے۔ اگر آپ کو جانے کی سپلائی کا آرڈر مل جائے تو آپ کو سپلائی برقرار رکھنے کیلئے لوگوں کو ہر 3 ماہ بعد خوش کرنا پڑے گا۔ اس طرح تو آپ کا منافع نقصان میں بدل جائے گا۔ میں ہنس پڑا اور کہا کہ یہ کاروباری راز ہے لیکن میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں آہستہ آہستہ اپنی جانے کی کوئی کم کرنا جاؤں گا اور غیر محسوس انداز میں یہ نقصان نفع میں بدل جائے گا۔ میں نے اسے کہا کہ میں ایک بڑے کاروباری خاندان یعنی چوہرا ٹیبل سے ہوں اور میں سمجھا ہوا ہوں کہ ہر کام میں فوری منافع کا نہ سوچو بلکہ اگر شروع میں کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑے تو اٹھاؤ کیونکہ یہی نقصان بعد میں بڑے منافع میں بدل جاتا ہے۔ غرضیکہ میں نے اسے اس طرح ذہنی طور پر اپنے قابو میں کیا کہ اس نے مجھے اسی وقت لنگر کے انچارج اور کیپ کماٹنٹ سے ملوانے کی حامی بھری اور مجھے لنگر کی طرف لے گیا۔

لنگر انچارج اس وقت فوجوں میں کھانے کی تقسیم کا جائزہ لے رہا تھا اور خاصا مصروف تھا۔ کلرک نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ صوبیدار تھا اور خاصا پرانا لگا دکھائی دیتا تھا۔ میرا تعارف کروانے کے بعد کلرک نے اسے کہا کہ ان کی جانے آپ کے پاس آئے گی۔ اسے پاس کرنا آپ کا کام ہے۔ یہ میرے دوست ہیں اور ان کا کام ہونا چاہئے۔ یہ آپ کی سیوا کریں گے، لنگر انچارج نے میرا جائزہ لیا اور کہا کہ صاحب مال ٹھیک ہو تو ہم کیوں ان فٹ کریں گے۔ ساتھ ہی اس نے کلرک سے کہا کہ وہ مجھے شام کو اس کے کوارٹر میں لے آئے۔ وہ معین ملی وہاں رہتا تھا۔ میں نے حامی بھری اور پھر ہم کیپ کماٹنٹ کے دفتر کی طرف چل پڑے۔

کیپ کماٹنٹ کا دفتر کوارٹر گاڑ سے منسلک تھا۔ کیپ کماٹنٹ ایک فل کرائل تھا اور اس وقت کھانے کے وقفے میں نہیں گیا ہوا تھا۔ اس کے دفتر میں تقریباً سارے کلرک میرے ہمراہی کلرک کے خاصے جاننے والے تھے۔ ان کی بے تکلفی دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ اندر ہی اندر ADOS کے دفتر سے لے کر لنگر اور کیپ کماٹنٹ تک ایک زنجیر بنی ہوئی ہے اور یہ سب مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ کیپ کی ٹریننگ کیلئے فوجی جوان صرف تین ماہ کیلئے آتے ہیں۔ اس لئے ان کی خوراک، صاف کاری اور تمام وہ اشیاء جو ان کو مفت مہیا کی جاتی ہیں، ان کی کوآئی میں ہیر پھیر کر کے اور ٹھیکیداروں سے ملی بھگت کر کے زیادہ قیمت کے ٹینڈر منظور کئے جاتے ہیں، اسی لئے ان تینوں دفاتر کے کلرک آپس میں خاصے بے تکلف تھے۔

تمام حالات کا مکمل جائزہ لینے کے بعد میں ADOS کلرک کے ہمراہ واپس لوٹ آیا۔ شام کو مجھے لنگر انچارج کے گھر جانا تھا۔ ADOS کے کلرک کو اب میں آئندہ شام کھوں گا۔ شام نے واپس آتے ہوئے مجھے کہا کہ لنگر انچارج کو خوش کرنے کے لئے مناسب رقم ہمراہ لے آؤں۔ شام 6 بجے کے قریب میں ہوٹل سے چھاؤنی کی طرف پھر روانہ ہوا۔ شام مقررہ جگہ پر میرا منتظر تھا۔ ہم دونوں لنگر انچارج کے گھر 7 بجے پہنچ گئے۔ لنگر انچارج ٹیبل کی کوارٹر میں رہتا تھا۔ اس نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا، برقی گنگلو اور خاطر تواضع کے بعد اس نے خود چائے کی بات چھبھری اور اپنی اہمیت بتانے کیلئے کہنے لگا کہ اگر میں چائے کو پاس نہ کروں تو ADOS والے کچھ نہیں کر سکتے۔ آخر مجھے بارہ تیرہ سو انفریکو خوراک کے معاملے میں مطمئن کرنا ہوتا ہے۔

صوبیدار بنتے بنتے ایک فوجی کو بائیس تیس سال لگ جاتے ہیں اور وہ ریٹائرمنٹ کے قریب ہوتا ہے۔ بھارتی فوج میں ایسا صوبیدار اگر کسی "پیدا" کرنے کی جگہ پر لگ جائے تو پھر بہت ہی کم ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ہاتھ صاف رکھتے ہیں۔ صوبیدار نے صاف الفاظ میں کہا کہ آپ کی جانے میں صرف پاس کروں گا بلکہ تعریف بھی کروں گا لیکن تالی دونوں ہاتھوں سے بچتی ہے۔ صوبیدار کو "راہ راست" پر لانے کا میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے خود میری مشکل آسان کر دی۔ اس نے کہا کہ صرف جو انوں NCO's کیلئے روزانہ 4 ہزار سے زائد، بڑے کپ کی جانے بنتی ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی کتنی جانے ہم استعمال کریں گے۔ جانے کی منظوری کے دوسرے مرحلے میں آپ خود طے کریں گے کہ جس تاریخ سے آپ کی جانے لنگر میں استعمال ہونی شروع ہوگی۔ میں 5 ہزار روپیہ ماہوار آپ سے لوں گا۔ میں نے منظور کر لیا اور پیشگی اسے دو ہزار روپے دیئے اور تھوڑی دیر بعد ہم اس کے گھر سے لوٹ آئے۔ شام نے مجھے رات کو 8 بجے شراب خانے میں ملنے کا کہا۔ اب 8 بجتے ہیں وقت ہی کتنا رہ گیا تھا۔ میں نے ہوٹل جانے کا ارادہ ترک کیا اور شراب خانے میں پہنچ گیا۔

شام نے جس طرح مجھے خرچ کرتے اور پیسے لٹاتے دیکھا تھا اس سے وہ مجھے ایک موٹا شکار کچھ بیٹھا تھا اور جلد از جلد اپنی موجودگی میں مجھے کیپ کماٹنٹ کے دفتر کے کلرکوں سے ملوانا چاہتا تھا۔ تا کہ میری کوئی Deal اس کی غیر موجودگی میں نہ ہو۔ رات 8 بجے وہ دونوں جوں کو اپنے ہمراہ لایا اور مجھے بتایا کہ وہ کیپ کماٹنٹ کے دفتر میں کام کرتے ہیں۔ وہ شام ہم نے کچھ گپ شپ اور کچھ کام کی باتوں میں گزارا۔ مجھے کچھ یونٹی شک سا پڑ گیا کہ شام اتنی جلدی کیسے سب سے ملوا رہا ہے اگر چنانہ دونوں فوجیوں کو میں دوپہر کو کیپ کماٹنٹ کے دفتر میں دیکھ چکا تھا لیکن پھر بھی اپنی تسلی کے لئے میں نے کام کی بات کو اس شام زیادہ آگے نہ بڑھایا اور کہا کہ کل میں شام کے دفتر میں آؤں گا اور اس کے ہمراہ کیپ کماٹنٹ کے دفتر میں ان سے ملوں گا۔ جب وہ سے فونٹی کر رہے تھے تو میں ان کے چہروں سے ان کے دلی جذبات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ شراب کے نشے میں انسان اندر کی بات بھی زبان پر لے آتا ہے اور اس کا چہرہ اس کے دلی جذبات کی عکاسی بھی کرتا ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ شام اور ایک فوجی تو شراب پی کر خوب ہنس بول رہے تھے جبکہ دوسرا فوجی بار بار گہری سوچ میں غرق ہو جاتا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ کیا بات ہے بار۔ بیوی یاد رہی ہے جو یوں خاموش بیٹھے ہو۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر چپ ہو گیا۔ میں نے دو تین بار اسے ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن وہ دل کی بات زبان پر نہ لایا اور نہ ہی اس کی خاموشی اور سوچ میں ڈوبنے میں فرق آیا۔

شراب خانے میں کوئی ٹائلٹ وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے چھوٹی انگلی کا اشارہ دے کر اپنی حاجت کا اظہار کیا۔ شام نے کہا کہ باہر سڑک کی دوسری جانب۔ میں نے اس سوچ میں ڈوبے فوجی کا ہاتھ تھاما اور کہا کہ میرے ہمراہ چلے، وہ میرے ساتھ باہر آ گیا۔ سڑک کی دوسری جانب میں نے فارغ ہو کر اسے کہا کہ تم ایسے ماحول میں جہاں انسان سب نمونے سے آزاد ہو جاتا ہے، یوں نمگن بیٹھے ہو۔ پریشانیوں مجھے بھی ڈھیر ساری ہیں لیکن ہر پریشانی کا کوئی نہ کوئی حل نکل آتا ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہوں اور اگر چل سکتے ہو تو یہاں سے واپسی پر میرے ہمراہ ہوٹل چلو۔ وہاں سکون سے باتیں کریں گے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا کہ صاحب آپ پہلی بار ملے ہیں اور میری پریشانی کو بھانپ گئے ہیں اور یہاں میرے ساتھی جو سارا وقت میرے ساتھ رہتے ہیں انہوں نے کبھی بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ کیا بات ہے۔ آپ میں مجھے ایک ہمدرد انسان کا دل دکھائی دیتا ہے۔ میں واپسی پر آپ کے ہمراہ ہوٹل چلنے کو تیار ہوں۔ شراب خانے سے میں آدھے گھنٹے بعد اٹھ جاؤں گا اور آپ کے ہوٹل میں سویلین لباس میں پہنچ جاؤں گا۔ آپ بھی میرے آنے کے بعد جلد آنے کی کوشش کیجئے گا۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور ہم واپس آ گئے۔ میں نے اس کے گلاس میں زیادہ شراب اٹھائی تاکہ وہ اور زیادہ نشے میں ہو جائے کچھ دیر بعد اس نے سردی کی شکایت کی اور سب سے معذرت کر کے باہر چلا گیا۔ ہمارے ٹیبل پر محض اس وقت شام پر تھی۔ دوسروں نے اس کے جانے کا خاص ٹوٹس نہ لیا۔ قریب ساڑھے گیارہ بجے ہماری محفل پر درخواست ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ میری طرح شام اور اس کا ساتھی بھی مستقبل کے سنہرے خیالوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔

یہاں میں ایک مختصر سی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ سوائے بنگال اور مدراس کے دوردراز دیہاتوں کے جہاں مقامی زبان بولی جاتی ہے، سارے بھارت کے شہروں اور افواج میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ اردو ہے جس میں ہشتک تیس چالیس الفاظ سنسکرت کے شامل کئے گئے ہیں۔ عیبیہ اور کڑک سنسکرت صرف سیاسی جلسوں میں استعمال ہوتی ہے۔ سارے بھارت کی عوامی زبان وہی ہے جو بھارتی فلموں اور گانوں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ تیس چالیس سنسکرتی لفظ یاد کر کے اور انہیں صحیح جگہ پر استعمال کر کے بلاشبک و شبہ آپ ہندی زبان بخوبی جاننے والے کہلا سکتے ہیں۔ دوران تربیت مجھے ساتھ سے زیادہ ایسے الفاظ اور ان کا صحیح استعمال بخوبی اذکرانے گئے تھے۔

میں شراب خانے سے نکل کر کھنے پر بیٹھا اور ہوٹل کی راہ لی۔ وہ کلرک جس کا نام اشوک سنہا تھا، ہوٹل کی لابی میں میرا منتظر تھا۔ میں اسے ہمراہ لے کر اپنے کمرے میں آ گیا اور شراب خانے سے ہمراہ لائی ہوئی بوتل کھولی اور اسے ایک پیگ بنا کر دیا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر انسان انسان کے کام نہ آئے گا تو کیا جانو اور پرندے کام آئیں گے۔ میں نے اسے کہا کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔ اپنی ضرورت سے زیادہ آمدنی ہے۔ بہنئی میں رہا ہوں ہے۔ کاروبار بڑھانے کیلئے یہاں آیا ہوں۔ پنجابی ہوں اور ذات پات پر یقین نہیں رکھتا۔ انسان دوست ہوں۔ تمہیں پریشان دیکھ کر نہ سہرا کر دو اور تمہیں یہاں بلا لیا۔ اب صاف صاف بتاؤ، کس بات نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے جو کچھ میرے ہنس میں ہوا، میں تمہارے لئے کروں گا۔

شراب کے نشے میں اشوک ضبط کے سب بندھن توڑ بیٹھا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ ندروئے کیونکہ دیکھ میں رونے سے نہ صرف سکون ملتا ہے بلکہ ڈھارس بھی ملتی ہے۔ میں اشوک کے بہت قریب بیٹھ گیا اور کہا کہ مر دو یا نہیں کرتے اور تم مردھی ہو، فوراً فوجی بھی ہو۔ تمہیں تو ہرگز رونا نہیں چاہئے بلکہ اپنی پریشانی کو دور کرنے کی تدبیر کرنی چاہئے اور پھر میرا وعدہ ہے کہ تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔

میں نے اسے تسلی دی تو وہ بولا، صاحب میرے پتا سوگ باش ہو چکے ہیں۔ میری تین بہنیں ہیں اور کسی کی بھی شادی صرف اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ میری آمدنی اس قدر نہیں کہ چیزیں دے سکوں۔ سب سے بڑی بہن کی ایک جگہ رگائی ہوئے دو سال ہو چکے ہیں لیکن محض چیز نہ ہونے کی وجہ سے پھیرے نہیں ہو پائے۔ اب لڑکے والوں نے رگائی توڑنے کی دھمکی دی ہے۔ ماتا جی اس غم میں گھل گھل کر بیمار ہو چکی ہیں۔ میں نے ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھ لیا ہے لیکن کہیں سے رقم کا انتظام نہیں ہوا۔ میں ہر مشکل سے مشکل کام کرنے کو تیار ہوں لیکن اپنی بہن کی رگائی ٹوٹنے میں دیکھ سکتا۔

اس کی دکھ بھری کہانی برصغیر کے اسی فیصد گھرانوں کی داستان تھی۔ لاکھوں لڑکیاں، چیزیں نہ ہونے کی وجہ سے شادی کی عمر کو عبور کر کے بوڑھی ہو چکی ہیں۔ والدین کی مجبوری کو لڑکے والے سننا بھی پسند نہیں کرتے اور لڑکے کا باقاعدہ بھلاؤ تاؤ کر کے اسے بیاتے ہیں اور جن لڑکی والوں کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہوتا ان کی بیٹیاں یا تو جھوٹی آس لگائے بوڑھی ہو جاتی ہیں یا جو دراما ذہن ذہن رکھتی ہیں وہ گھر سے بھاگ جاتی ہیں اور ان کا انجام ہاں لآخر خرابے خانے میں ہوتا ہے۔

میں نے اشوک سے پوچھا کہ اسے کتنی رقم کی ضرورت ہے۔ اس نے کہا کہ بڑی بہن کی شادی کے لئے اسے پچیس ہزار روپے مل جائیں تو وہ باسانی اپنی بہن کی شادی کر سکتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ اگر اسے 25 ہزار مل بھی جائیں تو وہ صرف ایک بہن کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکتا ہے۔ دوسری دو بہنوں کی تو ذمہ داری باقی رہے گی۔ میں نے اسے کہا کہ میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے بھی ایک شخص دوست کی تلاش ہے اور شاید تم ہی وہ دوست ثابت ہو گے۔ بہر حال فکر نہ کرو۔ میں تمہاری اس مجبوری میں تمہارا پورا ساتھ دوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ بہنئی میں ہم نے ایک کلب بنایا ہوا ہے۔ جس کے ممبر صرف غیر شادی شدہ مرد اور عورت ہی بن سکتے ہیں۔ اس کلب میں ہم ہر طبقے کے لوگوں کو ممبر بنا تے ہیں، ان کیلئے نام صرف موزوں رشتے تلاش کرتے ہیں بلکہ شادی کے وقت پھر پور مالی اعانت بھی کرتے ہیں میں تمہاری بڑی بہن کی شادی کیلئے اپنی طرف سے اور کلب کی طرف سے پورے 25 ہزار کا بندوبست کروں گا بلکہ تمہاری دوسری دو بہنوں کیلئے بھی کلب کی مدد سے موزوں رشتے تلاش کروں گا۔ میں نے اسے خاصی تسلی دی۔ اور پھر چاک چیکے جیسے کچھ یاد آ گیا ہو میں نے اسے کہا کہ بہت سارے فوجی بھی ہمارے کلب کے ممبر ہیں اور ان ممبروں میں جہاں تک مجھے یاد ہے ٹینک رجمنٹوں کے کچھ جوان اور افسران بھی شامل ہیں۔ پھر یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جہاں تک مجھے یاد ہے، ٹینک کی ہی کسی رجمنٹ کا ایک جوان جو ہمارا ممبر تھا وہ ہر ٹینگ حاصل کرنے آیا تھا اس کی ایک بہن کی شادی بھی اسی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ غالباً پنجاب کے علاقے کا تھا اور ہمارے کلب کی دہلی کی شاخ سے ممبر بنا تھا۔ اس کی بہن کی شادی بھی ہمارے کلب کی مالی اعانت سے ہوئی تھی۔ کلب کے قواعد و ضوابط کے مطابق اسے کلب سے حاصل شدہ رقم نہایت معمولی اقساط میں واپس کرنی تھی۔ دو تین اقساط کی ادائیگی کے بعد پھر اس نے رابطہ نہیں کیا۔ میں نے ماتھے پر ہاتھ مارے کہا کہ اس کا نام اور رجمنٹ ذہن سے نکل گئی ہے۔ لیکن اس کا نام سامنے آتے ہی فوراً پہچان لوں گا اور اس سے رابطہ کر کے اس سے بقایا اقساط کی ادائیگی کا تقاضہ کروں گا۔ میں نے اسے کہا کہ مالی اعانت حاصل کرنے والے اگر اقساط کی ادائیگی بھی بند کریں تو اس نیک مقصد کیلئے قائم کلب آخر کیسے چل سکتا ہے میں نے دوبارہ کہا کہ اگر نام اور رجمنٹ کی سٹ سامنے ہو تو فوراً سے پہچان لوں گا۔

اشوک کو اپنی مشکل حل ہوتی ہوئی سامنے نظر آ رہی تھی اور اس کیلئے اسے میری خوشنودی کی ضرورت تھی۔ اس نے کہا صاحب آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے اس مشکل وقت میں میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ ہے تو خلاف ضابطہ اور پکڑے جانے پر قانون کے مطابق میرا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا ہے لیکن میں پھر بھی مکمل فائل جو کہ میرے دفتر کے ایک کلرک کے پاس ہے، کسی طرح حاصل کر کے کل رات آپ کو ہوٹل میں لادوں گا اور آپ اس سے اپنے مطلوبہ شخص کو تلاش کر لیجئے گا۔ اگلے ہی دفتر کے وقت سے پہلے میں وہ فائل آپ سے واپس لے جاؤں گا اور آپ اس کا ذکر کسی سے بھی نہ کیجئے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے رخصت کرتے وقت ایک ہزار روپیہ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

اس فائل کا حصول میرے لئے کسی JACK POT سے کم نہ تھا اور اشوک کو میں نے اپنے مکمل قابو میں کر لیا تھا۔

دوسری طرف میں ADOS کے دفتر میں گیا اور ADOS سے ملا۔ لیفٹیننٹ کرنل گپتا ADOS تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے یہاں آئے ہوئے کئی روز ہو چکے ہیں اور میری جانے کے سہل ابھی تک آپ کے دفتر میں ہی پڑے ہیں۔ میں بہنئی کی پر رونق زندگی سے دور یہاں ہوٹل میں ایک طرح سے عقید ہو چکا ہوں اور بہت بور ہو رہا ہوں۔ اس لئے آپ میرے سہل متعلقہ لوگوں تک بھیجاؤ انہیں تاکہ جلد کچھ فیصلہ ہو سکے۔

غازی

ADOS سے میری ساری گفتگو انکشاف میں ہوئی تھی۔ وہ میری شخصیت، لباس اور پنی ملی انگریزی سے متاثر ہوا یا اس کے پیش نظر بھی 'چمک' تھی۔ اس نے میرے سامنے اپنے دفتر کے ایک کلرک کو میرے سہیل لنگر بھجوانے کا آرڈر دیا اور پھر مجھے کہا کہ یہ محض ایک رسمی کارروائی ہے کہ سہیل لنگر میں استعمال کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ میں بغیر لنگر میں بھیجے بھی فیصلہ کر سکتا ہوں، اور جہاں تک تمہاری بوریت کا سوال ہے تو کل شام تم میرے مہمان ہو گے اور میں تمہیں اپنے ہمراہ آفسرز میں لے چلوں گا۔

میں نے کرنل گپتا کا شکریہ ادا کیا اور اس سے اجازت لے کر اس کے دفتر میں کلرکوں کے پاس آ گیا۔ شام سے کچھ دیر گپ شپ کی۔ اس نے بتایا کہ گپتا نے آپ کے سہیل لنگر میں بھجوانے کا آرڈر کیا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں اسی سے مل کر آ رہا ہوں۔ اب چونکہ ہمیں جلد کام کرنا ہے اس لئے کیپ کمانڈنٹ کے دفتر تک مجھے لے چلو۔ وہاں جانے کا دفتر میں نے یہ بتایا کہ چونکہ سہیل لنگر میں جارہے ہیں تو شاید آج یا کل وہاں استعمال کئے جائیں۔ کیپ میں رہنے والے لنگر کے متعلق کوئی شکایت بھی ڈائریکٹ لنگر میں نہیں کر سکتے بلکہ اپنے سینئر کے ذریعے کمانڈنٹ سے کر سکتے ہیں اور کیپ کمانڈنٹ کا دفتر اس شکایت کی چھان بین کرتا ہے۔ یہ فوجی ڈیپن کالازنی حصہ ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد شام مجھے لے کر کیپ کمانڈنٹ کے دفتر میں چلا آیا۔ میں اشوک سے ملنا چاہتا تھا۔ اشوک نے مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک اطمینان مجھے نظر آیا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں ہی مجھے بتایا کہ کام ہو گیا ہے۔ وہاں رہی بات چیت ہی ہوئی۔ شام نے ایک دوسرے کلرک کو کہا کہ ان کے سہیل لنگر میں آج بھجوانے جارہے ہیں اگر کوئی شکایت وہاں سے آئی تو مجھے بتادینا۔ یہ دوسرا کلرک وہی تھا جو گزشتہ رات شام اور اشوک کے ہمراہ آیا تھا۔ وہاں سے ہم جب واپس لوٹنے لگے تو کیپ کمانڈنٹ سے اچانک آمناسا منا ہو گیا۔

شام نے اسے سیلٹ کیا۔ میری طرف اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا۔ اپنے احمد نگر آنے کی وجہ بتائی اور کہا میری چائے کے سہیل آج لنگر میں بھیجے جائیں گے۔ ہم دونوں انگریزی میں بات کر رہے تھے۔ کاروں پر سرخ پٹی لگائے اور کیپ کمانڈنٹ کی پوسٹ پر متعین کڑا ہوا فائل کرنل مجھے ایک معمولی کلرک کے ہمراہ دیکھ کر خوش نہ ہوا اور کہا کہ اگر آپ مجھ سے ملنے آئے ہوتے ہیں تو میرے دفتر میں آجائیں۔ میں نے شام کو اشارہ کیا اور کرنل کے پیچھے ہی اس کے دفتر میں داخل ہو گیا۔

بہت سجا سجا یا دفتر تھا۔ کرنل نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میں چاہتا تھا کہ کرنل کو بھی متاثر کر لوں۔ INITIALS کے ساتھ اس کا نام ملہوڑا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ کرنل صاحب میں دوسرے آپ سے ملنے یہاں تک آچکا ہوں۔ لیکن آپ دفتر میں موجود نہ تھے۔ میری چائے ٹیسٹ کیلئے ADOS کے آفس سے لنگر تک پہنچ چکی ہے۔ اصولاً مجھے پہلے آپ سے ملنا چاہئے تھا کیونکہ سارے کیپ اور اس میں رہنے والے آفسرز اور جوانوں کے آپ انچارج ہیں اور ان کی مکمل دیکھ بھال آپ کے ذمہ ہے۔ آپ کے دفتر تک آنے کے لئے میں نے ADOS کے ایک کلرک کو ہمراہ لے لیا تھا کیونکہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ کے دفتر میں آنے اور آپ سے ملنے کیلئے درخواست دینی پڑتی ہے چونکہ میں یہاں ہوں اور زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکتا اس لئے یہ شارٹ کٹ استعمال کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا پرنس کارڈ کرنل کو پیش کیا۔ موسم اچھی خاصا گرم تھا۔ کیپ کے راؤنڈ کی گرمی کمرے میں لگے ایئر کنڈیشننگ نے کم کر دی تھی۔ کرنل بھی مختصراً ہوا چکا تھا۔ بغیر وقت طے کئے آنے کی جب میں نے دوبارہ معذرت کی تو کرنل بالکل مختصراً چکا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں چائے پیوں گا یا کافی۔ میں نے کہا چائے بشرطیکہ آپ میری چائے کے سہیل سے چائے بنوائیں۔ میرے بریف کیس میں دو سہیل کے پیکٹ پڑے تھے۔ وہ دونوں نکال کے میں نے میز پر رکھ دیئے۔ کرنل نے اپنے بین کو بولا یا اور اسے میری دہی چائے بنانے کو کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں چائے بن کر آگئی۔ کرنل نے چائے کا گھونٹ لیا تو پوچھا کہ اس کے دام کیا ہیں۔ میں نے قیمت بتا دی۔ چائے کا کپ ختم کرتے ہی اس نے اتھرنون پر لنگر انچارج کو فون کیا اور کہا کہ آج جو چائے تمہارے پاس آ رہی ہے وہ میں نے پی ہے اور مجھے بہت پسند آئی ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ چند لمحے اٹھرا دھر کی بات کی۔ پھر میں نے اس سے اجازت چاہی اور چلتے چلتے کہا کہ کل میں کرنل گپتا کے ہمراہ آفسرز میں آ رہا ہوں۔ امید ہے وہاں آپ سے ملاقات ہوگی۔ کرنل ملہوڑا نے اثبات میں سر ہلایا اور سکرما تے ہوئے کہا۔ YOUNGMAN YOU LOOK LIKE AN OFFICER SO TRY TO REMAIN AMONG OFFICERS. میں نے دوبارہ اس کا شکریہ ادا کیا۔ کرنل نے اچانک کچھ سوچا اور مجھے کہا کہ میری ٹراپورٹ تمہیں ہونے تک چھوڑ آئے گی۔ 10 منٹ کے اندر ایک جیب دفتر کے سامنے آن رکھی جس پر میں اپنے ہٹل آ گیا۔

کرنل ملہوڑا اور کرنل گپتا کو کیا معلوم کہ جو کام ان کے دفاتر کے کلرک میرے لئے کر رہے تھے وہ کسی صورت بھی افسروں کے درمیان رہنے سے نہیں ہو سکتے تھے۔ ہٹل آ کر میں نے کھانا کھایا اور رات کو اشوک سے ملنے والی فائل کے خیالوں میں گم ہو گیا۔

شام 7 بجے کے قریب اشوک نے استقبالیہ سے مجھے فون کیا۔ میں نے اسے کمرے میں آنے کو کہا۔ وہ وہیلیں لباس میں تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک پیئڈ بیگ تھا۔ میں نے گزشتہ رات کی پچی ہوئی شراب اس کے سامنے رکھی۔ وہ گھبرایا، ہوا سا تھا۔ اس نے بغیر پانی ملائے شراب کا آدھا گلاس چڑھایا۔ پیئڈ بیگ کھول کر اس نے دو فائل نکال کر مجھے دیں اور کہا کہ ایک فائل میں گزشتہ 8 ماہ میں آنے والی رینٹوں اور ٹریڈنگ کے بعد ان کے واپس جانے کی تفصیل موجود ہے اور دوسری فائل میں ہر رجسٹ کے ٹریڈنگ لینے والے جوانوں اور افسران کے نام درج ہیں۔ اس نے میری آنکھوں میں گہرائی تک جھانکتے ہوئے کہا کہ 'ان دو فائلوں سے جو معلومات (معلومات پر اس نے خاصا زور دے کر کہا) بھی جائیں، حاصل کر سکتے ہیں'۔ میں یہ فائلیں ایک کلرک کی الماری سے چرا کر لایا ہوں۔ میں اب جاتا ہوں اور صبح 7 بجے سے پہلے یہاں آ کر یہ فائلیں آپ سے لے جاؤں گا۔ آپ یہ یاد رکھئے گا کہ میں نے یہ فائلیں نکال کر ایک بوجھ لیا ہے اور اگر پکڑا جاؤں تو لمبی سزا ہو سکتی ہے۔ میں نے یہ سارا خطرہ محض اپنی بہنوں کی شادی کے لئے مول لیا ہے۔ میں نے اسے دلا سادیا اور کہا کہ یہ فائلیں تمہاری حفاظت میں تو نہیں نہیں۔ ان کے متعلق اگر کسی کو پتہ بھی چل گیا تو متعلقہ کلرک ہی ہنسنے کا اور کل صبح تو تم انہیں واپس لے ہی جاؤ گے۔ میں نے اسے دو ہزار روپے اور دیئے اور کہا کہ جلد از جلد اس کے لئے روپے کا انتظام کروں گا۔

اشوک نے باقی شراب بھی گلاس میں انڈیلی اور ٹرانسٹ پی گیا۔ اتنی پینے کے باوجود وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے پیئڈ بیگ وہیں چھوڑا اور صبح 7 بجے آنے کا کہہ کر واپس چلا گیا۔

میں نے فائلوں کا سرسری جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ یہ ہمارے لئے پیش قیمت معلومات سمونے ہوئے تھیں۔ ایک فائل میں 71 کی جنگ کے بعد تربیت کیلئے آنے والی تمام رجمنٹوں کے نمبر، افسران اور جوانوں کی تعداد، کن ٹیگنٹ پر ٹریڈنگ دی گئی اور پھر واپس کہاں گئیں۔ یہ سب تفصیلات درج تھیں۔ دوسری فائل خاص موٹی تھی۔ اس میں ہر رجسٹ کے جوانوں کے نام، رینک، نمبر اور میڈیکل ہولڈنگس جو دی گئیں وہ درج تھیں۔ اسی طرح افسران کی فہرست اور رینک اور دیگر تفصیلات درج تھیں۔ فائلیں دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ اتنی اہم تھیں۔ میں نے فوری فیصلہ کیا کہ بجائے ان فائلوں کی تفصیلات نقل کرنے کے کیوں نہ یہ دونوں فائلیں ہی پاکستان بھجوا دوں۔ مجھے یقین تھا کہ میرے سینئر زمیری اس کامیابی پر اچھل پڑیں گے، جب انہیں اصل فائلیں مل جائیں گی میں نے فوری طور پر سامان بیک کیا۔ ہٹل کا بل ادا کیا اور بسوں کے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب میں کچھ گھبرایا ہوا تھا کہ خدا نخواستہ کامیابی کا یہ کھیل کہیں بگڑ نہ جائے۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ اشوک صبح مجھے ہٹل میں موجود نہ پا کر میرے متعلق بہت کچھ سمجھ جائے گا لیکن چونکہ وہ خود اس میں ملوث تھا اس لئے کسی کو بھی میرے بارے میں نہ بتائے گا۔ ADOS اور کیپ کمانڈنٹ میرے متعلق کسی طرح بھی شک کا شکار نہ ہوں گے اور نہ ہی شام، احتیاطاً میں نے ہٹل سے چلتے ہوئے استقبالیہ کلرک کو بتا دیا کہ ایک ایمر جنسی کی وجہ سے فوری طور پر ہمیں جا رہا ہوں اگر کوئی میرے متعلق پوچھے تو یہی بتادینا۔

بسوں کے اڈے پر معلوم ہوا کہ ایک بس اڈے سے ابھی نکلی ہے اور نہر کے پل کے پاس سواریاں لینے کے لئے کھڑی ہوگی۔ اڈے سے ہی میں نے دو سائیکل رکشے لئے۔ ایک پر سامان اور دوسرے پر خود بیٹھ کر انہیں پوری رفتار سے نہر کے پل کی طرف چلنے کو کہا۔ میں نے انہیں کہا کہ دونوں کو پچاس پچاس روپے دوں گا اگر وہ بس کی روانگی سے پہلے نہر پر مجھے پہنچا دیں۔ پچاس روپوں کے لالچ میں انہوں نے سائیکل رکشوں کو موٹر سائیکل رکشہ بنا دیا۔ نہر کے پل پر بس ابھی کھڑی تھی۔ میں نے کٹ لیا اور سیٹ پر بیٹھ کر یہ دعائیں کرنے لگا کہ کسی انہونی سے پہلے ہی محفوظ مقام تک پہنچ جاؤں۔ بس ٹوٹی پھوٹی سڑک پر چمکو لے کھاتی روانہ ہوئی اور تقریباً پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد اورنگ آباد پہنچی۔ دلی جانے والی گاڑی کی آمد میں قریب ایک گھنٹہ باقی تھا میں نے جان بوجھ کر تھرا کا کٹ لیا اور گاڑی کے انتظار میں ایک خالی اور اندھیری جگہ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی صبح وقت پر آگئی اور میں نے ایک خالی سیٹ پر قبضہ جما لیا۔ اس وقت میں بالکل خالی الذہن تھا۔ بس ایک دھن دی دل و دماغ کا احاطہ کئے ہوئے تھی کہ یہ فائلیں جلد از جلد پاکستان پہنچ جائیں۔

ایک بات یہاں تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری انجینی ڈین ملک میں انتہائی گہرائی بلکہ آخری کونے تک جا کر کام کرتی ہے جبکہ بارڈر پر تعینات ڈویژن کے فیلڈ انوٹی گیشن یونٹ بارڈر کے دوسری طرف ڈین کے ڈویژنوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان فائلوں کے ذریعے جہاں تک ڈین کے آئیڈ ڈویژن 10-INDEPENDENT BRIGADE کا تعلق ہے۔ ان کی رجمنٹوں کی ٹریڈنگ کن نئے ٹیگنٹوں کی کن رجمنٹوں کو چلائی کے متعلق 71ء کی جنگ کے بعد ہر بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی اور F.I.U کا کام بہت سہل ہو گیا تھا۔

جو جوں گاڑی دلی کی طرف بڑھتی گئی۔ میں نارمل ہوتا گیا کہ میں ڈینجر زون سے باہر آ گیا تھا۔ اگرچہ پورا بھارت ہی میرے لئے ڈینجر زون تھا۔ لیکن احمد نگر سے اتنی اہم معلومات اور CLASSIFIED FILES کے ساتھ خیریت سے نکل آنا بالکل سانپ کے بل سے بچنے و عافیت نکل آنے کے مترادف تھا۔ روانگی کے وقت سے لے کر اب تقریباً 24 گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے اور صبح صادق کا وقت تھا۔ جب گاڑی دلی پہنچی۔ میں نے ٹیکسی لی اور میرا ہوا چھی ہوٹل جا کر کمرہ لے لیا۔ دن چڑھے تک سوتا رہا۔ پھر ناشتہ وغیرہ کر کے کاروبار میں ہوٹل فون کیا۔ ٹرانسمیٹر والے ساتھی کو شام کے 4 بجے کناٹ ہیلس کے ایک ریسٹورنٹ میں ملنے کا کہا۔ باقی ساتھیوں کی خیریت اس لئے فون پر نہ پوچھی کہ ہوٹل میں وہ انجنیوں کی صورت میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ صرف یہ پوچھا کہ اور سب ٹھیک ہیں اور اس نے کہا ہاں.....

مجھے اشوک کا بار بار خیال آتا تھا کہ اپنی تکی بھجوری کے باعث اس نے خطرہ مول لیا اور اگر اس کے افسران کو اس کی اس حرکت کا پتہ چل گیا تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ اس خیال کے ساتھ ہی مجھے سوط ڈھا کہ، بھارتی فوج اور ملٹی ہائی کے مشرقی پاکستان کے بے گناہ شہریوں اور فوجیوں کے ساتھ بربریت کی انتہا سے بھی زیادہ مظالم کے مناظر ایک تیز فلم کی طرح میرے دماغ میں گھوم گئے۔ وہ لاکھوں رخم جو ہمارے دل اور ہماری آنکھوں کی ایک مقلوب تھا کہ ہم زمانہ امن میں نے صرف ایک پرمہم رکھا تھا اور ساتھ ہی مجھے یہ مقلوب یاد آ گیا کہ جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے اور ہماری انجینی کا ایک مقلوب تھا کہ ہم زمانہ امن میں جنگ کرتے ہیں اور جنگ کے دوران اپنی کی ہوئی جنگ کے نتائج دیکھتے ہیں اور میں اس وقت (حالت جنگ) میں تھا۔

شام کو جب میں ریسٹورنٹ پہنچا تو ٹرانسمیٹر والا ساتھی پہلے سے ہی موجود تھا۔ میں نے مختصر آسے بتایا کہ میں اپنے مشن سے کامیاب لوٹا ہوں۔ میں نے باقی ساتھیوں کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ آپ کی غیر موجودگی میں ہم نے کئی مفید معلومات اکٹھی کی ہیں۔ جن کے متعلق ہم سب آپ کو اپنی کارکردگی کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ باقی تینوں اور تم اگلے روز ٹھیک اسی وقت اسی ریسٹورنٹ میں آ جانا۔ اس وقت سب سے ضروری اور اہم کام یہ ہے کہ ٹرانسمیٹر پر پیغام بھیجنا ہے۔ کیا تم نے اسے ہوٹل سے ٹرانسمیٹر پر آزمائشی رابطے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے اسے کہا کہ ابھی ہوٹل چلو۔ میں پیغام لکھ کر دیتا ہوں اسے میرے سامنے ٹرانسمٹ کرو۔

ہم دونوں اکٹھے کاروبار میں ہوٹل پہنچے۔ باقی ساتھیوں کو پتہ بھی نہیں چلا اور ہم ٹرانسمیٹر والے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرہ احتیاط سے بند کیا۔ یہ کمرہ ہوٹل میں دوسری منزل پر کونے میں تھا۔ ہم نے کھڑکیاں کھول دیں۔ میرے ساتھی نے ٹرانسمیٹر نکالا اور کمرے کی بجلی سے اسے چالو کرنے لگا۔ میں نے پیغام لکھا کہ اشوک دوسری منزل پر کونے میں تھا۔ دو انتہائی اہم فائل بھیجنا ہیں۔ ایک کے بجائے دو کوریئر CORRIER بھیجیں۔ مجھ سے صرف پہلے والا کوریئر ہی ملے جبکہ دوسرا انیا اس کی نگرانی کرے۔

جب یہ پیغام دیا گیا اور جواب 'پیغام موصول ہوا' بھی مل گیا تو مجھے تسلی ہوئی۔ اس دوران میں ایک نہیں دیکھیں پیغامات پاکستان بھیجے۔ ہر ایک کیلئے مختلف کوڈورڈ تھا۔ اور جواب بھی۔ ہر ایک کو خفیہ کوڈ جو ہر ٹرانسمیٹر کے لئے مختلف تھا، بتا دیا جاتا تھا۔ شاید پہلے بھی ہمیں تحریر کر چکا ہوں کہ انتہائی ضرورت اور ایمر جنسی کے لئے ٹرانسمیٹر استعمال کرنے کی اجازت تھی اور بہت ہی تھوڑے وقت کیلئے۔ بھارتی انجینیوں کو بھی علم تھا کہ پاکستان سے بھارت پیغامات ٹرانسمٹ ہوتے ہیں۔ انہیں شاید ہماری ایک دفتر بکلائننگ سائی بھی ہو چکی تھی۔ اسلئے ٹرانسمیٹر کے استعمال میں انتہائی احتیاط برتنی لازمی تھی۔ بھارت کے پاس ایسے آلات تھے جن سے ٹرانسمیٹر کے محل وقوع کا پتہ چلایا جا سکتا تھا۔

پیغام بھیجنے کے بعد میں اسی ریسٹورنٹ میں آ گیا اور ٹرانسمیٹر والے ساتھی کو کہا کہ آدھے گھنٹے میں وہ باقی تینوں کو بھی وہیں پہنچنے کا کہہ دے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ہم چاروں ہوٹل میں مختلف کاروباری لوگوں کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے ڈاننگ ہال میں ایک دوسرے سے 'متعارف' ہو چکے ہیں اور یہ تعارف کچھ 'دوستانہ' رنگ میں بدل کر ہم اکثر یہ صرف لابی اور ریسٹورنٹ میں ملتے ہیں بلکہ چند منٹ کا وقفہ دے کر باہر بھی اکٹھے جاتے ہیں۔

آدھ پون گھنٹے میں ہم پانچوں کناٹ ہیلس کے ایک ریسٹورنٹ میں اکٹھے ہوئے۔ سب سے پہلے تو میں نے انہیں مختصراً بتایا کہ میں اپنے مشن میں کامیابی حاصل کر کے لوٹا ہوں۔ پھر میں نے ٹرانسمیٹر والے ساتھی سے گروپ ایڈر کا چارج واپس لیا اور انہیں کہا کہ میری غیر موجودگی میں اپنی کارکردگی مجھے بتائیں۔

سب سے بڑی خبر جو انہوں نے بتائی وہ تھی کہ جگد فراس خانہ، پرانی دہلی میں انہوں نے ایک تین کمرے کا مکان تلاش کیا ہے جو ایک مسلمان کی ملکیت ہے اور اس دو منزلہ مکان کی دوسری منزل کرائے کیلئے خالی ہے۔ کسی ایک ہوٹل میں زیادہ دن قیام ہوٹل والوں کو شک میں ڈال سکتا ہے۔ مکان کے دو اطراف اور سامنے بھی مسلمانوں کے مکان ہیں۔ مالک مکان کو یہ بتایا ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور کاروبار کے سلسلے میں دہلی میں ایک ہوٹل میں ہماری ملاقات ہوئی۔ چونکہ ہمیں اکثر دہلی آنا ہوتا اور کافی روز رہنا ہوتا ہے۔ اس لئے ہم چاروں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ایک مکان کرائے پر لے لیا جائے۔ مالک مکان مان گیا ہے۔ کرایہ اور بیٹنگی طے کر چکے ہیں۔ صرف آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔

مجھے یہ تجویز پسند آئی کیونکہ ڈین ملک میں مسلمان جاسوسوں کا بندوبن کر رہنا اور خصوصاً ہوٹل میں زیادہ عرصہ قیام نہ صرف انہیں مشکوک بنا دیتا ہے بلکہ ایک مسلمان کے مستقل طور پر ہندو کے روپ میں رہنے سے احتیاط کے باوجود اس سے غیر ارادی طور پر ایسی غلطی ہونے کا امکان ہے جس سے اس کی اصلیت ظاہر ہو سکتی ہے۔ ہم اس قسم کا کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھے۔ آگے آپ پڑھیں گے کہ نا دانشتہ طور پر مجھ سے بھی دو تین ایسی غلطیاں ہوئیں جن کی وجہ سے میں ڈین کی گرفت میں آئے آئے پھا۔ میں نے انہیں مکان کرائے پر لینے کی اجازت دے دی۔ ایک اور کامیابی جو انہوں نے حاصل کی وہ یہ تھی کہ بھارتی آرمی چیف کے ہیڈ کوارٹر کے باہر STATIC اور MOBILE مگرائی کر کے انہوں نے ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے والے چند سو بلیں لہا کر دیں کی فیزی کی پوزیشن اور رہائش گاہوں کا پتہ چلایا تھا۔ یہ خاصی اہم معلومات تھیں جو ہمارے آئندہ مشنوں میں بہت مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔ تربیت یافتہ فوجی تو خاصے محتاط ہوتے ہیں لیکن سو بلیں ملازمین بالکل ہمارے سو بلیں ملازمین کی طرح بے پروائی برتتے ہیں اور انہیں قابو کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ کچھ اور معلومات بھی انہوں نے مجھے دیں اور تقریباً آٹھ گھنٹے کی میٹنگ کے بعد ہم نے اپنی اپنی راہ لی۔ میں نے انہیں دو دن بعد اسی جگہ پر آئی وقت ملنے کو کہا۔ ان دونوں میں انہوں نے مکان کرائے پر لے کر شفٹ کرنا تھا۔

غازی

فائلیں تو میرے قبضے میں آچکی تھیں لیکن ایک پریشانی ایسی تھی جس کا کوئی حل نظر نہ آتا تھا۔ میں نے یہ فائلیں اپنے CONTACT کے حوالے کرنی تھیں۔ اور CONTACT یہ فائلیں لاہور میں میرے سینئرز کو پہنچانی تھیں۔ بارڈر کراس کرنے میں وہی خطرات تھے۔ اگر خدا نخواستہ CONTACT پکڑا جاتا تو اتنی اہم معلومات جن کی نہ صرف پاکستان کو بے حد ضرورت تھی بلکہ جن کے حصول کے لئے میں نے اپنی جان موت کے منہ میں ڈال دی تھی، اپنی منزل تک نہ پہنچ پاتیں۔ ان دنوں فوٹو اسٹیٹ ایجا نہیں ہوا تھا اور اگر تھا بھی تو صرف مغربی ممالک میں تھا۔ میرے پاس نہ تو کوئی کیمرہ تھا اور نہ ہی میں اتنا قیمتی کیمرہ لے سکتا تھا جس سے ان فائلوں کے مواد کی تصویریں اتا سکتا۔

بہت سوچ سمجھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ ہے تو یہ وقت طلب کام لیکن اسے فائلیں CONTACT کو دینے سے پہلے پورا ضرور کرنا ہے۔ تربیلہ میں ملازمت کے دوران کمپنی کی طرف سے ہم ایک سخت روزہ ”آواز“ نکالنے تھے جو جنگ پریس راولپنڈی میں چھاپا جاتا تھا۔ کتابت تو لیتھو میں ہوتی تھی لیکن چھپتا یہ آفسٹ پرتھا۔ رسالے میں چھپنے کے لئے جو تصویریں ہم دیتے تھے انہیں فوٹو فلم پر منتقل کیا جاتا تھا۔ فوٹو فلم بالکل فیم گائیو کی طرح ہوتی ہے جس کے آر پار دیکھا جاسکتا ہے لیکن اس پر تصویر پازینو ہوتی ہے اور وہی فوٹو فلم چھپانی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اب مجھے کسی ایسے اخبار یا رسالے کی تلاش تھی جو دہلی سے فوٹو آفسٹ پر چھپتا ہو۔ میں نے ایک بک اسٹال پر جا کے رسالے اور اخبار دیکھنے شروع کئے۔ بالآخر ایک مشہور فلمی ماہنامہ ایسا ملا جو آفسٹ پر چھپتا تھا۔ اس رسالے کا ایڈریس بھی میں نے نوٹ کر لیا اور آصف علی روڈ پر اس کے دفتر جا پہنچا۔

بجائے مالکان اور چیف ایڈیٹر سے ملنے کے میں نے ایک چڑا سی سے کاتبوں کا پوچھا اور ایک کاتب کا پوچھا۔ ایک کاتب سے جو شکل سے مسلمان لگتا تھا فوٹو فلم بنانے والے کا پوچھا۔ اس نے اس کا نام اور پتہ بتا دیا۔ یہ دفتر کاملازم نہ تھا بلکہ اس کی اپنی دکان اور اپنے آلات تھے اور وہ مختلف رسالوں اور اخبارات کے لئے فوٹو فلم بناتا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچا اور راجنٹ فوٹو فلم بنانے کی بات کی۔ میری دونوں فائلوں میں دوسو سے زیادہ صفحات تھے۔ میں نے اسے سناڑ بتایا تو اس نے کہا کہ بجائے فل سائز کے آپ پوسٹ کارڈ سائز میں، بنالیں تو لاگت بھی کم آئے گی اور وقت بھی نسبتاً کم صرف ہوگا۔ میں نے اسے مطلوبہ رقم سے زیادہ دینے کا وعدہ کیا لیکن دوشرا لاکھ کے ساتھ۔ اول زیادہ سے زیادہ 48 گھنٹے میں تمام کام ختم کرنا ہوگا۔ دو فوٹو فلم بنانے کے دوران میں موجود رہوں گا۔ پیسوں کے لاچ میں اس نے دونوں باتیں مان لیں۔ اس کے 3 اسٹنٹ بھی تھے جنہیں اس نے روک لیا۔ میں فوراً لوڈھی ہوٹل آیا۔ فائلوں میں سے کاغذات نکال کر ان پر نمبر لگائے اور اس کے اسٹوڈیو جا پہنچا۔

میں نے فائل کا ایک ایک کاغذ اپنی نگہبانی میں REDUCE کروا لیا اور فوٹو فلم کے تمام مرحلوں میں موجود رہا۔ غرض کہ جب تک ان میں کام کرنے کی سکت رہی وہ کام کرتے رہے۔ کاغذات کو REDUCE کرنے کا مرحلہ سب سے پہلے طے کر کے کاغذات اپنے قبضے میں کئے۔ باقی مراحل بعد میں طے کئے جو باقی رہ گیا تھا وہ اگلے دن مکمل کیا گیا۔ نہ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کاغذات کس قسم کے ہیں اور میں اتنی تعداد میں فوٹو فلم کیوں بنا رہا ہوں اور نہ ہی میں نے انہیں کچھ بتایا۔ یہ سارا کام محض روپے کی چمک سے ہوا۔ انہوں نے یہ جاننے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہوا جیسے آج کل ہمارے شاخنی کارڈ اور پاسپورٹ کے دفاتر میں بنگالیوں، بریوں کو نمشرف بہ پاکستان، کیا جاتا ہے۔ غیر ملکی دہشت گردوں کے پاس بھی پاکستانی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ ہیں۔ صرف کراچی میں ایک لاکھ سے زیادہ بنگالیوں کو پاکستانی بنایا جا چکا ہے۔ سعودی عرب میں نشیات لے جانے والے جو لوگ پکڑے گئے اور جن کے سر قلم کئے گئے ان سب کے پاس پاکستانی پاسپورٹ تھے جبکہ وہ پاکستانی باشندے نہ تھے بلکہ ”چمک“ کے زور پر انہوں نے پاکستانی پاسپورٹ بنوائے تھے۔

میں نے تمام فوٹو فلم ترتیب واریک ڈبے میں رکھ کر محفوظ کر لیں اور فائلوں کے کاغذات کو بھی دوبارہ ترتیب دیکر فائل کر دیا اور دونوں فائلوں کو پلاسٹک میں اس طرح باندھ دیا کہ باقی میں گرنے سے وہ خراب نہ ہو جائیں۔ مکمل وائر پروڈنگ کے بعد میں نے انہیں جوٹ کے ایک تھیلے میں رکھ کر سی دیا۔ اب میں مطمئن تھا کہ اول تو انشا اللہ یہ فائلیں بحفاظت میرے سینئرز تک پہنچ جائیں گی اور اگر خدا نخواستہ نہ پہنچ سکیں تو ان کی فوٹو فلم میں پاکستان پہنچانے کا انتظام کروں گا۔ میں نے خفیہ روشنائی سے احمد گل میں مشن کی کامیابی اور مزید معلومات تحریر کیں۔ وقت مقررہ پر میرے ساتھی اسی ریسٹورنٹ میں مجھے ملے۔ وہ مکان میں ششٹ ہو چکے تھے۔ کچھ فرنیچر انہیں مالک مکان نے دیا تھا اور کچھ انہوں نے خرید لیا تھا۔ میں نے اپنی ڈاک میں اخراجات کی تفصیل لکھ دی تھی۔ اب مجھے اور میرے ساتھیوں کو مزید رقم کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اب مجھے دہلی میں اپنے طبقے کے لوگوں سے میل جول بڑھانا تھا اور میرے ساتھیوں کو بھی اپنے مشن کے اہداف کی طرف بڑھانا تھا۔

ہم سب کو اب CONTACT کی آمد کا انتظار تھا۔ ٹرانسمیٹر پر ہمارے پہلی بار رابطے کے بعد امکان تھا کہ ٹی بیڈیا ت ملیں گی۔ میرے دوست بھی جھانسی اور بامپنا دوبارہ جانے کو بے تاب تھے تاکہ اپنا مشن پورا کر سکیں لیکن میں نے انہیں ڈاک ملنے تک اس ارادے سے باز رکھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی فوجی علاقے میں ایک دو دھماکے کر کے ہم بھارتی سیکورٹی کو چوکس کر دیں۔ علاوہ ازیں دھماکے خیز مادہ اور ہینڈ گرنیڈ زمین بھارت سے اپنے ”بھدروں“ سے حاصل کرنے تھے۔ جن کے حصول کیلئے مجھے ان سے رابطہ کرنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ کام موخر کر دیا جائے۔ بہر حال میرے چاہنے نہ چاہنے کی بات نہ تھی بلکہ ہمیں اوپر کے احکامات کی تعمیل کرنی تھی۔

CONTACT کی آمد میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ میں نے ان دنوں کی شامیں اشوکا اور اکبر ہوٹل میں گزاریں۔ اب میں نے اپنی پوری توجہ سروسز کلب میں داخل ہونے اور وہاں راہ و رسم بڑھانے پر مرکوز کر دی تھی۔

مقررہ دن اور وقت پر CONTACT ملا۔ اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ اس کے ہمراہ ایک اور آدمی بھیجا گیا ہے اور وہاں کھڑا ہے۔ اپنی تسلی کیلئے میں غلٹے غلٹے اس نئے آدمی کے قریب سے گزرا اور سگریٹ جلانے کیلئے اس سے ماچس مانگی۔ جو اباس نے کہا جس تو بچھے لیکن ایک سگریٹ آپ مجھے دیں۔ یہ ہمارے آدمی کیلئے مستقل کوڈ تھا۔ صحیح جواب ملنے پر میں نے اسے سگریٹ دیا اور اپنا سگریٹ سلا کر غلٹے غلٹے واپس آ گیا۔ CONTACT وہیں تھا۔ میں نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا جو مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ میرے سامنے سے گزر کر دوسری جانب کھڑا ہوا۔ جہاں CONTACT اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ڈاک اس کے پاس تھی۔ میں نے CONTACT سے اپنی ڈاک لی اور اسے کہا کہ اب اس جانب چلے جاؤ۔ میرا ساتھی تھا۔ پیچھے سے بھی چل پڑا۔ ادھر CONTACT کا ساتھی بھی فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ میں نے اپنے ساتھی کے پاس سے گزرتے ہوئے ڈاک اسے تھمائی اور پیچھے والی ڈاک کا پیکٹ اس سے لے لیا۔ میرا ساتھی فوراً وہاں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر ڈاک کا پیکٹ لے لے میں CONTACT کے پاس پہنچ گیا۔ کسی کی نظروں میں آنے بغیر میں نے پیکٹ اس کے حوالے کیا۔ اس سے پہلے میں CONTACT کو گاگلی ملاقات کے لئے ٹی جگہ، دن اور وقت کا بتا چکا تھا۔ پیکٹ لیکر CONTACT فوری وہاں سے چل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ہمراہی بھی کچھ فاصلہ دے کر اس کے پیچھے جا رہا تھا۔ دہلی کی گنجان آبادی میں، میں CONTACT سے سیدھا بھی مل سکتا تھا اور ڈاک کا تبادلہ کر سکتا تھا لیکن کسی بھی خطرے کے امکان کو پیش نظر رکھ کر یہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ بہر حال یہ مرحلہ پیرو عافیت طے ہوا۔ ڈاک لے کر میرا ہمراہی اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ وہ پہلے سے مقررہ وقت پر گھر سے باہر آ کر مقررہ جگہ پر میرا انتظار تھا۔ میں نے ڈاک کا پیکٹ اس سے لے لیا اور اپنے ہوٹل آ گیا۔ ڈاک میں کچھ ٹی بیڈیا ت تھیں اور میں ہزار روپے میرے ساتھیوں کے لئے اور دس ہزار روپے میرے لئے تھے۔ ہمیں رقم تو خاصی مل رہی تھی لیکن ایک ایک پیسے کا حساب ہم رکھتے تھے۔

غالباً یہ ہفتے کی شام تھی جب اشوکا ہوٹل میں ایک نفری پروگرام ترتیب دیا گیا تھا جس میں فلورڈانس بھی تھا۔ ٹکٹ پر اس پروگرام میں داخلہ تھا۔ میں نے ٹکٹ لینا چاہا تو معلوم ہوا کہ صرف جوڑوں کو داخلہ کی اجازت ہے۔ مجھے خاتون ساتھی کی ضرورت تھی جو اشوکا کی لابی میں پوری ہوگی۔ اونچی سوسائٹی میں داخل ہونے کی خواہشمند غریب گھرانوں کی لڑکیاں ان فائیو اشارہ پولوں کی لابی میں اکثر شام کو بیٹھی مل جاتی ہیں جو ایسے لوگوں کی تلاش میں آتی ہیں جو ان کی شام کا خرچ بھی اٹھا سکے۔ میں نے ایسی ہی ایک لڑکی کو دعوت دی۔ وہ فوراً ہی مانگی۔ میں نے ٹکٹ لینا، ہال میں داخل ہونے اور ایک ٹیبل پر قبضہ جمایا۔ آہستہ آہستہ مختلف جوڑے ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد فلورڈانس شروع ہو گیا۔ اکبر ہوٹل میں دو تین بار دیکھا ہوا ایک جوڑا بھی وہاں موجود تھا۔ شوہر بوڑھا اور بیوی جوان۔ دونوں سے نوشی میں مصروف تھے۔ میں نے اپنی ساتھی لڑکی سے پوچھا تو وہ تیار ہو گئی اور ہم فلورڈانس آگے۔ SQUARE ڈانس کے لئے شروع ہوئی آکسٹریا ڈھن تیز ہوتی گئی اور بالآخر اس دور کے مشہور ترین ROCK-N-ROLL پر ختم ہوئی۔ بوڑھے شوہر پر بھی سے اثر کر چکی تھی۔ وہ بھی اپنی ساتھی کے ہمراہ فلورڈانس آ گیا۔ ROCK-N-ROLL میں تیز ڈھن پر تپتے ہوئے جلد ہی وہ ہانپ گیا۔ میں ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ مغربی اصول کے مطابق میں نے اس بوڑھے کی پیچھے پر آہستہ سے انگلیاں بجائیں۔ وہ اس عورت سے الگ ہو گیا اور وہ عورت میرے ساتھ آئے۔ ناچ میں وقفہ ہوا تو میں اس عورت کو اس کی ٹیبل پر چھوڑنے گیا۔ اپنا تعارف کروا لیا۔ دونوں کا شکر یہ ادا کیا۔ اس عورت نے مجھے اپنی ٹیبل پر بیٹھنے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔

دوران گفتگو معلوم ہوا کہ مصوف ایک ٹھیکیدار ہیں اور خاتون ان کی بیگم ہیں۔ آکسٹریا تیز آواز اور نونوں کی اونچی آواز میں گفتگو کے خالص طور پر رکھا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ٹھیکیدار صاحب نے ٹیبل پر میری موجودگی اور اپنی بیگم کے ساتھ میرے ناچنے کو پسند نہیں کیا۔ میں ان سے اجازت لے کر اٹھنے ہی والا تھا کہ ڈانس پھر شروع ہو گیا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آکسٹریا نے میری پسندیدہ ڈھن Come September بجانی شروع کی۔ یہ اس دور کی بات ہے جب ”آتش جوان“ تھا۔ میرے پاؤں بے اختیار زرخش پر پہنچے شروع ہوئے ٹھیکیدار کی بیوی جو جوان اور خاصی پرکشش تھی اس نے مخمور آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا۔ میں کرسی سے اٹھا۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی کھڑی ہو گئی اور ہم فلورڈانس پر آ کر ناچنے لگ گئے۔ اس ڈھن پر Square یعنی Slow ناچ لیا جاتا ہے اور ناچنے والوں کے جسم ایک دوسرے کے بہت قریب آجاتے ہیں۔ کچھ ماحول کا اثر، کچھ مے کا نشہ اور جوانی کا جوش چند قدم لینے کے بعد ہی اس عورت نے اپنا سر میرے سینے سے لگا دیا۔ میں نے سرگوشی میں اس کا نام پوچھا تو اس نے آٹھا بتایا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے محسوس ہوا ہے کہ تمہارے شوہر نے میرے تمہارے ساتھ ناچنے کو پسند نہیں کیا۔ ”وہ سوائے ناپسند کرنے کے اور کچھ کیا سکتا ہے“۔ اس نے بڑے ذومعنی انداز میں جواب دیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں نے اکبر ہوٹل میں تمہیں دو تین بار دیکھا تھا اور تمہارے حسن سے متاثر ہونے بغیر نہ رہ سکا۔ آج اشوکا میں اس پروگرام میں تمہیں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو نہ نہرکا۔ لابی سے ایک لڑکی لی اور اس کے ہمراہ اندر آیا کیونکہ صرف جوڑوں کو آنے کی اجازت ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو سچی تھی کہ وہ تمہاری بیوی ہے۔ وہ فیس پڑی اور اسی مخمور لہجے میں کہنے لگی۔ تم مرد بڑے شیطان ہوتے ہو۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ٹھیکیدار صاحب کی پہلی بیوی مر چکی ہے اور اس بیوی کی اولاد میں اس سے بڑی ہے میں نے اسے کہا کہ شاید تم سے (بہت جلد) گھٹھو لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں تم سے بہت متاثر ہوں۔ میں ہمیں سے آیا ہوا ہوں اور لوہی ہوٹل میں مقیم ہوں۔ کاروبار کے سلسلے میں دہلی میں چند ماہ رہنا ہے۔ غیر شادی شدہ ہوں محض اس لئے کہ اب تک پسند کی کوئی عورت ملی نہیں۔ بالکل تنہا ہوں۔ میں چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس سے بہت سی باتیں کر کے اسے اپنی جانب راغب کر لوں، ممکن ہے بعد میں ایسا موقع نہ ملے۔ اس نے اسی مخمور لہجے میں کہا کہ پہلے تمہارا تبہ اب تمہاری ہے۔ اس نے لوہی ہوٹل میں میرا کمرہ نمبر پوچھا اور وہاں نشیمن کرنے کیلئے دوبارہ نام بھی پوچھا اور ناچتے ہوئے پھر میرے سینے پر سر رکھا دیا۔

جن قارئین کو ایسی اونچی سوسائٹی میں جانے کا موقع نہ ملا وہ انہوں نے سنا تو ضرور ہوگا کہ برصغیر سے رخصت ہوتے ہوئے انگریز اپنی لعنتی زندگی کی روایات یہاں چھوڑ گئے اور اس معاشرے کے لوگ مغرب کی نقل میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ مغرب کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ بھارت میں تو اب شہر کی آدھی آبادی اسکرٹ اور جینز پہنتی ہے۔ یہ بدل کلاس لوگ ہیں جبکہ اپر کلاس تو مغرب نوازی میں ان حدوں کو بھی پار کر چکی ہے۔ بھارتی فلموں کے ویڈیو کیسٹ میری بات کی گواہی دیں گے کہ جو عہد بنیاد ہم مغربی فلموں میں دیکھتے ہیں پاتے وہ بھارتی فلموں میں ہمیں ملتی ہے۔

ناچ ختم ہوا اور میں اشوکا کو اس کی ٹیبل پر چھوڑ کر اپنی ٹیبل پر آ گیا۔ میری PAID FRIEND اس دوران بیزار اور ہسکی کے نشے میں مدہوش ہو چکی تھی۔ میں خود بھی اس ماحول سے اب نکلنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اشوکا اور اکبر جیسے فائیو اشارہ پولوں میں صرف دو سو روپے میں کوئی جوڑا اپنی شام گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ محض نفری پروگرام اور ٹکٹ کی وجہ سے چلی کلاس کے شو رول چمانے والے لوگ وہاں طوفان بدتمیزی برپا کئے ہوئے تھے۔

میں نے بل ادا کیا اور PAID FRIEND کولابی میں کوئی اور شکار ڈھونڈنے کے لئے چھوڑ کر اپنے ہوٹل چلا آیا۔

اگلے روز صبح 11 بجے میرے فون کی گھنٹی بجی۔ میں حیران تھا کہ مجھے فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے فون اٹھایا تو آٹھنسی۔ اس کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی تک اس کا نشہ نہیں اترا۔ رگی کلمات کے تبادلے کے بعد اس نے کہا کہ تم میں سے ملنے تمہارے ہوٹل آ رہی ہوں اور لہجہ تمہارے ساتھ ہی کروں گی۔ میں نے اسے لابی میں ملنے کو کہا اور تیار ہو کر لابی میں آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی پہنچ گئی اور ہم کافی شاپ کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ رات بھی تمہارا شوہر ہمارے ناچنے پر ناراض دکھاتا دیتا تھا اور اب تم کیلی یہاں آ گئی ہو۔ وہ ہنسنے لگی اور بولی کہ بے چند (یہ اس کے شوہر کا نام تھا) کی تارکھی اور غصہ شراب کا نشہ اترا ہے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ THE IS NOT A HE MAN اس نے کہا کہ وہ اب بھی اچھی طرح محسوس کرتا ہے کہ میرے ساتھ اس کا بنا ہوا صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اگر HE KEEPS HIS EYES AND EARS SHUT اونچی سوسائٹی کی جوان بیوی اور بوڑھے شوہر کی ازدواجی زندگی کو آٹھنسی کے سات لفظوں میں بیان کر دیتا تھا۔

ہم دونوں ایک ٹیبل پر بیٹھے اپنے اپنے منصوبوں اور خواہشات کی تکمیل کے متعلق سوچنے لگے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر ہرے لہجے میں پوچھا۔ I BELIEVE I AM NOT THE FIRST MAN IN YOUR LIFE OTHER THAN YOUR HUSBAND (میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے شوہر کے علاوہ تمہاری زندگی میں داخل ہونے والا میں پہلا مرد نہیں ہوں) وہ پھر ہنسنے لگی اور کہا IF YOU THINK SO YOU ARE A FOOL (اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تم ایک احمق ہو)۔ وہ بلا جھجک مجھے بتانے لگی کہ میرا شوہر ٹھیکے لینے کیلئے صاحب اختیار رانسران کو اکثر پارٹیاں دیتا ہے اور انہیں خوش کرنے کے لئے مجھے آگے کرتا ہے۔ صاحب اختیار بنتے بنتے یہ لوگ عمر کی اس حد میں داخل ہو چکے ہوتے ہیں کہ جسمانی طور پر ”بیکار“ ہو چکے ہوتے ہیں۔ میرے والد بھی ٹھیکیدار تھے اور ایک ٹھیکے میں انہیں اتنا نقصان ہوا کہ وہ سنبھل نہ سکے اور بے چند نے میرے والد کی مالی امداد کر کے مجھے خرید لیا۔ اگر بے چند مجھ سے مخلص ہوتا تو میں عمروں کے اتنے تفاوت کے باوجود ایک اچھی بیوی ثابت ہوتی لیکن بے چند نے ٹھیکوں کے حصول کے لئے مجھے پینا شروع کر دیا۔ اب ہم دونوں میں ایک سمجھوتہ سا ہو گیا ہے کہ اس کی دی ہوئی پارٹیوں میں، میں اس کے لئے ٹھیکے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور وہ میری ذاتی ACTIVITIES کے متعلق کچھ نہیں پوچھتا۔ شراب کے نشے میں اگر اسے کبھی کبھار غصہ آ بھی جاتا ہے تو میں اس کی کمزوریاں اس کے سامنے لے آتی ہوں اور وہ خاموش ہو جاتا ہے۔

کافی دیر باتیں کرنے کے بعد جب میں نے اسے لہجے کے لئے ڈانٹنگ ہال چلنے کو کہا تو اس نے کہا کہ کافی شاپ میں SNACKS سے ہی پیٹ بھر چکا ہے۔ وہ بار بار مجھے کہہ رہی تھی کہ اپنے کمرے میں چلو اور میں ہر بار اس کا ہیبان کسی دوسری طرف پلٹ دیتا تھا۔

قارئین کی خدمت میں عرض ہے کہ میں متقی یا فرشتہ نہیں۔ ایک حسین اور جوان عورت کی ایسی کھلی دعوت کو ٹھکرانا بہت مشکل تھا لیکن میں عورت کی فطرت سے بخوبی واقف تھا کہ جب تک اس قماش کی خواہش پوری نہیں ہوتی وہ تسکین خواہش کے لئے نہ صرف پڑتی رہتی ہے بلکہ اپنے مقصد کیلئے خطرناک حد تک آگے جاسکتی ہے۔ ایک بار خواہش پوری ہو جائے تو وہ اس شخص کو اپنے ”فتح شدہ“ مردوں کی فہرست میں شامل کر کے کسی نئے ADVENTURE کی تلاش شروع کر دیتی ہے اور اس نے اپنی زندگی کے جو پہلو مجھے بتائے تھے، ان کے مطابق وہ میرے بڑے کام آسکتی تھی۔

غازی

بالآخر میں نے اسے کہا کہ میں RECEPTION پر جا کر بتا دوں کہ شام تک نئی کوئی ملنے والا مجھے ڈسٹرب کرے اور نہ ہی کوئی فون کال مجھے ٹرانسفر کی جائے۔ RECEPTION پر جا کے میں نے 50 روپے کلرک کی مٹھی میں دیئے اور کہا کہ ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ مجھے فون کرے اور میری آواز سننے ہی فون بند کر دے۔ یہ انتظام کر کے میں آشا کے پاس آیا اور اسے لے کر کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی آشا نے تکلفی سے میرے بیڈ پر نیم دراز ہو گئی۔ میں نے ”فوری حملے“ سے بچنے کے لئے اسے کہا کہ کیوں نہ اس موقع کو اور پر لطف بنا لیں۔ میں نے فون پر بار مین سے کہا کہ ایک پوسٹل اسکاچ ہسکی اور برف بھیجے۔ یہ فون کر کے میں نے اسے اشارے سے بتایا کہ میں باتھ روم میں جا رہا ہوں۔ ابھی میں باتھ روم سے نکلا بھی نہیں تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ فون آشا نے اٹھایا اور ریسپونڈ پر رکھ دیا۔ میں اس دوران باتھ روم سے باہر آ چکا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ میرا فون ہے۔ دوسری طرف ریسپنڈ تھا۔ میری آواز سن کر اس نے فون بند کر دیا۔ ادھر میں نے فون پر پیکٹرف بہت شروع کر دی کہ ریش صاحب آپ؟ آپ نے آنے کی کیوں زحمت کی۔ مجھے فون کر دیا ہوتا۔ میں فوراً حاضر ہو جاتا۔ اچھا تو کیا آپ کے پارٹنر بھی ساتھ ہیں۔ آپ براہ کرم لابی میں بیٹھیں۔ میں فوراً حاضر ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ آشا نیم باز آنکھوں سے مجھ دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ غضب ہو گیا۔ دہلی میں میری چائے کے پنجاب اور ہریانہ کے ایجنٹ اپنے پارٹنر کے ساتھ آئے ہیں۔ میں نے ریسپنڈ کو کوسا میری ہدایت کے برعکس اس نے انہیں کیوں بتا دیا کہ میں کمرے میں ہوں۔ اب مجھے ان سے ملنا اور ان کے ہمراہ ان کے دفتر جانا پڑے گا۔

آشا کچھ مایوس ہی ہو گئی۔ میں نے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور کہا کہ آج تو رنگ مجھے سے پہلے ہی بھنگ پڑ گئی لیکن آنے والے دنوں میں آج کی کوفت کی پوری طرح سے تلافی کریں گے۔ آشا نے میک اپ درست کیا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر وہ مجھے اپنا فون نمبر دے دے تو میں اسے فون پر سنے پروگرام سے آگاہ کروں گا۔ آشا نے خاموشی سے میز پر پڑے بیڈ پر نمبر لکھا اور راجا تک مجھ سے کہنے لگی۔ VINOD I PROMISE I WILL WIN YOU اس نے دوبارہ اپنا میک اپ ٹھیک کیا اور ہم کمرے سے نکل کر لفٹ میں نیچے آ گئے۔ میں اسے چھوڑنے کیلئے باہر تک آیا۔ پارکنگ میں وہ ایک غیر ملکی CONVERTIBLE گاڑی میں بیٹھی اور تیز رفتاری سے ڈرائیو کر کے چلی گئی۔ میں واپس کمرے میں آیا اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے کرتے سو گیا۔ آشا سے میں اپنا میل جول نہ صرف برقرار رکھنا بلکہ بڑھانا چاہتا تھا۔ اس قسم کی عورتوں کے تعلقات اونچی سوسائٹی کے بر طبقے کے لوگوں سے ہوتے ہیں۔ آشا کے ذریعے میں بہت سے کام کے لوگوں سے مل سکتا تھا۔ آشا کو میں ایک قیمتی مہرہ کی طرح سنبھال کر استعمال کرنا چاہتا تھا۔

وہ شام میں نے ہوٹل میں ہی گزاری۔ صرف اپنے کپڑے لینے کنات پیلس گیا۔ ٹرائی کیلئے کپڑے تیار تھے۔ میں نے ٹرائی دی اور دو دن بعد اپنے کپڑے لے آیا۔ اب میں پوری طرح سے اس اونچی سوسائٹی میں داخل ہونے کے لئے تیار تھا جس میں سینئر سول اور فوجی افسران کی بہتات تھی۔

ادھر میرے ساتھی بھی بکارت نہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے آری ہیڈ کوارٹر کے جن سول افسروں اور کراؤن گھر اور دفتر میں ان کی پوزیشن کا پتہ لگایا تھا۔ ان کے گھریلو حالات، گھر میں رہنے والے افراد خصوصاً بچوں اور جوان بچیوں اور غیر شادی شدہ بہنوں کے متعلق بھی معلومات حاصل کیں۔ یہ تمام معلومات انہوں نے مجھے دیں اور میں نے اپنی ڈائری میں کوڈورڈز میں نوٹ کر لیں۔ یہ معلومات ہمارے لئے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔

پیسے تو ہمارے پاس خاصے تھے۔ میں نے لوہی ہوٹل میں ایک امریکی جوڑا دیکھا جن سے بات چیت میں معلوم ہوا کہ وہ کٹھمنڈو جا رہے ہیں۔ میں نے ایک بات نوٹ کی کہ وہ جوڑا تقریباً ہر رات ہوٹل کے باغ کے ایک کونے میں اندھیرے میں بیٹھتا تھا۔ میں ایک رات جھاڑیوں کے پیچھے ان کے قریب پہنچا تو

جس کی بو آئی مجھے فوراً ایک بات سوچھی اور میں اچانک ان کے سامنے آ گیا اور کہا کہ یہاں حشیش پینا متی ممنوع ہے اور تم کھلے عام پی رہے ہو تم کو پکڑا دوں تو کئی سال کی جیل ہو جائے گی۔ وہ ڈر گئے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں انہیں پکڑواتا نہیں چاہتا۔ میری نظر ان رولر فلیکس کیمرے پر تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ یہ کیمرہ میں خریدنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے اپنی قیمت پر۔ بولوا بولوا کیا صلاح ہے۔ وہ اتنے خوف زدہ تھے کہ فوراً مان گئے۔ میں نے انہیں اسی وقت لے کر ریسٹیشن پر آیا۔

وہ عورت کمرے سے اپنا کیمرہ لے آئی اور میں نے چھو روپے کے عوض ان کا کیمرہ خرید لیا اور فرنٹ آف شینجر اور کیشیز کے رسید پر دستخط لے لئے تاکہ بعد میں وہ شور نہ مچا سکیں۔ وہ تو کچھ ایسے ڈرے کہ دوسرے دن ہی ہوٹل سے چیک آؤٹ ہو گئے۔ میں نے کیمرہ اپنے نمبر 2 یعنی ٹرانسمیٹر آپریٹر کو دیا اور کہا کہ اس کیمرے سے آری ہیڈ کوارٹر کے سول ملازمین جن کا وہ تعاقب کر چکے ہیں ان کی تصویریں اتاریں اور ان کے گھر کے افراد کی تصویریں بھی بنا لیں اور گھر والوں کے نام معلوم کریں اور تصویروں کے پیچھے ان کے نام انگلش میں لکھ دیں اور ان کے متعلق جو مزید معلومات حاصل کریں۔ وہ مجھے لکھ کر دیں۔ علاوہ ازیں ہیڈ کوارٹر کے صفائی کرنے والے خا کروں کا پیچھا کریں اور ان کے گھروں کے ایڈریس اور نام وغیرہ معلوم کریں اور ان کی بھی تصویریں حاصل کریں۔

بھارت میں شو در یعنی ہر جگہ صفائی کا کام ہزاروں برس سے کرتے آئے ہیں۔ آزادی کے بعد ان کا خیال تھا کہ شاید اب ذات پات کی تمیز ختم ہو جائے گی لیکن ہوا اس کے الٹ۔ انگریزوں کے راج میں اونچی ذات کے ہندوان نیچے ذات والوں پر اتنا ظلم نہیں کر سکتے تھے لیکن آزادی ملنے کے بعد تو انہیں ہر طرح کی آزادی مل گئی۔ شو در کو ہر جگہ نام تو دے دیا گیا لیکن ہر گاؤں میں باقی گاؤں سے الگ انہیں رہنے کی جگہ دی گئی اور ایک سرخ چھتہ ان کو اپنی بستی پر لانا لہرانے کا حکم دیا گیا۔ ان کے کونوں اور مندر تک الگ ہیں اور کوئی ہر جگہ اونچی ذات کے ہندوؤں کے کنوؤں سے نڈو پانی پی سکتا ہے اور نہ ہی ان کے مندروں میں جا سکتا ہے۔ اس صورت حال کو ہر جگہ زیادہ عرصہ برداشت نہ کر سکے اور ہر جگہ مرد ڈاکوؤں کے علاوہ پھولن دیوی جیسی درجنوں ڈاکوؤں کی ٹولیاں بتیں جنہوں نے اونچی ذات کے ہندوؤں سے اپنی ذلت کا خوب خوب بدلہ لیا۔ ہندو اب ہر جگہ پر بہت کم اعتبار کرتے ہیں۔ صفائی کرنے والے ہر جگہوں کے علاوہ عیسائی بھی ہیں۔ بھارتی افواج میں صفائی کیلئے عیسائی رکھے جاتے ہیں اور میرے منصوبے کے مطابق مجھے ان ہی صفائی کرنے والوں سے بہت کام لینا تھا۔ اس لئے میں ان کے متعلق تمام ممکنہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے چاروں ساتھیوں کو اس کام پر لگا دیا۔ اس دوران مجھے آشا کے دو تین فون آئے اور میں نے اسے فون پر اپنی تڑپ اور محبت کا کچھ ایسا یقین دلایا کہ اس کی آتش شوق کچھ اور بھڑک اٹھی۔ میں نے اسے کہا کہ میری چائے کی بہت بڑی کھپ بہی پہنچ چکی ہے۔ یہی کی مومن سون اور نی میں وہ چائے زیادہ دیروہاں اسٹور نہیں کی جاسکتی اور میں اسے اس علاقے میں بیچنے کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ اس لئے اس سے نڈل رکھا اور مزید چند روز مصروف رہوں گا۔

ایک روز میں دوپہر سے ذرا پہلے سرو سڑک بچلا گیا۔ وہاں ریسٹیشن میں بورڈ پر وہاں رہائش پذیر افسروں کے نام اور رینک لکھے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی وہ نام اور رینک نوٹ کئے اور کلب سیکریٹری کے کمرے میں چلا گیا اور لکھے ہوئے ناموں میں سے ایک کرنل کا پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ اس وقت تو وہ ڈیوٹی پر لگے ہوئے ہیں اور شام کو 7 بجے کے بعد مل سکیں گے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں نے کرنل صاحب کو پہلے سے نہیں دیکھا۔ ایک دوست کے REFERENCE سے ملنا چاہتا ہوں۔ سیکریٹری نے کہا کہ شام کو وہ بھی یہیں ہوگا اور مجھے کرنل کے پاس لے جائے گا۔ اور

اسی شام اچھی طرح ڈریس اپ ہو کر میں سرو سڑک بچلا گیا۔ سیکریٹری اپنے دفتر میں موجود نہ تھا۔ میں کلب کے لان میں ٹھلنے لگا۔ کلب میں ممبروں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ ٹھلنے کے دوران میں ان پر بھی نظر رکھ رہا تھا۔

سول اور یونیفارم میں کچھ جوان آفیسر زلان میں ایک الگ گروپ بنائے کھڑے تھے۔ جبکہ ان سے کچھ فاصلے پر اڈیٹر عریٹا پراس کا اپنا الگ گروپ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان سے بالکل علیحدہ لان کے دوسرے کونے کے قریب ایک بڑی بڑی موٹھوں والا ادھیر شخص ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ سامنے میز پر اعلیٰ غیر ملکی ہسکی اور بولوا Bowl اور میز کی دوسری جانب ایک خالی کرسی پڑی ہے۔ محض تجسس کی وجہ سے میں ہلٹا ہلٹا اس کی طرف گیا۔ وہ آہستہ آہستہ شراب کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کے پیچھے ڈرانا صلے پر ایک شخص جو صورت سے BATMAN لگتا تھا۔ سو دب طریقے سے کھڑا تھا۔ میں اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑا

ہو گیا اور ادھر ادھر اچھتی لگا ہوں سے دیکھنے لگا۔ کبھی کبھی اس کی طرف بھی دیکھے مگر اتارے ہوئے دیکھتا اور کبھی اپنی گھڑی پر وقت دیکھنے لگتا۔ میں ظاہر کر رہا تھا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے حزل (ر) گل حسن یاد آ گئے جو وہ دن سروس بھی راولپنڈی میں ہمیشہ فلیش میں ہوٹل میں رہتے تھے اور سر شام ہی لان میں اپنی محفل سجاتے تھے اور کراچی میں بریگیڈ میز (ر) نصیر الدین ہاویوں KDA کے سابق چیئر مین کراچی جیم خانے میں سب سے الگ تھلگ اسی طرح شام گزارتے تھے۔ یہاں ایک بات شاید قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو کہ حزل گل حسن نے اپنی صدر حزل کی بیٹی خان کا اتعفیٰ لیا تھا اور بیٹو صاحب کو چیف مارشل لایا انٹرنیٹ اور صدر بنایا تھا اور صرف 6 مہینے فوج کا سربراہ رہنے کے بعد صدر سے اختلاف کی وجہ سے انہیں اس عہدے سے ہٹا دیا گیا۔

میں سوچنے لگا کہ شاید یہ موٹھوں والا بھی مجر د زندگی گزار رہا ہے اور میرا یہ قیاس و فیصد درست نکلا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے جب اس نے مجھے مخاطب کیا اور اپنے پاس آئے کو کہا۔ اس کی آواز کے رعب اور دب بے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بریگیڈ میز سے کم رینک کا نہیں ہے۔ میں اس کے قریب گیا تو اس نے کہا ARE YOU WAITING FOR SOME ONE I ARE YOU FROM ARMED FORCES? (کیا تم کسی کا انتظار کر رہے ہو۔ کیا تم مسلح افواج میں ہو)۔ میں نے اسے کہا کہ جناب آپ نے آدھا درست کہا ہے۔ میں ایک صاحب کے انتظار میں ہوں لیکن میں سو بلیں ہوں۔ وہ سر ہٹا کر ایک فوجی تھا۔

اس نے میرے سر اچھے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا WHAT A SHAME! کہ تم جیسا انسان فوج میں نہ ہو۔ اگر تم چاہو تو میرے ساتھ بیٹھ سکتے ہو اور میں خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے کہا کہ میں فوج میں کرنل ہوں اور حزل ہیڈ کوارٹر میں کام کرتا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ آپ نے ایک بات نہیں بتائی کہ آپ غیر شادی شدہ ہیں۔ وہ چند سیکنڈ مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”تم کیسے جانتے ہو“۔ میں نے جواب دیا SIR, THIS IS OBSERVATION AND FACE READING میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی کہ ”آپ کا چہرہ بتا رہا ہے کہ آپ انتہائی قوت ارادی اور فیصلہ کن شخصیت کے مالک ہیں۔ آپ نے صرف ایک بار محبت کی اور اس میں ناکامی کے بعد آپ نے فوج اور ڈپلن سے شادی کر لی اور شام کا وقت جو آپ کے ماضی کی تلخ یادوں کو تازہ کر دیتا ہے، آپ شراب میں ڈوب کر گزارتے ہیں“۔ کرنل ہکا کا چند لمحے مجھے بتا رہا۔

مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کرنل بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو ضبط کر رہا ہے۔ وہ کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک پیگ بنا کر میرے سامنے رکھا اور کہا سو ڈیپائی میں نے جواباً ON THE ROCKS کہا۔ اس نے میرے گلاس میں برف کے چند کھڑے ڈال دیئے۔ کرنل نے میری باتوں کا تو کچھ جواب نہ دیا لیکن یہ کہا کہ مجھے تم سے مل کر مسرت ہوئی اور جب بھی جی چاہے شام کو میرے پاس آ جاؤ کرو۔ BAT MAN کو بلانے کے لئے سر پیچھے کیا

تو میں نے اپنا گلاس لان کی گھاس پر اٹھیل دیا اور تھوڑی دیر کے بعد معذرت چاہتے ہوئے اس کے پاس سے اٹھ آیا۔

اس کرنل کا نام فنکر تھا اور بعد کے صفحات میں آپ پڑھیں گے کہ اس کرنل کی وجہ سے کتنی کامیابی ہوئی۔ میں کلب سیکریٹری کے دفتر میں گیا۔ وہ دفتر میں موجود تھا۔ وہ مجھے لے کر کلب کی بار میں صوفوں پر بیٹھے ایک گروپ کی طرف لے گیا اور ایک شخص کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ کرنل ”مدن بیٹھے ہیں“ پھر

اس کے قریب جا کر اسے کہا ”نمر یہ صاحب دن کو کبھی آپ سے ملنے آئے تھے“۔ کرنل مدن نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے کہا کہ ”مدن جوشی کے Reference سے آپ کے پاس آیا ہوں“ جوشی کا نام میں نے خود گھڑ لیا تھا کیونکہ بھارت میں جوشی نام کے آخر میں بہت استعمال ہوتا ہے۔ کرنل مدن نے چند لمحے ذہن کو کرایا اور کہا؟ YOU MEAN COL. JOSHI OF IT PUNJAB میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ

میرا ان سے دور کی رشتہ داری ہے۔ میں چو پڑا ہوں کرنل بیٹھے ہوئے تھا۔ مجھ سے گرجوشی سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ جوشی اور میں جیسور میں اکٹھے تھے (سابقہ مشرقی پاکستان کی ایک چھاؤنی جہاں 71ء کی جنگ میں گھسان کارن پڑا تھا اور پاکستان اور بھارت کی پنجاب رجنوں نے انتہائی بہادری سے دو بدولتے ہوئے بھاری جانی نقصان اٹھایا تھا) کرنل نے صوفے پر مجھے بیٹھا یا اس دوران میں نے اپنا کاروباری تعارف اس سے کرایا۔ کرنل نے مجھے

پینے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی اور کہا کہ آپ سے ملنے کا میرا مقصد یہ تھا کہ میں یہاں دہلی میں بہت بور ہو چکا ہوں۔ خصوصاً شام گزار تو ایک عذاب ہے۔ اسی لئے آج دن کو کبھی آپ سے ملنے آیا تھا اور اب بھی اس لئے آیا ہوں کہ کم از کم ایک شام تو سترے ماحول میں گزار جائے۔ کرنل نے جواباً کہا کہ BE MY GUEST میں یہاں کلب میں ہی رہتا ہوں اور میں کلب سیکریٹری کو ابھی بلا کر کہے دیتا ہوں کہ تم جب بھی کلب میں آنا چاہو تو ہمیں میرے مہمان کی صورت میں ٹریٹ کرے۔ اس کے ساتھ ہی سرگوشی میں مجھے کہا کہ جب اکیلے آؤ تو اپنا بل ضرور ادا کر دیا کرنا۔ میں نے کہا I WILL AND THANKS FOR YOUR HOSPITALITY۔ کرنل نے اپنے ساتھیوں سے میرا تعارف کرایا۔ ان کی گفتگو کا سلسلہ جو میری آمد سے

ٹوٹ گیا تھا۔ پھر شروع ہو گیا اور میں بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لینے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ افسران سے روشناسی اور بے تکلفی ہو جائے۔ اس دوران کرنل مدن نے کلب سیکریٹری کو بلا کر میرے لئے ہدایت دے دیں اور تھوڑی ہی دیر میں، میں ان میں گھل گیا۔ کلب میں آفیسر ز ایوننگ جنیکلس یا ایوننگ سوٹ میں آ رہے تھے۔ وہاں اس فوجی افسران کی پہچان بہت آسان ہوتی ہے۔ آفیسر چاہے کسی بھی رینک کا ہو ”بار کے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے اٹمنشن ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بغیر ٹوپی کے سلیوٹ کیا جاتا ہے اور جو کا داکا سو بلیں آ رہے تھے وہ سیدھے داخل ہو جاتے تھے۔ اس دوران کلب کی عمارت کے اندر سے زیادہ باہر لان میں رونق تھی۔ لان میں درجنوں میزیں اور کرسیاں رکھی گئی تھیں اور فوجی آفیسر اور چند جوڑے

وہاں بیٹھے تھے۔ کرنل مدن نے قریب ایک گھنٹے بعد کارڈ روم میں مجھے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ میں نے انتہائی معذرت کرتے ہوئے کہا کہ مجھے تاش کے کھیل خصوصاً برج کھیلنا نہیں آتا۔ کرنل کے ہمراہ اس کے دو تین ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سب مجھرا اور لفٹیننٹ کرنل تھے جو باقی بیٹھے رہے میں نے تھوڑی دیر بعد ان سے اجازت لی اور لان میں چلا آیا۔

ٹرینگ کے دوران مجھے بتایا گیا تھا کہ کپٹن اور نئے میجر تک کے افسران بہت محتاط ہوتے ہیں جبکہ HIGH BRASS یعنی میجر سے اوپر کے افسران زیادہ احتیاط نہیں کرتے۔ اگر ان HIGH BRASS سے میل جول ہو جائے تو پھر فوجی افسر بھی سینئر کے ساتھ ملنے جلنے والوں پر شک نہیں کرتے۔ میں کچھ دیر لان میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھاس ہاتھ میں پکڑے ہلٹا رہا اور پھر واپس اپنے ہوٹل چلا آیا۔ دہلی میں برسات کا آغاز ہو چکا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی بوند باندنی شروع ہو گئی اور پھر گھٹاپوں ٹوٹ کر برسی کہ ہر طرف جل تھل ہو گیا۔

یہاں میں قارئین کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہم 15 افراد جو پاکستان سے مشن کی تکمیل کیلئے بھارت آئے تھے کوئی غیر معمولی انسان نہ تھے۔ یہ تو ہمارا جذبہ تھا جس کے تحت ہم نے اس خطرناک کام کو انجام دینے کا بیڑا اٹھایا تھا اور خود کو ڈابنڈ کر لیا تھا۔ بھارت میں کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ہمیں کچھ ناکامیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔ دہلی میں آشا سے ملنا، سرو سڑک میں کرنل فنکر اور کرنل مدن سے ملنا، میرے ساتھیوں کا آری ہیڈ کوارٹر کے سول ملازمین کے دفتر کی ادھر گھریلو حالات کی چھان بین کرنا اور اس کے علاوہ ہماری مزید بھاگ دوڑ اور کوششوں کا صرف ایک مقصد تھا کہ ہم ہیڈ کوارٹر میں ناصر ف داخل ہو سکیں بلکہ وہاں رابطے بھی پیدا کریں تاکہ ہم معلومات حاصل کر سکیں۔ ایک رابطہ کو تلاش کرنا اور اگر

اس میں ناکامی ہو پھر دوسرے رابطے کی تلاش کے بجائے میری حکمت عملی یہ تھی کہ ”ڈنن ٹاں اپنے ہدف“ پر چاروں طرف سے حملہ کیا جائے اس میں ناصر وقت کی بچت تھی بلکہ ڈنن کا کوئی WEAK POINT ملنے کا بھی قوی امکان تھا۔ ہمیں تازہ ترین معلومات اور ان کا تسلسل قائم کرنے کی ضرورت تھی اور اس کیلئے ہم چند نہیں بلکہ سینکڑوں رابطے تلاش کرنے کو تیار تھے، چاہے وہ اعلیٰ ترین ہوں یا کم ترین۔ ہم اپنے مقصد کے حصول کیلئے انتہائی بلندی اور پستی کی انتہائی گہرائیوں میں گرنے کو بھی تیار تھے۔ اسے آپ جنوں کہہ لیں، وطن سے محبت یا ستو ڈھا کہ کے لگے ہوئے رنوں کا درد کہ ہم ہر خطرے اور اس کے انجام سے بے پروا اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔

غازی

اگلا دن بارش کی نذر ہو گیا اور اس سے اگلے چند روز میں سرور کلب میں گزارے لیکن کامیابی کی کوئی صورت دکھائی نہ دی۔ سو مچھوں والے کرنل شکر سے بھی لان میں دو بار ملاقات ہوئی۔ اس کا میرے ساتھ رو یہ تھا دکا مجموعہ تھا۔ ایک طرف وہ پہلی ملاقات میں میری گفتگو سے کچھ جتنا سا لگتا تھا شاید وہ مجھ بیٹھا تھا کہ میں اس کے ماضی سے واقف ہوں یا اس کے اندر جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ دوسری طرف وہ میری کہنی سے خوش ہوتا تھا۔ ہر ملاقات کے خاتمے کے بعد آئندہ ملنے کے لئے زور دیتا تھا۔ اس کے مختار طرز سے پیش نظر میں نے بھی اس سے کبھی ہیڈ کوارٹر سے متعلق بات نہیں کی۔ ایک روز میں اس کے پاس 7 بجے شام گیا تو وہ اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے دروازہ KNOCK کیا تو بیٹ مین نے اسے میرے متعلق بتایا اور مجھے SITTING ROOM میں بٹھا دیا۔ کرنل شکر کے پاس دو کمروں کا بیٹ تھا۔ بیڈروم اور سٹنگ روم چھوڑی دیر بعد کرنل وردی پہنچے بیڈروم سے باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ اس نے کہا کہ اسے ایک آرجنٹ میٹنگ کے لئے ہیڈ کوارٹر جانا ہے۔ اس لئے وہ میرا ساتھ نہ دے سکے گا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس بریف کیس میں بجائے کتنی اہم فائلیں ہوں گی۔ اتنی مختصر بات کے بعد ہم دونوں باہر آگئے۔ پارکنگ میں ایک ہندوستانی گاڑی ہیڈ کوارٹر کی نمبر پلیٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ کرنل نے ہاتھ ملایا اور گاڑی اشارت کر کے تیزی سے چلا گیا۔ اگر مجھے پہلے سے اس شام کے حالات کا علم ہوتا تو میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بریف کیس کے حصول کے لئے کرنل کو ختم کرنے سے بھی گریز نہ کرتا، لیکن اب یہ بے سود تھا۔ اب اس بریف کیس کے حصول کے لئے مجھے شکر کی طاقت کے ساتھ ساتھ لوموزی کی چالاکی کو بھی استعمال کرنا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کرنل کے بیٹ مین کو پھانسنے کی کوشش کروں گا۔ ان چند دنوں میں، میں اپنے ساتھیوں سے ایک بار ملا۔ وہ سب اپنی کوششوں میں مصروف تھے لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تھی۔ ہم نے حساب لگایا کہ جتنے کم عمر سے میں نے احمد نگر کی فائلیں پاکستان بھجوائی ہیں۔ اس بڑی کامیابی سے ہمارے سینئرز ہمارا خاصا بلند امیج بنا چکے ہوں گے۔ لہذا اسے قائم رکھنے کیلئے ہم نے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ ہمارے CONTACT کی آمد میں بھی کم وقت رہ گیا تھا۔ فائلوں کے حصول میں کامیابی پر اپنے سینئرز کا رد عمل بھی دیکھنے کی خواہش تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس بار بھی اپنے CONTACT کے ذریعے مزید مواد بھیجوں۔ اس کے لئے میں کرنل شکر کے بیٹ مین کو ایک بار ٹولنا چاہتا تھا۔ اگر وہ ہاتھ نہ آتا تو پھر گھٹی تو نکالنا ہی تھا۔ چاہے ٹیڑھی اگلی سے نکالنا پڑتا۔

اس دوران آشا کا پھر فون اور اس نے مجھ سے کہا کہ شام کو 4 بجے اکبر ہوٹل کی کافی شاپ میں اس سے ملوں۔ میں 4 بجے اکبر ہوٹل چلا گیا کافی شاپ میں آشا ایک خوب رو جوان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں ابھی اسی شوش وینج میں تھا کہ ان کی ٹیبل پر جاؤں یا نہ کہ آشانے آواز دے کر مجھے بلایا اور اس جوان سے متعارف کرایا وہ M.E.S کے ایک بریگیڈیئر کا لڑکا تھا اور زبردستی تعلیم تھا۔ آشانے با تو میرا اقرب حاصل کرنے کیلئے مجھے جلانے کی کوشش کی تھی یا پھر وہ اس کے شوہر کیلئے ایک اور ٹھیکہ حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ وہ جوان فون کرنے کے لئے لابی کی طرف گیا تو آشانے بتایا کہ میرا دوسرا خیال درست تھا۔

میں ان کے ساتھ قریب آدھ گھنٹہ بیٹھا رہا۔ اس دوران آشا بھی اس جوان کو قریب ہو کر سرگوشی میں اس سے بات کرتی اور کبھی بے تکلفی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی اور اس جوان کو میرے چائے کے کاروبار کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتی اور کبھی مجھے اس کی شاہ خرچوں کا بتاتی۔ مجھے بہت جلد ہی محسوس ہو گیا کہ آشا کا مجھے یہاں بلانے کا مقصد بیک وقت دو شکار کرنا تھا۔ وہ ہم دونوں میں رقیبہ نہ جذب بات پیدا کرنا چاہتی تھی تاکہ ہم دونوں سے اپنے مقاصد پورے کر سکے۔ آشا سے دو بارہ جلد ملنے کا وعدہ کر کے میں ان کی ٹیبل سے اٹھا آیا۔ آشانے مجھ سے تعارف کے بعد اپنی نئی زندگی کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا میرے خیال میں اس کی وجہ اس کی ازدواجی زندگی کی محرومیاں اور اس کے شوہر کا اسے محض ٹھیکے حاصل کرنے کیلئے استعمال کرنا تھا۔ بے چند جیسے بوڑھے سے اس کی شادی کی وجہ اس کے والد کی مالی مجبوریوں تھیں لیکن بے چہرے نے بھی اپنے کاروبار میں اسے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ پڑھی لکھی جوان حسین عورت اپنے شوہر اور اپنے سماج سے باہر ہو چکی تھی۔ جب میں نے کہا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ یعنی میں خاصا بڑا کاروبار ہے اور اس کے حسن سے بہت متاثر ہوا ہوں، تو میں ممکن ہے کہ آشانے اپنے مستقبل کو میرے ساتھ وابستہ کر کے شہرے سنے دیکھنے شروع کر دیئے ہوں۔ بہر حال آشا کے رویے سے میں نے محسوس کیا کہ وہ فی الحال میرے کام نہیں آسکتی اور اپنے ہوٹل پہنچنے پہنچنے میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ آشا کو STAND 2 پوزیشن پر رکھ کر دیگر ممکن ذرائع کو استعمال کروں جن میں میرے ساتھیوں کی مہیا کردہ معلومات، کرنل شکر کا بیٹ مین، اشوکا اور اکبر ہوٹل میں شاملین گزارنے والے فوجی افسران اور ان کی بیگمات شامل تھیں۔

میں اگلی صبح محلہ فرس خانہ گیا ساتھیوں کے مکان کے سامنے مخصوص آواز نکالی اور واپس بڑی مرگ پر آ گیا چھوڑی دیر میں ٹرانسمیٹر والا ساتھی وہاں پہنچ گیا۔ میں نے شام کو ایک ریسٹورنٹ میں میٹنگ کیلئے کہا جس میں وہ چاروں اپنی اپنی کارکردگی مجھے بتائیں۔ اس میٹنگ میں چاروں نے کہا کہ فی الحال کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکی۔ بارش کی وجہ سے دہلی کی بھٹیڑ بھاڑ میں خاصی کمی آچکی تھی اور ایسے حالات میں کسی کا پیچھا کرنا شک پیدا کر سکتا تھا۔

ساتھیوں کے ساتھ میٹنگ کے تیسرے روز CONTACT سے ملاقات کا دن تھا۔ مقررہ وقت پر CONTACT سے ڈاک وصول کی اور اپنا پیکٹ اسے دے دیا۔ جلد جلد ZIG ZAG رستہ اختیار کر کے اپنے ہوٹل پہنچا تاکہ اگر کوئی پیچھا کر رہا ہو تو اسے جھٹک سکوں۔ اس بار ساری ڈاک ”سفید“ صفحات پر مشتمل تھی۔ میں نے ان سفید صفحات کو گہری پہنچائی تو الفاظ ابھر آئے۔ میری جیجی ہوئی دونوں فائلیں بحفاظت انہیں مل چکی تھیں۔ میری اس کامیابی کو بہت سراہا گیا تھا۔ بہترین الفاظ میں مجھے شاباش اور مبارک دی گئی تھی۔ میرے ساتھیوں کیلئے بھی علیحدہ علیحدہ تحریقی اور شاباشی کے خطوط تھے۔ ہمارے گھروں میں سب خیریت کا مزہ دہی تھا۔ میرے خط میں لکھا تھا کہ میری کارکردگی کے عوض 20 ہزار روپیہ میرے گھر والوں کو پہنچا دیا گیا ہے۔ ان دنوں پاکستان میں چائے، چینی اور بنا ہتی گھی کی بہت کمی تھی، اس لئے ہم ہانچوں کے گھروں میں یہ اشیاء اور مقدار میں بھیج دی گئی تھیں۔ پہلے مشنوں کو جاری رکھتے ہوئے مجھے ایک نیا اور انتہائی اہم مشن سونپا گیا تھا۔ ہماری انجینی کا ایک گروپ پہلے ہی اس مشن پر کام کر رہا تھا۔ (یہ مجھے اس ڈاک کے ذریعے معلوم ہوا) احمد نگر میں میری کامیابی کے بعد میرے گروپ کو بھی یہی مشن اپنے طور پر کرنے کے احکام ملے تھے۔ یہ مشن تھا کہ تار پور کے ایٹمی بجلی گھر سے ENRICHED (انزوں کردہ) یورینیم کہاں بھجوا جا رہا ہے اور یورینیم کس کام میں لایا جا رہا ہے، اس کے متعلق ہر ممکن معلومات حاصل کروں۔ اس ڈاک میں بھی ہمارے لئے تیس ہزار روپے روپے تھے۔ دس ہزار میرے لئے اور پانچ پانچ ہزار میرے ساتھیوں کے لئے۔ جو ڈاک میرے لئے تھی اسے میں نے پڑھ کر ہمیشہ کی طرح نذر آتش کر دیا۔ فائلوں کی فلم بھی ضائع کر دی اور ساتھیوں کی ڈاک اور ان کے روپے ان کے حوالے کئے۔ انہوں نے جب اپنی ڈاک پڑھی تو میں نے ان کی ڈاک واپس لے کر وہیں جلا ڈالی۔ ہم کسی بھی صورت خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔

مجھے احساس ہو رہا تھا۔ احمد نگر میں میری کامیابی سے میرے سینئرز نے مجھ سے بہت توقعات وابستہ کر لی تھیں اور اسی لئے تار پور کا مشن بھی مجھے سونپا گیا۔ تربیلہ میں ملازمت کے دوران غیر ملکی ملازمین سے مجھے اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ تار پور ایٹمی بجلی گھر بجلی پیدا کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی تیار کر رہا ہے۔ لیکن نیوکلیئر انرجی کے متعلق میری معلومات مفرتھیں۔ لہذا میں نے دہلی کے مختلف بک اسٹالوں سے نیوکلیئر انرجی کے متعلق ابتدائی کتابوں سے لے کر وہ کتابیں بھی خرید لیں جن میں زیادہ ٹیکنیکل معلومات تھیں۔ میں نے فارغ وقت میں ان کا مطالعہ شروع کر دیا تاکہ جب میں اس مشن پر جاؤں تو نیوکلیئر انرجی کے متعلق بالکل کورانہ ہوں۔

میرے ساتھی اس بار کی ڈاک میں شاباشی پا کر تروتازہ ہو چکے تھے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اچھی کارکردگی کے اعتراف میں ایک جھکی وہ کام کر دیتی ہے جو ہزاروں لاکھوں روپے نہیں کر سکتے۔ وہ اپنے تفویض کئے ہوئے کام زیادہ تندی سے کرنے لگے اور چند روز میں ہی مکمل معلومات اور تصاویر مجھے لادیں۔ آرمی ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے والے ایک سپرنٹنڈنٹ کا نام لیٹون تھا اس کا گھر اپنی دہلی میں ایک تنگ گلی میں تھا۔ اور اس کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بڑی بیٹی ایک اسکول میں ٹیچرچی اور دوسرے بچے اسکول اور کالج کے طالب علم تھے۔ لیٹون ہفتے میں ایک دو بار گانا سننے مخصوص بازار میں جاتا تھا۔ اس کی بیوی مہنگی تھی۔ ان اطلاعات کے ساتھ ان سب کی چلنے پھرنے تصویریں بھی اتاری گئی تھیں۔ ایک سو بلین کلرک تھا جو لیٹون کے گھر کے قریب رہتا تھا۔ وہ جوان اور غیر شادی شدہ اور لیٹون کی بڑی بیٹی سے اس کا AFFAIR چل رہا تھا۔ اس کلرک کا نام مدھوک تھا۔ اس کلرک کی لیٹون کی لڑکی کے ساتھ بھی ایک تصویر اتاری گئی تھی۔ لڑکی کا نام شانتی تھا۔ آرمی ہیڈ کوارٹر کے دو صفائی کرنے والوں کی دو تصاویر بھی اتاری گئی تھیں۔ یہ دونوں عیسائی تھے اور ان کے گھروں کا ایڈریس بھی حاصل کر لیا گیا تھا۔ میرے ساتھیوں کے اس ہوم ورک سے ہمیں ہیڈ کوارٹر میں پہنچنے کے نئے رستے دکھائی دیئے۔ چونکہ یہ سارا کام میرے ساتھیوں نے کیا تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں آئندہ کی جگہ میں پوری طرح شامل کروں۔ مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ بطور گروپ ایڈریس ان کو اپنے منصوبوں کی تفصیل نہ بتانے کا یہ اثر ہو رہا ہے کہ وہ مجھ سے محل کر بات نہیں کرتے۔ یہ ان کی فوجی ٹریننگ اور ڈسپلین کی وجہ سے تھا کہ وہ میرا حکم بلا چوراہا جالاتے تھے۔ ورنہ دشمن ملک میں اگر وہ میری بات ماننے سے انکار کر دیتے تو میں ان کا کیا باگاڑ سکتا تھا۔ مجھے ان سے بڑی حکمت عملی سے کام لینا تھا اور اب وہ موقع آن پہنچا تھا کہ میں انہیں اپنے مکمل اعتماد میں لوں اور ہیڈ کوارٹر تک رسائی کیلئے ہم سب اکٹھے پیچھے کر منصوبہ بندی کریں۔

میں آج تک ان کے گھر کے اندر نہیں گیا گیا تھا اور اس کی وجہ محض سیکورٹی تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ کل شام میں ان کے گھر آؤں گا اور وہیں ہم سب اس مشن کی منصوبہ بندی کریں گے۔ انہیں ابھی تک چونکہ کوئی مکمل مشن سونپا نہیں گیا تھا اور عین ممکن تھا کہ ان کی یہ سوچ ہوتی کہ ان کی مدد سے مشن مکمل کر کے سارا ریڈز میں لینا چاہتا ہوں۔ اگر انہیں یہ غلط فہمی تھی تو میں اسے بھی دور کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میں صرف ایک بات سے خوف زدہ تھا کہ وہ جوینر رینکس سے تھے۔ جن کا کام صرف احکامات کی تعمیل کرنا ہوتا ہے اور وہ دماغ سے ذرا کم ہی کام لیتے ہیں۔ اگر غدا انہیں کہیں حالات بگڑ گئے تو وہ سنبھال نہیں سکیں گے اور سارا کھیل ہی بگڑ جائے۔ دوسرے ان کا گروپ ایڈریس کر سارے مشن کی اور ان کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ بہر حال اب حالات کا تقاضا تھا کہ میں انہیں اس مشن میں شامل کروں۔

اگلی شام میں حسب وعدہ ان کے گھر گیا۔ وہاں اس مشن کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ دو خا کروں کو میرے دو ساتھی الگ الگ سنبھال لیں گے اور سپرنٹنڈنٹ لیٹون کے بارے میں میرے باقی ساتھی پتا چلائیں گے کہ وہ کسی مخصوص بالا خانے پہ جاتا ہے یا مختلف بالا خانوں پر۔ لیٹون کے متعلق مطلوبہ معلومات ملنے پر میں اسے سنبھال لوں گا۔ یہ فیصلہ ہونے پر سب مطمئن تھے۔ میں نے خا کروں سے رابطہ کرنے والے ساتھیوں کو مزید ہدایات دیں اور رات کا کھانا کھانے کے بعد میں واپس لوٹ آیا۔ اگلی تین شامیں میں نے اکبر ہوٹل اور اشوکا ہوٹل میں گزاریں۔ میں چوتھے روز دن کے 10 بجے سرور کلب میں کرنل شکر کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا بیٹ مین کمرے کی صفائی میں مصروف تھا۔ اس نے یہ بتا کر کہ کرنل صاحب دفتر گئے ہیں، مجھے باہر سے ہی رخصت کرنا چاہا۔ مجھے اور کچھ نہ سوچا تو میں نے اس سے پانی مانگا اور کہا کہ کمرے میں بہت درد ہے اگر اسپرین وغیرہ ہوتو پانی کے ساتھ دو گولیاں بھی دے۔ بیٹ مین نے مجھے SITTING ROOM میں بٹھایا۔ اسپرین اور پانی لینے کے بعد میں نے اس کا نام پوچھا تو اس نے عبدالکریم بتایا اور کہا کہ وہ کرنل کے ساتھ 8 ماہ سے ہے۔ میں نے کہا کہ عبدالکریم اپنے متعلق کچھ اور بھی بتاؤ۔ میں سردرد کے بہانے کر ہی پریم دراز ہو گیا اور عبدالکریم نے بون شروع کیا۔

”صاحب میں 4 سال سے بھارتی فوج میں ہوں۔ میں ہوں تو انٹرنیٹی میں لیکن عملی طور پر اب تک مختلف افسران کا بیٹ مین ہی رہا ہوں۔ کرنل صاحب کے پاس آنے سے پہلے میں اگر چھ آؤنی میں ایک میجر صاحب کا بیٹ مین تھا۔ کرنل صاحب اپنی سخت طبیعت کی وجہ سے نہ تو کسی سے مطمئن ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی ان کے بیٹ مین بننے پر خوشی سے رضامند ہوتا ہے۔ جب سے میں یہاں آیا ہوں کرنل صاحب کی میں پھر پور خدمت کرتا ہوں لیکن بہر روز ہی مجھے گالیوں سے نوازا جاتا ہے۔ کرنل صاحب جب موڈ میں ہوتے ہیں تو کچھ میسے وغیرہ بھی دے دیتے ہیں اور جب ناراض ہوتے ہیں تو بے تحاشہ گالیاں دیتے ہیں۔ 4 سال سے، پہلے ٹریننگ کے دوران اور بعد میں مختلف افسروں کا بیٹ مین ہونے کے دوران مجھے اتنی گالیاں پڑ چکی ہیں کہ اب میں ان کا عادی ہو چکا ہوں اور اپنی قسمت پر شا کر ہوں۔ فوج چھوڑنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ نہ مانا باپ زندہ ہیں اور نہ شادی کی ہے۔ عبدالکریم بڑی ستمی ارادوں بول رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ تم رہنے والے کہاں کے ہو؟ اس نے کہا ”حضور! لکھنؤ میرا آبائی وطن ہے۔ والدین کے گھر میں تو غربت ہی دیکھی لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ میرے دادا نواب تھے۔ والد مرحوم نے بھی خاندانی روایات اور اپنی وضع داری کا بھرم قائم رکھنے کیلئے چھوڑی بہت جائیداد اور رہائش جوہلی پہلے رہن رکھی اور بعد میں بیچ ڈالی۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو گھر میں غربت ہی دیکھی۔ ابھی 10 سال کا بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک سال کے اندر چند ماہ کے وقفے سے والدین کا انتقال ہو گیا۔ میں بالکل بے آسرا رہ گیا۔ والد مرحوم کے جاننے والے ایک دکان دار نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی اور میٹرک تک تعلیم دلوائی۔ انہوں نے ہی مجھے فوج میں بھرتی کروا دیا کہ یہاں عزت سے روٹی کماسوں کا یہاں روٹی تول لگی لیکن مسئلہ گالیوں سے ماں باپ، خاندان اور مذہب کی دلچسپیاں اڑ گئیں۔ عبدالکریم بولے جا رہا تھا اور میرا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ چند کتنے تھے جن کے گرد میرا ذہن گھوم رہا تھا۔ فوجی، مسلمان، ہندو افسران کی گالیوں سے بیزار بلکہ کسی حد تک باغی، کوئی رشتہ دار نہیں اور ہیڈ کوارٹر کے ایک اہم سینئر افسر کا بیٹ مین۔ حالات نے اس کا پہلے ہی خاصا پرین واش کر رکھا تھا اور باقی کام میں کر سکتا تھا۔ ایک بڑی دشواری تھی کہ میں نے ہندو ہونے کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اپنی اصلیت ظاہر کرنے میں فٹنی فٹنی جاسن تھا۔ ایک یہ کہ وہ میرا ساتھ دے گا اور دوسرے یہ کہ میرا بھید کھول کر ہندو افسران کی نظر میں خود کو فادار اور بھارت ماتا کا سپوت ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔

میں اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اس کیلئے مناسب منصوبہ بندی اور مزید سوچ و بچاری ضرورت تھی۔ میں نے اٹھتے ہوئے عبدالکریم سے کہا کہ میں اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں اس کیلئے یقیناً کچھ کروں گا۔ میں نے اسے کہا کہ میری آمد کا کرنل صاحب کو نہ بتائے۔ باتیں تو وہ کر چکا تھا لیکن اس ڈر سے سہم بھی گیا تھا کہ میں کرنل کو اس کی گفتگو کے بارے میں نہ بتاؤں۔ اس نے کہا کہ صاحب آپ کرنل صاحب کو کچھ نہ بتائیں۔ میری زبان تو ہرگز نہ کھلے گی۔ میں نے اس سے لکھنؤ کے اس دکان دار کا نام اور دکان کا نام اور محل وقوع پوچھا جو اس نے بتا دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی کئی ہوئی باتوں کی سچائی جان سکوں۔ 5 سو روپے دے کر میں وہاں سے رخصت ہوا اور میرا دماغ اس سلسلے میں مزید کچھ کرنے کے تانے بانے بننے لگا۔

بہت سوچ بچار کے بعد بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ عبدالکریم سے کام لینے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے لیکن کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اس کے متعلق مکمل چھان بین کی جائے۔ شام کو میں اپنے ساتھیوں سے ملنے ان کے گھر گیا۔ اتفاق سے مالک مکان گھر میں ہی تھا۔ مکان کی اوپری منزل کی بیڑھیاں اگر چہ بوڑھی میں ہی تھیں لیکن گلی میں مکان کے دروازے سے گزر کر ہی بیڑھوں تک پہنچا جاسکتا تھا۔ دروازہ مالک مکان نے ہی کھولا۔ میں نے اسے اپنا نام اظہر علی بتایا اور کہا کہ میرا ایک کاروباری وقت یہاں رہتا ہے (اس نے ساتھیوں میں سے ایک کا نام بتایا۔ وہ یہاں اپنے اصلی ناموں سے ٹھہرے ہوئے تھے تاکہ مختلف ناموں کے چکر میں کبھی غلط نام نہ بتا بیٹھیں)۔ مالک مکان نے مجھ پر جانے دیا۔ میں نے ساتھیوں کے ساتھ ایک کمرے میں میٹنگ کی اور کہا کہ ایک شخص کے کوآف معلوم کرنے کیلئے لکھنؤ جانا ہے۔ کبھی جانے کو تیار تھے لیکن میں نے دو کا انتخاب کیا اور انہیں لکھنؤ میں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر رہنے کی ہدایت کی۔ اس دکان دار سے جس نے بقول عبدالکریم، اس کی پرورش کی تھی، عبدالکریم کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا اور اگر اس کا کوئی قریبی رشتہ دار موجود ہو تو اس کا پتہ لگانا اور ان کی چھان بین کرنی تھی۔

میرے دونوں ساتھی رات کو ہی ٹرین سے روانہ ہونے کیلئے تیار ہو گئے۔ میں نے انہیں 3 دن دینے تاکہ تمام معلومات حاصل کر کے چوتھے روز واپس آجائیں۔ کئی بار احتیاطی تدابیر کو نظر انداز نہ کرنے کا کہہ کر انہیں اللہ حافظ کہا اور واپس اپنے ہوٹل چلا آیا۔

غازی

انگلے روز شام کو میں کرل ٹنگر کے پاس گیا۔ وہ حسب معمول لان میں سے کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔ عبدالکریم برآمدے میں حکم بجالانے کیلئے مودب کھڑا تھا۔ عبدالکریم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اور سر کو ذرا جھکا کر مجھے سلام کیا۔ آج کرل بھی موڈ میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا۔ ہیلو مسٹر پامسٹ PLEASE COME AND JOIN ME (آئیں اور میرا ساتھ دیں)۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کی تا کہ جو موضوع کرل کو پسند آئے اسی پر بات کریں۔ وہ شاید میرا نام بھول چکا تھا اس لئے بار بار مسٹر پامسٹ کہہ رہا تھا۔ میں نے بیٹھے ہوئے کہا کرل صاحب میں چائے بیچتا ہوں اور میرا نام و نوڈ ہے اور آپ مجھے پامسٹ کہہ رہے ہیں۔ کرل نے صاف گوئی سے کہا کہ مجھے تمہارا نام یاد نہیں آ رہا تھا لیکن پامسٹ میں تمہیں اس لئے کہہ رہا تھا کہ پہلی ملاقات میں ہی تم نے میرے ماضی کے متعلق صحیح باتیں بتادیں۔ میں نے کہا میں پامسٹری (دست شناسی) کی ایجنڈ سے بھی واقف نہیں ہوں البتہ FACE READING (چہرہ شناسی) میں کچھ شہد رکھتا ہوں اور وہ بھی اپنے کاروبار میں مختلف لوگوں سے ملنے کی وجہ سے۔ ان کے موڈ کو دیکھ کر چہرے کے تاثرات سے کچھ اندازہ لگا لیتا ہوں۔ کرل کہنے لگا لیکن میرے متعلق تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟ میں نے کہا کہ سر و مگر کلب میں آپ کی رہائش سے اندازہ لگا لیا کہ آپ کی فیملی نہیں ہے۔ ورنہ آپ کو سرکاری بنگلہ مل سکتا تھا۔ کلب کی روٹوں کو چھوڑ کر آپ اپنی الگ محفل سجاتے ہیں۔ بقول آپ کے آپ کا حلقہ احباب بہت چھوٹا ہے۔ آپ اپنی شام سے نوشی میں گزارتے ہیں اور تمہاری پسند ہیں اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ماضی کی کچھ ایسی باتیں ہیں جو آپ کا بیچھا نہیں چھوڑتیں اور آپ بھی ان باتوں کو خود سے الگ نہیں کرنا چاہتے اور ایسی یاد جوانی میں محبت میں ناکامی کی ہی ہو سکتی ہے۔ کرل غور سے میری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے سلسلہ برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ چونکہ میں خود بھی ماضی میں ایسی ہی ناکامی کا شکار ہوا ہوں، اس لئے آپ کے اس اندرونی درد کو بخوبی سمجھ گیا۔ آپ کو دیکھ کر مجھے ایک شعر یاد آیا ہے۔

کچھ اس طرح سے سجائے ہیں ہم نے
کہ اہل شہر بھی آتے ہیں جی کو بہلانے

میں تو چاہتا ہوں کہ ہر شام آپ کے ساتھ گزاروں لیکن محض اس لئے روز نہیں آتا کہ ایسی باتوں میں کھونے والا اپنی تنہائی میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ اسی موضوع پر یاد نہیں میں نے اور کیا کچھ کہا لیکن جب میں خاموش ہوا تو یہ سخت گیر کرل موم کی طرح کھل چکا تھا۔ لان میں حلقی ٹیلگوں لائٹس میں اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبر پر نظر آتی تھیں۔ کرل کچھ دیر کرسی کی بیک سے سر لگائے خاموش بیٹھا رہا۔ جب وہ خود پر قابو پا چکا تو بولا۔ میں نے اپنے ماضی کے بارے میں آج تک صرف دو تین دوستوں کو بتایا ہے اور آج تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم بتائے بغیر میرے ماضی کو یاد رکھتے ہو۔ میں لاہور کا رہنے والا ہوں اور راولپنڈی میں۔ میں نے اسے ٹوکتے ہوئے انجان بن کر پوچھا، راولپنڈی سے آپ کی مراد کیا ہے (حالانکہ میں خود گورنمنٹ کالج لاہور (ضلع کچھری کے پاس) کا اسٹوڈنٹ رہ چکا ہوں۔ یہ کالج تقسیم ہند سے پہلے برصغیر کا بہترین کالج مانا جاتا تھا اور اس کے طلباء خود کو رومنٹ کہتے ہیں)۔ کرل نے مجھے بتایا کہ کالج میں شیابونٹ نامی ایک کرچمن لڑکی سے اسے محبت ہو گئی۔ وہ اس کی کلاس فیوٹھی اور یہ یکطرفہ محبت تھی بلکہ یہ آگ دونوں طرف یکساں بھڑکی ہوئی تھی۔ وہ کالج کے نمایاں طلباء میں تھا اور پیرا کی میں کالج ٹیم کا کپٹن تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گریجویٹن کے بعد ICS (انڈین سول سروس) کا امتحان دے گا۔ شیابونٹ یہی چاہتی تھی۔ دونوں نے بی اے کا امتحان اکٹھے دیا تھا۔ دونوں کے گھر کو پرورد پر تھے۔ اس کے پتائی پنجاب گورنمنٹ میں ملازم تھے۔ ہم دونوں کے گھر والے اس محبت سے آگاہ تھے اور ایک دوسرے سے اکثر ملتے رہتے تھے۔ اپریل 47ء میں لاہور بھی ہندو مسلم فساد کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایک شام فساد یوں نے اس کے گھر کے سامنے والے گھر کو آگ لگا دی۔ وہ گھر مسلمانوں کا تھا۔ اس کے پتا جودل کے مریض تھے، یہ منظر دیکھ کر انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ سوگ باش ہو گئے۔

اس نے بتایا کہ ”فساد یوں کی شراغیں پرتو چند روز میں قابو پایا گیا لیکن پتائی کی موت نے ہمیں اجاڑ دیا۔ ہمارے پاس جمع پونجی نہ ہونے کے برابر تھی۔ گھر کا سارا بوجھ مجھ پر آ پڑا تھا۔ میں نے رنگ محل میں ایک دکان پر جزوقتی ملازمت کر لی۔ امید تھی کہ پتائی کے فنڈ وغیرہ مل جائیں گے تو میں ICS کی تیاری شروع کر دوں گا۔ شیلا کے گھر والوں پر ہماری مالی کمزوری کا راز کھل چکا تھا اور وہ کچھ کچھ کھینچنے سے رہنے لگے۔ اسی دوران شیلا کیلئے ایک انڈین کرچمن کپٹن کا رشتہ آیا۔ شیلا نے بھی اب مجھ سے دور رہنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے شیلا کو لاکھ بھاننے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ میں نے اسے گزرے دنوں کی باتیں اور تمہیں وعدے یاد دلانے لیکن بے سود۔ اور ایک دن شیلا اس کپٹن کی دلہن بن کر چلی گئی لیکن میرے دل سے نہ نکل سکی۔ میں اپنی بے وسامانی کے بوجھ تلے دبا ہوا شیلا کو گریب سے کپٹن کی دلہن بن کر نکلنے ہوئے دیکھتا رہا لیکن کچھ نہ کر سکا۔ مجھے ایک چپ لیگ گئی تھی۔ اسی دوران تقسیم ہند ہو گئی۔ میں اپنی ماما اور دو بہنوں کو لے کر بھارت چلا آیا۔ لاہور میں ہمارا مکان میرے پتا کے ایک دوست نے مناسب داموں پر ہم سے خرید لیا تھا۔ اس مکان کی جو رقم ملی تھی اس سے میں نے اپنی بہنوں کے ہاتھ پیلے کئے۔ کچھ عرصے بعد میری ماما جی بھی چل بسیں۔ اب میں یکا و تنہا تھا۔ میں نے فوج جوائن کر لی۔ ڈیرہ دون میں ڈھائی سال کی تربیت کے بعد سیکنڈ لیفٹیننٹ بنا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ شیلا کو دل سے نکال دوں لیکن اس کی محبت اور یاد کی جڑیں دل میں کچھ اتنی گہرائی تک پہنچ چکی تھیں کہ کام رہا۔

کرل کی دکھتی رنگ پر میرا ہاتھ کچھ ایسا پڑا تھا کہ اس کے جذبات کے سارے بند ٹوٹ چکے تھے۔ وہ بولتا چلا گیا۔ ”65ء کی بھارت پاکستان جنگ کے دوران ایک انٹینٹری کپٹن کا نمائندہ تھا اور لاہور سیکٹر پر میری کپٹنی تعینات تھی۔ میرے ریکی کرنے والے جوانوں نے بتایا کہ پاکستان کی ایک بڑی ٹوپ (غالباً رانی تھی رینی جو 250 پاؤنڈ کا گولہ 22 میل تک پھینک سکتی ہے) کی لوکیشن انہوں نے دیکھی ہے۔ میں اگر چاہتا تو اپنی آرٹلری کو بتا کر اس ٹوپ کو تباہ کروا سکتا لیکن میں ڈپٹی آرٹلری کو نہ بتا سکا۔ اگرچہ ہمارا مواصلاتی رابطہ اپنی آرٹلری (ٹوپ خانے) سے کٹ چکا تھا لیکن ان تک پیغام پہنچانے کے اور ذرائع بھی تھے۔ یہ شاید لاہور سے میری محبت اور شیلا کی وجہ سے ہوا جو لاہور میں رہتی تھی کہ میں اپنا فرض نہ بھار سکا۔ جس کی پاداش میں مجھے فزتری امور پر لگا دیا گیا۔ میں نے شادی نہیں کی۔ اپنے فزتری اوقات کے بعد میرا بیشتر وقت تنہائی اور شراب نوشی میں گزارتا ہے۔“

کرل ٹنگر نے اور بہت سی باتیں کہیں۔ جن سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ کرل بھارتی فوج سے بھی نالاں ہے اور غیر محسوس طور پر اپنی ذاتی وجوہات کی وجہ سے پاکستان کے بھی اتنا خلاف نہیں جتنا دوسرے بھارتی فوجی تھے۔ رات قریب بارہ بجے ہماری یہ محفل برخواست ہوئی اور میں کرل ٹنگر کے متعلق متضاد خیالات کے جھوم میں گھرا ہوا اپنے ہول واپس پہنچا۔

یہاں پاکستان کی رانی اور شیرینی توپوں کے متعلق قارئین کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ یہ دو سپر ہروی ہونیزر (ٹوپوں کی ایک قسم) امریکہ نے ”ایچھے وٹون“ میں پاکستان کو دی تھیں۔ ان میں چلنے والا گولہ 250 پاؤنڈ کا ہوتا ہے اور 22 میل تک اس کی رینج ہے۔

65ء اور 71ء کی جنگوں میں ان دو توپوں نے لاہور کے تحفظ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ بھارتی فوج ان کے گولوں کی آواز سنتے ہی دہشت سے کانپنے لگی تھی اور اگلے قدموں واپس اپنے مورچوں میں دب جاتی تھی۔

کرل ٹنگر نے شراب کے نشے میں اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ لیکن مجھے ڈرپ کرنے کیلئے یہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی تھی۔ عبدالکریم کی درجہری کہانی اور کرل ٹنگر کی باتیں۔ یہ دونوں سچی بھی ہو سکتی تھیں اور غلط بھی۔ ان حالات میں مجھے اپنا پر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا تھا۔ میں نے دونوں کی باتوں کے ہر فقرے اور ہر لفظ کا تجزیہ کرنا شروع کیا اور بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ جب تک میرے ساتھی لکھنؤ سے واپس آ کر عبدالکریم کے بیان کی تصدیق نہ کر دیں میں کوئی قدم نہ اٹھاؤں۔ تاہم پورے ایشیائی جنگی گھر کے متعلق چونکہ ہمیں پاکستان میں بریف نہیں کیا گیا تھا اور یہ مشن انتہائی اہم نوعیت کا تھا اس لئے میں نے ہر ممکن ذریعے سے معلومات اکٹھی کرنے کا فیصلہ کیا۔ نیوکلیئر انرجی سے متعلق کتابیں تو میں پہلے ہی لے چکا تھا اور ان کا مطالعہ بھی شروع کر دیا تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ وہاں کے سیکورٹی سسٹم کے متعلق بھی جان کاری حاصل کروں۔

یشونت پھنس گیا

قارئین ناصر میری بلکہ میرے ساتھیوں کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ دشمن ملک میں ہندو بن کر رہنے اور اس کی دفاعی نوعیت کی حساس اور CLASSIFIED معلومات حاصل کرنے اور ہر وقت پکڑے جانے کے خوف نے ہم پر شدید ذہنی داؤد ڈال رکھا تھا۔ ہمارے چہروں سے مسکراہٹ غائب اور ہماری ہنسی بالکل مصنوعی ہو چکی تھی۔ راتوں کو نیند میں ہم اکثر چونک اٹھتے تھے۔ اپنی کیفیت تو میں جانتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے بھی اپنی ذہنی حالت مجھے بتادی تھی۔ پاکستان میں دوران تربیت ایسی حالت پیش آنے پر ذہنی تناؤ کم کرنے کیلئے ایک مسکن دوا کے استعمال کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ ہم نے یہ دوا استعمال کرنی شروع کی اور ایک ہفتہ استعمال کے بعد ہمارے ذہنی تناؤ میں خاصی کمی آچکی تھی۔

لکھنؤ جانے والے میرے دو ساتھی جو تھے دن تو آئے۔ وہ عبدالکریم کے متعلق معلومات لے کر آئے تھے۔ دکاندار نے عبدالکریم کی کہی ہوئی تمام باتوں کی تصدیق کی تھی۔ دکاندار نے عبدالکریم کے متعلق یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے دو پارا کے رشتہ داروں کے علاوہ ایک حقیقی چچا بھی ہیں لیکن وہ سب عبدالکریم کے والدین کے مرنے کے بعد بجائے اس یتیم کو محبت و شفقت دینے کے ان کے گھر میں جو بچا کھچا سامان تھا، وہ بھی اٹھا کر لے گئے اور عبدالکریم بے آسرا اور بے سہارا گہرا گیا تھا۔ اس کے والد سے دوستی کی وجہ سے اس دکاندار نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی اور وہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دکان پر بھی اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ میٹرک کے بعد عبدالکریم مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لہذا سال بھر وہ دکان پر ہی کام کرتا رہا اور جونہی اسے موقع ملا، وہ فوج میں جھرتی ہو گیا۔

دکاندار نے میرے ساتھیوں سے اس پوچھ گچھ کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ عبدالکریم کی ان کے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی تجویز زیر غور ہے اور وہ اسی سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ دکاندار نے کہا کہ عبدالکریم ایک شریف اور نواب خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ سوائے غریب اور بے آسرا ہونے کے اس میں کوئی خامی نہیں۔ دکاندار نے یہاں تک کہا کہ اگر اس کی کوئی بیٹی ہوتی تو وہ اسے عبدالکریم سے بیابنے میں فخر محسوس کرتا۔ غرضیکہ عبدالکریم کی بیان کردہ سب باتوں کی سچائی کی تصدیق ہو چکی تھی۔ اب مجھے اس کا تعاون حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کرنی تھی۔ ابھی تک عبدالکریم کا جو خاکہ میرے سامنے تھا، وہ ایک خاندانی بے آسرا مسلمان بھارتی سپاہی کا تھا جو اپنے افسران کی مسلسل گام گلوچ اور سخت رویے کا شکار تھا۔ یہ اس خاکے کا مثبت رخ تھا۔ دوسرا رخ جو منفی تھا۔ وہ کچھ یوں تھا کہ وہ اپنی ذاتی شکایات اور رنجش کے باوجود اپنے ملک کا خیر خواہ ہو سکتا تھا۔ اس کی عزت نفس جو چکی جا چکی تھی اسے DEFECTOR (بغائی) بنا سکتی تھی یا پھر اس کی عزت نفس کی بحالی کیلئے وہ ہمارا راز جاننے کے بعد اپنے افسران کو ہمارے متعلق بتا کر بھارت مانا کا ”سپوت“ بن سکتا تھا اور اپنا کھوپا ہوا وقت حاصل کر سکتا تھا۔ دونوں صورتیں ممکن تھیں۔

یہاں پاکستان میں ہی دیکھ لیجئے۔ کہنے کو تو ہم سب پاکستانی اور ایک قلیل اقلیت کے سوا مسلمان ہیں لیکن ہم میں مادروطن کی عزت و حرمت اور بقا کو پیچھے ڈھکیل کر اپنے ذاتی مفاد کو پورا کرنے والے خدرا اور وطن فروش بھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ورنہ بھارتی ٹینکوں پر بیٹھ کر آنے کا ڈوٹی کرنے والے، پاکستان کا قومی پرچم جو ہماری آزادی اور غیرت کا نشان ہے اسے مزارقہ پر پزراؤتس کرنے والے، پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور کھیلے عام اس کا اعلان کرنے والے ابھی تک زندہ نہ ہوتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے خدراؤں کی باتیں سن کر خاموش رہنے والے بھی وطن کی محبت سے اتنی ہی دور ہیں جتنے وہ خدرا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ماں بہن کی گالی سن کر طیش میں آنے اور مرنے مارنے پر تل جانے والوں کی غیرت اس وقت کیوں سو جاتی ہے جب کوئی ان کی مادروطن کو گالی دیتا ہے۔ شاید یہ وہ لوگ ہیں جنہیں آزادی کی قدروقیمت معلوم نہیں اور وہ اپنے آزاد وطن میں درویش وقتی مشقات کا صلہ دشمن کی غلامی میں ڈھونڈتے ہیں۔ یہ ساری سیاسی پارٹیاں، یہ لسانی تنظیمیں، چاہے اقتدار میں ہوں یا حزب اختلاف میں صرف اور صرف اپنے ذاتی فائدہ کے حصول میں لگی رہتی ہیں۔ کوئی بھی سیاسی پارٹی ہو، ان کیلئے اقتدار کا حصول صرف پاکستان کو ٹکڑے کیلئے ہوتا ہے۔ پاکستان کی افواج پاکستان کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی محافظ ہیں۔ انہوں نے کبھی نہیں سوچا کہ افواج پاکستان کے جوان اور افسران اپنے سے 8 گنا بڑے دشمن کے سامنے یوں سین سپر، جان پھینکی پر لے کر ایک سبسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹے ہوئے ہیں کہ دشمن کا ”اکھنڈ بھارت“ کا خواب چکنا چور ہو چکا ہے اور اسے خود اپنی بقا کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ پاکستان میں دہشت گردی اور دھماکے کرنے والے اگر پاکستانی ہیں تو وہ سو فیصد یقیناً دشمن کے ایجنٹ ہیں۔ عبرت ناک موت ان کا مقدر ہے اور اللہ بہت جلد ہم ان طاعونی چوہوں سے نجات حاصل کر لیں گے۔

اس الجھی ہوئی صورت حال میں، میں نے ساتھیوں سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا اور ان کے ساتھ میٹنگ میں ہر ایک کا نقطہ نظر جاننے کی کوشش کی۔ دو ساتھیوں کا خیال تھا کہ رات کو عبدالکریم کو اٹھایا جائے اور اسے سمجھا یا جائے یا مجبور کیا جائے کہ وہ ہمارا ساتھ دے۔ اور اگر وہ نہ مانے تو اسے وہیں ختم کر دیا جائے۔ ایک ساتھی کا کہنا تھا کہ کرل ٹنگر کے کمرے میں رات کو گھس کر اسے ہلاک کر دیا جائے اور اس کے کمرے سے اس کا بریف کیس اور اہم کاغذات اٹھائے جائیں۔ یہ دونوں تجاویز جھوٹی ہی بحث کے بعد رد کر دی گئیں۔ پہلی اس لئے کہ عبدالکریم اپنی ذاتی حیثیت میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اٹھانے جانے کے بعد وہ اپنی جان بچانے کے لئے ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کر کے اس سے ناصر سے مکر سکتا تھا بلکہ ہمیں پکڑا کر اپنے نمبر بنا سکتا تھا۔ کرل کو اگر ہلاک کر دیا جاتا تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ اس کے کمرے میں موجود کاغذات وغیرہ اہمیت کے حامل بھی ہوتے۔ ہر دو صورتوں میں بھارتی سیکورٹی ناصر سے بہت چوسک ہو جاتی بلکہ میرے پکڑے جانے کا بھی امکان بڑھ جاتا کیونکہ کرل ٹنگر سے ملنے والوں میں میرا نام سرفہرست ہوتا۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ ان دونوں کو بھی انی الحال STAND BY پوزیشن میں رکھ کر مزید CULTIVATE کیا جائے اور اپنے مشن یعنی آرمی ہیڈ کوارٹرز میں پہنچنے اور وہاں معلومات کے حصول کیلئے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ اب اپنا پورا دھیان ہیڈ کوارٹرز کے سپر نٹنڈنٹ یشونت اور ان کے دو عیسائی سپیئر پروردیں۔ اگلے روز ہی اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ چھٹی کے وقت ہم ہیڈ کوارٹرز کے قریب بس اسٹاپ پر پہنچ گئے ہم یشونت کے ساتھ ایک ہی بس میں سوار ہوئے اور میں نے اس کا گھر بھی دیکھ لیا۔ میں نے اپنے دو ساتھیوں کو دونوں صفائی کرنے والوں کے پیچھے لگا دیا کہ ان سے واقفیت پیدا کریں اور اس طرح دفتر کے بعد ان کی سرگرمیوں کا ناصر سے پتہ چلائیں بلکہ اگر ضرورت پڑے تو ان میں شریک بھی ہوں۔ دوسرے دو ساتھیوں کی ڈیوٹی لگائی کہ دفتر کے بعد وہ یشونت کی SURVEILLANCE نگرانی کریں اور جس شام وہ گانا سننے کے لئے جائے تو ان میں سے ایک اس کا پیچھا کرتا رہے تاکہ اس بالا خانے کی نشان دہی ہو سکے جہاں وہ موجود ہو اور دوسرا ساتھی مجھے بتانے کیلئے اس علاقے چاوڑی بازار کے شروع میں ایک ریستورنٹ میں آئے جہاں میں ہر شام 7 بجے پہنچ جایا کروں گا۔

غازی

یہ مہینے کی شروع کی تاریخیں تھیں۔ اس ریٹورنٹ میں مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ غالباً تیسرا یا چوتھا دن تھا جب میرے ساتھی نے ریٹورنٹ میں آکر مجھے اشارہ کیا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم اس بالا خانے کے نیچے کھڑے تھے جس میں بیٹھتے کیا تھا۔ میں نے ایک ساتھی کو رخصت کیا کیونکہ اس شام میرا پروگرام صرف بیٹھتے سے ملنے اور اس سے تعلقات پیدا کرنے کا تھا۔ میں بالا خانے کی بیڑھیں چڑھ کر اس بجے سجائے کمرے میں پہنچ گیا جہاں تاج گانا ہوتا تھا۔ نشست فری تھی۔ چاروں طرف گاؤں کی تفریح سے رکھے ہوئے تھے۔ ابھی محفل شروع نہیں ہوئی تھی۔ تاہم مجھے خوش آمد یاد کیا۔ میں بیٹھتے کے ساتھ کی نشست پر بیٹھ گیا۔ چند منٹوں کے اندر مجھے ایک نفرتی پیشتر میں چاند کی ورق میں لپٹا پانپان پیش کیا گیا۔ میں نے پان اٹھا کر بیس روپے پیشتر میں رکھ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد سازندہ آگے اور اپنے ساز درست کرنے لگے۔ ابھی گانے کی تیاریاں ہی ہو رہی تھیں کہ بیٹھتے اور دو تین دوسرے لوگوں کے سامنے گلاس اور سوڈے کی بوتلیں آگئیں۔ بیٹھتے نے جب سے آدھے کی بوتل نکالی۔ دوسرے کا ہونے کیلئے بوتلیں تاہم نے پچھلے کمرے سے منگوا لیں۔ بڑے مودب انداز میں ٹیکہ لے کر مجھ سے پوچھا کہ کیا میں بھی ”شوق“ کروں گا۔ ”ہمارے پاس آپ کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے سب کچھ موجود ہے۔ آپ حکم کریں۔“ میں نے اسے کہا کہ آج سوڈے میں نہیں ہوں اس لئے صرف کوئی ٹھنڈا مشروب پیوں گا۔ تھوڑی دیر میں بیٹھتے کو کالو کالو کی دو بوتلیں میرے سامنے رکھی گئیں۔ محفل کا آغاز ہم کلاسیکی گانوں سے ہوا۔ بیٹھتے اس دوران اپنے آدھے کا آدھا حصہ لی چکا تھا۔ میں بیٹھتے پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا کہ اس کی ”نظر کرم“ کس طوائف پر ہے۔ نیم کلاسیکی موسیقی کا دور ختم ہوا۔ اس دوران تین نوجوان طوائفیں اپنے بیروں میں گھنگھر و بانہ ہنسنے لگیں۔ بیٹھتے نے بوتل میں بچی ہوئی شراب گلاس میں انڈیل لی۔ تھوڑا سا پانی ملا یا اور غٹا غٹا چڑھا گیا۔ ان تینوں طوائفوں نے تماش بیٹوں کے درمیان میں آکر سب کو فری سلام کئے۔ ابھی وہ طلبے اور دوسرے سازوں کے ساتھ اپنے قدم ملانی رہی تھیں کہ بیٹھتے نے اپنی دوسری جیب سے ایک آدھا اور نکالا۔ وہ بھارت کی بنی ہوئی رم (شراب کی ایک قسم) پی رہا تھا۔ چونکہ پوری بوتل گول اور آدھے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس لئے آسانی جیبوں میں آجاتے ہیں۔ بیٹھتے نے دوسری بوتل سے بھی کچھ رم گلاس میں انڈیل لی اور اسے چڑھا گیا اب وہ پوری طرح سے نشے میں چور تھا۔ جب گانا شروع ہوا تو ویل ایک روپے کی تھی۔ تاجپانے والی تینوں لڑکیوں نے رقص شروع کیا۔ ان تینوں کے قدم اور رقص کے زاویے ایک دوسرے سے اتنے لمبے ہوئے تھے کہ وہ ایک ہی جسم کے تین حصے دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے رقص نے محفل کو گرم کیا۔ ویل اب ایک روپے سے بڑھ کر 5 روپے ہو چکی تھی۔ مجھے چونکہ وہاں پر بیٹھتے کو اپنی طرف متوجہ کرنا اور طوائفوں پر اپنی امارت کا رعب ڈالنا تھا لہذا میں نے 10 روپے کی ویل شروع کی۔ بالا خانوں کا رواج ہے کہ جو زیادہ ویل پیش کرے اسی کے سامنے جا کر تاج پانپان پانپانے ہوئے بیٹھ کر ویل لینا ہوتا ہے۔ دس روپے کی ویل پر دوسرے تماش بین کچھ چونک سے گئے اور وہ روپے کے دس نوٹوں کا پیکٹ بنا کر ویل دینی شروع کی لیکن ویل دینے میں وقفہ بڑھا دیا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنی امارت کا سک بٹھانا تھا۔ میں نے ویل 20 روپے کر دی۔ بالا خانوں کا اصول ہے کہ بیک وقت اگر دو یا زیادہ تماش بین ویل پیش کریں تو زیادہ ویل دینے والے کے پاس طوائف پہلے آتی ہے۔ میں اپنے ہمراہ خاصی رقم لے گیا تھا۔ بیس روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی کے علاوہ 100 روپے کے 60 نوٹ میرے پاس تھے۔ بیک وقت میں نے اور بیٹھتے نے مخصوص طوائف کو ویل دینے کے لئے اشارہ کیا۔ میرے پاس 20 روپے کا نوٹ تھا اور بیٹھتے نے 10 روپے آگے کر رکھے تھے۔ طوائف میرے پاس آئی اور نوٹ لے کر اٹھنے لگی تو میں نے 20 کا ایک اور نوٹ نکال کر اسے پھر بٹھایا۔

20 والے نوٹوں کی گڈی میں نے اپنے سامنے قالین پر رکھی ہوئی تھی اور ایک کے بعد ایک نوٹ دے کر اس طوائف کو اٹھنے نہیں دیتا تھا۔ بیٹھتے نے اپنا ہاتھ جس میں دس کا نوٹ پکڑا ہوا تھا پیچھے کر لیا۔ میں نے اپنا سلسلہ جاری رکھا۔ بیٹھتے مایوس ہو کر اٹھنے لگا تو میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے اسے بٹھایا اور کہا بیٹھتے باہر گیا۔ وہ ایک اجنبی کے منہ سے اپنا نام سن کر کچھ حیران سا ہوا۔ میں نے بے تکلفی سے اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اسے اپنے نزدیک کر لیا اور دوسرے ہاتھ سے ویل پہلے بیٹھتے کے سر پر اور پھر اس کے ماتھے اور گالوں پر رکھ کر دینی شروع کر دی۔ طوائف کا کیا تھا اسے تو نوٹ اکٹھے کرنے تھے۔ وہ میری دی ہوئی ویل بیٹھتے کے سر پر اور چہرے سے اٹھا رہی تھی۔ شراب کے نشے میں مدہوش بیٹھتے نے ایک دو بار مجھے رمی طور پر روکنے کی کوشش کی لیکن حسن و شباب کی گرمی اور اٹھلیکیاں اسے اتنا سن بھائی کہ اس نے ہتھیار چھینک دیئے۔

اس دوران دوسری دو طوائفیں مسلسل تاج رہی تھیں اور بے دلی سے دوسرے تماش بیٹوں کی دی ہوئی ویلیں لے رہی تھیں۔ کچھ تماش بین مقابلے کی سکت نہ ہونے کی وجہ سے اٹھ کر جا چکے تھے۔ سازندوں نے بھی اس دوران دوٹی دھیں شروع کیں لیکن میں نے بیٹھتے کی پسینہ بھری لڑکی کو اس کے سامنے سے اٹھنے نہ دیا۔ میری گڈی میں جب چار پانچ نوٹ باقی رہ گئے تو میں نے سو روپے کے 20 نوٹ تاہم کو مخاطب کر کے اس کی طرف پھینک دیئے اور اس سے پہلے کہ میرے باقی چار پانچ نوٹ ختم ہوتے، 20 روپے والے نوٹوں کی ایک ٹی گڈی میرے سامنے رکھ دی گئی تھی۔ تاہم مجھ سے اب کتنی رقم لینے کا سوچ کر قفس بند کر دیا اور ایک طرح کا وقفہ ہو گیا۔ تاہم نے سب سے کھانے کا پوچھا۔ میں نے تیج کباب اور پراٹھے منگوائے۔ بیٹھتے نے بھی کباب اور پراٹھے منگوائے۔ میں نے ایک ہزار روپے ٹیکہ کی طرف اچھالتے ہوئے کہا کہ بیٹھتے، میں اور اس کی محبوبہ ہم تینوں کھانا پچھلے کمرے میں اکٹھے کھائیں گے۔ تاہم نے سر ہلا کر حیران ہوئی۔ ہم تینوں نے پچھلے کمرے میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد اب محفل کا دوسرا حصہ شروع ہونا تھا۔ بیٹھتے اتنی زیادہ پی چکا تھا کہ لڑکھڑا کر کہی ادھر گرتا کہی ادھر۔ میں نے تاہم کو کہا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں اس لئے اب ہم چلتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے تاہم کو کم از کم 5 سو روپے دیئے اور بیٹھتے کو سنبھالتے ہوئے نیچے لے آیا۔ میرا ساتھی ریٹورنٹ میں میرا منتظر تھا۔ میں نے اسے کسی لانے کو کہا۔ جلد ہی ٹیکسی آگئی۔ چاوڑی بازار کے پیچھے ہی دو ٹنگ گیوں میں جم فروشی کا دھندا ہوتا ہے۔ میں نے وہاں ٹیکسی رکوائی۔ بیٹھتے تو ٹیکسی میں ہی خرابے بھرنے لگ گیا تھا۔ میں اس گلی میں گیا۔ گلی میں داخلے کی جگہ پر پولیس کا ایک ہیڈ کانسٹیبل اور سپاہی کھڑے تھے۔ میں نے ان کی طلب نگاہی سے اندازہ لگا کر 50 روپے ہیڈ کانسٹیبل کی منگنی میں تمنا دیئے۔ اس نے ہنستے ہوئے مجھے آگے جانے کا رین سٹل دے دیا۔ میں نے گلی کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگایا۔ ایک نسبتاً جوان اور صاف ستھری عورت کے قریب گیا تو وہ فوراً بولی ”30 روپیہ“۔ میں نے کہا میں 3 سو روپے کا اور ایک گھنٹے میں واپس چھوڑ جاؤں گا۔ وہ کچھ سوچنے لگی۔ میں نے کہا اچھا 5 سو روپے کا۔ اس نے دلاورے نام کے کسی آدمی کو بلا لیا اور اسے میری آفر بتائی۔ دلاورے پوچھنے لگا کہ کہاں لے جانا ہے۔ میں نے کہا دیا گج، اس نے کہا کوئی پکڑے؟ میں نے جواب دیا۔ ہاں ایک ہندو کو رسوا کرنا ہے جس نے کئی مسلمان لڑکیوں کو خراب کیا ہے۔ اس نے پوچھا آپ مسلمان ہیں؟ میں نے کہا ہاں، اس نے کہا آپ نے بجائے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے سیدھی اور سچی بات کی ہے۔ آپ مشکل سے بھی بھلے آدمی دکھائی دیتے ہیں۔ میں زری کو آپ کے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ ایک گھنٹے کے بجائے اسے بے شک صبح تک اپنے ساتھ رکھیں لیکن اسے صحیح سلامت واپس چھوڑ جائیں۔ میں نے اسے کہا کہ ایک آدمی بھی پاس نہیں جائے گا۔ ہمیں صرف اس ہندو کو رسوا کرنا ہے اور بس۔ اس نے زری کو میرے ہمراہ جانے کو کہا اور خود کمرے کے اندر چلا گیا۔ زری پانچ سات منٹ میں میک اپ درست کر کے باہر آگئی۔ میں اسے لے کر گلی کے باہر آ گیا۔ میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھتے، سچ میں زری اور پھر میرا ساتھی بیٹھ گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور کچھ تھا۔ میں نے اسے دیا گج جانے کے لئے کہا۔ دیا گج جاتے ہوئے آدھا ٹیک تاک کوئی آبادی نہ تھی۔ صرف درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ اس جگہ رک جائے۔ اپنے ساتھی کو میں نے سوائے ہوئے بیٹھتے کو سہارا دیکر جھاڑیوں کے پیچھے لے جانے اور زری کو بھی ان کے پیچھے جانے کو کہا۔ ڈرائیور کو میں نے 100 کا نوٹ دیا اور کہا کہ ٹیکسی کا بوٹ اٹھا کر یوں ظاہر کرے جیسے آئین میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہو۔ ہم پندرہ بیس منٹ میں واپس آتے ہیں۔ وہ ہنسنے لگا۔

بیٹھتے نشے میں چور زمین پر ڈھیر پڑا تھا۔ میرے ساتھی کو بھی علم نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں اور میرا ساتھی دونوں سچ تھے۔ میرے ساتھی کے پاس تقریباً دو ہزار روپے تھے۔ میں نے اس سے ساری رقم لے لی اور اپنے سارے روپے اکٹھے ملا کر مدہوش بیٹھتے کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ بیٹھتے کو میرے ساتھی نے زمین پر بیٹھے بیٹھے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ میں نے زری کو کہا کہ وہ بیٹھتے کے بالکل ساتھ کھڑی ہو کر بیٹھتے کے سینے پر سر رکھ دے۔ اب یہ پوز کچھ یوں تھا کہ دونوں جھاڑیوں میں کھڑے تھے اور بیٹھتے نے نوٹوں والا ہاتھ اس کی گردن کے پیچھے سے گزار کر سامنے اس کے جسم پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے ساتھی سے کہرا لے کر اس کی پوری 12 تصویریں اتاریں۔ اس کے بعد میں نے نوٹ بیٹھتے کے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب ہم واپس ٹیکسی کی طرف لوٹے تو بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزارا ہوا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو واپس چوڑی بازار چلنے کو کہا۔ اس گلی کے قریب پہنچ کر میں نے زری کو واپس جانے کیلئے کہا تو وہ کہنے لگی کہ مجھے میرے کمرے تک چھوڑ جائیں ورنہ پولیس والے مجھے زبردستی ہمراہ لے جائیں گے۔ میں زری کو اس کے کمرے تک چھوڑ کر واپس پلٹا تو وہی دونوں پولیس والے وہاں موجود تھے۔ 50 روپے رشوت کی گرمی میں وہ ہمارے گلی میں جانے اور میرے واپس آنے پر صرف مسکرائے۔ اب میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ریلوے اسٹیشن کی طرف چلنے کیلئے کہا۔ ریلوے اسٹیشن پر یہ ٹیکسی چھوڑ کر ہم نے ایک دوسری ٹیکسی لی اور بیٹھتے کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ بیٹھتے کے گھر کی گلی کے چند قدم کے فاصلے پر میں نے ٹیکسی روکی۔

میں ٹیکسی میں بیٹھا رہا اور میرا ساتھی ادھ سوئے بیٹھتے کو سہارا دے کر اس کے گھر تک لے گیا۔ بقول اس کے بیٹھتے کے لڑکے نے دروازہ کھولا۔ میرے ساتھی نے بیٹھتے کو اس کے حوالے کیا اور تیز قدموں سے واپس لوٹ آیا۔ بیٹھتے کے لڑکے نے میرے ساتھی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ شاید یہ اس کے روز کے معمولات میں تھا کہ نشے میں چور واپس لوٹنا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کو حملہ فرما کر خانے کے قریب اتار دیا۔ اس سے لی ہوئی رقم واپس لوٹا دی اور کہا کہ فلم ڈیولپ کر کے ارجنٹ ہر تصویر کی تین تین کاپیاں بنوالے۔ میں اگلی شام 7 بجے اسے چاوڑی بازار کے اسی ریٹورنٹ میں ملوں گا۔ اپنے ساتھی کو رخصت کر کے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو دہلی چلنے کو کہا۔ لوڈی ہوٹل سے آگے زری ٹیکسی کو فارغ کیا اور ٹھٹھا ہوا واپس ہوٹل چلا آیا۔ اگلے روز شام کو میرے دو ساتھی مقررہ وقت پر مجھے چاوڑی بازار کے اسی ہوٹل میں ملے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ہنستے ہوئے میرے پاس بیٹھ گئے اور گزشتہ رات کی کہانی ہونی 12 تصویروں کا ایک سیٹ میرے سامنے رکھ دیا۔ تصویریں بالکل صاف آئی تھیں اور فلیش گن نے پس منظر میں جھاڑیوں کو بھی نمایاں کر دیا تھا۔ باقی دو سیٹ اور ٹیکسٹوہ احتیاطاً اپنے گھر چھوڑ آئے تھے۔ ان تصویروں کی وجہ سے بیٹھتے مجھے بالکل بے دست و پا نظر آ رہا تھا۔ اس کی کمزوری میرے ہاتھ ابھکی تھی۔ اب مجھے یہ کہنا تھا کہ بیٹھتے سے مل کر اور اسے یہ تصویریں دکھا کر اس کے بھیا تک انجام کی ایسی تصویر کشی کروں کہ وہ میری ہر بات ماننے پر مجبور ہو جائے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ بیٹھتے سے ملنے میں دو تین دن کا وقفہ دیا جائے۔ گزشتہ رات وہ اتنا مدہوش تھا کہ ہماری ”کارروائی“ کے دوران اس نے کوئی مزاحمت نہ کی تھی۔ اگر اسے کوئی بات یاد آئی تو وہ اسے شاید خوب سمجھے اور اگر اسے سب کچھ یاد بھی گیا تو اپنے ساتھ گزری ہوئی ”واردات“ کے اثر سے سنبھل جائے۔ اس سے فوری ملنے اور تصویریں دکھانے سے یہ بھی ممکن تھا کہ گھبراہٹ میں وہ اپنے افسران کے سامنے خود ہی سب کچھ بک نہ دے۔ میں اسے چند روز شش و پنج میں اور ہمارے اگلے اقدام (اگر اسے سب یاد آ گیا ہو تو) کے انتظار میں رکھنا چاہتا تھا۔ ہم ریٹورنٹ میں دو تین گھنٹے بیٹھے رہے لیکن اس رات بیٹھتے نہیں آیا۔ بیٹھتے کے ساتھ اس رات جو گزری وہ ہمارا پہلے سے تیار کردہ منصوبہ نہ تھا۔ محض اتفاق تھا کہ پہلے روز ہی یہ سب کچھ ہو گیا لیکن اب مجھے بازی جیتنے کیلئے اپنے پتے نہایت ہوشیاری سے کھیلنے تھے۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ عیسائی خاکیوں کے پیچھے لگے ہوئے دونوں ساتھیوں کو کہیں کہ وہ اپنا کھلم کھلی لیکن ہوشیاری سے مکمل کریں۔ میں چاہتا تھا کہ اگر بیٹھتے کو میں نے قابو کر لیا تو خاکیوں کے ذریعے کو فوراً شروع ہو جائے۔ میں نے اٹھتے ہوئے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ اگلی صبح وہ بیٹھتے کی گمرانی کریں اور دیکھیں کہ وہ دفتر جاتا ہے یا نہیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ لگا نہیں اور ہر شام اسی ریٹورنٹ میں بیٹھ کر بیٹھتے کی وہاں آمد کا انتظار کریں اور جو بھی وہ بالا خانے کی طرف جائے تو ایک اس کا پیچھا کرے اور دوسرے مجھے اکبر ہوٹل کی لابی میں اطلاع دے۔

غرضیکہ ان انتظامات کے تحت چار روز میں نے بیٹھتے کا انتظار کیا لیکن وہ چاوڑی بازار کی طرف نہیں گیا۔ دوسری طرف خاکیوں پر کام کرنے والے ساتھی بھی ابھی تک کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکے تھے۔ ان حالات میں، میں نے فیصلہ کیا کہ بیٹھتے کی آمد کے انتظار میں مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے خود اس سے رابطہ قائم کیا جائے۔ میں نے اپنے ایک ساتھی کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ بیٹھتے کے دفتر سے واپسی کے وقت کسی بس اسٹاپ کے قریب ایک چٹ اسٹھ کر فوراً بس سے اتر کر غائب ہو جائے۔ دوسرا ساتھی بیٹھتے کے گھر اترنے کے اسٹاپ پر اس کی خفیہ گمرانی کرے اور دیکھے کہ بیٹھتے گھر جاتا ہے یا چٹ پر کبھی ہدایت کے مطابق سرائے بیرم خان کے پہلے بس اسٹاپ کے بالکل سامنے ایک ریٹورنٹ کی طرف جاتا ہے اور یہ بھی دیکھے کہ بیٹھتے کا پیچھا نہیں کیا جا رہا۔ چٹ پر بس نے انگریزی میں لکھا تھا (تحریر کا ذکر) کہ وہ بالا خانے کے حوالے سے اور بعد میں پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں اپنی اور اپنے گھر والوں کی بھلائی کیلئے اس ریٹورنٹ میں اپنے گھر جانے سے پہلے پہنچ جائے۔ میں نے چٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس چٹ کے اسے ملنے کے بعد ہمارے ساتھی اس کی مسلسل گمرانی کر رہے ہیں اور اگر اس نے چٹ پر درج ہدایت کی کوئی بھی خلاف ورزی کی تو اسے اور اس کے گھر والوں کو ناقابل حلفی نقصان پہنچے گا۔

یہ سارا کام آئندہ روز ہونا تھا۔ میں اس مشن کی تکمیل کیلئے بس میں چٹ دینے والے ساتھی اور خود کو بیٹھتے کے سامنے EXPOSE کرنے کا خطرہ مول لے رہا تھا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ میں نے چاروں ساتھیوں کے سامنے یہ تجویز رکھی۔ فیصلہ تو میں کر چکا تھا۔ انہیں تو رمی طور پر بتانا تھا۔ سب نے میری تجویز مان لی اور ایک اضافہ کر دیا کہ بیٹھتے کے ساتھ ملاقات کے دوران وہ میری گمرانی اور حفاظت کیلئے مسلح ہو کر ہمارے ارد گرد ہی منڈلاتے رہیں گے۔ یہاں پر مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھی مشن کا کامیابی کے علاوہ میری زندگی اور تحفظ کیلئے کتنے مستعد ہیں۔ میں اسی لئے اپنے گروپ کو FIVE MEN ARMY کہا کرتا تھا۔

میں نے کہہ دیا کہ جب بیٹھتے اور میں ریٹورنٹ سے باہر نکلیں تو ہماری ایک تصویر خفیہ طور پر اتارے۔ اس وقت تک شام گہری ہو چکی ہوگی اس لئے حسب سابق جھاڑیوں والی تصاویر کی طرح فلیش گن استعمال کرے۔

یہ تمام ہدایات دے کر میں اپنے ہوٹل واپس آیا۔ بھارت میں آنے کے بعد یہ ہمارا پہلا موقع تھا کہ میں خود کو بطور مسلمان اور پاکستانی، ایک اہم شخص کے سامنے ظاہر کر رہا تھا۔ اس میں کامیابی اور ناکامی کے برابر کے مواقع تھے۔ میں نے اپنی طرف سے ہر ممکن پیش بندی کر لی تھی۔ چٹ ملنے کے بعد بیٹھتے کو کوئی موقع نہیں دیا گیا تھا کہ وہ ہماری اس متوقع ملاقات کا اپنے افسران کو بتائے لیکن یہ بھی عین ممکن تھا کہ بیٹھتے کو نیم بے ہوشی کی حالت میں جھاڑیوں میں اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ یاد آ گیا ہو اور اس نے اسے اپنے افسران کو بتا کر انہیں چونکنا کر دیا ہو اور واقعے کے دوسرے روز سے ہمارے آئندہ اقدام کو ناکام بنانے اور ہمیں ٹریپ کرنے کیلئے بیٹھتے کی حفاظت اور گمرانی پر کچھ لوگ مامور کر دیئے گئے ہوں۔ ایسی صورت میں پیش آنے والے حالات سے میں بخوبی ناخبر تھا۔ لیکن میری چھٹی حس یہ کہہ رہی تھی کہ اپنے مقصد کے حصول میں ہمیں کامیابی ہوگی۔ تربیت کے خاتمے پر میرے سینئر نے جو رپورٹ BIG BOSS کو بھیجی تھی وہ مجھے بھی دکھائی گئی تھی۔ اس رپورٹ کی آخری سطر مجھے ابھی تک یاد ہے IN MY OPINION HE IS INDESTRUCTIBLE OPTIMIST (میرے خیال میں یہ ایک پرامید نہ ٹوٹنے والا شخص ہے) مجھے اپنے سینئر کے ان الفاظ کی لاج بھی رکھی تھی اور سب سے زیادہ مجھے اپنے قادر مطلق و مکمل یقین اور اعتماد تھا کہ وہ دلوں کے عہد جاننے والا ہے۔ اس کے نام پر بنائے ملک کی بقا کی خاطر میں نے جو بھی فعل کئے ہیں وہ ان کی اصلیت اور مقصد، بخوبی جانتا ہے اور مجھے کامیابی نصیب ہوگی۔

غازی

میں نے اگلی صبح لیٹھونٹ کے گھرانے کے افراد اس کی بیٹی کے اسکول اور آشنا کی تصویریں اور کوائف اکٹھے کئے۔ ان کوائف کی ہماری بنائی۔ لیٹھونٹ کی تصاویر کو الگ لفافے میں رکھا۔ اپنا اسلٹو لڈو کیا اور فالتو راؤنڈ بھی رکھ لئے۔ یہ سب تیار کیا کرنے کے بعد میں ساتھیوں کے گھر گیا۔ وہ بھی اپنی تیاریوں میں مشغول تھے۔ میں نے اپنے پکڑے جانے کی صورت میں حسب سابق چارج اپنے ایک ساتھی کو دیا۔ میرے ساتھی کچھ جھمکے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور پٹی مذاق کی باتوں سے ان کا دل بہلایا۔ ہوٹل سے اپنے ہمراہ میں احمد نگر کی فائلوں کی فونو فلم اور لیٹھونٹ کی تصویروں کے دو بقیہ سیٹ اور ٹیکو بھی لے آئے تھے۔ وہ بھی اپنے نمبر ٹوکے حوالے کے۔ اب میرے کمرے میں کوئی ایسی چیز تھی جو مجھے قابل مواخذہ ثابت کر سکے۔ آخری ہدایات دینے کے بعد میں نے ساتھیوں سے رخصت چاہی۔

شام کے 4 بجے میں سرانے ہیرم خان کے اس ریٹھونٹ کے قریب جا پہنچا جہاں لیٹھونٹ کو ملاقات کیلئے بلایا گیا تھا۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ میرے دو ساتھی بھی نظر آ گئے۔ ایک کے پاس ایک بیگ میں کیمرا اور فلش گن تھی۔ ہم ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر چھپر نما چائے خانوں میں بیٹھ گئے۔ جلد ہی میرا وہ ساتھی بھی آ گیا جسے لیٹھونٹ کوس میں چٹ دینی تھی وہ اس چائے خانے کے قریب ایک جگہ کھڑا ہو گیا اور اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا۔ میں ٹپٹلتے ہوئے اس کے پاس سے گزرا تو اس نے کہا کہ بس میں بہت رش ہونے کی وجہ سے لیٹھونٹ کو چٹ دینے کے بعد وہ بس میں کھڑے مسافروں میں اس طرح چھپ چھپا کر اتر کر یقینی طور پر لیٹھونٹ سے دیکھ نہ سکا اور دوسرا ساتھی اسی بس میں سوار لیٹھونٹ کی نگرانی کر رہا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ دو ساتھی پہلے ہی آچکے ہیں اور اب لیٹھونٹ اور چوتھے ساتھی کا انتظار ہے۔

اب ہم سب امید و بیم کی کیفیت میں لیٹھونٹ کا انتظار کر رہے تھے اور میں دل ہی دل میں اس گفتگو کا اعادہ کر رہا تھا اور اسے مزید پراثر بنا رہا تھا جو مجھے لیٹھونٹ سے کرتی تھی۔ اسی گفتگو پر ہمارے اس مشن کا دارومدار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ لیٹھونٹ کو ہمارے ساتھ تعاون نہ کرنے کی صورت میں اسے مستقبل کی (جو اسی ریٹھونٹ کے باہر سے شروع ہو گا اور اس کے گھر کے تمام افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا) ایسی بھیا تک صورت دکھاؤں کہ اس کا BREAKING POINT (ٹوٹنے اور مدافعت کے خاتمے کا نقطہ) آجائے اور وہ ہمارے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں اس کی حفاظت کے علاوہ مالی فوائد کا بھی لاٹچ دیا جائے۔ میں اپنی ہونے والی گفتگو کے بیچ وچ کو مزید درست کرنے کیلئے اسی چھپر ہوٹل میں ایک اوٹ میں بیٹھ گیا۔ 6 بجے کے قریب میرے ایک ساتھی نے ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے سیٹی بجائی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہاں کے انداز میں بلایا۔ یہ لیٹھونٹ کی آمد کی اطلاع تھی۔ شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں، میں نے لیٹھونٹ کو مردہ قدموں سے ریٹھونٹ میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر میرا ساتھی جو اس کے تعاقب میں تھا، نظر آیا۔ میں چھپر ہوٹل سے اٹھا اور اس ساتھی کے قریب سے گزرا۔ اس نے سرگوشی میں کہا کہ لیٹھونٹ اپنے گھر سے بہت پہلے ایک اسٹاپ پر اتر کر سرانے ہیرم خان کی بس پر سوار ہو گیا تھا۔ میرا ساتھی بھی اسی بس میں سوار ہوا۔ کوئی نگرانی نہیں ہو رہی۔

سب اچھا کی رپورٹ ملنے کے بعد میں ریٹھونٹ کی طرف گیا۔ ریٹھونٹ میں لیٹھونٹ کو نے ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ میں جب اس کی میز کے بالکل سامنے پہنچ گیا تو لیٹھونٹ نے مجھے دیکھا اور ایک دم چونک گیا۔ اس کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی اور اسی گھبراہٹ میں پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ میں لیٹھونٹ کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھ گیا اور ویٹر کو کافی اور کچھ SNACKS لانے کا آرڈر دیا۔ لیٹھونٹ اپنی گھبراہٹ میں غصے اور زری کلمات بھی بھول چکا تھا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا جا رہا تھا۔ میں نے اسے کہا لیٹھونٹ باہر میں نے ہی آپ کو یہاں بلوایا ہے اور آپ سے کچھ بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔ لیٹھونٹ نے مجھے ٹوکا اور پوچھا کہ آپ وہی ہیں نا جو اس روز بلا خانے میں میرے ہمراہ بیٹھے تھے۔ آپ کا شہ نام کیا ہے؟ میں نے ذرا حکمانہ لہجے میں کہا۔ دیکھو! لیٹھونٹ! جب میں بات کر رہا ہوں تو مجھے ہرگز مت ٹوکو۔ یہ شی کا بلا خانہ نہیں ہے (شی اس کی پسندیدہ رقاصہ تھی) میری باتیں وہ بیان سے سنو اور مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرو۔ وہ حیران اور سرسیمہ مجھے نکلے جا رہا تھا۔ میں نے ایک، ایک کر کے اس کے لڑکے اور لڑکیوں کی تصاویر اس کے سامنے رکھ دیں اور ان کے نام بھی بتا دیئے۔ پھر اس کی لڑکی کے اسکول اور اس کی استانی لڑکی کے آشنا کی تصویر بھی سامنے رکھ دی۔ ان تصاویر کے دیکھنے کے بعد میں اس کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولے میں نے کہا۔ ”لیٹھونٹ میں تمہارے اور تمہارے گھر کے افراد کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہوں جتنا شاید تم بھی نہیں جانتے اور تمہارے بارے میں ایک خاص بات..... اور اس کے ساتھی ہی جھانزیوں کی اوٹ میں لی گئی 12 تصویریں اس کے سامنے رکھ دیں۔

لیٹھونٹ ایک ایک تصویر دیکھتا جاتا تھا اور اس کی پریشانی اور گھبراہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ آدھی تصویریں دیکھ کر ہی وہ حوصلہ چھوڑ بیٹھا۔ اس کی پریشانی پسینے سے بھیگ چکی تھی۔ فی الحقیقت اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے تصویریں اس کے سامنے سے اٹھائیں۔ لیٹھونٹ کہنے لگا ”اس عورت (زری) کو میں بالکل نہیں جانتا۔ بھگوان کی سوگند ہے میں بالکل نہیں جانتا۔“ وہ لڑکھاتی زبان میں انک انک کر کہنے لگا۔ ”میں تو غریب آدمی ہوں۔ سرکاری دفتر میں ملازم ہوں۔ بس اندازہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر بھی آپ بتائیں آپ کی ڈیمانڈ کیا ہے؟“ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس سے رقم وصول کرنے کیلئے اسے بلک میں کر رہا ہوں۔ میں نے اسے اسی حکمانہ لہجے میں کہا۔ ”اگرچہ میں تمہارے متعلق سب کچھ جانتا ہوں لیکن تمہارے منہ سے سچائی سننا چاہتا ہوں۔ جس دفتر میں کام کرتے ہو، وہاں اپنے ڈپارٹمنٹ اور اپنی پوزیشن کے متعلق بتاؤ۔“ اس نے کہا کہ ”وہ ملٹری ہیڈ کوارٹر میں COPYING BRANCH میں سپرنٹنڈنٹ ہے۔“ تو پھر اس تنخواہ میں بلا خانوں کی عیاشی کیسے کرتے ہو۔ میں نے پوچھا تو وہ گرگڑا کر کہنے لگا کہ گھر کا خرچ تو میری بیٹی جو ٹیچر ہے وہ اٹھاتی ہے۔ باقی سبے جو پڑھتے ہیں ان کی فیس وغیرہ میں ادا کرتا ہوں۔ وہ پھر گرگڑا کر کہنے لگا کہ میں غریب آدمی ہوں۔ پھر بھی آپ اپنی ڈیمانڈ بتائیں۔ ساتھ ہی اس نے پوچھا کہ آپ کو اعتراض نہ ہو بتائیں کہ کیا آپ ملٹری اٹیلی جنس کے آدمی ہیں؟ میں نے کہا ایک طرف تم مجھ سے میری ڈیمانڈ پوچھتے ہو اور ساتھ ہی میری شناخت بھی جانتا چاہتے ہو؟ میں نے اسے زوردار لہجے میں کہا۔ لیٹھونٹ میں یہاں تمہارے سوالوں کا جواب دینے نہیں آیا۔ تم چاروں طرف سے گھر کھینچو۔ تمہاری یہ تصویریں (یہ کہتے ہوئے میں نے تصویریں جیب سے باہر نکال کر میز پر رکھ دیں) تم کو تھوڑا دیر با د رکھتی ہیں۔ تم اپنی زندگی کا بقیہ حصہ جیل میں گزارو گے۔ اس عورت کے ساتھ تمہاری اس حالت میں ہاتھوں میں نوٹ پکڑے ہوئے یہ تصویریں ہی تمہیں جیل میں بقیہ زندگی کھینچیں ہیں گرگڑا کر کہنے لگا ”میں نے لیٹھونٹ سے کہا کہ اس کا ہارٹ ٹپل ہو جائے گا۔ وہ کاپینے کاپینے بار بار ادا کر دیکھ رہا تھا جیسے ابھی کہیں سے گولی چلے گی اور اس کا کام تمام کر دیگی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ خوف سے کہیں اس کے دل کی دھڑکن ہی نہ بند ہو جائے تو میں نے پانی کا گلاس اسے دیا۔ اس نے پانی پیا، لیکن اس کی گھبراہٹ اور کانپنے میں کوئی کمی نہ ہوئی۔

میں نے اسے کہا ”دیکھو لیٹھونٹ جو کچھ میں نے کہا ہے یہ سب کچھ بھی ہو سکتا ہے اور اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو تو نہ صرف تمہارے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوگا بلکہ تمہیں تعاون کرنے کا خاطر خواہ معاوضہ بھی دیا جائے گا۔“ امید کی کرن دیکھ کر وہ فوری بولا ”مجھے بتائیے مجھے کیا تعاون کرنا ہوگا؟“ میں نے اسے کہا کہ ”سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ کس حد تک تعاون کر سکتے ہو اور دوبارہ کہنا ہوں کہ مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ صرف میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ اور بالکل صحیح جواب۔“

تم COPYING BRANCH میں سپرنٹنڈنٹ ہو۔ تمہارے پاس آرمی ہیڈ کوارٹر سے بھیجی جانے والی ڈاک کے علاوہ آنے والی ڈاک کی بھی کاپیاں بنانے کیلئے آتی ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا ”عموماً روزانہ کتنی ڈاک تمہارے سیکشن میں آتی ہے اور کتنی ڈاک جاتی ہے اور یاد رکھنا مجھے تمہارے دفتر میں آنے اور جانے والی ڈاک کی تمام تفصیل معلوم ہے۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ تم کتنا بچو لے ہو۔ یہ باتیں تم سے پوچھ رہا ہوں۔“ لیٹھونٹ میں اب قوت مدافعت بالکل نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے مزید ڈرانے کے لئے کہا کہ تمہاری زندگی کا دارومدار اب صرف تمہارے بچ بولنے اور ہم سے تعاون کرنے پر ہے۔ اس لئے ہر جواب دینے سے پہلے میری بات کو یاد رکھنا۔ لیٹھونٹ BREAKING POINT پر تو آئی چکا تھا اب میں اسے مزید ”بھٹکے“ دینا چاہتا تھا۔

ہندو اگر کسی بات سے زیادہ ڈرتا ہے تو وہ موت ہے۔ اسی موت کے ڈر سے چند ہزار غیر ملکی مسلمان فوجیوں کے ساتھ غوری، تعلق، غلاماں، لودھی اور مغل حکمرانوں نے کروڑوں کی تعداد میں ”ہندو اور باہمت“ ہندوؤں کے مہابھارت پر دھڑلے سے حکومت کی۔ ان سے بھی پہلے محمد بن قاسم اور محمود غزنوی نے ہندوؤں کی اس ”پوتر“ دھرتی کا تینا ناچ کئے رکھا اور اس کی وجہ ہندو کی ازلی بزدلی اور موت کا خوف تھا۔ زندہ انسانوں کی قربانی دے کر وہ ”کالی ماتا“ سے طاقت حاصل کرنے کی پراختیا کرتے ہیں۔ کالی ماتا کا بت بھی انہوں نے اپنی بزدلی کو دور کرنے کیلئے بنایا ہوا ہے لیکن پتھر کی یہ مورتیاں بھی ان کا خوف دور نہ کر سکیں۔ جبکہ مسلمان کیلئے درجہ شہادت اس کی دنیا اور آخرت میں معراج کا نام ہے۔ رب ذوالجلال والا کرام نے درجہ شہادت کو نہ صرف مسلمان کی زندگی اور آخرت کی معراج قرار دیا ہے بلکہ شہید کا رتبہ اتنا بلند ہے کہ رب کریم نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ شہیدوں کو مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں اور ہم انہیں رزق دیتے ہیں۔ قیامت کے روز شہید بلا حساب کتاب کے داخل جنت ہوں گے۔ شہادت کے بعد شہید کو جو اعلیٰ و ارفع مقام ملتا ہے تو وہ خداوند کریم سے بار بار دنیا میں جانے اور شہادت پانے کی التجا کرتے ہیں اور ہندو جن کے ہاں سورگ (جنت) اور نرک (جہنم) کا تصور تو ہے اور ان کے یقین کے مطابق بھی نرک میں آگ ہی آگ ہے شاید اسی آگ کا عادی بنانے کے لئے وہ مردہ ہندوؤں کو اس دنیا میں شمشان میں آگ کی نذر کر دیتے ہیں۔

لیٹھونٹ نے مجھے بتایا کہ اوسطاً تیس سے چالیس خطوط روزانہ مختلف ڈویژنوں سے آتے ہیں۔ ریمسٹس اور بریگیڈ میز کو ہیڈ کوارٹر کو ڈائریکٹ CONTACT کرنے یا خطوط لکھنے کی اجازت نہیں ہوتی اور تقریباً اتنے ہی خطوط ہیڈ کوارٹر سے باہر بھیجے جاتے ہیں۔ میں نے CLASSIFIED خطوط کے متعلق پوچھا تو لیٹھونٹ نے بتایا کہ CLASSIFIED فائلوں میں لگنے کے لئے بھیج دیئے جاتے ہیں۔ ”اور ان سب کے انچارج تم ہو۔“ میرے اس سوال پر لیٹھونٹ نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا اور CLASSIFIED اور ”اہم خطوط تم ہی ٹائپ کرتے ہو گے۔“ میں نے یوں ہی سوال جڑ دیا۔ ”ایسے خطوط ایک کلرک ٹائپ ماسٹ ٹائپ کرتا ہے لیکن CORRECTION کے لئے پہلے میرے پاس آتے ہیں۔“ لیٹھونٹ نے جواب دیا۔ میں نے چند لمبے تاہل کے بعد لیٹھونٹ سے پوچھا کہ کیا وہ میرے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہے؟ لیٹھونٹ نے جواب دیا ”اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟“ میں نے کہا کہ ایک دوسری صورت بھی ہے۔ ریٹھونٹ کے باہر تمہیں گولی مار کر تمہارا کام تمام کر دیتے ہیں اور تم تعاون کے گنہگار ہو گے۔ لیٹھونٹ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور التجائی لہجے میں کہنے لگا ”نہیں، نہیں سر، ایسا نہ کیجئے گا، میں آپ کے لئے ہر کام کرنے کو تیار ہوں۔“

میں نے لیٹھونٹ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”اگر تم اپنی جان بچانے کیلئے میرے ساتھ تعاون کرنے کی جھوٹ موٹ بات کر رہے ہو تو تمہارا اور تمہارے خاندان کا وہ بھیا تک حشر کروں گا جس کا تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اپنے تعاون کے ثبوت کے طور پر کل دفتر سے واپسی پر CLASSIFIED فائلوں میں سے گزشتہ 3 ماہ کی ڈاک نکال کر اور ایک بڑے لفافے میں بند کر کے اپنے ہمراہ لے آنا۔ وہ ڈاک تم سے کون اور کہاں لیتا ہے۔ وہ تمہیں ابھی نہیں بتاؤ گا۔ میرے علاوہ جو بھی تم سے ڈاک وصول کرے گا۔ وہ تمہیں آدھی تصویر دکھائے گا، میں نے اس کی تصویروں میں سے ایک تصویر اسے دہرا کر کے اوپر ہی حصہ اسے دکھایا اور کہا کہ جو بھی یہ اوپر ہی حصہ تمہیں دکھائے وہ لفافہ اس کے حوالے کر دینا۔ اس عمل کے دوران میرے کم از کم ایک درجن آدمی تمہاری نگرانی اور تمہاری نقل و حرکت کو دیکھتے رہیں گے۔ اگر کوئی بھی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو تمہیں وہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ ان فائلوں میں ہماری ڈیپٹی وائسٹرن کمانڈ سے آئے ہوئے اور بھیجے ہوئے خطوط میں ہے۔ فائلوں کا لفافہ تمہیں اگلے روز شام کو واپس مل جائے گا۔“ وائسٹرن کمانڈ نے لیٹھونٹ کو چوکا دیا۔ ”کیا آپ پاکستانی ہیں؟“ لیٹھونٹ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ”نہیں، میں بھارتی ہوں اور اس سے زیادہ سوال کرنے کی تمہیں اجازت نہیں۔ جب تم ہمارا اعتماد حاصل کر لو گے تو تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے گا۔ میں نے جوابا کہا۔ لیٹھونٹ نے ڈرتے ڈرتے پھر سوال کیا ”سر میرے اس تعاون کا معاوضہ کیا ہوگا؟“ میں نے کہا دیکھو لیٹھونٹ اب یہ تمہاری ہمت اور قابلیت پر ہے کہ تم مجھے کتنے اہم خطوط دیتے ہو۔ اس وقت اتنا کہہ سکتا ہوں کہ معاوضہ معقول ہوگا اور اگر کوئی بہت اہم خط تم نے ہمیں دیا تو اس کا معاوضہ کتنا ہوگا۔ میں نے تنبیہ کے طور پر اسے کہا ”اس کے دفتر اور اس COPYING ROOM میں جہاں وہ بیٹھتا ہے ہمارا آدمی موجود ہے۔ وہ تمہاری دفتر کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھے گا۔ لہذا دفتر میں بھی کوئی چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ کل شام کو تمہارا پہلا امتحان ہے اور اس میں کامیابی ہی ہمارا اعتماد حاصل کرنے کی جانب پہلا قدم ہوگا۔ کوئی کوتاہی یا عذر نہیں ہونا چاہئے۔“

غرضیکہ تقریباً دو گھنٹے کی ملاقات میں لیٹھونٹ کو میں پوری طرح سے اپنے جال میں پھانس چکا تھا۔ میں نے بل ادا کیا اور لیٹھونٹ کو کہا کہ وہ ٹھیک دس منٹ کے بعد باہر آئے۔ دس منٹ کے بعد جب لیٹھونٹ باہر آیا تو میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چھپر ہوٹل کے قریب اندھیرے میں چھپا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہی اس آگے اور وہ اس میں سوار ہو گیا۔ ادھر ہم نے ایک ٹیکسی لی اور پرانی دلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو زائد رقم دیکر ہم نے اسے 5 سواریاں بٹھانے پر رضامند کر لیا تھا۔ راستے میں ہمارا ایک ساتھی اتر گیا اور تھوڑے فاصلے پر ایک ایک کر کے سارے ساتھی اتر گئے۔ میں بھی محلہ فراش خانے سے پہلے ہی اتر گیا اور ایک گلی کا یونہی پکڑ کاٹ کر واپس سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل جا پہنچا۔ میں نے ساتھیوں میں سے ان دو کی جو خاکروہوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے یہ ڈیوٹی لگائی کہ ایک لیٹھونٹ کے گھر کی گلی کے باہر نگرانی کرے اور کوئی غیر معمولی بات دیکھے تو اسے نوٹ کرے اور 4 بجے سے پہلے گھر پہنچ جائے۔ دوسرے ساتھی کو بھی انہیں ہدایات کے ساتھ آرمی ہیڈ کوارٹر کے باہر لیٹھونٹ کی نگرانی کیلئے کہا کہ اگر لیٹھونٹ چھٹی سے پہلے آیا کچھ اور آدمیوں کے ساتھ باہر نکلتے اس کا فاصلہ رکھ کر پیچھا کرے۔

ہوٹل میں بستر پر دراز میں اگلے دن لیٹھونٹ سے لفافہ لینے کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ ایک دوسرا مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں لیٹھونٹ سے حاصل کردہ خطوط کی کاپیاں کس طرح بناؤں گا۔ اگر فونو فلم بنوانے، اس فونو گرافر کے پاس گیا جس نے احمد نگر کی فائلوں کی کاپیاں بنائیں تھیں تو اسے نکل پڑ سکتا تھا۔ ایسا کوئی طاقتور لیڈر کیمرہ بھی ہمارے پاس نہیں تھا جن سے ان خطوط کی تصویریں اتر کر پاکستان بھیجی جا سکتیں۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ مجھے چاندنی چوک میں ایک ٹھیلے والا دیا جو بڑی سلیٹوں کے سائز کے دو ٹوکے جن کے فریم کے اندر کوئی چکنا مسالہ بچھا ہوا تھا ان میں ایک لکھا ہوا کاغذ ایک فریم میں رکھ کر دوسرے فریم سے اسے دبا تھا اور پھر ان فریموں کو علیحدہ کر کے ایک سادہ کاغذ پہلے فریم میں رکھتا تھا اور دوسرے فریم سے اسے پھر دبا تھا اور پھر برعکس نمایاں طور پر دوسرے کاغذ پر آ جاتا تھا۔ میں نے کافی دنوں پہلے اس ٹھیلے والے کے پاس سے گزرتے ہوئے سرسری طور پر اسے عکس اتارتے دیکھا تھا اور اسے محض ایک متاثر سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ صبح سے پہلے پہلا کام اس ٹھیلے والے سے عکس اتارنے والی سلیٹوں کو دیکھنا ہے۔

غازی

اگلی صبح 10 بجے میں چاندنی چوک جا پہنچا۔ ٹھیلے والا کھڑا تھا۔ میں نے اسے ایک انگریزی رسالے کا ورق دیا جو میں ہمراہ لے گیا تھا۔ اس نے دو منٹ میں عکس اترا ہوا کاغذ میرے ہاتھ میں چھما دیا۔ میں نے اس کاغذ پر زور سے انگلیاں پھیر کر دیکھا کہ کہیں عکس اترا تو نہیں جاتا، عکس زعفرانی رنگ کا پختہ تھا۔ ٹھیلے والے نے مجھے ایک محلول سے بھری بوتل دی کہ جب عکس دھندلا ہو کر اتارنے لگے تو بوتل کے محلول سے روئی جھلکو پیلے والی سلیٹ پر پھیروں اور اس کے خشک ہونے کا انتظار کروں۔ ایک دفعہ محلول سے تر سلیٹ سے 40 سے زیادہ عکس اتار سکتے تھے۔ غرضیکہ جب میں مطمئن ہو گیا تو میں نے سلیٹوں کے چار سیٹ اور 4 بوتل محلول خریدے۔ جن کی مجموعی قیمت 250 روپے ادا کی اور وہاں ہوں چلا آیا۔ میرا ایک مسئلہ تو حل ہو چکا تھا لیکن دوسرا مسئلہ لیٹونٹ سے لفافہ وصول کرنا تھا۔ جس کے متعلق میں کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ اس عمل میں ہر طرح کی احتیاطی تدابیر کے باوجود خطرہ تھا کہ لیٹونٹ نے ہمیں پکڑوانے کا کوئی انتظام نہ کر رکھا ہو۔ لیٹونٹ کے سامنے صرف میں ظاہر ہوا تھا۔ میرے ساتھیوں کے متعلق اس کی معلومات صفر تھیں۔ لہذا اپنے ساتھیوں کے پھاؤ کیلئے میں نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ لیٹونٹ سے لفافہ میں ہی وصول کروں گا۔ میرے ساتھی میرے تحفظ کیلئے ادھر ادھر موجود ہوں گے لیکن سامنے نہیں آئیں گے۔

آج کا دن میرے لئے بہت اہم تھا۔ لیٹونٹ کے سامنے میں خود کو ظاہر (EXPOSE) کر چکا تھا اور فائلوں کے لفافے کی وصولی بھی مجھے ہی کرنی تھی۔ مجھے بار بار یہ خیال آتا کہ اگر لیٹونٹ نے ”چھوٹی برائی“، یعنی اپنی ذاتی غلطیاں اور کوتاہیاں اپنے افسران کو بتا کر ”بڑی برائی“، یعنی اہم فائلیں ہمیں دینے اور تعاون کرنے کی بات اپنے افسران بالا کو بتا دی تو پھر کیا ہوگا۔ تاہم صرف ہمارا مشن نام کا ہوجانے کا بلکہ میں پکڑا بھی جاؤں گا۔ اس صورت حال میں میرا کیا حشر کیا جائے گا اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ پکڑے جانے کی صورت میں بھارتی تشدد کی سوچ ہی سے خوف کی لہر بڑھ کر ہڈی تک اترتی محسوس ہوتی تھی۔ جان جانے کا خوف، یقین جاننے ہرگز تھا کیونکہ ہم تو سرور پر کھن باندھ کر ہی سرحد پار آئے تھے۔ خوف تھا تو صرف یہ کہ میں تشدد کس انتہا تک سہہ سکوں گا۔ ہر حال اس بے چینی پر میں نے قابو پایا۔ عمل کو اچھی طرح چیک کر کے لوڈ کر لیا اور سائیکل کی داڑھ کے تاروں کو ڈھیلا کر لیا تا کہ ضرورت پڑے تو اسے جلد از جلد نکل سکوں۔

میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ لیٹونٹ سے پیکٹ کہاں پر لوں۔ لیٹونٹ کے دفتر سے گھر جانے والی بس میں پیکٹ لینا خارج از بحث تھا۔ اسلئے کہ لیٹونٹ کو اگر ”ڈبل رول“ کرنا تھا تو اس بس میں پہلے ہی سے بھارتی کمانڈو بیٹھے ہوں گے جو مجھے بڑی آسانی سے پکڑ سکتے تھے۔ اب باقی رہ گیا تھا لیٹونٹ کا بس سے اتر کر گھر جانے کے دوران کا فاصلہ۔ بس اسٹاپ اس گھر کی گلی سے قریب پچاس ساٹھ میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس راستے پر بھی بھارتی کمانڈو پہلے سے موجود ہو سکتے تھے اور اس گھر کی گلی کو ایک پھندا ثابت ہو سکتی تھی۔ اگرچہ میرے چاروں ساتھی بس میں سڑک اور گلی میں میری ہدایت کے مطابق موجود ہونے تھے لیکن ہم پانچوں اپنے سائیکل آرمز کے ساتھ کمانڈو کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ سوچ سوچ کر بالآخر ایک تجویز کچھ بہتر نظر آئی اور میں نے اس کے مطابق عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری روانگی کا وقت ہو چلا تھا۔ میں نے دو نفل بارگاہ رب اعزرت میں اپنی کامیابی کی التجا کے پڑھے اور پانچ ساری تیاری کے ساتھ ہٹوں سے باہر آ گیا۔

میں نے ہٹوں کے باہر کھڑی ٹیکسیوں میں سے ایک ٹیکسی لی اور اسے کنات پھیلے لے گیا۔ وہاں اس ٹیکسی کو چھوڑ کر ایک دوسری ٹیکسی لی اور لیٹونٹ کے گھر کی گلی کے سامنے سے رفتار آہستہ کروا کے آگے بڑھ گیا۔ میرے دو ساتھی وہاں موجود خود اپنے اور ٹھیلے والوں کے ساتھ مصروف تھے۔ آگے جا کر میں نے یہ ٹیکسی بھی چھوڑ دی اور ایک اور ٹیکسی لے کر لیٹونٹ کی گلی والی سڑک پر آ گیا اور اسے ایسی جگہ پارک کروا لیا جہاں سے بس اسٹاپ اور میری ٹیکسی کے بیچ میں لیٹونٹ کی گلی پڑتی تھی۔ ٹیکسی کارن میں نے بس روٹ کے مخالف سمت رکھا۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دفتر کے روٹ والی بس آگئی۔ تین چار مسافروں کے ساتھ لیٹونٹ بھی اترا اور میرے دو ساتھی بھی۔ دوسرے اتارنے والے مسافر بے ضرر دکھائی دے رہے تھے۔ بس آگے بڑھ گئی۔ میرے پہلے سے موجود دو ساتھی مجھے اپنے مخصوص اشاروں سے سب اچھا کی رپورٹ دے چکے تھے۔ بس سے اتارنے والے ساتھیوں نے بھی اشاروں میں سب اچھا کی رپورٹ دی تو میں نے ٹیکسی اشارت کرنے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھانے کا کہا۔ لیٹونٹ بوجھل قدموں سے اپنی گلی کی طرف آ رہا تھا اس کے ہاتھ میں کپڑے کا بنا ہوا ایک بڑا تھیلا تھا جسے وہ دو پہر کے کھانے کا ٹھنڈا کیریز رکھنے کے لئے استعمال کرنا تھا۔ لیٹونٹ ابھی گلی سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ میں نے ٹیکسی اس کے بالکل قریب رکوا دی۔ لیٹونٹ نے مجھے دیکھا اور اشارہ کیا کہ باہر آ جاؤں۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی اس نے تھیلے میں سے ایک بڑا پیکٹ مجھے نکال کر دیا اور کہا کہ 7 بجے تک اسے واپس پہنچا دوں۔ یہ سارا عمل آٹھ دن تک میں ہوا۔ پیکٹ لے کر میں تیزی سے پلانا۔ میرے چاروں ساتھی اس دوران گلی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ انہیں بھی یہی غرض تھا کہ کہیں میں ٹریپ نہ ہو جاؤں۔

ٹیکسی تک پہنچتے پہنچتے میں نے پیکٹ ایک ساتھی کو تھما دیا اور کہا کہ گھر پہنچو میں وہیں آ رہا ہوں۔ کنات پھیلے پر میں نے پھر ٹیکسی بدلی اور اپنے ہٹوں آگیا۔ ہٹوں تک پہنچتے پہنچتے میں بار بار پیچھے دیکھتا رہا کہ کہیں میرا اچھا تو نہیں ہو رہا لیکن سب ٹھیک تھا۔ ہٹوں پہنچ کر میں نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔ اب تک سب کام ہمارے منصوبے کے عین مطابق ہو رہے تھے۔ میں ایک بڑھ گھنٹہ آرام کر کے فریش ہو گیا اور سلیٹوں کے چاروں سیٹ اور کیمیکل کی ایک بوتل لے کر ساتھیوں کی طرف چل پڑا۔

میرے ساتھی میرے منتظر تھے۔ انہوں نے پیکٹ کھولا نہیں تھا۔ میں نے پیکٹ کھولا، اس میں ایک بڑی فائل میں آنے والی ڈاک اور دوسری فائل میں جانے والی ڈاک کے کل ملا کے دو سے اوپر خطوط تھے۔ میں نے خطوط پڑھنے سے پہلے اچھی طرح سے جانچ کی کہ آنے والی ڈاک کے خطوط پر دفتر کی طرف سے ڈبل فولڈنگ کے نشان ہیں یا نہیں۔ سب پر یہ نشان موجود تھے جس سے انکے صحیح ہونے کا پتہ چلتا تھا جبکہ جانے والے ڈاک فولڈنگ نہیں تھی ہر خط پر TOP PRIORITY اور CONFIDENTIAL کی مہر لگی ہوئی تھی۔ جانے والی ڈاک کاربن کی کاپیاں تھیں۔ جبکہ آنے والی ڈاک اصلی خطوط پر مشتمل تھی اور ان کے لیٹر ہیڈز پر مختلف CORPS اور ڈویژنل نشان اور نمبر چھپے ہوئے تھے۔ جبکہ جانے والی ڈاک پر خط بھیجے والے افسر کا نام اور رینک دستخطوں والی جگہ کے نیچے درج تھا اور اس کے نیچے ٹائپسٹ اور آفس پرنٹنگ کے نام کے پہلے حروف درج تھے۔ جب میں ہر طرح سے ڈاک کے صحیح ہونے پر مطمئن ہو گیا تو میں نے ساتھیوں کو بتایا۔ انہوں نے خوشی کا نفرہ لگایا اور بڑھ بڑھ کر مجھے اس کامیابی پر مبارکباد دینے لگے۔ میں نے انہیں اسی گرم جوش سے مبارک دی اور کہا کہ اتنی بڑی کامیابی ٹیم ورک کے بغیر ممکن نہ تھی اور مبارکباد کے ہم سب برابر کے مستحق ہیں۔

حقیقتاً یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔ ہم آرمی ہیڈ کوارٹرز میں دراز ڈالنے اور رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور اب ہمیں مسلسل اہم نوعیت کی معلومات وصول کرنے کا راستہ تلاش کرنا تھا۔

میں نے چاروں ساتھیوں کو سلیٹوں سے کاپی بنانے کی ترکیب سمجھائی اور دونوں فائلوں کے کاغذات ان میں بانٹ دیئے اور وہ پوری مستعدی سے کاپیاں بنانے میں لگ گئے۔ چار گھنٹے سے زیادہ کی مسلسل عرق ریزی سے تمام کاپیاں تیار ہو گئیں۔ میں نے لیٹونٹ کی دی ہوئی فائلوں میں خطوط اسی ترتیب سے لگا دیئے۔ جو کاپیاں ہم نے بنائی تھیں، وہ الگ محفوظ کر دی گئیں۔ کامیابی کی خوشی میں ہم رات کا کھانا بھی بھول چکے تھے۔ جب سب کام ختم ہو گیا تو ایک ساتھی نے جانے بانی۔ چائے پیتے ہوئے مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے کیرے والے اور ایک دوسرے ساتھی کو تیار ہونے کے لئے کہا۔ تیار تو وہ پہلے ہی تھے اور مسخ بھی۔ کیرے اور فلیش گن بیگ میں ڈال کر وہ میرے ساتھ ہوئے۔

رات کے قریب ساڑھے 11 بجے ہوں گے جب ہم لیٹونٹ کی گلی میں پہنچے۔ ٹھنڈا تھے ہوئے ایک دوسرے کی بلب اس تنگ گلی کا اندھیرا دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ میں نے کیرے والے ساتھی سے کہا کہ لیٹونٹ کے گھر کے دروازے کے باہر وہ میری اور لیٹونٹ کی ایسے پوز میں تصویر اتارے کہ میری پشت ہو اور لیٹونٹ کا چہرہ اور میں فائلوں سے دیتے ہوئے اس طرح پکڑوں گا کہ فائل کو اور اس پر لکھا ہوا صاف پڑھا جائے۔ دراصل ساتھیوں کے گھر چائے پیتے ہوئے میرا خیال اچانک ایک فائل کو پر گیا۔ لیٹونٹ نے اپنے دفتر میں جلدی یا گھبراہٹ میں بھیجے جانے والے خطوط کی کاربن کاپیز ایسے فائل کوڑ میں لگا دی تھیں جس پر اوپر کی کونے سے نیچے دوسرے کونے تک ایک موٹی سرخ پٹی بنی ہوئی تھی اور اس پٹی پر بڑے حروف میں CONFIDENTIAL اور فائل کوڑ کے اوپر کی حصے پر بھی بڑے حروف میں ARMY HEAD QUARTERS لکھا ہوا تھا۔ اسی فائل کوڑ نے مجھے یہ کام کرنے پر اکسایا تھا۔ میرے ساتھی نے لیٹونٹ کے گھر کے سامنے پہنچ کر کیرے کو فوکس کر کے اپنی جگہ سنبھال لی۔

دوسرے ساتھی نے پہلے نکال کر ہمیں کوڑ اور میں نے لیٹونٹ کے گھر کے دروازے پر لگی گھنٹی بجاتی۔ تھوڑی دیر بعد لیٹونٹ کی بڑی ٹیچر لڑکی نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ میں نے کہا ”ایک ضروری کام سے لیٹونٹ صاحب سے ملنا ہے“۔ وہ لڑکی غالباً سوئی ہوئی تھی اس لئے بڑ بڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی لیٹونٹ دھوتی سنبھالتا ہوا باہر آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ گم سم و سالیڈیشنان بنا کھڑا تھا۔ میں نے اسے کہا ”دیر سے آنے کی معافی چاہتا ہوں۔ علی الصباح مجھے ایک ضروری کام سے آکر جانا ہے اس لئے فائل لوٹانے آیا ہوں“۔ یہ کہتے کہتے میں نے سرخ پٹی والی فائل پیکٹ سے نکالی اور لیٹونٹ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ”آپ کا تعاون ہمیں بروقت ملتا رہے تو آپ کو ہماری وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ ٹھیک اسی وقت فلیش لائٹ چمکی۔ لیٹونٹ کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلی اور وہ اچھل پڑا۔ میں نے لیٹونٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیا۔ وہ بار بار میرے کیرے والے ساتھی کی جانب اشارہ کر رہا تھا جو تصویر اتارنے ہی تیز قدموں سے سڑک کی طرف چل دیا تھا اور صرف اس کا سایہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے دوسری فائل اور پیکٹ کو لیٹونٹ کے ہاتھ میں دے دیئے ہوئے کہا۔ کوئی بات نہیں، اپنا ہی آدی تھا۔ لیٹونٹ نے گھبراہٹ میں اٹھتے اٹھتے کہا۔ اس نے تصویر اتاری ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں اس نے تصویر اتاری ہے۔ صرف ہمارے تعاون کو مضبوط بنانے کے لئے۔“

لیٹونٹ کے ساتھ گزشتہ 30 گھنٹوں میں جو کچھ ہوا تھا اس سے اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ وہ سر جھکائے، نگاہیں اپنے پاؤں پر جمائے خاموش کھڑا تھا۔ میں نے اسے کہا ”نہیں شام سات بجے میں سرائے بیرم خان کے اسی ہٹوں میں آپ کا منتظر ہوں گے۔ آپ اپنے ہمراہ TOP PRIORITY اور انہوائی CLASSIFIED ہم معلومات کے کاغذ لائیں۔ آپ نے اب جب ہم سے تعاون کرنا شروع کر دیا ہے تو پھر جھجک کہیں۔ پر سوں ملاقات کے بعد آپ کے شی کے بالا خانے پر جانے کا مالی بندوبست کر دیا جائے گا“۔ لیٹونٹ کے چہرے پر مایوسی مسکراہٹ آئی۔ میں نے فوراً ہی کہا ”مسٹر لیٹونٹ مجھے انتظار کرنا بالکل پسند نہیں لہذا ٹھیک وقت پہنچ جائیں اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم دوست ہیں لیکن میری ہدایات پر عمل کرتے وقت مجھے باس سمجھنا اسی میں ہماری بھلائی ہے“۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ جوں جوں کے چہرے پر چند لمحوں پہلے نمودار ہوئی تھی۔ وہ ختم ہو گئی اور میں اسے مزید کچھ کہنے بغیر واپس چل دیا۔ ہمیں کوڑ دینے والا ساتھی بھی اوٹ سے نکل کر تیز تیز چلتا ہوا مجھ سے پہلے سڑک پر پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ ساتھیوں کو ان کے گھر قریب اتار کر میں نے لوہی ہٹوں کے قریب ٹیکسی کو فارغ کر دیا اور ٹھیلے ہونے ہٹوں جا پہنچا۔ اپنے مشن میں کامیابی کے بعد میری ساری بے چینی اور ٹھنڈن دور ہو چکی تھی۔ ہٹوں لائنوں میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور مشن میں کامیابی کے بعد اس کے تسلسل اور رابطے کے مختلف ذرائع کے متعلق سوچتا ہوا سو گیا۔

اگلے روز صبح ہی میں اپنے ساتھیوں کے گھر گیا اور اوٹ لیس پر کوڑ ڈی پیغام لاہور بھیجا کہ اس بار دو کیریئرز کو بھجوا جائے۔ آرمی ہیڈ کوارٹرز میں رابطہ پیدا کر لیا گیا ہے۔ اہم کاغذات کی کاپیاں بھیجی ہیں، اگر ممکن ہو تو ایسا کیرا بھیجا جائے جس سے کاغذات کی تصویر اتاری جا سکیں۔ کیرے کے لئے فائو فائیس بھی خاصی تعداد میں بھیجی جائیں۔ یہ پیغام بھیجنے کے بعد میں نے خاکروہوں کے پیچھے لگائے ہوئے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ اب جب کہ لیٹونٹ ہمیں صرف Copying Office میں موجود کاغذات مہیا کر سکتا ہے جبکہ ہیڈ کوارٹرز میں جنرل اور دوسرے سینئر افسران کے کمروں تک اس کی رسائی نہیں۔ وہاں صرف خاکروہ ہی دفتری اوقات کے بعد صفائی کیلئے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے ہی ان کے لکھے ہوئے نوٹ جنہیں وہ دو تین کلڑے کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں، ہمیں لا کر دے سکتے ہیں۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ ہیڈ کوارٹرز میں بیسیوں صفائی کرنے والے ہوتے ہیں۔ جنرل اور دوسرے سینئر افسران کے کمرے کون صاف کرتا ہے ان کے متعلق معلومات لیٹونٹ ہی ہمیں دے سکتا ہے۔ لہذا پہلے لیٹونٹ سے ان خاکروہوں کے نام معلوم کئے جائیں اور پھر ان پر کام کیا جائے۔ دراصل حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے آئندہ کے منصوبوں میں بھی تبدیلی کرنی پڑتی تھی۔

لیٹونٹ کا تعاون حاصل ہونے سے پہلے ہم ہیڈ کوارٹرز تک رسائی کے لئے چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے لیکن اب صورتحال حال بدل چکی تھی۔ اب ہمیں صبح افزا تک لیٹونٹ پہنچا سکتا تھا یا کم از کم ان کی نشاندہی کر سکتا تھا۔ میرے ساتھی جان دینے کو تو بروقت تیار تھے۔ لیکن نتوان کی سوچ میں گہرائی تھی اور نہ ہی وہ اپنے گروپ لیڈر سے اختلاف کرتے اور شور مچاتے دیتے تھے۔ شاید یہ ان کی ٹریٹنگ اور سخت ڈسپلن کی وجہ سے ہو۔ میں نے کئی بار ان سے مشورہ کرنا چاہا لیکن وہ صرف میری ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ فی الحال سو ہیئرز پر کام کرنے والے ساتھیوں کو روک دوں۔ میں نے کچھ دیر پہلے ہی ساتھیوں کو سو ہیئرز پر کام کو تیز کرنے کا کہا تھا اور اب جب انہیں روک دیا اور اس کی وجہ بتائی تو انہوں نے میرے فیصلے سے اتفاق کیا اور ہمیں پر میں نے ایک اور فیصلہ کر لیا کہ آئندہ انہیں مشورے میں ضرور شامل کیا کروں گا لیکن حتیٰ فیصلہ خود کروں گا۔ اپنی ہدایات کے تحت ہمیں بارڈر پار بھیجا گیا تھا۔ فوجی جوانوں کی ٹریٹنگ میں اپنے افسر کے حکم ماننے کی نہایت سختی سے ہدایات کی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ دوران جنگ اپنے افسر کا حکم مانتے ہوئے جوان ہزاروں لاکھوں گولیوں اور گولوں کے درمیان کود جاتے ہیں۔ ٹریٹنگ اور بعد میں ساری سروس کے دوران اس مقولے پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے کہ Think Later Obey First اور میرے ساتھی اسی ٹریٹنگ کے باعث بے چوں چوں عمل کر رہے تھے۔

لیٹونٹ سے رابطہ قائم ہوجانے کے بارے میں سوچنا تھا تو میرے خدشات بڑھتے جاتے تھے۔ جب تک ہم ”جی داس“ تھے۔ ہمیں کوئی فکر نہ تھی لیکن لیٹونٹ سے کامیاب رابطہ ہمارے لئے بہت قیمتی تھا اور اسے برقرار رکھنے کے لئے پھونک پھونک قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ میرے خدشات اس نوعیت کے تھے۔ (1) لیٹونٹ سے ہر بار کاغذات لینے اور پھر لوٹانے کے دوران پکڑے جانے کا خطرہ جس کی وجوہات میں (الف) لیٹونٹ کی پہلے سے ہی بھارتی جاسوسوں کی نگرانی، جس کی وجہ ایک حساس محلے کے محدود آمدنی والے شخص Out of Bound علاقے میں بالا خانوں پر اکٹرا جانا۔ (ب) شراب کے نشے میں اپنا راز اگل دینا۔ (ج) لیٹونٹ کی جوان اولاد کو باپ کی اس ”ذیل“ کا پتہ چل جانا اور وطن پرستی کے جذبے کے تحت ان کا اس ڈیل کو شط از باہم کرنا۔ (د) لیٹونٹ کو مجھ سے جو رقم ملتی تھی اسے بے احتیاطی سے خرچ کرنا اور پکڑے جانا۔ غرضیکہ کئی خدشات تھے جن سے نپٹنے کے لئے مجھے فیصلہ کرنا تھا۔ میرا پہلا فیصلہ تو یہ تھا کہ ذاتی طور پر لیٹونٹ سے کاغذات لینے اور دینے کے بجائے DROP کا طریقہ اختیار کر لیا جائے۔ یعنی کسی پبلک پلینس پر کسی ایسی محفوظ جگہ کو تلاش کرنا جہاں لیٹونٹ مقررہ وقت پر کاغذات کا پیکٹ رکھ دیا کرے اور میں اور میرے ساتھی بار بار باری وہاں سے وہ پیکٹ لیٹونٹ کی واپسی کے فوری بعد اٹھالیا کریں اور اس طرح مقررہ وقت پر ہم پیکٹ رکھ دیا کریں اور لیٹونٹ اٹھالیا کرے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو یہ تجویز بتائی تو حسب معمول انہوں نے بالکل صحیح اور بہت اچھا کہا۔

غازی

اگلے روز شام کو یثوث نے مجھے سرائے بہر خان کے ریستورنٹ میں ملنا تھا۔ اس دوران مجھے DROP کے لئے محفوظ جگہوں کا انتخاب کرنا تھا اور دوسرے مجھے اب خاصی رقم کی ضرورت تھی تاکہ یثوث کو روپوں کی تکمیل ڈالے رکھوں۔ ایسی اشد ضرورت کے وقت مجھے اپنے ”ہمدردوں“ سے رابطہ کرنے کی اجازت تھی۔ میں ساتھیوں سے رخصت ہو کر کپڑے کی مارکیٹ (مصطفیانہ نہیں لکھ رہا) پہنچا۔ دہلی پہنچنے ہی شروع کے دنوں میں، میں اپنے ”ہمدردوں“ کے ٹھکانے دیکھ چکا تھا۔ تاکہ بوقت ضرورت تلاش کرنے میں دقت نہ ہو۔ مارکیٹ میں، میں اپنے ہمدرد کی دکان پر گیا۔ میں نے چٹ پر رقم اور پانچ نوڈ نمبر لکھ رکھا تھا۔ یہ ٹھوک کپڑے کی مارکیٹ تھی۔ دکان کے مالک کا حلیہ مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا اور ”شناختی نام“ بھی، پھر بھی تسلی کیلئے میں نے دکان کے مالک کا پوچھا۔ دکان کے اندر ایک کیمین میں وہ بیٹھا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور میری سی گفٹنگو کے بعد میں نے ”شناختی“ نام لیا۔ وہ ایک دم چونک اٹھا اور کہا فرمائیے کیا حکم ہے؟ میں نے چٹ اس کے ہاتھ میں تھادی۔ چٹ پڑھتے ہی اس نے ایک ڈائری نکالی۔ شاید اس میں میرا کوڈ اور حلیہ درج تھا۔ اس نے چٹ ڈائری میں رکھی اور درزا کھول کر میں ہزار روپے مجھے دے دیا اور میں فوراً ہی شکر یہ ادا کر کے دکان سے باہر آ گیا۔ شاید پہلے بھی کہیں عرض کر چکا ہوں کہ ان ہمدردوں کو ہمارا ٹھکانہ غیر ملکی کرنسی میں ہمارا لیا ہوا پیسہ ادا کرتا تھا اور ہر ہمدرد کے پاس ہمارے مجھے کی خاصی رقم محفوظ ہوتی تھی۔

مارکیٹ سے باہر آ کر میں نے ٹیکسی لی اور مکمل محفوظ جگہوں کے انتخاب کے لئے یثوث کے دفتر اور گھر والی سڑک کے کئی چکر لگائے لیکن کوئی محفوظ جگہ نظر نہ آئی۔ ادھر یثوث کا دفتر سے گھر واپسی کے دوران بس سے اکثر اترا بھی اس کے مسافر دفتر کے ساتھیوں کو شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ لہذا میں نے DROP کی جگہ کا تعین یثوث سے آئندہ شام ملاقات پر باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا۔

میں اپنے ہوٹل واپس آ گیا اور شام کو سرور کلب میں کرنل شکر سے ملنے چلا گیا۔ کرنل شکر لان کے اسی مخصوص گوشے میں سے نوشی میں مشغول تھا۔ اس نے خاصی بے تکلفی سے مجھے خوش آمدید کہا اور کئی روز کی غیر حاضری کی شکایت کی۔ میں نے ضروری کام سے بہتی جانے کا عند پیش کیا۔ کرنل شکر نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ عبدالکریم اپنی مخصوص جگہ پر باادب کھڑا تھا۔ اس نے کئی بار آنکھوں اور چہرے کی حرکت سے مجھے اشارے کئے جنہیں شام کے دھندلکے میں میں سمجھ نہ سکا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کرنل شکر کو کہا کہ مجھے ٹوائلٹ جانا ہے۔ اس نے عبدالکریم کو بلا کر کہا اور یوں میں عبدالکریم کے ہمراہ کرنل کے بندروم کے ٹوائلٹ میں چلا گیا۔ عبدالکریم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا کہ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو مجھے علیحدگی میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں نے کہا عبدالکریم جو باتیں بھی کرنی ہیں کل 11 بجے لوڈھی ہوٹل میں میرے کمرے میں آ کر کرنا۔ عبدالکریم نے اثبات میں سر ہلایا اور میں پھر کرنل کی محفل میں شامل ہو گیا۔ کرنل شکر آج میری گزشتہ زندگی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ کرنل صاحب صرف ناموں اور جگہوں کا فرق ہے ورنہ میری اور آپ کی داستان ایک ہی ہے۔ آپ نے بھی محبت میں شکست کھائی اور میں نے بھی۔ آپ نے اپنے عم شراب میں سموئے اور میں نے بہتی کی رنگینوں میں۔ لیکن یہ دل ہے کہ نہ کھلتا ہی نہیں۔ تنہائی میں دل کے زخم پھر رستے لگتے ہیں۔ کرنل مجھ سے تھوڑا پوچھنا چاہتا تھا۔ مجھے کہانی کا کوئی سرالمتا ہی نہ تھا۔ میں نے جھوٹ موٹ آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور زندگی ہوئی آواز میں کہا۔ کرنل صاحب آپ نے دبی ہوئی راہ کھنڈ کر مجھے بڑا غم کیا ہے۔ اب کتنا وقت اس چنگاری کو دوبارہ راہ بننے میں لگے گا۔ آپ تو فوجی ہیں جذبات پر قابو پا سکتے ہیں لیکن میرے لئے یہ بڑا مشکل ہے۔ میں اب اجازت چاہوں گا۔ یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کرنل نے مجھے کئی بار پیچھے کیلئے کہا اور آخر میں خود اٹھ کھڑا ہوا لیکن میں نے ایسی ایک ٹنگ کی کہ کرنل بھی چکرا گیا اور میری تریا روتے ہوئے اس سے رخصت ہوا۔

میرا آج کا دن خاصا مصروف گزارا تھا۔ میں ہوٹل واپس آ گیا ریسیپشن پر میرے لئے آشا کا پیغام موجود تھا۔ اس نے مجھے گھر پر فون کرنے کا کہا تھا۔ میں نے ہوٹل میں لابی سے ہی آشا کو فون کیا وہ گھر پر ہی تھی۔ اس کی طبیعت ناساز تھی اور بے چند اپنے کاروباری سلسلے میں چند ہی گڑھ گیا ہوا تھا ڈھیر سارے شکایتوں کے بعد آشا نے مجھے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں نے فوراً اپنی طبیعت کے ناساز ہونے کا بہانہ کر کے معذرت کر لی۔ آشا نے بالآخر جب کوئی چارہ نہ دیکھا تو بولی ”میں آپ سے آپ کی بہتری کے لئے ہی ملنا چاہتی تھی“ اس کی یہ بات سن کر میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ جھلا آشا میری بہتری کے لئے کیا کر سکتی تھی۔ میں نے اس سے بہتر پوچھا لیکن اس نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ ملنے پر ہی بتائے گی۔ اگلا دن میری مصروفیت کا تھا گیا وہ جے عبدالکریم آ رہا تھا، شام کو یثوث سے ملنا تھا اور اس دوران اپنے ساتھیوں سے بھی ملنا اور سرائے بہر خان کا پروگرام سیٹ کرنا تھا۔ عام حالات میں آشا کی بات کو میں اہمیت نہ دیتا۔ لیکن دشمن ملک میں ہندو کر رہنے اور جاسوسی کرنے والے کو چھوٹی سے چھوٹی بات کو اہمیت دینی پڑتی ہے اور پھر آشا کے تعلقات تو فوجی اور سول افسران سے تھے لہذا میں نے آشا سے اشوکا ہوٹل میں ایک بجے اکٹھے لہجے کرنے کا کہا۔ لیکن آشا نے کہا کہ اشوکا میں اسٹاف کے اکثر لوگ اسے مزے بے چند کی حیثیت سے جانتے ہیں اس لئے کنٹاکٹ میں چائیز ریستورنٹ میں وہ دوپہر ایک بجے مجھے ملے گی۔ میں آشا کی اس ”بہتری“ والی بات سے اپ سیٹ ہو چکا تھا، بہر حال موقع محل کی مناسبت سے آئندہ قدم اٹھانے کا سوچ کر میں کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن ٹھیک 11 بجے ریسیپشنٹ نے مجھے عبدالکریم کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے اسے کمرے میں بلایا۔ عبدالکریم نے سول لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے نہایت مودبانہ انداز میں مجھے سلام کیا۔ میں نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا کہا تو وہ جھجکا اور کہنے لگا نہیں صاحب میں قائلین پر بیٹھوں گا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر مجھ سے بات کرنی ہے تو جیسا میں کہوں ویسا کرو اور عبدالکریم صوفے پر جھکتے ہوئے سمٹ کر بیٹھ گیا۔

عبدالکریم کا رویہ کوئی غیر معمولی نہ تھا سارے بھارت میں مسلمانوں کی یہی حالت ہے۔ انہیں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت دی جاتی ہے۔ بھارت میں مسلمان ہونا ہی بہت بڑا جرم ہے۔ میں نے بھارت میں اپنے قیام کے دوران محسوس کیا کہ کتنی کے چند مسلمان خاندانوں کے سوا جنہیں بھارتی حکومت، مراعات دے کر DECORATION PIECE کے طور پر عالمی رائے کو اپنے سیکولر نظام کا جھوٹا پروپیگنڈا کرنے کے لئے استعمال کرتی ہے، عام مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ مسلمانوں کو بھارت میں ملازمتیں نہیں ملتیں۔ اگر کوئی مسلمان معمولی دکان سے بھی کاروبار شروع کرے تو ارد گرد کے ہندو دکاندار اپنی اشیائے فروخت کی قیمتوں میں کمی کر کے اس مسلمان کی دکان بند کر دیتے ہیں۔ یہاں میں ایک واقعہ مختصر بیان کرنا چاہتا ہوں جس کا میرے مشن سے کوئی تعلق نہیں لیکن یہ بھارتی مسلمانوں کی حالت زار کا عکاس ہے۔ الہ آباد کے جنگلی قیدیوں کے کیمپ نمبر 2 میں بھارت کے ایک کاروباری اور سیاسی مراعات یافتہ سربراہ کو تقریر کرنے کا برہنہ واٹ کرنے کیلئے لایا گیا۔ اس نے پاکستانی فوجیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ خود بخود بھارت سے جنگ کر کے اپنی جانیں ضائع کرتے ہیں۔ بھارت ہو یا کشمیر بھارتی مسلمان اور ہندوؤں سے یکساں سلوک کیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بھارتی لوگ سبھا (نیشنل اسمبلی) میں بھارتی مسلمان جو اقلیت میں ہیں ان کے لئے کوئی علیحدہ کوہ قعر نہیں جبکہ پاکستان میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں۔ سب سے برابر کا سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت میں خود ہوں۔ میں مسلمان ہوں، میں صنعت کار بھی ہوں اور سیاست میں بھی ہوں۔ اگر بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ یکساں سلوک نہ کیا جاتا تو آج میں اس مرتبے پر نہ ہوتا۔ غرضیکہ اس نے خاصی تقریر چھڑائی۔ باقی تو سب خاموشی سے اس کی کواں سننے رہے لیکن ایک پاکستانی صوبیدار P.O.W سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور سوال کرنے کی اجازت چاہی۔ اس صوبیدار سے بعد میں، میں پاکستان میں مل چکا ہوں اور خود اس کی زبانی مکالمہ کچھ یوں ہوا۔

صوبیدار: جناب بھارت میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب کیا ہے؟

صنعت کار: مسلمان بھارت کی کل آبادی کا آٹھواں حصہ ہیں۔

صوبیدار: کیا آپ مسلمانوں کو MARTIAL RACE (جنگجو قوم) تسلیم کرتے ہیں؟

صنعت کار: یقیناً مسلمان MARTIAL RACE ہیں۔

صوبیدار: اور آپ کے کہنے کے مطابق بھارت میں مسلمانوں سے یکساں سلوک کیا جاتا ہے؟

صنعت کار: یہ بات بالکل صحیح ہے۔

صوبیدار: تو جناب یہ بتائیے کہ آپ کے ملک کی آبادی کا آٹھواں حصہ جنگجو قوم مسلمانوں پر مشتمل ہے تو پھر 47 سے آج 25 برس میں آپ کی فوج میں کتنے مسلمان جنرل بنے ہیں؟ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کوئی نہیں۔

صنعت کار: شرم سے سینے میں شربور ہو گیا اور تقریر ادھوری چھوڑ کر واپس چلا گیا اور پاکستانی صوبیدار کو بولنے کی پاداش میں 21 روز کی قید تنہائی ملی اور اس کا راشن اڈھا کر دیا گیا۔

میں نے بھارت میں قیام کے دوران اچھی طرح سے محسوس کیا کہ بھارتی ہندو مسلمانوں سے خدا واسطے کا بہر رکھتے ہیں اور انہیں بلاوجہ ذلیل و خوار کرنے اور بلا سبب قتل کرنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ جانے نہیں دیتے۔ ہندو خود ہی بات کریں تو ہرج نہیں لیکن اگر وہی بات بھارتی مسلمان کرے تو ہندو ہرم پر ”حملہ“ کرنے کا بے بنیاد الزام لگا کر ہندو مسلم فسادات شروع کر دیئے جاتے ہیں۔ جن میں مرنے والے مسلمان جو کل آبادی کا آٹھواں حصہ ہیں، کی تعداد ہندوؤں سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔

دہلی میں اشوکا اور اکبر ہوٹل بھارت سرکار کی ملکیت ہیں۔ ان ہوٹلوں میں یورپین اور امریکی گاؤں کو ”گاڈا ماتا“ کا گوشت کھلے بندوں پیش کیا جاتا ہے لیکن اسی گاڈا ماتا کو کوئی مسلمان سبزی فروش اپنی سبزی پچانے کے لئے ہلکا سا ڈنڈا بھی مار دے تو ہندو ہرم کی پوتر گاڈا ماتا کی بے عزتی کو جواز بنا کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ نومان کی نسبت سے ہندو ہندو دھرم کا ایک اہم دیوتا ہے۔ بھارت سرکار کی اپنے اسی دیوتا کو ہر سال چالیس ہزار سے زیادہ تعداد میں ڈاکٹری تجربات کے لئے غیر ممالک کو فروخت کرتی ہے جو اس دیوتا کی چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ میں نے بہتی سے بارہ چودہ میل سمندر کے اندر پلیٹیفنٹا (ELEPHANTA) جزیرے پر چٹانوں میں جہاں کورؤں کی بنائی ہوئی رہائش گاہیں اور سنگلیں ہیں اور لاتعداد ہندو موجود ہیں جو ٹینک منانے والوں کا کھانا چھپتے لیتے ہیں، ایک مسلمان کو بندر کو ٹنکر مارنے کی پاداش میں بے تحاشہ پیٹنے دیکھا ہے اسی سے آپ بھارت میں مسلمانوں کی حالت زار کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

عبدالکریم کا میرے کمرے میں صوفے پر بیٹھنے سے جھجکانا اس کی ذہنی حالت کی عکاسی کرتا تھا، ایک ”ہندو چانے کے بیوپاری“ کے ساتھ جبکہ وہ بیوپاری اس کے کرنل کا دوست بھی ہوا ایک معمولی مسلمان سپاہی صوفے پر ایک ساتھ بیٹھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں نے عبدالکریم کی جھجک دور کرنے کیلئے اس سے بے تکلفی کی باتیں شروع کیں۔ اس کیلئے ٹھنڈے مشروب منگوائے اور جب کچھ دیر میں عبدالکریم نے نارل رو یہ اختیار کیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ضروری بات کرنی ہے۔ عبدالکریم نے اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس کا سبب اب یہ تھا کہ ذلت سہتے سہتے بے حال ہو چکا ہے اور اب اس میں اس صورتحال کو مزید برداشت کرنے کی سکت نہیں۔ وہ روتے روتے میرے پاؤں میں گر گیا۔ میں نے اسے فوری اٹھایا اور صوفے پر بٹھادیا۔ ہندو افسر کی کالیوں اور رویے سے یہ مسلمان سپاہی اتنا ایوس ہو چکا تھا کہ مجھے موم کرنے کیلئے ہندو رسم و رواج کے مطابق اس نے میرے پاؤں چھونے چاہے۔ ”میں تو گھٹ گھٹ کر مرنے لگا تھا۔ آپ کے رویے نے ڈھارس بندھائی تو آپ سے بات کرنے کا حوصلہ ہوا۔ آپ کی کرنل صاحب سے گفٹنگو سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ کا بہتی میں چانے کا کاروبار ہے۔ خدا را مجھے یہاں سے بہتی لے چلے۔ میں زندگی بھر آپ کی خدمت کرتا رہوں گا اور آپ کو مجھ سے کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“ عبدالکریم کو میں نے پھر دلاسا دیا اور کہا کہ میں تمہاری ہمدرد کرنے کو تیار ہوں اور میں متعصب بھی نہیں ہوں۔ لیکن فوج سے بھاگ کر جانے کی وجہ سے تم DESERTER مفرو و فروری بن جاؤ گے۔ پولیس تمہیں تلاش کرے گی اور یا تو تم پکڑے جانے پر لمبے عرصے کے لئے جیل چلے جاؤ گے۔ ورنہ ساری زندگی مفرو و فروری کی حیثیت میں گزارو گے اور پولیس تمہارے رشتے داروں کو وقت بے وقت تنگ کرتی رہے گی۔ یہ کہہ کر میں خاموش ہوا اور ذرا توقف کے بعد اسے کریدنے اور ٹٹولنے کیلئے کہا۔ ”تم نے تو اچھی طرح سے دیکھا یا، ہوگا کہ ہمارے ملک میں مسلمانوں کے ساتھ کیسا ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ میں بہت کھلے دل کا آدمی ہوں اور اپنے دھرم کی تنگ نظری سے تالاں ہوں۔ بہتی میں میرے اکثر دوست مسلمان ہیں اور ان سے مذہبی گفٹنگو کے دوران اسلام کی وسعت نظری اور فراست کا قائل ہو چکا ہوں۔ ایک دو سماجی جموریات ہیں۔ جن کی وجہ سے ابھی تک خاموش ہوں ورنہ میں کب کا اسلام قبول کر چکا ہوتا۔“ میری بات سن کر عبدالکریم کی باجھیں کل گئیں اور وہ مجھے اسلام کی خوبیاں بتانے لگا۔ میں نے اسے نوک دیا اور کہا کہ میں نے اسلام کا بہت گہرائی تک مطالعہ کیا ہے لہذا تم اس موضوع کو چھوڑو اور اپنی بات کرو۔ تم ایک اچھے اور شریف خاندان کے فرد ہو اور حالات کا شکار ہو۔ میں تمہاری بھرپور ہمدرد کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن اس کے لئے تمہیں مجھ سے اپنی وفاداری کا ثبوت دینا ہوگا۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ انگریز کی تو نہیں لیکن ہندی اور اردو لکھ سکتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو وہ سب کچھ لکھ سکے جو اس کے ذہن میں ہو۔ تم یوں کرو کہ اپنے خیالات، جذبات اور کام کے متعلق جو کچھ بھی تمہارے علم میں ہے وہ لکھ دو۔ میں تین چار روز بعد تمہارے کرنل کے پاس جاؤں گا اور وہیں پر موقع دیکھ کر اپنی تحریر مجھے دے دینا اور خیال رکھنا کہ تمہارے کرنل یا کسی کو بھی اس کا علم نہ ہونے پائے۔ تمہاری تحریر سے میں اندازہ لگا لوں گا کہ تم میرے کتنے کام کے آدمی ہو۔ اس کے بعد ہی میں تمہارے متعلق فیصلہ کروں گا۔ اگر تم میرے امتحان میں پورے اترے تو تمہاری سوچ سے بھی بڑھ کر میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ غرضیکہ اسی طرح کی امید و بیم کی باتوں کے بعد میں نے عبدالکریم کو پانچ سو روپے دے کر رخصت کیا۔ ایک بجنے کے قریب تھا اور مجھے چائیز ریستورنٹ میں آشا سے ملنا تھا۔

جب میں ریستورنٹ میں پہنچا تو آشا میری منتظر تھی۔ کئی کلمات کے بعد آشا نے میری بے اعتنائی کے شکوے شروع کر دیئے۔ کہنے لگی۔ ”آپ ملے تو میں بھی کہ میری منزل مجھے مل گئی۔ شاید یہ میری بھول تھی۔ بھلا بہتی کی رنگین زندگی سے مانوس ہٹنے کی نظروں میں میری کیا وقعت۔ یونہی میں نے آپ سے اپنی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔“ آشا کافی دیر بولتی رہی اور میں سوچتا رہا کہ وہ ”میری بہتری“ والی بات کیوں نہیں کہتی جس کے متعلق اس نے گزشتہ شام مجھے ٹیلی فون پر بتایا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب تک آشا کو پر امید باتوں سے رام نہ کر لوں وہ مجھے کچھ نہ بتائے گی۔ میں نے آشا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور محبت بھر سے لہجے میں بولا۔ دیکھو آشا ہر انسان میں کچھ خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں اور میری خامیوں میں سے ایک بڑی خامی یہ ہے کہ میں اظہار محبت میں الفاظ کا سہارا لینے میں ہوشیار ہونا کام ہوتا ہوں۔ میں نے تمہیں شاید پہلے بھی بتایا تھا کہ میں جس لڑکی سے محبت کرتا تھا اس سے بھرپور اظہار محبت نہ کر سکا جس کے نتیجے میں وہ کسی اور کی بیوی بن گئی۔ اس لڑکی کے بعد جبوں میں ایک بہت بڑا غلغلہ رہا۔ جب تم ملیں تو میں سمجھا کہ میرے بیوی ہو تیں تو میں تمہارے بغیر کسی کلب یا پارٹی میں نہ جاتا اور تمہارے سوا کسی کے ساتھ نہ جاتا اور نہ ہی تمہیں مانپنے دیتا۔“ میں نے اسے کہا کہ بچپن میں، میں نے فارسی کے کچھ اشعار پڑھے تھے۔ میں تمہیں وہ شعر اور ان کا مطلب سناتا ہوں۔ ”تمن نوشدم، تو من شدی سن تن شدم تو من جاں شدی، ہتا سن نگوید بعد ازین، سن دیگرم تو دیگرمی“ (ترجمہ) میں تم بن جاؤں اور تم میں بن جاؤں۔ میں جم بن جاؤں اور تم جان بن جاؤں۔ تاکہ بعد میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں الگ ہوں اور تم الگ ہو۔

غازی

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس کا کسی مرد کی زبان سے اپنے لئے اظہار محبت اور اس کے حسن کی تعریف سننا ہے۔ میں شعروں کا مطلب سنانا گیا اور آشا کے ہاتھ کی میرے ہاتھ پر گرفت مضبوط ہونے لگی۔ میں نے کہا ”دیکھو آشا میرے جذبات اور خیالات کی راہ میں تمہاری زندگی کے لمحات کس بری طرح سے حائل ہیں۔ تم آج ایک مرد کی بغل میں ہوتی ہو تو کل دوسرے کی ہاتھوں میں۔ کبھی شوہر کے ساتھ اور کبھی دوستوں کے ہمراہ۔ ان حالات میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں تمہیں اپنی منزل سمجھوں اور تم مجھے“۔ آشا کی آنکھیں اپنی حقیقت کی تلخی برداشت نہ کر سکیں اور چپکے لگیں۔ میں نے اپنے رومال سے اس کے آنسو صاف کئے۔ وہ ذرا سنبھلی تو کہنے لگی ”دو دوئی، برسوں سے میرا ضمیر جس بات پر مجھے قائل نہ کر سکا۔ آپ نے چند منٹ میں وہ بات مجھے سمجھا دی۔ یقیناً جاننے میں دل سے آپ کی پوجا کرتی ہوں۔ پہلی ملاقات کے وقت سے ہی میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے جانتے لگی ہوں۔ آپ کو پانے کیلئے میں نے کتنے جتن کئے۔ ہوں میں آپ کے کمرے میں آئی۔ بریگیڈیئر کے بیٹے سے آپ کو محض اس لئے ملوایا کہ آپ میں جذبہ رقابت پیدا ہو۔ لیکن یہ میری بھول تھی اور آپ مجھ سے دور ہوتے چلے گئے۔ اب میں آپ کو اور ”سچائی“ کو سمجھ چکی ہوں۔ اگر آپ میرے ماضی کو فراموش کر دیں تو میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آج سے بلکہ ابھی سے ہی آپ ایک نئی اور بدلی ہوئی آشا کو دیکھیں گے“۔ میں نے کہا ”آشا یہ سب کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل اور پھر تم شادی شدہ ہو۔ کیا تمہیں بے چند اتنی آسانی سے چھوڑ دے گا؟“ آشا کہنے لگی ”یہی تو بتانے کے لئے میں نے آپ کو یہاں بلا یا تھا۔ بے چند نے Mess کے بریگیڈیئر سے جس کے لڑکے سے میں نے آپ کو ملوایا تھا۔ ایک بہت بڑا ٹھیکہ انتہائی کمی ریٹ پر حاصل کیا ہے اور بریگیڈیئر کو 25 لاکھ روپے رشوت دی ہے اور اس ٹھیکے کے حصول میں ایک منسٹر بھی شامل ہے جس کا ٹھیکے سے حاصل ہونے والے منافع میں آدھا حصہ ہے“۔ میرے پوچھنے پر آشا نے بتایا کہ ”اس کے پاس ایک چھوٹا ٹیپ ریکارڈر ہے۔ جس پر اس نے بے چند، بریگیڈیئر اور منسٹر کی ساری گفتگو ریکارڈ کر لی ہے کیونکہ کنٹریکٹ کے سلسلے میں بریگیڈیئر منسٹر اور بے چند کی ملاقاتیں بے چند کے عالی شان بنگلے میں ہوتی تھیں“۔ میں نے کہا ”آشا تم نے کل مجھے میری بہتری کا کہا تھا۔ بھلا اس ٹھیکے کے اندرونی حالات جاننے سے میری کیا بہتری ہوگی“۔ آشا نے بڑے مہوشانہ انداز میں کہا ”کیا میں آپ کی بہتری نہیں؟“ اور میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ آشا نے کہا کہ ”اس ریکارڈر گفتگو کی وجہ سے بے چند نہ صرف مجھے آزاد کر دے گا بلکہ میری زبان بند رکھے گا۔ عرض بھاری رقم بھی دے گا۔ اور پھر آپ کے ساتھ میں آپ کی مرضی کے مطابق زندگی گزاروں گی“۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آشا کو کیا جواب دوں۔ میں نے یوں ہی کہہ دیا ”آشا اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو وہ کیسٹ مجھے سنوا سکتی ہو۔ آشا نے فوراً ہی اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے ایک درمیانے سائز کا ٹیپ ریکارڈر نکال کر مجھے دیا اور کہا۔ یہ ٹیپ ریکارڈر بھی آپ کا اور کیسٹ بھی آپ کی۔ اب تو میں آپ کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی“۔ ادھر میری حیرانی اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ نامعلوم انداز میں آشا نے مجھ سے اپنی ساری امیدیں وابستہ کر لی تھیں اور اسے میری حقیقت کا ذرا بھرا علم نہ تھا۔ میں نے آشا کو کہا کہ وہ مجھ سے CONTACT کرنے میں احتیاط برتے۔ اور اگر کبھی اتفاقاً اس کا اپنے شوہر کے ہمراہ میرا آنا سامنا ہوا جائے تو مجھے نظر انداز کرے۔ جواباً آشا نے کہا کہ اب وہ اپنے شوہر یا کسی دوسرے کے ہمراہ کبھی باہر نہ جائے گی۔ لیکن مجھے ہر روز فون کرنے کی اور یہ کہ میں ہر دوسرے تیسرے دن اسے ضرور ملوں گا۔ کھانا تو ہم کبھی کا کھا چکے تھے۔ ریستورنٹ سے پہلے آشا باہر نکلی اور اپنی گاڑی میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد میں باہر نکلا اور ٹیکسی لے کر اپنے ساتھیوں کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں ہوٹل سے پوری تیاری سے نکلا تھا۔ بسٹل اور روپے میرے ساتھ تھے۔ ساتھی میرے انتظار میں تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم دو ٹیکسیوں میں سرائے بیرم خان کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم بیٹھتے سے مقررہ وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ بجائے چھپر ہوٹل میں انتظار کرنے کے میں نے سوچا کہ اس علاقے میں گھومنا جائے۔ ہم دو دو کی ٹولیسوں میں آگے پیچھے چل پڑے۔ یہ مسلمانوں کی آبادی کا علاقہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے ایک منزلہ گھر اور چھوٹی چھوٹی دکان تھیں۔ ایک دکان پر ہم نے ٹھنڈے دودھ کی بھری بوتلیں تیں اور پھر واپس لوٹ پڑے۔ پہلے کی طرح میں نے چھپر ہوٹل میں اپنا مورا چڑھنا اور میرے ساتھی بھی ادھر ادھر مختلف جگہوں پر ڈٹ گئے اور بیٹھتے کا انتظار ہونے لگا۔ اس انتظار کے دوران پولیس کی ایک گاڑی چھپر ہوٹل کے سامنے آ کر رکی اور پولیس اہلکاروں نے چائے پی۔ دہلی پولیس کے ماتحت عملے کے لوگ کمزور اور غربت کے مارے ہوئے نظر آتے تھے۔ جو اس معمولی ہوٹل میں چائے پینے چلے آئے تھے۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد بیٹھتے آنا دکھائی دیا۔ وہ آج نسبتاً بہتر حالت میں تھا۔ اس کے ریستورنٹ میں بیٹھنے کے تقریباً 10 منٹ بعد میں بھی ریستورنٹ میں داخل ہو گیا۔ بیٹھتے کو نے کی ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ اس نے چائے کا آرڈر دے رکھا تھا۔ چائے پیتے پیتے اس نے ایک پیکٹ مجھے تھما دیا۔ یہ پیکٹ اس نے کپڑوں سے نکالا تھا۔ میں نے بھی وہ پیکٹ اپنی قمیض کے اندر ڈال دیا اور پیٹ کی جیب سے روپوں کا لفافہ نکال کر اسے دیا۔ اس نے دھیرے سے پوچھا کتنے ہیں۔ میں نے کہا 5 ہزار۔ بیٹھتے کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ میں نے کہا آج تو شہی کے ہاں جاؤ گے۔ وہ جھینپ سا گیا اور دھیسے سے کہا۔ ہاں۔ میں نے کہا۔ پیکٹ کی واپسی پہلے کی طرح ہوگی۔ کہنے لگا۔ میں وہاں 12 بجے تک رہوں گا۔ واپسی پر گھر کے پاس آ کر واپس مل جائیں تو بہت بہتر ہوگا۔ کیونکہ میرے گھر والے پہلے ہی میرے دہرے گھر آنے سے نالاں ہیں۔ اور میرے آنے کے بعد اگر کوئی مجھے ملے آئے تو بہت برامانتے ہیں۔ رازداری کے لچھے میں کہنے لگا۔ اولاد جوان ہو جائے تو بوڑھے والدین کو نیکسر نظر انداز کر دیتی ہے اور ان کے اسی رویے نے مجھے شہی کے ہاں جانے پر مجبور کر دیا۔ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ سارا دن فخر میں کام کرتے کرتے تھک جاتا ہوں۔ گھر آتا ہوں تو بچے بات نہیں کرتے۔ فخر میں فخر کا کام اور گھر میں کوئی بات تک نہ کرے۔ ایسا آخر تک چل سکتا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے بیٹھتے کو تھپکی دی اور کہا کہ یہ بالا خانے آباد کرنے میں گھر کے افراد کا بڑا دخل ہے۔ ورنہ کوئی شخص اپنا روپیہ اور وقت ان گھنگھر وڈ کی آواز میں صرف نہ کرتا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان بالا خانے والیوں کی مسکراہٹ، ہنسی اور ادا نہیں سب معنوی ہوتی ہیں اور یہ صرف روپیہ بننے کے ڈھنگ ہیں۔ کوئی شخص بھی یوں ہی بوقوف نہ بنتا۔ بیٹھتے کے اٹھنے سے پہلے ہی میں باہر نکل آیا۔ میرے ساتھیوں کو علم تھا کہ یہ میٹنگ مختصر ہوگی۔ انہوں نے دو ٹیکسیاں پہلے ہی روک رکھی تھیں۔ ہم ان میں سوار ہو کر ساتھیوں کے گھر کے قریب اتر گئے۔

اس بار بیٹھتے کے پیکٹ میں پہلے کی طرح CONFIDENTIAL اور TOP PRIORITY کی مہروں والے خطوط تھے۔ ہم نے خطوط کی کاپیاں بنانی شروع کر دیں۔ یہ کل پچاس کے قریب خط تھے۔ میرے ساتھی کاپیاں بناتے رہے اور میں پلنگ پر دراز ہو گیا۔ آج میں کافی تھک چکا تھا اور رات کو پیکٹ واپس کرنے بھی مجھے ہی جانا تھا۔ یہ جمعہ کی رات تھی اور بیٹھتے سے میں نے ہفتے کے روز 3 بجے بعد دوپہر گولڈ سینما کے ریستورنٹ میں ملنے کو کہا تھا۔ جہاں اس سے نیا پیکٹ وصول کرنے کے علاوہ میں اس سے مفصل بات چیت کرنا چاہتا تھا اور آئندہ بیورو مجھے پاکستانی CONTACT سے ملنا تھا۔

رات کو ساڑھے گیارہ بجے میں کاغذات کا پیکٹ لیکر بیٹھتے کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ حسب معمول میرا ایک ساتھی میری حفاظت کیلئے میرے ہمراہ تھا۔ پرانی دہلی کا یہ علاقہ ہندوؤں کی آبادی کا تھا اور رات کو جلد ہی بے رونق ہو جاتا تھا۔ میں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کی تھی کہ بھارتی ہندوؤں کی اکثریت سقوط ڈھاکہ اور اپنی کامیابی پر بجائے خوش ہونے کے پشیمردہ تھی۔ شیر کو انہوں نے زخمی تو کر دیا تھا لیکن اب اس بات پر خوف زدہ تھے کہ نجانے زخمی شیر کب اپنا جک بدلہ لینے کیلئے حملہ کر دے۔ بھارتی فوج کے حکمہ جاسوسی کو بھی اس وقت تک یقیناً علم ہو چکا تھا کہ پاکستان نے اپنے جنگی قیدیوں کی کمی پوری کرنے کے لئے چار نئے ڈویژن بھی قائم کرائے تھے جو جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے۔ پھر پاکستان کی افواج کو سابقہ مشرقی پاکستان کا بھی اب دفاع نہیں کرنا تھا اور ان کی تمام تر طاقت مغربی پاکستان کے دفاع پر مرکوز تھی۔ دہلی میں اس طرح کی کئی افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ پاکستان پوری طاقت سے دہلی پر حملہ آور ہوگا۔ پاکستان کی چھاتہ بردار فوج دہلی میں اتاری جائے گی اور علیحدگی پسند سکھ پاکستان کیلئے فسطیح کا مسٹ کا کام کریں گے۔ دہلی میں ہر اتوار کو ہوائی حملے سے بچاؤ کے سائرن ٹیسٹ کئے جاتے تھے۔ بھارتی ہندوؤں کا یہی خوف دور کرنے کیلئے بھارتی حکومت نے غالباً 74 میں پاکستانی سرحد کے قریب ایٹمی دھماکہ کیا تھا۔ حالانکہ وہ کئی سال پہلے ایٹمی طاقت بن چکا تھا اور اپنی اس کامیابی کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا۔ بھارتی دھماکہ کے فوری بعد پاکستان نے بھی اپنی ایٹمی ریسرچ میں تیزی پیدا کر دی اور بھارتی ایٹمیوں کے عین مطابق تیل کی دولت سے مالا مال مسلم ملک نے پاکستان کی اس معاملے میں بھرپور مدد کی، جن میں نمایاں لیویا تھا۔ کرنل فذائی کے احکام پر یورینیم 238 کے خام مواد سے بھرے ہوئے 20 ٹرک جنوبی افریقہ میں سفر کے دوران غائب کر دیئے گئے۔ جن پر لداخام یورینیم پاکستان پہنچا دیا گیا۔ یہ خبر عالمی ذرائع ابلاغ نے بڑے زور شور سے جاری کی اور اسی کی بنیاد پر ”اسلامی بم“ کا شوشہ چھوڑا گیا۔ جس کی پاکستان نے کبھی قطعاً؟ تردید نہیں کی۔ یہی خوف تھا جو بھارتی ہندوؤں میں ساچکا تھا۔ پاکستانی چھاتہ برداروں کے خوف سے ٹڈل نکلاں ہندو سرشام ہی اپنے گھروں میں دبک جاتے تھے۔

ہم جب بیٹھتے کے گھر والی سڑک پر پہنچے تو آکا کا دیکھنے اور رکشا نظر آتے تھے۔ دکانیں سب بند تھیں۔ ہم نے اس بار ٹیکسی نہیں چھوڑی اور ٹیکسی میں ہی بیٹھے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد بیٹھتے کی گلی کے سامنے ایک رکشا کا اور اس میں سے جھومتا جھانتا بیٹھتے برآمد ہوا۔ میں پیکٹ لئے تیزی سے اس کے پیچھے گیا۔ شراب اور شہی کے قص نے اس کا نشہ دوہلا کر دیا تھا۔ وہ جھومتا اور گنگنا تا ہوا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا میں اس کی مصنوعی خوشی اس سے چھیننا نہیں چاہتا تھا لہذا اسے پیکٹ تھما کر اور اگلے دن گولڈ سینما میں ملنے کی یاد دہانی کروا کر واپس پلٹ آیا۔ اپنے ساتھی کو اس کے گھر کے پاس اتارا اور کناٹ پیلس پر ٹیکسی بدل کر اپنے ہوٹل آ گیا۔

اگلے روز صبح میں نے آشا کی دی ہوئی کیسٹ کئی بار سنی۔ اس میں تین افراد کی آواز گلاسوں کی کھٹک اور کبھی کبھی آشا کی آواز بھری ہوئی تھی۔ ٹھیکے سے متعلقہ امور پر گفتگو اور بچت کے متعلق اندازے بیان کئے گئے تھے صرف ایک بات ایسی تھی جس سے آشا کی سچائی کا ثبوت ملتا تھا۔ غالباً بریگیڈیئر نے کہا تھا۔ ”سر ٹھیک تو میں دے دیتا ہوں لیکن دوسرے ٹھیکیداروں نے شور مچایا اور بات انکار کر لی تو پھر کیا ہوگا“۔ اس کی بات کو دوسری آواز نے کاٹ دیا۔ ”بریگیڈیئر اس کی تم چھتا نہ کرو۔ یہ میری ذمہ داری ہے اور بے چند تمہارا حصہ تمہیں ٹھیک ملے ہی ادا کر دے گا۔ میری تو بے چند کے ساتھ حصہ داری ہے اور جب تک ٹھیکے کا تمام کام مکمل نہیں ہو جاتا، مجھے منافع کا حصہ نہیں ملے گا۔ یہ غالباً منسٹر صاحب، بریگیڈیئر کو تملی دے رہے تھے۔ ہمارے لئے یہ کیسٹ کارآمد ثابت ہو سکتی تھی لیکن اس کیلئے آشا کا تعاون ضروری تھا۔ اگر وہ ہمیں ٹھیکے کی تمام تفصیلات مہیا کر دے تو پھر بے چند کے علاوہ، بریگیڈیئر اور منسٹر کو بھی ہم قابو کر سکتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس معاملے پر آشا سے آئندہ بھرا یا منسٹر کو فون پر بات کروں گا۔ بھیر کے دن مجھے پاکستانی CONTACT سے بھی ملنا تھا۔ اس کے بعد ہی آشا کو فون کر سکتا تھا مجھے ٹھیکے کے معاملے میں جلدی نہیں تھی کیونکہ یہ ابھی ابتدائی مراحل میں تھا۔

ٹھیک دو بجے میں گولڈ سینما چلا گیا اس سینما میں مشہور بھارتی فلم بونی نی نی ریلیز ہوئی تھی اور سینما شائقین سے کچھ بھی بھرا ہوا تھا۔ گولڈ سینما کی بلڈنگ میں ایک نہایت ہی اعلیٰ درجے کا ریستورنٹ بنا ہوا ہے۔ مجھے بیٹھتے سے وہیں پر ملنا تھا میں ریستورنٹ میں داخل ہوا تو بیٹھتے پہلے ہی ایک ٹیبل پر قبضہ جمائے دکھائی دیا۔ کئی قسم کے کھانے اس کے سامنے پڑے تھے۔ آج وہ بہت کھرا ہوا تھا۔ رسی علیک سلیک کے بعد وہ کہنے لگا۔ ”گھر والے تو اکثر دال اور سبزی ہی پکاتے ہیں۔ کبھی کبھار کسی ریستورنٹ میں جا کر من پسند کھانا کھاتا ہوں یا پھر شہی کے ہاں اچھا کھانا ملتا ہے“۔ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا شہی کے ہاں کھانا تو یقیناً تمہیں بھاتا ہوگا کیونکہ شہی کا ساتھ اسے مزید لذت بخشنا دیتا ہوگا۔ بیٹھتے کچھ جھینپ گیا۔ اب چونکہ ہم دونوں دوست بن چکے تھے اسلئے وہ بے تکلفی سے کہنے لگا۔ ”شہی رات بھی آپ کا پوچھ رہی تھی۔ کبھی ادھر کا بھی چکر لگائیں“۔ میں نے کہا ”بیٹھتے صاحب کیوں اپنے پاؤں پر کپھاڑی مارنے کا کہہ رہے ہیں اس بالا خانے پر صرف شہی ہی نمایاں ہے اگر میں وہاں جانے لگا تو پھر آپ کی دال نہیں گلے گی۔ اس کا سن اور ادائیں تماش بینوں سے صرف روپیہ اٹھنے کے لئے ہیں جس طرح پیسے کے زور پر پہلے دن میں نے تمام تماش بینوں کو کھٹکنے پر مجبور کر دیا تھا اب میرے وہاں جانے سے آپ کو بھی کھسکنا پڑے گا۔ اس لئے آپ اکیلے ہی وہاں جا کر اپنی تنہائی دور کرتے رہیں اور اس میں مناسب حد تک میرا مالی تعاون جاری رہے گا۔ آپ میری ضرورت پوری کریں میں آپ کی ضرورت پوری کروں گا اور دوسری بات یہ ہے کہ طوائف کے کوٹھے سے اربوں روپے لٹانے والے بھی پیسہ ختم ہونے پر ڈمبل ورسو کر کے نکال دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے اپنا پیسہ خوش وحواس میں رہ کر اور ہاتھ بچھتی خرچ کریں۔ خرچ کم کریں لیکن ظاہر یہ کریں کہ آپ کے پاس بہت دولت ہے۔ اس طرح طوائفیں بھوکے پی کی طرح آپ کے گرد چکر کاٹی رہیں گی“۔ بیٹھتے خاموشی سے میری بات سن رہا تھا لیکن اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ بڑھا پے کے اس عشق سے بچتا اس کے بس میں نہیں رہا۔ اور میں جانتا بھی یہی تھا کہ شہی کی وجہ سے بیٹھتے ہماری ہرزوریت پوری کرنے پر مجبور ہے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔ ”ویسے بیٹھتے صاحب آپ کی پسند بھی لاکھوں میں ایک اور لا جواب ہے۔ شہی پر تو دل و جاں ہی نہیں، دونوں جہاں بھی چھاوڑ کرنے پڑیں تو سودا مہنگا نہیں“۔ بیٹھتے کھل اٹھا اور کہنے لگا ”دونو بھائی اب تو یہ بھگوان کے اور آپ کے ہاتھ میں ہے کہ میں شہی کو حاصل کر سکوں۔ کل کی ڈاک آپ کو کہی گئی؟“ میں نے جواب دیا ”کوئی خاص نہیں۔ معمول کی ڈاک سے ایک درجہ اوپر تھی“۔ حالانکہ یہ بہت ہی اہم ڈاک تھی آرمی ہیڈ کوارٹرز کے ایک خط کے ذریعے بھارت کے نمبر 17 نومبر 10 ڈویژن کا نمائندوں کو مطلع کیا گیا تھا کہ سکھ لائٹ انفنٹری کی تمام ریمنوں کو جن کی نفری 35 ہزار سے زیادہ تھی، ایک ماہ کے اندر ان ڈویژنوں سے ہٹا کر تری پورہ میں مقیم جاٹ ریمنوں (نفری تقریباً 30 ہزار) کی جگہ تعینات کیا جائے۔ بھارت کے نمبر 17 نومبر 10 ڈویژن پاکستانی سرحد کے قریب تعینات تھے۔ بیٹھتے کہنے لگا ”اب جبکہ میں نے آپ کے لئے اتنا بڑا رسک لیا ہے تو میں انتہا تک جانے کو تیار ہوں۔ بس آپ حکم کرتے جائیں میں تعمیل میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا“۔

غازی

مجھے اچانک خیال آیا اور میں نے بیثوث سے کہا تاراپور کے ایٹمی بجلی گھر سے RADIATION سے محفوظ ٹراک ٹائٹا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو باقاعدگی سے جاتے ہیں اور ان کی سیکورٹی فوج کے کمانڈرز کے سپرد ہے۔ تاراپور کا ایٹمی پلانٹ بھی ان کی نگرانی میں ہے اسی باعث ایٹمی پلانٹ اور ٹائٹا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے متعلق ہیڈ کوارٹرز میں یقیناً کچھ فائلیں ہوں گی۔ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی کارکردگی سے بھی ہیڈ کوارٹرز کو مطلع کیا جاتا ہوگا۔ ایسی تمام فائلیں مجھے دیکھ رہی ہیں، بیثوث ایسے خاموش ہو گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ میں نے بے رغبتی برتتے ہوئے کہا کہ میں نے تو یونہی آپ سے یہ بات کر دی ورنہ ایٹمی بجلی گھر اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دونوں میں ہمارا رابطہ ہے اور ہمیں مفصل معلومات مل رہی ہیں۔ میں نے تو محض ان معلومات کو Tally کرنے کیلئے آپ سے پوچھا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کام کے عوض آپ کو خاصی بڑی رقم مل سکتی تھی۔ میں خاموش ہو گیا تو بیثوث بولا۔ ”ایسی دو فائلیں ہیں جو جنرل صاحب اپنے کمرے کی سیف میں رکھتے ہیں چونکہ میں COPYING BRANCH میں سب سے سینئر اور سپرٹنڈنٹ ہوں۔ اس لئے ان فائلوں سے متعلقہ ڈاک ٹائپ کروانے کے لئے اور آئی ہوئی ڈاک فائل کروانے کیلئے جنرل صاحب مجھے بلاتے ہیں۔ جنرل صاحب کے کمرے میں پڑے ٹائپ رائٹر پر میں ٹائپ کرتا ہوں۔ اور کیا فائل میں لگا دیتا ہوں۔ یہ دونوں فائلیں الگ الگ نہیں ہیں بلکہ ایک فائل مکمل ہونے کے بعد دوسری فائل زیر استعمال ہے۔ جنرل صاحب کے حکم کے مطابق ہر آنے والی ڈاک کے جواب کی کاپی اسی کے ساتھ اسمبل کر دی جاتی ہے۔ جنرل صاحب کا ٹائپ رائٹر بجلی سے چلتا ہے اور ان کے کمرے میں فوٹو اسٹیٹ مشین بھی ہے لہذا کاربن کاپی نہیں بنائی جاتی۔“ میں نے کہا ”کوئی بات نہیں۔ آپ کی ان فائلوں تک محض رسائی ہمارا مقصد نہیں ہے۔ لہذا اس بات کو بھول جائیں۔ اب یہ بتائیں کہ جنرل صاحب اور بریگیڈیئر اور دوسرے سینئر افسران کے دفتروں کی صفائی کون کون سے سویپر کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی رومی کی ٹوکریوں میں چھینکے ہوئے کاغذ اور ان کے کلبے چاہئیں۔“ بیثوث فوری بولا۔ ”آپ کا یہ کام میں کروادوں گا اور ایسے تمام کاغذات میں آپ کو مہیا کروں گا۔“ میں نے اسے ٹوکا اور کہا ”تمہیں بیثوث باوجود دفتر میں جو کام ایک روٹین میں چل رہا ہے اس میں آپ کی مداخلت شک پیدا کر سکتی ہے۔ آپ صرف اس سویپر کے نام مجھے دے دیں۔ یہ سویپر کا کام ہے اور انہی سے ہم یہ کام لیں گے۔ دوسرے اس کام کا معاوضہ نہایت قلیل ہوگا جو آپ کے شایان شان نہیں۔ بڑا کام اور بڑا معاوضہ جنرل کی سیف میں بڑی فائلوں کا حصول تھا جو آپ کے لئے ممکن نہیں۔“ کچھ دیر خاموشی کے بعد میں نے بیثوث سے اگلی ڈاک کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ آئندہ وہ ڈاک جتنے میں دو دن مشکل اور جتنے کے روز دیا کرے گا۔ ڈیلوری کے لئے دونوں دن دفتر سے واپسی پر اس کی گلی کے باہر سڑک پر دودھ دہی کی دکان پر ایک جیسے تھیلوں کی تبدیلی کے ذریعے اور ڈاک کی واپسی کے لئے مشکل کورس 12 بجے جب وہ جنرل قندی کے لئے گلی کے باہر سڑک پر آیا کیا کرے گا اور جتنے کوشی کے بالا خانے سے واپسی پر ساڑھے گیارہ بجے سے بارہ بجے کے دوران سڑک پر۔ میں نے کہا کہ اول تو میں خود آیا کروں گا ورنہ میرا ایک ساتھی جس کی بڑی بڑی موٹھیوں ہوں گی اور نظر کی عینک لگائی ہوئی ہوگی۔ تمہارا قریب آ کر تم سے سگریٹ جلانے کیلئے وچاس مانگے گا اور اس کا کوڈورڈ ڈان ہوگا۔ ڈان سنتے ہی تم اس سے تھیلے تبدیل کر لینا اس دوران بیثوث نے ڈاک کا پیکٹ ٹھیل کے نیچے سے ہی مجھے تھا دیا جسے میں نے اپنے لباس میں چھپا لیا۔ یہ سب سمجھا کر جب میں کرسی سے اٹھنے لگا تو بیثوث نے رکتے رکتے پوچھا کہ جنرل کے دفتر کی فائلوں کا کتنا معاوضہ مل سکتا ہے۔ میں نے کہا بیثوث باوجود آپ نہیں کر سکتے اس کے متعلق پوچھنے کا کیا فائدہ ہے آپ دوست ہیں لہذا آپ کو بتانا ہوتا ہے کم از کم پچاس ہزار روپیہ۔

پچاس ہزار کا ہفتے ہی بیثوث کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ 70 کی دہائی میں پچاس ہزار روپے بہت بڑی رقم تصور ہوتی تھی۔ آج کل کے نوجوان اس دور کے پچاس ہزار کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ پاکستان میں اس دور میں بکرے کا صاف سترہا گوشت چار روپے پلو دستیاب تھا اور سب چیزوں کی قیمت اسی نسبت سے آج کل کے مقابلے میں بہت کمی تھی اور بھارت میں اندرون ملک بننے اور پیدا ہونے والی اشیاء کی قیمتیں پاکستان سے بھی نسبتاً کم تھیں۔ بیثوث کو وہیں چھوڑ کر میں ریٹورنٹ سے باہر آ گیا۔

میرے ساتھیوں نے بازاروں میں گھومتے ہوئے ایک دکان سے اسکول ڈراموں میں گیٹ اپ کے لئے بنی مصنوعی موٹھیوں اور سسکوں کی رول کی ہوئی ڈاڑھیاں خرید لی تھیں۔ انہوں نے تو یہ محض تقریر خریدی تھیں لیکن میں نے ان سے کام لینے کا فیصلہ کیا۔ بال تو ان کے پہلے ہی خاصہ بڑھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں سکھ طرز کی بندھی بندھائی پگڑیاں بھی خریدنے کا کہا تھا۔ اور اب میرے چاروں ساتھیوں کے پاس سبھی گٹ اپ کا مکمل سامان تھا۔ بیثوث کے ساتھ رابطے کا میں نے ”مضبوط پل“ بنا دیا تھا۔ اب ڈاک لینے اور واپس لوٹانے کا روٹین کا کام میں انہیں سونپنا چاہتا تھا۔ کیونکہ غیر ارادی طور پر میں کئی جگہ بیک وقت INVOLVE ہو چکا تھا۔ اور میرے پاس وقت کی کمی تھی۔ سینما سے نکل کر میں ایک چشموں کی دکان پر گیا اور ساہو سفیدیشوں والی چار عینکیں خرید لیں۔

بیثوث کی حالت دیکھ کر مجھے یکا یک ایک مضموبہ سوچا تھا لہذا میں سیدھا جاؤڑی بازار میں لے چلا گیا۔ صبح بتازس اور شام اودھ کے حسن کی طرح طوائفوں کے بالا خانے بھی شامل ڈھلنے کے بعد رنگین اور پرکشش ہوتے ہیں۔ ابھی شام کے 4 بجے تھے۔ میں نے اپنی آمد کی اطلاع دی تو ایک ادھیہ سو میرا بیٹا مجھے اندر لے گیا۔ رات کا سجا ہوا ہال کمرہ سگریٹ کے ٹکڑوں، اوندھے پڑے گالداروں، بکھرے سازوں اور منگنی چاندنیوں سے اٹاپا تھا۔ میں نے میرا بیٹا سے کہا کہ مجھے ذمہ دارنی سے ملنا ہے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اندر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں شی دو تین اور لڑکیوں کے ساتھ ادھیہ ترحیمی پڑی سو رہی تھی اور ایک پلنگ پر نیم دراز ذمہ دارنی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی نظریں سولیاہ انداز میں بے وقت آنے کا سبب پوچھ رہی تھیں۔ میں نے اسے کہا کہ میں شی کے متعلق کچھ بات کرنے آیا ہوں لیکن اس کی سولیاہ نگاہیں ختم نہ ہوئی۔ میں نے ایک ہزار روپے اسے دیئے اور کہا کہ میری بات غور سے سنی اور صحیح جواب دے۔ ہزار روپے نے میری بے وقت آمد کا احساس اس کے چہرے سے غائب کر دیا اور وہ میرا بیٹا کو کالی دے کر پکارنے لگی کہ ابھی تک میرے لئے شہنا نہیں لایا۔ اتنی دیر میں شی اور دوسری لڑکیاں بھی اٹھ بیٹھی تھیں۔ ذمہ دارنی نے انہیں اشارہ کیا اور وہ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ساری لڑکیوں میں صرف شی نے چھوٹی سی تھنی پہن رکھی تھی۔

میں نے ذمہ دارنی سے پوچھا کہ شی کی بات کہیں طے ہوئی ہے تو ذمہ دارنی نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا نہ راز نہ کیا، ہوگا تو ذمہ دارنی نے مجھے خریداری سمجھتے ہوئے کہا۔ ”میں ہزار سے ایک پائی کم نہیں“ میں نے پھر پوچھا، بیثوث باہو سے بھی اس مسئلے پر بھی بات ہوئی ہے تو وہ کہنے لگی۔ وہ بڑھا تو میری پگڑی کا دیوانہ ہو رہا ہے۔ یہاں پر پگڑی ہزار میری پگڑی کے قدموں میں نچھاور کر چکا ہے۔ لیکن میں نے اسے صاف کہہ دیا ہے کہ میں ہزار سے کم ہوں تو ان بیٹیوں پر اس مقصد کے لئے نہ چڑھتا۔ پھر ایک آہ بھر کر کہنے لگی۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ میری ماں بتایا کرتی تھیں کہ اس چوکھٹ پر بڑے بڑے رئیس اور نواب زادے لوٹتے رہتے تھے۔ اب تو کلجگ ہے کلجگ۔ جس کی جیب میں بھی سو روپیہ ہوتا ہے بلا ہڑک اندر چلا آتا ہے۔ میری بیٹیوں کے نازک پاؤں ناچنے ناچنے سو جاتے ہیں۔ لیکن پانچ روپے سے زیادہ ویل کوئی نہیں دیتا۔ میں نے اسے کہا کہ دیکھو اگر تمہیں شی کے 35 ہزار مل جائیں..... تو ذمہ دارنی میری بلانیں لے کر کہنے لگی۔ جوہری ہی ہیرے کی قدر پہنچاتا ہے۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی کہ میں نے اسے ٹوک دیا اور کہا کہ تم ایسے کرو کہ جب بیثوث آئے تو اسے کہنا کہ ایک رئیس نے 35 ہزار روپے کی پیشکش کی ہے۔ میں نے اس سے ایک ہفتے کی مہلت مانگی ہے۔ آپ چونکہ ہمارے پرانے شناسا ہیں اس لئے پہلا حق آپ کا۔ اس سے پہلے بھی آپ نے ہمارے بیس ہزار کے مطالبے کو پورا نہ کر کے اپنا نقصان اور ہمارا فائدہ کیا ہے۔ اب 35 ہزار کی آفر کو بھی آپ سوچ جائیں میں ضائع نہ کر دیں۔ وہ رئیس زادہ تو اس سے بھی زیادہ دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ آپ کے پاس ایک ہفتے کی مہلت ہے۔ ورنہ بعد میں ہم سے شکوہ نہ کیجئے گا۔ اس معاملے میں میرا ڈر ہرگز ہرگز نہ کرنا۔ غرضیکہ میں نے ذمہ دارنی کو خوب پٹی پڑھائی۔ لیکن وہ بھی گرگ باراں دیدہ تھی۔ کہنے لگی، حضور آپ کی ہر بات درست لیکن اگر بیثوث باہو 35 ہزار پر راضی نہ ہوئے تو ہم بیس ہزار سے بھی جائیں گے۔ میں نے اسے ایک ہزار اور دیا اور کہا کہ اگر بیثوث ایک ہفتے میں 35 ہزار نہ دے سکا تو میں بیس ہزار روپے ہی دے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ میرے کہے پر حرف بگڑے۔ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

میں نے ایک طرح سے یہ جو اٹھایا تھا۔ بیثوث سے مجھے امید تھی کہ جب اسے شی کے حصول کے اوقات کار کا پتہ چلے گا تو وہ بڑے سے بڑا رسک لے لے گا۔ میرے خیال میں ان دو فائلوں کا پچاس ہزار روپے میں حصول میرے سینئر کے لئے بہت سستا سودا تھا۔ ہمارا ایک گروپ پہلے ہی اپنے اس مشن میں ناکام ہو چکا تھا جبکہ مطلوبہ معلومات ہمارے لئے بہت ضروری تھیں۔

چاوڑی بازار سے واپسی پر میں ساتھیوں کے گھر چلا گیا اور آج کی ڈاک کی کاپیاں بنوا کر گزشتہ ڈاک کی کاپیاں بھی لے لیں۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ آج سے بیثوث کو ڈاک لوٹانے اور وصول کرنے کی ذمہ داری ان کے ذمہ ہے۔ کاپیاں بھی وہ خود ہی بنایا کریں۔ منگل اور ہفتے کو ڈاک کی وصولی اور واپسی کے اوقات اور جگہ بھی انہیں بتادی۔ اور کہا کہ بدھ اور اتوار کی صبح 10 بجے ڈاک کی کاپیاں مجھے لوڈھی ہوٹل کے قریب محل ریٹورنٹ میں پہنچا دیا کریں۔ بیثوث سے ڈاک لینے اور واپسی کے لئے دو ساتھی جایا کریں۔ جن میں سے ایک موٹھیوں اور عینک لگانے جبکہ دوسرا اپنی اصلی حالت میں اسے کور کرے۔ اسی وقت میں نے ایک فیصلہ کیا جو کہ میرے سینئر کی ہدایات کے خلاف تھا (حالات کے تقاضے کے مطابق دی گئی ہدایات میں تبدیلی کا مجھے اختیار دیا گیا تھا)۔ میں نے ساتھیوں کو لوڈھی ہوٹل میں اپنی رہائش اور ٹیلی فون نمبر بتا دیئے اور انہیں کہا کہ کسی ایمر جنسی یا ضرورت کے تحت وہ مجھ سے ہوٹل میں رابطہ کر سکتے ہیں۔ میرے اس فیصلے کی تین وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ میرا تقریباً ہر روز ان کے گھر جانا مناسب نہ تھا اور مالک مکان اور محلے داروں کو شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ دوم میرے ساتھیوں کو میرے متعلق کوئی علم نہ تھا اور کسی ایمر جنسی کی صورت میں وہ مجھ سے رابطہ نہ کر سکتے تھے اور تیسری وجہ یہ تھی کہ اگر کہیں میں پکڑا جاؤں تو وہ میرے متعلق بالکل اندھیرے میں ہی نہ رہیں۔ میں آہستہ آہستہ انہیں ذمہ داریاں سونپنا چاہتا تھا تاکہ میری گرفتاری کی صورت میں وہ طے شدہ امور کو جاری رکھ سکیں۔

اگلا سارا دن میں نے ہوٹل میں ہی گزارا جیتنے والی ڈاک تیار کی اور تازہ کارروائیوں کی کامیابیوں کی مفصل رپورٹ، مذکورہ دینے والی بیانیہ سے لکھی۔ ہمدرد سے 20 ہزار روپے لینے اور بیثوث کیلئے مزید روپوں کی ضرورت بھی لکھی۔ تاراپور مشن کی اب تک کی جانے والی کوشش اور اس کے متوقع نتائج کے بارے میں لکھی۔ غرضیکہ شام ڈھلنے سے پہلے ڈاک کا پیکٹ بالکل تیار کر دیا۔

میں اگلے روز مقررہ وقت پر اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ CONTACT سے ملے پہنچ گیا۔ میرے مطالبے کے مطابق اس بار دو CONTACT پیجے گئے تھے جو ڈاک کا خاصہ بڑا تھیلالہ تھے۔ میرے ساتھی مجھے کور کئے ہوئے تھے۔ تھیلے لے کر میں نے فوراً اپنے نمبر 2 کے حوالے کیا جو اسے اپنے گھر لے گیا۔ CONTACT کو مجھ سے کوئی بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ لہذا مجھ سے ڈاک لے کر وہ بھی فوراً چلے گئے۔ اپنے بقدر دو ساتھیوں کے ہمراہ میں تین ٹیکسیاں بدل کر اور مختلف علاقوں کے بے فائدہ چکر لگا کر اور راستے میں ساتھیوں کو الگ الگ جگہ اتار کر تقریباً دو گھنٹے بعد ان کے گھر پہنچا۔ ٹیکسیوں کو بدلنا، مختلف جگہوں کے چکر لگانا اور ساتھیوں کو راستے میں الگ الگ اتارنا ہمارے لئے لازمی تھا تاکہ اگر CONTACT کا پیچھا کیا جا رہا ہو تو نگرانی کرنے والے ہمارے ٹھکانوں تک بھی نہ پہنچ جائیں اور انہیں راستے میں ہی جھٹک دیا جائے۔

اس بار ہماری ڈاک کے پیکٹ میں ہمارے گھر کیلئے خطوط کے علاوہ دو عدد کیمبرے اور کیمبرے کے لئے بارہ ہفتوں کے رول تھے۔ ایک تین بور کا بسٹل سائیکلس کے ساتھ، تین فالٹو میٹریں اور دو سو گولیاں تھیں۔ پچاس ہزار بھارتی روپے تھے۔ سینئر کے خط میں ہماری کارکردگی کو بہت سراہا گیا تھا اور بیثوث سے حاصل ہونے والی ڈاک کا شدت سے انتظار کیا جا رہا تھا۔ ایک کیمبرہ سائز میں سگریٹ لائٹر جتنی تھا اور ڈاک کی تصویریں بنانے کی صلاحیت رکھتا تھا جبکہ دوسرا کیمبرہ CANNON آئیونک تھا اور اس میں بلٹ ان فلیش تھی۔ سینئر کا ایک خط صرف میرے لئے تھا جس میں مختلف ہدایات کے علاوہ یہ درج تھا۔ ”تمہاری کارکردگی اور صلاحیت نے ہمیں بہت متاثر کیا ہے تم چاہے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہو لیکن ہمارے لئے تمہاری زندگی بیش قیمت ہے۔ لہذا ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاؤ۔ سائیکلس والا بسٹل تمہارے لئے ہمارا تحفہ ہے۔ اگر ضرورت کا موقع پیش آجائے تو بے دریغ استعمال کرنا۔ آئندہ ہر اتوار اور بدھ کو ٹیک دو بجے بعد دو پہر ہم وائر لیس پر تمہیں CONTACT کیا کریں گے۔ تاکہ ضروری ہدایات کے علاوہ آپ سب کی خیریت معلوم ہو سکے۔ آپ جواب میں صرف MESSAGE RECEIVED اور ALL O.K کہیں۔“ یہ انتظام میرے خیال میں اس لئے کیا گیا تھا کہ ہم اپنے ٹراؤسمبر پر لاہور سے رابطہ کرنے اور پیغام بھیجنے میں جو وقت صرف کرتے تھے۔ اس دوران ہمارے ٹریس TRACE ہونے کا خاصا امکان تھا۔ جبکہ لاہور سے TRANSIMT ہونے والے پیغام چاہے کتنا وقت لیں RECEIVE کرنے اور مختصر ترین جواب بھیجنے میں ”پکڑ“ کا خدشہ بہت کم تھا۔ مجھے اس سبب انتظام کی وجہ کہیں کچھ گڑبڑ ہونے کا احساس لا رہی تھی۔ میں اسے محض اپنا وہم سمجھ کر بھلا دینا چاہتا تھا لیکن دو تین روز بعد کے اخبارات میں جلی سبھی خبروں میں الہ آباد میں ایک پاکستانی میجر جاسوس کی گرفتاری اور بعد ازاں اس کے تین ساتھیوں کی ٹراؤسمبر کے مسلسل استعمال کی وجہ سے آگرہ سے گرفتاری کی خبروں نے میرے خدشے کی تصدیق کر دی۔ اخبارات تو پاکستانی میجر اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری اور سبھی خیرا کشفیات کی توقع سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن کیا کشفیات ہوئے۔ اس کے متعلق کبھی کچھ نہ چھپا۔ تو کرنل ٹنگر نے ہفتہ دس دن بعد ملاقات میں تفصیلاً بتایا کہ احسن نام کا ایک پاکستانی میجر 39 ماؤنٹین ڈویژن کی وردی اپنے الہ آباد میں کسی آئٹشل ڈیوٹی کے بہانے ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ ہمیں میں مقیم ایک بھارتی کرنل کی ڈائری کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ہمیں میں کئی دنوں کی لا حاصل کوشش کے بعد اس نے کرنل کے مسلمان بیٹہ کو پیسے کے زور پر رام کرنا چاہا اور اسے اعتماد میں لینے کے لئے یہاں تک بتا دیا کہ وہ پاکستانی اور مسلمان ہے۔ کرنل کی ڈائری لا کر دینے کے عوض اس نے بیٹہ میں کو خاصی بڑی رقم کی پیشکش کی اور آڈیو رقم پیشگی دے گی۔ یہ بیٹہ میں کچھ زیادہ ہی ”محبت بھارت“ تھا۔ اس نے کرنل کو سب کچھ بتا دیا۔ میجر احسن کو فوراً گرفتار کر لیا گیا اور یہ تصدیق ہونے پر کہ اس کا 39 ماؤنٹین ڈویژن سے جو پورا میں STATOINED تھا کوئی واسطہ نہیں اس پر انتہائی تشدد کیا گیا لیکن اس نے سوائے اپنے نام، رینک اور نمبر کے کچھ نہ بتایا۔

بھارتی انٹیلی جنس نے جلد از جلد اپنے ساتھیوں اور ہمدردوں کے نام اگلوانے کی خواہش میں اس میجر کو Break کرنے کیلئے تشدد کی انتہا کر دی۔ اس کے دونوں پاؤں کی انگلیاں کاٹی گئیں۔ ہاتھ کاٹے گئے اور دونوں بازو بھی کاٹ دیئے گئے لیکن میجر احسن کی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ حتیٰ کہ وہ شہید ہو گیا۔ اس کے ساتھی آگرہ میں تھے۔ میجر احسن جب مقررہ وقت سے چند دن بعد تک وہاں نہ پہنچا تو وہ بوکھلا گئے اور بار بار ٹراؤسمبر پر لاہور سے رابطے شروع کر دیئے۔ Tracer نے ان کے سنکٹ کیج کے اور جگہ کا تعین کیا اور وہ تینوں بعد ٹراؤسمبر پکڑے گئے۔ کرنل ٹنگر نے کچھ مجھے بتایا میں منتا گیا۔ میں نے خود کوئی ایسا سوال نہ کیا جو کرنل کو میرے متعلق شک میں ڈال سکے۔ یہ ساری روداد میں نے اپنی ڈاک میں لاہور بھیج دی۔ بہت بعد میں مجھے پتا چلا کہ میجر کے تینوں ساتھیوں کو بھی تشدد سے شہید کر دیا گیا لیکن انہوں نے بھی اپنی زبان نہ کھولی۔ انا اللہ وانا علیہ راجعون۔

قارئین! شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ پاکستان سے اس فراوانی سے بھارتی کرنل کی آمد کی وجہ سے ہمیں اسے خرچ کرنے کی کھلی اجازت تھی۔ یہ بات ہرگز نہ تھی بلکہ میرے ہوٹل اور ساتھیوں کے مکان کے کرانے کی ادائیگی کے علاوہ میرے چار ہزار روپے اور میرے ساتھیوں کے تین تین ہزار روپے ماہوار ذاتی اخراجات کیلئے مقرر کئے گئے تھے۔ ان رقم کے علاوہ ہمیں ایک ایک پیسے کا حساب رکھنا پڑتا تھا۔ مشن کی مدد میں اخراجات کی تفصیلات Justification دینی پڑتی تھی۔ میرے ساتھیوں کے پاس چونکہ ذاتی اخراجات کی مدد میں رقم ایڈوانس میں جاری تھی اس لئے میں نے اس بار انہیں کچھ نہ دیا اور ہمدرد سے ہی ہوئی رقم کا قیودا راب ملنے والے پچاس ہزار روپے ہوٹل میں اپنے لا کر میں رکھ دیئے۔ یہ سب روپیہ ملک اور قوم کی امانت تھا اور ہم نے جبکہ اپنی زندگیاں اپنے وطن کیلئے واڈ پر لگا رکھی تھیں تو اس امانت میں خیانت کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

غازی

میں نے اپنے ساتھیوں کو میجر احسن اور اس کے ساتھیوں کی شہادت کا بتایا اور کہا کہ اب ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ میں نے انہیں سختی سے ہدایت کی کہ کبھی بھی اکیلے باہر نہ جائیں ہمیشہ دو جائیں۔ دونوں مسلح ہوں اور ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر چلیں۔ اگر محسوس ہو کہ آپ کا پیچھا کیا جا رہا ہے تو جھٹکنے کی پوری کوشش کریں اور اگر جھٹکنے میں ناکام ہو جائیں اور پھینچنے کی کوئی صورت نظر نہ آئے تو پھر پیچھا کرنے والے کو گولی مار کر ہلاک کر دیں اور وہاں سے غائب ہو جائیں۔ میری یہ ہدایت سن کر ساتھیوں نے بتایا کہ سرائے بیرم خان میں گھومنے کے دوران انہوں نے چاقو چھری اور خنجروں کی ایک دکان سے ایسی پانچ چھریاں خریدی ہیں جو آدھ رنج سے بھی کم چوڑی اور ایک فٹ لمبی ہیں اور ہاتھ میں پکڑنے والے عام موٹے ہید میں چھری کے دستے میں بنے اسکرپوکے ڈریلے فٹ ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے ایسا ایک ہید مجھے بھی دیا۔ چھری واقعی بے حد سخت اور بہت تیز تھی۔ ہید کے اندر فٹ ہونے پر چھری کا دستہ ہید کا حصہ دکھائی دیتا تھا۔ واقعی یہ کارآمد ہتھیار تھا جس سے آواز نکالے بغیر دشمن کو ہلاک کیا جاسکتا تھا۔ پاکستان سے بیچے گئے سائیکلر والے ہیل کورکھے کیلئے کو روالہ ایسی ہیٹس بیچی گئی تھیں جن سے ہیل لباس کے اندر بالکل چھپ جاتا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو دوبارہ تنبیہ کی کہ اسلحہ اور چھری کا استعمال صرف انتہائی خطرناک صورت حال میں گھر جانے پر کیا جائے جب دوسرا کوئی راستہ نہ رہے۔

ساتھیوں کو میجر احسن کی شہادت کا بتانے اور چھریاں لینے کا واقعہ ہمارے گزشتہ تسلسل سے تقریباً 12 روز بعد کا ہے۔ روز گزشتہ بیرم کے روز ہم نے پاکستانی Contacts سے ڈاک وصول کی اور بیچتی تھی اور اگلے روز بیٹھتے سے میرے ساتھیوں نے دودھ دہی کی دکان پر اس کی ڈاک کا تھیلہ وصول کرنا تھا۔ منگل کو میرے ساتھیوں نے بیٹھتے سے ڈاک وصول کی اور کہا ہاں ہاں کہہ کر بھول کر مغل ریسٹورنٹ میں میرے حوالے کر دیں۔ کاپیوں کے علاوہ بیٹھتے کا دبا ہوا ایک لفافہ بھی مجھے دیا۔ جس پر Most Urgent لکھا ہوا تھا۔ خط میں لکھا ہوا تھا۔ ”ایک بہت ہی اہم مسئلہ درپیش ہے آپ سے فوری ملنا چاہتا ہوں۔ بدھ کو رات آٹھ بجے گولپہ سینما کے ریسٹورنٹ میں آپ کا منتظر رہوں گا۔“ میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ رات پونے آٹھ بجے گولپہ سینما کے ریسٹورنٹ میں الگ الگ جا بیٹھیں اور میری بیٹھتے سے ملاقات کے دوران چوکنا رہیں۔

میں جان بوجھ کر چندر منٹ لیت ریسٹورنٹ میں پہنچا۔ پہلے سے وہاں بیٹھے ہوئے میرے دونوں ساتھیوں نے مجھے گرین سگنل دیا۔ بیٹھتے کو کونے کی ایک میز پر سر جھکا کر بیٹھا اور پریشان حال دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے سر اٹھایا۔ مجھے دیکھ کر اس کی بائیں کھلیں۔ ”بہت انتظار کروا دیا آپ نے۔ میں تو مایوس ہو چلا تھا“ میں نے کہا کہ میں تو صرف چندر منٹ لیت ہوا ہوں۔ ہر حال بتائیں کیا ضرورت آن پڑی۔ بیٹھتے نے میرے آگے فی الحقیقت ہاتھ باندھ دیئے۔ میری عزت اور زندگی اب آپ کے ہاتھ میں ہے“ میں نے کہا ”بیٹھتے کا بائو ہتاؤ تو سہی کیا بات ہے“ یہاں میں بتانا چلوں کہ بیٹھتے کو میں نے اپنا ہندو نام بھی ابھی تک نہیں بتایا تھا اس لئے وہ مجھے صرف صاحب کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ چند سینکڑوں الفاظ کے تسلسلے کے بعد آواز کرنے کیلئے وہ چپ رہا اور پھر بولا ”صاحب آپ سے تو اب میری کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ میں شی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کل شام میں اس کے ہاں گیا تھا تو اس کی ماں نے مجھے الگ بلا کر کہا کشتی کا ایک خریدار اس کے 35 ہزار دینے کو تیار ہے۔ نامعلوم وہ سچی ہے یا جھوٹ بول رہی تھی۔ لیکن مجھے اس نے صرف ایک ہفتے کی مہلت دی ہے۔ روپوں کا بندوبست کر لوں۔ ورنہ وہ شی کو دوسرے خریدار کے حوالے کر دے گی۔ یہ کہہ کر بیٹھتے میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ”بیٹھتے کا بائو اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے“ بیٹھتے اور زیادہ گڑگڑانے لگا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میں کسی صورت بھی اتنی رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ آپ میری آخری امید ہیں۔ بھگوان کیلئے مجھے یہ رقم ایڈوانس دے دیں۔ میں آئندہ اپنی ڈاک کا معاوضہ اس ایڈوانس سے منہا کروا تا رہوں گا“ ”دیکھو بیٹھتے کا بائو“ میں نے بے نیازی سے کہا ”آرمی ہیڈ کوارٹرز کی ساری ڈاک ہمارے مطلب کی نہیں ہوتی۔ آپ کے بیچے ہوئے بیشتر خطوط ہم رومی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ میں نے اب تک جو رقم آپ کو دی ہے وہ آپ کی دی ہوئی ڈاک کے مناسب معاوضے سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ سے دوستی ہوگئی ہے اس لئے میں نے یہ سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ اب آپ کو 35 ہزار روپیہ درکار ہے تو وہ اس قسم کی ڈاک کے عوض ایڈوانس نہیں دے سکتا۔ میں بھی آگے جواب دہ ہوں۔ اس کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے کہ تاراپور کی فائلیں اگر آپ مجھے لا دیں تو پھر یہ رقم آپ کو مل سکتی ہے۔“ ”لیکن وہ فائلیں تو جنرل صاحب کی سیف میں رکھی ہیں اور سیف کی چابیاں جنرل صاحب کے پاس ہوتی ہیں“ بیٹھتے نے مایوسی سے جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔ میں نے فوراً ہی اس سکوت کو توڑ دیا اور کہا ”بیٹھتے کا بائو ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ آپ کے بقول جنرل صاحب کی سیف کھولنے بھی آپ ہیں اور بند بھی آپ کرتے ہیں۔ یہ دو مواقع ایسے ہیں جن میں آپ چاہیں کہ کس صاحبان کی کلیوں پر لے سکتے ہیں۔ آپ عکس لے لیں اور چابیاں بنوالیں۔ جنرل صاحب کے دفتر سے جانے کے بعد آپ آسانی سے سیف کھول کر فائلیں نکال سکتے ہیں۔ دفتر سے واپسی پر فائلیں آپ میرے آدی کے حوالے کریں اور اسی رات کو فائلوں کے ساتھ آپ کو 35 ہزار روپیہ مل جائیں گے۔ بیٹھتے سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی خاموشی ڈر کی وجہ سے تھی میں نے اسے سوچنے کی مہلت نہ دی اور کہا کہ چاہیوں کے نقش اتارنے میں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ صرف ہوگا اور فائلیں نکالنے میں بھی کم وقت لگتا ہی وقت لگے گا۔ رسک تو آپ پہلے ہی لے رہے ہیں۔ یہ توکل دومنٹ کی بات ہے۔ جس کے عوض آپ اپنی بڑی سے بڑی حسرت پوری کر سکیں گے۔ ورنہ اگر اسی آرزو کو دل میں لے لے آپ کا دیہانت ہو گیا تو آپ کی یہ آتما بھی بھٹکتی رہے گی اور مرنے کے بعد بھی اسے شافی نہ ملے گی۔

بیٹھتے کا کچھ خوف تو میں نے دور کیا اور کچھ اس کی خواہش نے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بولا ”صاحب جب زندگی میں کوئی خوشی ہی نہیں تو پھر ایسی بے رنگ زندگی کو رنگین بنانے کیلئے میں یہ رسک بھی لے لوں گا۔ دیسی صاحبان کی نکلیاں تو میں آج ہی لے لوں گا جن پر نرم ہونے کی وجہ سے عکس نمایاں طور پر لیا جاسکتا ہے۔ سیف کھولتے اور بند کرتے وقت میری پیٹھ جنرل صاحب کی طرف ہوتی ہے۔ اس لئے نقش بھی آسانی سے اتار لوں گا۔ جنرل صاحب چونکہ ٹائپنگ کیلئے مجھے ہی بلواتے ہیں۔ اس لئے ان کے جانے کے بعد صفائی ہونے سے پہلے کوئی بہانہ بنا کر اس کمرے میں جاسکتا ہوں اور فائلیں نکال سکتا ہوں۔ کسی کو بھی شک نہیں ہوگا۔ لیکن ایک ارچن ہے کہ جنرل صاحب اس محدود مدت میں اگر مجھے نہیں بلواتے تو پھر کیا ہوگا۔“ محدود مدت سے بیٹھتے کی مراد شی کی ماں کی دی ہوئی مہلت تھی۔ میں نے کہا کہ اگر اس دوران جنرل نے تمہیں نہ بلوایا تو تم اپنا قلم سیف میں بھول جانے کا کہہ کر بھی جنرل سے چابیاں لے سکتے ہو۔“ اگر لگن سچی ہے تو بھگوان خود رستہ بنا دے گا۔ آپ رو بہ تیار رکھیں میں فائلیں لانے کی پوری کوشش کروں گا۔“ یہ کہہ کر بیٹھتے نے مجھے نمستے کہا اور رخصت چاہی اور میں سوچ رہا تھا کہ بیٹھتے کا بھگوان تو اس کا رستہ بنانے یا نہ بنانے میرا اللہ یقیناً ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی دے گا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے بیٹھتے کو کہا کہ چونکہ تمہاری ”بیر جنسی“ ہے اس لئے میرا ایک آدی ہر روز دفتر سے تمہاری واپسی کے وقت دودھ دہی کی دکان پر تمہارا انتظار کرے گا۔ کیونکہ ڈاک کی وصولی کیلئے منگل اور ہفتے کے دن مقرر تھے۔ بیٹھتے نے شکرانے کے انداز میں دوبارہ مجھے نمستے کہا اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی اپنے منصوبے کی اب تک کامیابی اور آئندہ کامیابی کے خیالات میں کھویا ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا اور اپنے ساتھیوں کے گھر چلا گیا اور انہیں کہا کہ آئندہ منگل تک روز دو ساتھی دودھ دہی کی دکان پر بیٹھتے کی واپسی کے وقت اس کا انتظار کریں اور عام ڈاک کے علاوہ جو کچھ بھی وہ دے اسے لے کر فوراً مجھے ٹیلی فون بوتھ سے فون کر کے مقرر کردہ وقت پر مغل محل ریسٹورنٹ میں مجھے دے دیں۔

میں نے اپنی طرف سے تمام انتظامات مکمل کر لئے تھے اور اب ہمیں بیٹھتے کی کامیابی کی خبر سننے کا بے تابی سے انتظار تھا۔ میرے دو ساتھی ہر روز دودھ کی دکان پر بیٹھتے کی دفتر سے واپسی کے وقت موجود رہتے تھے اور اسے اپنی موجودگی کا احساس بھی دلاتے تھے اسی صورتحال میں کئی دن بیت گئے۔ اس دوران بیٹھتے نے مقررہ دن انہیں ڈاک کا لفافہ دیا تھا۔ اس ڈاک میں ہیڈ کوارٹرز کے خطوط کے علاوہ تین سو پیرز کے نام اور گھروں کے ایڈریس بھی تھے۔ ہر ایک کے نام کے ساتھ لکھا ہوا تھا کہ وہ کس سینٹر افسر کے کمرے کی صفائی کرتا ہے۔ اس بار ہم نے بیٹھتے کی دی ہوئی ڈاک کی مناسب روشنی میں تصویریں بھی اتاریں اور اپنی کاپی کرنے والی سیٹوں سے کاپیاں بھی بنالیں کیونکہ فلموں کے رول تو پاکستان جا کے ہی ڈیولپ ہوتے تھے اور تب ہی ان کے رزلٹ کا پتہ چلنا تھا۔ کاپیاں ہم نے حفظ ماہانہ کے طور پر بنالیں تھیں۔ اس انتظار بیم کی کیفیت میں ایک روز عبدالکریم میرے ہٹل میں آیا اور اپنے کرنل کے متعلق اپنے خیالات پر مبنی چٹھی لکھی۔ عبدالکریم اردو بولتا تو صاف سٹری تھا لیکن اس کی تحریر بہت معمولی تھی۔ کرنل شکر کے متعلق اس نے جو کچھ لکھا تھا اس کا لب لباب یہ تھا کہ کرنل شکر اگر چہ ایک سخت گیر شخص تھا کہ اسے گالیاں بھی دیتا تھا لیکن دل کا وہ بہت نرم تھا۔ ایڈز کے آپریشن کیلئے عبدالکریم کو CMH میں داخل کیا گیا تو کرنل نے صرف یہ کہ ہر روز اس کی تیمارداری کو اتنا تھا بلکہ اس کیلئے پھل فروٹ بھی لاتا تھا۔ عبدالکریم کی تحریر کی ایک بات نے مجھے چونکا دیا کہ کرنل شکر کبھی کبھی نشے کی حالت میں بھارت اور بھارتی افواج کو گالیاں بکتا تھا اور کہتا تھا کشمیر کے معاملے میں بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کے جانی دشمن بن چکے ہیں۔ بقول عبدالکریم کے کرنل جھٹتا تھا کہ بھارت نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش تو بنا دیا لیکن اب بھارت کے ککڑے ککڑے ہونے کی باری ہے اور یہ کہ آئندہ جو پاکستان بھارت جنگ ہوگی وہ اٹلی جنگ ہوگی۔ اٹلی جنگ کے نتیجے میں دونوں ملکوں میں جو تباہی ہوگی وہ پاکستانی مسلمان تو برداشت کر جائے گا لیکن بھارتی ہندو ہرگز برداشت نہ کر سکے گا اور جنگ کے بعد بھارتی ہندو خود بھارت کی کالی کوٹو ڈر چھوٹی چھوٹی مختلف ریاستوں میں تقسیم کر لیں گے۔ ان ریاستوں کے پاس نہ اتنی طاقت ہوگی اور نہ وسائل کہ جنگ کرنے کا سوچ بھی سکیں۔ عبدالکریم نے لکھا تھا کہ کرنل شکر سپیٹ کر کہتا تھا کہ ایسا ضرور ہوگا لیکن تباہی و بربادی کے بعد۔ کاش بھارت کے گلوے جنگ سے پہلے ہی ہو جائیں اور ایک بڑی اور بھیا تک تباہی و بربادی سے بچا جاسکے۔ کرنل شکر کے مطابق دنیا بھر کے مسلمان ملک پاکستان کی ڈھال بن جائیں گے جبکہ بھارت یکہ و تباہی کا۔

عبدالکریم نے لکھا تھا کہ رات کو نشے میں کرنل شکر جو کچھ کہتا ہے وہ اگلی صبح مجھے سے ضرور پوچھتا ہے کہ کسی اور نے تو نہیں سنا۔ مجھ سے تسلی کر لینے کے بعد مجھے دس پندرہ روپے دے کر کہتا ہے ”جان بناؤ، بھارتی مسلمانوں کو آئندہ جنگ میں بہت بڑا رول ادا کرنا ہے اس کی تیاری کرو“۔

کرنل شکر کے متعلق عبدالکریم کی تحریر کو میں نے کئی بار پڑھا بہت سوچا اور بالآخر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عبدالکریم کی نگاہ میں، میں بھارتی ہندو اور کرنل شکر کا دوست ہوں اس لئے جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہوگا۔ اگر عبدالکریم کو معلوم ہوتا کہ میں مسلمان یا پاکستانی ہوں یا کرنل شکر کا دشمن اور اس کا افسر ہوتا تو وہ پہلی صورت میں مجھے خوش کرنے اور دوسری صورت میں کرنل شکر سے بدلہ لینے اور اسے نقصان پہنچانے کے لئے غلط بیانی کر سکتا تھا۔ یہ تحریر خود اسے بھی بے حد نقصان پہنچا سکتی تھی۔ لہذا اسے درست سمجھا جانا چاہئے۔ کرنل شکر خود مجھے ایک شام باتوں باتوں میں بتا چکا تھا کہ 65ء کی جنگ کے دوران اس کے جوان ریکی کرتے ہوئے پاکستان کی پیر ہیوی گون رانی اور شیرنی کی صحیح نشاندہی کر چکے تھے اور کرنل شکر نے یہ اطلاع نندے کران گون کو بھارتی توپ خانے اور ہوائی بمباری سے بچایا تھا۔ کرنل شکر کی گفتگو لاہور سے اس کی دلی وابستگی اپنی کلاس فیلو سے صحبت میں ناکامی اور دل شکنگی، اب تک غیر شادی شدہ ہونا، ان سب باتوں کو پیش منظر میں رکھ کر عبدالکریم کی تحریر کو میں نے درست سمجھا۔ میں نے کرنل شکر کا جو خاک کھینچا وہ جنگ سے نفرت کرنے والے، کشمیر کے مسئلے پر بھارت کی ہٹ دھرمی کو غلط سمجھنے والے اور مسلمانوں کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھنے والے ایک ایسے شخص کا تھا جو باہر مجبوری بھارتی فوج میں ملازمت کر رہا تھا اور وقت پڑنے پر بھارتی مسلمانوں کو ایک کالی بنا کر ہندوؤں کے تعصب کا مقابلہ کرنے اور مکتد پاک بھارت جنگ میں پاکستان کی مدد کرنے کا خواہاں تھا۔ ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر میں کرنل شکر کے زیادہ قریب ہو کر اور اسے کرید کر بہت مفید معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ میں نے کرنل شکر کو اپنی ویٹنگ لسٹ میں سرفہرست رکھا لیکن جب تک بیٹھتے کا معاملہ طے نہ ہو جاتا میں نے کسی اور رائیوٹو نہ چھیڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بیٹھتے کے دیئے ہوئے سو پیرز کے نام اور ایڈریس میں نے ان دو ساتھیوں کو دے دیئے جو پہلے ہی ہیڈ کوارٹرز کے سو پیرز کے بیچے لگے ہوئے تھے۔ اب انہیں ان تین سو پیرز کو HANDLE کرنا تھا شی کی ماں کی دی ہوئی ”مہلت“ میں ابھی وقت باقی تھا اور میں اس مہلت میں اضافہ بھی کروا سکتا تھا۔ بیٹھتے کو سیف کی چابیاں حاصل کرنے اور مظلوم بھائیوں کو لانے میں جو دشواریاں پیش آسکتی تھیں وہ بھی میرے پیش نظر تھیں لیکن میرا اور میرے ساتھیوں کا یہ حال تھا کہ صبح سے شام تک بیٹھتے کے دفتر سے واپس لوٹنے تک ہم اس کی کامیابی کی آگ لگائے بیٹھے رہتے تھے اور شام کو جب بیٹھتے خاموشی سے سر جھکا کر گھر کی جانب بڑھ جاتا تھا تو ہم سب بھی مایوس ہو جاتے تھے۔ یہ دراصل تاراپور کے اٹلی بجلی گھر کے متعلق معلومات کی اہمیت کی وجہ سے تھا۔ بعض اوقات مجھے خیال آتا کہ بیٹھتے اپنی مہم کے خطرات کے پیش نظر کہیں اس کام سے دست برداری نہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں اس سے یہ کام کروانے کیلئے ہمارے پاس زری کے ساتھ اس کی تصویریں اور ہیڈ کوارٹرز کی ڈاک کی واپسی کے وقت کی فائل کور، جس پر Classified and Confidential چھپا ہوا تھا کی تصویریں ہی کافی تھیں لیکن میں چاہتا تھا کہ بیٹھتے اپنی دیرینہ خواہش اور طلب کے تحت یہ کام کرے۔ جب شی کی ماں کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا تو بیٹھتے نے دفتر کی ڈاک کے ہمراہ ایک خط دیا جو میرے ساتھیوں نے مجھے فوراً پہنچا دیا۔ خط میں بیٹھتے نے گولپہ سینما کے ریسٹورنٹ میں آج ہی ملنے کیلئے لکھا تھا بلکہ وقت بھی خودی طے کر لیا تھا۔

مقررہ وقت پر میں ریسٹورنٹ میں پہنچا تو بیٹھتے کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس کا چہرہ اس کی مایوسی اور ناکامی کے اثرات سے بالکل بھگسا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ جنرل کئی روز سے دفتر نہیں آ رہا۔ اس نے ایک ہفتے کی چھٹی لے رکھی ہے۔ جس میں سے 4 دن گزر چکے ہیں اور چھٹی سے پہلے کے دو دنوں میں نہ تو جنرل نے اسے طلب کیا اور نہ ہی اسے موقع مل سکا کہ جنرل کے کمرے میں داخل ہو کیونکہ وہ جب بھی جنرل کے کمرے کی طرف گیا وہاں میٹنگ ہوتی تھی۔ بیٹھتے اپنی ناکامی سے حد درجہ مایوس تھا۔ کہنے لگا۔ ”اب شی کا حصول ناممکن ہو گیا ہے“۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور کہا کہ جنرل کی چھٹی ختم ہو جائے تو پھر موقع مل جائے گا۔ بیٹھتے کہنے لگا ”موقع تو یقیناً مل جائے گا لیکن بے فائدہ ہوگا شی کی ماں کی دی ہوئی مہلت تو کل ختم ہو رہی ہے۔ یہ ایسا وقت تھا کہ مجھے بیٹھتے کو جو اپنی ہمت تریا ہا چکا تھا، پھر سے تروتازہ کرنا تھا..... میں نے بیٹھتے سے کہا کہ وہ دل چھوٹا نہ کرے شی یقیناً اسے ہی ملے گی۔ اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔ میں نے بیٹھتے کو ہزار روپے دیتے ہوئے کہا کہ وہ گھر جا کر تازہ دم ہو اور ٹھیک 9 بجے شی کے بالاخانے پر میں اسے ملوں گا اور شی کی ماں کو مزید مہلت دینے پر رضامند کرنے کی کوشش کروں گا۔

بیٹھتے اور میں ریسٹورنٹ سے تقریباً آٹھ گھنٹے باہر نکلے۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلا اور میں ٹیکسی لے کر شی کے بالاخانے پہنچ گیا۔ دراصل میں مغل جمنے سے پہلے ہی شی کی ماں کو بریف کرنا چاہتا تھا۔ مغل جمانے کے سامان ہو رہے تھے۔ میں نے شی کی ماں سے علیحدگی میں بات کی کہ آج بیٹھتے اور میں رات 9 بجے آگئے تمہارے ہاں آئیں گے۔ بیٹھتے کیلئے مزید مہلت مانگنے پر پہلے تو تم انکار کر دینا اور میرے بہت اصرار کرنے اور بیٹھتے کیلئے میرے پانچ ہزار بیٹنگ دینے پر اسے مزید دس یوم کی مہلت دے دینا۔ یہ باتیں سمجھا کر میں واپس اپنے ہٹل چلا آیا اور 9 بجے تک تیار ہو کر اور پیسے لے کر پھر چوڑی بازار میں شی کے بالاخانے کے قریب پہنچ گیا۔

غازی

لیثونت وہاں پان کی دکان پر کھڑا تھا۔ کہنے لگا میں تو ساڑھے آٹھ بجے ہی یہاں پہنچ گیا تھا اور پان کی دکان پر ہی دکاندار سے گلاس اور سوڈا لے کر اپنا موڈ بنا رہا ہوں۔ ہم دونوں شی کے بالا خانے میں اکٹھے داخل ہوئے۔ محض شروع ہو چکی تھی۔ میں نے شی کی ماں کو اشارے سے پچھلے کمرے میں آنے کا کہا۔ وہ کمرے میں گئی اور ساتھ ہی ہم بھی کمرے میں چلے گئے۔ میں نے لیثونت سے کہا کہ جو کچھ کہنا ہے جلدی جلدی کہہ ڈالو۔ لیثونت نے مزید مہلت مانگی تو شی کی ماں نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگی۔ ”صاحبو! ہم تو کھلی کتاب ہیں اس بازار میں ہر طرف شی ہو رہی ہے۔ شی کو حاصل کرنا تو ایک طرف رہا۔ اس کے خواب دیکھنے کے لئے بھی جب بھری ہوئی چاہئے۔ تو میں نے محض لیثونت بابو کے پرانے گاگ بک ہونے کی وجہ سے انہیں بتا دیا تھا۔ ورنہ انہیں تو دوسروں کی طرح دعوت نامہ ہی ملتا۔ اب میں بہت جلدی کی یہ رسم ادا کروں گی۔ گاگ بک تو پہلے ہی میرے اشارے کے منتظر ہیں۔ لیثونت نے شی کے بارگزرگزر کر مزید مہلت مانگی لیکن وہ پرانی گھاگ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے جب یہ محسوس کیا کہ لیثونت بالکل ہی مایوس ہو چلا ہے تو شی کی ماں سے کہا۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ لیثونت بابو کے پاس پیسے نہیں۔ انہوں نے کہیں لگا کر ہے جن کی وصولی میں دیر ہو گئی ہے۔ اب محض چند روز کی بات ہے۔ آپ اپنی رسم کی تیاری کریں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے 5 ہزار روپے شی کی ماں کو دیئے۔ ”یہ 5 ہزار بیٹھی ہیں۔ آپ آج سے دسویں روز رسم کی ادا بیگی رکھیں۔ اس سے پہلے ہی آپ کو بقیہ رقم مل جائے گی۔“ بڑھیا نے 5 ہزار تو فوراً بوجھ لئے اور بولی ”بقیہ میں ہزار تو شی کے ہونے اور رسم کی ادا بیگی ہو ہی نہیں ہوتی۔ اس بازار کے سب بالا خانے والوں کی دعوت ہوتی ہے۔ ہم اپنے سب گاگ بکوں کو بھی دعوت دیتے ہیں۔ رات گئے تک بازاری سب لڑکیاں بجا کرتی ہیں شی کے لئے جوڑا بھی سلوانا ہے اور لیثونت بابو کو شی کی منہ دکھانی کے لئے 12 تو لے کا سیٹ بھی دینا ہوگا اور یہ سب اخراجات لیثونت بابو کو دینے ہوں گے۔ میرے پوچھنے پر شی کی ماں نے بتایا کہ کل 10 ہزار روپے مزید خرچ ہوں گے۔“ میں نے کہا کہ وہ بھی تیس ہزار کے ہمراہ آپ کو مل جائیں گے۔ آپ تیاری کریں۔ سب باتیں طے کر کے ہم کمرے سے باہر ہال میں آگئے۔ محض ابھی پوری طرح جی نہیں تھی۔ لیثونت خوشی سے پھولا نہیں سا رہا تھا۔ شی کی ماں نے مجھے بیٹھنے کے لئے بہت زور دیا لیکن میں نے ضروری کام کا عذر کر کے معذرت کر لی جبکہ لیثونت خود کو ابھی سے آدھا دوبا سمجھتے ہوئے بڑی شان سے محفل میں بیٹھ گیا۔ اس کی جیب میں میرے دیئے ہوئے ایک ہزار روپے جو کلبا رہے تھے۔ میں نے لیثونت سے چلتے چلتے یہ کہا کہ کل شام 7 بجے مجھے گولڈ سینما کے رسٹورنٹ میں ضرور ملے۔

اگلے روز شام کو لیثونت گولڈ سینما کے قریب ہی مجھے نظر آ گیا۔ میں نے اسے رسٹورنٹ جانے کا اشارہ کیا اور چند منٹوں کے وقفے کے بعد میں بھی رسٹورنٹ میں اس کی ٹیبل پر جا بیٹھا۔ میرے دوستی حسب معمول ہماری نگرانی کر رہے تھے۔

لیثونت نے میرے بولنے سے پہلے ہی میرا بہت بہت شکر یہ ادا کیا کہ گزشتہ رات میں نے اس کے خوابوں کو کھرنے سے بچایا۔ وہ جب چپ ہوا تو میں نے کہا۔ ”لیثونت بابو! میرے بس میں جو کچھ تھا میں نے کر دیا۔ اب آگے آپ کی ہمت ہے جو 5 ہزار میں نے شی کی ماں کو دیئے ہیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اب آپ کو ہر صورت وہ فائلیں لانی ہوں گی۔ شی کی ماں نے 10 ہزار مزید رسم کی ادا بیگی کے لئے مانگ لئے ہیں۔ وہ بھی میں ادا کروں گا لیکن اس کے لئے آپ کھوڑا سا مزید کام ہوگا۔ جنرل کی سیف میں صرف یہ دو فائلیں ہی نہیں بلکہ اور بہت سی اہم فائلیں ہوں گی۔ جنرل کی OFFICIAL ڈائری بھی اسی سیف میں ہوگی۔ آپ تارا پوری کی دو فائلوں کے ساتھ اور دوسری اہم فائلیں بھی مجھے لا کر دیں گے۔ کیونکہ فائلوں میں محفوظ کاغذات آپ ہی ٹائپ کرتے ہیں۔ اس جنرل سے پہلے یہاں جو جنرل تعینات تھے ان کی OFFICIAL ڈائریاں بھی اسی سیف میں ہوں گی کیونکہ ایسی ڈائریاں تبادلے کے وقت جنرل ہمراہ نہیں لے جاتے بلکہ آنے والے جنرل کی رہنمائی کیلئے ان ڈائریوں کو ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ آپ موجودہ جنرل اور اس سے پہلے تعینات تین جنرلز کی ڈائریاں فائلوں کے ہمراہ ضرور لائیں۔“ لیثونت میری باتیں بہت غور سے سن رہا تھا۔ میں نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”لیثونت بابو! آپ نے جس دشت میں قدم رکھا ہے۔ وہاں ہر ہر لمحے آپ کو پتہ نہیں کہ ضرورت پڑے گی۔ شی کو محض آپ کی بن کر رہنے کے لئے آپ کو ہر ماہ ایک معقول رقم سے دینی ہوگی۔ پھر آپ کو شی کی فرمائشیں پوری کرنے کے لئے بھی خاصی رقم کی ضرورت ہوگی۔ آپ کی اس مد میں مالی ضروریات میں پوری کروں گا اور آپ کو ہماری ضروریات پوری کرنی ہوگی۔ آپ کا بھر پور تعاون مجھے ملتا رہا تو مالی طور پر آپ کو پریشانی ہرگز نہ ہوگی۔“

میری ساری باتوں کے دوران لیثونت مجھے کنگلی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو چند لمحوں کے بعد وہ خاموش رہا اور نہایت سنبھل سنبھل کر بولا: ”صاحب مجھے آپ کا نام بھی پتہ نہیں۔ نہ ہی آپ نے بتایا اور نہ ہی میں نے پوچھنے کی ہمت کی۔ لیکن شی کے بالا خانے پر آپ سے اتفاقاً پہلی ملاقات سے اب تک جو حالات گزرے ہیں۔ ان سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کس ملک کے لئے کام کر رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے میں خود گئے تک جنس چکا ہوں۔ میری واپسی کی کوئی صورت نہیں اور آپ کے ساتھ تعاون میں ہی میری بقا ہے۔ میرے خلاف آپ کے پاس اتنے ثبوت ہیں کہ آپ مجھے زندہ درگور کر سکتے ہیں اور پھانسی پر چڑھا سکتے ہیں.....“ ”اس کے علاوہ میرے آدمی تمہیں گولی بھی مار سکتے ہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ آپ نے بالکل درست کہا۔ میں آپ سے بھر پور تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ میری اولاد میری دشمن ہے اور انہوں نے گھر میں ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کہ مجھے گھر ہی سے نفرت ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں مجھے کوئی نہ جانے۔ میری ساری زندگی دفتری کام میں گزری ہے۔ جمع پونجی کچھ بھی نہیں، جس اولاد کے اوپر اپنی حیثیت سے بڑھ کر اس لئے خرچ کیا کہ وہ بڑھاپے میں میری لاشی نہیں گے وہی مجھے گھر سے نکالنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ پہلے میرا گھر میں سب سے کھلا اور وادار تھا لیکن اب ایک کونے کی کوٹھی ہی میں میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مجھے بتائے بغیر میرا ذاتی سامان اور ایک کھات اس کوٹھی میں ڈال دی گئی۔ جوان بیٹے اور بیٹیاں ہونے کے باوجود اگر مجھے کچھ دیر ہو جائے تو خود ہی ریتوں سے ٹھنڈا کھانا نکال کر زہر مار کر لیتا ہوں۔ میرے ملنے والوں اور دوستوں کو گھر آنے کی اجازت نہیں۔ اپنے گھر میں ہی میں ایک اجنبی بن کر رہ گیا ہوں۔ ان حالات سے گھبرا کر میں نے پہلے شراب اور پھر شی کے بالا خانے پر اپنے غم بھلانے چاہے۔ عارضی یا مصنوعی ہی سہی لیکن مجھے شراب اور شی نے سکون دیا۔ لیکن اس سکون کے حصول میں روپے کی ضرورت ہے جو آپ پوری کر رہے ہیں۔ آپ نے میرے تعاون کی بڑی معقول قیمت ادا کی ہے اور شی کے معاملے میں آپ نے جس طرح سے میری مدد کی ہے۔ اسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ آج میں آپ کو ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ جنرل کی سیف کے اندر ایک ایسا خانہ بنا ہوا ہے جو ایک علیحدہ جانی سے کھلتا ہے۔ ایک روز میں نے جنرل کو اس خانے میں ایک نقشہ، جس پر مختلف رنگوں سے نشان اور لکیریں لگائی گئی تھیں، اور چند کاغذات رکھتے ہوئے دکھلایا۔ جنرل اسی وقت میٹنگ سے فارغ ہوا تھا۔ جب مجھے ٹاپنگ کے لئے بلا گیا تو جو کچھ میں نے ٹائپ کیا اس کی کاپیاں بنا کر پردھان منتری اور نیول اور ایئر چیف ہیڈ کوارٹرز میں بھیج دی گئی تھیں اور ٹائپ شدہ اصل کاغذ جنرل نے نقشے کے ساتھ ہی رکھوا دیئے تھے۔ ٹائپ کرنے کی وجہ سے مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ پاکستان پر حملہ کرنے کا مفصل پلان تھا۔ وہ نقشہ اور کاغذات اب بھی سیف میں محفوظ ہیں اور میں کوشش کروں گا کہ وہ بھی آپ کو لادوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے اس کام کا بھی بہت معقول معاوضہ دیں گے۔“ لیثونت نے آج پہلی بار پاکستان سے میری وابستگی کا ذکر کیا تھا اور میں حیران تھا کہ آج سے پہلے اس نے یہ بات کیوں نہ کی حالانکہ بے تکلفی کے کئی ایسے وقت آئے تھے جب وہ یہ بات مجھ سے کر سکتا تھا۔ شاید میری دھمکیوں اور مسلح ساتھیوں کی گولیوں کے خوف نے اسے بولنے کی جرأت نہ دی تھی اور آج آخر وہ دل کی بات زباں پر لے لی آیا۔

میں نے اسے کہا ”دیکھو لیثونت یہی بہتر ہے کہ جیسے سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہم دونوں نے اس مسئلے پر کبھی بات نہیں کی، آئندہ بھی نہ کریں تمہیں صرف اتنا یقین دلانا ہوں کہ مالی تعاون کے علاوہ تمہاری سبھی اور سیکورٹی کا ذمہ بھی لیتا ہوں۔ اگر تم کسی مصیبت میں پھنس گئے تو تمہیں بچانے کے لئے بے شک ہمیں درجنوں لوگوں کی زندگی لینی پڑے گی۔ ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ جنگی نقشے اور متعلقہ کاغذات کا ہم تمہیں بہت معقول معاوضہ دیں گے بشرطیکہ وہ ہمارے لئے کارآمد ہوں۔ ٹھوڑی دیر مزید گفتگو کرنے کے بعد میں رسٹورنٹ سے چلا آیا۔ اب تک سب کام حسب نفاذ ہو رہا تھا۔ اب لیثونت کی طرف سے کامیابی کی خبر کا انتظار تھا اور میرا ایک لمحہ بھی خبر سننے کے انتظار میں بیٹھنے سے گزر رہا تھا۔

اس ملاقات کے بعد لیثونت نے میرے ساتھیوں کو مقررہ دنوں میں دوسرے ڈاک کے پیکٹ دیئے جن کی ہم نے حسب معمول کاپیاں اور نوٹوں بنا لئے۔ مجھے اچھی طرح سے یہ یاد ہے کہ جیسے کادون تھا سردی خاصی بڑھ چکی تھی۔ اور میں اپنے کمرے میں صوفے پر نیم درازا اخبار پڑھ رہا تھا۔ سہ پہر چار بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف میرا ایک ساتھی بول رہا تھا۔ خوشی سے اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے کہا صاحب ڈاک مل گئی ہے اور سب کام ہو گیا ہے۔ اس کی آواز سے ہی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ لیثونت نے معرکہ سر کر لیا ہے میں نے اپنے ساتھی کو کہا کہ فوراً گھر چلا جائے میں وہیں پہنچ رہا ہوں۔ خوشی کے مارے میرا ابھی برا حال تھا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کئے اور ٹیکسی لے کر ساتھیوں کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ سارے رستے میں یہی سوچتا رہا کہ خدانے ذوالجلال والاکرام کے کرم سے ہمارے رستے خود بخود کھلتے چارے ہیں اور مشکل سے مشکل کام اللہ پاک ہمارے لئے آسان کر رہا ہے۔ اور اتنی بڑی کامیابی ملنے کی وجہ محض اس ذات کریم کا رحم و فضل ہے۔

ساتھیوں کے گھر پہنچا تو انہوں نے دروازہ بند کر کے تھپلا میرے سامنے الٹ دیا۔ میرے سامنے فرش پر تارا پوری کے ایٹمی بجلی گھر اور ٹائٹا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی متعلقہ دو فائلیں۔ چار عدد ڈائریاں جن کے کور پر سرخ پٹی اور چار ستارے بنے ہوئے تھے اور ایک علیحدہ پیکٹ میں سے نکالے ہوئے کاغذات اور نقشہ اور معمول کی ڈاک پیکٹ پڑے تھے۔

انتہائی اہم معلومات کا خزانہ میرے قدموں میں پڑا تھا۔ سب رتبہ اعزاز کا کرم تھا کہ اتنے قلیل وقت میں اتنی کم محنت اور جدوجہد کے عوض بغیر کوئی جانی نقصان اٹھائے ہمیں اتنی بڑی کامیابی نصیب ہو گئی تھی۔ ہم پانچوں ساتھیوں میں کوئی بھی پیشہ ور جاسوس یا اس کام کا سابقہ تجربہ رکھنے والا نہ تھا اور ہم دشمن ملک کے دفاعی مرکز میں سیکورٹی کے مضبوط اور مربوط نظام کو توڑ کر نہ صرف انتہائی اہم دفاعی راز بلکہ دشمن کا جنگی پلان بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ہم نے سب سے پہلے بارگاہ رتبہ اعزاز میں شکرانے کے نفل ادا کئے اور پھر اس خزانے کی تفصیلاً جانچ پڑتال شروع کر دی۔

راہ حق کے شہید

تارا پوری کے ایٹمی پلانٹ کی فائلوں میں تاریخ وار افروزہ یورینیم کے پلانٹ سے ٹائٹا ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے جانے والے ریڈیو ایکٹیوٹی سے محفوظ ٹوکوں کی روانگی اور منزل پر پہنچنے کی تفصیلات اور دوران سفر سیکورٹی کے انتظامات کی تفصیل درج تھی۔ دوران سفر ایک بار ایک ٹرک کے بارش کی وجہ سے پھسلنے، الٹ جانے اور اس حادثے میں ٹرک ڈرائیور اور ایک سیکورٹی گارڈ (کمانڈو) کے ہلاک ہونے اور تین زخمی ہونے والے گاڈرڈ کے ریڈیو ایکٹیوٹی سے متاثر ہونے کے علاوہ تارا پوری پلانٹ کے چیف انجینئر اور ٹائٹا ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے سینیئر افسر ایچ ایچ ایچ کے لئے احتیاطی تدابیر یعنی خط و کتابت موجود تھی۔ ہر ٹرک میں لادے جانے والے افروزہ یورینیم کی سلاخوں کی تعداد اور وزن اور وصولی کی رسیدیں بھی موجود تھیں۔ ٹائٹا ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے چیف کے لکھے ہوئے دو خطوط بھی موجود تھے جن میں کامیاب ٹرائیٹیشن اور سیکورٹی کے FOOL PROOF انتظامات کرنے پر آرمی چیف کا شکر یہ ادا کیا گیا تھا۔ اپنے تجربہ بات کی کامیابی اور مغرب بھارتی افواج کو ایک ”تھم“ دینے کا مزہ بھی منایا گیا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان فائلوں میں درج معلومات کے پاکستان چھیننے پر پاکستانی سائنس دان بھارت کی ایٹمی ریسرچ میں کامیابی کی حدود متعین کرنے میں ضرور کامیاب ہو سکتے تھے۔ پاکستان واپسی پر مجھے اپنے ذرائع سے معلوم ہوا کہ راجستھان میں بھارتی ایٹمی دھماکے کا پاکستان کی TOP BRASS کو آٹھ ماہ قبل ہی علم ہو چکا تھا۔ راجستھان میں بھارتی افواج کی نقل و حرکت، خاصے بڑے علاقے کو RESTRICTED ZONE بنانے، آبادی کے اخلا اور سرنگوں کی کھدائی کے علاوہ ہماری جنگی فائلوں میں درج ٹائٹا ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں بھیجے گئے افروزہ یورینیم کے وزن سے ہمارے سائنسدانوں نے متوقع بھارتی ایٹمی دھماکے کے حجم کا صحیح اندازہ لگایا تھا اور ایک مفصل رپورٹ پاکستان کے اس وقت کے چیف انجینئر مسٹر ڈو الفکار علی بھٹو کو بھی بھیج دی گئی تھی۔ حکومت پاکستان نے UNO، امریکی صدر اور مسلم ملک کے سربراہوں کو بھی اس رپورٹ کی کاپیاں بھیجی تھیں۔ پاکستانی پریس نے بھی بھارت کے متوقع ایٹمی دھماکے کے بارے میں اس انداز میں کالم اور خبریں شائع کیں تھیں کہ پاکستانی قوم کے دلوں میں بے خبری میں اچانک بھارتی دھماکے کی ہشت نہ پیدا ہونے پائے۔ اس طرح بھارت کا چانک دھماکہ کر کے پاکستانی قوم میں خوف اور ہشت پیدا کرنے کا پلان بالکل ناکام ہو گیا اور اس پلان کی ناکامی میں ہماری بھیجی ہوئی معلومات کا بھی کچھ عمل دخل تھا۔

جنرلوں کی چارٹاپ سیکرٹ ڈائریاں میں بار بار دیکھتا تھا۔ ان ڈائریوں میں سقوط ڈھاکہ کے بعد بھارتی افواج کی نقل و حرکت سے متعلق احکامات کے علاوہ 6 نئے ڈویژن جن میں 5 انفنٹری اور ایک آرمڈ ڈویژن تھا، کے متعلق مکمل معلومات تھیں جن کے مطابق انفنٹری ڈویژن میں ہر ایک میں ایک چوتھائی پرانے ڈویژن کی نفری شامل کرنے اور اتنی ہی تعداد میں نئے ڈویژن کی نفری پرانے ڈویژن میں کھپانے کے احکامات تھے۔ اسکے علاوہ ایک نیا MOUNTAIN DIVISION (پہاڑی ڈویژن) RAISE کرنے کے احکامات بھی تھے۔ جو جدید ترین روی اسلحہ اور ہتھیاروں سے مسلح ہوگا۔ یہ ڈویژن یقیناً کشمیر کی عوام کی ”سروکھی“ کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ جو سقوط ڈھاکہ کے بعد اپنی آزادی کے خواب سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ ایک خط جنرل نے لپیٹا سیکرٹ کے بریکڈ کمانڈر کو لکھا تھا جس میں وادی لپیٹا پر قبضہ برقرار رکھنے کی سختی سے ہدایت کی گئی تھی سقوط ڈھاکہ سے پہلے وادی لپیٹا پاکستان کے زیر قبضہ تھی۔ سیز فائر لائن کو شملہ معاہدے کے وقت کنٹرول لائن کا نام دیا گیا۔ اندرا گاندھی نے سیز فائر لائن کو سیدھا کرنے کے بجائے وادی لپیٹا کو بھی مقبوضہ کشمیر میں شامل کر لیا تھا۔ اس وقت حکومت پاکستان کو ہمارے مجبوری بھارتی فیصلہ منظور کرنا پڑا کیونکہ اس جنگ کے دوران بھارت نے نہ صرف مغربی پاکستان کا بھی کچھ سرحدی ٹکڑا اپنے قبضے میں کر لیا تھا بلکہ ہمارے نوے ہزار فوجی بھی بھارت کی قید میں تھے۔ بھارت ان حالات میں پاکستان سے اپنی مرضی کے فیصلے کروانے کی پوزیشن میں تھا۔ پاکستان کو اپنے قیدی واپس لینے اور بھارت سے زیر قبضہ زمین واپس لینے کیلئے یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ بھارت سے واپسی پر مجھے ذوالفقار علی بھٹو کے ایک باڈی گارڈ راجہ رفراز جو کہ DSP تھے اور بعد میں DIG ہو کر ریٹائر ہوئے، پتہ چلا کہ شملہ معاہدہ آخر وقت تک کھٹائی کا شکار تھا۔ پاکستانی ڈپٹی گیشن میں شامل افراد نے واپسی کے لئے اپنا سامان پیک کر لیا تھا۔ صبح پاکستانی وفد کی واپسی تھی۔ اندرا گاندھی نے پاکستانی قیدیوں کی رہائی کے عوض پاکستان سے جو مطالبہ کیا تھا وہ اتنا بڑا تھا کہ پاکستانی قوم اور حکومت کبھی اسے تسلیم نہ کر سکتی تھی۔ رات کو کھانے کے بعد شملہ کے سرکٹ ہاؤس میں اندرا گاندھی اور بھٹو چھل قدمی کیلئے باغ میں گئے۔ وہاں پھر جنگی قیدیوں کا ذکر چھڑ گیا۔ بھٹو نے کہا ”مسز گاندھی۔ میں پاکستانی قیدیوں کی واپسی میں دلچسپی نہیں رکھتا ہوں۔ جنگی قیدی بننے کے بعد وہ افواج پاکستان کیلئے بیکار ہو چکے ہیں۔ اگر وہ پاکستان کو لوٹا دیئے گئے تو ہمیں انہیں ریٹائر کر کے نہ صرف پنشن دینی ہوگی بلکہ 90 ہزار روزگاروں کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جائے گا۔ بہتر ہے آپ انہیں اپنے پاس ہی رکھیں اور ریٹائر کونٹین کے مطابق انہیں رہائش، خوراک، لباس اور دوسری سہولتیں مہیا کرتی رہیں۔“ یہ بھٹو صاحب کا تڑپ کا جاتا تھا۔

اندرا گاندھی ایک تو ہندو عورت تھی۔ دوسرے 90 ہزار پاکستانی قیدیوں کو ہمیشہ کے لئے رہائش خوراک اور دیگر سہولتیں اور ان کی نگرانی پر اٹھنے والے اخراجات..... اندرا گاندھی یہ سن کر بالکل ہی ڈھے گئی اور ان سے اپنی ڈیمانڈ واپس لیتے ہوئے فوری طور پر شملہ معاہدہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ سوئے ہوئے سیکریٹریوں کو جگایا گیا اور رات دو بجے تک معاہدے کی نوک پلک سنوار کر اسے دستخطوں کے لئے دوسرے ہاؤس کو پیش کیا گیا۔ رات کے پہلے پہر معاہدے پر دونوں سربراہوں کے دستخط ہوئے۔

غازی

ڈکروادی لیبیا کا ہو رہا تھا۔ کنٹرول لائن کے نقشے میں وادی لیبیا بھارت کے پاس چلی گئی تھی۔ اس سیکٹر کا پاکستانی کمانڈر ایک ٹرورسور پھر پاکستانی بریگیڈیئر تھا۔ وادی لیبیا تو بھارت کو دے دی گئی لیکن یہی بات بریگیڈیئر کے دماغ میں منت نہ بیٹھ سکی۔ اس نے خفیہ طور پر اپنی تیار کی جاری رکھی اور ایک رات اپنے پورے بریگیڈ کی طاقت سے وادی لیبیا پر حملہ کر دیا۔ بھارتی جنرل کا اپنے بریگیڈیئر کے نام خط ہمارے ہاتھ لگ چکا تھا جس میں اسے وادی لیبیا پر ہر حالت میں قبضہ برقرار رکھنے کا حکم دیا تھا۔ وہاں بھارتی فوج بھی چوکی اور بلندی پر یکے مورچوں میں تیار 2- STAND پوزیشن میں تھی۔ گھسان کا رن پڑا۔ حملہ رات کے وقت شروع میں کیا گیا تھا اور صبح تک بھارتی افواج کے ایک ہزار سے زیادہ جوان اور افسر پاکستانی مجاہدوں کی گولیوں کا شکار ہو چکے تھے جب کہ پاکستان کے تقریباً چار سو جوان اور افسر اس معرکے میں شہید ہوئے۔ صبح تک پاکستانی افواج نے نہ صرف وادی لیبیا بلکہ وادی کے اردگرد پہاڑیوں پر بھی جہاں بھارتی افواج نے کچے بکریز بنا رکھے تھے، قبضہ کر لیا۔ بھارت خاموشی سے اپنی اس شکست کو پی گیا۔ وادی لیبیا اور اس کے گرد و نواح کی پہاڑیاں آج تک پاکستان کے قبضے میں ہیں۔ وادی لیبیا میں شہید ہونے والے مجاہدوں کی بہادری کے اعتراف میں پشاور اور نوشہرہ کے علاوہ کشمیر کے کئی جمنٹل سینٹرز میں لیبیا میس بنائے گئے ہیں۔ چونکہ یہ ایک غیر اعلیٰ حملہ تھا اور ہائی کمانڈ کی اجازت کے بغیر کیا گیا تھا۔ اسلئے بہادری کے مجید اعتراف کا رٹا مے دکھانے والوں کو میڈل تو نہ دیے جاسکے لیکن ان کی بہادری کے واقعات نے پاکستانی قوم کو قیامت ان کا ممنون احسان بنا دیا۔

بھارت سے واپسی کے بعد ایک روز میں پشاور لیبیا میں گیا۔ ایک کمرے میں سے نسیم بیگم کے انتہائی پرسوز قومی ترانے کی آواز آرہی تھی۔ ’اے راہ حق کے شہیدو، وفا کی تصویر تو ہمیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں‘..... میں دروازہ کھٹکھا کراس کمرے میں داخل ہو گیا۔ ایک کپٹن نے ریکارڈ پلیئر پر یہ ریکارڈ لگا رکھا تھا۔ تعارف کے بعد اس نے بتایا کہ لیبیا پر حملے کے وقت وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ اس کی کپٹنی ایڈوانس پوزیشن میں تھی۔ جب وہ دشمن کی ہیوی مشین گنز کی ریش میں پھنسی ہو دشمن نے چاک ان پر فائر کھول دیا۔ 137 کی کپٹنی میں سے صرف 5 زندہ بچ گئے جن میں سے ایک وہ بھی تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریر تھیں۔ آپ یقین نہیں کر سکیں گے کہ ہم کس بے جگری سے لڑے۔ بھارت کے بکروادی کی پہاڑیوں اور ٹیلوں میں بنے ہوئے تھے اور انہیں خاموشی سے کرنی کی ہمیں کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ہمارا ایڈوانس رک چکا تھا اور بھارت کو کسی لمحے بھی مکمل تھی۔ ہماری کپٹنی کے چند جوانوں نے بھارتی بکریز کو خاموش کرنے کا بیڑا اٹھایا اور وہ ایک محفوظ جگہ سے ان پہاڑیوں اور ٹیلوں پر پہنچ گئے، جن میں بھارتی بکریز بنے ہوئے تھے جو پینڈ گریڈ ان کے پاس تھے وہ پین نکالنے کے بعد 6 سیکنڈ میں پھٹتے تھے۔ ان ٹیلوں اور پہاڑیوں سے انہوں نے گریڈ نیچے پھینکے لیکن 6 سیکنڈ میں وہ بھارتی بکریز سے بہت نیچے جا کر پھٹتے تھے۔ ان بکریز میں ہیوی مشین گنوں کے علاوہ ساڑھے تین انچ کے مارٹر گولہ بارود اور بھارتی فوجی موجود تھے۔ ہمارے جوانوں نے آپس میں مشورہ کیا اور خود سے اپنا اور بھارت کے بکریز کے فاصلے کا اندازہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ گریڈ نیچے کی پین نکال کر اور

یور سے اگلو ہانا کر دو جا سیکنڈ گریڈ نیچے کواپنے ہاتھ میں رکھیں گے اور پھر بھارتی بکریز کی طرف اچھا ل دیں گے۔

اس PROCESS کے دوران گتی کی ٹائمنگ میں غلطی کی وجہ سے ہمارے ایک جوان کے ہاتھ میں ہی گریڈ نیچے پھٹ گیا اور وہ شہید ہو گیا۔ باقی پانچوں نے صحیح ٹائمنگ پر گریڈ نیچے پھینکے اور وہ بالکل صحیح جگہ پر پھٹے۔ گریڈ نیچوں سے تو بھارتی نقصان ہوا لیکن بھارتی بکریوں میں موجود گولہ بارود پھٹنے سے قیامت پیا ہو گئی۔ ٹیلوں اور پہاڑیوں کا اوپری حصہ بھارتی گولوں اور گولہ بارود کے دھماکوں کی وجہ سے پھٹ گیا اور بھارتی سوراخوں کی جلی ہوئی لاشیں فضا میں دن گز سے زیادہ بلند ہو کر زمین پر گرنے لگیں۔ ہمارا ایک جوان ایک ایسی ہی جلس لاش کی زد میں آ کر اپنا زوتہ وا بیٹھا۔ صبح سویرے وادی لیبیا اور اردگرد کی پہاڑیوں اور ٹیلوں پر پاکستانی پرچم ہانے لگا اور بھارت اپنے نقصان سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ وادی لیبیا کی یادداشت سے ہی نکل گئی اور اس نے یہ وادی واپس لینے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میں کپٹن کے جذبات کو سراہتے ہوئے میں سے باہر چلا آیا لیکن وادی لیبیا کے پس منظر میں ’اے راہ حق کے شہیدو، وفا کی تصویر تو ہمیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں‘، نسیم بیگم کا گایا ہوا یہ ترانہ گئی روز تک میرے کانوں میں گونجتا رہا۔

بات ہو رہی تھی جزلوں کی چارڈائریوں کی۔ ان ڈائریوں کا ایک ایک صفحہ پیش قیامت سے بھرا ہوا تھا۔ سب سے اہم چیز بھارتی حملے کا مکمل پلان اور بھارتی بارڈر پر بھارتی فوجوں کی پوزیشن، چار مختلف جگہوں سے بیک وقت حملہ کرنے کی ARROW بنا کر نشان دہی، حملہ آور فوجوں کیلئے ٹوپ خانے کا کور، انٹیلیجنٹی ڈویژن میں پہلے سے موجود ٹیکر رجمنٹس کی تعداد ایک پورے ٹیک ڈویژن کا سا کلاٹ اور لاہور سیکٹر پر بیک وقت حملہ اور پاکستانی افواج کے ہتھیاروں کی جانچ کیلئے جگہوں کا تعین کیا گیا تھا۔ اس نقشے اور متعلقہ کاغذات میں ان کی تفصیل دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم بھارتی کمانڈ کے

OPERATION ROOM میں موجود ہیں۔ جہاں جنگ کے دوران ہر ایک تفصیل موجود ہوتی ہے۔ کاغذات کے مطابق بھارتی نیوی اور ایئر فورس نے کراچی کو اپنی گولہ باری کا نشان بنا نا تھا اور صوبہ سندھ کا سرک اور ریل سے باقی پاکستان سے رابطہ کا نشانہ تھا۔ بھارتی BORDER SE-(BSF) CURITY FORCE کا قاعدہ افواج کے ساتھ مل کر حیدرآباد اور کراچی پر قبضہ کرنا تھا۔ بھارتی وزیر اعظم کو بھیجے گئے خط میں یقین دہانی کرائی گئی تھی کہ اگر پلان کے عین مطابق حملہ کیا گیا تو کامیابی 80 فیصد یقینی تھی۔ کامیابی کی صورت میں متنوع علاقوں میں فوجی گورنر مقرر کرنے کیلئے چند جرنیلوں کے ناموں کی سفارش کی گئی تھی۔ ڈاک کے پیکٹ میں حسب معمول اہم نوعیت کے خطوط تھے۔

میں نے ساتھیوں کو فوری طور پر ان سب کی تصویریں اور کاپیاں بنانے پر لگا دیا۔ نقشے کی بھی کئی تصویریں اتاری گئیں لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس نقشے کی وہ ہو کاپی بنائی جائے۔ نقشے کی کاپی کیسے بنائی جاتی ہے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر شہر میں کتابوں اور نقشوں کے ایک بڑے اسٹور پر چلا گیا۔ وہاں ہر جگہ کے نقشے موجود تھے۔ میں نے حرا کمال کے ایک نسبتاً غیر معروف جزیرے پابنیو کا نقشہ مانگا جو بڑی تلاش کے بعد سلیز میں نے مجھے لاکر دیا۔ میں نے کہا کہ مجھے اس جیسے 6 اور نقشے درکار ہیں۔ سلیز میں نے معذرت کی کہ صرف ایک ہی نقشہ موجود ہے۔ میں نے کہا کہ نقشے کو وہ ہو کاپی کرنے کیلئے جو کاغذ استعمال ہوتا ہے مجھے وہ چاہئے اس نے اس کاغذ کا نام غالباً TRACING PAPER بتایا۔ میں نے اس کاغذ کا ایک رول 12 انچ اور چوبیس انچ کیلئے، پرکار مختلف اقسام کی پینسل اور مختلف رنگوں کے HI-LI-TER ایک بورڈ اور نقشے کو بورڈ پر لگانے کے لئے پین خرید لیں اور ساتھیوں کے گھر لوٹ آیا۔ کاپی کرنے والے کاغذ کا رول شفاف تھا۔ اسے نقشے کے اوپر جما کر لگانے سے نقشہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ میں نے میٹرک تک جو میٹری پڑھی تھی اور ایسی ابتدائی علم کی بنا پر میں نے نقشے کی دو کاپیاں بنانے کا کام سنبھالا۔ یقین

جانے کہ میری زندگی میں نقشے کی کاپی بنانے کی یہ پہلی کوشش تھی۔

میں نے لکڑی کے بورڈ پر نقشہ اور اس کے اوپر TRACING PAPER تپوں سے جما کر لگا دیا اور اللہ کا نام لے کر نقشے میں بنی پاکستان اور بھارت کی بارڈر لائن بنائی اور چند گھنٹوں کی محنت کے بعد نقشے کو وہ ہو کاپی ہر ایک تفصیل اور رنگوں کے TRACING PAPER پر منتقل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ چند منٹوں کے توقف کے بعد میں نے دوسرے TRACING PAPER ایسی نقشے کی ایک اور کاپی بنانے کے لئے لگایا۔ اتنی بڑی کامیابی نے ہمیں بھوک اور تھکن کا احساس بھی نہ ہونے دیا تھا۔ ہمارا ایک ساتھی ہر گھنٹہ کے بعد چائے اور لکٹ ہمیں پیش کرتا تھا جس سے ہم تر تازہ ہو جاتے تھے۔ میرے نمبر ٹو نے بتایا کہ چھوٹے کیمرے کی فلمیں ختم ہوئی چاہتی ہیں۔ میں نے ان فلموں کے رول پر تحریر ان کا سائز اور کپٹنی کا نام پڑھ کر اپنے نمبر ٹو کو کہا کہ کناٹ سرکس میں کوڈک کی ایجنسی اور سیل شاپ ہے وہاں جا کر پتہ کرے شاید اس سائز کی فلم وہاں مل جائے۔ میں نے اسے کیمرے میں پڑنے والے سیل بھی لانے کا کہا۔ ایک گھنٹے کے اندر ہی میرا نمبر ٹو خوش خوش واپس لوٹا اس نے سیل شاپ میں اس سائز کی موجود ساری کی ساری 32 فلمیں خرید لی تھیں اور کیمرے کیلئے فائو سیل بھی لے آیا تھا۔ ہم اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ سلیٹوں سے دھڑا دھڑکا پیاں بن رہی تھیں۔ کیمرے سے ہر ہر صفحے کے دو دو فوٹو بنائے جا رہے تھے اور میں نقشے کی دوسری کاپی بنانے میں مشغول تھا۔ جب ہم نے کام ختم کیا تو آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی اب ہمارے پاس ڈائریوں کے ہر صفحے کی دو کاپیاں اور کیمرے سے اتارے گئے دو دو ٹکس موجود تھے۔ تا راپور کی فائلوں کی بھی دو دو کاپیاں اور دو دو ٹکس موجود تھے۔ نقشے کی وہ ہو کاپی TRACING PAPER پر بن چکی تھیں۔ کام ختم ہوا تو ہمیں بھوک اور تھکن کا احساس ہوا۔ میرے ساتھیوں نے بتایا کہ گھنٹہ گھر کے قریب ایک درمیانے درجے کا ریسٹورنٹ رات بھر کھلا رہتا ہے۔ میں نے ایک ساتھی کو کھانا لانا اور دوسرے کو اسے کور دینے کے لئے بھیجا اور ان کے آنے سے پہلے ہم نے بیٹھنے کی واپس کرنے والی فائلیں، نقشے اور متعلقہ کاغذات، ڈائریاں اور ڈاک علیحدہ کر کے تھیلے میں ڈال دیں۔

پاکستان بھیجنے والی ڈاک، نقشہ، ڈائریوں کی کاپیاں اور فلم رول علیحدہ کر کے ایک پیکٹ بنایا اور اپنے پاس رکھنے والی کاپیاں اور نقشہ بنا کر اسے الگ پیکٹ میں بند کر دیا۔ جب ہم کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو رات اتنی گزر چکی تھی کہ میں نے ساتھیوں کے ہمراہ ہی شب بسر کی کا فیصلہ کیا۔ بیٹھتے کو ڈاک واپس کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ میں نے ایک چٹ پر اسے اگلے دن یعنی اتوار کو شام 7 بجے چاؤ کی بازار کے ریسٹورنٹ میں ملنے کے لئے کہا اور ساتھیوں سے کہا کہ علی الصباح ڈاک کا تھیلہ اور میری چٹ بیٹھتے کو گھر پر پہنچادیں۔

اگلی صبح جب میں بیدار ہوا تو آٹھ بج چکے تھے اور میرے ساتھی بیٹھتے کو ڈاک کا تھیلہ دے کر واپس آچکے تھے۔ ناشتہ کرنے کے بعد میں اپنے ہوٹل روانہ ہونے ہی والا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ 10 بجے پاکستان سے ہمارا وائرلیس پر رابطہ ہونا ہے۔ میں نے وائرلیس آپریٹر کو کہا کہ رابطہ ہونے پر MESSAGE RECEIVED-ALL OK کے علاوہ کوڈ میں JACK POT-SEND MOST RELIABLE TO COLLECT کی ٹرانسمٹ کیجئے۔ یہ پیغام بھیجنے کے بعد میں اپنے ہوٹل چلا آیا اور لمبی تان کر سون گیا۔ شام کو مجھے بیٹھتے سے ملنا اور اس کی ’آرزو‘ کی تکمیل کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا تھا۔

شام کو میں نے ہوٹل کے لاکر سے پیسے نکالے اور 7 بجے چاؤ کی بازار کے ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا بیٹھتے میرے انتظار میں وہاں پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ آج اس کی حالت دیدنی تھی۔ اپنی آرزو کی تکمیل اتنے قریب آنے کی خوشی اور جو کام وہ کر بیٹھا تھا اس کا خوف بیک وقت اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ ان دونوں کیفیتوں پر قابو پانے کی کوشش میں اس نے بہت زیادہ جھجھکا تھی۔ میں نے اسے اس کی کامیابی پر مبارکبادی تو وہ کہنے لگا ’صاحب جس روز جنرل صاحب چھٹی سے واپس آئے اسی روز اپنی ڈاک پڑھنے کے بعد انہوں نے مجھے ٹائپنگ کیلئے بلا لیا۔ میں نے جنرل صاحب کی مظلوم فائل نکالنے کیلئے سیف کھولی تو سیف کی چابیاں بجائے سیف کے تالے میں چھوڑنے کے انہی جب میں ڈال لیں اور ٹائپ کرنے کے دوران تینوں چابیوں کے نقش صاف نظر آئے اور جب کام ختم ہو گیا تو سیف بند کر کے چابیاں جنرل صاحب کو لوٹا دیں۔ چابیوں کے نقش تو میرے پاس تھے لیکن چابیاں ہوائے میں بہت دشواری پیش آئی۔ چابیاں بنانے والی کانوں پر لگوا تو انہوں نے نقش کی کاپی بنانے سے انکار کر دیا۔ ایک اور مکان پر گیا تو اس نے کہا یہ خطرناک کام ہم نہیں کرتے۔ جھٹ لال میاں میں بشیرا گریج والے کے پاس جاؤ۔ میں بھٹ لال میاں میں اڈھوٹا ہوا، بشیرے کی گیرج پر پہنچا تو اس نے نقش دیکھ کر پوچھا کہ کس نے بھیجا ہے۔ میں ڈرا ہوا تو بہت تھوینوی کہہ دیا کہ بڑے صاحب نے بھیجا ہے۔ بشیرے کو مجھے کچھ یاد آ گیا۔ کہنے لگا اچھا تو بڑے صاحب کو پھر کوئی سیف کھولی ہے۔ میں نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا تو بشیرا مجھے گریج کے پھیلے حصے میں لے گیا۔ جہاں لیٹھ مشین لگی ہوئی تھی۔ دو گھنٹے میں اس نے تینوں چابیاں بنا کر مجھے دے دیں اور کہا کہ بڑے صاحب کو کہنا کہ مال میں میرا حصہ نکال کر الگ رکھ دیں۔ میں کسی کو بھیج کر منگوا لوں گا۔ خود یہاں نہ آئیں۔ لوگ تنگ کرتے ہیں۔ میں حیران اور سرسہمہ تھا کہ جس بڑے صاحب کے مفالطے میں بشیرے نے چابیاں بنا کر دی ہیں جب انہیں پتہ چلے گا تو معلوم نہیں وہ میرے ساتھ کیا سلوک کریں۔ چابیاں لے کر میں بھاگ بھاگ اس علاقے سے نکلا اور فیصلہ کر لیا کہ آئندہ کبھی بھٹ لال میاں نہیں جاؤں گا۔ ہفتے کو کام کا آدھا دن ہوتا ہے جنرل صاحب کے جانے کے بعد بھگوان کا نام لیکر میں ان کے کمرے میں گیا۔ چابیاں بالکل صحیح بنی تھیں۔ سیف کھولنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی اور چند منٹ میں، میں فائلیں، ڈائریاں، نقشے اور کاغذات اپنے تھیلے میں ڈال کر کمرے سے باہر آ گیا۔ اب ایک مشکل باقی ہے کل سوموار کو مجھے دفتر جلد جا کر جنرل صاحب کے آنے سے پہلے سب چیزیں سیف میں واپس رکھنی ہیں۔ بیٹھتے نے مجھے یہ سب تفصیل اپنی بہادری دکھانے اور مجھ سے داد پانے کیلئے سنائی تھی۔ میں نے بھی اسے پھر پورا داد دی اور کہا کہ جب اتنا مشکل مرحلہ تم نے خوش اسلوبی سے طے کر لیا تو باقی بھی بہت آسانی سے کرو گے۔

میں چائے پی رہا تھا اور بیٹھتے کو میری خاموشی کھٹک رہی تھی۔ کہنے لگا ’صاحب آپ کا کام تو میں نے سر ہتھی کر رکھا پورا کر دیا ہے۔ اب وہ شمی.....‘ اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔ وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں خاموشی سے اس کی اس امید و بیم کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے خاموشی سے چائے ختم کی۔ میری خاموشی کا چند منٹ کا وقفہ بیٹھتے کیلئے صدیوں پر بھاری پڑا تھا۔

اس نے میرا بازو تھام کر ملتانیانہ لہجے میں کہا ’صاحب آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔‘ میں مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور کہا ’بیٹھتے باوقم نے ہمارا کام کیا اور اب ہم تمہارا کام کرتے ہیں۔‘ یہ سن کر بیٹھتے بھی میرے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا۔ ریسٹورنٹ کا بل ادا کر کے ہم باہر آ گئے۔ میں نے اسے آگے آگے چلنے کا کہا تھوڑی دیر میں ہی بیٹھتے اور میں شمی کے بالا خانے پر پہنچ گئے۔ ہم نے شمی کی ماں کو پوچھ کر لے کر بیٹھتے کے بیٹھنے والے جوشی کی ماں کے سامنے پہلے پھیل گئی بنا بیٹھا رہتا تھا۔ آج اس کے انداز ہی کچھ اور تھے اور وہ بڑھ چڑھ کر ہاتھیں کر رہا تھا۔ کافی دیر تک وہاں معاملات طے ہوتے رہے۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ شمی کی ماں کو اپنی اہل مال مزید تیس ہزار روپے دیئے جائیں اور بقیہ رقم رسم کے طے ہونے کے دن اسے دی جائے گی۔ میں نے بیس ہزار بیٹھتے کو دیئے اور بیٹھتے نے وہ فوراً ہی شمی کی ماں کو دے دیئے۔ بیٹھتے نے مطالبہ کیا کہ آج محفل کے دوران شمی کی ماں تمام تماش بیٹوں کے سامنے اس رسم کا اعلان کرے۔ شمی کی ماں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں نے بیٹھتے کے مطالبے پر دو ہزار سے دیئے۔ بیٹھتے وہیں بیٹھ گیا اور میں واپس چلا آیا۔ واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ ’زر، زمین اور زن ہی ہر فرد کی جز ہے‘ میں لفظ وطن سے فطرتی بھی فساد کے ساتھ شامل کر لیا جائے تو بہت مناسب رہے گا۔

اگلے دو روز میں بالکل فارغ رہا منگول بیٹھتے نے حسب معمول ڈاک میرے ساتھیوں کو دی جس کی کاپیاں بنا کر ڈاک اسے لوٹا دی گئی۔ اب مجھے آئندہ بدھ کو پاکستان سے وائرلیس پیغام کا انتظار تھا۔ بدھ کی صبح ہی میں ساتھیوں کے گھر چلا گیا۔ مقررہ وقت پر وائرلیس سیٹ آن کیا۔ رابطہ قائم ہونے پر پاکستانی پیغام ملا جسے ڈی کوڈ کیا گیا۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ آئندہ اتوار گیارہ بجے ایک ایجنٹس کوریئر جسے میں جانتا ہوں، اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مجھے سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن پر لے گا۔ تمام ڈاک اس کے حوالے کر دی جائے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ جنرل کی سیف سے حاصل شدہ نقشے، ڈائریوں اور فائلوں کی ایک ایک کاپی کے علاوہ بیٹھتے سے متعلقہ تصاویر کی بھی ایک ایک کاپی اپنے پاس رکھی جائے اور شروع سے اب تک مشن کے دوران اپنے پاس رکھی جانے والی سب کاپیاں بھی پاکستان بھیج دی جائیں۔ ہم نے یہ کاپیاں اپنے پاس محض اس لئے رکھی تھیں کہ خدا نخواستہ اگر کوئی بیٹھتے دوران سفر پکڑا جائے تو حاصل شدہ معلومات ضائع ہونے سے بچ جائیں اور ہم دوبارہ انہیں پاکستان پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس بار بھی جنرل کی سیف سے حاصل شدہ انتہائی اہم معلومات کی ایک ایک کاپی اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا کہ اتوار کو ڈاک لے جانے والے ایجنٹس کوریئر اگر کسی مشکل سے دوچار ہو جائیں تو معلومات کا یہ خزانہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔ گزشتہ تمام ڈاک کی ریزرو کاپیاں بھیجنے کا ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمارے پاس کاپیوں کا ذخیرہ کسی اچانک خطرے کی صورت میں ہماری MOBILITY کو کم کر سکتا تھا اور پکڑے جانے کی صورت میں ہمارے خلاف ایک مکمل ثبوت بن سکتا تھا اس کے علاوہ ہماری حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں دشمن اپنے منصوبوں کو تبدیل کر سکتا تھا یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ گزشتہ تمام کاپیوں کو تریب دے کر ایک علیحدہ پیکٹ بنا لیں۔ شام تک یہ کام بھی مکمل ہو گیا۔ ایجنٹس کوریئر کی آمد تک میں نے ساتھیوں کو ماسوائے بیٹھتے سے ڈاک لینے کے سب سرگرمیاں معطل کرنے کا کہا اور اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔

غازی

یونٹ کی رسم کی ادائیگی آئندہ ہفتے کی شام ٹھہری تھی۔ میں نے یونٹ کو بقیہ رقم بھی دیدی۔ میرے پاس دو تین روز فراغت کے تھے۔ چاند کی چوڑھویں تاریخ بھی دو دن بعد تھی۔ میں نے تاج محل آگرہ دیکھنے کا پروگرام بنایا اور اگلے صبح آگرہ کیلئے ٹرین پکڑ لی۔

انتہائی احتیاط اور حاضر دماغی کے باوجود اس سفر کے دوران مجھ سے ایک ایسی غلطی ہوئی جس کے متعلق میں آج بھی سوچتا ہوں تو ہنسی بھی آتی ہے اور اپنی غلطی کا متوقع انجام سوچ کر کانپ اٹھتا ہوں۔ ریل کا سفر میں ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ تھر ڈکلاس میں کروں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رش کی وجہ سے ہر کوئی جگہ بنانا اور اپنے سامان کی فکر میں مصروف ہوتا ہے اور دوسرے مسافروں کی طرف کم ہی متوجہ ہوتا ہے۔ مجھے ڈبے میں کھڑکی کے ساتھ منگول سیٹ ملی۔ میرے سامنے کی منگول سیٹ پر ایک ہندو برہمن ماتھے پر تلک لگائے اسی دھوئی ہانڈ باندھے بیٹھا تھا۔ آگرہ پہنچنے سے قریب آدھ گھنٹہ قبل اس برہمن نے ڈھکن والی پینٹل کی چمکتی ہوئی گڑوی نکالی اور ہاتھ کی اوک میں پانی اٹھیل کر پینے لگا۔ میری پیاس بھی اچانک جاگ اٹھی۔ میں نے اس برہمن کو کہا۔ ”مہاراج اگر کشت نہ ہو تو ہمیں بھی جل پینے کو دے دیویں۔“ برہمن نے گڑوی میری طرف بڑھادی۔ میں نے پانی اپنے ہاتھ کی اوک بنا کر پینا چاہا تو سارا پانی میرے ہاتھ کی انگلیوں کے خلا سے نیچے بہنے لگا۔ برہمن مجھے اس مشکل صورت میں گھرا دیکھ کر مسکرایا اور مجھے کہا ”مہاشے آپ گڑوی کو منہ لگا کر جل پی لیں۔“ میں نے گڑوی کو منہ لگا کر سیر ہو کر پانی پیا اور شکر یہ کے ساتھ اسے گڑوی واپس کر دی۔ میں کھڑکی سے گزرتے ہوئے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک کوئلے کا ایک ذرہ میری ناک میں گھس گیا (بھارت میں اکثر ریلوے انجن کوئلے سے چلتے ہیں) مجھے چھینک آئی اور بے اختیار میرے منہ سے الحمد للہ نکلا۔ برہمن نے مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے غصے بھری آواز میں پوچھا ”تم مسلمان ہو؟“ اسے اپنی گڑوی کے ٹھہرٹھ سے ہوجانے کا تم اور غصہ تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سوچا تو میں نے اسے سرگوشی میں کہا ”خاموش رہو۔ اس ڈبے میں کچھ پاکستانی جاسوس سفر کر رہے ہیں۔ صرف انہیں متوجہ کرنے کیلئے میں نے یہ لفظ کہا ہے میں دہلی میں آئی بی (INTELI GENCEBU REAU) کا آفیسر ہوں اور دہلی سے ہی انہیں پہچاننے کی کوشش میں ہوں۔ برہمن حیران و ششدر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پانے کی پوری کوشش کی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہم دونوں اسی کیفیت کا شکار تھے کہ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ یہ اسٹیشن ریلوے کی منڈی تھا یعنی آگرہ کا مول اسٹیشن۔ اگلا آگرہ چھاؤنی تھا۔ میں ریل کے ڈبے سے باہر آ گیا۔ تاج محل دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ حالات کے تحت میں نے تاج محل کی سیر کا پروگرام ملتوی کیا۔ چند منٹوں میں ہی گاڑی روانہ ہوئی اور میں واپس دہلی جانے والی گاڑی کے انتظار میں ویننگ روم میں بیٹھ گیا۔ واپسی کیلئے میں نے بیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور شام ڈھلنے سے پہلے دہلی پہنچ گیا۔

واپسی کے سفر کے دوران بھی میں پریشان رہا۔ دہلی پہنچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ آگرہ جانے اور تاج محل دیکھنے کا پروگرام دو تین ماہ کیلئے بھول جاؤں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ آئندہ چند روز میں ہی میرے ساتھیوں کو ایک ہنگامی مشن پورا کرنے کیلئے آگرہ جانا پڑے گا۔

اگلے روز صبح دس بجے عبدالکریم میرے ہوٹل میں آیا۔ اس نے بتایا کہ کرنل شکر دودن آگرہ میں رہ کر گزشتہ شام واپس لوٹا ہے۔ رات کو نشتے میں کہہ رہا تھا کہ آگرہ سے پہلے پکڑے گئے پاکستانی جاسوسوں کا واقعہ ابھی ٹھنڈا بھی ٹھنڈا بھی نہیں ہوا تھا کہ دو دنے پاکستانی جاسوس آگرہ میں پکڑے گئے ہیں۔ ہیڈ کوارٹر ذکی طرف سے اسے اس سلسلے میں آگرہ جانا پڑا۔ بھارتی انٹیلیجنس کا شکوہ کر رہا تھا کہ جس جگہ انہیں قہقہے کیلئے رکھا گیا ہے وہ ریلوے کی منڈی کے ریلوے اسٹیشن سے آگرہ کی جانب بنے ریلوے ڈائریکشنل کے ساتھ ہی واقع ہے اور اسے ریسیور کرنے والے DMI (DIRECTORE MILITARY INTELLIGENCE) کے آڈیوں نے ریلوے اسٹیشن سے لے کر سیف ہاؤس تک ریلوے پٹری کے کنارے کنارے سے پیدل چلایا۔

عبدالکریم نے اپنے متعلق پھر میری منت سماجت شروع کر دی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ میں جلد ہی اس کیلئے کچھ کروں گا۔ کچھ اور باتیں کرنے کے بعد میں نے اسے دوسروں پر دے دیئے اور رخصت کر دیا۔ منے پاکستانی جاسوسوں کے پکڑے جانے کی خبر نے مجھے پشیمردہ کر دیا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کے گھر چلا گیا اور انہیں خبر سنائی۔ میرے ساتھی جوان تھے، بڈر تھے اور جڈ بہ جب الوطنی سے سرشار تھے۔ یہ بات سن کر بھڑک اٹھے اور کہنے لگے کہ ان جاسوسوں کو چھڑوانے کیلئے ہمیں فوری کارروائی کرنی چاہئے۔ میرے تین ساتھی غیر شادی شدہ تھے۔ ان میں سے ایک کہنے لگا ”سر جب سے ہم بھارت میں داخل ہوئے ہیں ہم نے ذہنی طور پر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک اپنے وطن کی حرمت اور حفاظت کیلئے نچھاور کر دیں گے۔ جو پکڑے جا چکے ہیں وہ بھی ہمارے بھائی ہیں اور یقیناً یہی جذبہ پیکر وہ بھارت میں داخل ہونے والے ہوں گے۔ اگر ہم انہیں بچانے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارے لئے یہ اپنے مشن میں کامیابیوں سے زیادہ اہم ہوگا۔“ پوچھے ساتھی نے کہا ”سرا اگر خدا نخواستہ آپ یا ہم میں سے کوئی پکڑا جائے اور باقی ساتھیوں کو اس جگہ کا علم ہو جائے تو کیا ہم یونہی خاموش بیٹھے رہیں گے۔ گرفتار ہونے والے بھی ہمارے اپنے ہیں اور انہیں چھڑوانے کیلئے ہمیں کوئی دقیقہ فرگزاہت نہیں کرنا چاہئے۔“ میں نے انہیں کہا کہ میں ان کے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں لیکن ہمیں جوش کے ساتھ ساتھ ہوش سے بھی کام لینا چاہئے۔ پورے بھارت کی آبادی میں ہم پانچ ہی ایک دوسرے کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ ہمیں یہاں صرف اپنے مشن کو پورا کرنے کیلئے بھیجا گیا ہے۔ اگر ہم اپنے سینئر ذکی ہدایات کیخلاف گرفتار شدہ جاسوسوں کو چھڑوانے کا فیصلہ بھی کر لیں تو ہمیں پہلے چند باتوں کو مد نظر رکھنا ہوگا سب سے پہلے یہ کہ ان جاسوسوں کی نگرانی پر کتنے پہرے دار متعین ہیں اور ان کے پاس کس قسم کا اسلحہ ہے۔ نمبر دو یہ کہ بھارتی تشدد کے بعد وہ اس قابل بھی ہیں کہ جرات سے چھوٹنے کے بعد فرار ہو سکیں۔ نمبر تین یہ کہ وہ فرار ہو کر کہاں جائیں گے۔ پاکستان کی طرف کا بارٹو بھارت سے ان کے فرار ہونے کے فوراً بعد تیل کر دیا جائے گا۔ پہرے داروں سے بغیر مقابلہ کہ ہم ان کو جرات سے چھڑوائیں سکتے۔ مقابلے میں ہم نچھی اور گرفتار بھی ہو سکتے ہیں اور ایسی صورت میں ہمارا سارا مشن الٹ پلٹ ہو سکتا ہے۔ میں تو انہیں سمجھا بھجا کر واپس لوٹ آیا۔ میرے وہ دو گمان میں بھی نہ تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ خود ہی ساری منصوبہ بندی کر کے میری اجازت اور علم کے بغیر ہی اس پر فوری طور پر عمل پیرا ہو جائیں گے۔

اگلے دن صبح کے دس بجے میرے نمبر ٹوکافون آیا۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں مجھے فوری طے کیلئے کہا۔ میں حیران تھا کہ ایسی کیا ایمر جنسی پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے اسے مغل محل ریستورنٹ میں 11 بجے طے کہا۔ مقررہ وقت پر جب میں ریستورنٹ میں پہنچا تو وہ باہر ہی میرا انتظار کر رہا تھا۔ ریستورنٹ ابھی ابھی کھلا تھا۔ میں اسے ریستورنٹ میں ایک گوشے کی ٹیبل پر لے گیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا اور پریشان تھا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ جو کچھ اس نے بتایا اسے سن کر میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے کہا کہ گزشتہ رات سے ہمارے تینوں ساتھی غائب ہیں۔ اس نے کہا کہ رات بارہ بجے تک وہ یہی سمجھتا رہا کہ تینوں قلم کا آخری شو دیکھنے چلے گئے ہیں۔ جب وہ بارہ بجے کے بعد بھی واپس نہ آئے تو وہ باہر سڑک پر رات تو تک کھلے ہوٹلوں میں انہیں تلاش کرتا رہا لیکن سب بے سود اور جب صبح بھی وہ واپس نہ آئے تو وہ بہت گھبرایا گیا۔ بھارت میں قیام کے دوران ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق انہیں صرف دو دو کی ٹولی میں باہر جانے کی اجازت تھی۔ قلم کا آخری شو دیکھنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ باہر جانے سے پہلے اپنے دونوں ساتھیوں کو بتانا لازم تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کب تک واپس لوٹیں گے اور اب صورتحال یہ تھی کہ دو کے بجائے تین ساتھی رات 8 بجے سے غائب تھے اور انہوں نے میرے نمبر ٹوکافون پر میری نمبر موجودگی میں اپنے سینئر کو بھی اپنے جانے کا کچھ نہ بتایا تھا۔ بقول میرے نمبر ٹوکافون کے صبح اس نے ان کا سامان چیک کیا تھا۔ وہ تینوں اپنے محل، فائٹرز اور چھریوں والے بید ساتھ لے گئے تھے۔

کئی قسم کے اندیشوں اور سوچوں نے گھبرایا۔ ان کی گمشدگی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں بلاوجہ سوچ بچار میں وقت ضائع کرنے کے اپنے نمبر ٹوکافون کو ساتھ لیکر ان کے گھر چلا گیا۔ سب چیزیں موجود تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان پر کیا ہوتی۔ میں نے ان کے کمروں کو اچھی طرح سے کھنگال ڈالا لیکن کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جس سے ان کی گمشدگی کا سراغ ملتا۔ تھک ہار کر میں نمبر ٹوکافون کے کمرے میں جا بیٹھا۔ بار بار ایک ہی بات ذہن میں آتی تھی کہ وہ قلم کا آخری شو دیکھنے گئے ہوں گے۔ واپسی پر پولیس نے معمول کی چیکنگ کے دوران ان سے اسلحہ برآمد کیا ہوگا اور وہ کسی حوالات میں ہوں گے۔ تفتیش کے دوران ہمارا سارا ہجید کھل جائے گا۔ نہ صرف ہم دونوں بھی پکڑے جائیں گے بلکہ ہمارا مشن اور اتنی اہم ڈاک بھی دشمن کے ہاتھ لگ جائے گی۔ جیسے جیسے میں اس زاویے سے سوچتا جاتا مجھے آئندہ تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فوری طور پر ڈاک اور دوسری ضروری اشیا یعنی ٹرانسمیٹر، کیمرے اور ہماری اصلی پہچان کا سبب بننے والی تمام اشیا اس گھر سے فوری طور پر ہٹل منتقل کر لوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ تینوں گمشدہ ساتھیوں کو میرے ہوٹل کا بھی علم ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں تشدد کے باعث آگرہ ہو ل پڑے تو دشمن ہوٹل میں بھی فوراً پہنچ جائے گا۔ اس لئے فوری طور پر مجھے اور میرے نمبر ٹوکافون کی غیر معروف ہوٹل میں شفٹ کرنا چاہئے۔ میں نے نمبر ٹوکافون کو سامان بیک کرنے کو کہا۔ مجھے اس وقت کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ فکرتھی تو ڈاک اور باقی اشیا کو محفوظ کرنے اور خود کو اور اپنے نمبر ٹوکافون کو بچانے کی۔ میں نمبر ٹوکافون کے کمرے میں بڑی بے قراری اور اضطراب کی حالت میں بار بار نمبر ٹوکافون کو جلد از جلد سامان بیک کرنے کا کہہ رہا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ یہ وقت کا کھیل ہے کہ ہم پہلے اس گھر سے نکلنے ہیں یا پولیس اور دوسرے بھارتی ادارے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی کیفیت میں میری نگاہ ٹائم ٹیبل پر پڑی تو اس کے نیچے ایک کاغذ دبا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے وہ کاغذ اٹھایا اور میری آنکھیں چھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

یہ خط ہمارے تینوں ساتھیوں کی طرف سے مجھے اور میرے نمبر ٹوکافون کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا اور اس پر ان تینوں کے دستخط ثبت تھے۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا کہ ہم تینوں آگرہ میں گرفتار ہو پاکستانی جاسوسوں کو بچانے کے لئے جا رہے ہیں۔ اگر دو دن تک ہم واپس نہ لوٹ سکتے تو یہ سمجھ لیجئے گا کہ ہم تینوں دشمن کی گولیوں سے ہلاک ہو چکے ہیں اور اگر ہم زندہ گرفتار ہو گئے تو ہم سائینا نڈا ڈھیس چبا کر اپنی جان دے دیں گے لیکن اپنے راز اور آپ کے متعلق کسی قسم کی معلومات دشمن کو نہ دیں گے۔ خط میں انہوں نے مجھ سے اور نمبر ٹوکافون سے اپنے ڈیپن اور ہدایات کی خلاف ورزی کرنے پر معافی مانگی تھی اور لکھا تھا کہ اگر ہم یہ قدم نہ اٹھاتے تو ہمارے دماغ اس خیال سے پھٹ جاتے کہ ہمارے دو پاکستانی بھائی ہمارے جیسے ہی مشن کی تکمیل کے دوران گرفتار ہو چکے ہیں اور ان کی قید اور تشدد کرنے کی جگہ کا علم ہونے کے باوجود ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر رہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ آپ ہمارے اس اقدام کی کامیابی کی دعا کریں اور ہمارے زندہ نہ رہنے کی صورت میں ہماری مغفرت کی دعا کریں۔ زندہ نہ رہنے کی صورت میں آپ..... یا کورٹ مارشل جو سزا دے گا اسے بھگتے کو تیار ہیں۔

میں نے نمبر ٹوکافون کو بلایا اور اسے یہ خط پڑھنے کو دیا۔ اس خط نے مجھے اور زیادہ پریشان کر دیا۔ ناکامی کی صورت میں انہوں نے اپنی جان دینے اور راز نہ بتانے کا جو کہا تھا اس جذباتی پس منظر میں ایسے جذباتی عہد کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ نمبر ٹوکافون کی خط پڑھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ اس نے سارا گھرانہ کے سراغ کی تلاش میں الٹ پلٹ کر دیا تھا لیکن گھبراہٹ میں اپنے کمرے میں ٹائم ٹیبل کی طرف دھیان نہ دیا۔ یہ خط ملنے کے باوجود میں نے نمبر ٹوکافون کو ساتھ مل کر سب ضروری سامان اٹھایا اور جھنڈ لال میاں میں ایک معمولی ہوٹل میں دو کمرے لے لئے۔ گھر کے دروازوں کی ایک ایک چابی سب کے پاس تھی لیکن تینوں ساتھی اپنی چابیاں بھی وہیں چھوڑ گئے۔ مالک مکان کے گھر والوں کو ہم نے چابیوں کا ایک سیٹ دیا اور میرے نمبر ٹوکافون نے کہا کہ اس کے ساتھ کسی ضروری کام کی وجہ سے بیرون دہلی گئے ہیں اور جلد ہی میں چابیاں بھی بھول گئے ہیں۔ اسے بھی کسی پارٹی کو سامان ڈیلیور کرنے کے لئے جانا پڑ رہا ہے۔ اس کی واپسی سے پہلے اگر اس کے ساتھی آجائیں تو انہیں چابیاں دے دیں۔

جھنڈ لال میاں سے میں سیدھا اپنے ہوٹل پہنچا اور اپنے دو چار جوڑے پکڑے ایک سوٹ کس میں رکھ دیئے۔ کچھ اہم کاغذات اور سارے روپے لاکر سے نکال لئے۔ سائیکسرو والا محل بھی سوٹ کس میں رکھا اور ہوٹل کی انتظامیہ کو یہ بتا کر کہ دو ایک دن کے لئے دہلی سے باہر جا رہا ہوں، جھنڈ لال میاں کے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ دن کا باقی حصہ اور رات ہم نے آنکھوں میں کائی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بڑے زلزلے کی وجہ سے ساری عمارت ڈھیر ہو گئی ہو۔ آئندہ مشن کی بات تو ایک طرف رہی ہم دونوں صرف یہ سوچ رہے تھے کہ اس طرح ہم ڈاک آنے والے کوربیٹر کو دے سکیں۔ میرے نمبر ٹوکافون نے جو بیڑی پیش کی کہ ہمیں ٹرانسمیٹر پر پاکستان رابطہ کرنا چاہئے جسے میں نے فوراً ہی اس بنا پر رد کر دیا کہ بھارتی سول اور فوجی جاسوسی کے محکمے میجر احسن اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کی وجہ سے پہلے ہی چوکنٹا ہو چکے تھے۔ اب ان دونوں جاسوسوں کی گرفتاری کے بعد تو وہ ایمر جنسی کی حالت میں ہوں گے۔ ان حالات میں ٹرانسمیٹر پر لمبا پیغام، خود ان اداروں کو اپنی نشان دہی کرنے کے مترادف ہوگا۔ میرے نمبر ٹوکافون نے بھی کہا کہ اگر ہمارے تینوں ساتھی کامیابی کے ساتھ بھارت لوٹ بھی آئے تو انہیں ڈیپن کی خلاف ورزی کی وجہ سے کوربیٹر کے ہمراہ واپس بھیج دیا جائے۔ میں نے اسے کہا کہ کئی احوال انتظار کرو اور دیکھو (WAIT AND SEE) پر عمل کرنا ہے اور اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس انتہائی اہم ڈاک کو پاکستان بھجوانا ہے۔ ان تینوں نے جو حرکت کی تھی۔ وہ جذبات سے قطع نظر انتہائی ناش غلطی اور جان بوجھ کر ڈیپن کی شدید خلاف ورزی تھی۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ ان کی بھیر و عافیت واپسی کی صورت میں اگر انہیں پاکستان واپس بھیجا جائے تو وہ کورٹ مارشل کے خوف سے راہ میں ہی فرار نہ ہو جائیں۔ انہوں نے خط میں اپنے جذبات لکھ کر اپنی دانست میں تو اپنے اس اقدام کو جان بوجھ کر دیا تھا لیکن میرے لئے مشکلات کا ایک پھاڑ کھڑا کر دیا تھا۔ میں نے حالات کے تقاضے کے پیش نظر ان کی بھیر و واپسی ورنہ صورت دیگران کے واپس آنے کی ان کی لکھی ہوئی مدت کے دو دن بعد تک ان کا انتظار کرنے کے بعد ہی پاکستان کو ان کے بارے میں مطلع کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ دورانیہ اتوار تک کا بننا تھا جب انڈیش کوربیٹر نے مجھے ملنا تھا۔ پانچ میں سے اب ہم صرف دو باقی تھے۔ میں نے اپنے نمبر ٹوکافون کو کہا کہ جب تک حالات کسی ڈھب بیٹھ نہ جائیں ہم دونوں ایک دوسرے کو کور کریں گے اور تمہا ہرگز باہر نہ جائیں گے۔

اگلے روز دس بجے قریب ہم دونوں ان کے گھر کے سامنے سڑک پر پہنچے تو اتنا قالمالک مکان مل گیا۔ اس نے میرے نمبر ٹوکافون کو بتایا کہ صبح وہ تینوں گھر آ گئے ہیں۔ ہم قریب بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو وہ سو رہے تھے۔ نمبر ٹوکافون نے انہیں جگایا۔ مجھے اور نمبر ٹوکافون کو دیکھ کر وہ اس قدر گھبرائے کہ آنکھیں نہ ملا سکتے تھے۔ میں نے انہیں بالکل نارمل لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا خط مل گیا تھا۔ لہذا جو بات بیان کرنے کے بجائے مفصل طور پر اپنے گھر سے جانے اور واپس آنے تک کے واقعات بتاؤ اور صرف ایک آدی بولے۔ باقی خاموش رہیں۔ یہ سن کر ہمارا وہ ساتھی جو جوڑو کرائے کا ماہر تھا، کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا ”سر ہم سے بڑی غلطی ہوئی جو یہ حرکت کر بیٹھے“ میں نے اسے ٹوکا ”صرف وہ بتاؤ جو میں نے پوچھا ہے۔ غلطی ہوئی ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔“ سر آپ کے جانے کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ آگرہ میں گرفتار دونوں پاکستانیوں کو بچانا ضروری ہے۔ ہمیں یقین تھا کہ آپ ہمیں ہرگز اس کی اجازت نہ دیں گے۔ سو ہم نے طے کیا کہ آپ کی غلطی میں ہی یہ کام کیا جائے۔ ہم تینوں مسلح ہو کر ریلوے اسٹیشن پر پہنچے، رات گیارہ بجے آگرہ جانے والی گاڑی پر سوار ہوئے۔ یہ پیجر گاڑی تھی۔ ہر اسٹیشن پر رکتی اور دوسری گاڑیوں کو پاس کرواتی صبح ریلوے کی منڈی اسٹیشن پر پہنچی۔ ہم گاڑی سے اتر گئے اور سیف ہاؤس کا جو نقشہ آپ نے بتایا تھا اس طرف چل پڑے۔ ہم نے سوچا تھا کہ دن بھر ان کی نگرانی کے بعد رات کو کمانڈو ایکشن کر کے انہیں چھڑوانے کی کوشش کریں گے۔ ریلوے اسٹیشن سے ہی ریلوے پٹریوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ جو آگرہ کینڈ اسٹیشن تک جاتا ہے۔ سیف ہاؤس کے سامنے ریلوے پٹریوں کی دوسری جانب ایک کچی بستی تھی، ہوئی ہے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ جو سیف ہاؤس کی طرف سے اشارے کر کے بول رہے تھے ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ سیف ہاؤس کے سامنے کئی فوجی چیمپین اور ایجنٹس کھڑے تھے۔ ملٹری پولیس والے سیف ہاؤس کی طرف کسی کو جانے نہیں دیتے تھے۔ کچی بستی والے بھی اپنے گھروں کے سامنے دور سے ہی دیکھ رہے تھے۔ ہمارے پوچھنے پر مختلف لوگ مختلف باتیں کرنے لگے۔ ہر کوئی اپنے اپنے خیال کے گھوڑے دوڑا رہا تھا لیکن یقین سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

غازی

ایبٹینوں اور بچوں کی موجودگی سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی سینئر افسر کی آمد کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ملٹری پولیس والے پٹریوں کی دوسری طرف سے ان لوگوں کو گھروں کے اندر جانے کا کہہ رہے تھے لیکن وہ پٹریاں عبور کر کے شہریوں کو زبردستی گھروں میں دھکیل نہیں رہے تھے (شاید اس کی وجہ بھارت میں مارشل لا کا نکلنا اور فوج کا شہری معمولات میں دخل اندازی کی حدود کا تعین تھا) ہم نے دیکھا کہ ریلوے کانسٹیبل نے والا ایک شخص اپنی وردی میں اس ہستی میں داخل ہوا اور جلد ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ اس نے بتایا کہ صبح کے تین بجے کے قریب وہ ڈیوٹی پر جانے کے لئے گھر سے نکلا ہی تھا کہ سامنے والے گھر (سیف ہاؤس) کے اندر اور باہر گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ وہ کانٹے والا سیف ہاؤس کے متعلق تو کچھ نہ جانتا تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس گھر میں کچھ فوجی رہتے ہیں اور کبھی کبھی چینی بھی سنا دی جاتی ہیں۔ بچپوں میں سوار فوجی افسر بھی یہاں آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس گھر کے باہر اور اندر ہلکی پاور کے بلب جل رہے تھے۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ فوجی وردی پہنے ہوئے تین آدمی گھر کے باہر گولیاں گنتے سے مرچے ہیں اور گھر کے اندر سے بھی فائرنگ کی آواز آرہی ہے۔ فائرنگ تھی تو چند منٹوں بعد 5 آدمی جو شہری پٹری سے پہنچے ہوئے تھے، شہری پٹری سے پہنچے دو اور آدمیوں کو سہارا دیئے مکان سے باہر آئے۔ کچھ فاصلے پر ایک موٹر کھڑی تھی۔ وہ سب اس موٹر میں جا کر بیٹھ گئے اور موٹر تیزی سے پکی سڑک کی طرف بڑھی اور غائب ہو گئی۔ میں تو یہ سب دیکھ کر بہت ڈرا اور بھاگتے ہوئے اسٹیشن جا کر حاضری کے رجسٹر پر دستخط کیے اور ڈیوٹی دینے لگا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہو گئی اور چھٹی لیکر اب میں گھر جا رہا تھا۔ میں اس بارے میں فوجیوں کو کوئی بیان نہیں دوں گا۔ خواہ مخواہ پرانی مصیبت مول کیوں لوں۔ اس کانٹے والے کی باتیں سن کر وہاں موجود لوگوں نے پھر تبصرے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک جیب آئی جس پر ایک اشارہ لگا ہوا تھا۔ یقیناً اسی بریگیڈیئر کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ دوسرے جوینئر افسران کے ساتھ سیف ہاؤس کے اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی باہر آ گیا۔ جوینئر افسران سے چند منٹ باتیں کیں اور اپنی جیب میں بیٹھ کر چلا گیا۔

کئی قسم کے اندیشوں اور سوچوں نے گھیر لیا۔ ان کی گمشدگی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں بلاوجہ سوچ بچار میں وقت ضائع کرنے کے اپنے نمبر نوکو ساتھ لیکران کے گھر چلا گیا۔ سب چیزیں موجود تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان پر کیا ہوتی۔ میں نے ان کے کمروں کو اچھی طرح سے کھنگال ڈالا لیکن کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جس سے ان کی گمشدگی کا سراغ ملتا۔ تھک ہار کر میں نمبر نوکے کمرے میں جا بیٹھا۔ بار بار ایک ہی بات ذہن میں آتی تھی کہ وہ فلم کا آخری شو دیکھنے گئے ہوں گے۔ واپسی پر پولیس نے معمول کی چیکنگ کے دوران ان سے اسلحہ برآمد کیا، وہاں وہ کسی حوالات میں ہوں گے۔ تفتیش کے دوران ہمارا سارا بھید کھل جائے گا۔ نہ صرف ہم دونوں بھی پکڑے جائیں گے بلکہ ہمارا مشن اور اتنی اہم ڈاک بھی دشمن کے ہاتھ لگ جائے گی۔ جیسے جیسے میں اس زاویے سے سوچتا جاتا مجھے آئندہ تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فوری طور پر ڈاک اور دوسری ضروری اشیاء یعنی ٹرأسمیٹر، کیمرے اور ہماری اصلی پہچان کا سبب بننے والی تمام اشیاء اس گھر سے فوری طور پر ہٹا لی جائیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ تینوں گمشدہ ساتھیوں کو میرے ہوٹل کا بھی علم ہے۔ پکڑے جانے کی صورت میں تشدد کے باعث اگر وہ ہول پڑے تو دشمن ہوٹل میں بھی فوراً پہنچ جائے گا۔ اس لئے فوری طور پر مجھے اور میرے نمبر نوکو کو کسی غیر معروف ہوٹل میں شفٹ کرنا چاہئے۔ میں نے نمبر نوکو کو سب سامان چیک کرنے کو کہا۔ مجھے اس وقت کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ فکری طور پر ڈاک اور باقی اشیاء محفوظ کرنے اور خود کو اور اپنے نمبر نوکو بچانے کی۔ میں نمبر نوکے کمرے میں بڑی بے قراری اور ناظراری کی حالت میں بار بار نمبر نوکو جلد از جلد سامان چیک کرنے کا کہہ رہا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ یہ وقت کا کھیل ہے کہ ہم پہلے اس گھر سے نکلے ہیں یا پولیس اور دوسرے بھارتی ادارے یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی کیفیت میں میری نگاہ ٹائم ٹیم پر پڑی تو اس کے نیچے ایک کانڈر ہوا دکھائی دیا۔ میں نے وہ کانڈر اٹھایا اور میری آنکھیں کھلی کھلی رہ گئیں۔

یہ خط ہمارے تینوں ساتھیوں کی طرف سے مجھے اور میرے نمبر نوکو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا اور اس پر ان تینوں کے دستخط ثبت تھے۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح تھا کہ ہم تینوں اگر ہر گرفتار پاکستانی جاسوس کو بچانے کیلئے جا رہے ہیں۔ اگر دو دن تک ہم واپس نہ لوٹ سکتے تو کچھ لینے کا کہہ ہم تینوں دشمن کی گولیوں سے ہلاک ہو چکے ہیں اور اگر ہم زندہ گرفتار ہو گئے تو ہم سائینا نڈ ڈاڑھیں چبا کر اپنی جان دے دیں گے لیکن اپنے راز اور آپ کے متعلق کسی قسم کی معلومات دشمن کو نہ دیں گے۔ خط میں انہوں نے مجھ سے اور نمبر نوکے سے اپنے ڈھپان اور بددیانتی کی خلاف ورزی کرنے پر معافی مانگی تھی اور لکھا تھا کہ اگر ہم یہ قدم نہ اٹھاتے تو ہمارے دماغ اس خیال سے پھٹ جاتے کہ ہمارے دو پاکستانی بھائی ہمارے جیسے ہی مشن کی تکمیل کے دوران گرفتار ہو چکے ہیں اور ان کی قید اور تشدد کرنے کی جگہ کا علم ہونے کے باوجود ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر رہے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ آپ ہمارے اس اقدام کی کامیابی کی دعا کریں اور ہمارے زندہ نہ رہنے کی صورت میں ہماری مغفرت کی دعا کریں۔ زندہ رہنے کی صورت میں آپ..... یا کورٹ مارشل جو سزا دیں گے اسے بھگتے تو تیار ہیں۔ میں نے نمبر نوکو بلایا اور اسے یہ خط پڑھنے کو دیا۔ اس خط نے مجھے اور زیادہ پریشان کر دیا۔ ناکامی کی صورت میں انہوں نے اپنی جان دینے اور راز نہ بتانے کا جو کہا تھا اس جذبہ کی پس منظر میں ایسے جذباتی عہد کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ نمبر نوکو بھی خط پڑھ کر حیران و ششدر رہ گیا۔ اس نے سارا گھرانہ کے سراغ کی تلاش میں الٹ پلٹ کر دیا تھا لیکن گھبراہٹ میں اپنے کمرے میں ٹائم ٹیم کی طرف دھیان نہ دیا۔ یہ خط ملنے کے باوجود میں نے نمبر نوکے ساتھ مل کر سب ضروری سامان اٹھایا اور بھرتہ لال میاں میں ایک معمولی ہوٹل میں دو کمرے لے لئے۔ گھر کے دروازوں کی ایک ایک چابی سب کے پاس تھی لیکن تینوں ساتھی اپنی چابیاں بھی وہیں چھوڑ گئے۔ مالک مکان کے گھر والوں کو ہم نے چابوں کا ایک سیٹ دیا اور میرے نمبر نوکے کہا کہ اس کے ساتھی کی ضروری کام کی وجہ سے بیرون دہلی گئے ہیں اور جلد ہی میں چابیاں بھی بھول گئے ہیں۔ اسے بھی کسی پارٹی کو سامان ڈیپور کرنے کے لئے جانا پڑ رہا ہے۔ اس کی واپسی سے پہلے اگر اس کے ساتھی آ جائیں تو انہیں چابیاں دے دیں۔

جھت لال میاں سے میں سیدھا اپنے ہوٹل پہنچا اور اپنے دو چارجز کے پٹریے ایک سوٹ کیس میں رکھ دیئے۔ کچھ اہم کاغذات اور سارے روپے لاکر سے نکال لئے۔ سائیکل سوار والا پہل بھی سوٹ کیس میں رکھا اور ہوٹل کی انتظامیہ کو یہ بتا کر دو ایک دن کے لئے دہلی سے باہر جا رہا ہوں، جھت لال میاں کے ہوٹل میں پہنچ گیا۔ دن کا باقی حصہ اور رات ہم نے آنکھوں میں کاٹی۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی بڑے زلزلے کی وجہ سے ساری عمارت ڈھیر ہو گئی ہو۔ آئندہ مشن کی بات تو ایک طرف رہی ہم دونوں صرف یہ سوچ رہے تھے کہ کسی طرح ہم ڈاک آنے والے کو ریزروڈ سے نکالیں۔ میرے نمبر نوکے تجویز پیش کی کہ ہمیں ٹرأسمیٹر پر پاکستان رابطہ کرنا چاہئے جسے میں نے فوراً ہی اس بنا پر رد کر دیا کہ بھارتی سول اور فوجی جاسوسی کے محکمے میجر احسن اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کی وجہ سے پہلے ہی جو کچھ ہو چکے تھے۔ اب ان دونوں جاسوسوں کی گرفتاری کے بعد تو وہ لبریشن کی حالت میں ہوں گے۔ ان حالات میں ٹرأسمیٹر پر لمبا پیغام، خود ان اداروں کو اپنی نشان دہی کرنے کے مترادف ہوگا۔ میرے نمبر نوکے نے یہ بھی کہا کہ اگر ہمارے تینوں ساتھی کامیابی کے ساتھ بھارت لوٹ بھی آئے تو انہیں ڈھپان کی خلاف ورزی کی وجہ سے کو ریزروڈ کے ہمراہ واپس بھیج دیا جائے۔ میں نے اسے کہا کہ فی الحال انتظار کرو اور دیکھو (WAIT AND SEE) پر عمل کرنا ہے اور اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس انتہائی اہم ڈاک کو پاکستان بھجوانا ہے۔ ان تینوں نے جو حرکت کی تھی۔ وہ جذبات سے قطع نظر انتہائی فاش غلطی اور جان بوجھ کر دشمن کی شدید خلاف ورزی تھی۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ ان کی بھرتہ لال میاں کی صورت میں اگر انہیں پاکستان واپس بھیجا جائے تو وہ کورٹ مارشل کے خوف سے راہ میں ہی فرار نہ ہو جائیں۔ انہوں نے خط میں اپنے جذبات لکھ کر اپنی دانست میں تو اپنے اس اقدام کو جائز قرار دیا تھا لیکن میرے لئے مشکلات کا ایک پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔ میں نے حالات کے تقاضے کے پیش نظر ان کی بھرتہ لال میاں کی واپسی ورنہ بصورت دیگر ان کے واپس آنے کی ان کی کبھی ہوئی مدت کے دو دن بعد تک ان کا انتظار کرنے کے بعد ہی پاکستان کو ان کے واپس آنے کے لئے مطلع کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ دورانیہ اتوار تک باقیا تھا جب آپریشن کو ریزروڈ نے مجھے ملنا تھا۔ پانچ میں سے اب ہم صرف دو باقی تھے۔ میں نے اپنے نمبر نوکو کہا کہ جب تک حالات کسی ڈھب بیٹھ نہ جائیں ہم دونوں ایک دوسرے کو لور کریں اور ہتھیار گز باہر نہ جائیں گے۔

اگلے روز جس بجے کے قریب ہم دونوں ان کے گھر کے سامنے سڑک پر پہنچے تو اتفاقاً مالک مکان مل گیا۔ اس نے میرے نمبر نوکو بتایا کہ صبح وہ تینوں گھر آگئے ہیں۔ ہم قریباً بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو وہ سو رہے تھے۔ نمبر نوکے نے انہیں جگایا۔ مجھے اور نمبر نوکو کو دیکھ کر وہ اس قدر گھبرائے کہ آنکھیں نہ ملا سکتے تھے۔ میں نے انہیں بالکل نابل مجھے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا خط مل گیا تھا۔ لہذا جو بات بیان کرنے کے بجائے مفصل طور پر اپنے گھر سے جانے اور واپس آنے تک کے واقعات بتاؤ اور صرف ایک آدمی بولے باقی خاموش رہیں۔ یہ سن کر ہمارا وہ ساتھی جو جوڑو کرانے کا ماہر تھا، کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "نہر سے بڑی غلطی ہوئی جو یہ حرکت کر بیٹھے" میں نے اسے ٹوکا "صرف وہ بتاؤ جو میں نے پوچھا ہے۔ غلطی ہوئی ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا"۔ "سراپ کے جانے کے بعد ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر وہ میں گرفتار دونوں پاکستانیوں کو بچانا ضروری ہے۔ ہمیں یقین تھا کہ آپ ہمیں ہرگز اس کی اجازت نہ دیں گے۔ سو ہم نے طے کیا کہ آپ کی لاعلمی ہی یہ کام کیا جائے۔ ہم تینوں مسخ ہو کر ریلوے اسٹیشن پر پہنچے، رات گیارہ بجے آگرہ جانے والی گاڑی پر سوار ہوئے۔ یہ پینجر گاڑی تھی۔ ہر اسٹیشن پر کئی اور دوسری گاڑیوں کو پاس کرواتے ہی صبح راجہ کی منڈی اسٹیشن پر پہنچی۔ ہم گاڑی سے اتر گئے اور سیف ہاؤس کا جو نقشہ آپ نے بتایا تھا اس طرف چل پڑے۔ ہم نے سوچا تھا کہ دن بھر ان کی نگرانی کے بعد رات کو کمانڈو ایکشن کر کے انہیں چھڑوانے کی کوشش کریں گے۔ ریلوے اسٹیشن سے ہی ریلوے پٹریوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ جو اگر کینٹ اسٹیشن تک جاتا ہے۔ سیف ہاؤس کے سامنے ریلوے پٹریوں کی دوسری جانب ایک کچی ہستی بنی ہوئی ہے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ جو سیف ہاؤس کی طرف سے اشارے کر کے بول رہے تھے ہم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ سیف ہاؤس کے سامنے ٹی فوجی چینی اور ایبٹینوں کھڑی تھیں۔ ملٹری پولیس والے سیف ہاؤس کی طرف کی کو جانے نہیں دیتے تھے۔ کچی ہستی والے بھی اپنے گھروں کے سامنے دور سے ہی دیکھ رہے تھے۔ ہمارے پوچھنے پر مختلف لوگ مختلف باتیں کرنے لگے۔ ہر کوئی اپنے اپنے خیال کے گھوڑے دوڑا رہا تھا لیکن یقین سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

ایبٹینوں اور بچوں کی موجودگی سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی سینئر افسر کی آمد کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ملٹری پولیس والے پٹریوں کی دوسری طرف سے ان لوگوں کو گھروں کے اندر جانے کا کہہ رہے تھے لیکن وہ پٹریاں عبور کر کے شہریوں کو زبردستی گھروں میں دھکیل نہیں رہے تھے ہم نے دیکھا کہ ریلوے کانسٹیبل نے والا ایک شخص اپنی وردی میں اس ہستی میں داخل ہوا اور جلد ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ اس نے بتایا کہ صبح کے تین بجے کے قریب وہ ڈیوٹی پر جانے کے لئے گھر سے نکلا ہی تھا کہ سامنے والے گھر (سیف ہاؤس) کے اندر اور باہر گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ وہ کانٹے والا سیف ہاؤس کے متعلق تو کچھ نہ جانتا تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس گھر میں کچھ فوجی رہتے ہیں اور کبھی کبھی چینی بھی سنا دی جاتی ہیں۔ بچپوں میں سوار فوجی افسر بھی یہاں آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس گھر کے باہر اور اندر ہلکی پاور کے بلب جل رہے تھے۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ فوجی وردی پہنے ہوئے تین آدمی گھر کے باہر گولیاں گنتے سے مرچے ہیں اور گھر کے اندر سے بھی فائرنگ کی آواز آرہی ہے۔ فائرنگ تھی تو چند منٹوں بعد 5 آدمی جو شہری پٹری سے پہنچے ہوئے تھے، شہری پٹری سے پہنچے دو اور آدمیوں کو سہارا دیئے مکان سے باہر آئے۔ کچھ فاصلے پر ایک موٹر کھڑی تھی۔ وہ سب اس موٹر میں جا کر بیٹھ گئے اور موٹر تیزی سے پکی سڑک کی طرف بڑھی اور غائب ہو گئی۔ میں تو یہ سب دیکھ کر بہت ڈرا اور بھاگتے ہوئے اسٹیشن جا کر حاضری کے رجسٹر پر دستخط کیے اور ڈیوٹی دینے لگا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی وجہ سے میری طبیعت خراب ہو گئی اور چھٹی لیکر اب میں گھر جا رہا تھا۔ میں اس بارے میں فوجیوں کو کوئی بیان نہیں دوں گا۔ خواہ مخواہ پرانی مصیبت مول کیوں لوں۔ اس کانٹے والے کی باتیں سن کر وہاں موجود لوگوں نے پھر تبصرے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ایک جیب آئی جس پر ایک اشارہ لگا ہوا تھا۔ یقیناً اسی بریگیڈیئر کا انتظار ہو رہا تھا۔ وہ دوسرے جوینئر افسران کے ساتھ سیف ہاؤس کے اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد ہی باہر آ گیا۔ جوینئر افسران سے چند منٹ باتیں کیں اور اپنی جیب میں بیٹھ کر چلا گیا۔

کانٹے والے کے کہنے کے مطابق تین فوجیوں کی لاشیں جو اس نے سیف ہاؤس کے باہر دیکھی تھیں ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ایبٹینوں میں رکھ دی گئی تھیں۔ سورج کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ ان لاشوں کی جگہ چوڑے سے لاشوں کی پوزیشن بنا دی گئی تھی۔ سیف ہاؤس کے اندر سے تین فوجیوں کی لاشیں ہمارے سامنے دوسری ایبٹینوں میں ڈال دی گئیں۔ سیف ہاؤس کو لال لگا کر دونوں کو پھیرے پر کھڑا کر دیا گیا اور پہلے ہی ایبٹینوں اور پھر باقی چینیوں بھی وہاں سے چلی گئیں۔ اب ہمارا وہاں ٹھہرنا بیکار اور خطرناک تھا لہذا ہم اسی راستے سے راجہ کی منڈی اسٹیشن پہنچ گئے اور دہلی کی طرف جانے والی جو پہلی ٹرین ملی، اس پر سوار ہو گئے۔ اسٹیشن پر بہت سارے فوجی سپاہی اور افسران اور سفیر کینڈیوں میں فوجی جاسوس جو اپنے ہمراہ کیس کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے، کتوں کی طرح بھاگتے ہوئے جاسوسوں کو تلاش کر رہے تھے۔ ہم نے بجائے دہلی کے انبالہ کے ٹکٹ لئے تھے لیکن پلیٹ فارم پر فوجیوں کی پوچھ گچھ سے بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے ایک ترکیب سوچی۔ میں نے چپکے سے اپنی کلائی کی گھڑی جب میں رکھی اور ایک کیپٹن کے پاس جا کے اسے نمستے کیا اور وقت پوچھا۔ اس نے وقت بتا دیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ انبالہ جانے والی گاڑی کب آئے گی۔ اس نے جھلا کر کہا کہ ریلوے کے کسی آدمی سے پوچھو۔ مجھے کیا معلوم۔ گاڑی تو پلیٹ فارم پر ہی کھڑی تھی۔ میں نے ویسے ہی ریلوے کے ایک قلمی سے گاڑی کا پوچھا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کیپٹن کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے پھر نمستے کیا۔ کیپٹن تو پلیٹ فارم پر ایک جگہ کھڑا تھا جبکہ باقی فوجی پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے کیپٹن سے ایک ادھ منٹ بات کرتے دیکھ کر باقی فوجی ہمیں اس کا واقف کار سمجھے اور ہم بغیر کسی پوچھ گچھ کے ایک ڈبے میں سوار ہو گئے اور دہلی پہنچ گئے۔ رات ہم نے ویٹنگ روم میں ہر کی کیونکہ اسٹیٹن پر فوجی چیکنگ کر رہے تھے۔ ہم سے بھی انہوں نے پوچھا تو ہم نے کہا کہ راجہ کی منڈی سے ٹرین میں سوار ہوئے تھے اور انبالہ جانا ہے چونکہ جس ٹرین سے ہم آئے ہیں وہ صرف دہلی تک کی تھی لہذا انبالہ جانے والی ٹرین کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم نے انہیں ٹکٹ دکھا کر مطمئن کر دیا اور وہ آگے بڑھ گئے۔ یہاں آکر ہمیں شدت سے احساس ہوا کہ آپ کی اجازت کے بغیر ہم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے۔ ڈرتے ڈرتے ہم گھر پہنچے۔ ہم نے سب حقیقت بیان کر دی ہے۔ ہمیں اپنی سنگین غلطی کا شدت سے احساس ہوا اور ہم اپنی اس حرکت پر بے حد نادم ہیں۔ آپ ہمارے لئے جو سزا بھی تجویز کریں گے ہمیں خوشی سے قبول ہوگی۔

میں نے کہا کہ سزا کے بارے میں تو بعد میں بات کروں گا۔ اب یہ کہہ کر آپ دونوں میرے اور نمبر نوکے کے ساتھ چلو۔ ایک گھر چھوڑ کر ہم چاروں جھت لال میاں پہنچے۔ ہوٹل والوں سے حساب کر کے سب سامان اٹھایا اور پہلے ان کے گھر گئے اور وہاں سے اٹھایا ہوا سب سامان نمبر نوکے کے حوالے کر کے لوہی ہوٹل چلا آیا۔ میرے ہمراہ صرف ایک سوٹ تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کرتے مرتے اس ذات پاک نے ہمیں بچالیا۔ (پاکستان واپس آنے پر مجھے پتہ چلا کہ اگر وہاں میں پکڑے جانے والوں کا گروپ بھی 5 افراد کا تھا۔ یہ پانچوں آگرہ چھاؤنی میں دو اور تین کی ٹولیوں میں اپنے ٹارگٹ تک پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ ٹکٹ پڑنے پر ایف آئی یو کے آدمیوں نے دو کو پکڑ لیا اور ڈی ایم آئی والوں کے حوالے کر دیا۔ باقی تین دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ان کا گروپ ایڈر بھی دو پکڑے جانے والوں میں شامل تھا۔ باقی تینوں نے الگ الگ رہ کر ان کا پھینچا کیا اور وہ اسی شام سیف ہاؤس تک پہنچ گئے۔ 4 دن تک وہ اپنے گرفتار ساتھیوں کو چھڑوانے کی تدابیر کرتے رہے۔ اس دوران دو گرفتار ساتھیوں پر درمیانہ تشدد بھی کیا گیا۔ تین آزاد ساتھیوں نے بالآخر کمانڈو ایکشن کرنے کا فیصلہ کیا اور جس صبح میرے ساتھی وہاں پہنچے تو کمانڈو ایکشن کر کے وہاں پر موجود 6 بھارتی فوجیوں کو ہلاک کر کے ساتھیوں کو چھڑوا لیا گیا تھا۔ موٹر کارجی اسی رات گن پوائنٹ پر چھین گئی تھی اور آگرہ اسٹیٹن کے قریب اسے چھوڑ کر وہ پانچوں پہلے کھنڈو اور پھر بھارت نیپال بارڈر پر پہنچاؤں سے گزرتے نیپال میں داخل ہوئے اور ٹھنڈوں سے اپنے سفارت خانے کے ذریعے پہلے ملائیشیا اور پھر پاکستان بھرتہ لال پہنچ گئے) اگلے روز صبح ہی میں ساتھیوں کے گھر چلا گیا۔ میں نے رات ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ سخت سرزنش کے سوا ان کے خلاف پاکستان میں ان کی اس حرکت کی رپورٹ نہیں کروں گا۔ میری اپنی پوزیشن بہت نازک تھی۔ دشمن ملک میں ان سے کام لینا جہاں کسی اتھارٹی کا ان پر حکم چلانے اور حکم عدولی پر ان کو کوئی سزا دینے کا ذریعہ نہ ہو بہت ہی ٹھنکنا کام تھا۔

غازی

میں اکثر اوقات ان سے دوستانہ ماحول میں باتیں کرتا اور نفسیاتی طور پر انہیں HANDLE کرتا تھا اور اب بھی میں نے نفسیاتی طور پر ہی ان سے نشے کا سوچا تھا۔ ایک روز گھر پر میں نے ان چاروں کو ایک کمرے میں اکٹھا کیا اور کہا کہ آپ لوگوں کی اس حرکت سے مجھ پر واضح ہو چکا ہے کہ ”آپ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ ہم سب یہاں اپنے وطن اور قوم کے مفاد میں جان کی بازی لگا کر آئے ہیں۔ ہم سب کی مشترکہ کوششوں سے اللہ پاک نے ہمیں غیر معمولی کامیابیوں سے نوازا۔ یہ سب کامیابیاں ٹیم ورک کا نتیجہ تھیں اور ہر ٹیم کا ایک کپتان ہوتا ہے۔ میں بھی اپنی ٹیم کا گروپ لیڈر ہوں۔ آپ کے اس اقدام سے میں سمجھتا ہوں کہ اب بحیثیت گروپ لیڈر مجھے آپ کا بھرپور تعاون حاصل نہیں لہذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ اتوار کو پاکستان سے آنے والے کوریئر کے ہمراہ میں پاکستان واپس چلا جاؤں۔ جب تک آپ کا نیا گروپ لیڈر آئے آپ نمبر ٹو کے احکامات پر عمل کریں گے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی اس حرکت کے بارے میں سینئرز کو کچھ نہ بتاؤں گا۔“ میں یہ باتیں کہہ کر خاموش ہو گیا۔ وہ چاروں پہلے تو کم صدم مجھے سنتے رہے۔ پھر ایک نکت پھٹ پڑے۔ ”نہیں صاحب ہم ایسا ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ ہم جان دیدیں گے لیکن آپ کو واپس جانے نہیں دیں گے۔ آپ جو سزا چاہیں ہمیں دے لیں لیکن اپنا یہ فیصلہ بدل لیں۔ اگر آپ واپس چلے گئے تو ہم سب بھی آپ کے پیچھے پیچھے واپس پاکستان چلے جائیں گے۔ چاہے وہاں ہمیں سزائے موت ہی کیوں نہ دی جائے۔“

(وہ سب بیک وقت بول رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی اس حرکت کی..... میں خود پاکستان واپس جانے اور اپنا مشن نامکمل چھوڑ کر جانے کی پاداش میں سزا سمجھنے کو تیار ہو جاؤں گا۔) جب ان کی منت سماجت بہت بڑھ گئی تو میں نے انہیں کہا آپ نے ایک بار فوج میں بھرتی کے وقت حلف اٹھایا تھا۔ دوسری بار بھارت آنے سے پہلے۔ اب میں آپ سے حلف تو نہیں اٹھاؤں گا۔ صرف وعدہ لوں گا کہ آپ آئندہ ایسی حرکت ہرگز نہیں کریں گے۔“ ان سب نے باری باری اپنی ماؤں کو درمیان میں لاکر ایسا وعدہ کیا کہ میں کانپ اٹھا حالانکہ میں نے انہیں ایسا وعدہ کرنے کا ہرگز نہیں کہا تھا۔

چند لمبے پہلے والا ماحول یکسر بدل چکا تھا۔ سب کی آنکھیں پر غم تھیں۔ میں نے سب کو باری باری گلے لگایا۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔ انہوں نے چائے بنائی۔ چائے پینے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد کھانے کی خوشبو کی مہک آئی۔ مالک مکان دو بڑی سینیوں میں چار پانچ مختلف قسم کے کھانے اور ریانی لے کر آ گیا۔ بیڑھیوں پر کھڑی اس کی بیٹیاں کھانوں کی بڑے پکڑا رہی تھیں اور وہ انہیں اندر لارہا تھا۔ میں حیران تھا اور ابھی سوچ ہی رہا تھا اس اچانک میز بانی کا کونسا موقع تھا کہ مالک مکان نے بتایا کہ اس کی بڑی بیٹی کی منگنی طے ہو گئی ہے۔ نزدیکی رشتہ داروں کی دعوت میں کرایہ داروں کو شریک نہ کرنا کی طور مناسب نہ تھا اور پھر ہمسائے کے حقوق کے متعلق تو اسلام میں اتنی ہدایات ہیں کہ ایک موقع پر جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمسائے کے حقوق بتا رہے تھے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ”ہمسائے کے اتنے حقوق بیان کئے گئے ہیں کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وراثت میں بھی ہمسائے کا حصہ رکھنے کے احکامات الہی نازل نہ ہو جائیں۔“ میں نے مالک مکان کو بیٹی کی منگنی پر مبارک دی۔ لہذا کھانوں کا شکر یہ ادا کیا اور ساتھیوں کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ آئندہ چند روز میں ہم پانچوں اپنی طرف سے 5 بیاری سوٹ مالک مکان کو بیٹی کی منگنی کے تحفے میں پیش کریں گے۔ یوں شام تک ہم بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ صبح محفل کی جوٹی تھی وہ ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک خوشگوار اعتماد کی فضا نے لے لی تھی۔

لیٹونٹ نے حسب معمول ڈاک پہنچا دی تھی۔ آئندہ اتوار تک میں فارغ تھا۔ میں نے کرنل فنکر کے پاس جانے کا سوچا اور شام کو میں کرنل فنکر کی محفل میں بیٹھا تھا۔ آج اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ کرنل فنکر نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص سے میرا تعارف کرایا۔ وہ آگرہ چھاؤنی میں پنجاب رجسٹری کا کمانڈنگ آفیسر تھا اور بیڈ کوارٹر میں کسی کام سے آیا تھا۔ کرنل فنکر کی محفل تاؤ نوش جب عروج پر پہنچی تو کرنل فنکر نے نشے میں جھومتے ہوئے مجھ سے پوچھا ”نوندو اگر تم اپنی بہترین چائے کی بیٹیاں کسی محفوظ جگہ پر کسی اعتباری شخص کے حوالے کرو اور وہ بیٹیاں تم گم ہو جائیں اور تمہیں بعد میں معلوم ہو کہ تمہارا اعتباری آدمی لاپرواہ اور غافل شخص ہے تو اپنی اس نا مہجی کا الزام تم خود دو گے یا اس لاپرواہ اور غافل شخص کو؟“ میں نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”یقیناً میں خود کو موروں الزام ٹھہراؤں گا کیونکہ جس شخص کے پاس میں نے بیٹیاں رکھی تھیں مجھے اس کے متعلق پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ ”بالکل درست اور یہی بات میں کرنل رنجیت کو آج ہی بار سمجھا چکا ہوں لیکن کچھ بھی اس کے دماغ میں سمائیں رہا۔“ (NOTHING CAN BE PUT IN THE BRAIN OF THIS SQUARE HEADED PERSON)

کرنل کے اس بے تکلفانہ انداز سے میں نے اندازہ لگایا کہ کرنل رنجیت اس کا پرانا اور بے تکلف یار ہے۔ کرنل فنکر نے کرنل رنجیت پر اپنی ”گولہ باری“ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”رنجیت تمہاری کم سے کم سزا میرے خیال میں ملازمت سے برخاستگی ہوگی۔ فوجی ہونے کی وجہ سے تمہیں کوئی دوسرا کام تو آتا نہیں۔ اگر تم کوہوتو میں خود سے اس کے چائے کے کاروبار میں تمہیں شامل کرنے کی سفارش کروں۔“ کرنل رنجیت خاموشی سے سر جھکائے کرنل فنکر کے تمام جملے خاموشی سے سہرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کرنل فنکر نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ”پاکستانی میجر احسن اور اسکے ساتھیوں کے گرفتار ہونے اور ان کے مرنے کے بعد بھی انہوں نے اپنی روش نہ بدلی۔ چند روز پیشتر آگرہ میں دو پاکستانی جاسوس پکڑے گئے تھے۔ ان کے ڈویژن کمانڈر نے انہیں کرنل رنجیت کے حوالے کر دیا کہ F.I.U کے آڈیوں کے ذریعے ان کی تعقیب کریں۔ کرنل رنجیت نے اسے بلا وجہ کی دردمندی سمجھتے ہوئے انہیں آگرے میں دمی کے حوالے کر دیا۔ DMI اور FIUS میں ہمیشہ سے ایک تناؤ موجود ہے۔ DMI والوں نے یہاں اپنے ہیڈ کوارٹر اور آرمی ہیڈ کوارٹر کو مطلع کیا۔ اپنے ہیڈ کوارٹر کی طرف سے میں آگرہ گیا۔ وہاں DMI والوں کا میرے ساتھ رویہ بے تک آمیز تھا کیونکہ وہ صرف پردھان منتری کو جواب دہ تھے۔ میں اسی روز واپس چلا آیا۔ DMI کے دہلی کے افسران ابھی آگرہ جانے کا سوچ ہی رہے تھے کہ پاکستانی جاسوسوں کے ساتھیوں نے نہ صرف انہیں چھڑوایا بلکہ پیرے پر موجود ہمارے 6 جوانوں کو بھی ہلاک کر دیا۔ اب کرنل رنجیت کو یہاں جواب دہی کیلئے بلوایا گیا ہے۔ اس کا G.O.C بھی اس کے ہمراہ آیا ہے۔ اسے بھی کرنل رنجیت کی طرح ہی اپنی غفلت کی جواب دہی کیلئے بلایا گیا ہے۔ رنجیت میرا پرانا دوست ہے میں اسے پچانے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں لیکن اپنے جنرل کے سامنے میں کس حیثیت میں ان کی صفائی دے سکتا ہوں؟“

کرنل رنجیت تھوڑی دیر بعد رخصت لے کر کلب میں اپنے الاٹ شدہ کمرے میں چلا گیا۔ کرنل فنکر تھوڑی دیر سیر اٹھائے ستاروں کو دیکھتا رہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا ”نوندو میں تو یقیناً پاکستانی جاسوسوں کے فرار اور بھارتی جوانوں کی موت سے خوش ہوا ہوں۔ جاسوس جس نظر سے دیکھتا ہے دشمن ملک میں داخل ہوتا ہے اسے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیر کے جڑوں میں اپنا سر رکھ رہا ہے۔ اس کے زندہ واپس لوٹنے کی امید بہت ہی کم ہوتی ہے۔ گرفتار ہونے کے بعد اسے اور اس کے ساتھیوں کو اسی جذبے کے ساتھ اپنی رہائی کی کوشش کرنی چاہئے کیونکہ گرفتار جاسوس کو اپنی رہائی اور زندہ رہنے کی امید ہرگز نہ رکھنی چاہئے۔ جب تک وہ خود اپنی جان داؤ پر لگا کر اپنی رہائی کی کوشش نہ کرے۔ تندرستہ کر اپنی زبان کھولے اور تندرستی کی وجہ سے جان دینے سے بہت بہتر ہے کہ وہ گرفتار کرنے والوں کی کسی کمزوری کو بھی دیکھے تو اس کا بھرپور فائدہ اٹھائے۔ اس طرح یا تو وہ بچ کر بھاگ جائے گا یا پھر گرفتار کرنے والوں کی گولیوں سے ہلاک ہو جائے گا۔ گرفتاری کے بعد موت تو اس کے سامنے منڈلاتی رہتی ہے۔ اسلئے موت کا خوف بالکل نہ کرے اور اپنے بچاؤ کی کوشش ہرگز نہ کرے۔“

کرنل فنکر تو شراب کے نشے میں اس واقعے میں بھارتی فوج کی غفلت کا بار بار ذکر کر رہا تھا اور میں اس کی باتیں انتہائی غور سے سن رہا تھا۔ دشمن ملک کا ایک کرنل مجھے بھارتی سمجھتے ہوئے یہ ”راز“ کی باتیں بتا رہا تھا جو میرے سینئر نے ٹریڈنگ کے دوران مجھے ذرا نرم الفاظ میں بتائی تھیں۔ میں تو دونوں کی باتوں کا تجزیہ کر رہا تھا اور تندرستہ پر چند روز بھی کیونکہ آئندہ سال میں خود ہی ان حالات کا شکار ہونے والا تھا..... تھوڑی دیر کے بعد میں نے کرنل فنکر سے اجازت طلب کی۔ میں اس کے لئے کنٹاکس سے گرم نمکین کا جو لے گیا تھا۔ کرنل نے میرا شکر یہ ادا کیا اور میں واپس اپنے ہوٹل چلا آیا۔

آئندہ کل یعنی ہفتے کو لیٹونٹ کی مراد برآئی تھی۔ لیٹونٹ نے مجھے اس تقریب میں شمولیت کی بھرپور دعوت دی تھی لیکن میں نے معذرت کر لی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس نے اپنے چند دوستوں کو مدعو کیا تھا وہ اس کی اصلی مالی حالت جانتے تھے اور اب ایک لحاظ سے اس طرح دولت لاتا دیکھ کر وہ اگر کچھ شک میں پڑ گئے ہوں تو وہاں مجھے یعنی ایک اجنبی کو اس کے ہمراہ بے تکلفی سے پیش آتے دیکھ کر ان کا شک دو چند ہو سکتا تھا۔ لیٹونٹ میری بات سمجھ گیا۔ میں اسے جنرل کے کاغذات کی رقم پہلے ہی دے چکا تھا۔ لہذا اس نے میری معذرت قبول کر لی۔ میں نے اسے کہا کہ تم نے دیکھ لیا ہوگا کہ تمہارے تعاون کا معاوضہ تمہاری امیدوں سے بہت زیادہ اور ٹھیک وقت پر مل جاتا ہے۔ اب شکی کی وجہ سے تمہاری مالی ضروریات بڑھ جائیں گی۔ اپنی اتنی محنت سے حاصل شدہ خوشی کو عارضی نہ بنا دینا۔ شکی جیسی عورتیں مردوں کو چند ماہ میں ہی اتنی خوشیاں دے سکتی ہیں جو دوسری عورتیں زندگی بھر اپنے مردوں کو نہ دے سکیں کیونکہ شکی جیسی عورتوں کے پیش نظر صرف ایک بات ہوتی ہے کہ کس طرح اپنے عاشق کو خوش کر کے اسکی جیب خالی کریں اور اپنے مقصد کے حصول کیلئے وہ ناز و انداز کا ہر جہاں زماں ہیں۔

ہفتے کے روز لیٹونٹ نے حسب معمول ڈاک میرے ساتھیوں کو دی جسے انہوں نے فوری طور پر کاپیاں کرنے کے بعد اسے شام سے پہلے ہی لوٹا دیا اور اس نئی ڈاک کو بھی کویریئر کو دی جانے والی ڈاک میں شامل کر لیا۔ کیونکہ اگلی صبح اسپیشل کوریئر کی آمد تھی۔ میرے ساتھیوں نے ہفتے کی شام ہی مجھے اپنے گھر میں بتایا کہ دہلی کے بیرون شہر جانے اور آنے والی بسوں کے اڈوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر بھارتی خفیہ پولیس اور فوجی آنے جانے والے مسافروں پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہونٹوں، سراؤں اور مسلمان آبادیوں کی خصوصی نگرانی کی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں کی پولیس کی طرح بھارتی پولیس بھی اونچے درجے کے ہونٹوں میں گھسنے کی جرأت نہیں کرتی۔ مصیبت آتی ہے تو نکلے درجے کے ہونٹوں کی۔ میں نے ساتھیوں کو چونکار رہے اور بلا کسی خاص وجہ کے گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت کی۔ میں بھی جلد ہی اپنے ہوٹل واپس چلا آیا اور سینئر کے نام اپنے خطوط کو آخری ٹیچ دینے لگا۔

اتوار کی صبح میرا ایک ساتھی ڈاک اٹھائے اور دوسرے ساتھی اسے اور مجھے کو دینے کیلئے مقررہ جگہ پہنچ گئے۔ سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن شہر کے بیچوں بیچ بنا ہوا ہے۔ ریلوے پڑیوں کے اوپر شہر کے دونوں حصوں کو ملانے کیلئے ایک اور ہیڈ بروج ہے۔ میں ساتھیوں کو اسٹیشن کی دوسری جانب مارکیٹ میں ایک ہوٹل میں چھوڑ کر اور ہیڈ بروج کے اوپر پہنچا ہی تھا کہ سامنے سے کیپٹن ارشد آتا دکھائی دیا۔ کیپٹن ارشد پاک فوج میں جوڈو کرانے کا ماہر اور تیز دوڑنے میں امتیاز پوزیشن رکھتا تھا۔ میری ٹریڈنگ کے دوران ایک فرلانگ سے شروع کر کے گیارہ میل تک مجھے مسلسل دوڑنے کی ٹریڈنگ اسی نے دی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس سے اپٹ جاؤں لیکن حالات کے تقاضے کے مطابق ہم نے آنکھوں آنکھوں میں ہی علیک سلیم کی۔ اس کے پاس سے گزرتے وقت میں نے سرگوشی میں کہا کہ وہ آگے چلتا جائے میں چند لمحوں میں ہی اس کے پیچھے آ جاؤں گا۔ وہ دھیمی چال سے آگے بڑھتا گیا۔ میں تیزی سے پلٹ فارم پر آیا اور ایک اسٹال سے ایک دو سالے لئے اور واپس بروج کی طرف چل پڑا۔ بروج کی بیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے کیپٹن ارشد کو جالیا۔ اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کیپٹن ارشد نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنے ساتھیوں (کانڈیزرز) کو پل کی اسی طرف بازار میں چھوڑا ہے اور ایک گھنٹے کے اندر امرتسر جانے والی ٹرین پر واپس جانا ہے۔ امرتسر کے نام پر میں چونک پڑا اور پوچھا کہ کوئی راستہ تلاش کر لیا ہے۔ کیپٹن ارشد نے بتایا کہ امرتسر سے پاکستان کو جانے کا ایک نیا راستہ حافظ محمد (لاہور کا رہائشی) پاک بھارت سرحد کا اسمگلر) کے کیریئر نے چند بھجری کے راستہ دریافت کیا ہے بھارتی جانب کے سکھ اسمگلران کے ساتھی ہیں اور وہ بارڈر سے لے کر امرتسر ٹرین کی روانگی تک اپنی حفاظت میں لے کر جاتے ہیں۔ یہ ان کا تقریباً روز کا معمول ہے اور حافظ محمد بھارتی اسمگلرز کی لاہور آمد اور روانگی تک بارود تک ان کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے۔ ہمارا ادارہ حافظ محمد کو ہولتیں فراہم کرتا ہے جس کے عوض اس کے آدی ہمیں بارڈر کے آر پار لے جانے کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار ہیں۔ اسی رستے کو دیکھنے اور چیک کرنے کیلئے وہ خود (کیپٹن ارشد) آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ منڈی صادق گنج (جہاں سے ہم بھارت میں داخل ہوئے تھے) کی نسبت یہ راستہ نسبتاً آسان اور کم خطرناک ہے کیونکہ بارڈر کے دونوں طرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر دو گاؤں ہیں جن کے رہائشی اس کام میں ملوث ہیں اور وہی دہلی تک لے کر آئے ہیں اور واپس بھی وہی لے کر جائیں گے۔

دوران گفتگو ہم اس ہوٹل کے سامنے پہنچے جہاں میرے ساتھی میرے انتظار میں تھے۔ میں ارشد کو اس ہوٹل میں لے گیا اور ساتھیوں کے نزدیک ہی ہم ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ کیپٹن ارشد کا بھارت یا تازہ کا غالباً یہ پہلا موقع تھا۔ میں نے اشارے سے اسے بتایا کہ میرے ساتھی ہیں اور ہم سب مسلح ہیں۔ یہ سن کر کیپٹن ارشد کی پریشانی کچھ کم ہوئی۔ ہم نے چائے پی۔ میں نے کیپٹن ارشد کو ڈاک کی اہمیت کے متعلق مختصر بیان کیا اور کہا کہ پاکستان پہنچ کر منگل کو وائرس پر اپنے بیٹریٹ چھیننے کا بتا دیں تاکہ ڈاک کی کاپیاں ہم تلف کر دیں۔ ہم نے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ ہم ہوٹل سے اٹھے اور ہمارے پیچھے پیچھے میرے ساتھی بھی فاصلہ رکھ کر ہمیں کو دیتے رہے کیپٹن ارشد نے تقریباً سو میٹر دور ایک دوسرے ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے ساتھی وہاں بیٹھے ہیں جن میں ایک حوالدار سے کو دینے کیلئے بھی ہے۔ میں نے کیپٹن ارشد کو اس ہوٹل میں جانے کو کہا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ جس ساتھی نے ڈاک اٹھائی ہوئی تھی وہ آگے بڑھ آیا اور میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ باقی دو ساتھی ہمیں کورے ہوئے تھے۔ اسی انداز میں میرا ڈاک والا ساتھی اور میں ہوٹل کے بالکل نزدیک پہنچ گئے۔ میں نے ڈاک کا پیکٹ اس سے لے لیا اور ہوٹل کے اندر جا کر کیپٹن ارشد کے حوالے کیا۔ کیپٹن ارشد نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ آئندہ وہ کوریئر کا کام انجام دے گا۔ نشانی کے طور پر وہ ”سب ٹھیک ہے“ کیلئے سبز رومال اور خطرے کی صورت میں سرخ رومال گلے میں باندھے رہے گا اور میں بھی انہی سگنلز کیلئے کوٹ کی جیب میں لال اور سبز رومال نمایاں طور پر رکھوں گا۔ آئندہ کے کوریئر اور میں نے اپنے اسی طرح ایک دوسرے کی شکلیں پہچان لیں اور تھوڑی دیر بعد میں کیپٹن ارشد سے رخصت ہونے لگا تو اس نے پاکستان سے آدہ ڈاک کا پیکٹ مجھے اپنے ساتھیوں سے لے کر دیا۔ ڈاک لے کر میں ہوٹل سے باہر آ گیا اور اپنے نمبر ٹو کو دے کر ایک ساتھی کے ہمراہ گھر پہنچ دیا جبکہ تیسرا ساتھی اور میں ریلوے پلیٹ فارم پر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی کیپٹن ارشد اپنے ساتھیوں سمیت آ گیا۔ 10 منٹ میں گاڑی بھی آگئی وہ سب دو مختلف ڈبوں میں بیٹھ گئے۔ گاڑی روانہ ہوئی ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو الوداع کہا اور گھر واپس لوٹ آئے۔

اس دفعہ کی ڈاک میں ہمیں نئے کوریئر کے علاوہ کرنل ہدایات سمیت سختی سے تنبیہ کی گئی تھی کہ اپنی سیکورٹی کا خاص خیال رکھیں۔ ایک ماہ کے اندر ہمارے دو گروپ پکڑے گئے تھے۔ ایک گروپ تو شہید ہو گیا تھا۔ جبکہ دوسرا گروپ جان لیوا ٹریڈنگ کے بعد اپنے پہلے مشن کے دوران ہی پکڑے جانے پر بھارت میں کام کرنے کیلئے بیکار ہو چکا تھا۔ (اس نئے گروپ کے متعلق میں نے کرنل فنکر کے حوالے سے مفصل رپورٹ بھی ڈاک میں بھیجی تھی) ڈاک میں ہمارے گھریلو خطوط بھی شامل تھے۔ ہمارے لئے یہ خطوط کسی نعمت سے کم نہ تھے۔ ان حالات میں دیا غیر میں گھر والوں کی خیریت کی اطلاع ملنا ہی بڑی بات تھی۔ جنرل کی ڈاک آج ہی بھیجی گئی تھی لہذا اس پر کوئی تبصرہ نہ تھا۔ یہ مرحلہ بھی پیچرو عافیت طے ہو چکا تھا۔ میں شام تک ساتھیوں کے گھر میں ہی رہا اور خوب گپ شپ ہوتی رہی۔ شام کو مالک مکان اوپر آیا اور مجھے کہا کہ وہ مجھ سے علیحدگی میں ملنا چاہتا ہے۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ نچے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھوں، چائے اور SNACKS آگے۔

غازی

اس ڈائری میں درج ناموں سے محسوس ہوتا تھا کہ پاکستان میں بھارت نے اپنے جاسوسوں کا بہت بڑا نیٹ ورک بنا رکھا ہے۔ شاید ہی ایسا کوئی شعبہ ہو جس میں بھارتی جاسوس داخل نہ ہوں۔ پشاور سے کراچی تک ہر بڑے شہر اور چھاؤنی میں اس کے کارندے موجود تھے۔ اس میں وہ صنعت کار بھی شامل تھے جنہوں نے حکومت پاکستان سے خصوصی مراعات اور ٹیکوں سے قرضے لے کر بڑی بڑی صنعتیں لگا رکھی تھیں وہ بیورو کریٹس بھی ان کے پے رول پر تھے جن کی قابلیت اور اتھارٹی کے پاکستان بھر میں چرچے تھے۔ ان سیاستدانوں کے نام بھی تھے جن کا قبیلہ دہلی اور گاڈا درگا دہلی تھا اور وہ سیاست دان بھی تھے جو اپنے جلسوں میں پاکستان سے محبت اور اس کی بھائی کیلئے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کے دعوے کرتے تھے۔ سابقہ پاکستان سے سقوط ڈھاکہ کے بعد اس نچے نچے پاکستان میں آنے والے PLANTED مسلمانوں اور ان مسلمانوں کے روپ میں بھارت کے تربیت یافتہ ہندو جاسوسوں کے نام اور CONTACT کے ذرائع بھی درجے۔ میں تو حیران تھا کہ اتنے منظم اور وسیع نیٹ ورک کے ہوتے ہوئے پاکستان اب تک بھارت کے ہاتھوں پچا کیسے ہوا تھا۔ مختصر آپا پاکستان کی حالت اس ڈائری کی روشنی میں سقوط ڈھاکہ سے تین سال قبل کے مشرقی پاکستان کے حالات کے عین مطابق تھی جب ”اگر تلمہ سازش کیس“ منظر عام پر آیا اور اس سازش میں ملوث خدراوں کو قید سے چھڑوانے کیلئے پاکستان کے تقریباً سبھی سیاسی جماعتوں کے لیڈر ایک زبان ہو گئے تھے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ بیورو کریسی کھلے عام پاکستان کے (خدا نخواستہ) ختم ہونے کی باتیں کرتی تھی۔ اعلیٰ کاروباری حلقے اور صنعت کاروں نے حکومت سے عدم تعاون کر کے سول نافرمانی کی صورتحال پیدا کر دی تھی۔ بڑی معذرت کے ساتھ یہ لکھنے پر مجبور ہوں کہ پاکستان کی دفاعی جاسوس ایجنسیاں بھی افواج پاکستان میں شامل ان بنگالی کپتانوں کی نشان دہی میں نام کا ہو چکی تھیں جنہوں نے پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھا کر آرمی، ایئر فورس اور نیوی میں کمیشن حاصل کئے تھے اور پاکستان کے محافظوں کے مجھس میں وہ خدرا کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کر رہے تھے۔ 71ء کی پاک بھارت جنگ سے پہلے ہی بھارت کو پاکستان کے تمام دفاعی راز ان خدراوں نے پہنچا دیئے تھے اور ان خدراوں کی وجہ سے ہی جنگ شروع ہوتی ہی بھارتی ایئر فورس نے پاکستان کے خفیہ ہوائی اڈوں اور AIR STRIPS (چکوال اور شورکوٹ) کو اپنی بمباری کا نشانہ بنا لیا تھا اور پاکستان نے انتہائی مجبوری کے عالم میں اپنی ایئر فورس کے جہاز ایران بھیج دیئے تھے بھارتی بمبار اور لڑاکا جہاز کراچی سے پشاور تک بلا روک ٹوک منڈلاتے رہتے تھے۔ انہی خدراوں نے اس وقت پاکستان کی واحد اہم ”غازی“ کی صحیح نشان دہی کی اور اسے ہمیشہ کے قریب بھارتی فریکٹ جہازوں نے گھیرے میں لے کر DEPTH CHARGERS مار کر ڈبو دیا تھا اور انہی خدراوں نے بھارت کو خفیہ کنگل دے کر پاکستان کے کروڑوں جنگی جہاز خیر کو بھارتی میزائل بوٹ کے میزائلوں کا نشانہ بنا لیا تھا۔ خیر جہاز صرف 6 منٹ میں اپنے سات سو سے زیادہ بحری افسروں اور جوانوں کے ساتھ ڈوب گیا۔ اس جہاز کی زیر قیادت ایک فریگٹ کے بنگالی کپتان نے اپنے بنگالی وائٹریس آپریٹر کے ذریعے بھارتی نیوی کو کنگل دے کر خیر کی نشان دہی کی تھی خود اسے کوئی نقصان نہ پہنچا تھا اور دنیا کو دکھانے کیلئے یہ جہاز بھارتی نیوی کی ”حراست“ میں واکا پیم کی بندرگاہ پر پیچرو عافیت پہنچ گیا۔ مشرقی پاکستان میں ایسٹ پاکستان رجمنٹس، ایسٹ پاکستان رائفلز کے علاوہ بنگالی پولیس نے بھی کھلی بغاوت کر کے اپنے مغربی پاکستان کے افسران اور جوانوں اور ان کے بیوی بچوں کو بے دردی سے شہید کر دیا تھا۔ افواج پاکستان میں مشہور عالم ہو ابا زام ایم عالم جیسے محب وطن بنگالی تو چند ایک ہی تھے جبکہ خدرا بنگالی جوان اور افسر ہزاروں کی تعداد میں تھے جن کی خدرا کی سیاہ کارنامے پاکستان کی تاریخ میں تاقیامت موجود رہیں گے۔ کھٹنڈو (نیپال) میں پاکستان کاسٹریو بنگالی تھا۔ اس نے پاکستانی سفارت خانے پر قبضہ کر کے اس پر بنگالی فوجیوں کا جھنڈا لہرایا اور وائٹریس کی کوڈ اور ڈی کوڈ کی کتاب بھی بھارتی سفارت خانے کے حوالے کر دی۔ اس DEFACTOR (خدرا) کی وجہ سے تمام خفیہ پیغامات بھارت کیلئے کھلی کتاب بن گئے۔ پاکستان نے افراتفری کی حالت میں کھٹنڈو میں ایک کرائے کے مکان میں نئے پاکستانی سفیر اور نئے عملے کے ساتھ سفارت خانہ کھولا اور فوری طور پر اپنی ہونے والی کوڈ اور ڈی کوڈ ایک دنیا بھر میں اپنے سفارت خانوں کو جاری کی۔

بریف کیس میں دوسرے کاغذات اتنے اہم نہ تھے۔ میں نے نمبر نو کوڈ ڈائری کے ہر صفحے کے دو دو نوٹ بنانے کیلئے کہا اور کمرے میں مالک مکان عبدالکریم اور میں رہ گئے۔ ڈیوٹی میں کوڑ دینے والے ساتھیوں کو بھی میں نے آرام کرنے کا کہا۔ یہ ڈیوٹی تو میرے سینئر کیلئے ایک نعمت مرتبھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اتنی اہم ڈائری ہمارے ہاتھ آ جائے گی۔ اس خوشی کے ساتھ ساتھ میں نے کمرے میں موجود بے بیٹنی اور بے اعتمادی کی نفا کو ختم کرنا چاہا۔ میں نے اٹھ کر عبدالکریم اور پھر ڈیر شیریوانی (مالک مکان) کو گلے لگایا اور انہیں تفصیلاً بتایا کہ میں نے اس کمرے میں جو کچھ بھی کیا وہ اپنے مشن کی سیکورٹی کیلئے کیا۔ اب جبکہ تمام غلط فہمیاں دور ہو چکی ہیں تو ہمیں اب مل کر آئندہ کے لئے عمل کے متعلق سوچنا چاہئے۔ صبح ہو چکی تھی، مذہر کے گھر سے گرما گرم چائے اور اٹھنے پر اٹھوں کا ناشتہ آ گیا۔ اب ہمارا فوری اور صل طلب مسئلہ عبدالکریم کی حفاظت کرنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ نہ صرف دہلی بلکہ پورے بھارت میں اس کی تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔ اس کا ان حالات میں بھارت میں کہیں بھی رہنا خطرے سے خالی نہ تھا اور اس کے پکڑے جانے کی صورت میں ہمارا مشن بھی خطرے سے دوچار ہو سکتا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ کم از کم ایک ہفتہ تو عبدالکریم میرے ساتھیوں کے ہمراہ رہے اور کمرے سے باہر نہ نکلے۔ جب دہلی میں اس کی تلاش کی سرگرمی کم ہو جائے تو اسے دہلی کے زیر زمین ہمدردوں کے پاس پہنچا دیا جائے۔ میں اس دوران ڈائری پاکستان بھیج کر اپنے سینئر سے پر زور درخواست کروں گا کہ وہ عبدالکریم کو پاکستان بلوا لیں اور اس کی خدمت کے عوض اسے پاکستان کی شہریت دلوائیں۔ مجھے یقین تھا کہ میری درخواست رد نہیں کی جائے گی۔ عبدالکریم نے پاکستان جانے کی پر زور خواہش ظاہر کی۔ بھارت میں اس کا کوئی قریبی رشتہ دار اور سرپرست نہیں تھی۔ فوج میں اس سے جو ذلت آمیز سلوک کیا جاتا تھا اس کی وجہ سے وہ انتہائی افسردہ اور بددل ہو چکا تھا اور اب سب سے اہم وجہ

کے بریگیڈیئر کا انتہائی خفیہ رازوں سے بھر پور ایف کیس لے کر فرار ہونا تھا اور پکڑے جانے کی صورت میں انتہائی تشدد اور موت اس کا مقدر ہو چکی تھی۔ میں عبدالکریم کو لے کر اوپر ساتھیوں کے پاس گیا۔ ان کی رات بھی آکھوں میں کئی تھی۔ میں نے انہیں تمام واقعہ بتایا اور کہا کہ عبدالکریم اب ان کے ساتھ رہے گا اور اسے کمرے سے باہر ہرگز نہ نکلنے دیں۔ علیحدگی میں انہیں کہا کہ عبدالکریم نے بے شک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور اسے بحفاظت پاکستان بھیجنے کیلئے پوری کوشش کروں گا لیکن وہ عبدالکریم کی طرف سے ہمیشہ محتاط رہیں۔ اس نے بغیر کسی لالچ اور کسی فائدے کے بغیر اتنا خطرناک کام کیا ہے اس کی وہ اس کی بیزاری اور حالات سے سمجھوتہ نہ کرنے والی لابلانی شخصیت ہے۔ بھارتی افسروں کی گالیوں نے چنگاری کو شعلہ بنا دیا ہے۔ اس صورت حال میں وہ یہاں بھی کوئی ایسی حرکت کر سکتا ہے جو ہم سب کو کسی مصیبت میں بھنسا دے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ اول تو وہ کوئی ایسا موقع ہی نہیں آئے دیں اور اگر بغرض محال انہیں ایسی صورت کا سامنا ہوتا تو فوری طور پر اسے خنجر سے ہلاک کر دیا جائے جس طرح اپنی زندگیوں سے زیادہ اپنے مشن کو اہمیت دیتے ہیں ویسے ہی ہمیں اپنے مشن کی حفاظت کیلئے کسی کی جان لینے میں دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ بے شک وہ عبدالکریم ہی کیوں نہ ہو۔ میرے ساتھیوں نے کہا کہ اس صورت میں کم از کم دو آدمی گھر میں ہمیشہ موجود رہیں گے اور بیڑھیوں کے اوپر والے دروازے کو ہمیشہ مقفل رکھیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ عبدالکریم کو انڈر گراؤنڈ ہمدردوں کے پاس نہیں بھیجنا چاہئے۔ ان کے پاس نہ کوئی مشن ہے اور نہ ہی وہ عبدالکریم کی مکمل حفاظت کر سکیں گے۔ ہمیں نہ صرف عبدالکریم کو گرفتاری سے بچانا تھا بلکہ اس کو بھی نامحسوس ہونے والی حراست میں رکھنا تھا۔ اور یہ کام کرنے کا میرے ساتھیوں نے خود ذمہ اٹھایا۔ میں نے ان کی تجویز سے اتفاق کیا اور انہیں مزید ہدایات دے کر پھر مالک مکان کے پاس چلا آیا اور اسے کہا کہ حالات نے اچانک ایسا رخ اختیار کر لیا ہے اسے بھی پوری طرح محتاط رہنا ہوگا۔ کم از کم پندرہ روز تک وہ زیر زمین ساتھیوں سے ملنے سے گریز کرے۔ گھر سے باہر کم ہی جائے اور کسی طرح اپنے گھر کے سامنے والے ہمسائے کو کہے کہ تمہاری بیٹی کی سیکورٹی کے لیے جو بارے پر جو کچھ دیکھا تھا اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ اس پر مالک مکان نے بتایا کہ اس کا ہمسایہ تو خود انڈر گراؤنڈ ہمدردوں کا ایک طرح سے سرپرست ہے اور اس کے گھر سے راز کی کوئی بات باہر نہ نکلے گی۔ اس سے رخصت ہو کر میں اپنے ہوٹل چلا آیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ سو یا تو شام ڈھلے آکھ کھلی۔ دوسرے روز میں نے شہر کا جائزہ لینے کا سوچا۔ بلاوجہ ٹیکسی میں شہر گھومنا محفوظ نہ تھا۔ میں اٹوٹا کا ہوٹل چلا گیا اور وہاں سے ٹورسٹ بس میں بیٹھی اور پرانی دہلی کے قابل دید مقامات کی سیر بھی کی اور شہر کی حالت کا بھی جائزہ لیا ہر جگہ مخصوص لوگوں کی جھاگ دوڑ، خاص طور پر پبلک مقامات اور مسلمانوں کے رہائشی علاقوں میں جگہ جگہ چیکنگ دیکھنے میں آئی۔ قرول باغ اور خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ تو پورے طور پر پولیس کے محاصرے کی حالت میں تھا۔ چاندنی چوک، لال قلعہ، قطب مینار اور رہاویوں کے مقبرے میں بھی سول لباس میں فوجی اور پولیس ہر آنے والے کی جانچ کر رہے تھے۔ انہیں غالباً عبدالکریم کے قدم کا ٹھہرے اور چہرے کے متعلق بریف کیا گیا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ عبدالکریم سے مشابہت رکھنے والے ہر شخص سے پوچھ گچھ کی جارہی تھی۔ دہلی کی یہ حالت کم و بیش پندرہ روز تک برقرار رہی۔ اس دوران ہمیں یثوت سے ڈاک معمول کے مطابق ملتی رہی۔ بدھ کے روز پاکستان رابطہ کرنے پر پھر جب تک پاٹ ملنے کی خبر اور معتبر کیریئر کو بھیجنے کا انتہائی مختصر پیغام بھیجا۔ آئندہ اتوار کو وائٹریس پیغام ملا کہ گزشتہ ڈاک لینے والا کیریئر بدھ کو اس مقام پر ملے گا۔ اس بار بدھ کو کیریئر ارشد پہلے کی طرح ملا۔ میں نے ڈاک اور ڈائری اس کے حوالے کی۔ اپنی ڈاک میں، میں نے عبدالکریم کے کوآف مفصل طور پر لکھے اور اسے پاکستان بلوانے کی درخواست کی۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ عبدالکریم جب تک ہماری حفاظت میں ہے ہمارا مشن اور ہم سب خطرے میں ہیں اور اس کی نگرانی میں ہم وقت مصروف رہنے کی وجہ سے میرے ساتھی آئندہ مشنوں میں ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ لہذا اسے فوری پاکستان بلوانے کا انتظام کیا جائے۔ ورنہ پاکستان کے مفاد کیلئے جان کی بازی لگا کر اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے والے کو زندگی کی ضمانت اور انعام دینے کے بجائے ہمیں مجبوراً ہلاک کرنا پڑے گا۔

میری اس تحریر کا میرے سینئر پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ عبدالکریم کو ہمارا مہمان بنے ٹھیک اٹھارہ روز بعد کو بیڑی سے اپنے ہمراہ پاکستان لے گئے۔ عبدالکریم کو پاکستان کی شہریت دی گئی اور کاروبار کیلئے ساتھ ہزار روپے بھی بطور انعام دیا گیا (پاکستان بھیجنے کے فوری بعد اسے ہماری ایجنسی نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ INTERROGATION اور CRPOSS INTERROGATION کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد اسے CLEAR کر دیا گیا تھا)۔ عبدالکریم نے پاکستان میں شادی کی اور آج بھی الحمد للہ بخیر و عافیت اپنے بال بچوں سمیت پرسکون زندگی گزار رہا ہے۔ جب تک عبدالکریم ہمارا مہمان رہا، ہماری جان گلے میں اٹکی رہی، یہی حال مذہر شیریوانی کا تھا۔ بھارتی پولیس اور فوج نے دہلی سے باہر جانے کے سب راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی اور ہر آنے جانے والے کو انہیں مطمئن کے بغیر نکلنا قنقرہ یا ناممکن تھا جب دو کوریئر عبدالکریم کو لینے آئے تو میرے ساتھیوں نے اسے اپنے پاس رکھی نقلی موٹھیوں، داڑھی اور سکھوں کی پگڑی پہنا کر اسے ایک مکمل سکھ بنا دیا تھا اور میرے دو ساتھی انہیں کوڑ دینے کیلئے سبزی منڈی انڈین شہر شہر تک ٹرین میں ان کے ڈبے میں ہمراہ رہے۔ میرے علاوہ بخیر و خوبی ملے جانے کی خوشی میں ہم نے ایک گھریلو جشن منایا جس میں میرے اور میرے ساتھیوں کے علاوہ مالک مکان مذہر شیریوانی اور اس کے ہمسائے عارف نے بھی شرکت کی۔ اس جشن میں ہم نے ان کے انڈر گراؤنڈ ساتھیوں کی مدد سے اپنے آئندہ ماہ یعنی جنوری 73ء میں کئے جانے والے مشن کے بارے میں ابتدائی بات چیت کی۔ مذہر اور عارف نے یقین دلایا کہ انڈر گراؤنڈ کے بڑے جرات مند اور تیز ہیں۔ انہیں صرف صحیح گائیڈنس کی ضرورت ہے اور ان سے بڑے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ ابھی عبدالکریم کی تلاش جاری ہے۔ اگر چہ اس تلاش میں پہلے والی شدت باقی نہیں رہی لیکن دہلی اور گردونواح کی مسلمان بستیوں پر بھارتی فوج اور پولیس اب بھی خصوصی نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ یہ میرا اور میرے ساتھیوں کا مشاہدہ تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ جب تک حالات بالکل نارمل نہیں ہو جاتے۔ ہم کو احتیاطاً نئے افراد سے ملنے والے میں احتراز کرنا چاہئے۔ انہوں نے بھی میری بات سے اتفاق کیا۔ ہمارے پاس جنوری کے مشن کیلئے خاصا وقت تھا اور ہم جلد ہی میں کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔

پاکستان واپس پہنچنے پر میرے سینئر نے بتایا کہ عبدالکریم کی مہیا کردہ ڈائری ملنے ہی ہم نے اپنی تمام مہیا فورس ان خدراوں کی تلاش اور LANCESURVIEL (نگرانی) کیلئے پاکستان بھر میں پھیلا دی۔ اسکے نتیجے میں بھارتی ایجنٹوں کے کئی گروپ ٹرانسمیروں کے ساتھ پکڑے گئے۔ جن سے تفتیش کے ذریعے بھارت کو کئی گئی معلومات حاصل کرنے کے بعد انہیں شوٹ کر دیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ملکی حالات لمبی تفتیش اور عدالتی کارروائیوں کی پیچیدگیوں کے تحمل نہیں ہو سکتے۔ ٹرانسمیر کا ملنا ہی خدرا کی سب سے بڑا ثبوت ہے اور خدرا کی سزا ہمارے مجھے میں صرف موت ہے۔ اس ڈائری میں درج تفصیلات کے مطابق ان سیاست دانوں، نوکشاہی کے اعلیٰ افسران اور صنعت کاروں اور تجارت کاروں کی بھی بھرپور نگرانی کی گئی اور ثبوت اکٹھے کئے گئے۔ مارچ 73ء میں ان خدراوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ خدرا بیورو کریٹس کو ملازمت سے ہٹا کر لمبی سزائیں دی گئیں۔ ان سے زیادہ براحتراں خدرا صنعت کاروں اور تجارت کاروں کا ہوا۔ جن میں سے بعض نے خودکشی کر لی اور بعض کو ہمیشہ کیلئے غائب کر دیا گیا۔ رہ گئے سیاست دان تو خدرا سیاستدانوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس وقت برسر اقتدار سیاست دان بڑے بلند و بالا گڈوڈوں کے ساتھ برسر اقتدار آئے تھے۔ ان کے وہ دعوے جب سرباب ثابت ہوئے تو انہوں نے اپنی بقا کے لئے گرفتار سیاست دانوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ بہر حال ہم نے اس وقت پاکستان میں بھارت کے موجود تمام جاسوسی نیٹ ورک توڑ دیئے تھے۔

بھارت میں ہمارے گروپ کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ جب ہم بھارت میں داخل ہوئے تو ہمیں اپنے سینئر کے احکامات کی حرف بحرف بجا آوری کا حکم تھا اور اب حالت یہ تھی کہ ہماری غیر معمولی کامیابیوں نے ہمیں اعتماد کے اس مقام پر لاکھڑا کیا تھا کہ ہمارے سینئر ہمارے مشوروں پر عمل کرنے لگے تھے اور یہ سب رب العزت کا کرم تھا جس نے ہمیں ہمیں اس منزل پر پہنچایا۔ مجھے ڈاک میں ایک خصوصی پیغام ملا کہ آئندہ کے مشنوں کیلئے ہندرو پیہ اسلحہ، گریڈ زون وغیرہ درکار ہوں وہ دہلی میں ایک نئے کوڈ کے ساتھ ایک ”ہمدرد“ سے حاصل کر سکتا ہوں۔ اس نئے ہمدرد کو پہلے ہی ہدایات دی جا چکی ہیں۔ معمول کی ضروریات کیلئے مزید پچاس ہزار روپے مجھے بھیج دیا گیا تھا۔ اور کم روپے کے حصول کیلئے پہلے والے ہمدردوں سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔

غازی

ڈی ایم آئی میرے پیچھے پڑ گئی

عبدالکریم کے پاکستان بھیج دینے کے بعد میں ایک شام کرنل شکر سے ملنے گیا۔ میری اتنی لمبی غیر حاضری اسے میرے متعلق شک میں مبتلا کر سکتی تھی۔ سرور کلب میں سولین کے داخلے پر اب ایسی پابندی لگ چکی تھی کہ جس کو ملنا ہو وہ لکھ کر کیکٹرس دے تو پھر ہی نام، پتہ، ملاقات کا وقت درج کیا جاتا تھا اور واپسی پر اس کا فڈ پر صاحب ملاقات کے دستخط اور وقت لکھنا ضروری تھا۔ ان مراحل کو طے کر کے جب میں کرنل شکر کے پاس پہنچا تو اس نے ایک پھینکی میسکر ایٹ سے میرا استقبال کیا۔ لان میں اسی جگہ اس نے محفل بھار کھی تھی۔ میں جا کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور اپنی غیر حاضری کی وجہ سے بیٹھا جانا اور واپسی پر طبیعت کی سازی بتائی۔ ”اچھا ہی، ہوا و نو دجوتم اس عرصے میں یہاں نہیں آئے۔ عبدالکریم مجھے ایک بہت بڑی مشکل میں پھنسا کر فرار ہو گیا،“ میں نے کرنل شکر سے تفصیل پوچھی تو اس نے صرف یہی بتایا کہ عبدالکریم اسے ملنے آنے والے ایک بریگیڈیئر کا بریف کیس لیکر اچانک غائب ہو گیا۔ اس بریف کیس میں انتہائی اہم کاغذات تھے۔ تلاش ایسا کر کے باوجود عبدالکریم ہاتھ نہ آسکا اور اب وہ بریگیڈیئر اور خود کرنل شکر انکوائری کے ذلت امیز اور تھکا دینے والے مراحل سے گزر رہے ہیں۔ کرنل شکر جو پہلے ہی اپنے ذاتی نم شراب کے نشے میں بھلانے کی کوشش کرتا تھا اس نئی مصیبت کی وجہ سے جام پر جام چڑھا رہا تھا ”نوڈ“ اس نے سرگوشی میں کہا ”یہ نیا بیٹ مین اور جو دوسرے سولین ڈریس میں اس کے قریب ہی کھڑے ہیں ہمارے محکمہ جاسوسی کے آدمی ہیں اور میری اور مجھ سے ملنے کیلئے آنے والوں کی نگرانی اور جاسوسی کے لئے کھڑے ہیں اور اس سے زیادہ ذلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ سپاہی اور ICO رینک کے آدمی فل کرنل حاضر ڈیوٹی کی اس کے سامنے جاسوسی کریں۔ اور پھر رینکس میں مجھ سے بہت کم تر درجے کے جو افسر مجھ سے تقیظ کرتے وقت ”سر“ کا دم جھلکا کر مجھ سے ایسے ذلت آمیز سوال کرتے ہیں کہ جی جانتا ہے کہ میں انہیں شوٹ کر دوں۔ میں نے تو پکا فیصلہ کر لیا ہے کہ انکوائری کے نتیجے میں اگر مجھے فوج سے نہ نکالا گیا تو میں خود ہی فوج کو چھوڑ دوں گا۔ مجھ سے یہ ذلت آمیز زندگی اب مزید برداشت نہیں ہو سکتی۔ میرا قصور کیا ہے۔ بیٹ میں عبدالکریم کو خود اسی محکمے والوں نے اپنی تسلی کے بعد مجھے دیا تھا۔ وہ بریف کیس لے کر بھاگ گیا تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ یہ غلطی تو اس بریگیڈیئر کی ہے جو اتنے اہم کاغذات جنہیں دفتر سے نکالنے کی ہرگز اجازت نہ تھی بریف کیس میں ڈالے پھر ہاتھ چھوٹنے لگے تقیظ بھی اس کا حکم خود کر رہا ہے اس لئے وہ سارا ملہ مجھ پر ڈالنے کی کوشش میں ہیں۔ آج تم یہاں آئے ہو اور کل کو ہی اس محکمے کے آدمی تمہارے ہوٹل میں پہنچ جائیں گے اور تم سے طرح طرح کے سوال پوچھیں گے۔ تم ہرگز نہ گھبرانا اور بلا جھجک ان کے ہر سوال کا مناسب جواب دے دینا۔ مجھ سے ملنے کی وجہ پوچھیں تو کہہ دینا ہماری پہلی ملاقات آج سے چند ماہ پہلے اکبر ہوٹل میں ایک ڈریس شو میں ہوئی تھی اور ہم مزاجی کی وجہ سے ملاقاتیں بڑھتی رہیں۔ میں بھی انہیں یہی بتاؤں گا تا کہ دونوں کے بیانات ٹیلی ہو سکیں“ میں نے کہا کرنل صاحب اگر مجھے حالات کا علم ہوتا تو میں آتا ہی نہیں۔“ ”یہ بات نہیں بلکہ تمہارا آج یہاں آنا تمہارے اور میرے دونوں کے حق میں بہتر ہوا ہے اگر تم نہ آتے تو یہ عبدالکریم کے غائب ہونے کے بعد تمہارے نہ آنے کی وجہ سے مشکوک ہو جاتے۔ تمہارا اب یہاں آنا ہی تمہاری صفائی کے لئے کافی ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تم اب میرے پاس اپنی آمد و رفت بڑھادو تا کہ شک کی مدہم ہی لکیر بھی ان کے ذہن میں ہو تو وہ مٹ جائے۔“ کرنل شکر کے پاس کچھ دیر اور بیٹھ کر اور جلدی ہی ملنے کا وعدہ کر کے میں اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا کہ سولین کپڑوں میں سے ایک نے برآمدے میں دوسرے کو نئے میں کھڑے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ کلب سے باہر میں نے ٹیکسی لی تو جلد ہی محسوس ہوا کہ ایک گاڑی ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ میں نے اس نگرانی کی تصدیق کے لئے ٹیکسی کو کناٹ سرکس چلنے کو کہا۔ وہ گاڑی مسلسل ہمارا پیچھا کر رہی تھی۔ کناٹ سرکس میں ایک دکان سے تھوڑی بہت شاپنگ کر کے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ڈیوٹی ہوٹل چلنے کو کہا۔ لودی ہوٹل تک اسی گاڑی نے ہمارا پیچھا کیا۔ میں تو ٹیکسی فارغ کر کے ہوٹل کے اندر چلا گیا نہ معلوم وہ گاڑی کب تک وہاں کھڑی رہی۔ میری MOBILE SURVIILLANCE شروع ہو چکی تھی اور بہت جلد ہی STATIC SURVIILLANCE شروع ہونے والی تھی۔ میں کمرے میں چلا آیا اور ان سے منٹنے کے ذرائع سوچنے لگا۔

اگلے دن صبح سویرے ہی اپنے ساتھیوں سے ملنے اور انہیں اپنی نگرانی شروع ہونے کی اطلاع دینے ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ ہوٹل کی لابی میں صرف ایک دو غیر ملکی ٹورسٹ بیٹھے تھے۔ ہوٹل کے باہر پارکنگ سے گزرتا ہوا میں سڑک پر آ گیا۔ میں عمداً اپنے ساتھ اسلحہ نہیں لایا تھا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میں نے کئی بار چانک پیچھے گھوم کر دیکھا کہ میرا پیچھا تو نہیں ہو رہا۔ لوگ فٹ پاتھ پر آ جا رہے تھے لیکن ان میں کوئی میرا پیچھا کرنے والا دکھائی نہ دیا۔ میں نے اپنے فٹ پاتھ اور سڑک کی دوسری جانب کے فٹ پاتھ پر آنے والوں کی شکلوں کو ذہن نشین کر لیا۔ آگے گئے چوک تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی رفتار ایسی رکھی کہ جب سڑک پار کرنے کا اشارہ روشن ہو جائے تو میں اس وقت وہاں پہنچوں۔ اشارہ روشن ہوتے ہی میں نے سڑک پار کی اور دوسری جانب کے فٹ پاتھ پر پہنچ کر وہاں چلنا شروع کر دیا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد میں نے جوتوں کے تسمے باندھنے کے بہانے جھک کر پیچھے خوب اچھی طرح سے دیکھا۔ لیکن کوئی بھی پہلے دیکھا ہوا چہرہ نظر نہ آیا۔ اس طریقے سے پیچھا کرنے والے خود کو ظاہر کے بغیر پیچھا نہیں کر سکتے۔ اور ان کا نگرانی کرنے کا تسلسل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ پیچھا کرنے والی گاڑی بھی U-TURN لے لے بغیر اپنی کارروائی جاری نہیں رکھ سکتی۔ جب میں نے آل کیسٹر دیکھا تو ایک خالی ٹیکسی کو روک کر اس میں بیٹھ گیا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے میں نے کئی بار پیچھے دیکھا۔ کوئی گاڑی بھی اس نیت سے آتی دکھائی نہ دی۔ مزید احتیاط کیلئے میں نے ٹیکسی کو جن پر پیت چلنے کو کہا۔ ہاں پر ایک سڑک گول پکھرتی ہوئی پھر بڑی سڑک میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس پکھروالی سڑک کا پورا پکھر (جو عام حالات میں کوئی احمق ہی لگا سکتا ہے) لگا کر ہم پھر بڑی سڑک پر آ گئے۔ اس دوران میں نے پیچھے کی ٹریفک پر پورا دھیان رکھا۔ کوئی گاڑی بھی ہمارا پیچھا کرتے دکھائی نہ دی۔ وہاں سے میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو کناٹ ہیلس چلنے کو کہا۔ ڈرائیور بھی حیران تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں اسے خود ہی بتایا کہ مجھے صبح سویرے ہوا خوری کی عادت ہے۔ کچھ دیر پیدل چلنے کے بعد مجھے ٹانگ میں درد محسوس ہوا۔ لہذا میں نے عادت پوری کرنے کیلئے ٹیکسی لے لی۔ ٹیکسی کے پیشے میں نے اتار رکھے تھے۔ ٹھنڈا ہوا کے تپیزوں سے میرا چہرہ سن ہو چکا تھا لیکن یہ ضروری تھا۔

کناٹ ہیلس پہنچ کر میں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور ایک اعلیٰ ریسٹورنٹ میں جا کر بھر پور ناشتے کا آرڈر دیا۔ ریسٹورنٹ کے دروازے کے ساتھ ہی لگے پبلک ٹیلی فون تو مجھ سے مذہر شیروانی (مالک مکان) کا نمبر ملایا اور اسے اپنے نمبر کو بولانے کیلئے کہا۔ تین منٹ ختم ہونے سے پہلے ہی اگر SLOT میں مزید سکے نہ ڈالے جائیں تو فون خود بخود ڈس کنکٹ ہو جاتا تھا۔ مزید سکے میں نے ہاتھ میں تھام رکھے تھے۔ میرا نمبر فون پر آیا تو میں نے اسے بتایا کہ میری نگرانی ہو رہی ہے اسلئے مجھے ہوٹل میں ٹیلی فون ہرگز نہ کیا جائے اور نہ ہی مجھے ملنے کوئی ہوٹل میں آئے جب تک کہ میری نگرانی ختم نہ ہو جائے اور میں انہیں ALL CLEAR نہ کہوں۔ میں خود ہی ہر روز 10 سے 11 بجے کے دوران انہیں کہیں نہ کہیں سے فون کر لیا کروں گا۔ یسٹنٹ سے بروقت ڈاک لینے اور پاکستان سے ٹرانسمیٹر پر پیغام وصول کرنے میں کوتاہی ہرگز نہ کی جائے اور میرے فون کرنے پر مجھے تفصیلات بتا دی جائیں۔ میرا نمبر ٹویمری نگرانی کی بات سن کر پریشان ہو گیا اور اس نے مجھے کہا کہ ہمارا وہ ساتھی جو جوڈو کر لے گا ماہر اور بہت اچھا ناشتہ خچی تھا اگر ALL CLEAR ہونے تک میرے ہوٹل میں کمرہ لے کر وہاں مجھے کور دے اور حفاظت کرے تو بہت بہتر ہوگا۔ میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ فون پر گفتگو کے بعد میں نے ریسٹورنٹ میں ناشتہ کیا اور اشوکا ہوٹل جا کر ٹورسٹ بس میں پھر سارے دہلی کا پکھر لایا۔ میں نے محسوس کیا کہ پہلے والی کڑی چیکنگ میں اب خاصی کمی ہو چکی تھی۔ عبدالکریم کی کم از کم دہلی میں اب تک موجودگی سے وہ ناامید ہو چکے تھے۔ تقریباً چار بجے میں واپس اپنے ہوٹل میں پہنچا تو میرا ساتھی لابی میں بیٹھا تھا۔ میں کمرے کی چابی لینے کیلئے ریسپشن پر گیا تو وہ بھی وہاں پہنچ گیا اور قردے بلند آواز میں اپنے کمرے کی چابی مانگی۔ اس کا کمرہ میرے کمرے کی طرح فرسٹ فلور پر تھا۔ مجھے بھی تسلی ہو گئی کہ خدا خواستہ کوئی مشکل میں پڑنے پر میں بالکل ہی اکیلا نہیں ہوگا۔ ریسپشن پر مجھے بتایا گیا کہ دو صاحب مجھ سے ملنے کیلئے آئے ہیں اور پھر آنے کا کہہ کر چلے گئے تھے (ریسپشن پروالوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے میرے قیام کی تاریخ سے لیکر آج تک میری مصروفیات کے بارے میں کب کب پر پوچھا تھا۔ صبح کی شفٹ والا ریسپشن کا عملہ اس وقت چا چکا تھا۔) (یہ بات دوسرے دن مجھے ریسپشن کے اس لڑکے نے بتائی جسے میں گاہے بگاہے تھوڑے بہت روپے دیا کرتا تھا اور اکثر وہی لاکر کے ڈبل لاک کی چابی لاکروم میں لاتا تھا) میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور فوراً ہی دونوں داخل، گولیاں، چھری والا بید اور اپنی اصل شناخت کی ساری چیزیں لے کر ساتھی کے کمرے میں جا کر اور اسے دے کر وہاں اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ میرے کمرے میں اب میرے ذاتی استعمال کی اشیاء کے علاوہ کھلی چائے کے پیکٹ اور دو تین بڑے تھیلوں میں نمی سے محفوظ کاغذوں میں بند مختلف اقسام کی کھلی چائے کے بنڈل رہ گئے تھے میں نے ذہنی طور پر خود کو انکوائری کرنے والوں کے سوال و جواب کیلئے تیار کر لیا تھا۔

دوسری صبح 9 بجے سے پہلے ہی میرے فون کی گھنٹی بجی اور ریسپشنسٹ نے بتایا کہ دو صاحب مجھے ملنے کیلئے لابی میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور اپنے ساتھی کے کمرے کے دروازے پر مخصوص طرز کی دستک دے کر لابی میں آ گیا۔ لابی میں کئی کئی اور غیر ملکی بیٹھے ہوئے تھے۔ دو شخص مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور میری طرف بڑھے۔ غالباً گزشتہ شام ہی انہوں نے ریسپشن سے میرے چلنے کا پوچھا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مجھ سے میرا نام پوچھا۔ جب میں نے اپنا نام و نوڈ چوڑا دیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ مجھ سے ملنا اور کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے میں نے ان کا تعارف پوچھا تو انہوں نے نہایت نرمی سے بتایا کہ وہ فوج کے ایک حساس ادارے سے آئے ہیں۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر اور دوسرا جوان تھا۔ میں انہیں لے کر کافی شاپ میں آ گیا اور اپنے اور ان کیلئے کافی منگوائی۔ اتنی دیر میں میرا ساتھی بھی ایک دوسری ٹیبل پر آ کے بیٹھ گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ چائے پینے اور اخبار پڑھنے میں لگن تھا لیکن یقیناً اس کا دھیان ہماری طرف ہی تھا۔ میں نے انہیں کافی پیش کرتے ہوئے پوچھا کہ میں ان کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔ ادھیڑ عمر نے مجھ سے میرے کاروبار کے متعلق پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ کھلی چائے کا BLENDER اور بیو پارٹی ہوں۔ یہی میں رہتا ہوں اور گزشتہ چند ماہ سے دہلی میں اپنے کاروبار کی وسعت کیلئے مقیم ہوں کیونکہ یہاں سے پنجاب، ہریانہ، دہلی کے علاوہ اتر پردیش میں میری چائے کو اچھی پذیرائی مل رہی ہے۔ میری بات سن کر وہ فوراً کرنل شکر پر آ گئے اور اس سے میرے تعلقات کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ کرنل شکر سے غالباً پہلی ملاقات اکبریا شوکا میں ایک ڈریس شو میں ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات میں ہی ہم مزاجی کی وجہ سے ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ نتیجتاً میں اکثر اپنی خالی شامیں کرنل شکر کے ساتھ گزارتا ہوں اور آج شام بھی کرنل شکر کے پاس جاؤں گا۔ پرسوں شام بھی انہی کے ساتھ تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آپ کی اس پوچھ گچھ کا مقصد کیا ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ اپنے دیش کیلئے میں ہر ممکن تعاون کرنے کیلئے تیار ہوں لیکن مجھے کچھ بتائیں تو سہی۔ اب وہ مجھے کیا بتاتے، لگے ادھر ادھر کی باتیں کرنے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں نے ابھی تک آپ کی شناخت دیکھی بھی نہیں ہے۔ آپ کی زبانی بات پھر دوسرے کمرے میں نے آپ کی سب باتوں کا جواب دیا ہے۔ اب میں آپ کی کسی بھی بات کا جواب اس وقت تک نہیں دوں گا۔ جب تک آپ اس پوچھ گچھ کی وجہ نہیں بتائیں۔ میں کوئی اجنبی یا انجان شخص نہیں ہوں۔ میری سینٹرل منسٹر سے لے کر فوج کے اعلیٰ افسران تک رسائی ہے (یہاں میں نے نہیں کے بریگیڈیئر اور اس منسٹر کا نام لیا۔ جن کی گفتگو کی ریکارڈنگ آشنائے مجھے دی تھی) اور آج شام کرنل شکر کو بھی آپ کی یہاں آمد کا بتاؤں گا۔ میری اس دھمکی امیز گفتگو نے ماحول بالکل الٹ دیا۔ اب وہ میری اس طرح سے منٹیں کر رہے تھے کہ یہ محض غلط فہمی تھی جو انہیں یہاں لے آئی اور مجھے اس ملاقات کو نہیں بھول جانے کا کہہ رہے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں آزاد دیش کا شہری ہوں۔ آئم ٹیکس ادا کرتا ہوں اور کسی غیر قانونی کام میں ملوث نہیں ہوں اور آپ بغیر کچھ بتائے مجھ سے سوالات کرتے جا رہے ہیں اور میں نے ایک شریف شہری کی طرح آپ کے سوالات کے جوابات دیئے ہیں۔ میری ان باتوں سے وہ بالکل ہی دھمکے پڑ گئے اور کئی بار معذرت کرنے کے بعد وہ رخصت ہوئے۔ اس دوران میری اندرونی کیفیت یہ تھی کہ میں اچھا خاصا خوفزدہ ہو چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آئندہ کے حالات اس پہلی ملاقات پر منحصر ہیں۔ لہذا میں نے ان پر اپنا مکس جمانے میں اپنی پوری توانائی صرف کر دی تھی۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ بات بہتیں پر ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ میری نگرانی کا سلسلہ کئی روز جاری رہے گا۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میرا ساتھی بھی چند منٹ بعد کافی شاپ سے اٹھ آیا۔ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ جان بوجھ کر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ساتھی سامنے سے گزرا تو میں نے اسے کہا کہ وہ ساتھیوں کے پاس جائے اور انہیں تسلی دے کہ سب ٹھیک ہے اور آئندہ چند روز تک میرے بجائے وہ ان سے ملا کرے گا۔ جب وہ جانے لگا تو میں نے اسے 6 ہزار روپے پیدیا کہ یسٹنٹ کو ہر دوسری ڈاک کے ساتھ 2 ہزار روپے پیدیا جائے اور میرے متعلق بتائے کہ میں چند روز کیلئے دہلی سے باہر گیا ہوں۔

بعد دوپہر میں ہوٹل سے باہر نکلا اور ایک ٹیکسی لی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے محسوس ہو گیا کہ ایک گاڑی ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ میں ادھر ادھر کے بلا مقصد پکھراٹ کناٹ ہیلس پہنچا اور اسٹیشنری کی ایک بڑی دکان سے کچھ سامان خریدا اور واپس ہوٹل آ گیا۔ وہ گاڑی ہوٹل واپس پہنچنے تک میرا پیچھا کرتی رہی۔ چونکہ مجھے اپنی نگرانی ہونے کا علم ہو چکا تھا اس لئے میں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ شام کو میں کرنل شکر کے پاس چلا گیا۔ اس بار ایک دوسری گاڑی میرا پیچھا کر رہی تھی۔ کرنل شکر کے پاس میں دو گھنٹے سے زائد بیٹھا رہا اور اسے مختصر آج ہوتل میں ملنے والوں اور نگرانی کے متعلق بتایا۔ کرنل شکر نے کہا کہ چند روز کے اندر یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ یہ ان کی ROUTINE کی کارروائی ہے۔ مزید چند روز تک یہ نگرانی کا سلسلہ جاری رہا اور پھر ختم ہو گیا۔ اس دوران میں کرنل شکر سے دو بار اور ملاسا نے مجھے بتایا کہ اس نے جنرل کو اپنی اور اپنے دوستوں کی نگرانی اور پوچھ گچھ کے متعلق تفصیلاً رپورٹ کی ہے۔ کرنل شکر آرمی ہیڈ کوارٹر کا افسر تھا اور اس کی پوسٹ خاصی اہم تھی اور پھر جو واقعہ پیش آیا تھا۔ اس میں کرنل شکر کسی طرح سے بھی ملوث نہ تھا۔ اس کے جنرل نے یقیناً اس کی رپورٹ کا نوٹس لیا ہوگا۔ تبھی اس کی نگرانی اور اس کے واقف کاروں کی نگرانی ایک روز چانک ختم ہو گئی۔ میرا ساتھی نگرانی ختم ہونے کے بعد بھی دس روز میرے ہوٹل میں ہی مقیم رہا اور اس کے ہوٹل سے جانے کے دوروز بعد میں بھی احتیاط کے طور پر ZIG ZAG راستوں سے ہوتا ہوا اپنے ساتھیوں سے ملا۔ مزید چند روز معمول سے زیادہ احتیاط برتنے کے بعد ہم سب نے اپنے پہلے والی روٹین اختیار کر لی۔

میں نے ایک روز مذہر شیروانی اور عارف سے میٹنگ کی اور ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ نیو ایئر کی رات کو ہمیں کچھ ہنگامہ کرنا چاہئے۔ نئے سال کی آمد کی خوشی میں 31 دسمبر کی رات کو گولے وغیرہ تو چھوڑے جاتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ اس رات ٹھیک 12 بجے جب بڑے ہوٹلوں کے بال رومز میں ایک منٹ کیلئے بالکل اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔ اگر عین اس وقت اشوکا اور اکبر ہوٹل میں بڑے کریکر چھوڑے جائیں تو بڑا شور شرابہ مچے گا کیونکہ اس رات بھارتی آرمی، ایئر فورس اور نیوی کے اعلیٰ افسران بھی ان جگہوں پر موجود ہوں گے۔ ہالوں کے اندر کریکر چھٹنے سے افراتفری اور سرسیمیگی پھیل جائے گی جس کا دوسرے دن کے اخباروں میں خوب چرچا ہوگا۔ یہ ایک طرح سے ہماری ریہرسل تھی اس کام کی جو ہم 26 جنوری کو بھارتی مسلح افواج کی پریڈ کے دوران دکھانا چاہتے تھے۔

غازی

مذہب اور عارف نے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا بلکہ یہ کہا کہ یہ سب کام انڈر راکرڈ نو جوان مسلمان لڑکے سرانجام دیں گے۔ میں انہیں صرف ہدایات دوں۔ اس کام کے لئے مجھے ان لڑکوں سے ملنا تھا۔ میں نے ان پر اپنا یہ شک پہلے ہی ظاہر کر دیا تھا کہ ممکن ہے، ان لڑکوں میں بھارتی حکومت کے پلانڈ بھی شامل ہوں۔ اس لئے وہ میری اصلیت اور میرے ساتھیوں کے متعلق انہیں کچھ نہ بتائیں۔ بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ ان لڑکوں کو لیڈر سے مجھے ملوایا جائے۔ میں اسے ہدایات دوں اور وہ لیڈر میری ہدایات کی روشنی میں لڑکوں سے کام لے۔ دوسرے دن ہی مجھے نمبر ٹوکے ذریعے یہ پیغام ملا کہ شام کو 6 بجے لیڈر سے ملنے جانا ہے۔ مقررہ وقت پر میں ساتھیوں کے گھر چلا گیا۔ مذہب اور عارف تیار تھے۔ ہم نے ٹیکسی لی اور عارف نے اسے جھٹھ لال میاں چلنے کو کہا۔ جھٹھ لال میاں میں ایک جگہ ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور عارف ہمیں قریب ہی ایک گیرج میں لے گیا۔ اس نے گیرج میں کام کرنے والے ایک لڑکے سے کچھ کہا اور تھوڑی دیر بعد ہی ہم گیرج کے اندر وہی جھے میں ایک ڈرائنگ روم نما کمرے میں پہنچا دیئے گئے۔ وہاں ایک شخص نے بھرپور مسکراہٹ سے ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنا تعارف بشیر احمد کے نام سے کیا۔ یہ نام سن کر میں کچھ چونک سا گیا۔ لاشونہ نے بھی کہا تھا کہ جھٹھ لال میاں میں بشیر گیرج والے سے اس نے چایا ہوا، بخواتی تھیں۔ تعارف اور ریکی کلمات کے دوران ہی چائے اور خشک فروٹ آگیا۔ بشیر عارف نے اس ملاقات کا پہلے ہی سے بتا دیا تھا اس لئے ہی ہماری خاطر ومدارات کا سب انتظام تھا۔ بشیر نے بغیر کسی لاگ پیٹھ کے بتایا کہ ”گیرج کا کام تو ہونے کے برابر ہے۔ میں سے زیادہ لڑکے اس کے پاس کام کرتے ہیں جبکہ ہفتوں کوئی گاڑی مرمت کیلئے نہیں آتی۔ اپنے اور ان لڑکوں کے اخراجات پورے کرنے کیلئے ان سب کو غیر قانونی کام کرنے پڑے ہیں۔“ صاحب! یہ ہندو ہی تو ہم مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے ہیں لیکن اپنے ناپ جائز کام کروانے کیلئے ہاتھ جوڑتے ہیں، خاصا رو پیہ دیتے ہیں اور اگر میں انکار کر دوں تو سفارشی بنا کر اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو ہمراہ لے آتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ہر جائز و ناجائز کام کرتا ہوں، ان کی اتنی جرات نہیں کہ وہ میرے خلاف پولیس میں رپورٹ کریں اور اس علاقے کی پولیس بھی ہماری جانب سے آنکھیں اور کان بند کر سکتی ہے۔ کیونکہ میرے لڑکے ایک جگہ نہیں بلکہ کئی جگہوں پر بکھرے رہتے ہیں۔ میں نے سب لڑکوں کو (چاقو کی ایک قسم) کا استعمال ٹھیک ٹھاک سکھا رکھا ہے۔ یہاں کچھ عرصے قبل ایک نیا تھانہ بنا دیا تھا۔ اس نے مجھے کئی بار تھانہ بلایا اور غیر مذہب انداز میں پیش آیا۔ ایک روز میں تھانہ میں بیٹھا تھا کہ قزول باغ کے لڑکوں نے گھر سے نکلنے ہی اس کی استرازا نکال باہر کہیں۔ میری تھانہ میں موجودگی میں ہی اس کی لاش تھانے لائی گئی۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہ تھا۔ لڑکے واردات کر کے اپنے علاقے میں روپوش ہو گئے تھے۔ یہ علاقہ مسلمانوں کا ہے۔ یہاں سخت سے سخت تھانہ دار بھیجا گیا لیکن کسی نے بھی تھانہ میں گاندنوں کا پیٹ بھرنے کے سوائے عملی طور پر کچھ نہ کیا۔ یہ ہندو صرف کمزور ظلم و ستم کرتا ہے۔ ذرا کسی نے آنکھ میں آنکھ ڈال کر دیکھا تو فوراً بیٹھی ملی بن جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بشیر اس پہلی ملاقات میں مجھ پر اپنی اہمیت جتانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ہمیں 31 دسمبر کی رات کو کچھ جگہوں پر دھماکے کرنے ہیں جس کیلئے ٹر، چست لڑکے اور بڑے کرئیکرز کی ضرورت ہے۔ بشیر میری بات سن کر نفس پڑا اور بولا، صاحب میرے لڑکے تو اتنے بڑے ہیں کہ اگر میں کہوں تو وہ خود اپنے پیٹ میں چاقو گھونپ لیں اور جہاں تک کرئیکرز کا سوال ہے تو یہاں ہر قسم کی گولیوں کے علاوہ پینڈر گرنیڈ بھی آپ کا یہ غلام بناتا ہے۔ میرے گا کہ تو (ایک آنکھ دبا کر مدھیہ پردیش کی پھاڑیوں اور سانجھ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

عارف نے بشیر کے کو میرے متعلق پہلے ہی بتا دیا تھا اس لئے اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ بشیر جیسے کم پڑھے لکھے ہنرمند آدمی جو غیر قانونی کاموں میں بھی ملوث ہوں کو جب اپنے مذہب کے مفاد کیلئے کوئی کام کرنے کا موقع ملتا ہے تو وہ بڑے سے بڑا کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ بشیر کی بھارت میں یہی حالت تھی۔ اس نے ان کے روزگار مسلمان لڑکوں کے گروہ بنا رکھے تھے جو ملی جموریوں کا شکار تھے۔ بھارت میں ویسے مسلمان ہونا ہی سب سے بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ لڑکے اس کے گروہ میں بھی شامل تھے۔ بشیر ان سے جو بھی کام لیتا، ہو گا وہ یقیناً خلاف قانون ہو گا لیکن وہ کوئی منظم گروہ نہ تھا۔ جب بھی جہاں بھی کوئی موقع ملتا، وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں گے۔ نہ تو ان کی کوئی تربیت ہوئی تھی اور نہ کوئی مخصوص مقصد ان کے پیش نظر تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر 31 دسمبر کو انہوں نے حسب منشا کام کیا تو انہیں میں جہاں تک مجھ سے ہو سکا، تربیت دوں گا اور انہیں ایک یونٹ کے طور پر واضح نصب العین کے ساتھ کام کرنے کی ترغیب دوں گا۔

میں نے بشیر سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے ٹر اور چست لڑکوں میں سے نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے لڑکوں سے ملوادے۔ اکبر اور اشوکا، ہوٹل میں نیو ایئر ٹائٹ کے لئے ٹیبلوں کی ریزرویشن صرف جوڑوں کے لئے ہو سکتی تھی اور اس GATHERING میں شامل ہونے کیلئے اچھے لباس کے علاوہ PERSONALITY کی بھی ضرورت تھی۔ میں نے لڑکوں کا ساتھ دینے کیلئے لڑکیوں کے متعلق تو سوچ لیا تھا کہ ان ہونٹوں کی لابی میں ایسی بہت لڑکیاں مل جاتی تھیں۔ لڑکوں کیلئے موزوں لباس بھی ملے سلائے مل سکتے تھے۔ بشیر نے مجھے دو روز بعد شام کو اپنے SELECTED لڑکوں سے ملوانے کا وعدہ کیا اور ہم بشیر کے رات کے کھانے تک رکنے کے بے حد اصرار کے باوجود اس سے دو دن بعد ملنے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو ساری بات بتائی اور ہم نے اپنے طور پر یہ پروگرام بنایا کہ ہم اور خصوصاً میں اس رات اشوکا اور اکبر، ہوٹل کے قریب بھی نہ پھنکیں گے۔ میں لودھی ہوٹل کے درمیانے درجے کے پروگرام میں شامل ہوں گا۔ جبکہ میرے ساتھی کا روٹیشن ہوٹل میں اپنی شام گزاریں گے۔

دو روز بعد مذہب، عارف اور میں پھر بشیر کی گیرج میں گئے۔ خاطر ومدارات کے بعد بشیر نے اپنے شاگرد کو آواز دی جو اپنے ہمراہ چار لڑکوں کو لیکر کمرے میں آگیا۔ ان چاروں کی عمریں میں اور پچیس سال کے درمیان تھیں اور شکل و صورت سے بھی وہ اچھے گھروں کے لگتے تھے۔ انہوں نے فردافردا ہم سب سے باادب ہو کے ہاتھ ملایا اور بیٹھ گئے۔ میں نے ان کے نام اور تعلیم پوچھی تو انہوں نے اپنے ناموں کے ساتھ تعلیم بتائی۔ ان میں سے دو ایف اے تھے۔ ایک بی اے اور ایک مینٹر تھا۔ بشیر نے بتایا کہ اس نے انہیں پہلے ہی بتا دیا ہے کہ انہیں کیا کام کرنا ہو گا، جس کی انہوں نے بڑی خوشی سے حامی بھری ہے۔ ان چاروں کو دیکھ کر اور ان سے مزید گفتگو کے بعد میں نے پروگرام میں ذرا تبدیلی کی اور دونوں ہونٹوں میں دو دو جوڑے بیچنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے یہ فیصلہ اس وجہ سے کیا کہ ایک منٹ کے لئے تار کی ہونے کے درمیان ایک شخص صرف ایک کرئیکر ہی چلا سکتا ہے۔ اگر وہ ہونٹوں میں مختلف اطراف میں دو کرئیکر چلنے سے افزائے میں دو چھٹا اضافہ ہو سکتا ہے۔ میں نے لڑکوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس گہرے رنگوں کے سوٹ اور اوور کوٹ ہیں۔ بشیر نے بتایا کہ وہ خصوصی طور پر چھپے کرئیکر بنا کر دے گا۔ جو لباس میں بخوبی چھپائے جاسکتے ہیں اور ان کا دھماکہ بہت شدید ہو گا۔ میں نے لڑکوں کو کہا کہ روشنیاں گل ہوتے ہی انہیں کرئیکر چلانے اور انہیں ہال میں اچھال کر درمیان میں بھیجنا ہو گا اور یہ سارا کام 25 سینٹھ سے بھی کم وقت میں کرنا ہو گا۔ میں چاہتا تھا کہ روشنیاں گل ہونے کے وقفے کے دوران ہی کرئیکر پھٹ جائیں۔ بالکل اندھیرے میں پرجھوم ہالوں میں کرئیکر پھٹنے سے جو سراسیمگی اور ہوش پھیلنے لگی تھی اس کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔

میں نے بشیر کو کہا کہ کرئیکرز کے ساتھ بارودی مٹی اتنی چھوٹی لگائے جو 50 سینٹھ میں کرئیکر چلا سکے۔ غرضیکہ ابتدائی تربیت اور پروگرام پر عمل کرنے کی ہدایات دے کر میں نے بشیر کو کہا کہ میں ان لڑکوں سے حلف لینا چاہتا ہوں۔ وہ تیار ہو گئے اور میں نے ان سے حلف لیا کہ وہ اپنا کام پوری تندرہ اور ہدایات کے عین مطابق سرانجام دیں گے اور خدا نخواستہ کسی مشکل میں گرفتار ہو گئے تو ہرگز ہرگز اپنا راز اور ساتھیوں کا نام کسی کو نہ بتائیں گے۔ آج بشیر نے ہماری لاعلمی میں ہی حکلانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ابھی ہم وہاں بیٹھے ہی تھے کہ گرما گرما پر تکلف کھانا آگیا۔ ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا اور بشیر سے کا شکر یہ ادا کر کے اس سے رخصت چاہی۔ لڑکے ہمارے جانے سے پہلے ہی گلے جھٹے تھے۔ میں نے بشیر سے کہا کہ وہ جو کام ہمارے لئے کرنے لگا ہے اس کا اصل معاوضہ تو اللہ ہی اسے دے گا۔ لیکن اسے اگر کچھ رقم درکار ہو تو وہ وہمیا کی جاسکتی ہے۔ میری بات سن کر بشیر نے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”صاحب! رو پیہ کمانے کے بہت سے ڈھنگ ہیں جب جائز ذرائع سے میں روزی کمانے میں ناکام ہو گیا تو میں نے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کیا اور اب میں نے نہ صرف بہت کافی رو پیہ کمایا ہے بلکہ اس میں گونا گوں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ تمام لڑکے اپنی ضروریات کے لئے مجھ سے پیسہ لیتے ہیں۔ آپ اور آپ کے ساتھی تو اپنی جائیں ڈاؤن لگا کر جو کام اس ملک میں کرنے آئے ہیں۔ مجھے اس کا کچھ اندازہ ہے۔ پاکستان پہلے بھی اسلام کا قلعہ تھا اور اب بھی ہے۔ لعنت ہے مجھ پر کہ آپ کے کام میں کچھ ہاتھ بٹانے کا میں معاوضہ لوں۔ میں تو اپنا سب کچھ پاکستان اور اسکے مفاد پر بچھاؤ کرنے کو تیار ہوں۔ آپ نے یہ بات کہہ کر میری اپنی نگاہوں میں ہی ڈبل کر دیا ہے۔ بشیر نے کہا کہ میں سن کر میں بھی آبدیدہ ہو گیا۔ میں نے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور کہا ”بشیر بھائی تمہاری دل آزاری کرنے کی میں معافی چاہتا ہوں۔ اس مادہ پرست ملک میں مجھے علم نہیں تھا کہ تمہارے جیسے درد دل رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ پہلے تم نے پاکستان کو اسلام کا قلعہ کہا تھا اور اب میں کہتا ہوں کہ تمہارے جیسے اسلام اور پاکستان سے محبت رکھنے والے لوگوں کی وجہ سے ہی پاکستان واقعی اسلام کا قلعہ ہے۔ رات کے گھپ اندھیرے کے بعد اب یہاں چھٹنے والی ہے اور اللہ وہ دن ضرور آئے گا جب بھارت گلے گلے ہو جائے گا اور پاکستان 71ء میں اپنی ہزیمت کا پوری طرح سے بدلہ لے گا۔“

اس ملاقات کے بعد بشیر نے اور ان چاروں لڑکوں سے میں دو مرتبہ ملا اور انہیں 31 دسمبر کی رات کے بارے میں اچھی طرح سے بریف کیا۔ بشیر نے اس دوران چھپے کرئیکر تیار کر لئے تھے۔ ان کا حجم دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا دھماکہ کسی بڑے بم جیسا ہو گا۔ میں نے اس دوران اپنے نمبر ٹوکے کو بھیج کر اکبر اور اشوکا کو ہوٹل میں دو دو ٹیبل ریزرو کروائے جن کے ریزرویشن چارجز چار ہزار روپے تھے۔ ہماری تمام تیاری مکمل تھی جیسا کہ شروع میں عرض کر چکا ہوں۔ ان دونوں ہونٹوں کی لابی میں PAID PARTNER لڑکیاں ہم وقت موجود رہتی تھیں۔ میں نے اپنے نمبر ٹوکوں کو ہونٹوں میں بھیجا جہاں سے اس نے چار مناسبت لڑکیوں کو ہزار رو پیہ فی لڑکی کے حساب سے بک کر کے انہیں کنٹاکٹ پیلس کے رنگ محل ریسٹورنٹ میں 31 دسمبر کی شام کو 7 بجے ملنے کا کہا اور ایڈوانس میں انہیں سو رو پیہ فی لڑکی دیا۔ کرس اور نیو ایئر کی وجہ سے ان CALL GIRLS کے ریٹ بھی بڑھ گئے تھے۔ میں نے یہ سارا کام اپنے نمبر ٹوکے ذریعے اس لئے کروایا کہ میں پہلے ہی DMI کی نظروں میں آچکا تھا اور میں کسی طرح کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ سب تیاریاں مکمل تھیں۔ مقررہ وقت کے مطابق 31 دسمبر کو 5 بجے شام میں بشیر کے پاس گیا لڑکے پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ بشیر نے ہر لڑکے کی پینٹ کی بیٹھ کے ساتھ کرئیکرز اس طرح لگائے تھے کہ کوٹ پہننے سے وہ بالکل چھپ جاتے تھے۔ ہر لڑکے کے پاس ایک ایک خنجر بھی ناگلوں کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ میں نے انہیں کنٹاکٹ پیلس میں سات بجے سے پہلے ہی پہنچ جانے کا کہا۔ جہاں میرے نمبر ٹوکے چاروں لڑکیوں کے ساتھ انہیں ملنا تھا۔ نمبر ٹوکے کی نشانی لیدر جیکٹ اور سرخ قمیض تھی۔ میں نے چاروں لڑکوں کو ایک ایک ہزار رو پیہ بنا چاہا تو بشیر نے منع کر دیا اور کہا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی انہیں دو دو ہزار رو پیہ دے چکا ہے۔ بشیر نے انہیں سگریٹ کے پیکٹ اور ماچس دیتے ہوئے ہنستے ہوئے کہا کہ میں نے انہیں کہا ہے کہ کام کرنے کے بعد آج رات خوب مچ اڑاؤ۔

31 دسمبر کے رش کی وجہ سے ہمیں کافی انتظار کے بعد دو ٹیکسیاں ملیں۔ بشیر نے لڑکوں کو ایک ٹیکسی میں روانہ کیا اور چلنے وقت انہیں کہا کہ اگر کام ٹھیک طور سے انجام نہ دیا تو تمہارے گھروالوں کو قبرستان بھجوا دوں گا کیونکہ تمہاری لاشیں انہیں وہیں ملیں گی۔ یہ چلنے وقت کی آخری ہدایت تھی۔ ہمیں بھی بھارتی بارڈر میں داخل ہونے سے پہلے اسی طرح کی لیکن نرم الفاظ میں ہدایت ملی تھی۔ میرا نمبر 8 بجے مجھے فضل محل ریسٹورنٹ میں ملا۔ اس نے بتایا کہ چاروں لڑکیاں بروقت پہنچ گئی تھیں۔ لڑکوں کے آنے کے بعد اس نے چاروں ریزرویشن کارڈ لڑکوں کو اور بقیہ سو رو پیہ فی لڑکی ان لڑکیوں کو دینے اور چاروں دو کرئیکر میں بیٹھ کر اشوکا اور اکبر ہوٹل چلے گئے۔

میں نے نمبر ٹوکے کو بھی جانے کی اجازت دے دی اور اپنے ہوٹل چلا آیا۔ لودھی ہوٹل بھی 4 اشار ہوٹل تھا۔ انہوں نے بھی 31 دسمبر کی رات کو بھرپور منانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ میرا ٹیبل پہلے سے ہی ریزرو تھا میں کمرے میں جا کر غسل کر کے تازہ دم ہوا اور ڈریس سوٹ پہن کر نیچے آگیا۔ ہوٹل کے کانفرنس ہال میں نیو ایئر ٹائٹ منانے کا انتظام تھا ہال میں سینکڑوں رنگ بھرے بڑے غبارے کرس لڑی کے علاوہ رنگ دار جھلملاتی روشنیوں کی لٹریاں آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں میں اپنے ٹیبل پر جا کر بیٹھ گیا اس وقت تک تمام ٹیبل بھر چکے تھے۔ ہمیں سے خصوصی بلایا گیا ایک بیٹزا اپنی تیز دھنوں سے ماحول کو مزید رنگین بنا رہا تھا ہر ٹیبل پر جوڑے بیٹھے تھے صرف میرا ٹیبل ہی ایسا تھا جس پر میں اکیلا تھا۔ جوڑا نہ ہونے کی رعایت مجھے خصوصی طور پر اس لئے دی گئی تھی کیونکہ میں ہوٹل کا مستقل رہائشی تھا۔ ان دنوں مشہور مغربی ناچ ROCK-N-ROLL اور SHAKE تھے اور مجھ ان پر خاصا عبور تھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈانس ہال کا منجر میرے پاس آیا اور بڑے مودبانہ انداز میں کہنے لگا کہ ایک بریگیڈیئر اور ان کی بیگم بغیر ریزرویشن کے آگئے ہیں۔ بریگیڈیئر عرصے سے ہمارے ہوٹل کے اچھے COSTOMER ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو انہیں آپ کی ٹیبل پر بیٹھا دیا جائے۔ میں تجباتی سے پہلے ہی بوری ہو رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور رسم کے مطابق ان کے استقبال کیلئے ہال کے دروازے پر چلا گیا۔ منجر نے بریگیڈیئر سے میرا اور بریگیڈیئر نے اپنی بیوی سے میرا تعارف کروایا۔ یہاں بھی وہی بات تھی۔ ادھیڑ عمر شوہر اور جوان بیوی۔ میں نے انہیں اپنے ٹیبل پر جوانی کرنے کی دعوت دی۔ وہ وہ تھی ہی ایسی دعوت ملنے کے انتظار میں۔ خوشی میرے ساتھ ہو گئی۔ میں نے بریگیڈیئر کی بیوی کو کرسی پر بٹھایا۔ دوسری جانب بریگیڈیئر بیٹھ گیا اور سچ میں، میں سینڈویچ بن گیا۔ بریگیڈیئر اور اس کی بیوی سے مشروبات کے لئے پوچھا تو بریگیڈیئر نے کہا THANK YOU VERY MUCH BUT WE WILL PLAY DUTCH (شکر ہے لیکن ہم اپنے مشروبات کی قیمت خود ادا کریں گے) بریگیڈیئر نے ولایتی و ہسکی منگوائی اور دونوں میاں بیوی جام پر جام چڑھانے لگے۔ نیو ایئر کی رات، روشنیوں اور سجاوٹ کی جگہ گاہٹ، بیٹز کے نعمات کھیرتے ساز اور فلور پر ناپنے والوں کے تھرکتے بدن۔ بریگیڈیئر کی بیوی نے کئی بار شو ہر کو آنکھ کے اشارے سے فلور پر آنے کا کہا لیکن بریگیڈیئر صاحب ابھی تک شراب سے اپنی بیٹری چارج نہ کر سکے تھے۔ اس کی بیوی جھلا اٹھی۔ اس وقت بریگیڈیئر کا میں نے ہاتھ بٹانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے بریگیڈیئر سے اجازت طلب کر کے اس کی بیوی کو ناچ کی دعوت دی۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی ہم نے فلور پر ڈانس شروع کیا اور وقتے وقتے سے رات پونے بارہ بجے تک ناپتے رہے۔ بریگیڈیئر نے اپنی کوشش میں ناکام ہونے کی وجہ سے اتنی زیادہ پی ٹی تھی کہ کرسی سے ٹیک لگا کر خرا لے بھرنے لگا۔ اس طرح سونے میں ہی اس کی عافیت تھی۔ ہال میں فونو گرافز بھی گھوم پھر کر تصویریں اتار رہے تھے۔ بارہ بجتے میں 5 منٹ باقی تھے جب میں نے بریگیڈیئر کو جاکر کہا کہ صرف 5 منٹ باقی ہیں نئے سال کے استقبال میں بیوی کو اس کے حوالے کر کے میں ہوٹل سے باہر چلا آیا۔

لودھی ہوٹل اکبر اور اشوکا سے زیادہ دور نہیں تھا پھر بھی تجسس کی وجہ سے میں باہر آگیا تھا ٹھیک بارہ بجے فضا چھوٹے چھوٹے دھماکوں سے گونج اٹھی ہوٹل کی تمام روشنیاں ایک منٹ کے لئے گل کر دی گئی تھیں۔ مجھے اپنے ساتھی لڑکوں کے متوجہ دھماکوں کی آواز سنائی نہ دی۔ میں تقریباً بیس منٹ بج بے سردی میں بیٹھیں بے کھاتے ہوئے صرف ڈریس کوٹ میں باہر کھڑا رہا۔ جب سردی ناقابل برداشت ہو چکی تھی میں ہوٹل واپس جانے کا سوچ رہی رہا تھا کہ ایبونیٹیں اور فائر بریگیڈ کے انجن اپنے زوردار سائرن بجاتے اشوکا اور اکبر ہوٹل کی سڑک پر جاتے دکھائی دیئے۔ مجھے سردی کا احساس ختم ہو گیا اور میں تصور میں ان ہونٹوں میں دھماکوں سے پھیلی سراسیمگی کے عالم میں مہمانوں اور ہوٹل کے اسٹاف کی بھاگ دوڑ اور افزائے کو ENJOY کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تصور کی آنکھوں سے ان مناظر سے لطف اندوز ہونے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا (یہاں میں نے بتانا بھول گیا کہ تعارف کے وقت بریگیڈیئر نے اپنا نام راج پال اور اس کی بیوی نے ماتئی بتایا تھا۔ ڈانس ہال میں ہنگامہ اتنا زیادہ تھا کہ بات سنائی ہی نہ دیتی تھی۔ وہ تو دوسرے دن بریگیڈیئر سے شام کو ملاقات ہوئی تو اس سے کافی شاپ میں موصول گفتگو ہوئی۔ دراصل بریگیڈیئر اتنا مدہوش ہو چکا تھا کہ اس کو ہوٹل اسٹاف نے بڑی دقت سے ہوٹل کی گاڑی پر اس کو اس کے بیٹھکے پہنچایا تھا۔ اس کی بیوی بھی ڈرائیونگ کرنے کی حالت میں تھی۔ بریگیڈیئر کی گاڑی ہوٹل میں ہی کھڑی رہی اور دوسرے دن شام بریگیڈیئر گاڑی لینے اور ہوٹل کا بل ادا کرنے آیا تھا)۔

غازی

مذہب، عارف اور میں دوسرے دن بارہ بجے بشیر کے ہاں پہنچے۔ صبح اخباروں کے فرنیٹ پیج اکبر اور اشوکا ہوٹل میں رات ٹھیک بارہ بجے ہم چھٹے، مہمانوں کے زخمی ہونے اور مختلف قیاس آرائیوں سے بھرے پڑے تھے۔ بشیر نے بتایا کہ چاروں لڑکے صبح 10 بجے آئے تھے چاروں کے کریم صحیح وقت پر پھٹے تھے۔ وہ فوٹو اتفری میں اندھیرے میں ہی باہر نکل آئے تھے البتہ ہال میں لوگوں کی چیخ و پکار اور دھماکوں سے ٹوٹنے والی بوتلوں، گلاسوں اور پلٹے پھرنے کے ٹکڑوں سے کئی افراد دونوں جگہوں پر زخمی ضرور ہوئے تھے۔ لڑکوں نے اسے بتایا تھا کہ دہلی کے انتہائی پوش علاقے (جہاں دنیا بھر کے سفارت خانے موجود ہیں) میں ان ہولٹوں میں دھماکوں کی وجہ سے پولیس اور فوج نے دونوں ہولٹوں کو CORDON (گھیرا) کر لیا تھا۔ اخبارات میں لکھا تھا کہ فوری طور پر یہ طے نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دھماکے کس چیز کے تھے۔ دونوں ہولٹوں کی بھرپور تماشائی گئی اور کچھ برآمدہ ہونے پر ہی فوج اور پولیس کا گھیرا ختم کیا گیا۔

دو روز بعد میں مذہب اور عارف کے ساتھ بشیر کی گیارچ میں گیا۔ بشیر اپنے لڑکوں کی کامیابی پر پھولا نہیں سارا تھا۔ ہم نے اسے اور اس نے ہمیں مبارکباد دی۔ میں نے بشیر سے کہا کہ یہ دھماکے ہمارے مقصد کے حصول کی طرف ہمارا پہلا قدم تھا اور تمہارے لڑکوں کی آزمائش بھی اور تمہاری وجہ سے ہی یہ سب ممکن ہوا۔ اب ہم ان لڑکوں سے وہ کام لیں گے جس سے پورے بھارت میں ہلچل مچ جائے گی۔ میں نے بشیر کو بے حد صدارت کے لڑکوں کو بطور انعام دینے کے لئے 12 ہزار روپے دیئے اور کہا کہ آئندہ دو تین روز میں اسے پورا پیمانہ دوں گا تاکہ اس پر عمل کرنے کے لئے لڑکوں کو تہہ بہتہ دی جاسکے۔

بشیر سے فارغ ہو کر ہم واپس آگئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے 26 جنوری کے لئے ایک پلان ترتیب دیا اور اس کی ٹوک پلک سنواری۔ 26 جنوری کو بھارت کے ہر بڑے شہر میں اور خصوصاً دہلی میں (پاکستان میں 23 مارچ کی طرح) دفاعی افواج کی پڑ، ایئر شو اور اسلحے کی نمائش ہوتی ہے اور یہی دن ہم نے اپنے مشن کے لئے چننا تھا کہ بھارتی عوام اور غیر ملکی سفارتی نمائندوں کے سامنے بھارتی فوج اور انٹیلیجنس کی تسکی کر سکیں اور ان کی نااہلیت کو دنیا بھر کے سامنے ظاہر کر دیں۔

میں نے ساتھیوں کے مشورے سے دہلی کے پالم ایئر پورٹ، بمبئی کے سانتا کروڑ ایئر پورٹ اور سری نگر کے ہوائی اڈے کے کارگو سیکشنز کو ٹارگٹ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ دہلی میں پریڈ کے دوران خود ساختہ مالٹوف بموں کے دھماکے بھی کرنے تھے۔ ایئر پورٹس کے کارگو سیکشنوں میں دھماکوں میں ہم نے آتش گیر مادہ استعمال کرنا تھا تاکہ جانی نقصان کم سے کم ہو اور مالی نقصان زیادہ سے زیادہ دہلی میں فوجی پریڈ کا تو ہم کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ اس لئے ہم نے پریڈ کے آخر میں مختلف صوبوں کے فلٹس کو ان کے STARTING POINT پر ہی مالٹوف بموں کا نشانہ بنا دیا تھا۔ بجائے بوتلوں کے ہم نے دتی تھر ماس کے ٹین کے خولوں سے یہ بم بنانے کا فیصلہ کیا۔ سری دی کا موسم ہونے کی وجہ سے بوتلیں ہاتھ میں دیکھ کر انٹیلیجنس والوں کو شبہ ہو سکتا تھا لیکن چائے تھر ماس تو پریڈ دیکھنے والے اکثر ساتھ لاتے ہوں گے اور ان تھر ماسوں میں ہمارے چار پانچ (چائے تھر ماس) آسانی نظر انداز کئے جاسکتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے مشورے سے پلین مکمل کرنے کے بعد میں بشیر کی گیارچ میں گیا اور اپنا پلین بتایا۔ آتشیں گرنیڈ تو میں اپنے سینئرز کے دیئے ہوئے نئے ہمدرد سے دہلی میں حاصل کر سکتا تھا۔ مالٹوف بموں کے لئے میں نے بشیر کو کہا کہ چار پانچ دتی تھر ماس لے کر ان کے خولوں پر ایسی گہری لیکریں لگا دے جیسی دتی ہوں پر ہوتی ہیں۔ ایئر پورٹس پر دھماکوں کے لئے اس نے کہا کہ پہلے والے چار میں سے وہ دو تین لڑکے اس کام کے لئے بھیجے گا۔ ان میں سے ایک لڑکا بمبئی کی بار چاچا تھا۔ اسے بمبئی کے لئے منتخب کیا گیا۔ دہلی کا پالم ہوائی اڈہ تو سبھی نے دیکھ رکھا تھا۔ وہاں بھی کام دکھانا کچھ مشکل نہ تھا۔ بات سری نگر کے ہوائی اڈے پر آئے تھے۔ 71ء کی جنگ کے بعد بھارتی افواج کی مقبوضہ جوں اور کشمیر میں عددی طاقت بڑھادی گئی تھی۔ سردیوں میں تو عوام کی آمد و رفت بہت کم ہو جاتی تھی۔ ان حالات میں مشن اگر کامیاب ہو بھی جائے تو سری نگر سے باہر نکلنے کے صرف دو راستے تھے ایک بذریعہ ہوائی جہاز اور دوسرا بذریعہ سڑک۔ ان دونوں پر چیکنگ کے دوران اگر کوئی سری نگر میں اپنے قیام کی مدت اور جگہ کے متعلق سوالات کا خاطر خواہ جواب نہ دے سکے تو اسے فوری گرفتار کر لئے جانے کا ہر ممکن امکان تھا۔ ہم نے ان خدشات کے پیش نظر سری نگر کے ہوائی اڈے کو اپنے پروگرام سے نکال دیا اور بقیہ کی بھرپور تیاری کی شروع کر دی۔

اگلے روز میں اپنے نئے ہمدرد کے پاس پہنچا۔ اس کی فیکٹری دہلی سے ملحقہ انڈسٹریل ایریا میں واقع تھی۔ میں فیکٹری کی انتظار گاہ میں کافی دیر بیٹھا اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ خاصی دیر کے بعد جب وہ فارغ ہوا تو اس سے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ میں نے چٹ پرائیڈ کو پہلے سے ہی لکھ دیا تھا۔ میں نے وہ چٹ اس کی میز پر رکھ دی۔ اس پہلی اور چانک ملاقات میں چٹ دیکھ کر وہ کچھ نہ سمجھا اور سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ اسے الٹا پڑھئے۔ الٹا پڑھ کر اسے فوراً بات سمجھ میں آگئی۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے وقت اس نے میرے سلام کا رگی سا جواب دیا تھا۔ اب اٹھ کر اس نے مجھ سے معافنا کیا۔ خیریت پوچھی اور کہا ہم اکٹھے دفتر سے باہر نکلتے ہیں۔ مزید گفتگو گاڑی میں کریں گے۔ اس سے پہلے ہم دونوں نے اپنے کوڈز کو دوسرے دہرایا تاکہ ایک دوسرے کے متعلق کوئی شک وشبہ نہ رہے۔ دہلی جانے والی سڑک پر اس نے جیسی رفتار سے گاڑی چلانی شروع کی اور مجھ سے آمد کی وجہ پوچھی۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے 6 عدد گرنیڈ دکار ہیں۔ جن کی پین نکالنے اور چھٹنے میں پندرہ منٹ کا وقت ہے۔ (عام گرنیڈ پین نکالنے کے 6 سیکنڈ بعد پھٹ جاتا ہے) اس نے بتایا کہ ایسے گرنیڈ تو مہیا نہیں لیکن وہ ہمیں ٹائم بم دے سکتا ہے۔ جن کے چھٹنے کا وقت ہم خود سیٹ کر سکتے ہیں۔ اس نے کہا کہ آئندہ پیر کے دن ٹھیک اسی وقت میں اسے اس کی فیکٹری سے 5 سو قدم کے فاصلے پر سڑک پر لوں اور فلٹ مانگنے کیلئے اشارہ کروں۔ گاڑی میں ہی وہ مجھے مطلوبہ اشیا ایک سوٹ کیس میں پیک میرے حوالے کرے گا۔ اس نے کہا کہ میری فیکٹری میں تقریباً 80 فیصد غیر مسلم کام کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کا فیکٹری میں آنا مناسب نہیں اس نے مجھے اپنے گھر اور فیکٹری کے فون نمبر دیئے کہ جب بھی کوئی کام ہو تو ان نمبروں پر فون کر کے صرف یہ کہیں کہ آج موسم اچھا ہے اور اگلے روز شام 6 بجے میں آپ کو ایئر پورٹ روڈ پر پانی کی سبیل کے پاس سے گاڑی میں اٹھایا کروں گا۔ اس نے کہا کہ مجھے آپ کو پیسے دینے کی ہدایت بھی ملی ہے۔ اس لئے سوٹ کیس میں ایک لاکھ روپیہ بھی ہوگا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہمارے لئے کام بھی کرنا چاہتا ہے اور کچھ ڈرا ہوا بھی ہے۔ اس نے مجھے دہلی کے شروع ہوتے ہی ایک ٹیکسی اسٹینڈ پر اتار دیا۔

میری عادت ہے کہ کسی سے ملنے کی جگہ سے اگر میں واقف نہ ہوں تو ملاقات سے پہلے ہی اس جگہ کو تلاش کر لیتا ہوں تاکہ ملاقات کے وقت جگہ ڈھونڈنے میں وقت صرف نہ ہو۔ ٹیکسی اسٹینڈ سے ٹیکسی لے کر میں نے اسے ایئر پورٹ روڈ پر چلنے کو کہا۔ ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا کہ ایئر پورٹ روڈ پر کس جگہ جانا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ضلع پانی کی سبیل والی کوشی پر۔ اس سڑک پر شاید ایک ہی کوشی سبیل والی تھی۔ ڈرائیور نے مجھے ٹھیک سبیل والی کوشی پر اتار دیا۔ ٹیکسی کو فارغ کر کے میں نے اس کوشی کے مالک کی نیم پلیٹ پڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ کوشی مشہور فلمی ماہنامے شیخ کے مالک یونس دہلوی کی تھی۔ میں نے کچھ دور اور آگے جا کر ایک ٹیکسی پکڑی اور اپنے ہوٹل چلا آیا۔

اپنی طرف سے 26 جنوری کے استقبال کے لئے ہم اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس دوران پاکستان سے دو مرتبہ ڈاک ملی اور ہم نے اپنی ڈاک پاکستان بھیجی۔ بے شونت باقاعدگی سے ڈاک کا پیکٹ میرے ساتھیوں کے حوالے کرنا اور ہر مرتبہ دو ہزار روپے لیتا تھا۔ پاکستان سے ٹر اسمیٹر پر بھی باقاعدگی سے ہماری خیریت پوچھی جاتی تھی۔ ہر کام معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ بشیر نے 4 قہر مسوں کے خول میرے کہنے کے مطابق بنائے تھے اور چاروں لڑکوں کو ان کے مشن بتادیئے تھے۔ آئندہ پیر کو میرے نئے کاٹیکٹ نے 6 ٹائم بم اور ایک لاکھ روپیہ مجھے دے دیا۔ میں اور میرے ساتھی 26 جنوری کے مشن میں اگر عملی حصہ نہیں لے رہے تھے لیکن جنگ کے دنوں کی طرح ان کا گھر ہمارا OPERATION ROOM بن گیا تھا۔ جہاں پر باہمی مشورے سے فیصلہ ہوتے تھے۔ میں تقریباً ہر روز بشیر کی گیارچ جانے لگا۔ چاروں لڑکے بھی وہاں آ جاتے تھے اور میں انہیں مشن کے دوران پیش آنے والی ہر دشواری اور اس سے نکلنے کی تربیت دینے لگا۔ ان لڑکوں کی دلیری اور خوشی خوشی ہماری ہدایات پر عمل کرنے اور بار بار ریہرسل کے باوجود رہائش رہنے سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ لڑکے اپنے اپنے مشن کو بخیر و خوبی انجام دیں گے۔ جنوری کے تیسرے ہفتے میں، میں نے انہیں دو ٹائم بم لاکے دیئے اور انہیں OPERATE کرنے کی بار بار مشق کروائی۔ میں نے انہیں ٹائم بم میں منٹ بعد چھٹنے کا وقت ADJUST کرنے کی بار بار مشق سکھائی اور انہیں کہا کہ ٹائم بم کارگو سیکشن میں کارگو کے بڑے کارٹر کے درمیان چھپا کر رکھ دیں۔ کارگو سیکشن میں داخلے کے لئے انہیں بتایا کہ اس سیکشن میں اکثریت ایجنٹ سامان بک کروانے یا چھڑوانے آتے ہیں۔ وہ ان کے ہمراہ ہی ان کے ساتھی کے طور پر سیکشن میں داخل ہوں تو ان کیلئے بڑی آسانی رہے گی۔ ایکلخت طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنا کر کسی بڑے کارٹر پر بیٹھ جائیں اور چھوٹا تھپلا جس میں بم رکھا ہوگا اس کو چھپا کر اور بم چلنے کا سوچ آ کر کر کے پچھلے کارٹر کے پیچھے رکھ دیں اور پھر جلد از جلد وہاں سے نکلیں اور خیال رکھیں کہ بیس منٹ میں آپ ایئر پورٹ ورنہ کم از کم کارگو سیکشن سے نکل کر مین ٹرمینل میں پہنچ جائیں اور جتنی جلد ممکن ہو ایئر پورٹ سے جتنا دور جا سکتے ہیں، چلے جائیں۔ پالم ایئر پورٹ پر عارف انہیں دو مرتبہ لے کر گیا اور کارگو سیکشن میں لے جا کر انہیں عملی طور پر وہاں کا ماحول دکھایا۔ اس نے سیکشن کے ایک کارکن سے یونی پوچھا کہ ہنگامے کے کتنے روز تک کارگو بمبئی پہنچ جاتا ہے اس کے علاوہ کچھ اور معلومات لیں اور واپس چلے آئے۔

بمبئی کے متعلق ہم نے فیصلہ کیا کہ دو لڑکے وہاں جائیں۔ ایک مشن سرانجام دے اور دوسرا اسے سو کر کرے۔ بشیر نے انہیں چار عدد ہتھیار بھی دیئے کہ خطرہ اگر زیادہ ہو تو بے شک ہتھیار سے ہوائی فائر اور گریگ آڈی سامنے آ جائیں تو انہیں گولی مار کر فرار ہو جائیں۔

21 اکتوبر کو 2 لڑکے بذریعہ ٹرین بمبئی روانہ ہو گئے۔ بشیر نے انہیں ایک ایڈریس زبانی یاد کروا لیا کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ اس ایڈریس پر جا کر نہ صرف مدد حاصل کر سکتے ہیں بلکہ روپوش بھی رہ سکتے ہیں۔ بشیر نے بمبئی میں اپنے اس CONTACT کو فون کر کے بتادیا کہ اگر ان ناموں کے لڑکے آئیں تو ہر طرح سے ان کی مدد کرے۔ مجھے بشیر، عارف، مذہب اور ان لڑکوں کی گرم جوشی سے محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر کوئی اس مشن کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر اپنی پوری توانائی اس میں صرف کر رہا تھا۔

ان لڑکوں کی بمبئی روانگی کے بعد میں نے بشیر کے ساتھ مل کر مالٹوف بم تیار کئے۔ یہ بم بنانے کی ترکیب میں یہاں اس لئے تجربہ نہیں کر سکتا کیونکہ ترکیب جاننے کے بعد ہر گھر بم ساز فیکٹری بن جائے گا۔ بشیر نے اپنے گروپ میں چار لڑکے اس کام کے لئے چنے اور میں نے انہیں یہ بم ACTIVE کرنے اور انہیں پھینکنے کی بیسیوں بار ریہرسل کروائی۔ 25 دسمبر کو جب ہم ملے پالم ایئر پورٹ اور پریڈ پر جانے والے لڑکے مکمل طور پر تیار تھے۔ بشیر نے مشن کے بعد دو جگہوں سے لڑکوں کو اٹھانے کیلئے دو پرائیویٹ موٹروں کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ میں اور میرے ساتھی پریڈ پر جا رہے تھے۔ میرے نمبر ٹوٹے مشن کے دوران تصویریں اتارنی تھیں اور ایک ساتھی نے اسے کور دینا تھا۔ دوسرے دو ساتھیوں نے چاروں لڑکوں کو کور دینا تھا۔ پالم ایئر پورٹ پر کارگو سیکشن کے اندر پہنچانے کی ذمہ داری عارف نے لے لی تھی۔ 26 جنوری 8:30 بجے دہلی میں پریڈ پر اور 11:00 بجے دونوں ایئر پورٹس پر کارروائی کا وقت بہت پہلے ہی مقرر کر دیا گیا تھا اور اس مقررہ وقت میں تبدیلی صرف موقع پر حالات کو دیکھنے کی جاسکتی تھی۔ بمبئی جانے والے لڑکوں نے عارف کو فون پر اپنے بمبئی پہنچنے اور سانتا کروڑ ایئر پورٹ پر کارگو سیکشن میں جا کر حالات کا جائزہ لینے کا بتادیا تھا۔ یہ ہمارا پہلا مشن تھا جس میں ہم صرف نگرانی کرنے والے تھے اور سارا مشن ان لڑکوں نے پورا کرنا تھا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ 25 اور 26 جنوری کی رات میں نے بڑی بے قراری میں گزاری۔ تمام رات میں بار بار اللہ پاک کے حضور یہی التجا کرتا رہا کہ ہمارا یہ مشن بھی پہلے مشوں کی طرح کامیابی سے ہمکنار ہو۔ میں خصوصی طور پر مشن میں شامل لڑکوں کی سلامتی کی دعا بھی مانگ رہا تھا۔ ہم تو پاکستان سے ہی سرپرکھن باندھ کر نکلے تھے لیکن یہ لڑکے صرف ہماری ترغیب دینے کی وجہ سے اس خطرناک کام میں محض اپنے مذہب اور جذبے کی وجہ سے شامل ہوئے تھے۔

26 جنوری صبح سویرے میں تیار ہو کر ہوٹل سے باہر آ گیا۔ 8 بجے اندر گا ندھی کولال قلعے پر بھارتی پرچم لہانا تھا اور ساڑھے آٹھ بجے پریڈ کا آغاز ہونا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوند باندھ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک ٹیکسی ملی جس نے میٹر کے بجائے منڈانگے داموں پر مجھے پریڈ کے نقطہ آغاز سے ڈرا دور اتار دیا۔ پریڈ کے لئے بھارت کی تینوں افواج کے فوجی دستے اور ٹینک، توپیں، میزائل، میزائل، موپائل ریڈار کے ٹرک، پارڈریکٹوری فورس BSF کے دستے، اونٹ سوار صحرائی جنگ کے لڑاکا دستے، انجینئرنگ کے عارضی ٹیل بنانے کے موپائل ٹرک ترتیب میں پریڈ کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان کے بعد پیرا ملٹری فورس، پولیس اور CMH کی تہذیبوں کے دستے تھے۔ ان کے بعد اسکاڈز، طلبہ اور طالبات کی ٹولیاں پی ٹی کے مظاہر کے لئے موجود تھیں۔ سب سے آخر میں مختلف صوبوں کی ثقافتی نمائندگی کرنے والے فلوت تھے۔ پریڈ دیکھنے کے لئے تمام ممالک کے سفیروں اور VVIP شخصیتوں کے لئے سلامی کے چوڑے کے دونوں طرف شامیانے لگے ہوئے تھے۔ بھارتی صدر کو سلامی لینی تھی جبکہ تینوں افواج کے سربراہ اور وزیر اعظم کے لئے چوڑے پر بیٹھنے کا انتظام تھا۔ پریڈ دیکھنے کے لئے عوام کی بہت بڑی تعداد پریڈ کے نقطہ آغاز سے لے کر کرسیوں کے طویل سلسلے تک سڑک کے دو روہ کھڑی تھی۔ بارش سے بچنے کے لئے دونوں اطراف چھتریوں ہی چھتریوں نظر آ رہی تھیں۔ اس سارے علاقے میں بھارتی فوج اور پولیس کے جوان سیکورٹی کے لئے جا بجا کھڑے تھے یا اتنی بڑی پریڈ تھی کہ سلامی کے چوڑے سے تقریباً ایک کلومیٹر پہلے چوک میں دائیں جانب والی سڑک پر بھی ایک کلومیٹر تک پریڈ میں شمولیت کرنے والے بالکل تیار کھڑے تھے۔ میں نے لڑکوں کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ جب پریڈ شروع ہونے کا اعلان ہو جائے تو اس کے بعد وہ یہ کارروائی کریں کیونکہ اعلان کا مطلب یہ ہوگا کہ صدر، وزیر اعظم اور تینوں افواج کے سربراہوں کے علاوہ تمام سفیروں اور VVIP شخصیات بھی آچکی ہوں گی۔ اسی لئے میں نے کارروائی کا وقت مقرر کرنے کے باوجود حالات کی مناسبت سے وقت میں تبدیلی کا اختیار نہیں دیا تھا۔ ہم نے جو مالٹوف بم بنائے تھے ان سے ہمارا مقصد صرف فلٹس میں آگ بھڑکانے اور توڑ پھوڑ کا کام لینا تھا۔ 26 جنوری کو عام تعطیل تھی، صرف لازمی سرورسز مثلاً اسپتال، فائر بریگیڈ، ایئر پورٹ اور ریلوے وغیرہ کی چھٹی نہیں تھی۔ ہمارے سب انتظامات مکمل تھے۔ اب سب کام لڑکوں کو کرنا تھا اور اللہ پاک سے انہیں ہمت، کامیابی ملنے کی امید تھی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ میں خود گھبرا ہوا تھا۔ ہم نے بھارت میں جو بھی کام کئے تھے وہ خفیہ UNDER SHADOW تھے۔

کھلے عام اور لاکھوں عوام کے درمیان نیم تربیت یافتہ لڑکوں کے ذریعے دھماکے کرنے کا یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ بھارتی سیکورٹی کا سارا دھیان مسلح افواج اور فوجی اسلحے کی حد تک تھا۔ اس کے بعد شامل پریڈ دستوں کی سیکورٹی بہت کم تھی اور فلٹوں پر تو سیکورٹی کے لئے اکا دکا پولیس کے سپاہی ہی نظر آتے تھے۔ میرا یہاں کوئی کام نہ تھا۔ DMI کی نظروں میں پہلے ہی میں آچکا تھا۔ لہذا اچھے نتائج کی تمنا اور توقع لئے ہوئے میں اپنے ہوٹل واپس آیا۔ دھماکوں کے وقت ہوٹل میں میری موجودگی بھی میرے اوپر کسی شک کو دور کرنے کے لئے ضروری تھی۔

میں نے اپنے ساتھیوں اور بشیر سے یہ طے کیا تھا کہ دھماکوں کے فوری بعد وہ اپنے ٹھکانوں پر چلے جائیں۔ لڑکے بشیر کو اپنے مشن کی رپورٹ دیں۔ بعد دوپہر تین بجے میں ساتھیوں کے گھر جاؤں گا اور مذہب کے فون سے بشیر سے رابطہ کروں گا۔ بشیر کی اور اپنے دو ساتھیوں کی جوتوں کو کور دے رہے تھے کی رپورٹوں کا موازنہ کروں گا۔ دہلی پالم ایئر پورٹ کی رپورٹ بھی اس وقت تک یقیناً آچکی ہوگی اور عین ممکن تھا کہ بمبئی سے بھی اس وقت تک رپورٹ موصول ہو جائے۔

غازی

تین بجے میں ساتھیوں کے پاس جانے کے لئے ہوئے، باہر نکلا اور ایک ٹیکسی لی۔ مجھے نئی دہلی سے پرانی دہلی جانا تھا۔ راستے میں کئی سگنل آئے تھے۔ ایک سگنل پر جب ٹیکسی رکی تو اخباروں کے ضمیمے بیچنے والے چلا چلا کر ضمیمے فروخت کر رہے تھے۔ انگریزی کا صرف ایک ضمیمہ مل سکا باقی سب ہندی زبان کے تھے۔ ضمیمے میں شہر خبروں میں پریڈ میں شمولیت کرنے والے چار فلوٹوں پر دھماکے، آگ لگنے اور فلوٹوں پر موجود 20 سے زیادہ افراد کے زخمی ہونے کی خبر تھی۔ دوسری سرٹھی میں پالم ایئر پورٹ پر کارگو ٹیکشن میں بم دھماکے سے کارگو کی خاصی بڑی تعداد تباہ ہونے اور چھت کا ایک حصہ گرنے کا لکھا ہوا تھا۔ اخبار میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ دونوں جگہوں پر موقع پر کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی اور پولیس کارگو ٹیکشن کے عمل کو مزاحمت میں لے کر پوچھ گچھ کر رہی ہے جبکہ فلوٹوں پر دھماکوں سے عوام کی افراتفری اور بھاگنے کی وجہ سے کئی افراد گر کے زخمی بھی ہو گئے تھے جو خبر سننے کے لئے میں ساتھیوں کے پاس جا رہا تھا اس کا بیشتر حصہ مجھے ضمیمے میں ہی مل گیا تھا۔ یہاں میں قارئین کو دونوں جگہوں پر دھماکوں کے متعلق کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ کارگو ٹیکشن میں دھماکے کرنے والے لڑکے کو میں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ ہم آن کر کے بڑے کارٹون کے بیچ میں پھینک دے۔ اس طرح ہم کی شدت میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے۔ 360 درجے کے گول دائرے میں 80 درجہ طاقت تو فرش پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ 180 درجوں میں تقریباً 140 درجے ہم کی شدت دونوں اطراف کے کارٹون کو تباہ کر دیتی اور آگ لگا دیتی ہے جبکہ صرف 35 سے 40 درجہ دھماکے کی شدت سیدھی اوپر جاتی ہے جس کے نتیجے میں کئی کارٹن تباہ ہو گئے اور ان میں آگ لگ گئی۔ چھت کا ایک حصہ گر گیا اور فرش پر گڑھا پڑ گیا البتہ جانی نقصان نہیں ہوا۔ فلوٹس پر مالٹوف، بم چونکہ چھینکے گئے تھے اس لئے تھرماس کے خلوں کو گھڑوں سے ان پر موجود لوگ زخمی ہوئے اور فلوٹس جو کڑی کے ڈھانچوں پر بنائے جاتے ہیں ان میں فوری آگ بھی لگ گئی۔ دہلی میں ہمارا مشن پوری طرح سے کامیاب ہوا تھا۔ پریڈ کے دوران فلوٹوں پر دھماکے آگ لگنے اور لوگوں کے زخمی ہونے سے فلوٹوں کی پریڈ میں شمولیت نہ ہو سکی۔ غیر ملکی سفیر اور VVIP آگ لگنے، لوگوں کے زخمی ہونے اور بھارتی سیکورٹی کی نااہلیت کے گواہ تھے۔ عوام کی افراتفری اور بھاگ دوڑنے دھماکوں کے تاثر کو دو چند کر دیا تھا۔ پالم ایئر پورٹ پر دھماکے نے RESTRICTED ZONE میں بھارتی سیکورٹی کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ اگر ہم چاہتے تو ان دھماکوں سے بیسیوں افراد کو ہلاک بھی کر سکتے تھے۔ لیکن ایک تو بھارتی نہتے عوام کو ہلاک کرنا ہمارا مقصد نہ تھا۔ دوسرے ہلاکت کی صورت میں سب کی ہمدردیاں ہلاک شدگان اور بھارتی حکومت کے ساتھ ہوتیں لیکن اب صورت یہ تھی کہ سب بھارتی سیکورٹی (خصوصاً 26 جنوری کے حوالے سے) کی نااہلیت پر غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے اور یہی ہمارا مقصد تھا جو جو بیفصد پورا ہوا۔

ساتھیوں کے گھر پہنچ کر میں نے مذیر کے ذریعے عارف کو بلوایا اور اس کے آنے تک ساتھیوں کے پاس بیٹھ کے ان سے تفصیل پوچھی۔ ہم نے تو جو مالٹوف، بم بنائے تھے۔ وہ عام مالٹوف سے بہت زیادہ UP GRADED تھے۔ میرے ساتھی بھی ان کی کارکردگی سے حیران تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لڑکوں نے چاروں تھرماس کے یکے بعد دیگرے فلوٹوں پر اچھالے۔ ہم زوردار دھماکے سے بچھے۔ ان کے گھڑوں نے نہ صرف فلوٹوں پر کھڑے ہوئے لوگوں کو زخمی کیا بلکہ قریبی کھڑے چند پریڈ دیکھنے والے بھی زخمی ہوئے۔ بم پھٹتے ہی فلوٹوں میں آگ لگ گئی۔ وہاں کھڑے عوام ڈر کر بھاگے۔ اس افراتفری میں لڑکے بھی بھاگ گئے۔ بشیر نے ان کے لئے گاڑیوں کا پمپے ای انتظام کر رکھا تھا۔ لہذا وہ بخیر و عافیت اپنی منزل پہنچ گئے ہوں گے (عارف نے بشیر کو فون کر کے اس بات کی تصدیق کر لی تھی)۔ عارف مذیر کے گھر آچکا تھا۔ میں نیچے آیا اور دونوں کو ہم کی کامیابی کی مبارک باد دی۔ انہوں نے ہم سب کو مبارک باد دی۔ عارف نے بتایا کہ ایئر پورٹ پر کام سرانجام دینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ کارگو ٹیکشن میں اس وقت صرف دو آدمی ہال میں موجود تھے۔ لڑکے نے کارٹون کو دیکھتے ہی بم کو ان کر دیا اور ان کا مرکز پر ایسے بیٹھ گیا جیسے کسی کا منتظر ہو اور موقع ملنے ہی بم کا تھیلہ دو کارٹون کے درمیان پھینک دیا۔ اس نے ان سے کہا کہ مجھے 11 بجے یہاں ایک ہیرنگ ایجنٹ نے ملنے کو کہا تھا۔ مجھے ایک ضروری کام سے واپس جانا ہے اگر کوئی پوچھے تو اسے بتا دیں کہ چند آر کر گیا ہے۔ یہ کہہ کر لڑکا ہر جا گیا۔ ایئر پورٹ سے باہر میں گاڑی میں اس کا انتظار کر رہا تھا وہ بمشکل گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ ہمارا کام مکمل ہو چکا تھا لہذا ہم واپس چلے آئے۔ گاڑی بشیر نے بھی تھی، میں راستے میں اتر گیا اور گاڑی لڑکے کو لے کر بشیر کے گھر چلی گئی۔ اب تک مجھے بمبئی کے ہوائی اڈے کے علاوہ تمام معلومات مل چکی تھیں۔ مذیر کے ٹیلی فون سے بشیر سے رابطہ کیا تو اس نے بتایا کہ ابھی تک بمبئی سے کوئی اطلاع نہیں آئی۔ چونکہ اس دور میں ڈائریکٹ ڈائنگ کا سسٹم شروع نہیں ہوا تھا اس لئے کال ملنے میں خاصا وقت صرف ہو جاتا تھا۔ میں نے بشیر کو دہلی میں لڑکوں کی کامیابی پر اسے اور لڑکوں کو مبارک باد دی۔ بشیر نے اگلے روز دوپہر کو اس خوشی میں ہمیں کھانے کی دعوت دی جسے میں نے اچھائی شکر کیے کے ساتھ مستر دکر دیا کیونکہ ان دھماکوں کے بعد دہلی میں سیکورٹی یقیناً بہت سخت ہو چکی ہوگی اور ہم کسی طرح کی بھی بے اعتدالی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے بشیر کو کہا کہ بمبئی سے جو خبر آئے وہ عارف کو مختصر اور چھپے الفاظ میں بتا دے۔ نامعلوم مجھے کیوں یہ خیال آ رہا تھا کہ دہلی میں مسلمانوں اور سکھوں کے ٹیلی فونوں پر OBSERVATION لگ چکی ہوگی۔ میں نے مذیر کے گھر میں چائے پی اور ساتھیوں کو بتا کر اپنے ہوٹل چلا آیا۔

دوسرے روز میں ابھی کمرے میں ہی تھا کہ نمبر ٹو کافون آیا اور اس نے ہمارے اپنے طے شدہ کوڈ میں بتایا کہ چائے کی دو بیٹیاں بغیر ٹوٹ پھوٹ کے گودام میں پہنچ چکی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بمبئی گئے ہوئے دونوں لڑکے اپنا کام کر کے بمبئی کے ٹھکانے پر پتھریت پہنچ چکے ہیں۔ مجھے ان کی طرف سے بھی تسلی ہو گئی میں نے ناشدہ کمرے میں ہی منگوا لیا اور اپنے مقرر کردہ دو اخبار TRIBUNE اور TIMES OF INDIA دیکھنے شروع کئے دونوں اخباروں کے پہلے صفحے پریڈ کے دوران دھماکوں اور دہلی اور بمبئی ایئر پورٹس پر دھماکوں کی خبروں اور تصویروں سے بھرے پڑے تھے TRIBUNE نے تو اپنے ادارے میں صاف لکھ دیا تھا کہ 26 جنوری کو دہلی اور بمبئی میں دھماکے پاکستان کے ایجنٹوں یا آزادی پسند سکھوں نے کئے ہوں گے۔ TIMES OF INDIA نے شائدنا پریڈ کو SYMBOL OF NEGLIGENCE قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایسی نمائش پریڈوں کے بجائے ہمیں اپنی سیکورٹی پر توجہ دینی چاہئے۔ دشمن ہمارے اتنے اندر گھس آیا ہے اور اتنی بے خوفی سے کارروائیاں کر رہا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ پریڈ کے دوران یہ حادثہ اور دہلی اور بمبئی کے ہوائی اڈوں پر دھماکے دراصل ہمارے منہ پر دشمن کا بھر پور طمانچہ ہے۔ ابھی 31 دسمبر کے طمانچے کی گونج ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ 26 جنوری کو دوبارہ ہماری نااہلیت کے باعث ہمیں بھر پور طمانچہ کھانا پڑا ہے۔ مجھے انگریزی کے جو بھی اخبارات ان خبروں کے حوالے سے مل سکے وہ لے لئے تاکہ انہیں پاکستان جانے والی ڈاک میں بھیج سکوں۔ ان دھماکوں کی خبر BBC نے بھی نشر کی اور مجھے یقین ہے کہ تمام سفیروں نے ان دھماکوں کی خبر اپنے ممالک کو بھیجی ہوگی۔

یہاں میں یہ عرض کرتا چلوں کہ ہمیں پاکستان سے ان دھماکوں کے لئے کوئی ہدایت نہیں ملی تھی۔ ہم نے یہ دھماکے کرنے کا فیصلہ اپنی صوابدید کے مطابق خود کیا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کے سانحے کو صرف میرے سینئر زہی نے نہیں بلکہ سارے پاکستانیوں نے شدت سے اپنی رسوائی سے تعبیر کیا تھا اور اب ہم اس رسوائی کا بدلہ لینے میں اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ میرے سینئر زکوان دھماکوں کی اطلاع تو مل چکی تھی لیکن انہیں یہ علم نہ تھا کہ ان کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ ہماری ڈاک سے جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ دھماکے ہم نے کرائے تھے اور پاکستان کے ہمدردوں کا ایک گروہ بھی تشکیل دے دیا تھا تو یقیناً وہ خوشی سے جھوم اٹھے ہوں گے۔ پاکستان سے آنے والی ڈاک میں انہوں نے ہمیں اس انخود کردہ کارروائی پر بہت مبارک اور شاباش دی اور لکھا کہ جب اپنے چیف کو انہوں نے ہماری سابقہ کارروائیوں کے ساتھ ان دھماکوں کا بتایا تو چیف کے سراپتے الفاظ کچھ اس طرح سے تھے کہ اگر مجھے اتنے حوصلہ مند 25 گروپ اور مل جائیں تو میں بغیر جنگ لڑے بھارت کو شکست دے کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا ہوں۔ 2 فروری کو بشیر نے بمبئی والے لڑکوں کی بخیریت دہلی آمد کا خبر دہنایا۔

ان دھماکوں کے بعد بھارتی انٹیلی جنس واقعی بہت چوس ہو چکی تھی۔ ہم نے بھی اپنے ڈاک پاکستان بھیجنے اور وصول کرنے کے سوا آئندہ کے سب PLANS کچھ عرصہ کے لئے معطل کر دیئے۔ بیٹونٹ سے ڈاک باقاعدگی سے مل رہی تھی۔ میں اور میرے ساتھی مسلسل کام اور ذہنی دباؤ کی وجہ سے خاصے تھک چکے تھے۔ میں نے سینئر زکی اجازت سے ہم سب کے لئے 10 روز کی چھٹی کی اجازت لی۔

پروگرام اس ترتیب سے طے ہوا کہ پہلے میں اکیلا دن روز کی چھٹی کروں پھر ساتھی دو دو کی ٹولی میں یکے بعد دیگرے چھٹی پر جائیں۔ میں نے اپنے دن روز شملہ میں گزارنے چاہے۔ سردیوں میں شملہ میں برف باری اور جاگو میں بندروں کے گڑھ کے متعلق میرے والدین مجھے بڑی دلچسپ باتیں سنایا کرتے تھے۔ میری پیدائش سے 5 سال کی عمر تک وہ گرمیوں کا موسم شملہ میں گزارتے تھے۔ میرے دماغ میں شملہ کی دھندلی تصویر تھی اور اب میں خود جا کر اس تصویر کو نمایاں کرنا اور اس میں نقش بھرتا چاہتا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو بتایا کہ شملہ پہنچ کر میں انہیں اپنے ہوٹل سے فون کروں گا اور انہیں رابطے کیلئے نمبر بتا دوں گا تاکہ کسی ایمر جنسی کی صورت میں وہ مجھ سے رابطہ کر سکیں۔ پاکستان سے آنے والی ڈاک کی وصولی اور ڈاک بھیجنے کی تاریخ میری چھٹیوں میں آئی تھی۔ اسلئے میں نے نمبر ٹو کو چارج دیتے وقت کوریئر سے ملنے کا کوڈ اور جگہ بتا دی۔ یہ کوریئر اس سے پہلے بھی کیپٹن ارشد کے ہمراہ میرے نمبر ٹو کو دیکھ چکا تھا۔ میں نے جانے کی سب تیار کر لی۔ گرم کپڑوں کے چند جوڑے سوٹ کیس میں ڈالے۔ سائیکلس والا اور سادہ غسل ساتھ لیا۔ ہوٹل سے چیک آؤٹ کیا۔ لاکر میں رکھے ایک لاکھ سے زیادہ روپے نمبر ٹو کے حوالے کئے اپنا باقی سامان بھی ساتھیوں کے پاس رکھا اور 20 فروری کو میں شملہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

شملہ پہنچے مجھے ابھی 6 روز ہی گزرے تھے کہ میرے نمبر ٹو کافون آیا۔ اس نے بتایا کہ بشیر کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے اور یہ خبر اسے مذیر اور عارف نے بتائی ہے۔ یہ خبر سننے ہی میرا نفر جی موڈ تو بیکھت ختم ہو گیا تھا۔ میں نے نمبر ٹو کو کہا کہ وہ اور دوسرے ساتھی ہرگز اس طرف نہ جائیں۔ مذیر اور عارف کو بھی ادھر جانے سے منع کر دیں اور میں پہلی گاڑی سے واپس آ رہا ہوں۔ سفر کے دوران میں سارا وقت یہی سوچتا رہا کہ بشیر کس نے قتل کیا ہے۔ پولیس یا سرکاری اداروں نے اگر اسے ہلاک کیا ہوتا تو اخبارات میں بڑھا چڑھا کر اسے ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا جاتا لیکن ان اداروں کی جانب سے بالکل خاموشی تھی۔ اس واردات کی تفصیلات مجھے دہلی جا کر ہی مل سکی تھیں۔ بشیر جیسے مخلص ساتھی کی موت میرے لئے کم صدمے کی بات تھی۔ دہلی آ کر میں سیدھا ساتھیوں کے گھر گیا اور ان سے جو کچھ بھی اس واردات کی تفصیل مل سکتی تھی وہ سن کر مذیر اور عارف کے ساتھ ایک میٹنگ کی۔

مذیر اور عارف نے بھی جتنا کچھ اس واردات کے متعلق انہیں علم تھا، مجھے بتایا لیکن یہ سچہ میں نہ آتا تھا کہ قاتل کون ہے؟ عارف نے بتایا کہ بشیر سے رات کھانا کھانے کے بعد جب وہ اپنے اندرونی کمرے میں اکیلا تھا، کوئی ملنے آیا جسے اس نے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ مذیر کے ملازم کے مطابق وہ کوئی سکھ تھا۔ ملازم چائے بنانے کے لئے باورچی خانے میں گیا تو اس نے گولی چلنے کی آواز سنی وہ بھاگا ہوا کمرے میں آیا تو بشیر کو ماتھے پر گولی لگ چکی تھی اور وہ بستر پر دراز مریا تھا اور سکھ غائب تھا۔ ملازم نے بشیر کے جانے والے ایک دفتر میں گھروں میں اطلاع دی وہ آگے اور اس واردات کی پولیس کو خبر کی۔ اگلی صبح لاش کا پوسٹ مارٹم ہوا اور بعد دو پیر لاش دفن دی گئی۔ عارف نے بتایا کہ گویشیر لاوارث تھا لیکن اس کے جنازے میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ دکھ اور غم کا احساس اپنی جگہ لیکن بشیر کے قتل کو اندھا قتل قرار دینے جانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔ میرے دماغ میں بار بار ایک ہی بات گھوم رہی تھی کہ بشیر جو دن کے وقت بھی بغیر جان پہچان کے کسی کو نہ بلاتا تھا۔ رات کو اپنے اندرونی کمرے میں کسی انجان کو ملنے اور ملازم کو چائے بنانے کے لئے بھیجنے پر کیسے تیار ہو گیا۔ اس کا ملازم جس کا نام عاقل میاں تھا، نے بھی اس سکھ کو اپنے لئے انجان بتایا تھا اور کہتا تھا کہ جب میں اس کا پیغام لے کر بشیر کے پاس گیا تو اس نے سکھ کو فوراً ہمارے لانا لکھا۔ عاقل قریب دو سال سے بشیر کے باورچی اور خادم کا کام کر رہا تھا۔ اس واردات کی کڑیاں ملاتے مجھے دو دن گزر گئے۔ اچانک ایک خیال آیا کہ واردات کے متعلق ہم صرف عاقل میاں کے بیان کی روشنی میں ہی سوچ رہے ہیں اگر بغرض عاقل کا بیان ہی غلط ہو تو..... اور اچانک ہی میرے دماغ میں کڑیاں خود بخود ملنے لگیں۔ بشیر اپنی تمام رقم اپنے گھر میں رکھتا تھا۔ جس کا عاقل میاں کو علم ہو جانا عین ممکن تھا۔ عاقل قریب دو سال قبل بشیر کی ملازمت میں آیا تھا۔ ان دو سالوں میں اس سکھ کو عاقل نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔ عاقل میرٹھ کا رہنے والا تھا یہ اس کا بیان تھا جس کی کبھی تصدیق نہیں کی گئی۔ ان سب باتوں کی روشنی میں میری سوچ صرف عاقل کو ہی قاتل ٹھہراتی تھی۔ اس کا واردات کے بعد روپے لے کر فوراً ہی بھاگ نہ جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ بشیر کے دوست اور جانشین ساتھی اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ لیتے۔ میں نے عارف اور مذیر سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بشیر کے ظاہری طور پر رکھے ہوئے صرف 3 ہزار روپے ہی ملے ہیں جبکہ خود بشیر کی زبانی اس کے پاس نو لاکھ روپے تھے اس نے گھر میں ہی رکھا ہوا تھا۔ جوں جوں میں عاقل کے متعلق سوچتا میرا شک یقین میں بدلتا جاتا۔ بالآخر میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے ایک ترکیب کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا اور اگلی شام ہم سب جو بشیر کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

بشیر کے گھر سے قدرے پہلے ہی ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ ہم سٹنل (FILE) فائل پوزیشن میں چل رہے تھے۔ حالات ہی کچھ ایسے ہی ہو چکے تھے کہ ہمیں بے حد احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ بشیر ہمارا قابل اعتماد ساتھی بن چکا تھا اور اسی کے ذریعے ہم 31 دسمبر اور 26 جنوری کے مشن پورے کر سکے تھے۔ اس کے قتل کو بھول جانا اور پس پشت ڈالنا ہمارے لئے ناممکن تھا۔ اس جذباتی لگاؤ کے علاوہ بشیر ہماری بہت اہم ضرورت تھا۔ اسی کے توسط سے ہم نے لڑکوں کے گروہ کو باقاعدہ تربیت دینے کا فیصلہ کیا تھا جس کے متعلق اپنے سینئر کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ ہمیں یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر قاتل کو ہمارے اور بشیر کے تعلقات کا علم ہے تو وہ کسی وقت بھی ہم سب کے لئے مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔ اس لئے فوری طور پر اس کا سراغ لگانا اور ہمیشہ کے لئے اس کا منہ بند کرنا ہمارے اپنے تحفظ کے لئے بہت ضروری تھا۔

بشیر کی گھیرج سے کچھ پہلے ہمیں چاروں لڑکے اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں واپس لوٹ جانے کا کہا۔ ان لڑکوں نے ہی 26 جنوری کو پریڈ کے دوران دھماکے کئے تھے۔ ہمیں ان پر پورا اعتبار تھا۔ ہم واپس چل دیئے۔ وہ لڑکے تیز تیز چلنے ہوئے ہم سے آن لے اور سرگوشی میں انہوں نے بتایا کہ گھیرج میں اس وقت پولیس آئی ہوئی ہے۔ کچھ اور آگے ایک چھپر ہوٹل تھا۔ دو لڑکے ہمیں اس ہوٹل کی کچھلی طرف لے گئے۔ وہاں چھپر ہوٹل کے باورچی خانے کے ساتھ ہی ایک کمرہ بنا ہوا تھا جس میں چند کرسیاں اور میزیں پڑی تھیں۔ لڑکوں نے بتایا کہ یہ چھپر ہوٹل بشیر نے ہی ایک بے روزگار مسلمان کو اپنے پیسوں سے بنا کر دیا تھا اور بشیر کے ساتھیوں کے لئے محفوظ جگہ تھی۔ چھوڑی ہی دیر میں چائے آگئی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے بھر پڑا تھا کسی بھی وقت بارش شروع ہو سکتی تھی۔ ان لڑکوں نے بتایا کہ پولیس نے عاقل میاں سے معمولی سی پوچھ گچھ کی ہے۔ پولیس کو تو یہ خوشی تھی کہ علاقے کا ایک مشہور اور بڑا مسلمان ”غٹڈہ“ ہلاک ہو گیا تھا۔ ان کی سردی ختم ہو چکی تھی اس لئے محض رسمی اور سرسری کارروائی کی جا رہی تھی۔ میں نے لڑکوں سے کہا کہ آج ہم یہ فیصلہ کرنے نکلے ہیں کہ بشیر کے قاتل تک بہر حال میں پہنچیں گے۔ لڑکوں کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ ہمیں عاقل پر شک ہے۔ لڑکوں نے دہلی زبان سے میری بات کی تائید کی لیکن وہ حیران تھے کہ اس دو سالہ پرانے ملازم کو بشیر قاتل کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ بشیر اسے سخاوت سے بہت زیادہ رقم انعام اور مال دینی صورت میں دیتا تھا۔ میں نے لڑکوں کو کہا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی ٹھہریں۔ آج ہی اس بات کا فیصلہ ہو جائے گا کہ عاقل بے گناہ ہے یا گناہ گار۔ لڑکوں نے رضامندی ظاہر کی۔ میں نے دو لڑکوں کی ڈیوٹی لگائی کہ گھیرج کے قریب کہیں چھپ کر دیکھیں اور پولیس کے جانے کی ایک لڑکا ہمیں فوراً اطلاع دے اور دوسرا وہاں کھڑا رہے اور عاقل اگر ہمارے پیچھے سے پہلے باہر جائے تو اس کا پیچھا کرے۔ دونوں لڑکے چلے گئے اور ہم ان کے انتظار میں اسی کمرے میں بیٹھے رہے۔ چھوڑی ہی دیر بعد ایک لڑکا قریباً بھاگتے ہوئے آیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس واپس چلی گئی ہے اور عاقل جب گھیرج کے دروازے وغیرہ بند کر کے لگا تو اس لڑکے کے ساتھی نے دروازہ بند کرنے سے پہلے ہی عاقل کو باتوں میں لگایا ہے اور اگر ہم وہاں پہنچ جائیں تو گھیرج کے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ ہم فوراً اٹھے اور ہنگام بھاگ گھیرج تک پہنچے۔ گھیرج کا بڑا دروازہ نیم ہوا تھا۔ ہم ایک ایک کر کے گھیرج میں داخل ہوئے۔ سب سے آخر میں داخل ہونے والے میرے ساتھی نے گھیرج کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔

غازی

عائل جو ہم 9 افراد کی اچانک آمد سے گھبرا گیا تھا۔ دروازہ بند ہوتے دیکھ کر بالکل ہی بوکھلا گیا اور مدد کے لئے چیختے ہی والا تھا کہ میرے جوڈو کراٹے کے ماہر ساتھی نے اسے چہرے پر لگا تار دو تین گھونٹے مار کر نیم بے ہوش کر دیا۔ میں نے دو لڑکوں کی ڈیوٹی مین گیٹ پر لگائی تاکہ اگر کوئی باہر سے آئے تو ہمیں بتا سکیں۔ میرے دو ساتھیوں اور دو لڑکوں نے عائل کو ہاتھوں پاؤں سے اٹھایا اور اسے گیرج کے اندر اس کمرے میں لے گئے جہاں بشیر دن کے وقت بیٹھا کرتا تھا۔ اس کمرے کے اندر سے ایک کمرہ چھوڑ کر بشیر کے رہائشی حصے کے دو کمرے تھے اور ان کمروں سے ملحقہ وہ بڑا کمرہ تھا جس میں لینتھ مشین کے علاوہ کئی اور مشینیں پڑی ہوئی تھیں۔ بشیر کے رہائشی حصے کے کمرے متغزل تھے۔ عائل کی جیب سے میرے نمبر ٹوٹے چابوں نکالیں اور عائل کو گھسیٹتے ہوئے ہم سب بشیر کے رہائشی کمرے میں آگئے۔ اسی کمرے میں بشیر کو قتل کیا گیا تھا۔

عائل کے لئے یہ سب بالکل غیر متوقع تھا، اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھتا تھا کہ اسے دو ساتھیوں کو اشارہ کیا اور انہوں نے اسے ٹھنڈوں سے مارنا شروع کر دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے شروع میں ہی ایسی مادی جائے کہ وہ بچ بولنے پر مجبور ہو جائے۔ جب اس کی اچھی طرح سے ٹھکانی ہوگئی تو میں نے اسے پیچھے کو کہا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ میں نے اسے ایک زوردار جھانپڑا رسید کیا اور کہا کہ فرش پر آڑوں روک بیٹھے۔ عائل فرش پر بیٹھ گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ اب ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ بشیر کیسے قتل ہوا۔ عائل نے وہی سکھ والی کہانی شروع کی تو میرے ساتھی نے پیچھے سے اس کے سر پر گھونسا مارا۔ میں نے عائل سے کہا کہ میں نے تمہیں سچ بولنے کے لئے کہا تھا۔ سکھ والی بات بالکل غلط ہے۔ سچ بتاؤ، عائل نے گڑبڑ کر تہمتیں کھانی شروع کیں کہ سکھ والا واقعہ سچا ہے۔ میرے ساتھیوں نے اسے پھر مارنا شروع کیا۔ باہر مومسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور یہ کمرہ گیرج کے بالکل آخری حصے میں واقع تھا۔ عائل کی چیخ و پکار کی آواز سڑک پر سنی جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ میرے ایک ساتھی نے بچے کا ایک بھاری ریشخ اٹھایا اور مجھ سے پوچھا کہ ہاتھوں سے شروع کرو یا پاؤں سے۔ میں نے کہا پاؤں سے۔ میرے ساتھی نے اسے جوتے اتارنے کو کہا۔ عائل نے جوتے اتارنے میں تامل کیا تو میرے ساتھیوں نے اسے اپنی گردن میں لے کر اس کے جوتے اتارے۔ دو ساتھیوں نے عائل کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ایک نے اس کے منہ میں رو مال ٹھونسنا اور ریشخ والے ساتھی نے پورے زور سے اس کے پاؤں پر ریشخ مارنا شروع کیا اور تب چھوڑا جب اس کے پاؤں کی ہڈیاں چکنا چور ہو چکی تھیں۔ عائل بہت تڑپا تملایا لیکن میرے ساتھیوں کی مضبوط گردن سے نہ نکل سکا۔ عائل کے منہ میں رو مال بدستور ٹھونسنا ہوا تھا۔ میرے ساتھی نے اس کا دوسرا پاؤں کھینچ کر سامنے کیا اور مارنے کیلئے ریشخ بلند کیا۔ میں نے عائل کو کہا اب بھی سچ بول دو تو اس اذیت سے بچ جاؤ گے دوسری صورت میں تمہارا دوسرا پاؤں اور پھر سارے جسم کی ایک ایک ہڈی کے بیسیوں کڑے کر دیئے جائیں گے۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ ہم سچ اگھوانے کیلئے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ عائل کے منہ میں رو مال تھا۔ دونوں بازو ساتھیوں نے پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے زور زور سے اثبات میں سر ہلانا شروع کیا۔ ریشخ والے ساتھی نے اس کے منہ میں رو مال ڈالا تو پہلے تو عائل نے درد کی تکلیف کی وجہ سے چیخیں ماری شروع کیں۔ میرے ساتھی نے ریشخ اٹھا کر پھر اس کے پاؤں کو نشانہ بنانا چاہتا تو عائل نے چیختے ہوئے کہا اللہ کے واسطے مجھے مت ماریں میں سب کچھ سچ بتاتا ہوں۔ اس طرح کے تشدد کو تاہم بڑو نہ حملہ کہتے ہیں۔ عائل نے جو کچھ بتایا وہ یہ تھا کہ بشیر کے قتل سے ایک رات پہلے اس نے بشیر کو اپنی خیمہ سیف کھولنے دیکھا تھا۔ یہ سیف زمین میں اسی کمرے میں اس طرح گڑی ہوئی تھی کہ اس کے سامنے کارخانہ اوپر کی جانب تھا اور فرش سے قریب 6 انچ اندر تھی۔ کمرے میں بڑے ٹائلوں کا فرش تھا۔ سیف بند کر کے اس کے اوپر ٹائل رکھ دیئے جاتے تھے اور بڑا قایلین ان ٹائلوں کو ڈھانپ دیتا تھا۔ کمرے میں ایک بڑا قایلین بچھا ہوا تھا اور سیف والی جگہ پر صوفیہ پڑا تھا۔ عائل نے بتایا کہ سیف میں ڈھیر سارے روپے دیکھ کر اس کی نیت خراب ہوگئی تھی۔ بشیر کو اس پر اتنا اعتبار تھا کہ اسے ایک پستول بھی دے رکھا تھا۔ اسی پستول سے اس نے بشیر کو گولی رات نشا نہ بنایا اور بشیر کی جیب سے چابیاں نکال کر سیف کھولنی چاہی لیکن کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ سیف میں نمبر لاک بھی تھا۔ ہم نے صوفیہ ہٹایا۔ قایلین پلٹا نکل اٹھا تو سیف سامنے تھی۔ چابیاں پوچھنے پر عائل نے بتایا کہ دوسرے کمرے میں لینتھ مشین کی موٹر کے نزدیک چھپا کر رکھی ہیں۔ ایک ساتھی اس کمرے میں گیا اور چابیاں اٹھالیں۔ چابیاں تو سیف میں لگ گئیں لیکن نمبر لاک بڑی پر اہم تھا۔ سیف اتنی مضبوط تھی کہ پستول کی گولیوں سے بھی نہ نکل سکتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ نمبروں کی ترتیب بشیر نے کہیں لکھ کر رکھی ہوگی۔ میں نے بشیر کے کانڈات کی الماری کھنگالنی شروع کی۔ اس الماری میں مختلف قسم کے کانڈات، بجلی اور پانی کے بل بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ ایک ڈائری نما کاپی کانڈوں کے نیچے سے ملی۔ اس میں نام، ٹیلی فون نمبر اور عجیب و غریب قسم کے ایڈریس لکھے تھے۔ مثلاً مشرق میں 140 کلوانے کو سامان پہنچانا ہے۔ 6 کلوجوب میں سامان کی قیمت ملے گی۔ اس ڈائری پر اسی طرح کی تحریریں درج تھیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس ڈائری کے ہر صفحے پر اوپر بم اللہ الرحمن الرحیم کی عدوی تعداد 786 لکھی ہوئی ہے۔ ہر صفحے پر ایک صفحہ ایسا تھا جس پر دائیں جانب 8 اور 6 لکھے ہوئے تھے جبکہ بائیں جانب 7 لکھا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس صفحے پر 786 کوالٹ پلٹ اور علیحدہ علیحدہ کیوں لکھا تھا۔ میرے ساتھی اس دوران سیف کے نمبر ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بغیر کسی وجہ کے میں نے انہیں ہٹایا اور نمبروں والی تاب کو ہفر پلا کر پہلے دائیں جانب نمبر 8 پر لایا پھر بائیں جانب پورا چکر دے کر 7 نمبر پر رکھا اور دائیں جانب پورا چکر دے کر 6 نمبر پر رکھا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے پینڈل گھمایا تو سیف کھٹاک سے نکل گئی۔ میں سمجھتا ہوں اس میں ہیرا کوئی کمال نہ تھا یہ سب بم اللہ کی برکت تھی، محض اتفاق نہ تھا۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ سیف کو بالکل خالی کر دیں۔ سیف میں سے گیارہ لاکھ اور پانچ ہزار کے لگ بھگ رقم، 8 عدد مختلف بورے پستول اور ریوا لوری بے شمار گولیاں اور ایک ڈائری برآمد ہوئی۔ ڈائری میں اس کے گروہ کے تمام لڑکوں کے پتے اور کچھ ٹیلی فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔ میں نے وہ ڈائری تو جیب میں رکھ لی اس دوران شدید بارش اور خاصی رات گزر جانے کے باعث بڑے گیٹ پر کھڑے لڑکے بھی اندر آگئے تھے، روپیہ اور کانڈات میرے ساتھیوں نے بشیر کے ہی ایک سوٹ کس میں رکھ لئے اور اسلحہ اور گولیاں ایک کیڑوں کے تھیلے میں ڈال دیں۔ عائل گھٹنوں کے بل بیٹھا آنکھیں چھاڑے ہمیں اور سیف سے نکلنے والے لاکھوں روپوں کو دیکھتے ہوئے درد سے کراہ رہا تھا۔ اب وہی ہماری سب سے بڑی پر اہم تھا۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے والدین اور ان کی غیر موجودگی میں دوستوں اور ساتھیوں سے مشورہ ضرور کرتا تھا لیکن بعض اوقات جب میں اپنے تئیں اپنے کسی فیصلے کو بالکل درست سمجھتا تھا تو پہلے اس پر عمل کرتا اور بعد میں دوسروں کو بتاتا تھا۔

میں نے لڑکوں کو گاڑی پر ڈالنے والا ترپال لانے کو کہا۔ چند منٹ میں ہی وہ ایک پھٹا پانا ترپال لے آئے میں نے انہیں ترپال کو دہرا کر کے بچھانے کی ہدایت کی۔ کسی کو مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ سب خاموشی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ وہ عائل کو ترپال کے بیچ میں بٹھادیں۔ انہوں نے عائل کو اٹھا کر ترپال پر بٹھا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے آئندہ اقدام کا تیس کر سکیں۔ میں نے سائیکس والا بیل نکالا اور عائل کے سینے پر پے در پے تین گولیاں داغ دیں۔ عائل نے مدہم ہی سسکی لی اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لڑکوں اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کروں اور مختلف آراء کی صورت میں کسی مجھے میں پڑ جاؤں۔ عائل نے بشیر کے قتل کا اقبال کیا تھا۔ محض پیسے کی لالچ میں اس نے ہمارے ایک بے لوث اور وفادار ساتھی کو قتل کیا تھا اور اسے زندہ چھوڑ دینے کا مطلب تھا کہ میں اپنے سمیت اپنے ساتھیوں، لڑکوں اور نڈیرو عارف کو بھارتی پولیس اور DMI کے حوالے کر دوں۔ میرے ساتھیوں نے پہلی مرتبہ مجھے طیش کے عالم میں دیکھا تھا۔ وہ تو بالکل خاموش رہے، سب لڑکے مجھے لالہ جی کہتے تھے، ان میں سے ایک نے سکوت توڑا اور کہنے لگا اللہ جی ہمیں یہی تئوش تھی کہ کہیں آپ اسے چھوڑ نہ دیں اس جیسے خدا اور نمک حرام کا یہی انجام لازمی تھا۔ وہ چپ ہوا تو سب نے اس کی تائید کی۔ ایک لڑکے نے کہا کہ اگر اس کی لاش کے پانچ سات کٹڑے کر دیئے جائیں اور چہرہ ناقابل شناخت بنا کر گردن الگ کر دی جائے تو بہتر رہے گا۔ ایک نے تجویز کیا کہ لاش کو گیرج میں کہیں دفن کر دیا جائے جسے میں نے فوراً ہی مسترد کر دیا۔ بلاخر یہ فیصلہ ہوا کہ چہرے کو ناقابل شناخت بنا کر گردن الگ کر دی جائے اور کوئی ایسا نشان نہ چھوڑا جائے جس سے پتہ چل سکے کہ عائل کو مار دیا گیا ہے بلکہ یہ سمجھا جائے کہ وہ بھاگ گیا ہے۔ لاش کے کٹڑے کرنے کا کام میں نے لڑکوں کو سونپا میرے ساتھیوں میں سے ایک باورچی خانے میں چائے بنانے چلا گیا۔ قارئین! یہ میری زندگی اور بھارت میں میرا پہلا قتل تھا جس پر میں کبھی شرمندہ نہیں ہوا۔

میں نے عارف کا فون ملایا اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور مومسلا دھار بارش جاری تھی کافی دیر تک گھنٹی بجنے کے بعد عارف نے فون اٹھایا۔ میں نے مختصر آے کہ کچھ منٹ لال میاں میں ہم کل 9 افراد موجود ہیں ایک بڑی امیر منی ہے اس لئے جیسے بھی ہو، ایک پرائیویٹ کار خود ڈرائیو کرتے ہوئے 4 بجے تک پہنچ جائے۔ عارف کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی میں نے فون بند کر دیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر لڑکوں نے لاش کے کٹڑوں کی 9 گھڑیاں بنا لی تھیں۔ میرا ساتھی جائے اور سٹک کے رپورٹی جانے سے آگیا سب نے چائے پی۔

چار بجے سے پہلے ہی ہمیں ہارن کے وقفے وقفے سے سجنے کی آواز سنائی دی عارف اپنے ایک پڑوسی کی گاڑی لے کر آچکا تھا۔ میں نے مختصر آے ساری بات بتائی لڑکوں نے گاڑی کی ڈیگی میں سب گھڑیاں بھی رکھ دی تھیں۔ انہوں نے ایک ٹیکسڈ کی قمی کی گیرج میں پڑی اینٹوں میں سے ہر گھڑی میں پانچ پانچ اینٹیں بھی رکھ دی تھیں تاکہ گھڑیاں وزن کی وجہ سے تہہ میں چلی جائیں ہر گھڑی کوری سے مضبوطی کے ساتھ باندھا گیا تھا۔ عارف نے بتایا کہ ایک سڑک جنکے ڈاؤن اسٹریم Down Stream میں بارہ میل تک دریا کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ گھڑیوں کو وہاں بھینکانا بہتر رہے گا۔ میں نے صبح چار بجے کا وقت اس لئے چنا تھا کہ اس وقت پولیس اور دیگر اداروں کے ٹائٹ ڈیوٹی والے گھروں کو چلے جاتے ہیں جبکہ صبح کی ڈیوٹی والے 6 بجے سے پہلے ڈیوٹی کے مقام پر نہیں پہنچتے۔ اس وقت صرف فوجی دیہاتوں سے دودھ والے ہی سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ گاڑی میں عارف کے ساتھ میرا ایک ساتھی اور تین لڑکے بیٹھ گئے تاکہ گھڑیوں کو کھٹکانے لگانے میں وقت صرف نہ ہو۔ گیرج میں میرے سوا تین ساتھی اور ایک لڑکارہ گئے۔ عارف نے واپس پر لڑکوں کو کھٹکانے لال میاں کے قریب اتار کر میرے ساتھی کے ہمراہ واپس چلے جاتا تھا۔ میں نے عارف کو کہا کہ گھڑیاں بھینکنے کے بعد گاڑی کی ڈیگی کو کچھ وقت بارش میں کھلا رہنے دے تاکہ اگر خون کا کوئی نشان ہو تو وہ مٹ جائے۔ ہمارے پاس رہ جانے والے لڑکے نے بتایا کہ دہلی کی بہت ساری ٹیکسیاں کھٹکانے لال میاں میں رہنے والوں کی ہیں جو صبح سات بجے روزی کمانے نکل پڑتی ہیں۔ ٹھیک ساڑھے 5 بجے ہم نے گیرج کے کمروں اور مین گیٹ کو تالہ لگا یا اور سوٹ کس اور کیڑوں کے پستولوں اور گولیوں سے بھرے تھیلے کو اٹھا کر سڑک پر آگئے ابھی بالکل اندھیرا تھا بادلوں نے سحر کی مدہم روشنی کو چھپا رکھا تھا مومسلا دھار بارش جاری تھی۔ ہم بارش میں بھیگتے چلتے چلتے تقریباً دو کلومیٹر دور چورہا پے پہنچ گئے اور دائیں رخ کی سڑک کے کنارے ایک درخت تلے کھڑے ہو گئے تاکہ کوئی ہمیں کھٹکانے لال میاں سے آتا ہو نہ سمجھ بیٹھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک ٹرک دہلی کی جانب جاتا دکھائی دیا ہم نے اسے روکا تو سکھ ڈرائیور نے کہا کہ اسے سبزی منڈی جانا ہے وہ روپے دو اور پیچھے بیٹھ جاؤ ہم نے اسے غنیمت بنا لیا۔ بہتر جانا اور ترپال سے ڈھٹکے میں بیٹھ گئے۔ سبزی منڈی پہنچ کر ہم نے ریلوے اسٹیشن کا اور ہیڈ بروج کر اس کیا اور دوسری طرف آگئے۔ اسٹیشن کے باہر رکشے اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں ہم نے دو ٹیکسیاں لیں ایک میں اس لڑکے کو دوسرو روپے دے کر اس کے گھر بھیجا۔ اور دوسری میں میرے تینوں ساتھی اور میں ساتھیوں کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم رات بھر کے جاگے اور بارش سے بری طرح بھیگے ہوئے تھے ہم میں ناشتہ بنانے کی ہمت بھی نہ تھی۔ مذہر کے گھر والے بیدار ہوئے تو ہم نے انہیں ہمارے لئے ناشتہ بنانے کا کہا اور مذہر کو بھی اپرا پلا کر اسے رات کا وقتہ سنایا۔ اس نے بھی میرے فیصلے کی تائید کی۔ آٹھ بجے تک عارف اور ہمارا ساتھی بھی لوٹ آئے اور پانا کام پتھر خوشی انجام دینے کا بتایا تو ہمیں اطمینان نصیب ہوا۔ بشیر سے متعلق باقی واقعات مختصر عرض کرتا ہوں۔ دو روز بعد عارف نے بشیر کے شاگرد لڑکوں کی میٹنگ بلائی۔ کیونکہ عارف کو ہی سرپرست کی حیثیت حاصل تھی میں نے تمام روپیہ عارف اور مذہر کے حوالے کیا جسے دونوں نے Joint اکاؤنٹ کھول کر بینک میں رکھوا دیا۔ اس رقم سے لڑکوں کی مزید تربیت اور ان کی جائز ضروریات کیلئے روپیہ نکلا گیا جاسکتا تھا۔ بشیر کا کوئی فوری وارث تو تھا نہیں جسے روپیہ دیا جاتا۔ اس لئے اس کا بہترین مصرف ہم نے یہی سمجھا کہ اس کی رقم کو اس کے جائزوں پر ہی خرچ کرنا چاہئے۔ بشیر کی صحیح فوٹو ہمیں اس کے مرنے کے بعد آئی جب پتہ چلا کہ بشیر نے گیرج اپنی موت کے بعد سچ کر اس روپے سے کھٹکانے لال میاں کی کنواری لڑکیوں، ضعیف مردوں اور عورتوں میں بانٹنے کی قانونی وصیت کر رکھی تھی۔ میرے مشورے سے عارف نے وہ گیرج بشیر کے جمع شدہ پیسوں میں سے 3 لاکھ میں خریدا۔

بشیر کے جائزوں کو پھر مل بیٹھنے اور مستقبل میں اپنی کارروائیوں کیلئے جگہ میسر آگئی۔ جن لڑکوں کو بشیر نے موٹرملیک کے کام سکھایا تھا انہوں نے ورکشاپ سنبھال لی۔ کھٹکانے لال میاں والوں کو جب بشیر کی وصیت اور غنڈے کے خول میں ایک محبت کرنے والا شریف انسان دکھائی دیا تو بہت ساری پرائیویٹ کاریں اور ٹیکسیاں اس کے گیرج کی گا بن گئیں۔ ملکیت لڑکوں نے بھی خوب محنت کی۔ گیرج کا کام اور شہرت روز بروز بڑھتی گئی۔ دن کو وہاں موٹروں کی مرمت کا کام ہوتا تھا اور رات کو تربیت اور مستقبل میں کارروائیوں کی منصوبہ بندی کی جاتی تھی۔ کیا اب بھی مجھے عائل کے قتل کا مجرم ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ ایک بات بیان میں رہی۔ بشیر کی سیف سے ملے اسلحہ کو میں نے اپنے ساتھیوں کی تحویل میں دے دیا کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ نوجوان لڑکے جذبات میں بہہ کر کوئی ایسی نادانی نہ کر بیٹھیں جس کا نہما یہ ہم سب کو بھگتنا پڑے۔ رام پوری چاقو کا استعمال ہوا تو وہ بشیر سے سے سیکھ ہی چکے تھے بارودی اسلحہ نہیں دینا دانش مندی نہ تھی۔

آئی بی ہیڈ کوارٹرز میں دھا کے

میرے ساتھی اور میں پہلے ہی اعصاب شکن ماحول میں رہ رہے تھے۔ بشیر کے قتل نے تو ہمیں بالکل ہی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ہماری حالت کا اندازہ تو وہی کر سکتے ہیں جنہیں ہوائی سفر کے دوران بھی جہاز کے AIR POCKET میں آ کر بے تکڑوں فٹ بیخندت نیچے چلے جانے یا طوفان میں گھر کر ڈگمگانے کا تجربہ ہوا ہو۔ صرف چند منٹوں کیلئے ایسی کیفیت کے دوران مسافروں کی جو حالت ہوتی ہے۔ ہم لگا تار اور مسافر قتل تقریباً دس ماہ سے اس کا شکار تھے۔ بشیر کے قتل کے دو ہفتے بعد میں نے ساتھیوں کو پہلے سے طے شدہ چھٹی پر جا کر تازہ دم ہونے کو کہا۔ لیکن انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے انہیں ماسوا ڈاک کی وصولی اور بیٹھنے تمام سرگرمیاں پندرہ روز کیلئے معطل کرنے کا کہا، وہ مان گئے۔ میں خود بھی سے حد فوجی دباؤ کا شکار تھا جس کا میں نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ میں تقریباً دو روز نہ ساتھیوں کے گھر جاتا تھا۔ عارف اور مذہر سے بھی اکثر ملاقات رہتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرے ساتھی ہمیشہ اپنے بستروں میں رضائی اوڑھے لیٹے ہی رہتے تھے، خود میری حالت یہ تھی کہ ان دو تین گھنٹوں کو چھوڑ کر جو میں ساتھیوں کے پاس جانے اور ان کے ساتھ بات چیت میں صرف کرتا تھا باقی سارا وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایسی حالت میں اگر مزید چند روز ہم نے گزارے تو اعصابی تناؤ ہم سب پر حاوی ہو جائے گا اور ہم مزید کوئی مشن پورا کرنے کے قابل نہ رہیں گے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ 65ء کی جنگ کے بعد سیز فائر کے دوران پاکستانی اور بھارتی فوجیں ایک دوسرے کی فائرنگ ریشخ میں مورچوں میں دیکھ رہی تھیں۔ پاکستانی فوجی آدھی رات کے وقت مل کر بلند آواز میں اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے اور فوراً ہی بھارتی فوجی ہزاروں گولیاں فائر کر دیتے۔ بھارتی فوجی علی الصبح حاجات سے فراغت کیلئے چھٹی گزریاں لئے ہوئے مورچوں سے باہر نکلتے تو پاکستانی فوجیوں کو ان کا نشانہ بنانے کا کام کر دیا اور فائر کر دیتے تھے۔ بس پھر نہ حاجات باقی رہتی تھی اور نہ ہی گزریاں۔ کئی کئی گھنٹے بھارت کی طرف سے مسلسل فائر جاری رہتا۔ پاکستانی فوجیوں نے نوا سے ایک روزمرہ کا کھیل بنالیا تھا۔ ادھر بھارتی فوج کی حالت ڈرگروں تھی۔ آخر کار سیکٹر کمانڈروں کے اجلاس میں اس سیکٹر کے بھارتی بریگیڈیئر نے پاکستانی سیکٹر کمانڈر سے گڑبڑ کر التجا کی کہ ایک تو پاکستانی فوجی رات کو اللہ اکبر کا نعرہ نہ لگائیں اور دوسرے گزریوں پر فائر کرنا چھوڑ دیا۔ کئی بھارتی فوجی اللہ اکبر کے نعرے سے اپنے حواس کھو بیٹھے اور چیختے چلاتے فائر کرتے تو نو میگز لینڈ سے بھی آگے بڑھ کر پاکستانی گولیوں کا شکار ہو چکے تھے۔

غازی

لوگرم رکھنے کیلئے ہمیں لپکنا، جھپکنا اور جھپٹ کر پلٹنے کی اشد ضرورت تھی۔ میں نے ہنگامی بنیادوں پر ایک پروگرام بنایا اور عارف کے ذریعے لڑکوں کو شام چھ بجے گیارہ بجے میں میٹنگ کیلئے اکٹھے ہونے کا کہا۔ اگلے روز ہم پانچوں عارف کو ساتھ لے کر گریج پہنچے۔ تمام لڑکے وہاں موجود تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہنا چاہئے بلکہ اپنی سرگرمیوں کو تندرہی سے جاری رکھنا چاہئے۔ HIT AND RUN کی پالیسی کے تحت آپ لوگوں کو نارگٹ چھنے ہیں۔ چونکہ لڑکے دہلی اور گردونواح سے بخوبی واقف ہیں لہذا ہر تین لڑکوں کی ٹولی کا انچارج میرا ایک ساتھی ہوگا۔ میں نے 9 لڑکوں کی تین ٹولیاں بنائیں اور تین ساتھیوں کو (نمبر نو کو چھوڑ کر) ان کا انچارج بنایا۔ میں نے انہیں کہا کہ نارگٹ چھنے وقت اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ شہری آبادی کو جانی یا مالی نقصان نہ پہنچے۔ ہمارا مقصد صرف سراسیمگی پھیلانا اور IN-UNIFORM ان لوگوں کے خلاف عوام میں نا اہلی کے جذبات پیدا کرنا ہے۔ نارگٹ چھنے کے بعد وہ مجھے نارگٹ کی تفصیلات بتائیں گے اور نارگٹ ہر لحاظ سے مفید اور محفوظ ہو تو میں اس نارگٹ کیلئے ضروری سامان مہیا کروں گا۔ میں نے لڑکوں سے کہا کہ پرسوں صبح 9 بجے وہ کشمیری گیٹ، گاندھی کی سادھی اور لال قلعہ کے سامنے بالترتیب آئے، بی اور سی گروپ پہنچ جائیں۔ جہاں پر میرے تین ساتھی انہیں ملیں گے اور نارگٹس کی تلاش میں ان کے ہمراہ رہیں گے۔ سب نے اس پروگرام کو پسند کیا۔ میرے ساتھی بھی اپنی اصلی فارم میں آگے اور اس نے مشن کیلئے ذہنی طور پر خود کو تیار کرنے لگے۔ ان نارگٹوں کی تلاش سے میرا ایک اور مقصد بھی تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے ساتھی دہلی سے اچھی طرح سے واقف ہو جائیں اور میں بھی ان معلومات کی روشنی میں ان سب جگہوں پر نشان لگا سکوں جہاں ایسی کارروائی کی جاسکتی تھی اور وہ حساس مقامات جو اب تک میری نظروں میں نہیں آئے تھے ان کے متعلق بھی جانکاری رکھوں۔ ان تینوں ٹولیوں نے کم از کم دس بارہ حساس مقامات تلاش کرنے تھے۔ اس IN-UNIFORM سے میری مراد صرف فوجی علاقے ہی نہیں تھے بلکہ پولیس، ریزرو پولیس، آئی بی، بیوی اور ایئر فورس کے دفاتر کے علاوہ پولیس لائنز، فوجی اور آل انڈیا ریڈیو کے ٹرانسمیشن پول بھی تھے جہاں فوج کا پہرہ ہوتا ہے۔ میں نے اس بات کی تفصیلاً وضاحت کر دی تھی۔

مقررہ وقت پر میرے ساتھی لڑکوں سے مقررہ جگہوں پر ملے اور اپنے اپنے نارگٹس کی تلاش میں دہلی اور گردونواح کے علاقوں میں پھیل گئے۔ ہر شام 8 بجے میں ساتھیوں کے گھر جاتا۔ ہم سب نے دہلی اور نواحی علاقوں کے ایک جیسے نقشے لے رکھے تھے۔ میرے ساتھی اپنے اپنے نقشوں پر نشان لگاتے اور اس سے علاقے کی تفصیل مجھے بتاتے اور میں اپنے نقشے پر نشان لگا کر ان کی حاصل کردہ تفصیل کی سرکھی لکھ لیتا۔ یوں تقریباً دس روز میں مجھے چودہ مختلف حساس مقامات کی تفصیل اور نشان دہی حاصل ہو چکی تھی۔ میرے ساتھی اور لڑکے بھر پور چستی اور عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے ان چودہ مقامات کی اہمیت کے حساب سے درجہ بندی کر لی اور تین دن میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان سب مقامات پر گیا۔ ایک کا وقت اور بھاگنے کے رستوں کا تعین کیا۔ درجہ بندی میں اول اہمیت میں نے ریڈیو ٹرانسمیشن پول، ایریا، دوئم آئی بی ہیڈ کوارٹر اور تیسری پوزیشن تین مقامات یعنی آرمی، ایئر فورس اور نیول RECRUITING CENTRES کو دی۔ ان تمام مقامات پر حملوں کے وقت مدافعت کا کوئی امکان نہ تھا اور میرے ساتھیوں اور لڑکوں کو گروپ کی صورت میں حملہ کرنے اور دو دو کی ٹولی میں بھاگ جانے کا عملی تجربہ بھی ہو جاتا۔ میں نے اپنے نئے ہمدرد صنعت کار سے رابطہ کیا اور اس سے مزید پندرہ ٹائم بم طلب کئے۔ اس نے ایک ہفتے میں ہم مہیا کرنے کی مہلت لی۔ میں چاہتا تھا کہ لڑکوں اور اپنے ساتھیوں کی کارکردگی اگر حوصلہ افزا رہی تو اس سب سے بڑے مشن کو انجام دینے کی کوشش کروں جس کے متعلق میرے سینئر نے دوران تربیت مجھے بتایا تھا کہ وہ مشن ہمارا PRESTIGE MATTER بن چکا ہے۔ میں نے بھی بھارت میں اب تک کے قیام کے دوران جب بھی اس مشن کے متعلق سوچا، اپنے ساتھیوں کی مختصر تعداد اور مشن سرانجام دینے کیلئے مطلوب سامان کا نہ ہونا اڑے آیا۔ اب ان لڑکوں کی وجہ سے ہماری عددی کمی پوری ہو چکی تھی اور نئے ہمدرد کے ذریعے ہر طرح کے مطلوبہ سامانے حاصل ممکن بنا دیا گیا تھا۔ ہمارے سینئر نے بھی یہ نیا انتظام غالباً اس لئے کیا تھا کہ ہماری گزشتہ کارکردگی نے انہیں متاثر کیا ہو اور انہیں اپنے PRESTIGE MISSION میں ہماری کامیابی کا امکان نظر آتا ہو اور وہ مشن بھارت کے اس ہوائی اڈے کا جس کارن وے، جنگی طیاروں کے FUELING اور PARKING RAMP کا انتظام پہاڑ میں سرنگیں کھود کر پہاڑ کے اندر کیا گیا تھا اور ایک تھائی رن وے بھی پہاڑ کے اندر ہی تھا اور وہاں بھارت نے اپنے ٹنگ 21 کے علاوہ فرانسیسی میراج طیارے بھی محفوظ کئے ہوئے تھے۔

ہم نے پہلے روز ریڈیو ٹرانسمیشن پول (POLE) I.B. ہیڈ کوارٹر پر صبح سات بجے اور آرمی اور ایئر فورس ریکروٹمنٹ سینٹر پر شام 6 بجے حملہ کا وقت مقرر کیا ان اوقات میں مدافعت کا بہت کم امکان تھا اور ان کا جانی نقصان ہوتا بھی تو بہت کم ہوتا۔ ایک ہی دن میں چار مختلف حساس مقامات پر بم دھماکوں سے تباہی اور وہ بھی بھارتی دارالحکومت میں پورے بھارت کو ہلا کر رکھ دیتی۔ میں نے کئی بار ان چاروں نارگٹس پر جا کر حملے کے بعد بھاگنے کے راستوں کا تعین کیا۔ دشواری صرف ریڈیو ٹرانسمیشن پول پر حملے کے بعد فرار کی راہ کا تعین کرنے میں پیش آئی۔ ٹرانسمیشن کے پوزیشن دہلی کے انڈسٹریل ایریا کے ختم ہوجانے کے بعد جمن جی ٹی روڈ پر دہلی سے قریب 30 کلومیٹر کے فاصلے پر تھے اور وہ سارا ایریا خاردار تاروں سے گھرا ہوا تھا اندر داخل ہونے کا صرف ایک راستہ تھا اور ٹرانسمیشن پول کے درمیان ریلوے اسٹیشن کے دو کمرے اور گارڈ ز کے لئے بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ نگرانی کے دوران مجھے ایک وقت میں صرف دو گارڈز دیکھائی دیئے۔ جو بیشتر وقت گارڈ روم میں ہی گزارتے تھے کیونکہ بادلوں کی وجہ سے انہیں دھوپ سینکے کونیسر نہ تھی۔ پچھلی جانب کی خاردار تاروں کو کاٹ کر ریلوے اسٹیشن تک بغیر گارڈز کی نگاہ میں آئے پہنچا بہت آسان تھا۔ مسئلہ صرف بم رکھنے کے بعد تین روڈ تک واپس آنا اور وہاں سے دہلی تک آنے کا تھا۔ اس کا حل یوں نکالا گیا کہ ہم کو ان کر کے چھٹنے کا وقفہ 45 منٹ کا رکھا جائے اور واپسی کے لئے گاڑی مہیا کرنے کی ذمہ داری عارف کو سونپی۔

I.B. (تینلی جنس بیورو) کا ہی کوارٹر پرانی دہلی میں ایک قدیم عمارت میں قائم تھا۔ ایک بغیر دروازوں کے مغلیہ دور کے طرز کا داخلے کا تاجزادہ دروازہ تھا کہ بڑا تھا بھی با آسانی گزر جائے۔ دروازے سے گزر کر مستطیل میدان میں عملے کی اور سرکاری گاڑیوں کی پارکنگ تھی اور اس میدان کے تین اطراف پر آمدے اور کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہیں پر زیر زمین نارچر پیل اور لاک بھی ضرور ہوں گے۔ یہاں پر پروگرام کے مطابق پارکنگ لائٹ میں سرکاری گاڑیوں کے درمیان والی گاڑی میں بم رکھنا تھا تاکہ دھماکے سے دونوں اطراف کھڑی گاڑیوں کو بھی نقصان پہنچے۔ صبح سات بجے سوئیزر تک ہمیں ان گاڑیوں تک پہنچنا اور بم رکھنے کے بعد فرار ہونا بہت آسان تھا۔ نیول ریکروٹمنٹ سینٹر کو ہم نے فی الحال اپنی لسٹ سے نکال دیا تھا۔ آرمی اور ایئر فورس ریکروٹمنٹ سینٹر پر شام 4 بجے کے بعد صرف دو تین گارڈز اور سوئیزر کی حکمرانی ہوتی تھی۔ ان دونوں جگہوں کی چار دیواری 4 سے 5 فٹ تک بلند تھی اور اسے پھلانگ کر اصل عمارت کے بڑے دروازے تک پہنچنا اور بم رکھ کر (دروازہ بند ہونے کی صورت میں کھڑکی کا شیشہ کاٹ کر بم اندر بھینکنا) اور سلامتی سے واپس لوٹنا بھی ایسا دشوار نہ تھا۔ ان دونوں جگہوں پر بم چھٹنے کا وقفہ 30 منٹ رکھنے کا طے ہوا۔ یہ دونوں سینٹر نئی دہلی میں سفارت خانوں کے قریب ہی جن پت کے علاقے میں واقع تھے۔ میں نے ان حملوں کے دوران پیش آنے والی ہر ممکن دشواری اور تمام جزئیات پر اپنے ساتھیوں سے کئی بار مشورہ کیا اور لڑکوں کو کئی بار رہبر سل کروائی۔ ہمارا ہوم ورک پوری طرح سے مکمل تھا اور ہم سب اس پر متفق اور مطمئن تھے حملے کا وقت تک متعین کیا جا چکا تھا۔ اب ہمیں ہموں کی وصولی کے بعد صرف تاریخ کا تعین کرنا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ یہ حملے اتوار کے روز کئے جائیں کیونکہ چھٹی کی وجہ سے آئی بی کی بیشتر گاڑیاں ہیڈ کوارٹر میں موجود ہوں گی ریکروٹمنٹ سینٹر پر بھی بالکل خاموشی ہوگی کیونکہ بعض اوقات امیدواروں کے ٹیسٹ خاصی دیر تک جاری رہتے تھے۔

میر کی ہدایت پر میرے ساتھیوں نے خاردار تار کاٹنے کے لئے ایک بڑا کٹر، ریز کے بڑے دستانے، سوئیزر کے مخصوص لباس، شیشہ کاٹنے کیلئے بہرے کی ٹلمیں، شیشے کو بغیر آواز علیحدہ کرنے کے لئے ریز کے ویکوم (یہ ویکوم ریز بچوں کی کھلونوں کی دکان سے تیروں کے آگے لگے ویکوم ریز تھے) اپنے اور لڑکوں کے لئے کیوس شوز اور اونٹنیوں (جنہیں کھول کر گرننگ تک لایا جاسکتا تھا اور صرف آدھا چہرہ دکھائی دیتا) خریدیں اور ان ٹوپوں پر پشت کی جانب صرف آنکھوں کی جگہ پر سوراخ کرنے تاکہ اگر ضرورت پیش آئے تو حملے کے دوران ان کی شناخت نہ ہوسکے۔ غرضیکہ پلان کے مطابق ہماری تمام تیاری مکمل تھی۔ اس بار مجھے ان مشنز کو صرف مانیٹر کرنا تھا۔ عملی حصہ نہیں لینا تھا۔ طے شدہ مقام اور وقت کے مطابق مجھے دو سوٹ کیسوں میں حفاظت سے پیک کئے ہوئے 15 ٹائم بم بھی ملے گئے۔ اپنے ساتھیوں کو ACTIVATE کرنے کیلئے میں نے چاروں جگہوں پر بم پلانٹ کرنے کی ذمہ داری انہیں سونپی۔ لڑکوں نے انہیں کور دینا تھا۔ صبح والی دو ٹولیوں میں سے ایک کو اس شام دوسرے نارگٹ پر حملہ کرنا تھا یہ ٹولی میرے جوڈو کرائے کے ماہر ساتھی کے زیر نگرانی تھی۔ میرے نمبر ٹونے بہت ضد کہہ کر اسے بھی چاروں میں سے ایک مشن دیا جائے لیکن میں نے اسے اجازت نہ دی ہمارا ٹرانسمیشن آپریٹروں کا اور مشن میں نا کامی کی صورت میں ہمارا ٹرانسمیشن سے پاکستان سے رابطہ ختم ہو جاتا۔ میں نے اس مشن کیلئے بھی پاکستان سے اجازت نہیں لی تھی۔ مجھے ایک جزل ہدایت دی گئی تھی کہ ہر وہ کام کرو جس سے عوام میں سراسیمگی پھیل سکے اور ایسی ہدایت کے تحت میں نے گزشتہ اور یہ مشن ترتیب دیئے تھے۔

میں نے آئندہ جیسے کی شام ساتھیوں کے ہمراہ لڑکوں سے میٹنگ کی۔ عارف اور مذہبی اس میٹنگ میں شامل تھے۔ میں نے انہیں آخری ہدایت دی اور بتایا کہ آئندہ اتوار کو یہ مشن سرانجام دینے ہیں۔ میرے ساتھیوں کے پاس اپنا اسلحہ تھا۔ بشیر کی سیف سے لے اسلحہ میں سے میں نے تین ریوا اور اور گولیاں تینوں ٹولیوں کے اسمارٹ لڑکوں کو دیں اور کہا کہ اسلحہ کا استعمال صرف اسی صورت میں کیا جائے جب کوئی اور رستہ باقی نہ رہے اور مشن مکمل کرنے کے بعد اسلحہ میرے ساتھیوں کو واپس کر دیا جائے۔ عارف کے ذمے گاڑی کا انتظام کرنا اور ٹرانسمیشن پول تک چاروں کو لے جانے اور واپس لانے کی ڈیوٹی تھی۔ غرضیکہ تمام انتظامات اور ہدایات کو آخری بار دہرا کر ہم واپس چلے آئے۔ ساتھیوں کو گھر پر چھوڑ کر میں اپنے ہوٹل واپس آ گیا۔ میں نے ساتھیوں کو علیحدگی میں خبردار کر دیا تھا کہ ان کی ٹولی کا ایک لڑکا بھی غیر حاضر ہو تو مشن کو ملتوی کر دیں۔ بشیر کے قتل کے واقعے نے مجھے بے حد چوکنہ کر دیا تھا اور مجھے کسی پر بھی پورا اعتبار نہیں رہا تھا۔ اس مشن کی تمام تفصیلات پلاننگ میں بیان کر چکا ہوں۔ لہذا انہیں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اتوار کی صبح 7 بجے ہی میں ساتھیوں کے گھر پہنچ گیا۔ مذہبی، میں اور میرا نمبر ٹونڈیر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر مشن کے نتائج کا انتظار کرنے لگ گئے۔ سب سے پہلے آئی بی کے ہیڈ کوارٹر جانے والی ٹولی کا نگرہاں میرا ساتھی آیا۔ اس نے بتایا کہ سوئیزر کے ہمیں میں سے گاڑیوں تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور وہ درمیان والی گاڑی میں ہم رکھ کر بلا کسی کی نظر میں آئے وہاں سے نکل آیا۔ ریوا اور والے لڑکے نے ریوا اور اسے واپس کیا اور چاروں الگ الگ راستوں سے چلے گئے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد عارف میرے ساتھی کے ساتھ واپس آیا اور اپنی کامیابی کا مزہ نہ سٹیا۔ ہم چھٹنے کے وقت سے بہت پہلے ہی دونوں ٹولیاں اپنے نارگٹس سے بہت دور پہنچ چکی تھیں۔ اب ہمیں اخباروں کے ضمیمے چھپنے کے وقت تک انتظار کرنا تھا۔ اس ساتھی کو بھی لڑکے نے ریوا اور واپس کر دیا تھا۔ عارف نے بتایا کہ وہ ٹرانسمیشن پول کے سامنے تین روڈ پر گاڑی کا پوزٹ اٹھا کر ان کا انتظار کر رہا تھا۔ کسی نے بھی وہاں اس کی موجودگی کا نوٹس نہیں لیا۔ چاروں کارروائی مکمل کر کے ٹھیلنے ہوئے واپس آ گئے اور وہ گاڑی تیز بھاگ کر دہلی چلا آیا۔

مذہبی نے دوپہر کے کھانے کا انتظام اپنے ہاں کر رکھا تھا۔ میں نے کھانے کے بعد اپنے نمبر ٹونڈیر کو بھجوا کر جا کر اگر کوئی ضمیمہ چھپا ہوا لے آئے تھوڑی دیر میں ہی نمبر ٹونڈیر سے سرخ چہرے کے ساتھ فاختا نانداز میں واپس آیا۔ اس کے پاس انگریزی اور ہندی میں چھپے ضمیمے تھے۔ انگریزی ضمیمے میں آئی بی اور ٹرانسمیشن پول پر دھماکوں کی خبریں ملی سرخوں کے ساتھ چھپی ہوئی تھیں۔ مختصر ادارے میں انٹیلی جنس بیورو کے ہیڈ کوارٹر میں دھماکے سے 7 گاڑیوں کے مکمل تباہ ہونے اور باقی گاڑیوں کو نقصان پہنچنے کا احاطہ کرتے ہوئے اس ادارے کو بری طرح لٹا ڈال گیا تھا اور روز داخلہ سے استغنیٰ دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی اخبار میں ٹرانسمیشن پول پر پورے اسٹیشن کے مکمل طور پر تباہ ہونے اور دہلی ریڈیو اسٹیشن کے بند ہونے پر وزیر مواصلات سے بھی استغنیٰ کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ شام 5 بجے تک انگریزی کے 5 مختلف ضمیمے ہمارے پاس جمع ہو چکے تھے۔ اخبار والوں کو کیا معلوم تھا کہ ابھی تو صرف اتروں ہوا ہے اور باقی آدھا حصہ شام 6 بجے شروع ہوگا۔ ہم نے ایک دوسرے کو بھر پور مبارک باد دی۔ شام کو جانے والی ٹولی کا ساتھی آرام کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا ہم مذہبی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے وقفے وقفے سے چائے پیتے رہے۔ 5 بجے قبل ہی ہمارا ساتھی شام کے مشن کے لئے تیار ہو کر آ گیا اور ہم سے اجازت لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے نمبر ٹونڈیر نے مجھے پھر اس مشن پر جانے کی اجازت دینے کو کہا لیکن میں نے انکار کر دیا اور اسے کہا کہ غرضیکہ ہی ہم سب اس مشن کے متعلق تفصیلات طے کریں گے جس میں سب کو اپنی صلاحیت دکھانے کا بھر پور موقع ملے گا۔ اس مشن میں جی بھر کر اپنے ارمان پورے کر لیا۔

شام کو سات بجے پہلی ٹولی واپس آئی۔ مذہبی نے لڑکوں کو ہاں سے ہی واپس بھیج دیا۔ میرے ساتھی نے ایئر فورس ریکروٹمنٹ سینٹر کے ہال سے ملحقہ کمرے کی کھڑکی کا شیشہ کاٹنے اور بم پھینکنے کا بتایا۔ انہیں کسی مدافعت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ واپسی پر لڑکے نے ریوا اور اسے واپس کر دیا تھا۔ اب صرف آخری ٹولی کی کامیاب واپسی کے ہم سب منتظر تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہمارا ساتھی مسکراتا واپس لوٹا۔ اس ساتھی کا یہ آج کا دوسرا مشن تھا۔ اس نے بتایا کہ شیشہ کاٹنے کے بعد اسے علیحدہ کرتے وقت شیشہ نہ چپے گیا۔ اچھی وہ فوجی ٹونڈیر ہوئے شیشے کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ اسے کور دینے والے ایک لڑکے نے پیچھے سے آ کر اپنے چاقو سے اس کی گردن کاٹ دی۔ یہ سب کچھ آدھ ڈھکے سینڈ میں ہو گیا۔ میرے ساتھی نے بڑے آرام سے ہم کمرے میں کھڑکی کے قریب ہی پڑی کر سی پر رکھ دیا اور ہم سب واپس چلے آئے۔ شام ڈھلے دہلی ریڈیو اسٹیشن اپنی اشرفیاء ایئر ریلیے RELAY SYSTEM سے بحال کرنے میں کامیاب ہوا۔

دوسرے دن صبح کے اخبارات چاروں جگہوں پر تباہی کے حالات سے بھرے ہوئے تھے I.B. کے ہیڈ کوارٹر میں تباہ گاڑیوں اور ٹرانسمیشن لائن کے RELAY STATION کے منہدم کمرے اور تباہ مشینز کی تصویریں بھی تھیں۔ آرمی اور ایئر فورس ریکروٹمنٹ سینٹر کی تصویریں نہیں تھیں۔ اخبارات میں یہ لکھا تھا کہ ان دونوں عمارتوں میں بم کے دھماکے ہوئے اور دھماکوں والے کمرے تباہ ہو گئے۔ آرمی کے جوانوں نے دونوں عمارتوں کو گھیر رکھا تھا۔ گارڈ کے قتل ہو جانے کی خبر کو سرکاری طور پر دبا دیا گیا تھا لیکن جانے وقوع پر پہنچنے والے اخبارات کے رپورٹروں کو سوئیزر نے بتا دیا تھا کہ ایک گارڈ بھی ہلاک ہو گیا ہے۔

ہماری اس کامیابی نے جہاں ہمیں خوشیوں سے لاد دیا تھا وہاں پورے بھارت اور خصوصاً راجدھانی دہلی کے عوام میں خوف و ہراس اور عدم تحفظ کا بہت احساس پیدا ہو گیا۔ اخبارات کئی روز ان دھماکوں کی خبروں سے بھرے رہے۔ TRIBUNE نے تو اپنے ادارے میں یہاں تک لکھا تھا کہ اب ہمیں واقعی ضرورت ہے کہ آئی بی، آرمی اور ایئر فورس کی حفاظت کے لئے ایک علیحدہ فورس تیار کریں۔ پوزیشن پارٹیوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر کھر اس پارٹی پر بے طرح کچھ اچھالی۔ حتیٰ کہ لوگ سجا میں بھی اس واقعہ پر خاصا ہنگامہ ہوا۔ اخبارات نے ان دھماکوں کا ذمہ دار پاکستان، علیحدگی پسند سکھوں اور بعض نے کشمیر کے حریت پسندوں کو ٹھہرا لیا۔ ان دھماکوں سے چند روز قبل ہی تامل ناڈو (مدراں) کی صوبائی حکومت کو شکم کر کے صدر راج نافذ کیا گیا تھا۔ اخبارات نے اسے سابق تامل ناڈو حکومت کا انتقامی کارنامہ قرار دیا۔ ان دھماکوں کے بعد دہلی کو معمول پر آنے میں دس پندرہ روز لگ گئے۔ بھارتی ہندوؤں نے پاکستان کے اندرونی خلفشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے 71ء میں دولت کر دیا تھا لیکن اپنی فطری بزدلی کے باعث وہ ہر وقت پاکستان دشمنی سے خوف زدہ رہتے تھے کہ نہ جانے کب یہ بڑی شیر بدلیہ لینے کو اٹھ کھڑا ہو۔ یہ تو ہمارے اس وقت کے حکمرانوں کی بزدلی، بھارت نوازی اور پاکستان دشمنی تھی جو بدلہ نہ لے کر اور ہزار سال تک جنگ لڑنے کے دعوے کرنے والے کشمیر میں بینز فائر لائن کو کٹرول لائن قرار دینے کے پردے میں آزاد کشمیر میں بینز فائر لائن کے قریب فوجی لحاظ سے انتہائی اہم پہاڑیوں کو بھارتی تسلط میں دے آئے۔ یہاں تک کہ اس 'فیاضی' میں انہوں نے شاہراہ ریشم کی وہ پہاڑیاں بھی بھارت کو پیش کر دیں جن پر صرف ایک ہیوشین گن اور ایک مارٹر سے شاہراہ ریشم کو بھارت بند کر سکتا ہے۔

غازی

میں نے دیکھا کہ میرے ساتھیوں کی پڑمردگی اب بٹا شدت میں بدل گئی تھی۔ دراصل کسی مشن کو سرانجام دینے کی یہ پہلی مکمل ذمہ داری تھی جسے انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا۔ میں نے عارف کے ذریعے لڑکوں کو دو دو ہزار روپے بھجوائے اور انہیں آئندہ تیس روز تک بالکل مائل رہنے اور ایک دوسرے سے ملنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ اب DMI کے علاوہ IB ایگزٹورس اور آر آئی کے جاسوس یونٹ بھی حملہ آوروں کو ہر جگہ تلاش کر رہے تھے اپنے ساتھیوں کو بھی میں نے محتاط رہنے کا کہا۔ بھارتی انگریزی اور ہندی کے جتنے اخباروں میں ان دھماکوں کے متعلق خبریں چھپتی رہیں۔ وہ میں نے خرید لئے (ہندی اخبارات میں عارف کی بیٹی کے توسط سے ملے کیونکہ وہ اسکول میں ہندی پڑھتی تھی) میں نے یہ سب اخبار آئندہ ڈاک میں پاکستان بھیج دیئے۔ مجھے یقین تھا کہ ہمارے ادارے کے پاس بھی بھارتی جاسوسوں اور بارڈر انسپکٹروں کی ایک بڑی کھپ ہوگی جو ہندی اخبارات میں پڑھ کر سنائے گی۔

قریباً ایک ماہ بعد میں نے ساتھیوں اور لڑکوں کو پھرا کٹھا کیا اور کہا کہ ہمیں دہلی سے دو ایک بڑے مشن کو پورا کرنے جانا ہے اس لئے ڈیڑھ اور جسمانی طور پر خود کو تیار رکھیں۔ اپنے تین ساتھیوں کے علاوہ میں تین لڑکوں کو ہمراہ لے جاؤں گا۔ اس بار میرا مشن پیناٹن کی سرنگوں میں چھپنا اور بھارتی ہوائی اڈہ تھا۔

بھارت کے اس ہوائی اڈے کے متعلق ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ بھارت میں رہتے ہوئے پاکستان سے معلومات حاصل کرنے کی بات بڑی مشکل خیز تھی۔ ہمیں صرف یہ معلوم تھا کہ یہ ہوائی اڈہ پہاڑی علاقے میں بنایا گیا ہے اور نزدیک ترین شہر گورکھ پور ہے مزید معلومات کا حصول صرف گورکھ پور سے ہی ممکن تھا۔ دہلی میں دھماکوں سے جو سراہیمگی بھیلی تھی وہ آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی لیکن بھارتی سولین اور فوجی ایجنسیاں پورے طور پر حرکت میں آ چکی تھیں اور ہر طرف ان کے کارکن دھماکے کرنے والوں کی تلاش میں پھر رہے تھے۔ معمول کی ڈاک کے علاوہ ہم نے اپنی تمام سرگرمیاں معطل کر دی تھیں۔ ہمارے گروپ نے ہمیں دیئے گئے مشن کے علاوہ اپنے طور پر کئی مشن کامیابی سے پورے کئے تھے ہم نے تازہ ترین معلومات کے حصول کے لئے یثوت کو بل بنایا تھا شہر کی فرمائش پوری کرنے کے لئے وہ ہفتے میں دو بار باقاعدگی سے ہمیں ڈاک دے رہا تھا۔

جانناؤ لڑکوں کا ہم نے گروپ تیار کر لیا تھا جو انتہائی خطرناک کام کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتا تھا ہمارے سینئر ہماری کارکردگی سے بہت خوش تھے ایسے حالات میں جب تک ہمیں پاکستان سے کسی نئے مشن کے لئے ہدایات نہ ملتیں ہمارا UNACTIVE رہنا ہی بہتر تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جب تک گورکھ پور کے مشن میں کامیابی کا منفی منفی یقین نہ ہو جائے، اپنے سینئر کو کچھ نہ بتایا جائے کیونکہ اب تک کی مسلسل کامیابیوں میں ہم ناماکی کا داغ نہیں لگانا چاہتے تھے۔ ہماری 10 یوم کی چھٹی کو پہلے ہی منظور ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں نے سبھی 73 میں اپنے دو ساتھیوں اور تین لڑکوں کے ساتھ گورکھ پور جانے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران معمول کے واقعات کو میں نے طوالت کی وجہ سے قلم بند نہیں کیا۔ مختصر آئیں تقریباً ہر ہفتے کرل ٹنگر سے ملنے سرورسز مملکت جاتا رہا۔ آٹھ سے تین چار ملاقات ہوئی وہ بہت آزاد خیال عورت تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اب وہ اتنی DEPRESS ہو چکی ہے کہ بے چہرے سے چھٹکارے کے لئے وہ اسے زہر دے کر ہلاک کرنے پر بھی آمادہ ہے اس نے بے چہرے سے اپنی حق میں وصیت لکھوانے کے لئے اس سے ازدواجی تعلقات میں بہت بہتری پیدا کر لی ہے۔ بے چہرے سے سو تیلی اولاد سے تحفظ دینے کے لئے جلد ہی اس کے نام نہایت مقبول رقم اور جائیداد منغل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو بھی یہ کام ہو جائے گا میں بے چہرے کو سوگ میں بھیج دوں گی۔ دولت اور جائیداد کے عوض میں اپنی زندگی کی خوشیوں کا اس بوڑھے سوسٹ کے مرنے تک گمان نہیں گھونٹ سکتی۔ یہ آٹھ کے الفاظ تھے جو اس نے ایک ملاقات کے دوران کہے۔ یثوت نے اس دوران اپنے معاوضے میں اضافہ کرنے کا کہا۔ میں نے نرمی سے انکار کر دیا کہ جب تک کوئی نیا JACK POT نہیں ملے اسے مزید رقم کی توقع نہیں کرنی چاہئے اور اگر اس نے ڈاک دینے یا ہم خطوط کو ہمیں دینے سے انکار کیا تو اس کا انجام بھی اسے یاد دہانا چاہئے۔

ہمارے سب کام معمول کے مطابق نہایت خوش اسلوبی سے ہو رہے تھے۔ مکی کے دوسرے ہفتے میں، میں اپنے دو ساتھیوں اور تین لڑکوں کے ساتھ گورکھ پور کے لئے روانہ ہو گیا۔ گورکھ پور میں میرے ساتھیوں اور لڑکوں نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرے لئے۔ میں سول انٹرن کے قریب ایک نسبتاً بہتر ہوٹل میں ٹھہرا۔ میں نے ساتھیوں کو ہدایت کر دی کہ لڑکوں کو اپنی نگاہ میں رکھیں اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے ہماری آمد مشکوک ہو جائے کیونکہ گورکھ پور دہلی کی نسبت بہت چھوٹا شہر ہے اور مشکوک حرکات بہت جلد نظر میں آسکتی ہیں۔

اگلے روز میں ساتھیوں کے ہوٹل گیا اور ایک ساتھی ایک لڑکے کی دونوں یاں بنائیں اور ایک لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر شہر کے سروے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ اگر ضرورت پیش آئے تو لڑکوں کو بولنے دیں اور خود خاموش رہیں لڑکوں کا لب و لہجہ دہلی والوں کا تھا اور میرے ساتھی پنجابی لہجے میں اردو بولتے تھے دہلی میں تو سب چل جاتا تھا لیکن یہاں صورتحال مختلف تھی۔ گورکھ پور اترا پردیش میں ہماری کے دامن میں پہاڑیوں کے سلسلے میں واقع ہے۔ یہ شہر نیپال کی سرحد کے قریب ہے اور ریلوے جنکشن کے علاوہ یہاں بھارتی جھاڑی بھی ہے ہم شہر بھر میں سارا دن گھومے۔ درمیانے درجے کا شہر ہے۔ ہمیں شہر میں ایگزٹورس کی وردی پہننے کوئی بندہ دکھائی نہ دیا۔ دوسرے روز بھی سارا دن شہر میں مارے مارے پھرنے کے باوجود ہمیں کوئی ایسا سراغ نہ ملا جس سے ہوائی اڈے کی موجودگی کی تصدیق ہو سکتی۔ کسی انجام سے ہوائی اڈے کے متعلق پوچھنا انتہائی خطرناک تھا۔ مجھے مجرا حسن کے مسلمان ہیٹ مین پر پھر سوہ کرنے کا انجام یاد تھا اس لئے ہمیں خود ہی اس تلاش کو جاری رکھنا تھا۔ تیسرے دن میں لڑکے کے ہمراہ شہر سے باہر ایک سڑک پر جا رہا تھا کہ مجھے ایک پیٹرول ٹینگر دکھائی دیا۔ جس کی رفتار سے معلوم ہوتا تھا کہ خالی ہے۔ میں نے رکشوالے کو اسی سڑک پر جانے کو کہا۔ دو تین سو گز رنے کے بعد مجھے پیٹرول کے ٹینک دکھائی دیئے۔ رکشوالے نے پوچھنے پر بتایا کہ شہر کے پیٹرول کمپنوں کو یہاں سے ہی پیٹرول پلائی ہوتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب بھی دو ٹینک ہیں لیکن وہاں کا پیٹرول صرف فوج کے لئے ہے میرے لئے یہ معلومات دلچسپ تھیں۔ میں نے رکشوالے کو وہاں شہر چلنے کا کہا۔ شہر میں رکشہ چھوڑ کر ہم نے ایک دوسرا رکشالیا اور ساتھیوں کے ہوٹل چلے گئے شام کو میں نے سب کو اکٹھا کیا اور کہا کہ کل وہ ریلوے اسٹیشن کے قریب آئل ٹینکس تلاش کریں اور سارا دن ٹینک کو جانے والی سڑک پر آئل ٹینکروں کے نمبر اور رنگ نوٹ کریں اور خصوصی طور پر ان ٹینکروں پر دھیان دیں جن پر HIGHLY INFLAMMABLE کے ساتھ 100 P.C.OCTANE لکھا ہو۔ کیونکہ لڑکا اور ہمارا سہارا ان تمام جہازوں میں انتہائی صاف اور بغیر ملاوٹ کے پیٹرول استعمال ہوتا ہے میرے ساتھیوں نے دو دن کی تک دو دو کے بعد اس ٹینکر کا سراغ لگایا جو خالی رنگ پر یکونفلاج کئے ہوئے تھا۔ میرے ساتھیوں نے اسے پیٹرول لے کر جانے والی سڑک پر پانچ چھ کلومیٹر تک جا کر وہ جگہ بھی نوٹ کر لی جہاں پر اس سڑک سے مختلف اطراف کو جانے والی سڑکوں کے کٹ ختم ہو جاتے تھے وہ سڑک گورکھ پور سے شمال مغرب کی طرف جاتی تھی۔ دوسرے روز میں اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اس سڑک پر خاصی دور تک گیا میں نے دیکھا کہ اس سڑک سے اطراف کو جانے والی سڑکیں چھوٹی اور ٹوٹی چھوٹی تھیں جبکہ یہ مین سڑک جو آگے جاتی تھی شروع سے ہی بڑی اور بغیر پچکلوں کے ٹوٹ پھوٹ کے بغیر نہایت مضبوط بنی ہوئی تھی۔ اس سڑک پر کوئی ٹریک دکھائی نہیں دی۔ سو فیصد صاف تیل لے جانے والے ٹینکر ٹوٹی چھوٹی سڑکوں پر نہیں جاتے کیونکہ پچکلوں سے یہ تیل خود بخود دھڑک اٹھتا ہے مجھے پختہ یقین ہو گیا تھا کہ یہی سڑک ہوائی اڈے تک جاتی ہے اور یہ ہوائی اڈہ گورکھ پور کی حدود سے خاصی دور بنا ہوگا۔

گورکھ پور میں مزید دو دن رہنے سے ہمیں مزید یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ اس سڑک پر آگے جا کر ایک چیک پوسٹ آتی ہے جب تک وہاں سے CLEARANCE نہ ملے آگے کوئی نہیں جاسکتا۔ اس چیک پوسٹ کے بعد رہائش علاقہ ہے وہاں پر ہوائی اڈے سے متعلقہ عملے کے رہائشی کوارٹرز ہیں ان کوارٹرز کے بعد آئیڈیئر ز کی رہائش کالونی ہے اس کے بعد ایک اور چیک پوسٹ ہے جہاں پر دو آئیڈیئر زمینیں ہیں جن میں پائلٹ اور سٹینڈنگ سٹریٹ آئیڈیئر رہتے ہیں آئیڈیئر میں کے بعد سڑک ایک پہاڑی کے گرد گھوم جاتی ہے ہمیں یہ معلومات بڑے کھوج کے بعد ایک ادھیڑ عمر ڈرائیور سے ملیں جو کالونی کی تعمیر کے دوران ایک انجینئر کو کالونی کے تعمیراتی حصے تک لے جاتا تھا۔ اس نے ہمیں یہ معلومات ایک شراب خانے کے باہر ٹیکسی اسٹینڈ پر دیں جب میں اور میرا ساتھی اسے اس سڑک پر لے جانے کے لئے بک کرنا چاہتے تھے۔ اس نے بتایا کہ پہلی چیک پوسٹ سے آگے رہائشی کالونی میں جانے کے لئے جس کو ملنا ہو اس کی ٹیلی فون پر اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس ڈرائیور نے کہا "بچو اب آپ نے جن صاحب کو ملنا ہے ان کو ٹیلی فون کر کے کہہ دیں کہ وہ آپ کے نام پر انام اور ٹیکسی نمبر چیک پوسٹ پر لکھو ایں۔ تب ہی میں آپ کو وہاں تک لے جاسکتا ہوں" ڈرائیور کی باتیں سن کر ہم مایوس ہو گئے ظاہر ایسی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی کہ ہم کالونی یا آئیڈیئر زمینیں تک ہی پہنچ سکتے۔ اس کے آگے جانے کا تو سوال ہی پیدا ہوتا تھا۔ میں نے اس شام ساتھیوں کو اس صورت حال سے آگاہ کیا اور دوسرے روز ہم مایوس دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔

واپسی کے سفر کے دوران اور پہلی پہنچ کر بھی میں کئی ہفتے تک ہوائی اڈے تک پہنچنے کی کسی بھی امکانی صورت پر غور کرتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان رکاوٹوں کو کیونکر عبور کیا جائے۔ ڈرائیور نے بھی چند برس پہلے کے حالات بیان کئے تھے جبکہ وہ ہوائی اڈہ مکمل طور پر OPERATIONAL تھا تو کیا سیکورٹی کے وہی پہلے والے انتظامات تھے یا نئے رائج کئے گئے تھے ان کے متعلق ہمیں کچھ علم نہ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ مشن میرے ذہن سے دھندلاتا گیا اور آخر کار MISSION IMPOSSIBLE سمجھ کر ہم نے اسے بھلا دیا۔

دہلی میں ہماری معمول کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ معمول کے مطابق ڈاک کی آمد و رفت جاری تھی۔ میرے ساتھی ہفتے میں دو بار لڑکوں کی تربیت کے لئے بشیر کی گیج میں جاتے تھے۔ میں تقریباً ہر ہفتے کرل ٹنگر سے ملتا تھا۔ اسی دوران 73ء کا موسم سرما شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ ہم نے نئے سال کا استقبال دھماکے کرنے کے بجائے ہٹلوں کی محفلوں میں شمولیت سے کیا۔ 74ء کی 28 جنوری کی پڑھ بھی ہم نے خاموشی سے دیکھی اور پڑھ میں شامل اسلحہ اور ہتھیاروں کی تصویریں اتار کر پاکستان بھیج دیں۔ میں قارئین کو ایک وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ہماری یہ آٹھ نو ماہ کی خاموشی غیر معمولی نہیں تھی۔ بھارت میں قیام کے دوران اگر ہر روز ایک مشن پورا کرنے کا کوئی دعویٰ کرے تو وہ محض افسانہ اور من گھڑت قصہ ہوگا۔ بھارت میں ہمارے قیام کا ایک دن ہمارے مشن کی کامیابی تھی۔ جس طرح پاکستان کے غیر ملکیوں میں سفارت خانے صرف پاکستان کے مفاد کیلئے قائم کئے گئے ہیں۔ وہ سفارت خانے چاہے کوئی عملی کارکردگی نہ دکھائیں لیکن صرف پاکستان کی نمائندگی کیلئے بیسیوں افراد کے عملے پر کروڑوں ڈالر سالانہ خرچ کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم بھارت میں اپنے محکمے کے نمائندے تھے جو ان کے احکام کی بجا آوری پر ہمہ وقت تیار تھے۔ ہم نے حساس معلومات کے حصول کے پل بنا دیئے تھے۔ تمام دیئے گئے مشنوں کو کامیابی سے پورا کیا تھا۔ جانٹا لڑکوں کی ایک ٹیم جن کے ذریعے نہ دیئے گئے مشن بھی کامیابی سے پورے کئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہمارے سینئر بھارت میں ہمارے قیام کو طول دے رہے تھے۔ مجھے ایک خفیہ خط میں یہاں تک کہا گیا تھا کہ میرے سمیت میرے ساتھیوں میں سے اگر کوئی بھارت میں شادی کرنا چاہتا ہے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا اور پاکستان واپسی پر ان کی بیویوں کو پاکستانی شہریت بھی دلا دی جائے گی۔

بشیر کی گیج کولڑکوں نے بڑی اچھی طرح سنبھالا تھا۔ میں ہفتے میں ایک روز گیج جاتا تھا اور لڑکوں سے ان کی تربیت کے علاوہ دوسرے مشاغل کے بارے میں بھی بات چیت کرتا تھا۔ یہ روزی 74ء کے وسط کا ذکر ہے۔ میں بشیر کی گیج میں بیٹھا تھا۔ ایک ٹرک مرمت کے لئے گیج میں کھڑا تھا، میرے پوچھنے پر ملینک لڑکے نے بتایا کہ چلتے ہوئے اس کا کریک شافٹ آواز دیتا ہے۔ شاگرد نے اس کے پیچھے جیک لگا کر اسے اٹھانا چاہا تو جیک آدھ میں ہی جواب دے گیا۔ میرے پوچھنے پر کہا کہ کب کیا کرو گے۔ ملینک لڑکے نے کہا کہ میں نے چوڑی پلیٹس، بخاریں ہیں اور ٹرک کے نیچے وہ پلیٹس کوالا کی شکل میں لٹکانے پلیٹس پر لیٹ کر ٹرک کو سڑک پر چلوانے کا اور چلتے ٹرک کی کریک شافٹ کو کچھ کر نقص کا پتہ چلائے گا۔ میرے سامنے ہی اس نے 6 انچ چوڑی تین پلیٹس ٹرک کے نیچے کھیں۔ ایک پلیٹ نے اس کی گردن، دوسری نے کمر کے نیچے حصے اور تیسری نے اس کے پاؤں کو اٹھا رکھا تھا۔ لڑکے نے پلیٹس پر لیٹنے کے بعد ڈرائیور کو ٹرک چلانے کا کہا۔ ٹرک چلنے سے کریک شافٹ بھی گھومنے لگی۔ 15 منٹ کے اندر ٹرک واپس آ گیا۔

ملینک نے نقص کا پتہ چلا دیا تھا۔ آدھ گھنٹے میں اس نے نقص دور کر دیا اور ٹرک والا اسے 250 روپے دے کر چلا گیا۔ ملینک لڑکے نے پلیٹس کے اوپر لیٹ کر ٹرک چلوانا تھا اور ایک کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ اسی صورت میں طے کیا تھا اور اسے خرش تک نہ آتی تھی۔ میرے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکہ ہوا۔ مجھے گورکھ پور کے ہوائی اڈے کے اندر اپہرین تک پہنچنے کی ترکیب دھندلی ہی دکھائی دے رہی تھی اور مجھے محسوس ہوا رہا تھا کہ اگر ان پلیٹس کی خامیوں کو دور کر کے انہیں UP GRADE کیا جائے اور حتمی اقدام کے کماں تو آئل ٹینکرز کے نیچے لیٹ کر سرنگ کے اندر کھڑے جہازوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو پلیٹس کے متعلق بتایا اور کہا کہ اگر مضبوط پلیٹس اور انہیں ٹرک کے نیچے حصے میں منت کرنے کے محفوظ طریقے کا پتا چل جائے تو آئل ٹینکروں کے اسٹیشن کے قریب آئل ٹینکس سے پیٹرول لینے کے دوران یا سڑک پر مرمت کرنے والے کے بھیس میں ٹینکر کو تھوڑی دیر کیلئے روک کر یہ پلیٹس منت کرنے کے ہوائی اڈے کی سرنگ کے اندر تک پہنچا جاسکتا ہے۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ اچھی تک یہ تجویز جنھن ایک دھندلا سا خاکہ ہے جب تک مکمل طور پر اس کے خدا خال واضح نہ ہو جائیں اور جب تک ہم اسے O.K اور اس کے قابل عمل ہونے کا اطمینان نہ کر لیں اس کا کسی سے بھی ذکر نہ کریں۔

بھارت میں 90 فیصد بھارت میں ہی تیار شدہ مرسیڈیز ٹرک اور بسیں چلتی ہیں۔ جن کے ماڈل معمولی ترمیم کے ساتھ تین چار سال کے بعد مارکیٹ میں آتے ہیں۔ میں نے ایک ساتھی کو ایک لڑکے کے ساتھ پھر گورکھ پور بھیجا تاکہ معلوم کریں کہ آئل ٹینکر کس ماڈل کے اور کتنے پیٹروں والے ہیں۔ چند روز کے بعد وہ واپس آئے اور بتایا کہ مرسیڈیز ماڈل کے 10 پیٹروں والے ٹینکر ہیں۔ ان معلومات کی روشنی میں، میں نے گیج کے ملینک کو کہا کہ وہ وہاں ہی ٹینکر تلاش کرے اور اس کے نیچے گھس کر پلیٹس کو منت کرنے کی جگہ تلاش کرے۔ ابھی ملینک لڑکا ایسے ٹینکر کی تلاش میں تھا کہ میرا نمبر ٹو دہلی میں مرسیڈیز کے شوروم سے مختلف ساز کے مرسیڈیز لڑکوں کے چیئرمین کے بروشر لے آیا۔ ان بروشر میں 10 پیٹروں والے ٹرک کے چیئرمین کی تصویریں بھی تھیں۔ ملینک لڑکے نے بتایا کہ کمپنی والے صرف چیئرمین ہی فروخت کرتے ہیں اور ان چیئرمین پر سن، ٹرک یا ٹینکر کی ہاڈی مالک کو اپنی خواہش کے مطابق خود بخواتی پڑتی ہے۔ کمپنی سے مکمل تیار ہاڈی سمیت ایسی گاڑیاں بھی ملتی ہیں جن کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ہاڈی چاہے کمپنی کی ہاڈی پر ایسی ٹیٹور پر بخواتی جائے۔ چیئرمین کا اندرونی حصہ ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا کہ ایگزٹورس والے کمپنی سے مکمل تیار شدہ ٹینکر ہی خریدتے ہوں گے۔ ملینک لڑکے نے اس دوران ایک دن وہ ٹینکر کے نیچے گھس کر پلیٹس لگانے کے ضروری پوائنٹس نوٹ کر لئے۔ ٹینکر کی ہاڈی اور چیئرمین کے درمیان اسٹیشن کی مختلف کٹروں میں منتظم ایک چادر لگی ہوتی ہے۔ اس چادر میں مختلف جگہوں پر سوراخ ہوتے ہیں۔ ملینک لڑکے نے کہا کہ وہ نشین پر ایسے راڈ تیار کر سکتا ہے جو سوراخ میں داخل ہو کر دو اطراف میں عمل چلائیں اور چادر کو مضبوطی سے پکڑ لیں۔ ان راڈوں کے نیچے حصے میں بیک لگانے کیلئے مضبوط گول دائرے ہوں جن میں پلیٹس کے بک با آسانی ڈالے جاسکیں۔ اس لڑکے نے کاغذ پر اس کا بنا کر مجھے راڈ ز کی دوران استعمال صورت سمجھائی۔ میں اس کی تجویز سے کافی مطمئن ہو گیا اور اسے کہا کہ وہ 12 عدد راڈ بہترین اسمٹل کے بنائے اور یہ راڈ ذہن میں یہ رکھ کر بنائے کہ ان کے استعمال کے دوران ان کو 120 کلو وزن تک برداشت کرنا ہوگا۔ میں نے 120 کلو وزن اس لئے کہا تھا کہ ٹینکر کے چلنے کے دوران جھکوں سے پلیٹس پر لیٹنے والے کے وزن کا باؤ ڈالنا بھی ہو سکتا تھا۔ ملینک لڑکے کو میں نے راڈ بنانے کا کہا اور ساتھ ہی ساتھ عارف کو مارکیٹ میں مہیا پرانے پیرا شوٹس کی پلیٹس اور بک خریدنے کا کہا۔ عارف دونوں چیزیں لے آیا۔ پلیٹس کی چوڑائی صرف 3 انچ تھی میں نے عارف کو کہا کہ ان پلیٹس کو ایک دوسرے کے ساتھ نہایت مضبوط دھماگے سے اس طرح سیاجا جائے کہ ڈھائی ڈھائی میٹر لمبی ایک بارہ انچ چوڑی اور دو انچ چوڑی پلیٹس تیار ہو جائیں۔ یہ کام عارف نے اپنی ٹیم اور میڈیر کی بچیوں کے سپرد کیا۔

غازی

انہوں نے رضائی سینے والی سویوں سے تین تین سلامیاں کر کے میرے مطلوبہ سائز کی تین بیٹلس تیار کر دیں۔ میرا ذہن مکمل طور پر اس منصوبے کی جزئیات میں کوئی کسر نہ چھوڑنے میں مصروف تھا۔ ان بیٹلس پر لیٹ کر لمبے سفر کے دوران جھکوں سے گریز کرنے کا امکان تھا۔ لہذا میں نے ایک فٹ چوڑی بیٹ کے اوپر مسافر جہازوں کی سیٹھی بیٹ کی طرز کی حسب ضرورت چھوٹی بڑی ہونے والی بیٹ لگوانے کا فیصلہ کیا۔ عارف نے کباڑیوں سے یہ بیٹ بھی خریدی اور لڑکیوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اس بیٹ کو بڑی بیٹ پر سی دیا۔ مکینک لڑکے نے اس دوران چند راڈ تیار کئے تھے جو سوراخ میں ڈالنے کے بعد راڈ کے نچلے حصے میں بنے ایک اوپر نیچے حرکت کرنے والے سوچ کو اوپر کرنے سے دو حصوں میں تقسیم ہو کر اسٹیل کی چادر سے چپک جاتے تھے اور سوچ کو نیچے کرنے سے اپنی پہلے والی پوزیشن میں آجاتے تھے ان راڈوں پر سیٹھی لاک بھی لگائے گئے تھے کہ جھکوں سے راڈ خود بخود بند ہو کر نیچے نہ گرجائے۔ اب ہمیں پھر دس ویلر ٹرک کی تلاش تھی جس کی چلی پیٹ کے سوراخوں کے فاصلے کو دیکھ کر بیٹلس کو ایسے کاٹنا جانا تھا۔ تاکہ تینوں بیٹلس لینے والے کو ایک سیدھ میں سنبھال سکیں۔ چند روز میں مکینک لڑکے نے ہماری یہ مشکل بھی حل کر دی اور ٹینکر کی پیٹ کا اسٹچ بنا کر ان سوراخوں پر نشان لگا دیئے جن میں راڈ داخل کرنے تھے اور بیٹلس کو مطلوبہ سائز کے مطابق کاٹ دیا۔ میں نے عارف کے ذریعے کئے ہوئے سائز کے مطابق بیٹلس کا ایک اور سیٹ بنوایا۔ اس دوران مکینک لڑکے نے 12 عدد راڈ تیار کر کے میرے حوالے کر دیئے۔

میں نے مکینک لڑکے کو کہا کہ اگر ممکن ہو تو ہم ان راڈز اور بیٹلس کی عملی ٹرائی بھی لے لیں۔ چند روز میں لڑکے نے عارف کو پیغام بھیجا کہ گریج میں ویبا ہی ٹینکر آگیا ہے آپ رات کو ٹرائی لے لیں۔ میں شام گہری ہونے کے بعد اپنے نمبر نوے کے ساتھ گریج میں پہنچا۔ مکینک لڑکا اور میرا نمبر نوے دونوں ٹینکر کے نیچے گھس گئے۔ میری نظر گھڑی پر تھی۔ ابھی دو منٹ بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ مکینک لڑکا ہرا گیا اور مجھے ٹینکر میں ساتھ بیٹھنے کا کہہ کر خود اسٹیرنگ سنبھال لیا اور ٹینکر کو گریج سے نکال کر سڑک پر لے آیا۔ ٹینکر کی رفتار ستر کلومیٹر فی گھنٹہ تک بڑھا کر جانے آنے میں کل 10 کلومیٹر فاصلہ طے کر کے واپس گریج میں آگیا۔ ٹینکر کے کھڑے ہونے کے بعد ایک منٹ میں میرا نمبر نوے ٹینکر کے نیچے سے نکل آیا اور کہا کہ نہایت محفوظ طریقہ ہے اور سیٹھی بیٹلس نے تو گرنے کے امکان کو بھی یکسر ختم کر دیا۔ ہم خوشی خوشی ساتھیوں کے گھر پہنچے اور اب تک اس مشن کیلئے اپنی کی ہوئی کاوشوں کی کامیابی کا اپنے ساتھیوں اور عارف اور رزیر کو بتایا عارف اور رزیر کے جانے کے بعد میرے نمبر نوے میرے گھٹے پڑنے اور کہا "آج تک میں نے آپ کے ہر حکم کی بلاچوں جوں اسی تعین کی ہے لیکن اب اگر آپ نے مجھے اس مشن پر جانے سے روکا تو میں پاکستان واپس جانے کو ترجیح دوں گا۔ آپ نے پہلے مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا۔ میں بجلی کا ٹیکیشن بھی ہوں اور رزیر اسمیر تک ٹھیک کر لیتا ہوں۔ ہم کا ٹانگ سیٹ کرنے اور اسے بینڈیج (BANDAGE) ٹیپ سے ٹرک کے نیچے فٹ کرنا آپ سے بہتر جانتا ہوں۔ میں نے یہاں قیام کے دوران (ایک ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ٹرانسمیٹر چلانے اور CODE کو DECODE وغیرہ سب تفصیل سے سکھا دیا ہے۔ میری غیر موجودگی میں یہ سب کام بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ اگر میں مشن میں شہید ہو گیا تو آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری شہادت مشن کو مکمل کرنے کے بعد ہی ہوگی۔ میں سفر کے دوران ہی ہم کو ٹرک سے چپاں کر دوں گا اور سرنگ میں بیٹھنے کے بعد ہی مختصر وقفے کا ٹانگ سیٹ کر دوں گا تاکہ ہم یقینی طور پر سرنگ میں ہی پھنسے۔ اس مشن کیلئے میں سو زون ترین شخص ہوں۔ مجھے نہ ہنچ کر آپ مجھ سے نا انصافی کریں گے اور اللہ کے سامنے میں آپ کا دامن پکڑوں گا۔

میں اپنے نمبر نوے کی وطن سے محبت، جذبہ حریت اور شوق شہادت کے اس شدت سے اظہار کو سن کر حیران رہ گیا۔ ہم پانچوں اپنے وطن کی محبت اور بھارت کے سقوط ڈھاکہ کی صورت میں لگائے زخموں پر مرہم لگانے آئے تھے اور اپنی بساط سے کہیں زیادہ ہم نے اپنے اس ازلی دشمن کو نقصان پہنچایا تھا۔ میں نے اب تک کامیابی سے انجام دیئے کسی بھی مشن کا کریڈٹ صرف خود کو نہیں دیا تھا بلکہ اسے اپنے گروپ کی اجتماعی کوششوں کا شکر ٹھہرایا تھا۔ ہم نے کوئی بھی مشن ساتھ سے ستر فیصد کامیابی کے یقین کے بغیر شروع نہیں کیا تھا اور اب میرا نمبر نوے اس مشن کو ایسا انجام دینے کی ضد کر رہا تھا جس میں کامیابی کا یقین بے شک فغنی فغنی تھا لیکن سچ نکلنے کا امکان بیس فیصد سے بھی کم تھا میں نے اسے اس مشن کے تمام خطرناک پہلوؤں سے آگاہ کیا لیکن اس نے ایک نہ سنی اور بالآخر مجھے اس کی ضد کے آگے تھکنا پڑا۔ میں چاہتا تھا کہ 23 مارچ کو یوم پاکستان کی خوشی کے موقع سے پہلے اس مشن کی کامیابی کا تھکا اہل وطن کو پیش کر دیا جائے میں نے اپنے نمبر نوے کو (جسے آئندہ میں حبیب کے نام سے مخاطب کروں گا) کہا کہ اس مشن کی اہمیت کے پیش نظر اسے فوری طور پر بیٹلس پر لینے کی پریکٹس شروع کر دینی چاہئے میں نے اسے بیٹلس کا ایک سیٹ دیا جسے اس نے چھت کے بالوں میں کندھے کا ڈکڑک کی چلی ٹیٹ والی پوزیشن میں لٹکا دیا۔ وہ ہر روز دو مرتبہ ان بیٹلس پر لیٹ کر ساتھیوں کو کہتا کہ اسے دائیں بائیں اور آگے پیچھے جھلائیں تاکہ چلتے آگے ٹینکر والی پوزیشن بن جائے۔ حبیب کو مشن پر جانے کی اجازت دینے کے دو روز بعد میں گریج میں گیا تو مکینک لڑکے نے (جسے آئندہ میں حبیب کہوں گا) مجھ سے پوچھا کہ ہمیں مشن پر کب جانا ہے۔ میں حیران تھا کہ ساتھیوں کے علاوہ میں نے مشن پر جانے کے متعلق کسی کو نہیں بتایا جو لڑکے کو گھپور گئے تھے انہیں بھی مشن کے ناقابل عمل ہونے کا کہہ دیا تھا اور اب قیصر کا مجھ سے پوچھنا کہ "ہمیں مشن پر کب جانا ہے" میرے لئے باعث حیرت تھا۔ میں نے قیصر کو ذرا کرید اتوا اس نے بلا جھجک کہا کہ اسے ہماری تیاری اور راڈ بنوانے سے پورا یقین ہو چکا ہے کہ ہم نے مشن پر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے اسے لڑکوں کے ذریعے گھپور میں آگے ٹینکروں کی نگرانی کا بھی علم ہو چکا تھا۔ "چاہے آپ کے مشن کے متعلق مجھے ابھی تک پوری معلومات نہیں ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا مشن گھپور سے تعلق رکھتا ہے اور اسے ٹرک یا آگے ٹینکروں کے نیچے بیٹلس پر لیٹ کر انجام دینا ہے۔ بیٹلس پر لینے کے دوران کام کرنے کا مجھے تجربہ ہے راڈز کو چادر کے سوراخوں میں کم از کم وقت میں ڈالنے، سیٹ کرنے اور بیٹلس کو ان میں فٹ کرنے کا ڈھکی کرنا ہوں، ریو اور چلانے اور چاقو کے استعمال کا میں ماہر ہوں، اس لئے اس مشن پر جانے کے لئے میں خود کو زون ترین سمجھتا ہوں، لہذا اس مشن پر جانے کا موقع مجھے دیں۔" قیصر کو میں نے بتایا کہ میں پہلے ہی اپنے ساتھیوں میں سے ایک کا انتخاب کر چکا ہوں تو قیصر نے کہا کہ ایک کے بجائے اگر دو کو مشن پر بھیجا جائے تو کامیابی کا دہرا یقین ہو سکتا ہے۔ قیصر کی ان باتوں نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس نے بالکل درست کہا تھا کہ دو کے مشن پر جانے سے کامیابی کے امکانات بہت بڑھ جاتے تھے۔ ایک سے اگر غیر ارادی طور پر کوئی غلطی ہو جاتی تو دوسرا اسے COVER کر سکتا تھا۔ پھر واپسی کے دوران یقینی مزامتوں کا مقابلہ کرنے کے بجائے دونوں ایک دوسرے کی مدد کر سکتے تھے۔ یہ مشن ایسا تھا جس کیلئے صرف ایک باہری RISK یا جاسکتا تھا دوسری بار جانے کی کوئی گنجائش ہرگز تھی۔ نفسیاتی طور پر بھی ایسا فیصلہ مشن کے دوران کسی مرحلے میں بھی ایسا ہونے کے باعث حواس کھو سکتا تھا جبکہ دو ہونے کی صورت میں تنہا ہونے کا احساس ختم ہو جاتا تھا میں نے ان سب پہلوؤں پر غور کرنے اور قیصر کی اس مشن پر جانے کی خواہش اور اس کی اہمیت کے پیش نظر یہ طے کیا کہ دونوں کو مشن پر بھیجا جائے۔ میں نے قیصر کو پیش آنے والے خطرات سے پوری طرح آگاہ کیا کہ اگر یہ اس کی SKIN DEEP خواہش ہے تو وہ ختم ہو جائے لیکن اس نے اپنے دلائل سے مجھے لا جواب کر دیا اور میں نے قیصر کو اس مشن میں شامل ہونے کی اجازت دے دی اور اب تک ہوائی اڈے کے متعلق مجھے جو معلومات حاصل ہو چکی تھیں ان کی روشنی میں اسے بریف کیا اور فوری طور پر بیٹلس پر لینے کی پریکٹس شروع کرنے کا کہا اور دوسرے دن قیصر کو بیٹلس کا دوسرا سیٹ بھیجوایا۔

میں نے اس مشن پر حبیب (نمبر نوے) کے علاوہ اپنے ایک ساتھی اور قیصر سمیت چار لڑکوں کو ہمراہ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا اس دوران پاکستان بھیجی جانے والی ڈاک میں، میں نے لکھ بھیجا کہ ہم لوگ ایک مشن کا جائزہ لینے اور اگر ممکن ہو تو اسے جائزہ لینے کے دوران ہی پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔ حبیب اور ایک ساتھی بھی میرے ہمراہ جارہے ہیں۔ ڈاک کی وصولی اور بھیجنے کا میرے باقی دو ساتھیوں کو علم نہیں اور نہ ہی کوئٹہ سے ان کی چہرہ آشنائی ہے لہذا ہماری واپسی تک ڈاک کے سلسلے کو معطل کیا جائے۔ واپسی پر ٹرانسمیٹر کے ذریعے کسی بدھ یا اتوار کو 10 بجے اوکے کا سگنل دیں گے۔ اس سگنل کے بعد معمول کے دنوں اور اوقات میں ڈاک کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا جائے میں اب تک کئے گئے مشنوں میں اس بار سب سے بڑا گروہ ہمراہ لے جا رہا تھا کیونکہ ابھی تک مشن کے دوران درپیش مختلف مراحل سے ہم لاعلم تھے اور میں چاہتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر میں عددی کمی کا شکار نہ ہو جاؤں۔ سب تیاریاں مکمل کر کے ہم 6 مارچ 74 کو گورکھپور کے لئے روانہ ہوئے۔ ہمارے پاس ذاتی اور ضروری سامان کے علاوہ 6 ٹانگ، 8 حمل اور ٹینکروں کو لیا گیا تھیں۔ گورکھپور پہنچ کر میں نے ایک ساتھی اور لڑکوں کو ایک دن کے مختلف اوقات میں ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرایا۔ حبیب اور قیصر نے میرے ہمراہ میرے ہوٹل میں کمرے لئے۔ دوسرے دن صبح سے ہی ہم نے بیٹروں ٹینکس کی نگرانی شروع کر دی تاکہ ایئر فوس کے آگے ٹینکروں کا کھوج مل سکے۔ مجھے اب تک حاصل شدہ معلومات سے اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ آگے ٹینکروں سے ڈائریکٹ جہازوں میں بیٹروں نہیں ڈالا جاتا اور سرنگ میں یقیناً ایئر فوس کے اپنے ٹینک بنے ہوں گے جن میں آگے ٹینکروں کا بیٹروں ذریعہ کیا جاتا ہوگا اور ان ٹینکوں سے جہازوں کو بیٹروں چلائی ہوتا ہوگا۔ آگے ٹینکر اپنا نوڈ ایئر فوس کے ٹینکوں میں منتقل کر کے اپنی پارکنگ میں واپس آجاتے ہوں گے۔ تین چار روز کی نگرانی کے بعد ہمیں ایئر فوس کا آگے ٹینکر دکھائی دیا۔ بیٹروں بھرنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ صرف ہوا، ٹینکر میں ڈائریٹر کے علاوہ کلیئر اور ایک مسلح گارڈ موجود تھا۔ یہ تینوں بیٹروں بھرنے کے دوران ٹینکر سے باہر آکر بیٹروں ٹینکس کے نزدیک ہی بنی ہوئی ایک منڈ پر پر بیٹھ گئے۔ تیل بھرنے کے دوران حبیب اور قیصر کا ٹینکر کے نیچے گھسنا ممکن نہ تھا۔ واپسی کے سفر کے دوران سڑک پر مرمت کرنے والوں کے بھیجے میں ہم ٹینکر کو چند منٹوں کے لئے روک سکتے تھے لیکن یہ کام بغیر سڑک مرمت کی ہوی مشینری کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اگر ہم سڑک پر کسی طرح سے بھی ٹینکر روک کر گارڈ، ڈائریٹر اور کلیئر پر قابو پا کر اور ان کی وردیاں بہن کر ٹینکر لے جاتے تو پہلی چیک پوسٹ پر ہی دھر لے جاتے۔ بالفرض مجال اگر ہم چیک پوسٹ کی رکاوٹوں کو بھی عبور کر لیتے تو ہمیں معلوم نہ تھا کہ ایئر فوس کے ٹینک کہاں ہیں اور کس طرح وہاں تک پہنچنا جاسکتا ہے ایئر فوس کے ٹینکر ہفتے میں ایک آدھ بار ہی بیٹروں لینے آتے تھے۔ ہمیں کچھ مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگے ٹینکروں تک کس طرح پہنچیں۔ اسی سوچ پچا میں دن پون گزرتے جا رہے تھے اور ہم اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تھے۔

ایک شام ہم سب ایک ریستورنٹ میں بیٹھے تھے کہ ایک لڑکے نے کہا کہ اس نے نگرانی کے دوران دیکھا ہے کہ بیٹروں ٹینکس کا جس وسیع چار دیواری نے احاطہ کیا ہوا ہے اس کے تین بڑے گیٹ ہیں پہلے اور دوسرے گیٹ میں ریلوے لائن بھیجی ہوئی ہے۔ ایک چھوٹا گیٹ عملے کے داخلے کیلئے بنا ہوا ہے تیسرے بڑے گیٹ سے ٹینکر آتے جاتے ہیں۔ یہ چاروں گیٹ متغزل رہتے ہیں اور ٹینکروں کے لئے بنے گیٹ پر ایک چوکیدار موجود رہتا ہے جو ٹینکر ڈائریٹر کی شناخت کیلئے دو چار منٹوں کے لئے ٹینکر کو گیٹ سے باہر روکتا ہے اور شناخت کے بعد تار رکھول کر ٹینکر کو اندر جانے کی اجازت دیتا ہے یہ دو چار منٹ کا وقفہ حبیب اور قیصر کیلئے بہت کم تھا۔ ہمیں کم از کم دس منٹ درکار تھے۔ اسی لڑکے نے کہا کہ اگر ایک لڑکا میرے ہمراہ کر دیں تو میں ٹینکر کو دس کے بجائے چندہ میں منٹ تک روک سکتا ہوں۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہمارا ایک ساتھی اگر سڑک پر فاصلے سے کھڑا ہو کر دوسرے ٹینکر کو دیکھ کر اشارہ کر دے تو میں اور میرا ساتھی فوری چوکیدار کے پاس پہنچ جائیں گے۔ ساتھی چوکیدار کو باتوں میں لگا کر اس کے قریب ایسے رخ سے کھڑا ہو جائے گا کہ چھانک کو چوکیدار نہ دیکھ سکے اور میں اسی دوران تالے میں چھوڑی ہی پہلی ڈال دوں گا یہ کام کر کے ہم وہاں سے چلے آئیں گے۔ ٹینکر کے نیچے پوچھو کہ چوکیدار لاکھولنے میں تاکا ہو جائے گا ٹینکر میں بیٹھے ہوئے لوگ ٹینکر سے اگر اترے بھی تو ان کا دھیان تالے اور گیٹ پر ہوگا اس طرح جو وقت ملے گا اس میں حبیب اور قیصر ٹینکر کے نیچے جا کر اپنی کارروائی آسانی سے مکمل کر سکتے ہیں یہ تجویز اگر محفوظ نظر آئی تو ہمیں اس کے سوا دوسرا کوئی ذریعہ بھی نہ تھا سب نے اسے تجویز پر عمل کرنے کے حق میں ووٹ دیا۔

واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے عرض ہے کہ دہلی سے روانگی سے قبل میں نے عارف کے ذریعے سیلیٹی رنگ کے دو اور آل (OVER ALL) حبیب اور قیصر کے لئے بنوائے تھے اور ان کی پشت پر ایئر فوس کے مخصوص گول دائروں والے نشان بھی بنوائے تھے ایک مسئلہ جس کا کوئی حل ہمیں اب تک نہیں سوجھا تھا وہ حبیب اور قیصر کے ہم آن کر کے سرنگ سے نکلنے اور ایئر فوس کے RESTRICTED AREA سے بحفاظت باہر آنے کا تھا۔ دو ہوی صورتیں تھیں۔ اول یہ کہ دھماکے کے بعد وہاں جو افقہری بھیلی تھی اس کا فائدہ اٹھا کر وہ دونوں کو جیب یا ٹرک لے کر جانے والے رستے ہی سے واپس آتے۔ ہنگامی حالت میں شروع کے ایک دو گھنٹوں کے دوران سخت سے سخت سیکورٹی انتظامات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ آگے ٹینکس کے علاوہ ایئر فوس کا ARSENAL (اسلحہ خانہ) بھی سرنگ کے اندر ہی موجود ہوگا۔ سرنگ میں ہمارے بسوں کے دھماکے سے اگر آگے ٹینکس نے آگ پکڑی تو ARSENAL میں بھی آگ کی حدت سے دھماکے ہوں گے۔ جہاز تو یقیناً عمل اٹھنے تھے۔ سرنگ میں اسلحہ خانے کے آگ پکڑنے سے دھماکوں کی شدت اور حدت کا رخ بھی صرف سرنگ کے دہانے کی طرف ہوگا۔ سرنگ کے اندر کسی بھی ذی روح کا کچ جانا ممکن نہ تھا اس لئے حبیب اور قیصر کا بسوں کے چھٹنے سے پہلے ہی سرنگ سے باہر نکل آنا، بے حد ضروری تھا۔ دوسری صورت میں دونوں کو سرنگ سے باہر آکر پہاڑ پر چڑھ جانا اور جھپٹے چھپاتے لمبا چکر کاٹ کر گورکھ پور پہنچنا تھا۔ دونوں صورتوں میں ان کے نیچے کا بہت کم امکان تھا۔ میں نے ان سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی تھی۔ گورکھپور میں بھی انہیں ان خطرات سے کئی بار آگاہ کیا لیکن سب بے ہودہ ان کا مشن پر جانے کا امر ابرو بڑھتا گیا۔

میں دہلی سے روانگی سے پہلے اتر پردیش کا ایک نقشہ ہمراہ لایا تھا اس نقشے کے مطابق گورکھپور سے تقریباً 50 کلومیٹر شمال میں ہندوال اور 45 کلومیٹر پور اوتا اور جنوب میں 50 کلومیٹر پوریا کے قصبہ تھے۔ یہ سب علاقے سطح مرتفع اور چھوٹی بڑی پہاڑیوں پر مشتمل تھے۔ گورکھپور میں آخری ہدایت کے طور پر میں نے انہیں کہا کہ اگر سڑک پر واپسی میں دشواری پیش آئے تو پہاڑی رستہ اختیار کریں اور زرد کی قصبہ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ پہاڑی رستہ اختیار کرنے کی صورت میں اپنے اور آل اتار کر بیٹنگ دیں۔ میں نے انہیں کہا کہ سرنگ کے باہر یقینی طور پر بیٹیں اور ٹرک وغیرہ کھڑے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی گاڑی حاصل کریں اگر کوئی رکاوٹ ہے تو بے دریغ اسے شوٹ کر دیں۔ واپسی کے دوران اگر چیک پوسٹوں پر کوئی روکے تو گاڑی چلانے والا ایئر فوری سے BARRIERS کو توڑنا ہوا آگے بڑھے جبکہ دوسرا گارڈ زپر فائر کھول دے۔ میں نے انہیں کہا کہ میں اپنے ساتھ دو لڑکوں کو لے کر کسی پرائیویٹ گاڑی میں جہاں تک اس سڑک پر آتا ممکن ہو ان کا انتظار کروں گا۔ سب اپنا سامان بالکل تیار رکھیں کیونکہ ہمیں فوری طور پر گورکھپور سے نکلنا ہوگا۔ غرضیکہ اپنا تمام پروگرام تقصیلاً طے کر کے ہم نے اگلی صبح سے مشن پر عملی کام کا آغاز کر دیا۔ حبیب اور قیصر نے اور آل اور ہم خالی تھیلوں میں ڈال کر آگے ٹینکس کے قریب اوٹ میں بٹھائیں سنبھال لیں۔ چوکیدار کے پاس جانے والے دونوں لڑکوں نے بھی ریلوے لائن کے ساتھ ایسی جگہ پر ڈیرے ڈالے جہاں سے ٹینکر کی آمد کا سگنل دینے والا لڑکا نہیں بخوبی دکھائی دے سکتا تھا۔ پروگرام کے مطابق ہم نے یہ طے کیا کہ ہم سب ہر روز صبح ہوٹلوں کے بل ادا کر کے حبیب اور قیصر کا سامان میرے کمرے میں اور دوسرے ہوٹل والے ایک لڑکے کے کمرے میں رکھ دیا کریں تاکہ ہوٹل چھوڑنے میں وقت ضائع نہ ہو۔ مشن سے واپسی پر حبیب اور قیصر کو لینے کیلئے پرائیویٹ گاڑی کے حصول کے لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ جو بھی قیصر اور حبیب ٹینکر کے ساتھ روانہ ہوں گے۔ ہم شہر میں کسی بھی اچھی حالت کی ایسی پرائیویٹ گاڑی کو روک کر جس میں صرف ایک شخص ہو۔ ڈرائیور سمیت اس گاڑی کو انخوا کر لیں گے اس دوران میرا ساتھی اپنے اور میرے ہوٹل سے سامان لے کر طے شدہ جگہ پر آجائے گا اس کے فوری بعد ہم ایک اور پرائیویٹ گاڑی ڈرائیور سمیت انخوا کریں گے اور دونوں گاڑیاں لے کر سرنگ والی آخری دو شاخے تک جا کر حبیب اور قیصر کا انتظار کریں گے۔ دونوں گاڑیوں کے مالکان یا ڈرائیور کو سامان جگہ دیکھ کر لڑکے انہیں خنجر سے ہلاک کر دیں گے۔ آپ اسے ہمارا ظالمانہ اور سفاکانہ رویہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے سوا کوئی دوسری صورت تھی اگر ہم انہیں ضرب پہنچا کر بے ہوش بھی کر دیتے تو ہوش میں آنے کے بعد وہ ہماری شکل و صورت سے متعلقہ حکام کو یقیناً آگاہ کر دیتے اس لئے ہم نے مجبوراً یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم دشمن کے ساتھ حالت جنگ میں تھے اور ان حالات میں ہمیں KILL YOUR ENEMY BEFORE HE KILLS YOU کے مقولے پر عمل کرنا تھا۔ ہمارے دو جاننا اس انتہائی خطرناک مشن پر جان کی بازی لگا رہے تھے ان کے جانے کے بعد ہی ہم نے گاڑیاں انخوا کرنی تھیں اور ان کی جان بچانے کیلئے اگر ہمیں سینکڑوں افراد کو بھی ہلاک کرنا پڑتا تو ہم ڈرائیور بن کر رہتے۔

غازی

20 مارچ تک ہم روزانہ صبح 8 بجے سے شام 6 بجے تک اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ٹینکر کا انتظار کرتے رہے۔ ہم صبح اپنے ہمراہ سینڈوچ بنا کر لے جاتے تاکہ بھوک کا دوا کر سکیں۔ 21 مارچ کو صبح ساڑھے نو بجے کے قریب سڑک پر کھڑے لڑکے نے ٹینکر کی آمد کا گنل دیا گنل ملتے ملتے ہی دونوں لڑکے تقریباً بھاگتے ہوئے اپنی اوٹ سے نکل کر گیت پر چوکیدار کی طرف گئے۔ ایک نے چوکیدار سے ٹینکوں کے انچارج کے متعلق پوچھتے ہوئے اسے باتوں میں لگایا اس دوران دوسرے لڑکے نے نہایت پھرتی سے تالے میں اٹلی ڈال دی۔ یہ سارا کام ہنڈیوں کے ذریعہ منٹ میں پورا کر کے دونوں لڑکے شہر کی طرف مقررہ جگہ پر لوٹ گئے۔ چند منٹ کے اندر ٹینکر گیت پر پہنچ گیا۔ چوکیدار نے معمول کے مطابق ٹینکروں کی شناخت کے بعد گیت کھولنا چاہتا تھا تالے اٹلی کی وجہ سے نہ کھل سکا۔ چوکیدار نے تالے کھولنے کیلئے زور آزمائی شروع کی۔ یہی وقفہ ہمیں درکار تھا۔ حبیب اور قیصر نے ہوں اور اور آل کے تھیلے اپنے سینوں پر باندھ رکھے تھے۔ وہ خاموشی اور تیزی سے ٹینکر کی طرف بڑھے اور بغیر کسی نظر پڑنے ٹینکر کے نیچے ٹھس گئے گیت کھلنے میں جب دیر ہوئی تو ٹینکر میں بیٹھے ڈرائیور، گاڑی اور کچھ بیٹے اتار آئے تالے میں اٹلی چونکہ تازہ تازہ ڈالی گئی تھی۔ اس لئے چند زوردار جھکوں سے ڈرائیور نے تالے کھول دیا پھانک کھلنے پر ٹینکر اندر داخل ہوا اور ایک ٹینکر واپسی کے لئے روانہ ہوا۔ اب تک سب کام ہماری امیدوں کے مطابق ہوا تھا ہم بھاگتے بھاگتے رکشا اسٹینڈ پر گئے وہاں سے دو رکشا کھولنے والے ہٹلوں سے ہمارا سامان لینے چلے گئے۔ میں نے انہیں میننگ پوائنٹ کا بتایا تھا۔ باقی ہم تین تھے ہم نے شہر کے ساتھ ہی چھوٹے سے انڈسٹریل ایریا کا رخ کیا۔ ہمیں وہاں سے گاڑیاں حاصل کرنی تھیں۔ چند گاڑیوں کے بعد ہمیں ایک ایسی کار دکھائی دی جس میں صرف ایک آدمی تھا۔ میں نے سڑک کے درمیان آ کر اسے روکا۔ ڈرائیور نے شیشے چڑھائے ہوئے تھے۔ ہمیں میرے جیب میں تھا میں نے اسے کچھ کہنے کے انداز میں لب ہلائے۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے شیشہ نیچے کیا۔ میں نے ہٹل نکال کر اس کی گردن کے ساتھ لگا دیا۔ ڈرائیور کے لئے یہ سب انتہائی غیر متوقع تھا وہ بھلا گیا میں نے دروازہ کھول کر اسے ساتھ کی نشست پر کھلیا۔ اور خود اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ مجھے اسٹیرنگ پر دیکھتے ہی دونوں لڑکے اوٹ سے نکل کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میں نے گاڑی کو ٹرن کیا۔ اس دوران لڑکوں نے ڈرائیور کو کھینچ کر پچھلی سیٹ کے پائیدان پر لٹا دیا۔ ایک لڑکے نے ریو اور اس کی بیٹی سے لگا کر کہا ڈرائیور بھی حرکت کی یا آواز نکالی تو بھیجا ڈاؤن گا۔ گاڑی ٹینکر میں میننگ پوائنٹ پر پہنچ گیا اور گاڑی سے نکل کر ہٹل جانے والے لڑکوں کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ بیس منٹ کے اندر چند منٹوں کے وقفے سے دونوں لڑکے آگے اور گاڑی سے کچھ دور ہی سامان اتار کر رکشا ڈاکو فارغ کر دیا میں گاڑی ان کے قریب لے آیا۔ انہوں نے جلدی جلدی سامان گاڑی کے ٹرک (ڈگی) میں رکھا اور ہم اب دوسری گاڑی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اب ہم نے ریلوے آفس کا رخ کیا اور آفس کے مین گیت سے باہر ہی گاڑی پارک کر کے ہم دو آفس کی حدود میں داخل ہوئے۔ گورکھپور میں بڑا انکیشن ہونے کی وجہ سے مسافروں کی بھیڑ رہتی ہے۔ ہم آفس کی کار پارکنگ میں چلے گئے ریزرویشن کیلئے وہاں لوگ آ رہے تھے۔ پارکنگ میں سات آٹھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم گاڑی چرائی بھی سکتے تھے لیکن گاڑی چوری ہونے کی اطلاع ملنے پر نہ صرف شہر کی ناک بندی ہو جاتی بلکہ گاڑی کی تلاش بھی فوری شروع ہو جاتی۔ اس لئے ہم ڈرائیور کے ساتھ ہی گاڑی انوارا کرنا چاہتے تھے۔ ایک سوئڈ پوائنٹ صاحب ریزرویشن آفس سے باہر آئے اور ایک نئی گاڑی کی جانب بڑھے، ابھی اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ میں نے ہٹل اس کی پشت سے لگا کر اسے اندر کھلیا اور ہٹل کے دستے سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر زوردار چوٹ لگائی۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ میرے ساتھی نے پچھلا دروازہ کھول کر اسے بھی پائیدان پر لٹا دیا۔ میں گاڑی لے کر آفس کے باہر آ گیا میرا ساتھی بھی گاڑی چلانے کا ماہر تھا۔ میں نے ساتھی کو دوسری گاڑی چلانے کے لئے بھیج دیا اور کہا کہ اس گاڑی کے ڈرائیور کو بھی ہٹل کے دستے سے سر پر چوٹ لگا کر بے ہوش کر دو تاکہ ان کی طرف سے کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔ ہم کل سات افراد گورکھپور آئے۔ حبیب اور قیصر کے علاوہ ہم 5 تھے۔ ایک لڑکا میری گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور دوسری گاڑی میں میرے ساتھی کے ساتھ دو لڑکے بیٹھ گئے اور ہم نے اللہ کا نام لے کر اپنی گاڑیاں ہوائی اڈے کی سڑک پر ڈال دیں۔ میں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی تھجک محسوس نہیں کروں گا۔ کہ یہ میرا پہلا مشن تھا جس میں، میں ایڈوائس پارٹی (عملی حصہ لینے والوں) میں شامل نہیں تھا۔ میری اپنی حالت ایسی تھی کہ جو اس بالکل معطل ہو چکے تھے میں پہلے سے طے شدہ پلاننگ کے مطابق ایک ریلوے کی طرح کام کر رہا تھا اور میرے ساتھی اور لڑکوں کی بھی یقیناً یہی حالت تھی۔ یہ پہلا مشن تھا جس میں کارروائی کی جگہ اور حالات کا ہمیں ڈرامہ علم نہیں تھا، کارروائی کے بعد حبیب اور قیصر کے بحفاظت بچ نکلنے کے بہت ہی کم چانس تھے اس ساری پلاننگ کی ذمہ داری مجھ پر تھی اور میں نے اپنے سینئر سے بھی اس مشن کی اجازت نہیں لی تھی۔ حبیب اور قیصر آگ کے سمندر میں کودنے گئے تھے۔ حبیب اور قیصر اگر بخیریت آجاتے تو اس میں میری پلاننگ کا ڈرامہ حصہ نہ ہوتا۔ یہ ہم پر اللہ پاک کا رحم اور کرم ہوتا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اپنے نمبر بنانے کی خواہش میں، میں نے حبیب اور قیصر کو موت کے منہ میں دھکیلا ہے مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ میں نے جلد بازی میں غلط اور غیر محفوظ پلاننگ کی ہے۔ اس احساس کی وجہ سے اگر صبح کا وقت لوٹ آتا تو میں حبیب اور قیصر کو جانے سے روک دیتا لیکن تیر کامن سے چھوٹ چکا تھا۔ اب اللہ پاک کے رحم و کرم کی امید پر اس لگائے بیٹھا تھا۔ لڑکوں اور ساتھیوں کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ ایک دوسرے سے وہ ایک لفظ بھی نہیں بول رہے تھے۔ ہمارے قیدی سر کی چوٹ کے باعث تقریباً دو گھنٹوں کیلئے بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں نے لڑکوں کو کہا کہ ان کے سروں پر دوبارہ چوٹ لگانا تاکہ وہ ہوش میں نہ آسکیں۔ میں نے اس وقت یہ عہد کیا کہ حبیب اور قیصر کی بخیریت آمد کی خوشی میں اللہ کے حضور شکرانے کے نفل ادا کروں گا اور ان کو قیدیوں کو ہلاک کرنے کے بجائے سر پر چوٹیں پہنچا کر چار پانچ گھنٹوں کے لئے بے ہوش کر دوں گا اور اس عرصے میں دونوں گاڑیوں میں ہم کو کچھور سے خاصی دور نکل جائیں گے۔ ہم نے واپسی کا روٹ بڈ ریجر سڑک خلیل آباد (60 کلومیٹر) اور فیض آباد (50 کلومیٹر) تک اور پھر بڈ ریجر ٹین لکھنؤ اور لکھنؤ سے دہلی جانے کا بنایا تھا ہمیں انتظار کا ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ حبیب اور قیصر کو گئے تقریباً تین گھنٹے گزرے تھے کہ ہمیں زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ابھی زمین کی تھر تھر ہٹ ختم نہیں ہوئی تھی کہ پہاڑی دوسری جانب سے آگ اور دھواں کے بادل اٹھتے ہوئے دکھائی دیئے اسکے ساتھ ہی کانوں کے پردے چھانٹنے والے دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وقفے وقفے سے آگ کے شعلے بلند ہوتے اور دھماکوں کی شدت بڑھتی جاتی۔

شعلے اتنے بلند تھے کہ پہاڑی دوسری جانب ہونے کے باوجود ہمیں دکھائی دے رہے تھے وقفے وقفے سے دھماکوں کی شدت سے میں نے اندازہ لگایا کہ سرنگ میں بنا ہوا اسلحہ خانہ بھی آگ پکڑ چکا ہے اور یہ دھماکہ ہم، راکٹ اور دوسرا اسلحہ چھٹنے سے ہو رہے ہیں ہمیں جو شعلے دکھائی دے رہے تھے وہ یقیناً سرنگ کے دہانے سے نکلنے تھے کیونکہ اخراج کا اور کوئی رستہ نہ تھا مشن پورا ہونے کی حد تک ہم کامیاب ہو چکے تھے لیکن ہمیں ڈرامہ خوشی نہ تھی۔ ہم سب حبیب اور قیصر کی بخیریت واپسی کی دعائیں مانگ رہے تھے دھماکے اور آگ کے شعلے اسی شدت سے جاری تھے کہ ہمیں ایئر فورس کا ایک ٹرک سرنگ کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ ہم نے گاڑیاں اشارت کر لیں اور دو لڑکے اس سڑک کے دونوں طرف ڈھلانوں میں کھڑے ہو گئے۔ ٹرک تیزی سے ہماری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا ٹرک ڈرامہ دیکھ پھانچا تو لڑکوں نے ڈرائیور اور ساتھ کی سیٹ پر بیٹھے، ہڈیوں کو پیمانہ کفر لگا لیا اور سڑک کے پیچ آ کر ٹرک کو روکنے کا اشارہ دینے لگے۔ ٹرک رکتے ہی حبیب اور قیصر ٹرک سے باہر آئے میں نے اپنے ساتھی کو کہا کہ ٹرک کے ایکسیلیر پر پتھر رکھ کر اسے اشارت کرے اور اسٹیرنگ موڑ کر سڑک کی ڈھلان پر لڑکھ دے ابھی تک ہمارے حواس قابو میں نہ تھے اور نہ ہی حبیب اور قیصر سے ہم نے کوئی بات کی تھی۔

ٹرک لڑھکتا ہوا ڈھلان سے پچاس ساٹھ فٹ گہری کھائی میں جاگرا۔ لڑھکتے ہوئے اس میں آگ لگ گئی۔ اس دوران لڑکے دو پرٹنالی ڈرائیوروں کو گاڑیوں سے بے ہوشی کی حالت میں ہی نکال چکے تھے۔ ایک لڑکے نے خنجر نکالا ہوا تھا میں نے یہ دیکھا تو چیخ کر اسے منع کیا لڑکے میرے کہنے پر ان دونوں کو گھسیٹ کر ڈھلان پر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں لے گئے میں نے خود جا کر ان کے سروں کو ہٹل کے دستے سے کٹی گئی بارضرب پہنچائی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ آئندہ چار پانچ گھنٹوں تک ہوش میں نہیں آسکتے تھے۔ قیصر میرے ساتھ اور حبیب ساتھی کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہم نے گاڑیوں کا رخ گورکھپور کی جانب کیا اور شہر میں داخلے سے پہلے ہی خلیل آباد کی سڑک پر گاڑیوں کو تیز رفتاری سے بھگاتے لے گئے۔ سڑک ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی ہم بشکل ایک گھٹنے میں خلیل آباد پہنچے۔ وہاں پر ہم نے دونوں گاڑیوں میں پیٹرول ڈلوایا۔ پانی اور آئل چیک کیا اور فیض آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ فیض آباد پہنچنے میں ہمیں مزید 5 گھنٹے لگے۔ سڑک جگہ جگہ ZIGZAG اور ٹوٹی پھوٹی تھی۔ فیض آباد میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہم نے گاڑیاں روک کر اپنا سامان نکال لیا۔ میرے ساتھی نے ٹرک لڑھکتے وقت ڈیزل سے بھرا (CANE) کیمین نکال کر آدھا ٹرک میں اٹھل دیا تھا اور آدھا ہمراہ لے آیا تھا۔ ٹرک سے باہر نکل کر اس نے ڈیزل کو آگ دکھادی تھی اسی وجہ سے ٹرک میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ آدھا بچا ہوا ڈیزل ہم نے دونوں گاڑیوں کے اندر اٹھل دیا اور اسے آگ لگا کر تیز تیز قدموں سے فیض آباد میں داخل ہو گئے۔ فیض آباد میں رکشے لے کر ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ میں نے اپنے ساتھی کو اسٹیشن کا جائزہ لینے کو بھیجا اس نے تپا لگا کوئی غیر معمولی سرگرمی دکھائی نہیں دی۔ ہم نے دو دو کی ٹولیوں میں لکھنؤ کے ٹکٹ لئے۔ تین گھنٹے انتظار کے بعد لکھنؤ جانے والی ٹرین آئی اور ہم سب ایک ہی ڈبے میں سوار ہو گئے میں نے سب کو اپنے ہٹل اور ریو اور تیار رکھنے کا کہا۔ اتنے بڑے مشن کو کامیابی سے پورا کرنے اور قیصر اور حبیب کے بخیریت لوٹ آنے کے بعد ہم کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھے۔

ٹرین کے چلنے کے بعد ہم نے گورکھپور سے بنوائے سینڈوچ کھائے۔ فیض آباد سے لکھنؤ تک سو سو کلومیٹر کا فاصلہ اس بجز ٹرین نے 5 گھنٹوں میں طے کیا لکھنؤ پہنچنے تو رات خاصی دھل چکی تھی اسٹیشن سے معلوم ہوا کہ دہلی کی ٹرین صبح 8 بجے ملے گی۔ ہم نے رات کا بقیہ حصہ ریلوے ویٹنگ روم میں ہی گزارنے کا فیصلہ کیا اسٹیشن سے ہی ہم نے چائے اور ایک کھا کر بھوک مٹائی۔ صبح 8 بجے ہم ٹرین میں بیٹھے اور شام گئے دہلی پہنچے۔ گورکھپور سے دہلی پہنچنے تک ہم نے مشن کے متعلق اپنے جانناز ہیر وز حبیب اور قیصر سے کوئی بات نہ پوچھی تھی دہلی اسٹیشن سے میں نے تین لڑکوں کو رخصت کیا اور قیصر کو ہمراہ لے کر ساتھیوں کے گھر آ گیا یہ رات بھی ہم نے خاموشی سے بسر کی۔ باوجود بے حد اشتیاق کے میں نے حبیب اور قیصر سے مشن کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ میں جانتا تھا کہ انہیں TENSION کے جال سے نکلنے کیلئے آرام کی ضرورت ہے دوسرے روز صبح ناشتے کے بعد میں نے انہیں اپنے کمرے میں بلایا۔ میرے ساتھی بھی وہاں آگئے تھے میں نے حبیب اور قیصر کو کامیابی سے مشن مکمل کرنے اور زندہ بچ نکلنے پر بہت بہت مبارکباد دی۔ میرے ساتھیوں نے بھی بڑھ بڑھ کر انہیں گلے لگایا۔ عارف اور رند پر بھی ہمارے کمرے میں آچکے تھے میں نے حبیب اور قیصر کو کہا کہ اب تھکنا ہے ہاتھیں کھینچنے کے نیچے لیٹنے کے بعد واپسی تک ان پر کیا بھی اور کس طرح وہ واپس لوٹنے میں کامیاب ہوئے چونکہ مشن کا یہ انتہائی خطرناک حصہ انہوں نے سرانجام دیا تھا لہذا میں ان دونوں کی زبانی بیان کردہ حالات کو اپنے الفاظ میں تحریر کر رہا ہوں۔

حالات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کیلئے دہلی میں ہماری عدم موجودگی کے درمیان پیش آنے واقعات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پاکستان سے ہماری ڈاک کا سلسلہ تو میری درخواست پر منقطع ہو چکا تھا لیکن پاکستان سے ٹرانسمیٹر پر ایک روز کے وقفے سے دہلی میں ہمارے دو ساتھیوں سے ہماری واپسی کا پوچھا جاتا رہا تھا۔ اس مشن کے متعلق میں نے نیا نیا سینئر کو کچھ بتایا تھا اور نہ ہی ان سے اجازت لی تھی۔ انہیں تو یہ بھی علم نہ تھا کہ ہم کس مشن کے لئے کہاں گئے ہیں پاکستان سے میرے ساتھیوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مقررہ وقت پر صرف پاکستان سے آمدہ بیغام وصول کریں اور خود کوئی بیغام ٹرانسمیٹ نہ کریں۔ انہیں یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ دہلی واپسی پر میں پاکستان سے آنے والے ٹرانسمیٹر بیغام کو اپنی موجودگی میں وصول کروں کیونکہ کوئی بہت ضروری اور اہم ہدایت مجھے دینی ہے۔

حبیب اور قیصر سے جب میں نے مشن کے دوران پیش آنے والے واقعات پوچھے تو وہاں موجود ہم سب ہمہ تن گوش تھے۔ حبیب نے بات شروع کی۔ اس نے کہا کہ گیت پر ٹینکر کے رکتے ہی قیصر اور میں نہایت آسانی سے ٹینکر کے نیچے پہنچ گئے۔ قیصر نے تو فوری ٹینکر کے نیچے لگی اٹھل پلٹ میں سوراخ ڈھونڈ کر ان میں راڈ چھسنا کر اپنی ہیٹلس فٹ کر لیں۔ مجھے سوراخ ڈھونڈنے میں وقت پیش آ رہی تھی۔ قیصر نے میری مدد کی اور موزوں سوراخوں میں میرے راڈ ڈال کر میری ہیٹلس ان میں فٹ کر دیں۔ ہم دونوں کو ہیٹلس پر لینے بشکل چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ پھانک کھلنے کی آواز آئی اور ٹینکر چل پڑا۔ اٹھل ٹینکس کے قریب جا کر ٹینکر رک گیا۔ اندازے کے مطابق وہاں ٹینکر پر پیٹرول لوڈ کرنے میں تقریباً آدھ گھنٹہ لگنا تھا۔ دو چار منٹ اسی صورت میں گزارنے کے بعد جب ہم نے دیکھا کہ ہماری اس حالت میں موجودگی کو کسی نے نوٹ نہیں کیا اور ٹینکر میں پیٹرول بھرنے کی آواز سنائی دی تو ہم نے ہیٹلس پر لینے لینے اپنے اور آل پہن لے۔ دونوں نے دو بم نکال کر بیڑیج ٹیپ کے ساتھ نہایت مضبوطی سے ٹینکر کی پیٹ کے ساتھ چپاں کر دیئے۔ اور بیڑیج ٹیپ سے ہوں کو چار چار مختلف جگہوں پر لگا کر انہیں اتنا محفوظ کر دیا کہ سفر کے دوران سڑک پر جھکوں کی وجہ سے بم گرنے جائیں۔ ہمیں اب صرف ہوں کی ٹانگہ سیٹ کرنی تھی جو ہم منزل پر پہنچ کر ہی سیٹ کر سکتے تھے۔ سیفٹی ہیٹلس نے ہمیں جھکوں سے گرنے سے بچایا ہمارے تھیلوں میں اب ایک ایک بم، ہٹل، گولیاں اور خنجر تھے۔ تھیلے ہم نے سینوں پر باندھ رکھے تھے۔ پہلی چیک پوسٹ روانگی کے پون گھنٹے کے بعد آئی۔ وہاں سے کیپٹن کے بعد ٹینکر آگے چل پڑا۔ دوسری چیک پوسٹ تقریباً 20 منٹ بعد آئی۔ ہم اس سارے سفر کے دوران صرف سڑک اور عمارت کی پانچ چھ فٹ بلندی تک ہی دیکھ سکتے تھے۔ دوسری چیک پوسٹ سے کیپٹن کے تقریباً 10 منٹ کے سفر کے بعد ٹینکر بائیں جانب مڑا۔ اب ہمارے ایک طرف پہاڑ اور دوسری جانب کھڈ تھے۔ سڑک کے دونوں جانب خاردار تار کی بہت گھنی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ ٹینکر نے اس سڑک پر اپنی رفتار کم کر دی کیونکہ سامنے سے بھی جیپ اور ٹرک آ رہے تھے۔ سڑک پہاڑی کے ساتھ ساتھ اس کی گولائی کے ساتھ ہی گھوم رہی تھی۔ ہمیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ سڑک اب ڈھلان ہے کچھ ہی دیر بعد ہمارے ایک جانب پہاڑی اور دوسری جانب ہموار زمین آگئی اس ہموار زمین پر بنا ہوا رن وے صاف دکھائی دے رہا تھا جو پہاڑی میں جاگ رہا ہے ہو جاتا تھا رن وے آنے سے پہلے ہی ٹینکر ایک سرنگ میں داخل ہوا اور تقریباً سو میٹر جا کر رک گیا ہم نے ہوں پر 20 منٹ وقفہ کا ٹائم سیٹ کیا (ان ہوں میں زیادہ سے زیادہ 59 منٹ بعد چھٹنے کا وقت سیٹ کیا جاسکتا تھا) اتنی دیر میں ٹینکر سے پیٹرول سرنگ میں بے ٹینکس میں منتقل کیا جانے لگا۔ سرنگ میں بجلی سے روشنی کی گئی تھی جو باہر کی روشنی سے بہت کم تھی ہم نہایت آسانی سے اور بغیر کوئی آواز پیدا کئے ٹینکوں کی دوسری جانب سے ٹینکر سے باہر نکلے ہم نے دیکھا کہ یہ سرنگ آگے جا کر پہاڑ میں کھدے ہوئے ایک بہت بڑے ہال میں ختم ہو جاتی تھی ہمارے اوور آل پہننے ہونے کی وجہ سے ہم پر کسی نے شک نہیں کیا اور ہم اس ہال تک پہنچ گئے۔ وہ ہال اتنا بڑا تھا کہ اس میں جہازوں کے کئی بیٹنگر بنا جائیں۔ اس ہال میں دو تین مختلف اقسام کے جنگی جہاز کھڑے تھے۔ ان جہازوں کی پارکنگ میں بجلی کی بہت زیادہ روشنی نے دن کے جالے کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔ وہاں پر درجنوں ٹینکیشن ہمارے جیسے اوور آل پہننے جہازوں کی مرمت اور دیکھ بھال کر رہے تھے۔ میں نے اپنے دوسرے ہم میں اب سے 15 منٹ بعد کا ٹائم سیٹ کیا اور جہازوں کی طرف چل پڑا۔ جب میں ہال کے تقریباً نصف تک پہنچا تو مجھے سرنگ کا وہ دہانہ دکھائی دیا جس میں میدانی رن وے داخل ہوتا تھا۔ سرنگ میں تقریباً ایک کلومیٹر رن وے بنا ہوا تھا۔ اسی پوائنٹ سے بیٹنگر میں کھڑے جہاز ٹیک آف کے لئے اشارت ہوتے تھے اور سرنگ سے نکلنے تک ان کی رفتار اتنی بڑھ جاتی ہوگی کہ میدانی رن وے کا کچھ حصہ ہی طے کر کے وہ مو پورا ہو جاتے ہوں گے۔ میں جہازوں کی طرف یہ سوچ کر بڑھتا تھا کہ کسی بھی جہاز کی کاک چٹ میں موقع دیکھ کر بم پھینک دوں گا اور یہ موقع مجھے بہت جلد مل گیا۔ میں بم ایک جہاز میں پھینک کر قیصر کی طرف متوجہ ہوا وہ اس ہال میں سات آٹھ حصوں پر منتظم سینٹ کے اندر رگی بہت چھوٹی چوڑائی کی ریل کی پٹریوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو رن وے والی سرنگ کے ہال میں خاتمے کے قریب ہی ایک پٹری میں شامل ہو جاتی تھیں اور وہ ایک پٹری ایک سرنگ میں چلی جاتی تھی۔ ہم نے جو ٹائم ٹینکر والے ہوں میں سیٹ کیا تھا اس میں اب صرف 9 منٹ باقی تھے۔ قیصر نے سرگوشی میں مجھے کہا کہ یہ پٹریاں یقیناً جہازوں میں بم لادنے والی ٹریلیوں کیلئے بنی ہیں اور سرنگ میں داخل ہونے والی پٹری ARSENAL تک جاتی ہے میں نے اس کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانا اور اس سرنگ میں داخل ہو گیا اور میں ٹینک والی سرنگ سے باہر جانے کو چل پڑا۔ قیصر نے سرنگ میں کیا کیا یہ اسی سے پوچھئے۔

غازی

قیصر نے بتایا کہ میں وقت کی کمی کے باعث سرنگ میں داخل ہو کر بھاگے لگا۔ یہ بڑی ایک جگہ ختم ہو جاتی تھی وہاں بھی ایک بڑی سرنگ جس میں ٹرک آسکیں بنی ہوئی تھی۔ جہاں بڑی ختم ہوتی تھی وہاں ترتیب سے مختلف سازنے کے بم اور راکٹ سیکٹروں کی تعداد میں پڑے تھے جن کی نگرانی پر دو ایئر فورس کے گاڑ اور ایک افسر تھانوں نے اور آل بہن رکھے تھے۔ دونوں گاڑوں کو مسلح تھے جبکہ افسر کے پاس نگاہی طور پر کوئی ہتھیار نظر نہ آتا تھا۔ اور آل کی وجہ سے مجھے گاڑوں تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ میں ایک گاڑ کے قریب گیا اور انتہائی غیر متوقع طور پر خنجر سے اس کی شرک کاٹ دی۔ بم پر میں نے صرف 10 منٹ کا وقفہ سیٹ کیا تھا میں نے بیک وقت اپنا بم ہوں کے اسٹاک کے ساتھ رکھا اور گاڑ کی اسٹین گن اٹھائی۔ اس سارے واقعے کا دوسرے گاڑ کو اس وقت پہنچا جب میں اس کے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے بھی خنجر سے وصل جہنم کیا۔ ان کے افسر نے دوسرے گاڑ کا شرک دیکھ کر اپنے اور آل کی زپ کھول کر روئی میں سے پستول نکالنا چاہا۔ پستول کو وہ ابھی پوری طرح سے نکال بھی نہ سکا تھا کہ میں نے اسٹین گن سے اس پر تین چار گولیاں چلا کر اسے وہیں ڈھیر کر دیا اور خود اس بڑے سرنگ کے دہانے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا سرنگ میں اسٹین گن چلنے کی آواز کی گنا بڑھ گئی تھی لیکن کوئی آواز کی سمت کا تعین نہ کر سکا تھا۔ دہانے پر دو پیرے دار کھڑے تھے۔ مجھے اور آل پہنچنے اور ہاتھ میں اسٹین گن لئے دیکھ کر وہ مجھے حملے کا ہی ایک فرد سمجھے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ اندر گولیاں چلنے کی آواز کیسی تھی۔ اتنی دیر میں، میں بھاگنے کی وجہ سے اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پا چکا تھا میں نے نہیں کہا ”کیا تمہیں اب تک خبر نہیں ہوئی؟“ وہ دونوں سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر بیک وقت بولے ”ہمیں کوئی خبر نہیں“ اور میں نے انہیں اسٹین گن کی گولیوں سے اندرونی خبر دے دی۔ سڑک پر پہنچ کر میں شکر کے داخلے والی سرنگ کی طرف بھاگا کیونکہ حبیب اسی سرنگ سے باہر آنے کیلئے چلا تھا سرنگ کے دہانے کے قریب ہی حبیب میرا منتظر تھا ہم نے ٹرکوں اور بیچوں کی پارکنگ کی طرف دوڑ لگائی ابھی ہم اس پارکنگ کے نزدیک ہی پہنچے تھے کہ ہمیں پہلا دھماکہ سنائی دیا۔ ہم بھاگ بھاگ پارکنگ میں کھڑے ایک ٹرک کی طرف پہنچے۔ ٹرک میں بیٹھنے ہی لگے تھے کہ دوسرا دھماکہ ہوا اور اس کے ساتھ تیسرا دھماکہ ہوا اور پھر تو دھماکوں، شعلوں کا سلسلہ بندھ گیا۔ میں نے ٹرک میں چابی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے ڈیش بورڈ سے تاریں نکالیں اور انہیں جوڑی رہا تھا کہ ٹرک تھر تھر آنے لگا زمین ہل رہی تھی یہ آئل ٹینک یا ARSENAL میں ہوں کے پھینچنے کی وجہ تھی ہم نے ٹرک اسٹارٹ کیا اور تیزی سے واپسی کیلئے روانہ ہوئے اچانک ایک کانوں کے پردے پھاڑنے والا انتہائی شدید دھماکہ ہوا یہ دھماکہ غالباً عدت سے ARSENAL میں رکھے ہوں کے بیک وقت پھینچنے سے ہوا تھا اس دھماکے نے زمین کو ایسے جھنجھوڑا کہ ہمارا ٹرک کئی فٹ ہوا میں اچھلا بڑی مشکل سے میں نے اسٹیئرنگ پر قابو رکھا۔ ابھی ہم سڑک کے موڑ کے اس حصے تک نہیں پہنچے تھے۔ جہاں سرنگیں آنکھوں سے اوجھل ہوتیں کہ تینوں سرنگوں سے بیک وقت آگ کے شعلے نکلے۔ زمین مسلسل تھر تھر رہی تھی اور دھماکوں کا سلسلہ جاری تھا۔ آگ کی حدت ہمیں ٹرک میں بھی محسوس ہوئی۔ میں نے ٹرک کی رفتار تیز کر دی پہلے بند بڑی رفتار سے ٹرک نے توڑ دیا۔ میس اور کالونی کے رہائشی زمین پلٹے اور دھماکوں کی وجہ سے باہر نکل آئے تھے۔ میں ٹرک کے ایکسپلوزیو کو دبائے جا رہا تھا دوسرا پیر بھی ٹرک سے توڑتے ہوئے ہم RESTRICTED AREA سے باہر نکل آئے۔ آگے آ کر دو شائے کے قریب آپ انتظار میں کھڑے تھے۔ حبیب نے کہا ”سر آپ نے آگ کے شعلے اور دھوئیں کی جو بلندی دیکھی تھی۔ وہ اصل کا عشر شیر بھی تھی۔ کیونکہ درمیان میں پہاڑ تھا جو کچھ ہم نے دیکھا وہ تو قیامت صغریٰ تھی۔ اس شدت کی آگ تھی کہ انسانوں سمیت ہر شے یقیناً راکھ کا ڈھیر بن گئی ہوگی۔ یہاں میں آپ کو ایک عجیب حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔ اس مشن میں کامیابی اور بیروہ بننے کا سہرا حبیب قیصر کے سر پر اور قیصر حبیب کے سر پر باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں کا یہ کہنا تھا کہ دوسرے کے بغیر یہ مشن کبھی کامیاب نہ ہو سکتا۔ ان دونوں نے فی الحقیقت اپنی جان کی بازی لگا کر ہمارے چیف سے لے کر ہر متعلقہ فرد کے ادھورے خواب کو پورا کیا تھا۔ ہماری شاہنشاہ اور تعریف کے علاوہ پاکستان سے اس مشن کی کامیابی کی تصدیق کے بعد ان دونوں کو خصوصاً اور مشن میں شامل ساتھی لڑکوں اور مجھے کیا انعام ملا۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہم سب کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ سب سے زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ بھارتی حکومت اور ایئر فورس نے اس جانی کو بالکل دبا دیا۔ ہم سب اخبار ایک صفحے تک کھنگالنے رہے لیکن اتنے بڑے واقعے کی کوئی خبر کسی اخبار میں موجود نہ تھی۔

صرف Times of india نے ایک ادارے The mass pyre in mountain کے عنوان سے شائع کیا جس میں ہوائی اڈے پر تباہی کا ڈر بڑے محتاط انداز میں کیا گیا تھا۔ اس کی یقینی وجہ یہ تھی کہ اس واقعے کی تشہیر کرنے سے بھارت خود اپنی نا اہلی سیکورٹی کو تسلیم کرنا اور اپنے منہ پر خود طمانے مارتا۔ ہندو کی تو خوں میں ہی یہ ہے کہ اپنی غلطی کو کبھی تسلیم نہیں کرتا اور عیش خود کو صحت کابرت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کشمیر میں اب چھ لاکھ سے زیادہ بھارتی فوج کی موجودگی کو بھارت کا صحیح اقدام قرار دینا، جو ناگزیر اور حیدر آباد پر اس لئے قبضہ کرنا کہ وہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت کو نظر انداز کر کے اس وقت کے بھارتی مہاراجہ ہری سنگھ کے الحاق کو وجہ بنا کر قبضہ کرنا بھارتی ذہنیت کی گھمبیر اور عمدہ عکاسی کی بہترین مثال ہے۔

شام تک میں ساتھیوں کے گھر بیٹھا رہا اور ہم اس جان لیوا مشن کی تکمیل اور مکمل کامیابی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ ساتھیوں کے گھر میں اکثر جاتا تھا اور ہڈی پر ہماری میز بانی کا بوجھ پڑتا تھا۔ میں نے کئی بار ہڈی پر اس بوجھ کی میز بانی سے روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہر بار قسطی انکار کر دیا۔ گورکھپور سے واپسی پر ہم گزشتہ 24 گھنٹے سے اس کی میز بانی سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ شام کو سب سے رخصت ہو کر میں اور قیصر سڑک پر آگئے۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے سوٹ کپس دو ٹیکبوں میں رکھے اور قیصر اپنے گھر اور میں اپنے ہوٹل روانہ ہوا۔ ہوٹل میں میرے لئے کئی روز پہلے کا کرٹل شکر کا پیغام موجود تھا کہ میں اسے فوری ملوں۔ اگلی صبح میں نے پاکستان جانے والی ڈاک کے لئے اس مشن کی مکمل رپورٹ لکھی جس میں یہ بھی لکھا کہ بھارتی حکومت نے اتنے بڑے حادثے کو بالکل دبا دیا ہے اور اس حادثے کے متعلق کسی اخبار میں کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔ اگلے روز ٹرانسمیر پر رابطے کے وقت میں ساتھیوں کے گھر چلا گیا۔ مقررہ وقت پر پاکستان سے رابطہ ہوا تو حبیب (نمبر نو) نے نہایت مختصر پیغام دیا کہ گروپ لیڈر اور دونوں ساتھی واپس آگئے ہیں اور گروپ لیڈر یہاں موجود ہے۔ اس کے جواب میں پاکستان سے مجھے ہدایت کی گئی کہ تفصیلی رپورٹ ڈاک کے ذریعے بھیجوں۔ مزید یہ کہ سنے راستے سے ڈاک لانے، لے جانے والوں میں سے کچھ ہارڈ پر پکڑے گئے ہیں۔ اس لئے پہلے رستے سے پہلے والے کوریئیر سے آئندہ مجھے کو شام 4 بجے آخری مرتبہ کے Contact spot پر ملوں۔ لاہور کے رستے آنے والے کوریئیر اگر دکھائی دیں تو ان کی نظروں میں نہ آؤں وہ دشمن کی حراست میں ہیں۔ کیپٹن ارشد سے ملاقات کے دوران میرے جن ساتھیوں کو ان کوریئیر نے دیکھا ہے۔ وہ بھی ان کی نظروں سے بچیں۔ پاکستان سے ہمیں ٹرانسمیر پر متصل ہدایات ملتی تھیں۔ بھارتی انٹیلی جنس یقیناً اس فریکوئنسی پر انہیں سچ کرتی ہوگی۔ پاکستانی ٹرانسمیر کا تو وہ کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے۔ خطرہ صرف ہمارے ٹرانسمیر سے پیغام بھیجتے وقت تھا۔ لہذا ہم اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ ایک منٹ کیلئے ٹرانسمٹ کرتے تھے اس مختصر وقت میں ہمارے Trace ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔

گورکھپور کے متعلق ہمیں جو معلومات آئندہ دو ماہ میں حاصل ہوئیں۔ قارئین کے لئے تسلسل کی غرض سے یہاں لکھ رہا ہوں۔ مختلف ذرائع جن میں کرٹل شکر بھی تھا، مجھے معلوم ہوا کہ گورکھپور کے مرکزی شہر ہونے کی وجہ سے اس خفیہ اڈے کو گورکھپور کا اڈہ کہا جاتا تھا جبکہ یہ درحقیقت گورکھپور سے تقریباً 50 کلومیٹر کے فاصلے پر چند وال کے قریب بنایا گیا تھا۔ اس اڈے کا رن وے مہندوں کی طرف تھا اور رہائشی کالونیاں اور میس وغیرہ پھاڑکی اس جانب گورکھپور کی طرف تھے۔ سرنگیں مہندوں کی جانب تھیں۔ اس اڈے سے ٹیک آف کے بعد جہاز ترقی اور (Routine) روٹین کی پروازوں کے لئے اڑتے تھے۔

یہ مستند اطلاعات بھی ملیں کہ ہماری کارروائی کی وجہ سے پھاڑ کے اندر موجود تمام لوگ، جہاز اور اسلحہ راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ اس حادثے کی وجہ کا تعین کرنے کے لئے اعلیٰ سطح کے کمیشن بنائے گئے۔ لیکن کوئی کمیشن بھی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ یہ ہوائی اڈہ تباہی کے بعد قریب ایک سال تک بند رہا۔ یہ سب باتیں مجھے بمبئی اور پاکستان واپس پہنچنے سے پہلے نیپال میں معلوم ہوئیں۔

آئندہ مجھے کچھ پہلے والے کوریئیر سے ملنا تھا۔ میں نے Times of india کے اس شمارے کے کئی پرچے خریدے تاکہ پاکستان بھیج سکوں۔ اس مشن کی مفصل رپورٹ بھی تیار کی۔ ہماری دہلی سے غیر موجودگی کے دوران لیٹون سے ہفتی ڈاک موصول ہوئی تھی۔ وہ بھی دہلی میں رہ جانے والے ساتھیوں نے تیار کر رکھی تھی۔ اس بار ہماری ڈاک کا پیکٹ خاصا بڑا تھا۔ میں جمعرات کو کرٹل شکر سے ملنے گیا۔ حسب معمول اس نے سرو سڑک کے لان میں محفل سجا رکھی تھی۔ سڑکی علیک سلیک کے بعد میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے کاروباری سلسلے میں بمبئی گیا ہوا تھا۔ میری دہلی سے غیر حاضری کے دوران اس کا ہوٹل میں بھیجا ہوا پیغام واپسی پر ملا، سو حاضر ہو گیا ہوں۔ کرٹل شکر جو اپنی کرسی پر نیم دراز تھا میری بات خاموشی سے سنتا رہا۔ میں نے بات ختم کی تو وہ کرسی پر سیدھا ہوجا کر بیٹھ گیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا ”کیا گورکھپور بھی گئے تھے؟“ کرٹل شکر کی زبانی گورکھپور کا نام سن کر میرے روٹنے لگے ہو گئے۔ میں نے حواس پر قابو پانے کی پوری کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میں خاموشی سے لکٹی باندھے چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ یقیناً کرٹل شکر نے بھی میری اس حواس باختگی کو محسوس کیا ہوگا۔ اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس میرے سامنے رکھ دیا جسے میں غنا غنی پی گیا، حواس ذرا بحال ہوئے تو کرٹل شکر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دیکھی۔ میں نے حواس مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا کہ میں بمبئی سے واپسی پر گورکھپور بھی گیا تھا۔ مجھے وہاں اپنی چائے متعارف کرانی تھی۔ میں نے اسے جواب تو دے دیا لیکن میری زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ میری اس حالت کو کرٹل شکر گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چند لمحے توقف کیا اور اسی سرگوشی کے لہجے میں بولا ”تم نوڈو ہو یا نوڈو۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ میرے لئے تو تم صرف نوڈو ہو۔ جو کام بھی کرو پوری احتیاط سے اور دیکھ بھال سے کرو“۔ یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا اور اپنے لئے نیا جام بنانے لگا۔ کرٹل شکر کے اس فقرے نے میرے بڑی مشکل سے بحال کئے ہوئے حواس پھر درہم برہم کر دیئے۔ میرے دل و دماغ میں زبردست ہچکل مچی ہوئی تھی۔ میرے لئے اس کی باتیں انتہائی غیر متوقع تھیں۔ میں اس مجرم کی طرح اس کے سامنے بیٹھا تھا جس کے جرائم لکھتے بے نقاب ہو چکے ہوں اور وہ اپنی سزا سننے کا منتظر ہو۔ کرٹل شکر میری اس حالت سے خاصا محظوظ ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا اصلی لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ”مجھے ایک Official کام سے گورکھپور جانا پڑا۔ میں نے تمہیں وہاں دیکھا۔ تمہارے ساتھ دو تین اور آدمی بھی تھے۔ میں حبیب میں چھاؤنی جا رہا تھا اس لئے ٹھہر نہ سکا۔ میں گورکھپور میں دو روز رہا اور واپس دہلی آ گیا“۔ کرٹل شکر نے اب وہی پہلے والی ہنسی مذاق کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نیم دہلی سے اس کا ساتھ دیتا رہا، لیکن میرے دماغ میں اس کے کہے ہوئے الفاظ مسلسل گونجتے رہے۔ ”تم نوڈو ہو یا نوڈو اور جو کام بھی کرو پوری احتیاط اور دیکھ بھال سے کرو“۔ بڑے واضح اور صاف الفاظ میں میری اصلیت اور اصل کام کا علم ہو جانے کا مطلب لئے ہوئے تھے۔

دوران گفتگو کرٹل نے شاید میری بدحواسی کو دور کرنے کے لئے پھر گورکھپور کا ذکر شروع کر دیا۔ ”نوڈو کیا تمہیں معلوم ہے کہ گزشتہ دنوں گورکھپور میں کیا حادثہ ہوا“۔ میرے فنی سر ہلانے پر اس نے کہا کہ ”وہاں ایئر فورس کے ایک خفیہ ہوائی اڈے پر اچانک آگ بھڑک اٹھی جس نے جہازوں، اسلحہ خانہ (Arsenal) اور آئل ٹینکس کو بھی آٹا ٹاٹا اپنی لپیٹ میں لے لیا اور دوسو سے زیادہ Airforce personnels کے ہمراہ سب کچھ مل کر رکھ ہو گیا۔ اس ہوائی اڈے پر سیکورٹی اتنی سخت تھی کہ تخریب کاری کا ذرا سا بھی امکان نہیں۔ یعنی شہادت دینے کو بھی کوئی زندہ نہ بچا۔ صرف ایک ٹرک جائے حادثہ سے نکل سکا جو دو سیکورٹی بیروں پر زور کوڑتا، Restricted areas سے باہر آیا۔ صرف اس کا ڈرائیور اس حادثے کا یقینی شہد تھا لیکن اپنی حواس باختگی میں ٹرک پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور ٹرک کھڈ میں لڑھک کر ڈرائیور سمیت جل کر رکھ ہو گیا۔ یہ حادثہ یقیناً ایئر فورس Crew کی غفلت کی وجہ سے پیش آیا ہے“۔ کرٹل جھوڑی دیو کو چپ ہوا اور پھر سوالیہ انداز میں بولا۔ ”ایک بات ایسی ہے جو اس حادثے کو تخریب کاری کا نتیجہ قرار دے سکتی ہے۔ حادثے کے بعد گورکھپور کے دو آدمی ہوائی اڈے والی سڑک پر بیہوش پائے گئے۔ ان کے بیان کے مطابق اسی روز ان کی گاڑیاں پستول دکھا کر چھین گئی تھیں اور انہیں سروں پر ضرب پہنچا کر بیہوش کر دیا گیا تھا۔ ان کی دونوں گاڑیاں فیض آباد کے قریب چلی ہوئی ملی ہیں۔ ان دونوں کے بیان کے مطابق وہ اتنے حواس باختہ تھے کہ گاڑیاں چھیننے والوں کو بھی طرح سے دیکھ نہ سکے۔ ان کے بیانات سے صرف ایک Clue ملا کہ ان میں ایک آدمی گورا چٹا اور لمبے قد کا تھا ”کرٹل نے بتا کر پھر چپ ہو گیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ وہ غالباً میری پریشانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا پھر اچانک بولا ”نوڈو۔ کیا یہ عجیب اتفاق نہیں کہ تم بھی گورے چنے اور لمبے قد کے ہو اور حادثے کے دنوں میں گورکھپور میں ہی تھے“۔ میرے لئے اب خاموش رہنا محال تھا۔ میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ کرٹل صاحب اگر آپ کو مجھ پر شک ہے تو پھر پکڑو کیوں نہیں دیتے۔ کرٹل کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا ”مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ تم وہ گورے چنے اور لمبے آدمی نہیں ہو جس کا ذکر دونوں کارماکان نے کیا ہے۔ بھارت میں ایسی مشابہت تو ہزاروں لوگوں میں ہو سکتی ہے۔ میں نے تو محض مذاق ہی بات کی تھی۔ یہڈکڑا کرٹل میں اس حادثے کی جو رپورٹس آئی ہیں میں نے تو ان رپورٹس کی بنا پر تمہیں سب واقعہ بتایا ہے۔ ایئر فورس والوں نے تو اپنی نا اہلیت اور کمزوری کو کوئی چھپانے کیلئے اس حادثے کی خبر اور تفصیلات کو دبا دیا ہے تمہیں آگاہ کرنے کے لئے یہ تفصیلات تمہیں بتائی ہیں“ اس کے بعد کرٹل نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ جب دو گھنٹے بعد میں نے کرٹل سے اجازت چاہی تو اس نے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور مسکراتے ہوئے پھر سرگوشی میں کہا ”میں نے تو یہ باتیں تمہیں اس لئے بتائی ہیں کہ تمہیں حادثے میں ہونے والے نقصان کا پورا اندازہ ہو جائے“۔ کرٹل نے اپنا چہرہ میرے کان کے قریب کرتے ہوئے پھر سرگوشی میں کہا ”آئندہ کبھی گورکھپور نہ جانا۔ میں کرٹل سے رخصت لے کر واپس ہوٹل آ گیا۔ میرے دل و دماغ میں مچی ہچکل میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اسی باعث میں ساری رات سو نہ سکا۔ کرٹل کی باتوں نے مجھے بالکل Abnormal کر دیا تھا۔

اگلادین جمعہ تھا۔ مقررہ وقت میں ڈاک کا پیکٹ لے کر پہلے والے کوریئیر سے ملنے چلا گیا۔ میں بھی مسلح تھا اور میرا ایک ساتھی بھی مجھے کوڈ دینے کے لئے ہمراہ تھا۔ کرٹل شکر سے حاصل شدہ معلومات بھی میں نے ڈاک میں شامل کر دی تھیں۔ مقررہ جگہ پر کوریئیر ملا اور ہم نے اپنے پیکیوں کا تبادلہ کیا۔ ٹرینگ کے دوران دی گئی ہدایات کے مطابق میں نے آئندہ ڈاک کے تبادلے کے لئے نئی جگہ نیا وقت اور نئی تاریخ کا تعین کیا۔ جس کا اصولی طور پر علم صرف مجھے اور کوریئیر کو ہوتا تھا میں نے اسے یہ بھی کہا کہ مجھ سے ملاقات کے وقت وہ خود آکھلا آئے، اپنے کسی ساتھی کو ہمراہ ہرگز نہ لائے۔ اس کوریئیر کو چونکہ میرے ساتھیوں کے متعلق کچھ علم نہ تھا لہذا میں نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ صرف میں ڈاک کے تبادلے کے لئے جاؤں گا اور میرا ایک ساتھی کوریئیر کی نظروں میں آئے بغیر مجھے کوڈ دے گا اور ہر بار مختلف ساتھی میرے ہمراہ جائے گا۔ میں نے ساتھیوں کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اگر اچانک لاہور والے کوریئیر کو دیکھیں تو اس کی نظروں میں آئے بغیر ہم ہوجائیں۔ کیونکہ وہ ٹرانسمیر صحیح کے مطابق بھارتی حراست میں ہے۔

غازی

کرل ٹنکر سے گورکھپور کے متعلق ہونے والی گفتگو سے جہاں مجھے ہوائی اڈے کی تباہی کی تفصیلات ملی تھیں وہاں اس نے Between the lines مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس میٹروں کے مالکان کی شناخت کے مطابق ایک لمبے قد اور سفید رنگ والے کی تلاش میں تھی۔ یہ یقینی امر تھا کہ گاڑیاں جلا کر حادثے کے ذمہ دار لوگ فیض آباد میں ہی نہیں رہ گئے تھے بلکہ وہ ٹرین کے ذریعے یا تو گورکھپور سے ہوتے ہوئے مظفر پور کی طرف گئے ہیں یا لکھنؤ کی طرف یہ تعین کرنے کے بعد مظفر پور کی طرف جانے والوں کی منزل نیپال ہو سکتی تھی دوسری طرف لکھنؤ جانے والے لاکھ پور اور پھر وہاں سے بھارت کے کسی بھی حصے میں جا سکتے تھے۔ اگرگزشتہ ڈیڑھ سال کے دھماکوں کو پیش نظر رکھ کر وہ تفتیش کو آگے بڑھاتے تو دہلی میں نیو ایئر ٹائم ایئر پورٹ اور 26 جنوری کے دھماکوں کی وجہ سے اپنی تفتیش میں وہ دہلی کو مرکزی حیثیت دے سکتے تھے۔ کرل ٹنکر کا مجھے آئندہ متاثر رہنے اور گورکھپور نہ جانے کا شعور دینا بھی اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ انٹیلی جنس والے پوری تہذیب سے ہمارا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسری طرف پاکستان سے موصولہ ٹرانسمیٹر پیغام میں پرانے کوریئر کے ذریعے پرانے رستے سے ڈاک بھیجنے کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے، لاہور ہارڈ سے آنے والے کوریئر یا اس کے ساتھیوں کے پکڑے جانے کی اطلاع اور خصوصی طور پر لاہور کوریئر کو دیکھتے ہی غائب ہو جانے کی ہدایت کا واضح مطلب تھا کہ لاہور والا کوریئر بھارتی ہارڈ کے اندر پکڑا جا چکا ہے۔ دہلی میں اس کی موجودگی کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا کہ اس نے بھارتی تفتیشی اداروں کے تشدد کی وجہ سے سب کچھ بیک دیا ہے اور وہ تفتیشی ادارے کے کارکنوں کے زرنے میں نہیں دہلی میں تلاش کر رہا ہے۔ ان سب حالات کے پیش نظر میں نے فیصلہ کیا کہ سوائے ٹرانسمیٹر، ہینڈ لوں، گولیوں اور کیمروں کے اپنا اور ساتھیوں کے پاس موجود مناسب سامان جس سے ہماری شناخت ہونی ممکن تھی، عارف کے گھر منتقل کر دیا جائے۔ جمعہ کے روز میں نے ڈاک وصول کی تھی تو اس کے روزیہ کام کر دیا۔ عارف سے چونکہ ہمارا ظاہری کوئی تعلق نہ تھا (نڈر کے گھر میرے ساتھی رہتے تھے) اس لئے اس کا گھر موجودہ حالات میں محفوظ ترین تھا۔ عارف کے گھر رکھے گئے سامان میں بشیر مرحوم کی سیف سے لے کر یو اور، ہینڈ لوں اور گولیوں کے علاوہ ہم نے ہوں سے ہجر اسٹوٹ کیس بھی اس کے گھر منتقل کر دیا۔

میں نے دہلی میں اپنی اور ساتھیوں کی سکونت تبدیل کرنے کے متعلق بھی سوچا لیکن ٹی جگہ ہمارے لئے زیادہ غیر محفوظ تھی۔ موجودہ جگہوں پر رہتے ہوئے ہمیں دو سال ہونے کو آئے تھے۔ ساتھیوں کے محلے دار بھی انہیں کاروبار ہی سمجھتے تھے اور ان کی ایسی کوئی Activity محلے داروں کی نظر میں نہ تھی جو انہیں مشکوک بنا سکتی۔ مالک مکان نڈر اور عارف بھی ان کی صفائی دینے کو موجود تھے۔ اھر لودھی ہوٹل میں میرا طویل قیام میرے حق میں جاتا تھا۔ ہوٹل کا تمام اسٹاف مجھے جانے کے لیے پارٹی کی حیثیت سے جانتا تھا اور اس کی گواہی دے سکتا تھا۔ اسی ہوٹل میں میرے متعلق پوچھ گچھ کے لئے DMI والے ایک بار آچکے تھے اور انہوں نے بھی مجھے Clear کر دیا تھا۔ لہذا سکونت تبدیل کرنے کا خیال میں نے دل سے نکال دیا۔ ساتھیوں کو میں نے موجودہ حالات کی نوعیت اور ممکنہ روپوش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا اور انہیں Red Alert پوزیشن میں رہنے کا کہا جو ڈو کرائے کے ماہر ساتھی کو میں نے لودھی ہوٹل میں اپنے فلور پر ایک کمرے میں شفٹ کر لیا تاکہ کسی ناگہانی صورت میں وہ مجھے کو بھیج دے سکے اور ساتھیوں کو بھیجتا سکے۔ اب ہمارے پاس صرف اسلحہ اور ٹرانسمیٹر تھے ہم نے بہر صورت اپنے پاس رکھنا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو یہ بھی کہہ دیا کہ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ انہیں اپنی گرفتاری یقینی دکھائی دے تو Sitting Duck کی طرح بغیر مزاحمت کے گرفتاری ہرگز نہ دیں بلکہ اسلحے کا بے دریغ استعمال کریں۔ گرفتاری کی صورت میں ہر تشدد تو لازمی مفقود تھی اس لئے دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائیں، میں نے انہیں کہا کہ بے شک دشمن کے چند رہے ہیں افراد گرفتار کرنے آئے ہیں لیکن صرف تنخواہ کے لئے ملازمت کرنے والے ایک دو گولیاں چلتے ہی جا میں بچانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہندو فطر تا ڈرپوک ہیں لہذا اسلحے کا استعمال انہیں بھگانے اور خود غائب ہو جانے میں بہت مدد دے گا۔

ہمارے پاس اب نہ کوئی مخصوص مشن باقی تھا اور نہ ہی پاکستان سے ہمیں کوئی نئی ہدایت موصول ہوئی تھی۔ حالات کے پیش نظر ہم بھی چاہتے تھے کہ کچھ وقت بالکل خاموشی سے گزارا جائے۔ ہماری سرگرمیاں اب صرف ڈاک وصول کرنے، بھیجنے اور مقررہ وقت پر ٹرانسمیٹر پر پیغام وصول کرنے تک محدود تھیں۔ میرے ساتھی ہر روز ماسوا اتواری شام بشیر مرحوم کے گریج جاتے اور لڑکوں کو تربیت دیتے موسم گرما شروع ہو کر اپنے جوتوں تک آچکا تھا مئی 74ء میں بھارت نے راجستھان میں پوکھران کے مقام پر زمین دوزی ایٹمی دھماکا کیا بھارت کے اس ایٹمی دھماکے کو دنیا بھر میں کوریج ملی۔ بھارتی اخبارات نے تو اس دھماکے کی خبروں کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھارتی نیوکلیری ہتھیار کی وجہ سے باقاعدہ ڈرانا اور اپنے تنظیم بھارت میں ضم ہو جانے کی دھمکی آمیز ترغیبات دینی شروع کر دیں اور یہ سلسلہ ہفتوں جاری رہا۔ میں اور میرے ساتھی بھی بھارتی ایٹمی دھماکے کی وجہ سے پشمرہ ہو گئے۔ ایک روز جب ہم سب اکٹھے بیٹھے تھے، ہماری گفتگو کا رخ اس ایٹمی دھماکے کی طرف ہو گیا۔ میں نے ساتھیوں کو کہا کہ بھارت ایک چھوڑ دیں دھماکے کرے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پاکستانی سائنسدان بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں ہوں گے۔ ماضی کی تاریخ کے اوراق ہمیں بتاتے ہیں کہ برصغیر میں تیز و تند ہوائیں ہمیشہ مغرب سے ہی آتی ہیں۔ ہزاروں برس قبل اس علاقے میں آریں سے لیکر سفید بن، سکندر اعظم، لودھی، سلجوقی، تغلق غزنوی، خاندان غلاماں، مثل اور احمد شاہ ابدالی تک سب مغرب سے ہی آئے اور اس علاقے کا تیا بنا پتھر کرتے رہے۔ ہم بھارت کے مغرب میں ہیں اور انشا ء اللہ ماضی کی روایات کو برقرار رکھیں گے۔ میرے ساتھی بھی لڑکوں کو گریج میں اسی طرح دلاسا دیتے تھے۔ حالات بالکل ایک پرسکون سمندر کی طرح تھے لیکن میری چٹھی اس کہہ رہی تھی کہ اس پرسکون سمندر کے پیچھے ایک بڑے طوفان کی آمد ہے اور یہی ہوا۔

شیر شکاریوں کے زغم میں

یہ 6 جون 74ء اور ڈاک لینے اور دینے کا دن تھا۔ کیریئر سے اس بار میں نے آصف علی روڈ پر ایک جوس کی دکان پر سہ پہر چار بجے ملنے کا طے کیا تھا۔ جو ڈو کرائے کے ماہر میرے ساتھی کو مجھے کور دینے کے لئے ساتھ جانا تھا ہماری ڈاک کا پیکٹ بھی اس کے پاس تھا۔ ہم آصف علی روڈ پر پونے چار بجے ہی پہنچ گئے اور جوس کی دکان سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی چھوڑ دی۔ میں دکان کی طرف چلنے لگا۔ میرا ساتھی مجھ سے بیس پچیس قدم پیچھے تھا۔ ہم نے یہ طے کیا تھا کہ میں جوس کی دکان پر رک کر جوس کا آرڈر دوں گا۔ اس دوران میرا ساتھی میرے پاس سے گزرتے ہوئے ڈاک کا پیکٹ خاموشی سے مجھے تمھارا کر کے بڑھ جانے کا اور بیس کلومیٹر کے فاصلے سے مجھے کور دے گا۔ میں جوس کی دکان پر پہنچا اور ابھی جوس کا آرڈر دے ہی رہا تھا کہ آنا نا نا چاروں طرف سے چند رہے سے زیادہ افراد مجھ پر چھپٹ پڑے۔ نہایت تیزی سے انہوں نے میرے ہاتھ میری پشت پر باندھے اور آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی۔ مجھے ایک گاڑی میں دھکیل کر دوا در میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے، اور گاڑی تیزی سے چل پڑی یہ سارا عمل ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہو گیا۔ مجھے تو سمجھنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ تھینا میرا ساتھی بھی اس چاکا اور غیر متوقع حملے سے بوکھلا گیا ہوگا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے کور دے سکے گاڑی مجھے لے کر جا چکی ہوگی۔ اس کے پاس ڈاک کا پیکٹ بھی تھا جس کا تحفظ اس کی ذمہ داری تھی۔ اس واقعے کی اپنے باقی ساتھیوں کو اطلاع بھی اس نے دینی تھی۔ یہ صرف میرے اندازے تھے جو گاڑی میں سفر کے دوران میں نے لگائے۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ میرے ساتھی کو بھی اسی وقت گرفتار کر لیا گیا ہو۔ گرفتاری کے وقت تو میں ان کے زغم میں تھا اور فوری طور پر میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور مجھے کچھ علم نہ تھا کہ میرے ساتھی کی کیا پوزیشن تھی۔ گاڑی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک چلتی رہی اور اس دوران درجنوں سوڑ کالے گئے کئی بار گاڑی چند لمحوں کے لئے رکی۔ یہ غالباً روڈ سنٹل پر سرخ تپتی ہونے کی وجہ تھی میں نے گاڑی میں اپنی دونوں طرف بیٹھے لوگوں سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے غالباً انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے میں اس بلا وجہ گرفتاری اور سڑک سے یوں اٹھانے جانے کی تذلیل کے خلاف ہائی کورٹ جاؤں گا میں ایک معزز کاروباری شخص ہوں میرے ساتھ بلا وجہ کا یہ سلوک انہیں بہت مہنگا پڑے گا ان دونوں نے جواب میں ایک لفظ تک نہ کہا جب میں خاموش نہ ہوا تو اگلی سیٹ سے آواز آئی کہ اسے چپ کر اور ان دونوں نے میرے منہ میں پتھر اٹھوس دیا۔ میری اس انداز سے گرفتاری اور تفتیش آمیز سلوک تھینا پولیس کی کارروائی تھی اور نہ پٹی بندھنے تک میں نے کسی باوردی شخص کو وہاں دیکھا تھا۔ مجھے گھیرے میں لینے والے سوبیلین لباس میں تھے۔ جوس کی دکان پر میرے بیٹھے ہی ان کی فوری کارروائی کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ انہیں میرے جوس کی دکان پر بیٹھنے کے دن اور وقت کے علاوہ شناخت کا بھی پہلے سے علم تھا۔ کوریئر سے ہملاقات پر آئندہ ملنے کا دن، وقت اور نئی جگہ کا تعین بھی کرتا تھا۔ جس کا علم میرے اور کوریئر کے سوا کسی کو نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ میرے ساتھی اور مجھے کور دینے والے کو بھی یہ علم نہ ہوتا تھا کہ مجھے کہاں اور کس وقت کوریئر سے ملنا ہے۔ مجھے سو فیصد یقین ہو چکا تھا کہ کوریئر نے ہی انہیں بتایا ہے۔ کوریئر چار بجے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ میں جوس کی دکان پر چار بجتے کے دو تین منٹ بعد پہنچا تھا جہاں ہم نے ٹیکسی چھوڑی تھی۔ وہاں سے بھی جوس کی دکان صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس وقت بھی کوریئر وہاں موجود تھا۔ ان وجوہات کی روشنی میں صرف کوریئر ہی دکھائی دیتا تھا جس نے میری ہتھیاری تھی اگر پکڑے جانے والوں کو اپنی تفتیش سے میرے متعلق پتہ چلا ہوتا تو مجھے گرفتار کرنے کے لئے لودھی ہوٹل بہترین جگہ تھی جہاں میں پیشتر وقت موجود رہتا تھا۔

میرے منہ میں پتھر اٹھنا ہوا تھا۔ آنکھوں پر اس بری طرح اور سختی سے پٹی باندھی گئی تھی کہ کچھ دکھائی دینا تو ایک طرف رہا، میں آنکھوں کے پونے بھی نہ ہلا سکتا تھا۔ ہاتھ پشت پر ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر اس طرح باندھے گئے تھے کہ کلائیوں میں ٹینس اٹھ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ گاڑی کی اوسط رفتار تیس بیس تیس میل تھی اس حساب سے تقریباً پچاس میل چلنے کے بعد جب گاڑی رکی اور مجھے بازوؤں سے کھینچ کر اتار لیا گیا تو میں نے اندازہ لگایا کہ ہم دہلی میں ہی ہیں اور لمبا سفر سڑکوں پر ادھر ادھر گھومنے کی وجہ سے مجھے منزل کی قیاس آرائی سے دور رکھنے کے لئے کیا گیا ہے۔ گاڑی سے اتار کر وہ مجھے بازوؤں سے پکڑ کر تقریباً 40 قدم دھکیلتے ہوئے لے گئے اور پھر 25 میٹر تھینا اتار کر میرے اندازے کے مطابق لوہے کا دروازہ کھول کر مجھے اندر لے گئے۔ وہاں میری تلاش ملی گئی۔ میرے پاس بھرا ہوا ہینڈ لوں اور ایک فالٹو میٹرز تھی۔ ہینڈ لوں کے بعد تو انہوں نے اس بری طرح سے دوبارہ میری تلاش کی کہ میری ہینڈ کے ٹرن اور ٹینس دیکھنے کے لئے میری ہینڈ اتار لی گئی۔ بش شرت کے کار پہلے اچھی طرح ٹٹولے اور پھر بش شرت بھی اترا والی۔ جو تے اور جراب بھی اتار لئے۔ میرے جسم پر صرف انڈر ویئر اور بلیز باقی رہ گئے۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے یہاں لانے والوں کا کوئی انسبر بھی ہوا موجود تھا جو انہیں اشاروں سے احکام دے رہا تھا۔ میری اس حالت میں مسلمان ہونے کی شناخت کی گئی۔ اسی حالت میں مجھے فرش پر بٹھا دیا گیا۔ مجھے کمرے میں کرسیاں یا میز رکھنے کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر اسی حالت میں گزری تھی کہ دو تین افراد نے میری ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ دو نے میرے بال اور سر کو پکڑ کر میرا چہرہ اوپر کیا۔ ایک نے میرے منہ سے پکڑا نکالا اور منہ کے اندر زبان اور تلوکے چچ لوہے یا لکڑی کا ایسا ٹکڑا بھنسا دیا جس سے میرا منہ کھل گیا۔ پھر کسی نے زبور کی قسم کے کسی آلے سے میرے ایک ایک دانت اور ڈاڑھ کو زور سے کھینچا۔ جب زبور سامیہڈ بھری نعلی ڈاڑھ پر آیا تو وہ ذرا سے جھلکے سے ہی باہر آئی گئی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں D.M.I (Directorate Military Intelligence) کی حراست میں ہوں۔ اس کے تھوڑی دیر بعد کرسیاں اٹھانے کی آواز آئی۔ پھر میرے دونوں پاؤں زنجیر میں لگے لڑوں میں علیحدہ علیحدہ جکڑ دیئے گئے۔ اس کے بعد ہاتھوں کی بندھی رسی کھولی گئی اور دونوں کلائیوں بھی زنجیر میں لگے۔ ہتھکڑی نمائروں میں علیحدہ علیحدہ جکڑ دیں گئیں۔ اس کے بعد ہاتھوں کی بندھی رسی کھولی گئی پٹی اتنی سختی سے باندھی گئی تھی کہ کچھ دیر تو مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ جب دیکھنے کے قابل ہوا تو وہاں صرف ایک شخص موجود تھا۔ میرے مانگنے پر اس نے پٹی کے ایک بیالے میں مجھے پانی دیا۔ میرے پاؤں میں پڑے کڑے جن زنجیروں سے بندھے تھے ان کے دوسرے سرے فرش پر کڑے ہوئے تھے اور میں ٹانگوں کو فولڈ (Fold) کر سکتا تھا۔ کلائیوں میں بندھے کڑے دیوار میں کڑی زنجیروں میں لگے ہوئے تھے اور ان میں صرف اتنی گنجائش تھی کہ میں دونوں ہاتھوں کو اپنی ناف تک لاسکتا تھا۔ اس آدی سے میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے صرف اتنا کہا کہ جو کچھ کہنا ہے وہ ہمارے افسران سے کہنا۔ میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ اگر سب کچھ سچ بتا دو گے تو تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔ ورنہ سچ بولانے کے ہمارے پاس ایسے طریقے ہیں کہ تم سچ بولنے پر مجبور ہو جاؤ گے لیکن اس وقت تک تمہارے جسم کی ہڈیاں ٹوٹ چکی ہوں گی اور تم زندگی بھر کے لئے معذور ہو چکے ہو گے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے ”نظر یقین“ کا نمونہ پیش کرتے ہوئے ایک زوردار ٹھٹھا میری دائیں ران پر مارا اور ہیل کا دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ ٹھٹھا گلتے سے مجھے درد تو بہت ہوتا تھا۔ میں نے ایک ہلکی سی آہ میں دبا لیا۔ یہ تو ابتداء عشق تھا۔ میرے ساتھ آئندہ جو کچھ ہونا تھا سامیہڈ کی ڈاڑھ نکل جانے کے بعد مجھے ان کے تشدد کی انتہا اور زبان نہ کھولنے کے لئے خود کو تیار کرنا تھا۔ میں نے Cell کا جائزہ لیا۔ یہ سیل اندازاً 16x12 فٹ کا تھا۔ اس کی چھت بہت اونچی تھی جہاں پر دمدم روشن والا بلب ٹنٹا رہا تھا۔ چھت کے بالکل قریب دیوار میں مضبوط سلاخوں والا ایک روشدان تھا۔ سیل کے دروازے پر لوہے کی پلٹ لگی ہوئی تھی اس پلٹ میں اوپر کی جانب 18 انچ مربع کا ایک کٹ تھا جسے دروازے کے باہر کی جانب لگی ایک پلٹ نے اس کٹ کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ کٹ باہر والوں کے اندر دیکھنے کے لئے بنایا گیا ہوگا۔ میرے دائیں جانب میرے بالکل قریب ہی ایک چھوٹا پانی کا مٹکا تھا جس تک میرا ہاتھ پہنچ سکتا تھا۔ خود کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے آغاش کا شہری کا شاعر یاد آیا۔

شیر	کس	حال	میں	ہے
لوہے	کے	جال	میں	ہے

انترو گیشن شروع ہونے سے پہلے مجھے کچھ فیصلے کرنے تھے۔ جوس کی دکان پر میری گرفتاری کا مطلب تھا کہ انہیں میری لودھی ہوٹل میں رہائش کا علم نہ تھا۔ لہذا لودھی ہوٹل کا نام نہیں لینا تھا۔ میرے ساتھیوں کے متعلق بھی انہیں کوئی علم نہ تھا۔ لہذا خود کو اکیلا ظاہر کرنا تھا۔ بھارت میں داخلے کی مدت کا تعین میرے لئے مشکل مرحلہ تھا۔ یہ کوریئر جس کے متعلق مجھے یقین تھا کہ اسی کی ہتھیاری کے باعث میں پکڑا گیا تھا، ہمارے بھارت میں داخلے کے بعد شروع سے ہی ڈاک لاتا اور لے جاتا تھا۔ صرف چند ماہ کے لئے لاہور کا راستہ اختیار کیا گیا تھا۔ اگر اس نے DMI والوں کو سب کچھ بتا دیا تھا تو پھر مجھے بھارت میں قیام کے ایک ایک روز کا حساب دینا تھا۔ بھارت میں انجام دیئے اپنے سارے مشنوں سے مجھے لاتعلق ظاہر کرنا لازمی تھا۔ ہمدردوں اور ساتھیوں کے نام بھی نہیں لینے تھے۔ کوریئر نے اس مرتبہ لائی ہوئی ڈاک بھی تھینا دشمنوں کے حوالے کر دی ہوگی۔ میں دعا مانگنے لگا کہ اس ڈاک میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو میرے ساتھیوں اور ہمارے لئے گئے مشنوں کو عریاں کر دے۔ میرے ساتھ آئندہ جو کچھ ہونا تھا اس کا مجھے پورا اندازہ تھا۔ میں نے حکمت عملی (Strategy) یہ بنائی کہ دوران تفتیش میں انہیں اپنا صحیح نام بتا دوں گا۔ میرے مسلمان ہونے کا تو وہ پہلے ہی اطمینان کر چکے تھے۔ تفتیش کے دوران میں انہیں پاکستان میں دوران تربیت بتانے لگے بھارتی افواج اور تھیلیوں کے متعلق اپنی معلومات بتاؤں گا۔ اس طرح پاکستان کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچانے بغیر میں تفتیش کا دورانیہ لمبا اور تشدد میں کمی کی کوشش کروں گا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ پاکستان کی دفاعی افواج کے متعلق میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں، بھارت آنے سے پہلے میں تربیل میں غیر ملکی ٹھیکیداروں (Tarbela joint venture) کے پاس بحیثیت P.R.O ملازم تھا۔ تربیت کے دوران مجھے صرف بھارت اور بھارتی افواج کے متعلق معلومات از بر کروائی گئی تھیں۔ میں نے یہ بھی طے کیا کہ میں دوران تفتیش ان سے تعاون کرتے ہوئے انہیں اپنے کسی فرضی Contact کو کورکڑوانے کیلئے دہلی میں مختلف مقامات پر لے جانے کی کوشش کروں گا کیونکہ اگر وہ مان گئے تو بے شک چاروں اطراف سے ان کے زرنے میں ہونے کے باعث وہ مجھے ہتھکڑی نہیں لگائیں گے اور اس طرح ممکن ہے کہ میرے بھاگنے کی کوئی سہیل بن جائے۔ اس طرح کے بہت سے خیالات میرے دماغ میں آتے رہے اور انہی خیالات میں غرق میری آنکھ لگ گئی۔

غازی

ما معلوم کیا وقت تھا جب میرے جسم پر ٹھوکریں مار کر مجھے جگا یا گیا۔ آنے والے چار بندے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے میری آنکھوں پر پٹی باندھی۔ پھر ہاتھوں کو کڑوں سے آزاد کر کے میری پشت پر سی سے باندھ دیئے۔ پھر پاؤں سے کڑے اتارے اور بازوؤں سے پکڑ کر سیل سے باہر لے گئے اور بیڑھیاں چڑھ کر بائیں جانب کو پھل دیئے۔ دس بارہ قدم چلنے کے بعد دائیں طرف مڑے اور چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ پہلے آنکھوں کی پٹی کھولی اور پھر ہاتھ کھول دیئے۔ انتہائی تیز روشنی کے ریفلیکٹور (Reflector) میں لگے بلب نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔ کئی بار آنکھیں کھولنے اور بند کرنے کے بعد مجھے ایک بڑے ٹیبل پر پڑے اسی لیمپ کے پیچھے کرسیوں پر بیٹھے تین اشخاص دھندلے دھندلے سے دکھائی دیئے۔ میں بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ آنکھیں جب کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے ادھر ادھر دیکھا یہ ایک بڑا کمرہ تھا جس میں دو پتھر پوری رفتار سے چل رہے تھے۔ مجھے لانے والے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر جا چکے تھے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی اور مجھے Assess کرنے کے بعد درمیان میں بیٹھا آدمی بولا "مسٹر۔ اب تک تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ تم ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہو۔ اس مصیبت سے تمہارے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن ہم تمہیں ایک موقع دینا چاہتے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو، ہمارے سوالات کا صحیح اور مکمل جواب دو اور اپنے عملی تعاون سے ہمیں یقین دلاؤ کہ تم دلی طور پر ہمارا ساتھ دو گے تو تم نہ صرف تشدد سے بچ جاؤ گے بلکہ ہم تمہیں آزاد کر دیں گے اور تمہیں خاطر خواہ انعام بھی دیا جائے گا۔ دوسری صورت میں، میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس سیل میں تمہیں رکھا گیا ہے۔ وہاں سے ہمارے لوگوں نے کئی لاشیں نکال کر جلا ڈالی ہیں۔ اگر اس سیل کو فوراً سے دیکھو تو وہاں تمہیں خون کے داغ بھی دکھائی دیں گے۔ یہ ان کا خون ہے جنہوں نے ہماری شرافت کی وجہ سے پہلے زبان نہیں کھولی لیکن جب ہم نے دوسرا طریقہ استعمال کیا تو انہوں نے سب کچھ بتا دیا لیکن اپنی حماقت کی وجہ سے ہماری شرافت کی پیشکش کو ٹھکر کر یا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے یا زندگی بھر کیلئے اپنا بچ ہو گئے۔ ہماری یہ عادت ہے کہ ہم پہلے شرافت کی زبان میں بات کرتے ہیں جس کی سمجھ میں یہ زبان نہ آئے اسے دوسری زبان میں سمجھا جاتا ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کون سی زبان سمجھتے ہو۔ میں نے یہ لمبی بات اس لئے کی ہے کہ تم شکل و صورت سے پڑھے لکھے لگتے ہو اور میں نہیں چاہتا کہ تم لاطینی میں مارے جاؤ۔" وہ خاموش ہوا تو اس کے ساتھ کرسی پر بیٹھا بیٹا ایک جوان شخص بولا Your game is over now show sportsmen and cooperate with us۔ spirit میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے اس کے لئے میں آپ کا مشکور ہوں۔ واقعی میری گیم اب ختم ہو چکی ہے اور میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے سوالات کے اطمینان بخش جواب دوں۔ اگر میں کسی بات کا جواب نہ دے سکوں تو اس کی وجہ آپ سے کچھ چھپانا نہیں بلکہ میری لاعلمی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ آپ مجھ سے سوالات پوچھنے کا سلسلہ شروع کریں، میری آپ سے دو درخواستیں ہیں۔ اول یہ کہ میرے کپڑے مجھے لوٹا دیئے جائیں اور دوسری درخواست یہ ہے کہ اپنے آدمیوں سے کہیں میرے ساتھ تو بہن آمیز اور ذلیل کرنے کا رویہ چھوڑ دیں۔ جسم پر لگے زخموں سے زیادہ دردناک لگے زخموں سے ہوتا ہے۔ میں آپ کی حراست میں ہوں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ میرے "تعاون" کرنے پر آمادگی کے بعد آپ کا میرے ساتھ کیسا رویہ ہوتا ہے۔ میں خاموش ہوا تو ان تینوں نے آپس میں کھسپ پھسکی۔ پھر درمیان والے نے گھٹنی بجائی۔ باہر سے ایک شخص اندر آیا اور درمیان والے نے اسے میرے کپڑے اور جو تلے لانے کے ساتھ ساتھ چائے لمکھٹ اور پانی لانے کا بھی کہا۔ سائیڈ پر بیٹھے آدمی نے لیپ کا سوئیچ بند کر کے کمرے میں لگے عام بلب جلا دیئے۔ درمیان والے نے کہا Now relax and prepare your self to answer the questions یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری تمام گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی۔ میں چونکہ اپنی گرفتاری اور پھر وہاں سے فرار ہونے کے درمیان عرصے کے کسی ایک لمحے کو بھی اب تک فراموش نہیں کر سکا اس لئے اس دوران پیش آنے والی واقعات اور سوال جواب کے مرحلوں کو اردو میں ڈھالنے کی پوری کوشش کے باوجود کچھ حصے انگریزی میں لکھنے پر مجبور ہوں تاکہ قارئین تک بالکل صحیح تاثر پہنچا سکیں۔

چند منٹوں میں ہی میرا لباس اور جو تھے مچھل گئے۔ جنہیں میں نے ان کی اجازت سے کمرے کے کونے میں جا کر پہن لیا۔ پھر پانی، چائے اور بسکٹ آگئے۔ انہوں نے مجھے میرا سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹریٹی لونا دیا۔ چائے پینے کے بعد بیچ والے نے جو بیٹھا ان کا سینئر تھا۔ سوالات کا سلسلہ شروع کیا (س) نام (ج) میں نے اپنا پتہ نام بتا دیا (س) مذہب (ج) مسلم (س) قومیت (ج) پاکستانی (س) کس ایجنسی کیلئے کام کرتے ہو؟ (ج) مجھے علم نہیں کیونکہ میں سو بیٹا ہوں اور مجھے یہ بتانا ہی نہیں گیا کہ میں کس کے لئے کام کرتا ہوں۔ (س) پاکستان سے رابطہ کا ذریعہ (ج) کوریئر جس نے آپ کو میرے متعلق خبری کی۔ (س) پہلے کیا کرتے تھے؟ (ج) تربیلہ میں PRO تھا (س) اس ادارے میں کیسے آئے؟ (ج) سقوط ڈھاکہ کے بعد جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ (س) کس کے ذریعے رابطہ ہوا؟ (ج) ایک کزنل دوست کے ذریعے (س) تربیت کہاں پائی؟ (ج) لاہور میں۔ (س) کس راستے سے بھارت میں داخل ہوئے؟ (ج) کوئی رستہ جس سے کوریئر آتا ہے۔ میرے اس جواب پر سینئر نے سخت آواز میں Name it کہا میں نے جواب دیا منڈی صادق گنج سے بھارت میں ہنومان گڑھ اسٹیشن تک۔ (س) یہاں کتنے عرصے سے ہو (ج) تقریباً دو سال سے۔ اس کی تصدیق آپ کوریئر سے بھی کر سکتے ہیں۔ (س) تمہیں کیسے معلوم ہے کہ تمہارا کوریئر ہماری حراست میں ہے؟ (ج) جہاں پر مجھے آج گرفتار کیا گیا اس جگہ، دن اور وقت کا علم صرف کوریئر کو ہی تھا۔ (س) رہائش کہاں ہے؟ (ج) علی گڑھ میں (س) اپنے محلے کے افسران کے نام بتاؤ۔ (ج) مجھے کسی کے نام کا علم نہیں حتیٰ کہ اپنے محلے کے نام سے بھی ناواقف ہوں۔ جنہوں نے تربیت دی تھی انہوں نے بھی اپنے صحیح نام نہیں بتائے آپ کی طرح وہاں بھی Compartmentation پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔

(س) ہمارے متعلق کیا جانتے ہو؟ (ج) مجھے یقین ہے کہ آپ DMI سے ہیں (س) یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟ (ج) میری گرفتاری جس منظم طریقے سے ہوئی، کوئی سو بیٹا محکمہ اتنی پھرتی نہیں دکھا سکتا۔ (س) تمہارا مشن کیا ہے؟ (ج) یہ سروے کرنا کہ بھارتی مسلمان پاکستان کے ساتھ کس حد تک دلی وابستگی رکھتے ہیں اور کتنے فیصد بھارتی غیر مسلم پاکستان کے ساتھ اس کے خواہاں ہیں۔ (س) تمہارے گروپ میں کتنے آدمی ہیں؟ (ج) میں اکیلا ہوں (س) تم جھوٹ کہہ رہے ہو (ج) اگر میرے ساتھ کچھ اور لوگ ہوتے تو میں لازماً آپ کو ان کے متعلق بتا دیتا۔ اس طرح تقیث کا بوجھ بٹ جاتا۔ (س) یہاں کے اخراجات کیسے پورے کرتے ہو؟ (ج) بھارت میں کن لوگوں سے تمہارے مراسم ہیں اور یہاں پر کون تمہیں مالی امداد دیتے ہیں؟ (ج) میرے اخراجات کیلئے روپے کوریئر کے ذریعے پاکستان سے آتے ہیں۔ بھارت میں مجھے کوئی مالی مدد نہیں دیتا۔

اس طرح کے بنیادی سوال مجھ سے 2 گھنٹے سے زیادہ پوچھے گئے اور میں ان کے گول مول جواب دیتا رہا۔ بھارتی افواج اور اسلحے کے متعلق ان کے پوچھنے پر میں نے کہا کہ مجھے ٹریڈنگ کے دوران جو کچھ بتایا گیا ہے۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتا اور جو کچھ بھارتی دفاعی افواج کے متعلق میری معلومات ہیں میں وہ سب آپ کو بتانے کو تیار ہوں۔ میرے ساتھ آج جو کچھ ہوا ہے اس سے میری دماغی حالت صحیح نہیں۔ مجھے لمبے عرصے کے لئے جیل سمجھنے یا ہلاک کرنے کے لئے آپ کے پاس میری بیانی کی ہوئی معلومات ہی کافی ہیں لیکن انہیں منور ریکارڈ کیا گیا ہے اور نہ ہی لکھا جا رہا ہے۔ میں نے آپ کو مکمل تعاون کا یقین دلایا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی تقیث کسی اور وقت کریں۔ میں تو آپ کی حراست میں ہوں میری سائنائیڈ ہماری دائرہ بھی آپ نے نکال لی ہے۔ مجھے وقت دین تاکہ میں ذہنی طور پر تامل ہو سکوں۔ اگر دوران تقیث کسی موقع پر بھی آپ نے محسوس کیا کہ میں آپ سے کچھ چھپا رہا ہوں تو آپ کے اختیار میں ہے کہ جیسا سلوک چاہیں آپ میرے ساتھ کر سکتے ہیں اور یہ حقیقت تھی کہ میں بہت زیادہ ذہنی دباؤ میں تھا اور سنھلنے کے لئے کچھ وقت چاہتا تھا۔ اب تک میں نے جو جواب دیئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ان کی کوئی حیثیت نہیں اور مجھ سے حقیقت اٹھوانے کے لئے وہ مجھ پر بے تحاشا تشدد کریں گے۔ میں چاہتا تھا کہ میں ذہنی طور پر تشدد سہنے کے لئے خود کو تیار کر لوں۔ ان کے سینئر نے میری باتیں سن کر کہا "جو کچھ تم نے بتلا ہے وہ صریحاً غلط اور جھوٹ ہے۔ ہم نے تمہیں موقع دیا لیکن تم نے یہ سمجھا کہ تمہارے سامنے دو احمق بیٹھے ہیں جو تمہاری ہر بات کو بچ مان لیں گے۔ اپنے دماغ سے اس خیال کو ہی جھٹک دو کہ تم ہم سے سچائی چھپا سکو گے۔ ہم تمہیں صرف ایک موقع اور دیتے ہیں اور تمہیں یہاں سے شفٹ کر کے اس سے بہتر جگہ بھیج رہے ہیں۔ تمہیں اتنا وقت بھی دیں گے کہ تم Mentally normal ہو سکو۔ تمہارا بیان بھی ہمارا ایک آدمی لکھتا جائے گا۔ آئندہ تقیث کے دوران اگر تم نے غلط بیانی کی یا کچھ چھپانے کی کوشش کی تو پھر تمہارے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا اس کے تم خود ذمہ دار ہو گے۔" یہ کہہ کر ان کے سینئر نے گھٹنی بجائی۔ دو آدمی اندر آگئے، سینئر نے انہیں مجھے باہر لے جانے کا کہا، وہ میری آنکھوں پر پٹی باندھنے لگے۔ سینئر نے انہیں روک دیا اور کہا کہ رات کے اندھیرے میں اسے کیا نظر آئے گا۔ اس کے ہاتھ بھی کھلے رہنے دو۔ تھوڑی دیر تک ایک بند گاڑی اسے آکر لے جائے گی۔ کمرے میں بھی اسے کلارا ہنہ دینا لیکن دو آدمی اس کی نگرانی کے لئے کمرے میں موجود ہیں۔ یہ ہدایت دے کر وہ اٹھائے میں نے اس سے کہا "سر میں آپ سے دوبارہ یقین دہانی چاہتا ہوں کہ آپ سے پھر پورا تعاون کے بدلے مجھے پرتشدد نہیں کیا جائے گا اور آپ کے اطمینان کے بعد مجھے رہائی مل جائے گی۔" سینئر نے کہا "تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں لکھ کر دوں"۔ ایک جونیئر بولا usla you got to believe Mr. you have no choice. یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ ان دو گاڑیوں نے مجھے پکڑا اور کمرے سے باہر لے آئے۔ وہاں دو اور گاڑیوں نے کھڑے تھے۔ یہ چاروں مجھے اسی زمین دوز کمرے میں لے آئے۔ دو گاڑیوں نے کمرے کے اندر کھڑے رہے اور دوسرے دو گاڑیوں نے زور کر لیاں لے کر آئے۔ مجھے فرش پر بیٹھ جانے کا کہہ کر وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں فرش پر لیٹ گیا۔ زمین دوز کمرہ اونچی چھت کی وجہ سے باہر کی نسبت خاصاً ٹھنڈا تھا۔ میں نے آئندہ پیش آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے خود کو تیار کرنا شروع کیا، اسی دوران میری آنکھ لگ گئی۔ کہتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ میں گوسولی کے قریب تھا لیکن ابھی سولی پر چڑھا نہ تھا۔

مجھے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی ہوگی کہ مجھ کو زور دیا گیا۔ کمرے میں اس وقت پہلے دو گاڑیوں کے علاوہ 4 اور آدمی موجود تھے۔ نئے افراد میں سے ایک نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے آئے۔ اس زمین دوز کمرے میں تو دن اور رات کی تیز ہوا ہی ناممکن تھا۔ آنکھوں پر پٹی باندھی ہونے کی وجہ سے کمرے سے باہر آ کر بھی وقت کا کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ مجھے وہ ایک طرف لے کر چلے اس بار میں نے قدم گننے شروع کئے۔ آٹا لیس قدم گئے تھے جن میں دو بیڑھیاں بھی شامل تھیں کہ وہ رک گئے اور دھکیل کر مجھے زمین پر ایک میٹر بلند (درمیان میں ایک پائیدان) ایک بیٹھ پڑھا دیا گیا۔ ٹیٹل کر میں نے اندازہ لگایا کہ یہ گاڑی تھی۔ دروازہ بند کرنے کی آواز آئی اور گاڑی چل پڑی۔ مختلف بیٹھوں پر دائیں بائیں مڑتے اندازاً ایک گھنٹہ بعد یہ گاڑی ایک جگہ رکی۔ مجھے گاڑی سے اتارا گیا۔ اترنے سے پہلے میرے سر پر ایک کپڑا ڈال دیا گیا۔ تیس سے زیادہ قدم چلنے کے بعد مجھے ایک قدم بیڑھی چڑھ کر چند قدم کے بعد ایک جگہ روکا گیا۔ سر کا کپڑا اور پٹی ہٹا دی گئی۔ یہ ایک 12x10 کا کمرہ تھا۔ جس میں ایک طرف ایک فولڈنگ بیڈ اور بستہ تھا۔ حالات کی طرح ایک مضبوط ساخوں والا دروازہ تھا۔ یہ دروازہ ایک چھوٹے پرآمدے میں کھلتا تھا۔ کمرے کی چوڑائی سے دونوں اطراف دو اونچی دیواریں برآمدے اور آگے تقریباً 15 فٹ دور تک گئی تھیں۔ جہاں سامنے کی ایک دیوار دونوں طرف سے ان سے ملی ہوئی تھی۔ دائیں جانب کی دیوار میں ایک لوہے کا دروازہ تھا۔ میں ابھی اچھی طرح سے ان دیواروں اور کمرے کو دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ چاروں گاڑیوں کے دروازے کھلے لگا لگا کر دیوار والے دروازے سے باہر چلے گئے اور اسے بھی باہر سے بند کرنے اور تالا لگانے کی میں نے آواز سنی۔ کمرے کی چھت میں ایک بلب لگا ہوا تھا۔ جس کا سوئیچ کمرے میں نہیں تھا۔ کمرے میں ایک طرف بغیر دروازے کا ایک ٹوائلٹ کمرے کے باہر کی جانب بنا ہوا تھا۔ جس میں دیسی طرز کا فرش، لوٹا اور ایک ٹوٹی پانی کی تھی۔ ٹوائلٹ میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہ تھا۔ کمرے میں ایک جانب پانی سے ہمراہ ایک اور پلاسٹک کا گلاس تھا۔ پیلنگ کے بالمقابل فرش میں جزی لوہے کی ایک ٹیبل اور دیوار میں جزی زنجیر سے باندھی لوہے کی ایک کرسی تھی۔ جسے بمشکل چند اونچ چاروں جانب سرکایا جا سکتا تھا۔ چھت پر لگا بلب کمرے کے آخری کونے میں تھا اور ایک چھت کا پکٹھا کمرے کے درمیان میں بہت اونچا چھت سے چھوٹا ہوا لگا تھا۔ جسے بیڈ ٹیبل پر چڑھ کر بھی چھوٹا نہ جا سکتا تھا اس کو کھلے کا سوئیچ بھی کمرے میں نہ تھا۔ چار دیواریں کی دیواریں اتنی بلند تھیں کہ باہر کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ برآمدے کی وجہ سے جب تک فرش پر انتہائی جھک کر نہ دیکھا جائے۔ آسمان بھی نظر نہ آتا تھا۔ یہ تھی میری VVIP رہائش گاہ جو "تعاون" کیلئے رضامند ہونے کے باعث مجھے دی گئی تھی۔ میں بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ کمرے کے لئے کھانا آ گیا۔ کھانا لانے والے کے ساتھ دو رائل برادر گارڈز تھے۔ کمرے کا دروازہ کھولنے وقت دونوں نے ریفلیکس میری طرف تان لیں، کھانا میز پر رکھ کر وہ واپس چلے گئے۔ کھانے میں تین چائیاں اور وال تھی۔ یہ دوپہر کا کھانا تھا۔ روشنی سے میں نے اندازہ کیا کہ دن کے بارہ یا ایک بجے ہوں گے۔ دھوپ کی تیز تاب سے یہ کمرہ آگ، ہو رہا تھا اور پتھکے کی ہوا اس میں اضافہ کر رہی تھی۔ میں صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ میں نے تقیث کے دوران جو کچھ کہا تھا، اس پر کتنا عرصہ قائم رہ سکوں گا۔ چائے کے کاروبار اور بہن میں سکونت کی جو Cover story پاکستان سے رو آئی ہے۔ میں میرے سینئر نے میرے لئے تیار کی تھی وہ عام حالات اور محض شک کی بنا پر پوچھ گچھ کیلئے ہی سوزوں تھی لیکن اپنے ہی آدمی (کوریئر) کی غداری کی وجہ سے گرفتار ہونے کی صورت میں میرے پاس اپنے چھوٹے اور بڑے Cover story کو اپنی راستہ نہ تھا۔ یہاں پر میں واقعات کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے دو تین باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں جن کا علم مجھے بہت بعد میں باپھر پاکستان واپس پہنچنے پر ہوا۔

کوریئر کی غداری پر میرا یقین محض شک کی بنیاد پر نہ تھا۔ جس کی دکان پر ملنے کے دن اور وقت کا صرف مجھے اور کوریئر کو ہی علم تھا۔ مقررہ وقت پر میرے وہاں پہنچنے ہی چاروں اطراف سے مجھ پر DMI کے آدمی اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے انہیں میرے متعلق مکمل طور پر پہلے ہی بریف کیا جا چکا ہو۔ نومان گڑھ کے راستے سے آنے والا کوریئر مجھے ملنے کے دن سے دو رات قبل ہارڈ رکر اس کرتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہارڈ رکر اس کرنے کے بعد فوری طور پر اسے بھارتی ہارڈ ریسکوری فورس نے گرفتار کر لیا ہو اور تقیث اور تشدد کو برداشت نہ کرتے ہوئے اس نے میرے متعلق سب کچھ اگل دیا ہو۔ پاکستان واپس پہنچنے پر مجھے بتایا گیا کہ کوریئر کو ایسی صورت درپیش آنے پر یہ بتانے کی ہدایت کی گئی تھی کہ وہ دہلی میں کبھی جگہ کا نام بتادے جہاں پر مقررہ وقت پر اسے ڈاک کا پیکٹ رکھ دینا اور پاکستان جانے والی ڈاک کا پیکٹ اٹھانا ہوتا تھا۔ پیکٹ وصول کرنے والے کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اگر اسے ایسی ہی صورت پیش آتی تھی تو اس نے دی گئی ہدایت کو نظر انداز کر کے پٹر پٹر سب کچھ بتا دیا تھا۔ پاکستان واپس پر مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ اپنی روانگی سے آٹھ روز بعد واپس آیا اور سینئر کو یہ بتایا کہ ڈاک کا پیکٹ اس نے مجھ سے دیا تھا لیکن میں نے اسے ڈاک نہیں دی اور کہا کہ اگلی بار ملنے پر اسے پاکستان جانے والی ڈاک دی جائے گی۔ حالانکہ مجھے حکم تھا کہ بے شک کوئی ڈاک نہ ہو تو بھی پیکٹ ضرور بھیج دیا جائے کیونکہ پیکٹ کے اندر خصوصی طور پر تیار کردہ ایک واٹر پروف پیکٹ ہوتا تھا۔ کوریئر کو چونکہ بھارتی ہارڈ ریں B.R.B قسم کی نہر کو تیر کر عبور کرنا ہوتا تھا اس لئے یہ خصوصی واٹر پروف پیکٹ تیار کئے گئے تھے جنہیں پاکستان بھیجنا لازمی تھا۔ میرے ساتھیوں نے میری گرفتاری کے اگلے روز ہی میری گرفتاری اور جوڑو کرانے والے ساتھی کے مجھ سے روز پاکستان بھیجے جانے والی ڈاک کے بیچ جانے کی خبر پاکستان ٹرانسمیٹ کر دی تھی۔ لہذا کوریئر کو پاکستان میں داخل ہوتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے تین چار روز اپنے بچاؤ کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ہتھیار ڈال دیئے اور بتایا کہ اسے ہنومان گڑھ اسٹیشن پر گرفتار کیا گیا تھا۔ تشدد برداشت نہ کرتے ہوئے اس نے گھبراہٹ میں سب کچھ بتا دیا تھا لیکن اس بات کا وہ کوئی جواب نہ دے سکا کہ وہ بھارتی حراست سے کیوں نکلا، پاکستان آ کر اس نے اپنی گرفتاری کو کیوں چھپایا اور آئندہ ڈاک لے جانے کیلئے دن کا یقین کیوں کیا۔ اس کا مطلب ظاہر تھا کہ وہ Defector (غدار) ہے۔ ہماری قومی بدقسمتی ہے کہ آزادی کے حصول کے بعد بھی ہم نے اپنی نہر کیلئے مغربی ممالک کو ہی اپنا قبلہ بنا لیا۔ میں یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ محکمہ جاسوسی کی "اعلیٰ تربیت کے حصول کیلئے پاکستان اور بھارت دونوں ممالک کے افسران اسکاٹ لینڈ میں بھیجے جاتے تھے اور اکثر ایسا ہوا کہ بھارتی اور پاکستانی زیر تربیت افسران اکٹھے ایک ہی کلاس میں یہ تربیت حاصل کرتے۔ سائنائیڈ ہماری دائرہ انتہائی تشدد کو برداشت کر سکتے کی صورت میں چپا لینے کی تربیت دونوں ممالک نے اسکاٹ لینڈ یا ڈے سے ہی پائی تھی اور دونوں ممالک اس آخری اقدام سے بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میری گرفتاری کے بعد بدل (Cell) میں ملائی کے بعد سب سے پہلے میری دائرہوں کو پکھا گیا اور سائنائیڈ ہماری دائرہ نکال دی گئی۔ اب میرے پاس ما سوائے تشدد کی انتہا سے مرنے کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔

غازی

میں نے حالات کا تجزیہ کیا اور اپنے تجربے کی روشنی میں کچھ فیصلہ کئے۔ اس کٹھن گھڑی میں اللہ پاک سے التجا کی کہ مجھے اپنے فیصلوں پر قائم رہنے کی ہمت اور طاقت عطا کرے۔ میرا فیصلہ یہ تھا کہ اپنے ابتدائی بیان پر آخر دم تک قائم رہوں گا۔ کسی بھی حالت میں اپنے ساتھیوں، بلڑوں اور ہمدردوں کے نام انہیں ہرگز ہرگز نہ بتاؤں گا۔ نہ ہی بھارت میں سرانجام دینے گئے مشنوں کے متعلق کچھ بتاؤں گا اور نہ ہی ان سے اپنا تعلق ظاہر کروں گا۔ میں نے ابتدائی گفتیش میں اپنا صحیح نام اور اپنی ماضی کی ملازمت کے متعلق صحیح جواب اس لئے دیئے تھے کہ جینوا کنونشن کے تحت صرف باوردی دشمن کو جو برائے نام تحفظات ملتے تھے وہ بےوردی گرفتار شدگان پر لاگو نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی کوئی ملک اپنے بےوردی جاسوسوں کی گرفتاری کے بعد انہیں OWN کرتا ہے بلکہ وہ گرفتار شدگان سے قطعی لاطعائی ظاہر کرتے ہیں۔ صرف ایک مہم وہی امید ہوتی ہے کہ اگر نام پتہ وغیرہ صحیح دے دیا جائے تو پھر کسی تیسرے ملک کے توسط سے دونوں ملک ایسے قیدیوں کا تبادلہ کرتے ہیں۔ یہ امید محض دل کو بہلانے کیلئے ہے۔ ورنہ ایسے قیدیوں کی گرفتاری کی نکتہ نشین کی جاتی ہے اور نہ ہی انہیں زندہ یا اس قابل چھوڑا جاتا ہے کہ ان کا تبادلہ کیا جاسکے۔ سپر طاقتوں کا معاملہ دوسرا ہے۔ 65ء کی انڈیا پاک جنگ کے دوران کراچی میں ایک حملہ آور جہاز (HIT) کیا گیا۔ جسے دو روئی پائلٹ اڑا رہے تھے۔ دونوں پائلٹ پیرا شوٹ کے ذریعے بچاؤات اتر آئے۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا اور ریڈیو پر ان کی گرفتاری کی خبر بھی نشر کی گئی لیکن چوبیس گھنٹوں کے اندر ہی روسی سفارت خانہ انہیں سفارتی دباؤ سے چھڑوا کر لے گیا۔ 71ء کی جنگ کے دوران بھی انتہائی مستند ذرائع نے تصدیق کی تھی کہ روس کی بھارت کو دی ہوئی میزائل بوٹس کا عملہ روسی تھا۔ ان میزائل بوٹس نے ہی ہمارے بحری جنگی جہاز خیر کوشا نہ بنا تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس وقت کی سپر پاوروں سے ہم احتجاج تک نہ کر سکے۔

میرے فیصلے کا لب لباب یہ تھا کہ جب سر پر آن پڑی ہے تو پوری ہمت اور حوصلے سے اپنے ابتدائی موقف پر قائم رہنا ہے۔ اور گفتیش کاروں کو الجھانے اور ان کو ان کے ملک کی ہی وہ معلومات دے کر جو پاکستان کو ہمارے بھارت میں داخلے سے پہلے ہی مل کر اب OUT DATED ہو چکی تھیں، ان کی گفتیش کے رخ کو موڑنے (DIVERG) کی کوشش کرنی ہے۔ گفتیش کرنے والے بھی آخر انان اور خطاؤں سے مبرا نہ تھے۔ میں چاہتا تھا کہ نفسیاتی طور پر انہیں زیر کرنے کی کوشش کروں۔ اس کی مثال میں چند فقروں میں پیش کرتا ہوں۔ اگر کوئی اجنبی شخص آپ کے گھر میں گھس آئے آپ اسے پکڑ لیں اور گھر میں بلا اجازت داخل ہونے کی وجہ دریافت کریں اور جواب میں وہ آپ کو بتائے کہ آپ کے گھر میں تجوری (SAFE) کس کمرے میں الٹا الٹا کے پیچھے پوشیدہ ہے۔ صندوقوں میں بنیادی اشیاء کی تفصیل اور تالوں کی چابیاں کہاں رکھی ہیں اور آپ کے کتنے بچے ہیں اور کن کن اوقات میں کن کن اسکولوں میں جاتے ہیں۔ تو آپ یقیناً اس شخص سے پوچھ گچھ کو پس پشت ڈال کر اپنے گھر، اپنی قیمتی اشیاء اور اپنے بچوں کے تحفظ کے متعلق سوچنے لگ جائیں گے اور اس اجنبی شخص سے یہ جاننا چاہیں گے کہ آپ کے گھر اور افراد خانہ کے متعلق اور کن کن باتوں کا علم ہے۔ آپ کو اپنے اب تک کے تمام حفاظتی اقدام بے کار اور بے معنی دکھائی دیں گے اور آپ کی توجہ نئے حفاظتی اقدام اور قیمتی اشیاء کی جگہوں کی تبدیلی کی طرف مبذول ہو جائے گی۔ دو سال سے زیادہ عرصہ پہلے پاکستان میں دوران تربیت ہمیں پاکستانی افواج کے متعلق تو کچھ نہیں بتایا گیا تھا لیکن بھارتی افواج کے متعلق بھر پور اور مفصل تفصیلات بتائی گئی تھیں۔ میرے پروگرام میں تھا کہ میں گفتیش کے دوران یہ OUT-DATED معلومات آہستہ آہستہ گفتیش کرنے والوں کو بتاؤں گا اور ان کی توجہ ان کی اپنی دفاعی افواج، ان کے دفاعی پروگرام اور فوجوں کی DEPLOYMENT کا پاکستان کو علم ہونے کی طرف پھیر دوں گا۔ اس طرح میں تھمڑ ڈگری ٹارچر سے بھی بچ جاؤں گا اور ”تعاون“ کی پمپکنش کے پیش نظر وہ شاید مجھے اپنے کسی CONTACT کو پکڑوانے کے لئے بغیر پھنسنی کے شہر میں بھی لے جائیں جہاں سے میں فرار کی کوشش کروں گا اور شاید کامیاب بھی ہو جاؤں۔ میں صرف تشدد سے پہلے فرار کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ تشدد کے بعد تو میری جسمانی حالت ہی ایسی ہو جاتی تھی کہ بغیر نگرانوں کے وہ مجھے اگر دہلی کی کسی سڑک پر چھوڑ دیتے تو میں اسے کس بھی نہ کر سکتا۔ میں نے ذہنی طور پر خود کو تشدد برداشت کرنے اور زبان نہ کھولنے کے لئے بھی تیار کر لیا تھا۔ اس تیاری میں اپنے وطن اور اس کی مٹی سے محبت کے علاوہ میرے افراد خانہ اور خصوصاً اس وقت میرے اکلوتے بیٹے (جو میری روانگی کے وقت ایک سال کا بھی نہ تھا) کیلئے باپ کے نام کے ساتھ خدا کے شرمناک اضافے کے بجائے شہید کا باعث صدا سحر ام لفظ چھوڑنے کی خواہش بھی تھی۔

وہ دن بھی یونہی گزر گیا۔ رات ساتھ اٹھ بیٹے کے قریب تین چپا تپوں اور دال پر مشتمل کھانا بھی آگیا۔ کھانے کے بعد میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ آدھی رات کے قریب میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے اس سیل (CELL) سے نکالا گیا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ کتنے آدمی میرے ہمراہ تھے۔ CELL میں تو صرف دو داخل ہوئے تھے جنہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی تھی۔ قدموں کی چاب سے اندازہ ہوتا تھا کہ چھ سات بندے تھے۔ جن میں دو افراد کے جوتوں کی آواز فوجی بوٹوں کی تھی۔ مجھے تقریباً ڈیڑھ سو قدم چلایا گیا۔ چلنے کے دوران دوسرے مجھے روک کر تین چار مرتبہ لٹو کی طرح گھمایا گیا۔ یہ عمل یقیناً مجھے سمت اور فاصلے نہ کر سکنے کیلئے کیا گیا تھا۔ بالآخر مجھے ایک سیڑھی چڑھ کر روک دیا گیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ایک کرسی پر لے جا کر بٹھا دیا گیا اور آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ اب میرے سامنے ابتدائی گفتیشی ٹیم کے علاوہ ایک اور شخص بھی بیٹھا تھا اور ٹیبل کے دائیں جانب بھی ایک شخص بیٹھا تھا۔ میز پر اسپول (SPOOL) والا ٹیپ ریکارڈر تھا جس کا مائیک ٹیبل کے درمیان رکھا تھا۔ دائیں جانب بیٹھے شخص کے ہاتھ میں قلم اور سفید کانفڈ دھرے تھے۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد سامنے بیٹھے نے مجھے کرحت لکھے میں مخاطب کیا اور کہا کہ تم نے میری ٹیم کو جو بیان دیا ہے وہ شخص بکواس ہے۔ یہ ان کی غلطی تھی کہ تمہیں اسی وقت اپنی حقیقت لکھنے پر مجبور نہیں کیا۔ ہم دشمن کے جاسوسوں کی نازیر داریاں نہیں کرتے اور نہ اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے جب چاہیں، ہمیں جھوٹی سچی کہانی سنا دیں اور ہم اس پر یقین کر لیں۔ اب اپنے دماغ میں میری یہ بات اچھی طرح سے بٹھا لو کہ ہم صرف سچ سننا چاہتے ہیں اور اس بات کا فیصلہ میں کروں گا کہ تم سچ بول رہے ہو یا جھوٹ۔ اگر مجھے دوسرا سبھی شک پڑا کہ تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو تو اسی لئے تمہیں جھوٹ بولنے کی سزا ملے گی۔ یہ سزا ہماری شرارت کی لائن کے خاتمے کے ساتھ ہی جزی جزی ہوئی ہے اور تمہیں صرف ذہن نشین کرانے کے لئے ہے کہ تمہارے سامنے اسحق نہیں بیٹھے ہیں جنہیں تم بے وقوف بنا سکو۔ (NEVER THINK THAT YOU ARE SITTING INFRONT OF JUGGLERS AND CAN BEFOOL THEM) وہ تو میں نے کہا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جو کچھ پہلے بتایا ہے اور جو کچھ اب بتاؤں گا وہ بالکل سچ ہوگا۔ میری گرفتاری سے لے کر اب تک مجھے سوچنے کا خاصا موقع ملا ہے اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ آپ کی ٹیم کے ایک رکن نے مجھے کہا تھا کہ YOUR GAME IS OVER اور یہی حقیقت ہے اب میری اسی میں بھلائی ہے کہ میں آپ سے مکمل تعاون کروں۔ میری بات ختم ہونے پر اسی شخص نے ٹیپ ریکارڈر والے شخص کو اشارہ کیا۔ اس نے ریکارڈر آن کیا۔ اب تک مجھ سے مخاطب شخص نے جو یقیناً اس ٹیم کا لیڈر تھا مجھے کہا NOW START FROM THE BEGINING (اب ابتدا سے شروع ہو جاؤ) میں نے وہی باتیں دہرائی شروع کر دیں جو ٹیم کے ممبران کو پہلے بتا چکا تھا۔ جب میں نے یہ کہا کہ مجھے بھارت میں سروے کیلئے بھیجا گیا تھا تو لیڈر نے میری بات کا ٹی اور کہا کہ تم دو سال سے زیادہ عرصہ تک اس ملک میں صرف سروے کرتے رہے ہو۔ میرے ہاں کہنے پر لیڈر نے ہاتھ اٹھا کر دو انگلیوں سے اشارہ کیا اور فوراً ہی میرے سر پر دو بار انتہائی زوردار ضرب ماری گئی۔ مجھے ایسا لگا کہ میرا دماغ پھٹنے لگا ہے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو ایک ٹیم شخص ہاتھ میں لمبا چوڑا چنڑے کا تلہ لئے کھڑا تھا بالکل ویسا ہی جیسے پولیس والے جرم اگوانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ لیڈر نے کہا ”اب بتاؤ کس لئے آئے تھے“۔ میں نے پھر کہا سروے کے لئے لیڈر کے اشارے پر پھر میرے سر کو دو بار توتھ مشق بنایا گیا۔ پھر وہی سوال پوچھا گیا۔ میں نے پھر وہی جواب دیا اور پھر وہی میرے سر کی درگت بنی۔ میں نے بھی تیرہ کیا ہوا تھا کہ چاہے مارا کر میرے سر کو توڑ دیں میں اپنا بیان سچ بول رہا ہوں یا جھوٹ۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ دس گیارہ بار اس کے پوچھنے پر میں نے وہی جواب دیا اور ہر بار وہی سزا پائی۔ اس کے بعد میری آنکھوں میں دھند چھانے لگی۔ میرا دماغ بے جان ہو رہا تھا کچھ دیر میرے سر پر مسلسل ضرب پاشی کی گئی۔ سر پر مسلسل چوٹیں لگنے کا احساس کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔ میں شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو سورج خاصا بلند ہو چکا تھا۔ آنکھوں کی دھند آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی میں اسی سیل میں بیڈ پر پڑا تھا۔ میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو میرے منہ سے کراہ نکلی۔ میں بیڈ سے اٹھ نہ سکا۔ ابھی تک مجھے کچھ یاد نہ آیا تھا کہ میرے ساتھ کیا تھی۔ میرے کانوں سے شائیں شائیں کی مسلسل آواز آرہی تھی۔ رفتہ رفتہ دماغ کی دھند چھٹنے لگی۔ مجھے رات کا واقعہ یاد آگے لگا۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو درد سے میری چیخ نکل گئی۔ سر پر درمیان میں دو تین جگہ بڑے بڑے گومز پڑ چکے تھے جن سے ٹیسٹیں اٹھ رہی تھیں۔ چہرے پر ہاتھ پھیرا تو مجھے ہونے خون سے ہاتھ تھڑ گئے۔ چہرے پر کوئی زخم نہ تھا۔ یہ خون یقیناً نکیر پھوٹنے سے نکلا تھا۔ جب تک میں ہوش میں تھا تو نکیر نہ پھوٹی تھی۔ یقیناً میرے بے ہوش ہونے کے بعد بھی میرے سر پر ضربات پہنچائی گئی تھیں۔ میرے جسم کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا کہ ٹانگوں، رانوں، بازوؤں اور پیٹھ پر متعدد داسی جگہیں تھیں۔ جنہیں چھونے سے بھی درد کی شدید لہریں اٹھتی تھیں۔ یقیناً میری بے ہوشی کے بعد میرے جسم کو بھی توتھ مشق بنایا گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ذرا ڈاکھک کر میں پانی کے ٹمکے تک پہنچا اور پانی سے چہرے گردن اور ہاتھوں پر لگے خون کو صاف کیا اور ٹمکے کے نیم گرم پانی سے پیاس بجھائی اور پھر بیڈ پر دراز ہو گیا۔ چوٹیں ٹھنڈی ہونے کی وجہ سے زیادہ درد کر رہی تھیں۔ میری عمر 74ء میں 38 سال کے قریب تھی اور میں جوانی کے اس دور سے بہت زیادہ آگے نکل چکا تھا جس میں درد کا احساس نسبتاً کم ہوتا ہے۔ میں نیم غنودگی کی حالت میں بیڈ پر پڑا تھا۔ نہ معلوم کس وقت کھانا آیا جو میں نے نہ کھا یا۔ میں اسی حالت میں تھا کہ غروب آفتاب کے قریب کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک لکڑی کی کرسی کمرے میں رکھ دی گئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی ابتدائی گفتیشی ٹیم کا لیڈر کمرے میں آگیا۔ اس کے ساتھ دو کارڈر تھے۔ اس نے کھانے کے برتن واپس بھیجے اور چائے اور بسکٹ لانے کا کہا۔ ٹمکے میں سے پانی نکال کر اس نے مجھے اسپرو کی دو گولیاں کھانے کو دیں اور 8 گولیاں میرے سر ہانے رکھ دیں۔ آئیوڈکس کی ڈبیا مجھے دی کہ چوٹوں پر لگا لو۔ چائے آگئی تو اس نے مجھے چائے بنا کر دی بسکٹ کھانے کو دیئے۔ جب میں چائے پینے لگا تو اس نے سرگوشی میں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ تمہاری حالت پر ہم مذہب ہونے کی وجہ سے رحم آ رہا ہے۔ میرا تم کو بھی شوروہ ہے کہ مجھے سب کچھ بتا دو۔ میری ترقی ہو جائے گی اور تمہیں یہاں سے فرار کرانے کا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ یہ کم بخت جلد ہی دل کی بات کہہ کر اپنے ”مسلمان“ ہونے کا اظہار کر بیٹھا۔

یہ جاسوسی کے ملزمان کی گفتیش کا ایک باوقی طریقہ ہے۔ ایک گفتیشی ٹیم تشدد کرتی ہے۔ اور اسی ٹیم کا ایک فرد بعد میں ملزم سے تمنا ل کر اظہار ہمدردی کرتا ہے اور اسے مدد دینے اور فرار کرانے کا وعدہ کرتا ہے۔ جاسوسی کا ملزم یہ بخوبی جانتا ہے کہ اسے تو کبھی کسی عدالت میں پیش کیا جائے گا اور نہ اپنے کسی ہمدرد کے ذریعے کسی وکیل سے ملاقات کا موقع فراہم کیا جائے گا۔ تشدد کا آغاز بہت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ بعد میں تشدد سہتہ سہتہ جسم اس کا عادی اور حواس معطل ہونے کے باعث تشدد کی اذیت اور تکلیف کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ ہر طرف سے ناامیدی اور کسی قسم کی مدد ملنے سے مایوس ملزم کو جب گفتیشی ٹیم کا کوئی ممبر ہمدردی جتا تا ہے تو ملزم اسے ”اندانہ“ اور ڈوتے کو ٹمکے کا سہارا سمجھ کر اس کی چٹنی چڑی باتوں میں آکر اپنی سچ اصلیت اپنے تقویض کردہ مشن کے علاوہ مدد حاصل کرنے کے لئے اپنے ہمدردوں اور ساتھیوں کے متعلق سب کچھ اگل دیتا ہے۔ میں یہاں پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو شخص تشدد کے ابتدائی پانچ پھروہ زیر داشت کر جائے اور زبان نہ کھولے تو پھر انتہائی شدید تشدد سے بھی اس سے زبان کھلوانی نہیں جاسکتی۔ میجر احسن شہید جس کا ذکر پہلے میں کر چکا ہوں میرے جواز کی بہترین مثال ہے۔ گفتیشی ٹیم کے اس ممبر نے جو میرے لئے اسپرو اور آئیوڈکس لے کر آیا تھا اور چائے اور بسکٹ منگوانے کا ابھی اہتمام کیا تھا۔ اس پہلی ”ہمدردانہ“ ملاقات میں ہی مجھے فرار کرانے کیلئے اپنا سب سے بڑا کارڈ شوکر بیٹھا۔ اس نے اپنے ”مسلمان“ ہونے اور مجھے راز بتانے کے عوض اپنی ترقی پانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میں اس کی باتیں نہایت غور سے سنتا رہا اور ساتھ ہی آہستہ آہستہ چائے پی رہا تھا۔ اب مجھے اپنے پتے ترتیب دینے تھے۔ اس نے بات ختم کی تو میں نے کہا۔ ”اس دکھ اور مصیبت کی گھڑی میں ایک ہمدرد مسلمان کامل جانا میرے نعمت غیر متوقعہ سے کم نہیں۔ آپ کی ہمدردی نے مجھ میں گویا نئی روح پھونک دی ہے۔ مجھ سے اب تک گفتیش کے دوران جو کچھ پوچھا گیا، میں نے بتا دیا۔ مجھے اپنی طرف سے تو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ میرے پاس جو معلومات ہیں وہ بھارت کے لئے بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں نے تو پہلے ہی روز اپنی گرفتاری کے بعد ہتھیار ڈال دیئے تھے، میری سامینڈ بھری داڑھ نکل جانے کے بعد آخری امید بھی ختم ہو چکی تھی۔ اسلئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آپ سے پورا تعاون کروں گا۔ آپ مسلمان ہیں اور میری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ میں، آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سے نہ صرف انتہائی تعاون کروں گا بلکہ اگر میری بات مانی گئی تو 20 جون کو سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن پر ایک پاکستانی CONTACT کو بھی پکڑا دوں گا بشرطیکہ آپ نے میری گرفتاری کی خبر پریس اور ریڈیو میں نہ دے دی ہو اور 20 جون کو کسی وجہ سے نہ آسکا تو پھر 22 جون کو اسی جگہ اور اسی وقت وہ مجھے لے گا۔ میں تو آپ سے پورا تعاون کرنا چاہتا تھا لیکن میرا جو مشر کیا گیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری دی ہوئی معلومات اتنی اہم ہوں گی جس سے آپ کی ترقی یقینی امر ہو جائے گی۔

میرا یہ باتیں سن کر تو اس کی باجھیں کھل اٹھیں۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے سر پر مسلسل ضربیں لگنے سے میری دماغی حالت ایسی نہیں کہ میں آئندہ چوبیس گھنٹے تک بیان دے سکوں۔ میں آپ کی حراست میں ہوں تو وہی۔ اگر آپ نے مجھے دماغی طور پر سنبھلنے کا وقت دے دیا تو میں آپ کو مایوس نہ کروں گا۔ دوسری صورت میں نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صم ہی ہوا کہ مصداق موت مجھے سامنے دکھائی دے رہی ہے۔ میں پھر خدا کی کا لیبل خود پر کیوں لگواؤں“۔ اس نے میرا ہاتھ دبا یا اور بولا ”میری پوری کوشش ہوگی کہ تمہیں 24 گھنٹے آرام کا وقت مل جائے“۔ پھر ذرا قریب ہو کر بولا ”اگر تمہیں نماز پڑھنے والا کپڑا اور قرآن (اس کا تلفظ کرنا تھا) چاہئے تو میں بھجوائے دیتا ہوں“ میں نے کہا ”یو آپ کی بڑی کرم نوازی ہوگی۔ مجھے سگریٹ اور ماچس بھی چاہئے اگر ممکن ہو تو وہ بھی بھجوادے“۔ وہ سب چیزیں بھیجے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

درد کی شدت کے باوجود مجھے ہنسی آگئی۔ مجھ سے راز اگوانے کے لئے اس نے خود کو مسلمان تو ظاہر کیا تھا لیکن اسے لفظ جاپ نماز تک کا علم نہ تھا اور قرآن مجید فرقان مجید کو ادب کے الفاظ کے بغیر ”کران“ کہنے والا واقعی DMI کا ہی ”مسلمان“ ہو سکتا تھا۔ میں آئندہ گفتیش کیلئے خود کو تیار کرنے اور اس کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ رات کو خاصے بہتر کھانے کے ساتھ ہی ایک جاپ نماز ایک متر متر قرآن مجید اور سگریٹ کے دو پیکٹ اور ماچس مجھے بھیج دیئے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد میں نے وضو کیا اور عشا کی نماز پڑھی۔ میرے جیسے ہی بے عمل مسلمانوں کے متعلق اللہ پاک نے فرمایا ہے ”جب ہم ان کی کسی کو کھینچتے ہیں تو وہ لمبی لمبی دعائیں مانگتا شروع کر دیتے ہیں“ میں نے بھی نماز کے بعد اتنی شروع و خصوص سے دعائیں مانگی۔ جتنی زندگی بھر کبھی نہ مانگی تھیں۔ میری دعاؤں کا لب لباب یہ تھا کہ ”اے پروردگار! میرے گناہ بے حد و شمار ہیں لیکن میری رحمتیں بے پایاں ہیں تو رحمتوں سے، رحیم ہے، کریم ہے، بخشنے والا ہے، غنی ہے، ذوالجلال والا کریم ہے، سچ ہے، بصیر ہے، غفار ہے، ستار ہے، وکیل ہے، علیم ہے، علیم ہے، بے حد و حساب صفات کا مالک ہے۔ معاف کرنے والا ہے، ذرہ نواز ہے۔ اپنے حبیب کے صدمے اور اور اپنے پیاروں کے صدمے مجھ بے کس پر رحم فرما۔ میرے دانستہ اور نادانستہ گناہوں کو معاف کر۔ میری مدد فرما اور مجھ پر اپنا رحم کر، اپنا کرم کر، اپنا فضل کر“۔ یقین جانے دعائیں مانگنے کے بعد مجھے بڑا سکون ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اکیلا نہیں بلکہ ذات قادر مطلق میرے ساتھ ہے اور میری قسمت کا فیصلہ DMI والے نہیں بلکہ ذات باری تعالیٰ کرے گی۔

غازی

وہ رات میں نے بڑے سکون سے گزاری۔ اگلی صبح ناشتے میں چائے اور پوریاں ملیں۔ ناشتے کے بعد میں نے باضو کو تلاوت کلام پاک شروع کر دی۔ قرآن پاک اگرچہ مترجم تھا لیکن میں عربی تلاوت کے جا رہا تھا آج سے دو تین برس قبل ایک مشہور زمانہ عالم دین کا ایک قول پڑھا تھا کہ بائیس برس دین کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے اللہ کو پہچانا لیکن مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک کو مجھ سے زیادہ مقرب وہ ان پڑھ اور عربی سے لابلند گذریا ہے جو آیات قرآنی کا مطلب سمجھے بغیر انہیں بلک بلک کر اس یقین کے ساتھ پڑھتا ہے کہ وہ سچا کلام ہے۔

دن کا باقی حصہ میں نے آئندہ تفتیش کے دوران اپنے بیان اور ان 'معلومات' کو دہراتے ہوئے گزارا جن سے میں نے تفتیش کرنے والوں کو یقین دلانا تھا کہ میں فی الحقیقت ان سے تعاون کر رہا ہوں۔ یہاں میں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بھارت کے دفاع کے متعلق میں نے جو معلومات انہیں دیں۔ وہ دو سال اور چند ماہ قبل دوران تربیت مجھے پاکستان میں ازبر کرائی گئی تھیں۔

پاکستان واپسی پر میں نے جب اپنے مینٹرز سے پوچھا کہ وہ معلومات دشمن کو دینی کیا پاکستان کے مفاد میں کسی طرح بھی نقصان دہ تھیں تو انہوں نے پورے وثوق سے کہا کہ ہرگز نہیں کیونکہ وہ OUT DATED تھیں اور ایک طرح سے پاکستان کے مفاد میں تھیں کہ بھارتی افواج کو یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کے مختلف ڈویژن، بریگیڈ اور رجمنٹس کے متعلق پاکستان کو کتنا بھرپور علم ہے۔

تقریباً آدھی رات کو گارڈز مجھے لینے آگے اور پہلے کی طرح مجھے اتر و گیشن روم میں پہنچا دیا گیا۔ اس دفعہ ٹیم میں وہ مرکزی افسر نہ تھا جس کے حکم پر میرے سر پر نقد دیا گیا تھا۔ اس بار ٹیم کے ممبر انبساط شرافت سے پیش آئے۔ کسی ہی مختصر گفتگو اور مجھے سگریٹ دینے کے بعد ٹیپ ریکارڈ رآن کر دیا گیا۔ اس بار ٹیم کا سربراہ وہی تھا جو گزشتہ شام میرے CELL میں آیا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ شروع سے اپنے متعلق اور بھارت میں اپنے قیام کے متعلق تفصیلاً بتاؤ۔ میں نے رٹی رنائی وہی داستان شروع کر دی جو گزشتہ دو بار انہیں سنا چکا تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ گزشتہ دو سال سے تم بھارت میں صرف سروے کرنے پر ہی لگے ہو یا اس کے پس پردہ کوئی اور مقصد بھی ہے، میں نے جواب دیا کہ ان دو سالوں میں مجھے سروے کرنے اور بھارت میں لمبی مدت رہنے کیلئے خود کو ADJUST کرنے کی کوشش کرنے کا کہا گیا تھا۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ لمبی مدت کے لئے بھارت میں تمہارے قیام کرنے کی کیا وجہ تھیں بتائی گئی تھی، میرا جواب تھا کہ کھل کر تو کچھ نہیں بتایا گیا تھا لیکن ٹریڈنگ کے دوران بھارتی افواج کے متعلق مجھے جو کچھ بتایا گیا اس کا مطلب واضح تھا کہ اگر میری سروے رپورٹس سے وہ مطمئن ہو گئے تو پھر مجھے بھارتی افواج کی جاسوسی کام دیا جائے گا۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا پاکستان میں ایک جاسوس کو ٹریڈنگ دینے اور اس کی صلاحیتوں کو آزمانے کیلئے کئی سال لگ جاتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے اوروں کے متعلق تو کچھ علم نہیں کیونکہ COMPARTMENTATION پر نہایت سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ جیسے ملٹری میں SHORT SERVICE COMMISSION کے لئے صرف چھ ماہ کی ٹریڈنگ اور لمبی مدت کے لئے ڈھائی سال کی ٹریڈنگ ہوتی ہے۔ ویسے ہی میری ٹریڈنگ اور بھارت میں دو سال سے زیادہ قیام LONG SERVICE کے لئے تھا (س) بھارتی افواج کے متعلق تمہاری کیا معلومات ہیں؟ (ج) بھارت میں قیام کے دوران تو کچھ بھی نہیں لکھیں ٹریڈنگ کے دوران مجھے جو کچھ بتایا گیا تھا وہ بیان کر دیتا ہوں۔ میں نے یادداشت پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی کیونکہ کرتے ہوئے بھارتی فوج کے 15 افسر کی ڈویژنوں کے نشان، ان کے بریگیڈز کے نمبر اور کون کون سی رجمنٹس پر یہ بریگیڈز مشتمل تھے اور ان کے شناختی نشان بتانے شروع کئے۔ اگرچہ روشنی مدھم تھی لیکن میں صاف دیکھ رہا تھا کہ تفتیشی ٹیم بے اختیار رمنہ کولے خاموشی سے میری بات نہایت غور سے سن رہی تھی۔ پنکھوں کی اور میری آواز کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ THERE WAS PINDROP SILENCE میں بھارتی تفتیشی ٹیم کے آگے بھارت ہی کے OUT DATED راز کھول رہا تھا اور ہر بھارتی ڈویژن کی بات کہتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک ایک کر کے ان کے کپڑے اترتے جا رہے تھے، میں نے تقریباً دو گھنٹے افسر کی کے صرف 5 ڈویژنوں کے متعلق بتانے کے بعد پانسہ پڑایا، اور ٹیم کے سربراہ کو کہا کہ سر پر چوٹوں کی وجہ سے اب سردی سے پھلنے لگا ہے۔ ممبران نے آپس میں کس کس پر براہ بولا، کوئی بات نہیں۔ ہم تفتیش کل رات تک ملتوی کر دیتے ہیں۔ امید ہے کل بھی تم آج کی طرح ہی تعاون کا مظاہرہ کرو گے یہ کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی گا رڈز اندر آگئے۔ اس بار اس 'تعاون' کے صلے میں تفتیشی ٹیم کے تینوں ممبران نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور گارڈز کو مجھے واپس CELL میں لے جانے کا حکم دیا۔

Cell میں بستر پر لیٹے ہوئے میں یہ سوچنے لگا کہ دو سال سے زیادہ پرانی معلومات بیان کرنے پر ان کا جو رد عمل ہوا ہے اگر وہی رد عمل بھارتی افواج کے سربراہ کا ہو تو وہ اپنی ساری فوج کی پوزیشن تبدیل کرنے کا سوچنے لگ جائے گا اور اگر ایسا ہو جائے تو پاکستان کے حق میں بہتر ہوگا کیونکہ جب ایک جگہ Deployed فوج یا اس کا کچھ دفعہ Move کرتا ہے تو FIU والے بھی جن کی دشمن کے علاقے میں صرف چندہ میں میل کی ریش ہوتی ہے، وہ بھی سب کچھ معلوم کر لیتے ہیں جبکہ دشمن کے علاقے میں انتہائی اندر جا کر جاسوسی کرنے والوں کے لئے تو یہ بچوں کا کھیل ہوتا ہے جب کہ ایک جگہ پر Deployed فوج کے متعلق چھان بین زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ میں نے آج کی تفتیش خیریت سے ہو جانے پر شکرانے کے نفل ادا کئے۔ رات کا باقی حصہ سوئے جاگئے اور آئندہ شب کو تفتیش کا سامنا کرنے کی تیاری میں گزار گیا۔ آپ یقین چاہیے کہ گرفتاری کے بعد مجھے اپنے اہل خانہ کے ہولے بیسوں بارتیزی سے آنکھوں کے سامنے گزرتے دکھائی دیئے لیکن میں نے ان کے خیال کو ہر بار جھٹک دیا۔ انسان کی سب سے بڑی کمزوری اور اسکے پائے استقلال میں لرزش پیدا کرنے والے اس کے اہل خانہ اور ان کی یاد ہوتی ہے۔ اور میں قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ ایسی صورت حال میرے ساتھ بھی پیش آئے۔

انہی خیالوں میں رات کا بقیہ حصہ گزارا۔ اگلا دن کچھ وقت سوتے اور کچھ وقت آنے والی رات کی تیاری میں گزار گیا۔ میں جانتا تھا کہ ٹائم گین Time Gain کیلئے تفتیشی ٹیم کو جو معلومات دے رہا ہوں، ان کا جب تجزیہ کیا جائے گا تو تفتیشی ٹیم کی کارکردگی محض صفر ہوگی، کیونکہ وہ اپنی ہی فوج کے متعلق باتیں سننا نہیں چاہتے تھے اور وہ بھی اتنی پرانی بہر حال میں نے Standup لیا تھا مجھے توقع تھی کہ مجھے مزید چند روز ان کے تشدد سے بچنے کا موقع مل جائے گا۔ آدھی رات کو پھر مجھے تفتیشی کرنے میں پہنچا دیا گیا۔ کل والی تفتیشی ٹیم وہاں موجود تھی۔ سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو میں نے کہا کہ مجھے جو کچھ دوران تربیت بتایا گیا تھا اس کے مطابق بھارت کا فٹ آرمد ڈویژن جھاسی کے قریب Stationed ہے۔ اس آرمد ڈویژن کے علاوہ نمبر 10 انڈپینڈنٹ آرمرڈ بریگیڈ Independant Armoured Brigade جو بذات خود ایک ڈویژن کے برابر ہے اس میں او سی IPT76 اور فرانسیزیسی AMX-13 ٹینک ہیں جنہیں آپ نے 71ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان میں استعمال کیا تھا اور متوسط ڈھا کہ کے بعد انہیں آپ فاضل میکٹر میں لے آئے ہیں۔ لاہور میکٹر میں آپ نے Sikh light infantry کی رجمنٹس اور پنجاب رجمنٹس کو Deploy رکھا ہے۔ آپ کا 39 Mountain DIV جس کا ہیڈ کوارٹر پونا میں ہے اسے جوں کے نزدیک Move کر دیا ہے۔ جھاسی کے قلعے میں آپ کا بہت بڑا ایمونیشن ڈپو ہے۔ میں خاموش ہوا تو انہوں نے سوال کیا کہ ایئر فورس اور نیوی کے متعلق کیا جانتے ہو۔ میں نے کہا کہ آپ کے ایئر کرافٹ کیئر و کرانت پر Harrier اور کینبرا اہجاز ہیں۔ 65ء کی جنگ کے دوران پاکستانی آبدوز غازی نے آپ کے ایک فریگٹ بیس کو ڈوبو دیا تھا اور آپ نے اپنے ایک دوسرے فریگٹ پر بیس نام لکھ کر نیشنل اور انٹرنیشنل پریس کو اس نئے بیس فریگٹ پر عصر اند دیا اور یوں پاکستانی دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ کو کبھی میری باتیں تلخ لگی ہوں گی لیکن آپ نے مجھے کہا کہ جو کچھ بھی میرے علم میں ہے آپ کو بتا دوں اس لئے میں نے یہ باتیں آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔ میں نے تقریباً تین گھنٹے ان کے سوالات کے جوابات دیئے وہ مجھ سے بار بار پاکستانی دفاعی افواج کے متعلق سوالات کرتے تھے اور ہر بار میرا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ آپ کے جو ایجنٹ پاکستان بھیجے جاتے ہیں انہیں آپ بھارتی افواج کے متعلق کوئی معلومات Feed نہیں کرتے۔ عینہ اسی طرح پاکستانی افواج کے متعلق میری معلومات صفر ہیں میں نے انہیں کہا کہ ایک پاکستانی ایجنٹ کا دہلی میں مجھ سے رابطہ ہے۔ مجھے یہ بالکل علم نہیں کہ اسے کیا مشن سونپا گیا ہے ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں اور نہ ہی مجھے اس کے ٹھکانے کا علم ہے۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ پاکستانی کوریئر جو ڈاک لاتا ہے اس میں سے اس کی ڈاک اور اس کیلئے بھیجے گئے پیسے اسے دے دوں۔ 20 جون کو دن کے ٹھیک دس بجے مجھے سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن پر اسے ملنا ہے اور اگر کوریئر پیسے لایا تھا تو اس کی ڈاک کے علاوہ 5 ہزار روپے بھی دینے ہیں۔ اگر 20 جون کو صبح 10 سے ساڑھے دس کے درمیان وہ مجھے کسی وجہ سے نہ ملا تو پھر 22 جون کو اسی وقت اور اسی جگہ مجھے اسے ملنا ہے۔ اگر آپ مجھے 20 جون کو سبزی منڈی اسٹیشن پر لے جلیں تو میں اسے پکڑوا سکتا ہوں۔ ممکن ہے ان کو کوئی گروپ ہو۔ اس کے ذریعے آپ اس گروپ تک پہنچ سکتے ہیں۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ اگر کوئی اور خون خمنے کی وجہ سے میرے کپڑوں سے بدبو آ رہی ہے۔ اگر آپ میرا ہائی کریں تو میرے ناپ کی ایک قمیص اور باجامہ مجھے دیں۔ اس کے بعد میں نے یہ پیش کش کی کہ اس کے علاوہ اگر آپ 20 جون کو اس آدی کو پکڑنا چاہتے ہیں تو میرے پہننے ہوئے کپڑوں کو دھوا کر پریس کروادیں اور اگر ڈاک میں پاکستان سے رقم بھیجی گئی تھی تو 20 جون کو 5 ہزار روپے بھی مجھے دیں تاکہ میں رقم دینے کے بہانے چند منٹ کے لئے اسے روک لوں اس دوران آپ اسے گرفتار کر لیں۔ چونکہ رقم آپ اس سے برآمد کریں گے اس لئے اس کے پاس اس کے سو کوئی چارہ نہ ہوگا کہ وہ اپنے پاکستانی ہونے اور یہاں اپنے قیام کا مقصد آپ کو بتا دے۔ میری گواہی اور اسے 'راہ راست' پر لانے کی میری کوشش بھی آپ کے کام کو آسان بنا دے گی۔ میں نے بات ختم کی تو انہوں نے کہا کہ وہ مشورہ کر کے مجھے کل بتائیں گے۔ جب وہ اٹھنے لگے تو میں نے کہا کہ ایک بات آپ کو بتانا میں بھول گیا تھا اگر 20 جون کو آپ کا مجھے لے جانے کا پروگرام ہو تو ایک ہزار روپے بھی مجھے دیجئے گا۔ جسے میں دائیں کلائی پر باندھ لوں گا۔ یہ میرا اور اس آدی کا 'سب ٹھیک ہے' کا سگنل ہے۔ خطرے کی صورت میں سرخ رومال استعمال کیا جاتا ہے۔ میری سب باتیں انہوں نے بڑے تخیل سے سنیں اور مجھے واپس تیل میں بھیج دیا گیا۔

سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن پر نہ تو مجھے کسی Contact سے ملنا تھا اور نہ مجھے اس فرضی Contact کو 50 ہزار روپے دینے تھے۔ یہ سب پلان میں نے اپنے فرار ہونے کی کوشش کرنے کیلئے بنایا تھا۔ جن قارئین نے دہلی کا سبزی منڈی اسٹیشن دیکھا ہے۔ انہیں بخوبی علم ہوگا کہ گھنٹہ چوک سے اسٹیشن کی طرف جو سڑک جاتی ہے اس پر ایک پرانا سینما ہاؤس بھی ہے۔ پلیٹ فارم کے باہر ریلوے اسٹیشن کے کوارٹر اور رکشہ گیسٹ اسٹیشن بھی ہے۔ پلیٹ فارم میں داخل ہو جائیں تو دائیں طرف اسٹیشن ماسٹر کا دفتر اور ویٹنگ روم وغیرہ ہیں اور بائیں جانب ایک بک اسٹال اور ایک چائے کا اسٹال ہے۔ تقریباً اسی جگہ پر اوور ہیڈ برج بنا ہوا ہے۔ اس پل کی دوسری جانب ایک سڑک ہے جو 90 درجے کا زاویہ بناتی ہوئی تقریباً سو میٹر دور سبزی منڈی کی مین سڑک سے جاملتی ہے۔ اس اسٹیشن پر دو مین ریلوے لائنوں کے علاوہ آدھن لوپ لائنیں بھی ہیں جو بیشتر اوقات مال کے ڈبوں کی شفٹنگ اور مال اتارنے اور چڑھانے کے لئے مال کے ڈبوں سے بھری رتی ہیں۔ میں نے اسی اوور ہیڈ برج کے پلیٹ فارم کی دوسری جانب والے حصے میں 'اپنے Contact کو ملنا تھا'، تفتیشی ٹیم کو میں نے ایسی مفصل پلاننگ کر کے دی تھی جیسی میں اپنے مشنوں کے دوران کیا کرتا تھا۔ صرف اپنے فرار کا منصوبہ انہیں نہیں بتایا تھا۔ مجھے صرف ایک بات کا خدشہ تھا۔ گرفتاری کے بعد میں نے گھبراہٹ میں تفتیشی ٹیم کو بتایا تھا کہ میں علی گڑھ سے دہلی ڈاک وصول کرنے اور بھیجنے کے لئے آتا ہوں۔ علی گڑھ کا نام تو میں نے بتا دیا تھا۔ جبکہ میں نے کبھی علی گڑھ گیا تھا اور نہ ہی وہاں کے رہائشی علاقوں اور وہیلوں کے نام جانتا تھا۔ مجھے یہی خدشہ تھا کہ اگر تفتیشی ٹیم نے مجھ سے علی گڑھ کے متعلق سوال کئے جہاں میں اپنے سابقہ بیان کے مطابق دو سال سے زیادہ عرصے تک رہا تو میں کیا جواب دوں گا۔ کمان سے تیز نکل چکا تھا جس کی واپسی ناممکن تھی۔ علی گڑھ والا بیان میں نے سب سے پہلی تفتیش کے دوران دیا تھا۔ جسے ریکارڈ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد تو میں نے کبھی علی گڑھ کا نام لیا اور نہ انہوں نے کبھی پوچھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے دو سالہ بھارت میں قیام کے متعلق جب تفصیلی تفتیش کا مرحلہ آئے گا تو اس وقت مجھے بہت بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دوسری تیشی مجھے کوریئر سے DMI والوں کو حاصل کردہ ڈاک کے متعلق تھی۔ نہ معلوم اس ڈاک میں کیا تھا۔ ڈاک میں اگرچہ کسی کا نام لکھا نہیں ہوتا تھا اور ہدایات بھی کسی کو مخاطب کئے بغیر ہوتی تھیں لیکن بعض اوقات اس ڈاک میں ہمارے گھر بلو خطوط بھی ہوتے تھے۔ جو غیر اصلی لفافوں کے ہوتے تھے ان خطوط میں درج ناموں پر سیاہی لگادی جاتی تھی۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ایک دو تین چار کی ترتیب میں نمبر الاٹ کئے گئے تھے۔ ان خطوط کو سنر کر کے سادہ لفافوں میں ڈال کر اوپر نمبر لکھ دیئے جاتے تھے۔ میں نے سوچا کہ کوریئر سے حاصل کردہ ڈاک کے متعلق انہیں یہی کہوں گا کہ وہ ساری ڈاک سبزی منڈی پر ملنے والے 'Contact' کے لئے ہے۔

اگلے روز شام کے وقت میرے لئے سلیٹی رنگ کی قمیص اور باجامہ بھیج دیا گیا اور میرے پہننے ہوئے کپڑے لے گئے۔ باجامہ میں نا لے کے بجائے الاٹنگ لگا تھا۔ ایک ہوائی جہاز اور سگریٹ بھی تھے۔ اس رات مجھے تفتیش کے لئے باہر نہیں نکالا گیا۔ اس سے اگلے دن صبح کے وقت گارڈز نے آکر میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور مجھے باہر لے جا کر اور کئی بار ٹوٹی طرح گھما کر تقریباً ڈیڑھ سو قدم چلنے کے بعد ایک سیل میں جا کر میری پٹی اتار دی۔ اس سیل کے باہر بھی اونچی چار دیواری تھی۔ ہاتھ روم بھی کمرے کے کچھلی طرف بنا ہوا تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جس سیل سے مجھے یہاں لایا گیا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی تھا لیکن اس سیل سے تقریباً دو گنا بڑا تھا۔ اس سیل میں دو بیڈ تھے اور ایک بیڈ پر ایک نوجوان بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے بھی سلیٹی باجامہ اور قمیص پہن رکھی تھی جس پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ اس نوجوان کے منہ اور ایک کان سے بھی تھے ہوئے خون کی لکیر چہرے سے ہوتے ہوئے گردن تک چلی گئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسے بڑی بے دردی سے مارا گیا ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر پہلے تو مجھے شک ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی تو وہ چل رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ ان جھیزوں نے نہ معلوم کس جرم کی پاداش میں اس نوجوان کے ساتھ اتنا بے رحمانہ سلوک کیا ہے کہ زندہ اور مردہ میں تیز مشکل ہوگی۔ تین چار گھنٹوں بعد اس نوجوان نے کراہنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اس نے پانی مانگا۔ پانی پینے کے بعد اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور کراہتے کراہتے سو گیا بے ہوش ہو گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اپنے ساتھ آئندہ پیش آنے والے تشدد کا اندازہ ہو رہا تھا۔ آخر کب تک میں تفتیشی ٹیم کو طفل تیلیوں سے بہلا سکتا تھا۔ غروب آفتاب کے بعد سے پھر ہوش آیا۔ میں نے پانی سے اس کے چہرے اور گردن سے خون صاف کیا اور اسے سگریٹ دیا۔ اس کی حالت ذرا سنبھلی تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اس کی یہ حالت کیوں کی گئی۔ وہ جواب دینے ہی لگا تھا کہ ہم دونوں کے لئے کھانا آگیا۔ بڑی مشکل سے اس نے چند نوالے کھانا کھایا۔ میرے دو بارہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ لاہور رنگ محل کارینے والا ہے۔ فلمیں دیکھنے کا اسے بہت شوق ہے اور اسی شوق کے پیش نظر اس نے لاہور کے ایک آٹھنگر سے رابطہ کر کے بھارت میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا۔ باڈر کر اس کرتے ہی بھارتی سیکورٹی فورس والوں نے دونوں کو لالکا رما۔ آٹھنگر اس علاقے سے بخوبی واقف تھا وہ وہاں سے آگے بڑے سرکنڈوں (Elephant Grass) میں چھپتے چھپاتے غائب ہو گیا۔ جبکہ میں سیکورٹی فورس والوں کے ہاتھ آگیا۔ اپنے فیلمڈ آفس میں لے جا کر انہوں نے پہلے تو معاشی لیتے ہوئے اس کی جیبیں خالی کر دیں اور پھر بے تحاشہ مار مار کر میرے ساتھی آٹھنگر کا پوچھنے لگے۔ میں نے انہیں سب کچھ صحیح بتا دیا لیکن انہوں نے میری ایک سنی اور مجھے امر لے جا کر اسی مجھے کے لوگوں کے حوالے کر دیا۔ وہاں بھی مجھ پر بے انتہا تشدد کیا گیا لیکن میرے پاس انہیں بتانے کو جب کوئی بات تھی ہی نہیں تو آخر کیا بتاتا۔ امر تتر سے مجھے یہاں لایا گیا مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کون سا شہر ہے۔ چودہ چندہ روز سے ہر رات کو مجھے ایک تہ خانے میں لے جا کر بہت زیادہ مارا پیٹا جاتا ہے۔ مجھے ایک اندھیری کونفری میں رکھا جاتا تھا۔ دو دن ہوئے مجھے یہاں منتقل کیا گیا ہے۔ آپ بھی میری طرح مصیبت میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ اگر آپ مسلمان اور پاکستانی ہیں تو میری مدد کیجئے اور کسی طرح ان ظالموں کے ٹھکے سے چھڑوائیں۔

غازی

میں نے اس نوجوان کو دلاسا دیا اور کہا کہ اگر تم بے گناہ ہو تو یہ تمہیں بالآخر چھوڑ دیں گے اور غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرنے کے جرم میں زیادہ سے زیادہ دو تین سال کی سزا ہو جائے گی۔ میں نے اسے کہا کہ تمہاری طرح ہی میں بیہاں بے بس ہوں اور عملی طور پر تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ بہر حال حوصلہ رکھو، اللہ پاک یقیناً کوئی نیکوئی رستہ دکھا دے گا۔ اس لڑکے نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو یہاں کس جرم کے تحت لایا گیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے تفتیشی عملے کے سامنے دہراتے دہراتے میں تھک گیا ہوں۔ اسلئے پھر کسی وقت تمہیں اپنی داستان سناؤں گا۔ اس رات جب باہر کا دروازہ کھلنے کی آوازی آئی تو میں تفتیشی مراحل سے گزرنے کے لئے خود کو تیار کرنے لگا۔ گارڈ زائد رات کے آوازوں اور اس نوجوان کی آنکھوں پر پٹی اور ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے باہر دھکیل کر لے گئے۔ اس نوجوان نے پٹی بندھتے ہی رونا اور آواز بکا شروع کر دی۔ زیادہ سے زیادہ 20 منٹ گزرے تھے کہ مجھے اس لڑکے کے چیختے چلانے اور ہائے مر گیا۔ مجھ پر رحم کرو، اف میری ہڈی ٹوٹ رہی ہے کی آوازیں آنے لگیں ان آوازوں کے ساتھ ساتھ مغلظات اور مار پیٹ کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ ”مار چریل یہاں سے قریب ہی ہوگا“ میں نے اندازہ لگایا۔ اس لڑکے کی چیخوں سے ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے سخت جسمانی اذیت دی جا رہی ہے۔ مجھے پھر کسی کی کرخت آواز سنائی دی۔ مرچیں تیل اور ڈنڈا لاؤ تھوڑی دیر بعد ہی اسے نوجوان کی انتہائی تیز چیخ سنائی دی۔ وہ شدید درد سے بھریں، دردناک چیخیں مار رہا تھا۔ چشم قصور سے میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اتنا وحشیانہ عمل تو شاید کسی دور میں بھی ظالم سے ظالم شخص نے بھی اپنے دشمن سے نہ کیا ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ نوجوان اور میں دونوں ان ظالموں کے آگے بے حقیقت کیزے سے بھی کم حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے، میرے ساتھ اس سے بھی زیادہ اذیت ناک رویہ اپنایا جائے گا۔ پاکستان سے روانگی سے قبل سائینڈ بھری ڈاڑھ لگانا واقعی درست تھا۔ اس شرمناک اذیت اور ذلت سے بچنے کے لئے وہ ڈاڑھ واقعی ان حالات میں نجات ثابت ہوتی۔ اس نوجوان کی درد بھری چیخوں سے مجھے خاک نیند آتی تھی اس کی چیخیں اچانک بند ہو گئیں۔ میں نے سوچا کہ یا تو وہ مر گیا ہے اور یا کم از کم بے ہوش ہو چکا ہے۔ رات یونہی بیت گئی۔ فجر کے وقت چار گارڈز اسے ہاتھوں اور ٹانگوں سے اٹھائے سیل میں اس کے بیڈ پر پھینک کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض بالکل نارمل تھی۔ وہ بھینبا بے ہوش تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں اپنے بیڈ پر چلا آیا اور میری بھی آنکھ لگ گئی۔ صبح 8 بجے کے قریب ہم دونوں کے لئے ناشتا آیا۔ وہ بے ہوش تھا، میں نے ناشتہ زہر مار کیا، میں سوچ رہا تھا کہ اب عنقریب ہی میری بھی ایسی ہی چیخیں شروع ہونے والی ہیں۔ میں نے خود کو اذیت اور تشدد دہینے کے لئے تو ایک حد تک تیار کر لیا تھا۔ لیکن جو شرمناک اذیت گزشتہ رات اس نوجوان کو دی گئی تھی اس کا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس نوجوان کے کپڑوں پر پانے خون کے دھبوں کے علاوہ نئے دھبے بھی لگے ہوئے تھے اور اس کے پاؤں کی آسن بھی خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔ تیل، مرچیں اور ڈنڈا منگوانے کی آواز، نوجوان Loudest cry (درد بھری انتہائی تیز چیخ) اور خون سے بھری آسن سے صاف ظاہر تھا کہ رات اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا۔

دو پہر کے قریب اسے ہوش آیا۔ پہلے کی طرح اس کی ناک اور کان سے نکلنے والا خون اس کے چہرے پر جما ہوا تھا۔ میں نے اس کے چہرے سے خون صاف کیا، اسے پانی پلایا، اس کے ہاتھوں پر بھی خون جما ہوا تھا۔ اسے بھی صاف کیا۔ نوجوان تشکر بھری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ دو پہر کا کھانا آیا تو میرے بے حد مجبور کرنے پر اس نے کھانا کھایا۔ میں نے اسے کھانے کے بعد اسپرو کی دو گولیاں دیں۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور بولا ”میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ دو چار دن سے زیادہ زندہ نہ رہ پاؤں گا۔ میرے پاس تو ان ظالموں کو بتانے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں۔ میں تو بھارتی فلمیں دیکھنے کے شوق میں مارا گیا۔ آپ میری حالت دیکھیں اور خود کو ان ظالموں کے ظلم سے بچانے کے لئے اگر کوئی بات نہیں بتائی تو وہ بھی بتادیں، اس کی اس بات سے میں سوچ میں پڑ گیا کہ کل یہی شخص مجھ سے گزرا کہ یہاں سے نکلنے یا تشدد سے بچنے کے لئے میری مدد طلب کر رہا تھا اور آج مجھے صیحت کر رہا ہے۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اس کے سر اچھے کا جائزہ لینے لگا۔

مجھے گرفتار ہونے سے 6 دن ہوئے تھے جبکہ اس نوجوان کے مطابق اس کی گرفتاری کو آج سترہ شمارہ روز ہو چکے تھے لیکن اس کی داڑھی میری داڑھی کے نصف کے برابر تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ اور پاؤں کے ناخنوں کو دیکھا تو وہ بھی بڑھے ہوئے نہیں تھے۔ اس کے متعلق میرے دل میں کچھ شک سا رہ گیا۔ میں نے اسے تنگ کو مٹانے کے لئے اس سے پوچھا کہ وہ کتنا پڑھا ہوا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میٹرک پاس ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ گورنمنٹ اسکول سے اس نے میٹرک پاس کیا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ رنگ محل میں میری بھی عزیز داری ہے۔ میرے عزیزوں کے گھر تو ”رنگ محل حویلی“ کے پیچھے ”گلبرگ“ میں ہیں۔ اس کا گھر رنگ محل حویلی کی کس جانب ہے۔ وہ گھبرا گیا اور کہنے لگا ہمارا گھر تو رنگ محل حویلی کے دائیں جانب ہے۔ میں نے سر ہلا کر گویا سمجھتے ہوئے کہا تو تمہارا مطلب ہے کہ من آباد میں ہے۔ وہ بولا جی ہاں من آباد میں ہے۔ میں نے کہا کہ حویلی کے باہر دو جھوتے ہوئے ہاتھی دیکھے ہیں۔ کہنے لگا جی ہاں کئی بار، بلکہ میں نے تو انہیں ایک دو بار گئے بھی کھلائے ہیں۔ (رنگ محل لاہور میں تنگ بازاروں کا مرکز ہے اور وہاں کوئی رنگ محل حویلی نہیں ہے اور نہ ہی ہاتھی ہیں۔ گلبرگ اور من آباد لاہور کی نئی بستیاں ہیں جو رنگ محل سے 10 سے 15 کلومیٹر دور ہیں) اس نے رنگ محل حویلی، جھوتے ہوئے ہاتھی اور من آباد کا کہہ کر میرے شک کو یقین میں بدل دیا۔ یہ نوجوان نہ تو پاکستانی تھا اور نہ یہ بارڈر پر پکڑا گیا تھا بلکہ یہ DMI کا بھیجا ہوا Stool pigeon تھا اور DMI کا ہی آدمی تھا۔ اس مصیبت کی گھڑی میں بھی میں نے DMI کے شروع کئے ہوئے اس کھیل کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ Stool pigeon کا متبادل اردو میں صحیح لفظ مجھے معلوم نہیں۔ یہ دشمن کا راز اگھوانے کے لئے ایک پھنکنڈہ ہوتا ہے کہ اپنے ہی آدمی کو سیل (Cell) میں اصل ملزم کے ساتھ بند کر دیا جاتا ہے۔ اس کے جسم اور کپڑوں پر تشدد کی علامات بنائی جاتی ہیں اور سیل کے قریب ہی اسے لے جا کر مصنوعی تشدد کیا جاتا ہے۔ وہ آدمی ایسی دردناک چیخیں مارتا ہے کہ سننے والوں کے دل دہل جائیں۔ اس کے دو مقاصد ہوتے ہیں اول یہ کہ اصل ملزم Stool pigeon پر ہونے والے تشدد اور اس کی حالت کو دیکھ کر گھبرا جائے، اس کے اعصاب ٹوٹ جائیں اس کی قوت ارادی اور مدافعت کی طاقت ختم ہو جائے اور وہ اپنے متعلق سب کچھ بتا دے۔ دوم یہ کہ DMI کو اپنی ہی طرح مصیبت میں گرفتار سمجھ کر اسے اپنا راز دار بنانے اور اسے اپنی اصلیت بتادے۔ بعض اوقات اصل ملزم کا اعتماد حاصل کر کے فیض اپنی رہائی کا مژدہ سنانا ہے اور اصل ملزم کو کہتا ہے کہ اپنے باہری Contact تک اگر کوئی پیغام پہنچانا ہو تو وہ یہ ”خدمت“ سرانجام دینے کو تیار ہے۔ تربیت کے دوران ہمیں Stool pigeon کے متعلق نہ صرف بریف کیا گیا تھا بلکہ راولپنڈی میں ایک مصنوعی مقابلہ بھی کروایا گیا تھا جس میں A ڈویژن پولیس انٹیش کی حوالات میں مجھے اور میرے ایک ساتھی کو ایک رات کے لئے بند کر دیا گیا تھا۔ جہاں پہلے سے ہی ایک اسٹول بجن موجود تھا۔ جس نے رات بھر ہمیں کریدنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ برہنگ کے بعد چونکہ وہ تازہ تازہ واقعہ تھا اس لئے ہم دونوں نے اسٹول بجن کو پہچان لیا تھا۔

اب اس اچانک مصیبت اور بے چارگی کی حالت میں Stool pigeon کی بھر پور اداکاری کی وجہ سے میں اسے فوری پہچان نہ سکا۔ لیکن اس کی داڑھی ناخنوں اور لاہور میں رنگ محل کے متعلق اس کی ”معلومات“ نے اس کا بھانڈا کھجور ڈیا۔ اسے بھی غالباً رنگ محل کے متعلق اپنی دی ہوئی معلومات پر خود ہی شک ہو گیا تھا۔ اس نے اسی میں عافیت سمجھی کہ اب سو نے کا بہانہ کر کے میرے سوالات سے بچ جائے۔ رات کو پہلے مجھے سیل سے لے جایا گیا۔ تفتیشی ٹیم بھی غالباً اپنے بار بار کے دہرائے ہوئے سوالات اور میرے مسلسل ایک ہی جواب سے اکتا چکی تھی۔ اسلئے اس بار انہوں نے اپنے سوال جواب کا سلسلہ مختصر رکھا۔ ٹیم کے انچارج نے مجھے رخصت کرنے سے پہلے کہا۔ تم نے اپنے متعلق ہمیں جو کچھ بتایا ہے ہمیں اس پر بالکل یقین نہیں۔ اب ہم تمہارے اس وعدے پر کہ 20 جون کو تم پاکستانی ایجنٹ کو پکڑو دو گے، یقین کرتے ہوئے 20 جون کا انتظار کریں گے۔ اگر اس روز بھی تم ناکام ہوئے تو ہم تمہیں دوسری ٹیم کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ دوسری ٹیم کا تمہارے ساتھ رویہ اتنا سخت ہوگا جس کا تمہیں اندازہ نہیں۔ اس لئے اب بھی وقت ہے کہ ہمیں سب کچھ سچ بتا دو اور خود کو تشدد سے بچالو۔ ہر انسان کی تشدد برداشت کرنے کی ایک حد ہوتی ہے اور جب اسے اس حد سے آگے لے جایا جاتا ہے تو وہ سب کچھ بتا دیتا ہے۔ اس کی یہ بات سن کر مجھے سیمیرا حسن شہید یاد آگیا۔ تشدد کی کون سی حد تھی جس سے وہ نہ گزرا تھا۔ لیکن اس نے زبان نہ کھولی۔ اس کے ہوش میں ہوتے ہوئے اس کے پاؤں کی انگلیاں اور پاؤں کاٹے گئے اس کے ہوش میں ہوتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اور ہاتھ کاٹے گئے۔ لیکن وہ مرد مومن یہ سب کچھ سہہ گیا، جان دے دی لیکن زبان نہ کھولی۔ تفتیشی ٹیم نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست تھا جب تک ایک ٹیم زبان کھولنے میں مکمل طور پر ناکام نہ ہو جائے ملزم کو دوسری ٹیم کے حوالے نہیں کیا جاتا۔ ملزم کی زبان کھولنے پر ہی کسی تفتیشی ٹیم کی کارکردگی کو پرکھا جاتا ہے اور کامیابی کی صورت میں سارا کریڈٹ (Credit) اسی ٹیم کو ہی ملتا ہے۔ 20 جون کو میرے تعاون کے وعدے سے موجودہ ٹیم کو مجھے اپنی تحویل میں رکھنے کا جواز مل گیا تھا۔ 20 جون کو اگر وہ ناکام ہو جاتے تو مجھے یقیناً کسی دوسری ٹیم کے سپرد کر دیا جاتا جس کے زبان کھولنے کے اپنے حربے ہوتے۔ میں نے ٹیم کے انچارج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”سر میں اپنے عدم تعاون کا انجام بخوبی جانتا ہوں۔ میرے Cell میں ایک جوان قیدی ہے جس کی حالت دیکھ کر اور رات کو تفتیشی ٹیم کی تفتیش کے دوران اس کی چیخوں سے مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ میرے عدم تعاون کی صورت میں میرا کیا حشر کیا جائے گا۔ میں نے آپ سے 20 جون اور اگر ایجنٹ اس روز نہ آیا تو 22 جون کو اسے پکڑوانے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر 22 جون کو بھی ناکام ہوا تو آپ بے شک میرا جو حشر کریں مجھے آپ سے کوئی گلہ نہ ہوگا بلکہ میں اسے اپنے مفرد کا لکھا سمجھ کر قبول کروں گا“۔

ٹیم کے انچارج نے اپنے رویے میں ٹپک پیدا کرتے ہوئے کہا ”پاکستان سے آنے والی ڈاک میں بھارتی کرنسی بھی بھیجی گئی تھی۔ تمہارے کہنے کے مطابق 20 جون کو 8 بجے تمہارے کپڑے، گھڑی اور سبز رومال تمہیں مل جائے گا۔ رواں گے وقت 5 ہزار روپیہ بھی تمہیں ایجنٹ کو دینے کے لئے دیا جائے گا۔ تم بظاہر ہماری حراست میں نہیں ہو گے لیکن ہمارے درجنوں سولین لباس میں جوانوں نے تمہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہوگا۔ اس لئے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کا سوچنا بھی نہیں۔ اگر تم نے یہ حماقت کی تو ہم تمہارا وہ حشر کریں گے کہ تم اپنے لئے موت مانگو گے لیکن تمہیں موت بھی نہ ملے گی۔ ہم تمہیں سبزی منڈی اسٹیشن پر لے جا کر کوئی رسک نہیں لے رہے۔ وہاں پر تم آزاد ہونے کے باوجود بالکل اسی طرح ہماری حراست میں ہو گے جیسے اس کمرے میں ہو۔ اگر آزمانا چاہتے ہو تو سامنے دروازہ ہے۔ وہاں سے نکل کر فرار ہونے کی کوشش کرو۔ ہم میں سے کوئی بھی نہ تو اپنی کرسی سے اٹھے گا اور نہ ہی گارڈز کو پکارے گا۔ دروازے سے باہر نکلنے ہی تمہارا جو حشر ہوگا۔ اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ اور اس حماقت کی کھلیتا دم داری تمہاری ہوگی۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔ اس گفتگو کے بعد ٹیم نے مجھے سیل میں بھیج دیا۔

مجھے سیل (Cell) میں لایا گیا تو اسٹول بجن وہاں نہیں تھا۔ صبح کے قریب اسے واپس لایا گیا، اس بار پھر اس کے کپڑے خون سے لتھڑے ہوئے تھے اور وہ کراہ رہا تھا۔ مجھے چونکہ اس کی اصلیت کا یقین ہو چکا تھا اس لئے میں نے اس کا کوئی ٹوٹس نہیں لیا۔ میں نے سوچا کہ میرے ساتھ جو ہونا ہے اسے تو میں روک نہیں سکتا۔ اس دوران اس کے ”ڈرامے“ کا ہی لطف اٹھایا جائے۔ درحقیقت میں نے فرار کا جو منصوبہ بنایا تھا میں اپنی پوری توجہ اس پر مرکوز کئے ہوئے تھا۔ فرار میں ناکامی اور تشدد کے متعلق میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ زبان تو میں نے کسی حالت میں نہیں کھولی تھی، میرا کیا حشر ہوتا تھا اسے سوچ ہی کر بار بار مرنے سے کیا فائدہ تھا۔ زندگی کے عزیز نہیں ہوتی۔ مجھے بھی اپنی زندگی بہت عزیز تھی۔ اپنے گھر والوں سے بھی بڑی محبت تھی، لیکن بھارتی بارڈر کراس کرتے ہی میں نے اپنی ان کمزوریوں کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ یقیناً یہی حالت میرے ساتھیوں کی بھی تھی۔ ہم دو سال سے زیادہ بھارت میں قیام کے دوران سیکڑوں بار گھنٹوں اکٹھے گزارتے تھے لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس تمام عرصے میں کبھی ایک بار بھی کسی نے اپنے اہل خانہ کا نہ تو ذکر کیا اور نہ ہی انہیں یاد کیا تھا۔ زندگی سے پیار کیا ہوتا ہے، ہم اسے بھول چکے تھے۔ خطرناک سے خطرناک مشن پر جانے کے لئے قدم پیچھے کرنا تو دور کی بات ہے، سب سے بڑھ کر اس مشن پر جانے کی ضد کی اور خود کو مشن کے لئے موزوں قرار دینے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ تھی کہ ہم پانچوں جن میں صرف میں سولین تھا اور میرے چاروں ساتھی سروسز (Services) کے باقاعدہ ملازم تھے ہم نے خود بھارت جانے اور خطرناک مشن سرانجام دینے کے لئے اپنے آپ کو وولنٹیئر (Volunteer) کیا تھا۔ ہم میں سے کسی کو بھی زبردستی بھارت نہیں بھیجا گیا تھا۔ ہم سب اس دشمن ملک میں تنگ نظر ظالموں کے ہاتھوں گرفتاری کی صورت میں اپنے ساتھ ہونے والے بدترین تشدد سے بھی واقف تھے۔ سائینڈ کی ڈاڑھیں لگوا کر ہم نے موت کو گلے لگانے کے اسباب کو خوشی قبول کیا تھا۔ یقین جانے کہ میں موت سے ہرگز خوف زدہ نہ تھا۔ نہ بھرہری ڈاڑھ کے نکلنے کے بعد میں نے ذہنی طور پر خود کو بدترین تشدد دہینے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اب یہ جو چند روز (22 جون) کی مہلت تھی میں اسے پورے طور Enjoy کرنا چاہتا تھا۔ Cell میں مجھے یہ Stool pigeon (جسے آئندہ میں بیمار کبوتر کہوں گا) ہی میسر تھا چنانچہ میں نے اسی کے ساتھ ہی اپنے باقی ماندہ وقت کو خوشگوار بنانے کا فیصلہ کیا۔

غازی

میں نے دوپہر کے کھانے کے لئے بھی اسے ناشایا اور نہ ہی اس کے چہرے سے خون وغیرہ صاف کیا جب سورج غروب ہونے تک میری طرف سے کوئی پیش رفت نہ ہوئی تو وہ خود ہی کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ دوپہر کے کھانے کے برتن اٹھانے کیلئے جب گاڑے آئے تو میں نے اس کے لئے بیچا گیا کھانا بھی واپس کر دیا تھا اور گاڑے کو کھانا کھانے کے لئے بھی ہوش ہے۔ اسلئے اس کا کھانا بھی واپس لے جائیں۔ بیمار کو تو مجھ سے کھانے کے متعلق پوچھا تو میں نے کہا کہ تم اس وقت بے ہوش تھے۔ سارا دن کھانے پر کھیاں، جھینٹاتی رہتی ہیں اس لئے میں نے تمہارا کھانا واپس بھیج دیا۔ وہ جوان تھا اور جوانی میں نسبتاً جھوک زیادہ لگتی ہے۔ صبح کا ناشتا بھی اس نے نہیں کیا تھا۔ اس کے چہرے پر جھوک کے آثار تھے اور کراہیں بھرنے اور ہانے والے کرنے کی ایک ننگ بھی مسلسل کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کو ڈیوٹی سونپی گئی تھی کہ مجھ سے ہمدردی کے پردے میں کچھ راز اگلوالے۔ اپنے کراہنے اور دو روز مجھ سے چہرے پر جسے خون صاف کرانے کے سوا اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔ جھوک کی شدت کی وجہ سے وہ خاصا بے چین دکھائی دیتا تھا۔ وہ خود ہی اٹھ کر با تھ روم میں گیا اور خود ہی چہرے اور ہاتھوں کو دھویا، میں سگریٹ سلگائے بستر پر نیم دراز کھینچی اسے دیکھ لیتا تھا۔ میری خاموشی اب اس کیلئے ناقابل برداشت ہو چکی تھی۔ مجھے مخاطب کر کے بولا، صاحب آپ نے کیا سوچا ہے۔ میں نے پوچھا کس بات کے متعلق کیا سوچا ہے؟ کہنے لگا کہ ان ظالموں کے ہاتھوں ظلم سے بچنے کیلئے۔ میں نے کہا 'یہاں تم اپنی فکر کرو اپنے بچاؤ کے متعلق سوچو، میرے اور ہونے والے ظلم کی فکر میں کیوں گھلے جاتے ہو۔' کہنے لگا 'میں نے تو اس لئے پوچھا تھا کہ میری حالت تو آپ دیکھ رہے ہیں، کس بری طرح سے مجھے ادھیڑ کر رکھا گیا ہے۔ آپ تو بچ جائیں ان کے ظلم سے'۔ میں نے کہا 'کیسے بچ جاؤں؟' کہنے لگا 'جو کچھ ہو پوچھتے ہیں انہیں صاف صاف بتا دیں' میں نے کہا 'تم کیوں نہیں صاف صاف بتا کر ان کے ظلم سے بچ جاتے؟' کہنے لگا 'میں نے سب کچھ بالکل بچ انہیں بتا دیا ہے اور بتانے کیلئے میرے پاس کچھ ہے بھی نہیں' میں نے کہا 'میں نے بھی سب بچ انہیں بتا دیا ہے اور میرے پاس بھی انہیں بتانے کے لئے مزید کچھ نہیں، میں نہیں جانتا کہ جب تم نے سب کچھ انہیں بتا دیا ہے پھر بھی ہر روز وہ تمہارے ساتھ اتنا بر سلوک کیوں کرتے ہیں۔ لہذا انہیں تمہارے متعلق یہ یقین ہو چکا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو اور اسے ہی اگلوالے کے لئے وہ تم پر تشدد کرتے ہیں۔ تم اپنے بچنے کی تدبیر کرو، میرا اللہ مالک ہے۔ میری فکر نہ کرو' یہ کہہ کر میں نے آنکھیں موند لیں۔ گرمی سے برا حال ہو رہا تھا۔ نچکے کی ہوائی گرم تھی کہ کو بھی اس کے آگے ماتھی۔ مل پانی اتنا گرم تھا کہ پانی میں انڈا ڈال دیں تو لہٹتا اہل جاتا۔ طبیعت پہلے ہی بیزار ہو رہی تھی اس پر اس بیمار کو بوترے سوالات، وہ مجھے بچ بولنے کی نصیحتیں کرنے لگا لیکن میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ جب وہ خاموش نہ ہوا تو میں نے تنگ آ کر کہا 'دیکھو یا تو خاموش ہو جاؤ اور اگر بولنا چاہتے ہو تو مجھے رنگ محل حویلی کے متعلق بتاؤ۔ میں تو کبھی کبھار اس طرف جاتا تھا تم تو وہاں کے رہنے والے ہو۔ ہاتھوں کو گئے بھی کھلاتے رہے ہو، تمہاری معلومات بہت زیادہ ہوں گی۔ مجھے اس حویلی کے متعلق بتاؤ' اب تو جناب اسے ایسی چپ لگی کہ رات کا کھانا بھی اس نے خاموشی سے کھایا۔ نصف شب کے قریب گاڑے سے لے گئے اور صبح اسے خون میں تھنڑا ہوا چھوڑ گئے۔ رات کو اس کی چیخوں اور آواز کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ مجھے تو 20 جون تک کی مہلت مل چکی تھی۔ لہذا میں ان تاریخوں تک تفتیشی ٹیم کے سوالات سے بھی بچ گیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جب گرمی کی شدت میں کچھ کی ہوئی تو میں سو گیا۔ سورج طلوع ہونے کے قریب تھا کہ پنے در پنے خوفناک دھماکوں سے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے اندازے کے مطابق تینوں دھماکے میرے سہل سے قریباً سو میٹر دور ایک منصف کے اندر ہوئے تھے۔ چار دیواری کے باعث باہر تو میں دیکھ نہیں سکتا تھا دھماکوں کے تین چار منصف بعد بیٹھیاں بیٹھے اور بھاگ دوڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ اونچی آواز میں احکام دیئے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی چھپوں کے ایک طرف جانے کی آواز آئی اور ان کے بعد ایبویٹس اپنے مخصوص ہونڈ بھائی گزرتے۔ ہر طرف ایک شور مچا ہوا تھا۔ کچھ مجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ کانوں کے پردے بھاڑنے والی آواز سے تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہوں کے دھماکے تھے اور ایبویٹس کی آمد سے اندازہ ہوتا تھا کہ جانی نقصان بھی ہوا ہے۔ بیمار کو بھی حیران و پریشان تھا۔

سارا دن اسی شور شرابے میں گزر گیا۔ ہمیں صبح کا ناشتا اور دوپہر کا کھانا بھی نہ دیا گیا۔ رات کا کھانا لانے والوں کے ساتھ دو مسلح فوجی بھی تھے جنہوں نے تیل کا دروازہ کھلے وقت ہماری طرف گھسے تان لیں میں تو خاموش رہا لیکن بیمار کو بوترے کھانا لانے والوں سے پوچھا کہ صبح کس چیز کے دھماکے ہوئے تھے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ رات کو دس گیا کہ بچے گاڑے زاپچھے۔ انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور مجھے پہلے والے سنگل بیڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے بعد بیمار کو بوترے میں نے بھی نہیں دیکھا۔

متسلل کو قائم رکھنے کیلئے عرض ہے کہ جب میں فرار ہو کر اپنے ساتھیوں کے پاس گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ تینوں دھماکے جھٹ لال میاں میں بشیر کے گیرج میں جمع ہونے والے لڑکوں نے کئے تھے۔ میرے ساتھیوں نے بتایا کہ میری گرفتاری کے بعد انہوں نے وائٹس پر پاکستان سے رابطہ کیا تھا اور انہیں میرے متعلق بتایا تھا۔ پاکستان سے انہیں سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنی تمام سرگرمیاں بالکل معطل کر دیں اور میری تلاش میں ہرگز کوئی رسک نہ لیں Wait and see ان کے دیئے ہوئے احکام کا لب لباب تھا۔ میرے ساتھیوں نے احکام پر حرف نہ برف عمل کیا لیکن لڑکوں کو تمام واقعہ بتا دیا۔ میری گرفتاری کا سن کر لڑکے بہت مشتعل ہو چکے تھے۔ انہوں نے میرے ساتھیوں سے مل کر میرا سراغ لگانے اور مجھے چھڑانے کا پروگرام بنانا چاہا لیکن میرے ساتھیوں نے باوجود شدید خواہش کے پاکستان سے ملے احکام کے پیش نظر اپنی مجبوری بتائی اور معذرت کر لی۔ اب لڑکوں نے اپنے طور پر میرا کھوج لگانا چاہا۔ وہ چند ماہ پہلے ریٹائر ہونے والے ایک مسلمان فوجی سے ملے۔ جس نے انہیں بتایا کہ اس طرح گرفتاری کا عمل صرف DMI والے ہی کرتے ہیں۔ اس سابق فوجی نے لڑکوں کو دہلی میں DMI ہیڈ کوارٹر تک کھل دیا۔ وہ خود بھی ہیڈ کوارٹر کے اندر نہیں گیا تھا۔ اندر کی معلومات حاصل کرنے کے لئے لڑکوں نے گیرج میں مرمت کے لئے آئی ایک گاڑی لی اور بعد دوپہر ہیڈ کوارٹر کے باہر کھڑے ہو گئے۔ جب اسٹاف چھٹی کے بعد باہر نکلا تو انہوں نے ہیڈ کوارٹر کے ایک آڈیٹورم کو آکر لیا اور گیرج میں لے گئے تھوڑے سے تشدد کے بعد ہی اس نے ہیڈ کوارٹر کا پورا نقشہ اور زیر زمین Cell کے علاوہ زمین پر بنے ہوئے بیلوں کی تفصیل بتا دی۔ میرے متعلق اسے کچھ بھی علم نہ تھا۔ ساتھیوں کے بقول لڑکوں نے اس فوجی کی وردی اترا کر اسے دھوتی قمیص پہنادی اور شاہدہ کی طرف ایک سنسان جگہ پر لے گئے اور اس کی گردن پر خنجر رکھ کر اس سے میرے متعلق پوچھا لیکن وہ کچھ نہ بتا سکا۔ اس فوجی کا زندہ رہنا میرے علاوہ میرے ساتھی لڑکوں، عارف اور مڈیر سب کے لئے خطرناک تھا اس لئے ایک لڑکے نے اسے خنجر سے ہلاک کر دیا اور اس کی لاش پر مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگادی تاکہ شناخت کے قابل نہ رہے۔

لڑکوں کا لیڈر اب قیصر تھا جس نے گورکھپور کے مشن کو میرے نمبر نو کے ساتھ پورا کیا تھا۔ انہوں نے عارف کے پاس میرے رکھوائے ہوئے سامان سے 3 ٹائم بم اور 6 سیل اور گولیاں لیں۔ انہوں نے نقشے کے مطابق DMI کی اس دیوار کو نشانہ بنانا تھا جو Cell کے قریب تھی۔ بیرونی دیواریں بہت اونچی تھیں اور ان پر خار دار تاروں کی بانڈ لگی ہوئی تھی اس لئے باہر سے اندر کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ حملے میں دو گاڑیاں استعمال کی گئیں۔ علی الصبح جب سڑکوں پر ٹریفک نہیں ہوتی اس وقت حملے کا پروگرام بنایا گیا۔ ایک بم بیرونی دیوار کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا جبکہ دو بم اندر چھینکے گئے۔ دیوار والے بم سے دیوار میں خاصا بڑا دھماکا پڑ گیا جبکہ اندر پھینکے گئے بم DMI ہیڈ کوارٹر میں رہائشی فوجیوں کی بیرکوں پر گرے۔ لڑکوں کو شاید اس ہیڈ کوارٹر کی عددی نفری کا علم نہ تھا۔ دھماکے سے جب انہوں نے اندر جھانکا تو انہیں مختلف عمالتوں اور بیرکوں کے جوم میں تیل دکھائی نہ دیئے۔ دھماکوں کے فوری بعد سیٹیاں بیٹھے اور چیخ و پکار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب وہاں لڑکوں کا ٹھہرنا صریحاً بے فوٹی اور بغیر کسی فائدے کے خود کشی کے مترادف تھا۔ لہذا سب لڑکے جانیں بچا کر قریب ہی کھڑی دونوں گاڑیوں میں بھاگ آئے۔ صبح طلوع تو کسی کو نہ تھا لیکن قیاس تھا کہ بارکوں پر ہوں کے پھٹنے سے 8 سے زیادہ فوجی ہلاک اور بیسیوں زخمی ہو گئے تھے۔ ان دھماکوں کے بعد شہر کی سختی سے ناک بندی کر دی گئی اور جگہ جگہ تلاشی کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن اللہ پاک کے رحم و کرم سے لڑکے اور ساتھی بالکل محفوظ رہے۔ آٹھ دن کی سختی کے بعد چیکنگ وغیرہ ختم کر دی گئی اور دہلی کی زندگی معمول پر آگئی۔ DMI کی بیرونی دیوار کی اسی روز مرمت کر دی گئی تھی جبکہ اندر کا حال کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ لڑکوں نے اس Attempt کے بعد DMI کے افسران پر ان کے گھروں اور دفتر کے درمیان حملوں کا پروگرام بنایا جسے عارف، مڈیر اور میرے ساتھیوں نے لڑکوں کو سمجھا کر ملتوی کر دیا کہ اگر ان حملوں کا کسی کو بھی ذرا سا بھی شک پڑ گیا کہ یہ حملے مجھے پچانے کیلئے ہو رہے ہیں تو مجھے فی الفور ختم کر دیا جائے گا اور میری زندگی کی موہوم سی امید بھی ختم ہو جائے گی۔ اس کے باوجود لڑکوں نے ہیڈ کوارٹر سے آنے جانے والی گاڑیوں پر نگاہ رکھی شروع کر دی کہ شاید کسی گاڑی میں انہیں نظر آ جاؤ لیکن وہاں تو صرف فوجی جینٹیں، ٹرک، پرائیویٹ موٹریں اور بند فوجی گاڑیاں ہی آتی جاتی تھیں۔ اسلئے میرے بارے میں وہ کوئی سراغ نہ لگا سکے اور چند روز کے بعد لڑکوں نے نگرانی بھی مایوس ہو کر ختم کر دی۔

اب پھر اصل سلسلے کی طرف آتے ہیں۔ اس سنگل بیڈ میں مجھے وقت پر ناشتا کھانا اور سگریٹ ملنے رہے۔ صرف ایک فرق پڑا۔ مسلح فوجی گاڑے دن رات میں چار پانچ دفعہ اچانک آ جاتے۔ کبھی تیل کے باہر سے ہی مجھے دیکھ کر چلے جاتے اور کبھی تیل کھول کر کمرے اور با تھ روم کی ہر چیز چیک کرتے۔ اسی طرح دن گزرتے جاتے تھے۔ غالباً 18 جون کی رات تھی جب مجھے تیل سے نکال کر تفتیشی ٹیم کے کمرے میں لے جایا گیا۔ وہی سابقہ ٹیم کے ممبر تھے۔ انہوں نے پھر مجھے تینوں کی یا زیادہ مناسب الفاظ میں وارننگ دی کہ 20 جون کو سبزی منڈی اسٹیشن پر کوئی 'سماقت' نہ کروں۔ میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔ انہوں نے مجھے اپنی داستان شروع سے بیان کرنے کو کہا۔ میں نے پھر وہی رٹنی رٹائی کہانی بیان کر دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے انہوں نے مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا لباس جو تے اور گھڑی وغیرہ تم کو کل شام مل جائیں گی۔ کل شام تمہاری شیوہ بنانے کے لئے حجام بھی بھیج دیا جائے گا۔ پرسوں صبح ساڑھے 8 بجے تک تم تیار ہو جانا۔ چلتے وقت تمہیں 5 ہزار روپے بھی دے دیا جائے گا And remember no tricks میں نے کہا آپ مطمئن رہیں۔ میری طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ ہوگی۔ میں نے انہیں کہا کہ گرمی بہت زیادہ ہے اور تیل میں صابن نہیں ہے۔ مزید براں مہربانی کریں تو ایک برش، ٹوتھ پیسٹ، کنگھی اور شیشہ بھی بھجوا دیں، تاکہ Contact کے سامنے جب میں جاؤں تو بالکل نارمل لگوں۔ ٹیم کے سربراہ نے کہا۔ بہت اچھا۔ یہ سب چیزیں تمہیں کل شام تمہارے لباس کے ساتھ ہی مل جائیں گی۔ ٹیم کا ایک ممبر جو اپنے دشمنی کے جذبات پر قابو نہ رکھ سکتا ہوا بولا۔ کبھی نہ بھولنا کہ تمہاری کوئی سماقت اسے تمہاری زندگی کا آخری بار روانت صاف کرنا بھی ہاں تک ہے۔ "WILL میں نے جواب دیا اور گاڑے زینے میں واپس لے گئے۔

اگلی شام گاڑے کے ہمراہ حجام بھی آ گیا۔ جس نے میری شیوہ بنائی۔ میری پینٹ، شرٹ، گھڑی، جوتے بھی مجھے واپس مل گئے۔ ایک ہنرور مال، کنگھی شیشہ، صابن، ٹوتھ پیسٹ اور برش بھی مجھے دیا گیا۔ وہ رات میں نے زیادہ جاگ کر اور دعائیں مانگ کر گزری۔ اگلی صبح 8 بجے تک میں روٹنگی کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا۔ گرفتاری کے بعد میں نے کبھی مرتبہ آئینہ دیکھا تھا، ان 14 روز میں میرا چہرہ آدھا نہیں رہا تھا۔ آنکھوں کے گرد پڑ گئے تھے۔ یہ تو ابھی "آغاز سفر" تھا۔

فرار کی پہلی کوشش

مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میری یہ تیاری بالکل اس دنہ جیسی تھی جسے قربانی سے پہلے بنایا سونا جاتا ہے۔ ٹھیک 9 بجے گاڑے آگے اور میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے باہر لے گئے۔ تقریباً سو قدم کے فاصلے پر مجھے ایک گاڑی میں بٹھا کر پٹی کھول دی گئی یہ بالکل بند گاڑی تھی جس کی چھت پر بلب جل رہا تھا۔ لاڑی میں میرے ساتھ سو بیلیٹیں لباس میں دو گاڑے بیٹھے تھے جن کی قبضوں کے اندر سے ریوا لور جھانک رہے تھے۔ پون گھنٹہ چلنے کے بعد گاڑی رکی۔ باہر کا دروازہ کھلا۔ پہلے گاڑے زینے اتارے اور پھر مجھے نیچے اتارنے کا کہا گیا۔ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد ایک گاڑے نے مجھے نوٹوں کی ایک گڈی تھمائی اور کہا کہ "یہ 5 ہزار ہیں" گڈی میں سے پینٹ کی جیب میں ڈال دی تھی جس سے جیب خاصی پھول گئی۔ گاڑی بند ہونے کی وجہ سے ہم تینوں پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ گاڑی سے نیچے اتارے ہوئے وہ گڈی میری جیب سے نکل کر نیچے گر پڑی۔ میں اسے اٹھانے کے لئے نیچے جھکا اور جو بھی سیدھا ہوا تو دیکھا کہ دونوں گاڑے زینے سے 15 قدم سے زیادہ دور جا چکے ہیں۔ اب میں تقویٰ کیا کام دکھانے کے لئے "آزاد" تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ بالوں کے فوجی کٹ والے سویلین لباس پہنے ہوئے بیسیوں افراد نے مجھے ایک وسیع حصار میں لے رکھا تھا۔ میں پلیٹ فارم کی جانب چلا۔ پلیٹ فارم کے اندر بھی داخلے کے دروازے پر دونوں طرف سے اس طرح کے لوگ دکھائی دیئے۔ میں نے سست روی سے اور ہیڈ بیج کی طرف بڑھنا شروع کیا Contact سے ملنا تو فرضی کہانی تھی۔ میں تو اپنے فرار کیلئے لوپ ہول Loophole تلاش کر رہا تھا۔ اور ہیڈ بیج کی بیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے دانستہ لنگڑانا شروع کر دیا اور پل کی ریٹنگ کو تمام کر آہستہ آہستہ اوپر جانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت بیٹنگزوں نگاہیں جو ہر مرکز ہوں گی۔ برج پر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ پل کے تقریباً درمیان میں بیٹنگ کریں ریٹنگ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ پل کے دونوں طرف DMI کے آڈیٹورم آ رہے تھے۔ انہوں نے اتنا مکمل انتظام کیا ہوا تھا کہ لوپ لائنوں پر کھڑے خالی جھکڑوں پر بھی ان کے آڈیٹورم سے تھے۔ کچھ دیر پل کے اوپر انتظار کرنے کے بعد میں نے پل کی دوسری جانب چلنا شروع کیا۔ اس طرف بیڑھیاں ابھی آڈیٹورم سے نیچے تھیں۔ تین آڈیٹورم میں مارے میری طرف آئے۔ ایک سرگوشی میں بولا، اس طرف نیچے جانے کی اجازت نہیں، میں نے اسے کہا کہ پل سے اتار کر سڑک پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہیں مطلوبہ آڈیٹورم آپ لوگوں کے فوجی کٹ بال دیکھ کر واپس ہی نہ چلا جائے۔ وہ تذبذب میں پڑے اور میں نے نیچے اتارنا شروع کر دیا۔ پل سے اتار کر میں دس پندرہ منٹ سڑک کے دونوں اطراف دیکھتا رہا۔ اس دوران تین ٹرک سڑک پر سبزی منڈی کو جاتے دکھائی دیئے۔ سڑک تنگ تھی اور لوپ لائنوں کے بالمقابل آتی ہوئی پل کے بالکل قریب سے 45 درجے کا زاویہ بناتا ہے۔ سبزی منڈی کی مین روڈ سے جالقی تھی۔ اس موڑ پر ٹرک آ کر اپنی رفتار بہت آہستہ کر لیتے تھے۔ DMI کی گاڑیاں دونوں طرف پلیٹ فارم کی جانب کھڑی تھیں کیونکہ اس طرف پارکنگ کی کوئی جگہ نہ تھی۔ مجھے بھاگنے کا ایک ہی راستہ دکھائی دیتا تھا کہ کسی ٹرک کے پیچھے لگتی زنجیروں کو تمام کر مین روڈ تک پہنچ جاؤں، اور وہاں کے رش میں گم ہو جاؤں۔ میں اس وقت بھی یہ کوشش کر سکتا تھا لیکن دشواری یہ تھی کہ تینوں پہرے دار سائے کی طرح میرے بالکل پیچھے کھڑے تھے۔ ان کے اس قدر قریب ہوتے ہوئے میرے لئے اس طرح بھاگ نکلنا ناممکن تھا۔ میں نے چند منٹ مزید اپنے منصوبے کا جائزہ لیا اور واپس پل کی بیڑھوں کی جانب چل پڑا۔ 15 منٹ سے زیادہ میں نے پل کر اس کرنے میں لگا دیئے۔ پلیٹ فارم پر آ کر میں نے "ہندو مسلم پانی" کے مسلح گھمڑوں سے پانی پیا۔ بک اسٹال پر کچھ رسالوں کی ورق گردانی کی۔ پھر پلیٹ فارم پر ایک جانب سے دوسری جانب ٹھہرنا شروع کر دیا۔ جب گیا کہ میرے چند منٹ اوپر ہو گئے تو میں نے کٹائی سے ہنرور مال اتار کر جیب میں رکھ دیا اور پلیٹ فارم کے باہر آ گیا۔ میرے باہر لگتی ہی دو آڈیٹورم کی طرف لے گیا اور بند گاڑی لے کر آگئے۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ جب میری آنکھوں پر پٹی باندھنے لگے تو میں نے انہیں کہا کہ آپ تفتیشی ٹیم کے اچھا ریکوہ کر دیں کہ آج میں ان سے لازماً ملنا چاہتا ہوں۔

غازی

سپل میں مجھے چھوڑ کر وہ دونوں چلے گئے۔ رات تقریباً دس بجے تفتیشی ٹیم کا انچارج میرے سپل میں آیا۔ میں نے اسے پانچ ہزار روپے اور اپنی گھڑی واپس دی اور کہا کہ اگر آپ نے اپنے فوجی ہیر کٹ والے آدمی چاروں طرف پھیلادینے میں پورے 22 بجوں کو جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میرا Contact کوئی اتحق نہیں ہے۔ جو فوجی کٹ کے اتنے لوگوں کو دکھ کر چوک نہ جائے۔ نہ معلوم آج بھی وہ آیا ہو اور خطرے کی بو سونگھ کر واپس چلا گیا ہو۔ اب میرے پاس صرف 22 بجوں کا موقع ہے کہ Contact کو پکڑوا سکوں۔ لیکن اس کے لئے آپ کو اپنے آدمیوں کو ایک ٹوم کرنا چاہئے اور دوسرے انہیں کہیں کہ مجھ سے دو روڑر ہیں۔ پلیٹ فارم سے بھاگنے کے امکانی 4 راستے ہیں۔ ایک گھنٹہ چوک کی طرف، دوسرا تیسرا پلیٹ فارم کی دونوں جانب اور چوتھا سبزی منڈی والی سڑک۔ اگر آپ کو مجھ پر یقین نہیں ہے تو ان چاروں رستوں پر اپنے آدمی کھڑے کر دیں لیکن مجھ سے خاصے فاصلے پر ریلوے کے مال کے چمکڑوں پر بھی آپ کے آدمی کھڑے تھے۔ اور مجھے پلیٹ فارم کے عین سامنے آپ کی بندگاڑی سے اتارا گیا۔ اگر میرا Contact اس وقت پلیٹ فارم کے گیٹ پر کھڑا ہوتا تو کیا آپ توقع کر سکتے تھے کہ وہ مجھ سے ملتا فوراً ہی غائب ہو جاتا۔ ٹیم کا انچارج میری ساری باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولواٹھیک ہے پرسوں تمہیں آدھے رستے سے ہی ٹیکسی میں بٹھا دیا جائے گا جس کا ڈرائیور ہمارا اپنا آدمی ہوگا۔ ہمارے نگرانی کرنے والے پوشیدہ جگہوں پر کھڑے ہوں گے اور تمہیں پلیٹ فارم، اوور برج اور سڑک پر جانے کی بھی اجازت ہوگی۔ تمہارا پیچھا صرف ایک دو افراد ہی کریں گے جن کے ہیر کٹ فوجی نہیں ہوں گے۔ البتہ یہ خیال رکھنا کہ آج کے مقابلے میں دو گنی فورس ان تمام رستوں پر مامور ہوگی جن سے فرار ممکن ہے۔ اپنی ٹیم کے ممبران کی مرضی کے خلاف میں تمہارے ساتھ خاص رعایت برت رہا ہوں۔ اگر تم نے میری رعایت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو پھر تم خود حالات کے ذمہ دار ہو گے۔ جتنے عمل اور بردباری سے ہم نے تمہیں اتنی مہلت دی ہے۔ اتنی ہی زیادہ تمہیں اذیت دی جائے گی۔ میں اس کی باتیں سن کر خاموش اور مستنبتل سے مایوس سا ہو گیا۔ اٹھتے وقت اس نے پرسوں ساڑھے آٹھ بجے تیار رہنے کی ہدایت کی اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا Hope for best اور چلا گیا۔ شاید اس نے میرے چہرے پر مایوسی کے تاثرات پڑھ لئے تھے۔

میرا وہ رات اور آگاد دن بہت بے چینی میں گزارا۔ رات میں کامیابی کے بہت کم چانسز (Chances) تھے۔ میں زیادہ سے زیادہ دس پندرہ منٹ چل کے دوسری جانب سڑک کے کنارے گزر سکتا تھا، اس دوران کسی ٹرک کا اس سڑک پر آنا اور میرا نگرانوں کا حصار ڈکڑکڑکے پیچھے لگانا اور مین روڈ پر ٹرک کو چھوڑ کر عوام کے رش میں غائب ہو جانا اور اس تمام عمل کے دوران نگرانوں کا مجھے پکڑنے میں کامیاب نہ ہونا کسی سن گھڑت افسانے میں کسی سپر مین (Super Man) کے لئے تو بہت معمولی سی بات ہے۔ لیکن ایک ماٹل انسان کے لئے عملی طور پر اس کامیابی کے بہت ہی کم مواقع تھے۔ 22 بجوں میری دانست میں میرے لئے آخری موقع تھا جس میں کامیابی کا صرف 5 فیصد اور نگرانوں کی گولیوں سے مرنے اور تشدد سے بچنے کا 95 فیصد چانس تھا اور اسی لئے میں اس موقع کو گونا گونا گونے نہ چاہتا تھا۔ گرفتاری کے باعث پاکستان کے لئے اس وجہ سے بھی بیکار ہو چکا تھا کہ مزید کوئی مشن نہ کر سکتا تھا میری درجنوں تصویروں اتاری جا چکی تھیں۔ میری Cover story ختم ہو چکی تھی اور میں اپنے مجھے کے لئے ایک عضو بیکار بن چکا تھا۔

ایک کاٹنا جیسے کی مجھے بھی اتنی ہی تکلیف ہوتی تھی جتنی کسی دوسرے انسان کو اور تفتیشی ٹیم کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ میری زبان کھولانے کیلئے تشدد کا سلسلہ شروع کرنے والے تھے جس میں مجھے میجر احسن شہید کی طرح تیز تشدد (Fast Torture) کے ذریعے جلد موت (Quick Death) ملتی۔ میجر احسن کی شہادت اس کی کامیابی اور DMI کی ناکامی تھی۔ اب DMI والوں نے مجھے زندہ رکھ کر تشدد کا پروہہ جڑ پاننا تھا جس کے باعث میں اپنی زبان کھولنے پر مجبور ہو جاتا۔ فرار کے منصوبے میں ناکامی کی صورت میں نگرانوں نے مجھے وہیں گولیاں مار کر ہلاک کر دینا تھا، دونوں صورتیں میرے لئے ذریعہ نجات تھیں۔ میں اپنی موت کو آخری تحفہ سمجھ کر اپنے وطن عزیز کو پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس رات کا خاصہ حصہ عبادت کرنے میں گزارا۔ رات کو کھانے کے ساتھ ہی میرا لباس، جو تھے، گھڑی اور سبز رومال وغیرہ مجھے بھیج دیئے گئے تھے، صبح میں وقت سے پہلے ہی تیار ہو گیا۔ 9 بجے گاڑی مجھے لینے کے لئے آگئے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے بندگاڑی میں بٹھا یا گیا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد گاڑی رکی میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی تھی، مجھے 5 ہزار کی گڈی بھی دے دی گئی، یہی دہلی میں جن پتا علاقہ تھا۔ بندگاڑی ایک ٹیکسی کے قریب رکی تھی۔ مجھے ٹیکسی میں بچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا گیا، اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان پائیدان پر ایک مٹھی ساٹھن لیا ہوا تھا۔ میرے بیٹھے ہی اس نے مجھ پر پہلے تان لیا اور اگلی سیٹ کے فرش میں جزی ایک زنجیر کا پھنکڑا جیسا کڑا امیری ایک ٹانگ میں ڈال کر اسے بند کر دیا اور ٹیکسی سبزی منڈی کی طرف روانہ ہو گئی، ٹیکسی سے کچھ آگے ایک گاڑی جا رہی تھی جدھر جدھر وہ گاڑی مڑتی ٹیکسی بھی اس کا پیچھا کرتی، ٹیکسی اور اس گاڑی کی رفتار بھی ایک ہی تھی۔ نتیجاً وہ گاڑی DMI کی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا تو فرش پر لینے آدمی نے مجھ سے کہا ”سامنے دیکھو“ اپنی ڈپٹی کیفیت تو میں اوپر کی سطور میں بیان کر چکا ہوں کہ میں خود اپنی موت کے اسباب کرنے جا رہا تھا، میں نے اس شخص کو کہا میں پیچھے دیکھوں گا اور ہر طرف دیکھوں گا تم میں ہمت ہو تو گولی چلاؤ۔ یہ کہہ کر میں انجام سے لاپرواہ پیچھے دیکھنے لگ گیا۔ وہ بھلا مجھ پر ان حالات میں گولی کیسے چلا سکتا تھا۔ منہ ہی منہ میں دو چار گولیاں بک کر چپ ہو رہا۔ ہماری ٹیکسی کے پیچھے دو پرائیویٹ کاریں مسلسل ہمارے تعاقب میں تھیں۔ ان میں بھی یقیناً DMI کے آدمی ہوں گے۔ میں دل ہی دل میں اپنی زندگی کے اس پہلے اور آخری پروٹوکول کو دکھ کر ہنس پڑا۔ میں اتنا اہم تو تھا کہ 3 گاڑیاں میری ”حفاظت“ کے لئے آگے پیچھے چل رہی تھیں اور اسٹیشن پر بھی یقیناً درجنوں افراد میرے ”استقبال“ کے لئے پہلے سے ہی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اگر آگے اور پیچھے تین حفاظتی گاڑیاں نہ ہوتیں تو میرے لئے بڑا آسان تھا کہ لینے ہوئے آدمی سے پہلے چھین کر کڑے کی چابی جو یقیناً اس شخص یا ڈرائیور کے پاس تھی حاصل کرنا اور خود کو آزاد کرالیتا۔ یہ ساری کارروائی میں صرف 2 منٹ میں مکمل کر سکتا تھا لیکن ریوا اور چھیننے کے دوران ہی ڈرائیور نے گاڑی روک دینی تھی اور گاڑی کے رکتے ہی حفاظتی گاڑیوں سے نکل کر مسلح افراد نے مجھے گھیرے میں لے لیا تھا اور اس طرح میں ٹیکسی میں کڑے سے بندھا ہوا ہی ان کے قابو میں آجاتا۔ بغرض مجال میں پہلے سے ان پر فائر بھی کرتا تو لینے ہوئے آدمی اور ڈرائیور پر دو گولیاں چلانے کے بعد پہلے میں صرف 5 گولیاں باقی رہیں اور نگرانی کرنے والے مجھے ہلاک کرنے کے بجائے ٹیکسی میں ہی، مجھ پر قابو پالیتے۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ڈپٹی تانؤ کے باعث میں فوری طور پر اس منصوبے پر عمل کرنے سے قاصر رہا یا بھی قدرت کو ہی منظور نہ تھا کہ مجھے رتبہ شہادت سے نوازتی اور ابھی کڑے امتحانوں سے گزرتا میرا مقدر تھا۔

سبزی منڈی اسٹیشن کی کار پارکنگ میں ٹیکسی جا کر رکی لیکن مجھے کڑے سے اس وقت تک آزاد نہ کیا گیا جب تک کہ تینوں حفاظتی گاڑیاں بھی پارکنگ میں جا کر رک نہ گئیں اور ان میں سے بارہ تیرہ افراد نکل کر مختلف اطراف میں پھیل نہ گئے۔ کڑے کی چابی ڈرائیور کے پاس تھی۔ میں ٹیکسی سے نکلا اور آہستہ آہستہ قدموں سے پلیٹ فارم کی جانب چل پڑا۔ میں نے کئی بار دائیں بائیں اور پلیٹ فارم کی سیڑھیوں پر جوتے کے تسمے باندھنے کے بہانے جھک کر پیچھے دیکھا۔ مگر ان مختلف جگہوں پر خود کو چھپا چکے تھے۔ وہ شاید اس انتظار میں تھے کہ میں پلیٹ فارم کے اندر چلا جاؤں تو وہ ایک ایک کر کے اپنے لئے پہلے سے مخصوص جگہوں پر چلے جائیں۔ پلیٹ فارم کے اندر بھی مجھے فوجی ہیر کٹ والے لوگ دکھائی نہ دیئے۔ میں بہت ہی آہستگی سے اور ہیڈ برج کی طرف بڑھنے لگا۔ پلیٹ فارم پر بک اشال اور چائے کے اشال پر یونہی کھڑے میں نے چھ سات لوگوں کو دیکھا جو میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ آگے بڑھ کر اچانک واپس چلنا شروع کیا تو ان کی نگاہیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ یہ لوگ یقیناً DMI کے فیلڈ ایجنٹ تھے۔ نیچلے رینکس کے ان لوگوں کو جتنا بھی سمجھا جائے یہ اپنی کسی نہ کسی حماقت سے خود کو دکھا کر دیتے ہیں۔ میں نے ”مسلم پانی“ کے مشکوں سے پانی پیا اور پھر پل کی طرف چل دیا۔ پل کے دوسری طرف کی سیڑھیاں اترنے تک میں نے تقریباً 16 ایسے آدمی مارک (Mark) کئے۔ جو بلاوجہ وہاں موجود اور مجھ پر نظر میں گاڑے ہوئے تھے۔ چند منٹ میں نے سڑک کے موڑ پر کھڑے ہو کر سڑک کا جائزہ لیا۔ سڑک پر دونوں اطراف چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں اور ان پر بھی ”گاہک“ کھڑے تھے۔ جو سامان خریدنے کے بجائے میری طرف متوجہ تھے۔ میں واپس چلنا اور پل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میرے بیان کے مطابق Contact نے مجھے پل یا پلیٹ فارم پر ملنا تھا۔ پل کے اوپر نگرانی کرنے والے جوں کے توں کھڑے تھے۔ کم تعلیم یافتہ یہ پانی یا حوالدار تک کے عہدے کے لوگ صرف آرزو کی تعمیل پر ہی حرکت بھی کرتے ہیں۔ میری نگرانی کرنے کے احکام پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے ایک لمحے کو بھی اپنی نظریں مجھ پر سے نہ ہٹائی تھیں 22 بجوں کو آگ بے سواتے سورج کے نیچے یہ پل پر ایسے کھڑے تھے جیسے جیسے ہوں۔ صرف ان کی نگاہیں میرے تعاقب میں ادھر سے ادھر ہو رہی تھیں۔ میں پلیٹ فارم پر آ گیا۔ چائے کے اشال اور بک اشال پر وہی لوگ موجود تھے۔ میں بک اشال پر کھڑے ایک شخص کے پاس پہنچا اور سرگوشی میں اسے کہا کہ مجھے ٹوائٹ جانے کی ضرورت ہے، میرے ساتھ ویٹنگ روم تک چلو۔ وہ حیران و پریشان میری طرف منہ پھاڑے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر تم میرے ساتھ نہ گئے تو تمہارے افسر سے بہت ناراض ہوں گے کہ تم نگرانی کیلئے میرے کہنے کے باوجود میرے ساتھ نہیں گئے۔ میں اسے یہ کہہ کر ویٹنگ روم کی طرف چل پڑا۔ چند قدم چل کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اور اس کے ساتھ کھڑا دوسرا آدمی میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ میں ویٹنگ روم میں گیا اور چند منٹ بعد فارغ ہو کر ویٹنگ روم سے باہر آ گیا۔ یہ دونوں مگر اس ویٹنگ روم میں کھڑے تھے، میرے باہر آنے کے ساتھ ہی وہ بھی باہر آ گئے۔ میں بک اشال پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ اشال پر پہنچے تو میں نے انہیں کہا کہ اب پہلے کی طرح یہیں کھڑے رہو۔ یہ کہہ کر میں پھر پل کی جانب بڑھ گیا۔ پل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا تو بک اشال پر کھڑے دونوں مگر اس اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ اس آپریشن کو مانیٹر کرنے والے یقیناً اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں موجود تھے۔ میں نے پل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ اس بار لا زماً فرائی کوشش کروں گا، وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اب ساڑھے دس سے بھی چند منٹ اوپر ہو چکے تھے اور گیارہ بجے تک انہوں نے مجھ واپس لے جانا تھا۔

میں پل کی دوسری جانب سڑک کے موڑ پر آ گیا۔ میں نے سوچا کہ اب وقت آچکا ہے بجائے نگرانوں کے کھوج میں دماغ کو ادھر ادھر بھٹکانے کے اپنی پوری توجہ فرار پر مرکوز رکھوں، اب مجھے مین روڈ کی طرف جانے والے ٹرک کی تلاش تھی، چند منٹ بعد ہی ایک ٹرک دور سے آتا دکھائی دیا۔ میں نے نگرانوں کی توجہ ہٹانے کے لئے پل کی جانب چلنا شروع کیا۔ میں نے سوچا تھا کہ ٹرک کے موڑ تک پہنچنے اور رفتار کم کرنے تک پل کی صرف تین یا چار سیڑھیاں چڑھوں گا۔ میرا رخ پلیٹ فارم کی طرف دیکھ کر نگران اسی جانب متوجہ ہو جائیں گے۔ میں یکبار پلٹ کر بھاگوں گا اور ٹرک کے پیچھے لٹک جاؤں گا۔ ٹرک میں روڈ پر پہنچنے کا تو یقیناً مین روڈ پر داخل ہونے کیلئے دونوں جانب آتی جاتی ٹریفک میں اپنا راستہ بنانے کیلئے رے کا گیا آہستہ ہو جائے گا اور میں ٹرک سے دو کر مین روڈ کی بائیں جانب بھاگوں گا اور سڑک کی دوسری جانب کی گلیوں میں غائب ہونے کی کوشش کروں گا۔

ٹرک قریب آئی تو میں یکبارگی پلنا اور تیزی سے سیڑھیاں بھلا گتے ہوئے ٹرک کے قریب پہنچ گیا اس ٹرک کے پیچھے زنجیریں لگی تھیں۔ میں نے سڑک کے عقبی کھلنے والے تختے کو اچھل کر دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام لیا۔ ٹرک اس دوران موڑ کاٹ کر اپنی رفتار بڑھا چکا تھا۔ یہ سارا عمل تین سیکنڈ سے بھی کم وقت میں پورا ہوا۔ میرے اس غیر متوقع اقدام سے نگران اتنے حواس باختہ ہو چکے تھے کہ کوئی رد عمل نہ کر سکے۔ ٹرک میں روڈ پر پہنچنے کے قریب تھا کہ مجھے بیٹیاں بچنے کے ساتھ ساتھ پستول کی گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو پل کے پاس کھڑے نگرانوں کے علاوہ سڑک پر گاڑوں کے روپ میں کھڑے نگران بھی دوڑ رہے تھے۔ میں روڈ آتے ہی ٹرک آہستہ ہوا تو میں نے ٹرک سے چھانگ لگائی اور مین روڈ پر بائیں جانب بھاگنا شروع کر دیا۔ تفتیشی کمرے میں جم پر جوتھ دیکھا گیا تھا، ان چوٹوں کا درد مجھے بھاگتے ہوئے اپنی ٹانگوں میں محسوس ہوا۔ میرا پیچھا کرنے والے مین روڈ تک پہنچ چکے تھے اور میرے لئے تیز بھاگنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں روڈ پر ایک پھیلنے کا درخت تھا۔ ایک لمحے کو وہاں رک کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو نگرانوں کو نظر نہ آنے البتہ دو گاڑیاں بڑی تیزی سے میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ میں نے ٹریفک سے بھری سڑک کو اتنی تیزی سے کراس کیا کہ کئی گاڑیوں کو ایمر جنسی بریک لگانی پڑی۔ سڑک کے دوسری جانب پہنچنے ہی میں نے فٹ پاتھ پر آگے دوڑنا شروع کیا۔ میری طرف آنے والی گاڑیاں سڑک کے بائیں جانب تھیں جبکہ سڑک کے دائیں جانب آگے بھاگ رہا تھا۔ پچاس قدم کے فاصلے پر میں نے اپنی طرف آنے والی ایک پرائیویٹ گاڑی کو فٹ پاتھ کے ساتھ رکتے دیکھا۔ اگرچہ میرے منصوبے میں یہ بات شامل نہ تھی۔ لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر میں یہ گاڑی چھین لوں تو تعاقب کرنے والی گاڑیوں کے الٹی جانب بھگا کر لے جاؤں گا، ٹریفک کے رش میں تعاقب کرنے والی گاڑیاں بوٹرن (u-tem) لینے میں لامحالہ کچھ وقت صرف کریں گی اور اس دوران میں ان کی پہنچنے سے دور نکل چکا ہوں گا۔ میں نے اپنے بھاگنے کی رفتار بڑھائی۔ سڑک کی دوسری جانب تعاقب کرنے والی گاڑیاں میرے بالکل متوازی پہنچ چکی تھیں۔ پرائیویٹ گاڑی کا ڈرائیور گاڑی سے نکل رہا تھا کہ اس کے سر پر پہنچ گیا۔ ہتھیار تو میرے پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے اس کی کبھی پر ہاتھ کی زوردار ضرب لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر سڑک پر گر گیا، اس کے ہاتھ سے چابی چھین کر میں گاڑی میں داخل ہوئی رہا تھا کہ مجھے فائر کی آواز کے ساتھ ساتھ اپنی دائیں پنڈلی میں گولی لگنے کا احساس ہوا۔ پنڈلی کے درمیانی حصے میں محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے دھتکے کو کسے رکھ دیے ہوں۔ میں نے چابی انکیشن میں ڈالی اور گاڑی اشارت کر لی۔ گاڑی کو سڑک پر ڈالتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نگرانوں کی گاڑیوں میں نکلے ہوئے دو افراد سڑک کو ادھا کر اس کرچکے تھے اور جو بھی ان کے سامنے ٹریفک ہتی وہ مجھ پر فائر کر دیتے۔ گاڑی کی باڈی کے اگلے حصے پر پانچ چھ گولیاں ضرور لگی ہوں گی۔ غالباً وہ پوری سڑک اس لئے کراس نہیں کر رہے تھے کیونکہ انہوں نے مجھے گاڑی چھیننے اور اس میں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے گاڑی پوری رفتار سے چلا دی اور پل والی سڑک سے بھی کافی آگے نکل آیا۔ مجھے اپنے فرار میں کامیابی کا یقین ہو چلا تھا۔ میری دائیں پنڈلی سے خون مسلسل بہ رہا تھا۔ لیکن ان حالات میں اس طرف دھیان دینے کا وقت نہ تھا۔ Back view mirror میں دیکھا کہ نگرانوں کی دو گاڑیوں سے مختلف دو اور گاڑیاں انتہائی تیز رفتاری سے دائیں بائیں ہوتی اور ٹریفک کو چرتی میری گاڑی کے قریب آ رہی تھیں۔ میں نے پورا ایک سیکنڈ بے خبری دیکھا لیکن بھارت کی بی بی ہوئی اس ہندوستان نامی گاڑی کی رفتار نہ بڑھ سکی۔ میرا پیچھا کرنے والی دونوں گاڑیاں اب بالکل میرے پیچھے تھیں اور ہمارے درمیان اب کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ان گاڑیوں سے غالباً رائل برداروں نے فائر کھول دیا اور چند ہی لمحوں میں گاڑی کے دونوں پچھلے ٹائر کیے بعد دیگرے سرسٹ ہو گئے۔ گاڑی لڑکھڑائی لیکن میں نے اسٹیرنگ پر قابو رکھ کر اسے اٹھنے سے بچالیا۔ ٹائر پھٹنے کی وجہ سے رفتار خود بخود کم ہو چکی تھی۔ میں نے بریک لگا کر گاڑی کو روکا اور اسٹیرنگ پر سر رکھ دیا۔ میری کامیابی منزل کو چھوڑتے چھوڑتے ناکامی میں بدل چکی تھی۔ تفتیشی ٹیم نے میرے وہم گمان سے بھی زیادہ حفاظتی اقدام کر رکھے تھے۔ پل والی سڑک جہاں مین روڈ سے ملتی تھی۔ وہاں سڑک کے دونوں اطراف مسلح نگرانوں سے بھری دو گاڑیاں ایک دوسرے سے مخالف سمتوں میں کھڑی تھیں جن کا آپس میں اور اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں مانیٹرنگ ٹیم سے رابطہ تھا۔ پیچھا کرنے والی ایک گاڑی میری گاڑی کے آگے اور دوسری سائڈ میں رک گئی۔ مجھے سمجھ کر ہر بار نکالا گیا۔ انتہائی تیزی سے میری تلاش لی گئی اور مجھے سائڈ والی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دھکیل دیا گیا۔ میری دونوں جانب دو گاڑیوں بیٹھے گئے جنہوں نے میرے ہاتھ پشت پر باندھے اور آنکھوں پر پٹی باندھی۔ اگلی سیٹ پر ان کو کوئی افسر بیٹھا تھا جو اسے ٹانگی پر کھینچ لگا کر ہم نے اسے گرفتار کر لیا ہے۔ اس کے کہنے پر گاڑی نے میری جیب سے 5 ہزار کی گڈی اور کائی سے گھڑی اتاری۔ میری پنڈلی میں شدت سے درد ہو رہا تھا لیکن میں نے زبان کو دانتوں میں سمجھ کر آہ تک نہ بھری۔ میرا منصوبہ بنا کام ہو چکا تھا اور میرے پاس اب خود کو حالات کے سپرد کرنے کے کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

منصوبے کی ناکامی کی مایوسی اور پنڈلی میں گولی لگنے کے درد سے میں نیم غنودگی کی حالت میں تھا۔ میری اس وقت کی حالت بالکل ویسی تھی جیسے کسی مجرم کو چھانسی کے تختے کی طرف جاتے وقت ہوتی ہوگی بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ۔ کیونکہ چھانسی پانے والا تو چند لمحوں میں ہر قسم کے دکھ درد سے آزاد ہو جاتا ہے جب کہ میرے اوپر ابھی تشدد کے پھاڑ توڑنے اور ظلم کے نئے نئے تجربے ہاتھ کئے جاتے تھے۔

غازی

نامعلوم کس وقت گاڑی رکھی مجھے کھینچ کر باہر نکالا گیا۔ تالہ کھلنے اور دروازہ کھولنے کی آواز آئی اور اتنی بے دردی سے دھکادے کر مجھے پھینکا گیا کہ میرا سر سامنے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ بغیر میری پٹی اتارے اور ہاتھ کھولے دروازہ بند کر دیا گیا۔ درد کی شدت سے مجھے بے حد پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے دو تین بار پانی مانگا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میرے والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بڑی سے بڑی مصیبت میں اگر کر بلا کے شہیدوں کے دکھاؤ نکالو کیا کو یاد کرو تو تمہیں اپنے دکھاؤ نکالو بہت پیچھے نظر آئیں گی۔ کر بلا والوں نے تین دن بھوک اور پیاس میں گزارے تھے۔ جب کہ میں نے اپنی پیاس صرف ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے بجھائی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے دیوار سے ٹیک لگائی۔ ہاتھ پیچھے بندھے ہونے کی وجہ سے میں لیٹ نہ سکتا تھا ہاتھوں سے ٹٹول کر مجھے معلوم ہوا کہ میں اینٹوں کے فرش پر پڑا ہوں۔ پکھا بھی کوئی نہ تھا۔ کمرہ تندہوری طرح تپ رہا تھا۔ نامعلوم میں کتنی دیر اسی حالت میں پڑا رہا۔ پنڈلی میں گولی لگنے کی وجہ سے میری ساری ٹانگ میں انتہائی درد ہو رہا تھا میں نے بڑی مشکل سے زخمی ٹانگ کو ہلایا اور اسے ایک دو بار فونڈ کیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ گولی لگنے سے میری ٹانگ کے سامنے کا گوشت اور ہڈی کا کچھ حصہ ٹوٹ کر علیحدہ ہو چکا تھا لیکن ٹانگ کی ہڈی پوری طرح ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ میں نے کروٹ کے بل لیٹنے کی کوشش کی تو ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے بازو میرا وزن زیادہ دیر نہ سہار سکے۔ دیوار سے ٹیک لگانے میں ہی بہتری نظر آئی ٹانگ کے زخم سے بہتے خون کو کسی حد تک روکنے کیلئے میں نے اس ٹانگ کو فونڈ کر لیا مجھ پر غنودگی طاری ہوتی جا رہی تھی میں نے بھی اسی میں عافیت سمجھی یہ بھی اللہ پاک کا کرم ہے کہ غنودگی اور بے ہوشی کی حالت میں جا بے کچھ عرصہ کیلئے ہی دکھ درد کا احساس ختم ہو جاتا ہے نامعلوم میں کتنی دیر اسی حالت میں پڑا رہا کہ مجھے تین چار زوردار ٹھڈے مارے گئے۔ میں ہوش میں آ گیا مجھے کھڑا ہونے کو کہا گیا لیکن باوجود کوشش کے میں کھڑا نہ ہو سکا۔ اس جرم کی پاداش میں میرے چہرے اور جسم پر ٹھڈوں کی بارش کر دی گئی جب پھر بھی میں کھڑا نہ ہو سکا تو مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا گیا اور مجھے دھکیلتے ہوئے کسی جانب لے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ زخمی ٹانگ کی وجہ سے میں ایک قدم بھی نہ چلا سکتا تھا۔ مجھے دھکیلا بھی جا رہا تھا اور گھسیٹا بھی جا رہا تھا۔ اسی حالت میں مجھے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ کچھ دیر بعد ایک کرخت آواز آئی۔ ”کیا تم اپنے پہلے بیان میں کچھ تبدیلی یا اضافہ کرنا چاہتے ہو یا اسی پر قائم ہو“ میں نے جواب دیا ”میرا پہلا بیان ہی سچ پر مبنی تھا“ تم نے فرار ہونے کی کوشش کیوں کی؟ ”کیا تم سمجھتے تھے کہ اپنی اس احمقانہ کوشش میں کامیاب ہو سکو گے۔ ان کے اس سوال کا میں نے جواب دیا۔ ”فرار ہونے کی کوشش میرا حق تھا میں نے کوشش کی۔ تاکہ کامی اور کامیابی تو بعد کی بات ہے۔“ میرا جواب سن کر وہ بھڑک اٹھے ”اب ہم اپنا حق استعمال کرتے ہیں۔“ میرے دونوں بازوؤں سے موٹا راڈز آرا گیا۔ میرے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے اور آنکھوں پر پٹی تھی اس لئے صرف محسوس ہی کر سکتا تھا راڈز کے دونوں سروں پر کنڈے اور سچ لگنے کی آواز آئی اور راڈز نے مجھے اوپر اٹھانا شروع کیا اور تھوڑی دیر ہی میں میرے دونوں پاؤں زمین سے اٹھ گئے۔ میرے جسم کا سارا بوجھ میری بغلوں اور کندھوں پر پڑ گیا۔ اوپر اٹھانے سے پہلے ایک مضبوط پٹی میری کلائیوں کے گرد لپیٹ کر اسے میرے پیٹ پر کس کر باندھ دیا گیا تھا۔ میرے جسمانی وزن کی وجہ سے راڈز میری بغلوں پر پیچھے اندر گھسا جا رہا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس اذیت سے نکلنے والی چیونٹیوں کو روک رکھا تھا اور ہر چیونٹی کو اللہ میں بدل کر منہ سے نکالتا تھا۔ راڈز کے دباؤ کی وجہ سے میرے ٹھٹھے بے جان ہو رہے تھے۔ منہ سے صرف اللہ کی آواز آرہی تھی۔ بت پرست اپنے درمیان اللہ کا نام سننے کی تاب بھلا کہاں رکھتے تھے۔ انہوں نے میری ٹانگوں پر بنشر مارنے شروع کر دیے۔ چند لمحے بہت درد ہو لیکن اللہ پاک کا سزا ہے میرا دماغ سن ہوتا چلا گیا اور لہجہ لہجہ درد کا احساس کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا نہ معلوم کتنی دیر وہ میرے بے ہوش جسم کوئی نشا نہ ختم ہوتا رہے۔ مجھے ہوش آیا تو میرے ہاتھ کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں کی پٹی بھی اتار چکی تھی بڑی مشکل سے میں آنکھیں کھولنے کے قابل ہوا۔ میرے جسم کا ایک ایک حصہ درد سے پھٹ رہا تھا بڑی مشکل سے میں نے گردن گھما کر دونوں طرف دیکھا۔ یہ 10x8 فٹ کا سیل تھا۔ میں فرش پر پڑا تھا سامنے مضبوط سلاخوں والا بڑا دروازہ تھا اور برآمدے میں دو مسلح گارڈ اسٹنولوں پر بیٹھے میری نگرانی کر رہے تھے۔ کمرے میں ایک کونے میں مٹی کا گھڑا اور پیلا تھا۔ رفع حاجت کیلئے ٹولے ہوئے گھڑے کا نچلا حصہ دوسرے کونے میں پڑا تھا۔ دن ڈھلتا ہو محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ چند روزی رات کے بعد یہ کالا دن تھا یا دوسرا دن میرے ٹانگ کے زخم پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ران کے جوڑے لے کر پاؤں تک زخم والی ٹانگ بری طرح سوجی ہوئی تھی۔ میں بڑی مشکل سے کھسکتا ہوا گھڑے تک پہنچا اور پانی پیا۔ زخمی ٹانگ سے خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ جتنے ہوئے خون کے نشان فرش سے ہوتے ہوئے سیل کے دروازے کے باہر نالی تک چلے گئے تھے۔ اس سیل کے باہر کوئی چار دیواری تھی سامنے کوئی 50 فٹ کے فاصلے پر (Toilets) ٹوائیٹس کی قطار تھی جس کے پیچھے ایک اونچی دیوار پر خاردار تاروں کی بانڈھ لگی ہوئی تھی۔

پہرے داروں نے مجھے پانی پیتے ہوئے خاموشی سے دیکھا۔ میں گھسٹتا ہوا پھر سیل کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، میرے دونوں بازو راڈز کی وجہ سے بے جان ہو چکے تھے۔ میں نے بہت ہی دشواری سے گھڑے سے پانی نکالا تھا اور میں نے بازوؤں کو حرکت کے قابل بنانے کے لئے ہاتھوں کی مٹھیاں کھولنی شروع کیں تاکہ بے جان ہٹوں میں حرکت سے جان پڑ سکے۔ پانی پینے کے بعد مجھے پیشاب کی حاجت ہوئی۔ میں نے گارڈ کو کوا کہو تو جواب ملا۔ دروازے کے ساتھ والی دیوار پر کوا اور بعد میں پانی بہا دو میں نے بڑی مشکل سے یہ کام انجام دیا۔ پیشاب کے ساتھ خون بھی آیا۔ شاید میرے گردوں پر بھی انہوں نے طبع آزمائی کی تھی۔ شام ڈھلتے ہی دال اور روٹی پر مشتمل کھانا آ گیا۔ گارڈ نے اپنی اوقات دکھائی۔ دال کا پیالہ سلاخوں میں سے عین اس جگہ پر مجھے تھا۔ جہاں حاجت سے فارغ ہو کر میں نے پانی بہایا تھا اور روٹی بھی اسی جگہ سے تھماتے ہوئے جان بوجھ کر فرش پر گرا دی۔ دو چپاتیاں تھیں میں نے اوپر والی چپاتی کھالی اور نیچے والی دال کے پیالے کے ساتھ لوٹا دی۔ چپاتی کھاتے ہوئے مجھے ہر نوالہ چباتے ہوئے کچ کچ کچ کی آواز آتی تھی (فرار کے بعد بمبئی میں مکمل میڈیکل چیک اپ سے معلوم ہوا کہ میری استروئیں اور معدے میں ٹشٹے کے باریک ذرات چھبے ہوئے ہیں) رات کو پھر مجھے کلائیوں میں رسی اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر ٹار پیل سیل میں لے جایا گیا۔ وہاں میری آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ زخمی ٹانگ کی وجہ سے میں بغیر سہارے کے کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ تفتیشی ٹیم کے افراد نے مجھ سے پوچھا Do you want to say some thing (کیا تم کچھ کہنا چاہتے ہو) میں نے جواب دیا۔ Yes you are swines (ہاں! تم سو رکی اولاد ہو) میں چاہتا تھا کہ وہ اشتعال میں آ کر مجھ پر فوری سخت تشدد شروع کر دیں تاکہ میں جلد ہی بے ہوش ہو جاؤ اور تشدد کی تکلیف کے احساس سے بچ جاؤں۔ میری دی ہوئی گالی سن کر تفتیشی ٹیم کا ایک رکن کرسی سے اٹھنے لگا لیکن سہارہ نہ اسے بٹھا دیا اور کہا ہم نے تم کو بہتر سبق دینا ہے۔ (Dont worry. we will give him a beter lesson) (فکر نہ کرو۔ ہم اسے اچھا سبق پڑھا دیں گے) اس کے کہنے پر گارڈ نے مجھے گھسیٹتے ہوئے ایک لمبی میز پر لے گئے۔ جس پر لٹا کر میرا جسم گردن سے پاؤں تک چمڑے کی پٹیوں سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ میں ذرا سی بھی حرکت کے قابل نہ رہا۔ پھر میرے ایک کان کو گیلیا کر کے ایک کلپ لگا دیا گیا جبکہ دوسرا کلپ میرے پوشیدہ عضو پر۔ یہ تھوڑی ڈگری نارنج تھا۔ جس کا مجھے نشان نہ بنایا جانے والا تھا۔

بھنگرے پیر کار، نازی جرمنی کا ”سواستکار“ کے نشان کو پوجنے والے یہ بھارتی ہندو اپنے ظلم و ستم میں نازیوں سے بھی چند قدم آگے تھے۔ مجھے بجلی کے جھکے دینے کے لئے میرے جسم پر لگائے گئے دونوں کلیوں کو بجلی کی تاروں سے منسلک کر دیا گیا۔ جن کے دوسرے سرے ایک مشین (جسے غالباً Mango electric کہا جاتا ہے) میں لگے ہوئے تھے۔ اس مشین کے پینڈل کو گھمانے سے 4 سو واٹ سے بھی زیادہ بجلی نہایت مختصر وقت اور قوتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مختصر وقت کے جھکے انسان کو ہلاکت نہیں کرتے لیکن اتنے تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتے ہیں جسے قلم تحریر کرنے سے عاجز ہے۔ میرے منہ میں اکثر کپڑے اٹھائے دیا گیا۔ اور مشین کا پینڈل گھمایا جانے لگا۔ اتنی ہائی وولٹیج کی بجلی سے میرے جسم کو قوتوں سے داغا جا رہا تھا۔ پہلے جھکے سے ہی مجھے ایسے محسوس ہوا کہ میرا کلیجہ اور دل میرے حلق میں آگے ہیں۔ انتہائی مضبوطی سے بندھے ہونے کے باوجود میرا جسم ہر جھکے سے پھڑپھڑاتا اور کئی کئی انچ اس ٹیبل سے اچھلتا۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا دوران خون رک گیا ہے اور دل کی دھڑکن بند ہو چکی ہے۔ میری آنکھیں شدت تکلیف سے حلقوں سے باہر آرہی تھیں اور دماغ کی نہیں پھٹ رہی تھیں۔ میری سانس رک رہ گئی۔ میں تشدد کے اس شدید ترین عذاب سے گزر رہا تھا جسے تحریر کرتے وقت آج بھی میرا جسم تھرا اٹھتا ہے۔ نامعلوم کتنی دیر مجھے بجلی کے جھکے دیئے جاتے رہے۔ کیونکہ جب مجھے ہوش آیا اور میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو میں اپنے Cell میں تھا اور سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بس دیکھ سکتا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کون ہوں، کہاں پر ہوں اور مجھ پر کیا گزری ہے۔ کافی وقت اس کیفیت میں گزر گیا۔ پھر آہستہ آہستہ حواس بحال ہونے لگے اور یادداشت جو بالکل ختم ہو چکی تھی لوٹ آئی۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا جسم کے ایک ایک حصے میں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہزاروں سوئیاں چھبوی گئی ہیں۔ میری آنکھوں کے پیوٹے بھی حرکت کرنے سے قاصر تھے۔ بھوک اور پیاس کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ شام تک بڑی مشکل سے اس قابل ہو سکا کہ پانی کے گھڑے تک پہنچنے کے پانی پی سکوں۔ میرے کلپ والے کان اور ناک سے خون نکل نکل کر جم چکا تھا۔ پانی پینے کے ساتھ ہی ابائی آئی اور ساریا باہر آ گیا۔ میری جو کیفیت تھی میں اسے بیان کرنے سے عاجز ہوں۔ اسی حالت میں تھا کہ گارڈ نے Cell میں کھانا رکھ دیا۔ میں تو بانی بھی بھضم نہ کر سکتا تھا، کھانا کیسے کھاتا۔ ایک عجیب بات تھی کہ میری زخمی ٹانگ کا درد ختم ہو چکا تھا۔ مجھے یہی محسوس ہوا۔ حالانکہ حقیقت میں سارے جسم میں شدید درد کی لہریں ٹانگ کے درد پر حاوی ہو چکی تھی۔ نامعلوم کس وقت گارڈ نے آئے اور مجھے گھسیٹتے ہوئے اسی عتوبت خانے میں لے گئے۔ ٹیم کے افراد مجھ سے کچھ پوچھ رہے تھے کیا پوچھ رہے تھے مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا میرے جواب نہ دینے پر مجھ پھنڈوں کی بارش کر دی گئی لیکن شاید میرا جسم بے حس اور حواس مکمل بحال نہ ہونے کی وجہ سے مجھے بہت تھوڑا درد ہوا۔ کئی آدمی مجھے دونوں اطراف سے ٹھڈے مار رہے تھے اور میں اٹھتا ہوا ادھر سے ادھر ہو رہا تھا۔ میری یہ حالت دیکھ کر کسی نے انہیں مزید تشدد سے روکا۔ نیم غنودگی کی حالت میں مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ کسی نے میرا بلڈ پریشر دیکھا۔ زخمی ٹانگ پر پٹی پٹی لگائی اور تین آنکھشن دیئے۔ پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

مجھے ہوش آیا تو اتنا جانک تھا کہ میں ہڑبڑا گیا۔ کسی نے پانی کی پوری بائوٹی مجھ پر اٹھیل دی تھی۔ میں اٹھو نہ نہ کہہ سکتا تھا کہ ایک گارڈ ہائوٹ لے کھڑا اور سیل کے باہر تین آدمی کھڑے تھے۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر ایک آدمی نے اشارہ کیا تو وہ گارڈ سیل میں داخل ہوئے اور مجھے کھینچ کر دیوار کے ساتھ میری ٹیک لگادی۔ ایک اور گارڈ سیل میں آیا اور چائے میں سکٹ بھلو کر مجھے سکٹ کھلائے اور چائے پلائی۔ اس کے بعد سو بیلیں لباس پہننے والی سیل میں آئے انہوں نے میرا بلڈ پریشر چیک کیا۔ ٹانگ کے زخم کی پٹی بدلنی پانی کے ساتھ چند گولیاں مجھے کھلائیں دو آنکھشن لگائے۔ ایک گارڈ نے سگریٹ جلا کر مجھے دیا۔ میں نے ایک ہی کش گھینچا تھا کہ شدید کھانسی کی وجہ سے دہرا ہو گیا۔ اس کے بعد دو تین گارڈ نے مجھے کھڑا کیا اور میری گرفتاری کے وقت پہنا ہوا لباس اتار کر سلٹی ٹھیس اور پا جامہ جو پہلے سیل میں مجھے دیا گیا تھا، پہنایا۔ غالباً ڈاکٹر تھا جس نے مجھ سے کچھ پوچھا، کچھ سمجھ آنے کے باوجود میں نے بولنا چاہا تو زبان نے ساتھ نہ دیا اور میں تھکا کر رہ گیا (بجلی کے جھکوں کا بھجھ پڑا شدید اثر ہوا تھا کہ آج 23 برس گزرنے کے بعد بھی میں بڑی مشکل سے اپنی ہیکلا ہٹ پر قابو پاتا ہوں اور میری بائیں آنکھ کا ڈھیلا (Eyeball) بھی بعض اوقات صبح جگہ پر نہیں رہتا۔ مجھے دیکھنے اور خصوصاً تیسری ڈائمینشن (3rd Dimension) میں فاصلے کا اندازہ لگانے میں خاصی دقت ہوتی ہے۔

مجھ پر یہ میرا پانی میری ہمدردی یا انسانیت کے جذبے کے تحت نہیں ہو رہی تھی بلکہ مجھے مزید تشدد پہننے کیلئے تیار کیا جا رہا تھا جس کا ثبوت آئندہ دنوں میں مل گیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا جب مجھے ہوش میں لایا گیا لیکن میں دن اور رات سے بالکل بے خبر تھا اور نہ ہی مجھے معلوم تھا کہ کتنے گھنٹوں یا دنوں میں بے ہوش رہا تھا۔ رات کا کھانا مجھے اسی ذالالت کے ساتھ سلاخوں کے نیچے سے فرش کو چھوتا ہوا دیا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ گارڈ زاپوہ کے حکم پر نہیں بلکہ مجھ پر محض مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنی ازلی نفرت کا اس طرح اظہار کر رہے تھے۔

اس رات مجھے اترو گیشن کیلئے نہیں لے جایا گیا۔ دوسرے روز دن کو ڈاکٹر پھر آیا۔ میری پٹی تبدیل کی۔ آنکھشن لگانے اور دو کی گولیاں دیں۔ میری ٹانگ کا زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو رہا تھا، سوجن اور درد میں کمی ہوئی تھی۔ اس رات مجھے پھر تفتیشی عتوبت خانے میں لے جایا گیا۔ تفتیشی ٹیم کے سربراہ نے مجھ سے پوچھا ”اب کیسا محسوس کر رہے ہو“ میں نے جواب دیا کہ زندہ ہوں۔ اس نے کہا ”تم بھی یہی چاہتے ہیں کہ زندہ رہو اور ہمارے سوالوں کے جواب دو“۔ میں خاموش ہو گیا۔ تفتیشی ٹیم کے کسی فرد کے اشارے پر چارپانچ گارڈ نے مجھے زمین پر لٹا کر دیو بوجھ لیا۔ ایک گارڈ نے لوہے کے ایک چھینٹے گلو سے میرا منہ کھولا اور منہ کھلا رکھنے کے لئے میرے تالو اور زبان کے درمیان کوئی چیز بھنسا دی۔ ریز کی ایک گلی میرے منہ میں حلق تک ڈال دی گئی۔ اس گلی کے دوسرے سرے پر ایسا (جلاب) دینے والا سلنڈر نما برتن تھا۔ اس کے ذریعے بہت زیادہ صابن ملے ہوئے پانی کو دوبارہ میرے پیٹ میں داخل کیا گیا۔ اتنی زیادہ مقدار میں صابن ملے پانی نے میرے پیٹ کو آخری حدوں تک پھیلا دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرا پیٹ پھٹ جائے گا۔ انہوں نے بس نہ کیا بلکہ اور پانی میرے پیٹ میں ڈالنے لگے۔ اس دوران گارڈ نے زنجیر سے بندھے دوڑنے میں ناگوں میں ڈال دیئے تھے جب پانی میری باجھوں سے باہر بہنے لگا تو انہوں نے میرے منہ سے گلی اور منہ کھلا رکھے والا لوہے کا ٹکڑا نکال دیا پھر زنجیر میں گھسیٹیں اور میں ہوا میں الٹا معلق ہو گیا۔ منہ کے رستے سارے پانی اور تھوڑی سی کھائی ہوئی غذا نکل گئی۔ اس رات میرے ساتھ ہی عمل دہرا لیا گیا۔ پانی میں نامعلوم کیا ڈالا گیا تھا پانی نکلنے کے بعد میرے پیٹ میں آگ سی لگی گئی۔ اس آگ کی اتنی زیادہ تکلیف تھی کہ میں تڑپنے لگا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے پیٹ میں ہزاروں سوئیاں چھبوی گئی ہیں۔ میں ابھی ہوش میں تھا کہ گارڈ نے مجھے لکڑی کے ڈنڈوں سے بری طرح پھینٹنے لگے۔ درد کی شدت سے میں اونٹن ہوا گیا۔ یکبارگی میرے سر کے درمیان ایک زوردار ڈنڈا لگا مجھے سر کی کوہڑی ٹوٹنے کی آواز آئی۔ زوردار دھماکہ ہوا اور میرے حواس بالکل معطل ہو گئے۔

پہلی تفتیشی ٹیم نے بالکل درست کہا تھا کہ تم موت مانگو گے لیکن تمہیں مرنے نہیں دیا جائے گا۔ نامعلوم مجھے کب ہوش آیا۔ میرے لئے وقت دن اور رات کی تمیز ختم ہو چکی تھی۔ ایک عجیب بات میں نے محسوس کی۔ میرا جسم چوٹوں سے بھر پڑا تھا۔ ٹانگ کا زخم تشدد کی وجہ سے کھل چکا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ لیکن جسم میں کہیں بھی درد کا نام و نشان نہ تھا۔ میں نے جسم کے مختلف حصوں پر ہاتھ پھیرا لیکن چھونے کا احساس نہ ہوا۔ ٹانگ کے زخم پر بندھی پٹی اور پھر زخم پر ہاتھ لگایا لیکن تھوڑا دور ہوا اور نہ چھونے کا احساس۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن یہ سمجھ نہ آتا تھا کہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ میں نے سر پر ہاتھ پھیرا تو ہڈی ٹوٹنے کی جگہ پر ایسا محسوس ہوا جیسے چھوٹا سا اسپڈر بنا بیکر بنا ہوا میرا ہاتھ خون میں تھرا گیا لیکن درد نہ ہوا۔ میری بائیں آنکھ کے کونے سے بھی خون نکل کر جم چکا تھا۔ لیکن درد نہ تھا۔ صرف کانوں سے مسلسل شائیں شائیں کی تیز آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے اس کیفیت سے نکلنے کے لئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی تو دماغ میں دھماکہ ہونے لگے۔ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ شاید میں پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔

جب دوبارہ ہوش آیا تو دن کی روشنی تھی۔ میں کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ میرا غلاظت بھر لباں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ بے اختیار میرا دایاں ہاتھ میرے جسم کو ٹٹولنے لگا۔ میری کھوٹی ہوئی یادداشت آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔ جسم کے مختلف حصوں سے درد کی ٹپسیں بھی اٹھ رہی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹانگ کے زخم کو چھوا تو درد سے میری کراہ نکل گئی۔ نئی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جسم کے مختلف حصوں پر بینڈج لگے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو محسوس ہوا کہ ایک بڑی پٹی میرے سر کے زخمی حصے اور چہرے پر بندھی ہوئی ہے۔ لباں کی تبدیلی اور لمبی امداد میری بے ہوشی کے دوران کی گئی تھی۔ دو پہر کے قریب ڈاکٹر آیا۔ میری دوبارہ مرہم پٹی کی گئی۔ ڈاکٹر نے اپنی نگرانی میں مجھے دو دھ ملا دیہ کھلوایا۔ میری حالت دیکھ کر وہ بار بار سر کھجکتا تھا۔ مجھے آنکھشن لگاتے ہوئے اس نے آہستہ سے Barbarians (ظالم وحشی) کہا۔ اس نے مجھے چند گولیاں کھلائیں اور کچھ گولیاں مجھے دیتے ہوئے کہا کہ درد ہونے کی صورت میں کھالوں۔ میں اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی میری قوت گویائی واپس نہ آئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے اشاروں سے بتایا کہ میں بول نہیں سکتا ہوں۔ اس نے میرا منہ کھولا۔ چٹنی سے زبان کو پکڑ کر اوپر نیچے آگے پیچھے کیا۔ پھر دو آنکھشن میرے دائیں اور بائیں کانوں کے نیچے لگائے۔ میرے بازو کو تھپتھپاتا ہوتے ہوئے Dont worry you will be all right (فکر نہ کرو تم ٹھیک ہو جاؤ گے) کہا اور چلا گیا۔

غازی

یقیناً یہ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ اگلے تین روز مجھے سیل سے باہر نہ نکلا گیا۔ صبح ناشتے دو پہر اور رات کے کھانے میں مجھے صرف دلیہ ملتا رہا۔ اس دوران ڈاکٹر روز آتا اور میری مرہم پٹی کرتا۔ میری قوت گویائی اگر چہ واپس آچکی تھی لیکن میں نے خاموشی میں ہی مصلحت سمجھی۔ پیٹ میں صابن اور نامعلوم کیا کچھ ڈالنے سے مجھے مسلسل چپچسپ ہو رہی تھی اور بخار بھی تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو اشاروں سے بتایا تو اس نے گولیاں دیں۔ وہ مجھے بلاناغہ ہر روز 4 انجیکشن لگاتا تھا۔

میری صحت آہستہ آہستہ بحال ہو رہی تھی۔ چوتھے روز مجھے دو پہر کو سیل سے نکالا گیا۔ اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا۔ جب پٹی کھلی تو میں نے تفتیشی ٹیم اور ڈاکٹر کو دیکھا۔ وہ برآمدے میں پیڈسٹل پکھے کے سامنے بیٹھے تھے۔ برآمدے میں ایک طرف برف کے دو بلاک رکھے تھے برآمدے کے پیچھے کمرے اور سامنے چار دیواری تھی۔ چار دیواری میں ریٹ پڑی ہوئی تھی میرے کپڑے اتارے گئے اور مجھے ریٹ پر سیدھا لٹا کر میرے دونوں ہاتھوں اور پیروں پر پہرے داروں نے اپنے وزنی بوٹ رکھ دیئے تاکہ حرکت نہ کر سکوں۔ ریٹ اتنی گرم تھی جیسے جلنے تندو سے نکالی گئی ہو۔ میں اپنے منہ کو تختی سے بندکے دانتوں کو بچھپنے آہ کرہ کر کے روئے تھا۔ قریباً بیس منٹ بعد مجھے ریٹ سے اٹھایا گیا اور برآمدے میں رکھے برف کے بلاکوں پر لٹا دیا گیا۔ 10 چندرہ منٹ بعد مجھے پھر ریٹ پر لٹا دیا گیا۔ اس بار ریٹ پر لیٹنے کے وقت میں اضافہ کر دیا گیا۔ پھر برف پر لٹا دیا گیا یہ عمل 3 مرتبہ دہرایا گیا۔ میرا جسم بار بار گرم خنڈا ہونے کی وجہ سے سن ہو رہا تھا۔ جب تیسری بار مجھے ریٹ پر لٹا دیا گیا تو مجھے گرم ریٹ کی حدت کا احساس بہت کم ہوا اس بار برف پر لٹانے کے بعد جب مجھے پھر ریٹ کی طرف لے جایا جانے لگا تو ڈاکٹر نے چلا کر کہا Stop it. Stop it. Stop it now. He will be paralysed forever (بند کرو، ختم کرو۔ یہ زندگی بھر کیلئے مفلوج ہو جائے گا) تفتیشی ٹیم کا مقصد بھی یقیناً یہی تھا کہ اس عمل سے مجھ پر فاج گرجائے اور میں مر جاؤ۔ تفتیش کے دوران انہیں ہر قسم کے انتہائی تشدد کے باوجود میری زبان کھلوانے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اپنی ناکامی پر پروردہ ڈالنے کیلئے اب انہیں میرے مردہ جسم کی ضرورت تھی۔ میجر احسن پر کئے گئے تشدد کے دوران میجر کی شہادت کے بعد غالباً تفتیشی ٹیم کو تختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ پاکستانی جاسوس زبان کھولنے کے بجائے تشدد کی موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے انہیں ہلاک کرنے کے بجائے انہیں زندہ رکھ کر ایسا تشدد کیا جائے کہ وہ موت مانگیں اور انہیں موت بھی نہ ملے۔ شاید ایسی حالت میں ان کی قوت مدافعت ختم ہو جائے اور وہ بولنے پر مجبور ہو جائیں۔ تفتیشی ٹیم نے ڈاکٹر کے روکنے پر اس سے بحث شروع کر دی لیکن ڈاکٹر کے یہ کہنے پر خاموش ہو گئے کہ اگر تفتیش کرنا تمہاری ذمہ داری ہے تو ملازم کو زندہ رکھنا میری ذمہ داری ہے۔ اس وقت ملازم کی حالت ایسی نہیں کہ اس پر مزید تشدد کیا جائے۔ میری اجازت کے بغیر اگر تم نے ملازم کو Cell سے نکالا تو میں جہاز کو تمہارے خلاف رپورٹ کر دوں گا۔ یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر نے ہندی میں گاڑ زکو حکم دیا کہ مجھے کپڑے پہنانے چاہئیں۔ اس کے بعد ہندی لب و لہجے سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ پارسی مذہب کا ہے۔ کسی بندو ڈاکٹر سے ایسے سلوک کی توقع کرنا ہی فضول تھی۔

مجھے سیل میں واپس لایا گیا۔ ڈاکٹر بھی تھوڑی دیر میں سیل میں پہنچ گیا۔ اس نے خود کو اپنے ہاتھ سے میری پشت اور گرم ریٹ سے متاثرہ حصوں پر کوئی Ointment (مرہم) لگائی۔ انجیکشن دیئے۔ ٹانگ کی اور سر کی پٹی تبدیل کی۔ کمپاؤنڈ راس کے ساتھ تھکانے ڈاکٹر نے یہ سب کام خود کئے۔ غالباً وہ مرتے ہوئے انسان کی خدمت کر کے اس کی دعائیں لینا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہا تو اس نے سرگوشی میں کہا Never talk otherwise you will be taken again for torture (ہرگز مت بولو ورنہ تمہیں تشدد سہنے کیلئے دوبارہ لے جائیں گے) میں نے تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھا اور وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس روز کے بعد مجھے تشدد دیا تفتیش کے لئے نہیں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر ہر روز میری مرہم پٹی کے لئے آتا تھا۔ دو تین روز بعد میری خوراک میں تبدیلی کر دی گئی اور دلیہ صرف ناشتے میں اور دو پہر اور دن کے کھانے میں دال چپاتی ملنے لگی۔

میرے Cell پر پہرے داروں کو دو رکنی ٹیمیں تھیں۔ ہر ٹیم 8 گھنٹے پہرہ دیتی تھی۔ اللہ پاک کا کرم تھا کہ میں تیزی سے رو بصحت ہونے لگا۔ جسمانی اور دماغی کمزوری بے حد تھی لیکن ٹانگ اور سر کے زخمی بھرنے لگے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہر روز میرے Cell کو دھویا جانے لگا۔ ڈاکٹر کے حکم پر پی ریز کے پائپ سے سیل کے اندر مجھ پر پانی پھینک کر مجھے ہر دوسرے روز غسل کرایا جانے لگا۔ میں نے ڈاکٹر کی ہدایت گرہ میں باندھ لی تھی کہ ہرگز نہ بولوں۔ تفتیشی ٹیم کے ارکان دو تین مرتبہ آئے اور سیل کے باہر ہی مجھ سے ایسی باتیں کرنے لگے کہ میں شاید اچانک بول اٹھوں۔ میں ان کی ہر بات کا جواب زبان پر ہاتھ رکھ کر اس کے رہ جاتا اور وہ مجھے اور ڈاکٹر کو گالیاں بکتے واپس چلے جاتے۔

ڈاکٹر کی مسلسل دیکھ بھال اور دوائیوں کی وجہ سے خاصا ٹھیک ہو چکا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ پارسی ڈاکٹر کی وجہ سے ہی میں وقتی طور پر Torture سے بچ گیا لیکن ڈاکٹر آخر تک میری ڈھال بنا رہے گا میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فرار کے منصوبے سوچنے لگا۔ اسی روز جب ڈاکٹر آیا تو میں نے اسے سر کی پٹی تبدیل کرنے کے دوران آہستگی سے کہا Cell کے اندر ہی حاجت پوری کرنے سے مجھے بہت پریشانی اٹھانی پڑتی ہے اس شدید گرمی میں بے حساب کھینوں اور بدبو کی وجہ سے دماغ چھلنے کو آیا ہے۔ چپچس کی وجہ سے بار بار مجھے گھڑے کے ٹوٹے ٹکڑے کو ہی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ Cell کے سامنے ہی لیٹرین کی قطار ہے اگر گاڑ ضرورت کے وقت وہاں لے جایا کریں تو میں اس اذیت سے بچ جاؤں گا۔ میری حالت آپ دیکھ رہے ہیں کہ زخموں اور کمزوری کے باعث میں ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا اس لئے صبح پہرہ داروں کی موجودگی میں میرے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آپ پہلے ہی مجھ پر اتنی مہربانی کر رہے ہیں۔ جس کے لئے تازہ کاری میں آپ کا مشکور رہوں گا۔ اگر مزید یہ مہربانی کر دیں تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ ڈاکٹر نے خاموشی سے میری بات سنی اور سرگوشی میں ہی جواب دیا will try اور چلا گیا۔ سیل میں مرہم پٹی کرنے کے دوران اسے خود میری پریشانی کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا یقین تھا کہ اگر ڈاکٹر چاہے تو مجھے یہ بولت دلا سکتا ہے۔ تفتیشی ٹیم کا کام اگر مجھ سے راز گلوانا تھا تو ڈاکٹر کا کام مجھے زندہ رکھنا تھا۔ اسی لئے مجھ پر تشدد کے دوران تفتیشی ٹیم سے نہ صرف الجھ گیا تھا بلکہ اس نے تشدد بھی رکوا دیا تھا۔ یقیناً کوئی اعلیٰ عہدے کا افسر میرے کیس کا انچارج ہوگا اور ڈاکٹر کی اس تک ڈائریکٹ رسائی ہوگی۔ دوسرے روز ہی صبح کے وقت ایک لوہے کا کڑا میری بائیں کلائی میں پہنا دیا گیا گاڑ کماڈر جو نائب صوبیدار اور رکھ تھا، نے گاڑ زکو Cell کی چابی دی اور انہیں کہا کہ آئندہ مجھے حاجت کے لئے لیٹرین میں لے جایا جائے گا۔ میں رسی باندھ کر دوسرا ایک گاڑ پکڑ رکھے جب کہ دوسرا گاڑ اپنی رائفل تیار رکھے اور اگر میں بھاگنے کی کوشش کروں تو بلاتا خیر مجھے گولی ماری جائے۔ گاڑ کماڈر، گاڑ زکو، ہدایت دیکر مجھ سے مخاطب ہوا اور بچانی میں کہنے لگا کتنا گھبرو ہے تو اور تیرا جو حال ہو چکا ہے تو اگر نہ بولا تو اس سے بھی بدتر حال ہوگا اور اگر بولا تو پھر بھی تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ جہاں اتنا تشدد تو سہہ لیا ہے وہاں تھوڑا بہت اور سہہ لینا اس سے نکل کر اور صاف بات تو نہ کی لیکن بین السطور Between the lines مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میرے لئے بھی یہ آخری موقع تھا کہ فرار کی کوشش کروں۔ اس کوشش میں کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں میری نجات تھی۔ اتنے سخت تشدد کے بعد یہ وقت میرے لئے سنہری موقع تھا۔ زبان میں نے کھولی نہ تھی اور اب زمزمیہ تشدد سہنے کا مجھ میں حوصلہ بھی نہ تھا۔

میں نے اپنی پوری توجہ گاڑ زکو پر مہذول کر دی۔ دو دو گاڑ زکو آٹھ آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی میرے سیل پر دیتے تھے۔ ان میں سے دو گاڑ زکو انتہائی متعصب تھے۔ یہی وہ گاڑ زکو تھے جو مجھے سلاخوں کے نیچے سے غلاظت کو چھوا کر کھانا دیتے تھے، اور اکثر اوقات مجھے فحش گالیاں دیتے تھے۔ انہی گاڑ زکو نے مجھے لیٹرین لے جانے کے بعد جب سیل میں بند کیا تو میں غفایت کے مارے فوری لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے پاؤں کے قریب ٹانگ پر کسی چیز کے رینگنے کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا تو ایک بڑا بچھو میری ٹانگ پر چل رہا تھا۔ اس سے پہلے کو وہ ڈنگ مارتا میں نے اسے انگلیوں سے جھٹک دیا۔ اسے مارنے کیلئے میں نے نیچے کی جگہ سر کے نیچے رکھنے والی اینٹ اٹھائی تو اینٹ کے نیچے درمیان بنے خول میں 3 اور بچھو تھے۔ میں نے چاروں بچھو کو اینٹ سے ماریا۔ دونوں گاڑ زکو دیکھ رہے تھے۔ بچھو مارنے پر انہوں نے مجھے بے تحاشہ گالیاں دیں۔ شاید بچھو بھی ان کا کوئی بھگوان تھا۔ یہ بچھو یقیناً ان کے ایما پر ہی سیل میں میری غیر حاضری کے دوران چھوڑے گئے تھے۔ دو گاڑ زکو بالکل روبروٹ کی طرح تھے۔ اپنی ڈیوٹی کے آٹھ گھنٹوں میں سے چھ سات گھنٹے یہ دھوپ اوگرمی کی پروا کئے بغیر سیل کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مارچ کرتے ہوئے پہرہ دیتے تھے۔ وہ آپس میں بھی بہت تھوڑا بولتے تھے۔ مجھے مخاطب کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گاڑ زکو تیسری جوڑی ان دونوں کے مقابلے میں نسبتاً بہتر تھی۔ ان میں سے ایک گاڑ اپنے ماتھے پر ہمیشہ لپٹا ہوا چندن اور چاول کے چند دانے لگائے رکھتا تھا۔ سگریٹ پیتے ہوئے وہ کبھی کبھی مجھے بھی ایک سگریٹ دے دیتا تھا۔ میرے بول نہ سکنے کی ایکٹنگ کامیابی سے جاری تھی۔ ڈاکٹر کی ادویات سے اگر چہ چپچس میں خاصی کمی ہو چکی تھی لیکن میں فرار کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی پلاننگ کو Fool proof بنانے کیلئے 24 گھنٹے میں دن بار مرتبہ لیٹرین جاتا۔ مجھے یہ چند منٹوں کا موقع ہی میسر تھا جب مجھے سیل سے باہر نکالا جاتا تھا۔ سیل سے باہر گر دو پیش کا تفصیلی نقشہ میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔ میرا سیل دس Cells کی ایک قطار میں دسواں جانب سے تیسرا تھا۔ باقی نو Cell یا تو خالی تھے یا ان میں ایسے لوگ مجھوں تھے جن کیلئے گاڑ زکو کی ضرورت تھی۔ میرے سیل کے تقریباً سامنے ہی لیٹرین کی قطار تھی جن میں داخلے کا رخ دوسری جانب تھا۔ میرے سیل سے بائیں جانب لیٹرین سے بہت تھوڑے فاصلے پر ایک منزلہ بیرس تھیں۔ دائیں جانب ایک پتلی سڑک تھی اور سڑک کے پار بنی ہوئی عمارت کی پشت تھی۔ لیٹرین سے زیادہ سے زیادہ 30 قدم کے فاصلے پر ایک اونچی دیوار تھی۔ اس دیوار پر خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ اس دیوار کی بلندی اور باڑھ سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بیرونی دیوار ہے۔ دیوار کی دوسری طرف سے گاڑیوں کے چلنے کی مدد ہم آوازیں آتی رہتی تھیں۔ میں نے سیل سے باہر نکل کر میں دروزہ (Main entrance) دیکھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ میرے خیال میں میرا سیل اور درگد کی عمارتیں چار دیواری میں گھرے علاقے کے عقبی حصے میں تھیں۔ میرے لئے فرار ہونے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ میں تاروں والی دیوار بھلا جاؤں۔ میں نے اندازہ لگا دیا دیوار کی بلندی 8 فٹ کے لگ بھگ تھی اور سب سے نیچے والی خاردار تار دیوار سے 6 انچ بلندی تھی۔ اس تار کے اوپر 5 یا 6 مزید خاردار تاریں تھیں جو دس فٹ کے فاصلے پر دیوار میں گڑے ہلائی شکل کے T-Irons سے بندھی ہوئی تھیں۔ اگر میں کی طرح سب سے نیچے والی تار کو تھام کر، اس کے سہارے اپنے جسم کو اونچا کھینچ لینے میں کامیاب ہو جاتا تو تقریباً 3 فٹ اونچی خاردار تاروں کو بھلا گ کر دیوار کی دوسری جانب کو دسکتا تھا۔ ان خاردار تاروں کو بھلا گئے اور دیوار کی دوسری جانب کو دسے میں میرا زخمی ہونا لازمی تھا جبکہ میری ٹانگ ابھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی اور میں لنگڑا کر بہت آہستہ چل سکتا تھا۔ یہ سب تو بعد کے مرحلے تھے۔ سب سے پہلے تو مجھے مسلح گاڑ زکو سے جان چھڑانے کی سہیل کرنی تھی۔ میں نے اس کے علاوہ دیگر ممکنہ ذرائع پر غور کیا۔ لیکن سب ناممکن العمل ثابت ہوئے۔ اس منصوبے میں بھی میری کامیابی کے صرف 5 فیصد چانسز تھے۔ پہرے دار ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں رائفلیں اور بیٹلی کے ساتھ بیک پر بیونٹ Bayonet (ٹنگین) لگی ہوتی تھی۔ ٹنگین بیٹلی میں لگی ایک چھوٹی میاں ہوتی ہے جسے ایک چھوٹی بیٹلی میں لگا سٹیچ بن Stich button میاں میں قابو رکھتا ہے۔ اگر بیٹن کھول دیا جائے تو ٹنگین کو فوری نکالا جاسکتا ہے۔ میں یہ تفصیل اس لئے لکھ رہا ہوں کہ فرار کے عمل کے دوران اس کی تفصیل بیان کرنا مناسب نہ ہوگا۔

مجھ پر تعینات گاڑ زکو کی ڈیوٹی کے اوقات بھی بدلتے رہتے تھے۔ گاڑ زکو وہ جوڑی جو مجھ سے نسبتاً بہتر سلوک کرتی تھی، ان کی ڈیوٹی کے دوران میں خاصا وقت سلاخوں کے ساتھ کھڑان کی باتیں سنتا۔ ”بول تو میں نہیں سکتا تھا“ اس لئے یہ گفتگو یک طرفہ ہوتی تھی۔ ان گاڑ زکو میں سے ایک برہمن تھا جس کے ماتھے پر ہمیشہ چندن اور چاول لگے ہوتے تھے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے مجھ ”مسلے“ کو ”مشدھ“ کرنے کا سوچا۔ کہنے لگا ”صرف ہمارا دھرم ہی سچا ہے۔ ہمارے بھگوان تو ہمارے بیچ پیدا ہوئے اور تم مسلمان اپنے بھگوان کو بلانے کیلئے آج تک ”خدا“..... خود“ (خدا) کہتے ہو۔ اتنا پار کرنے کے باوجود تمہارا بھگوان نہیں آیا۔ زندگی میں تو تم نے بہت کثرت (تکلیف) اٹھائے۔ اب بھی اگر ہمارا دھرم اپنا لوتو تمہارے من کو بھی شائقی ملے گی اور تمہاری آتما بھی سورگ (جنت) میں جائے گی“ اس کی باتیں سن کر میں ایسے سر ہلاتا جیسے وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہو۔ دل میں، میں سوچتا تھا کہ سورگ اور زنگ (جنت اور دوزخ) تو بہت دور ہیں یہ تو اپنے مردے کو یہاں دنیا میں ہی چنا کی آگ میں شاید اس لئے جلاتے ہیں کہ یہیں جہنم کی آگ کے کچھ عادی ہو جائیں اور زنگ میں گرم سرد ہونے کے باعث بیمار نہ پڑ جائیں۔ میں نے اشاروں سے اسے کہا تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے اپنے دھرم کے متعلق کچھ اور بتاؤ۔ میرا اصل مقصد اس کی ہمدردی جیتنا تھا۔ میری دلچسپی دیکھ کر اس نے تفصیلاً مجھے ہندو دھرم کے متعلق لیکچر دینا شروع کر دیئے۔

غازی

فرار کی دوسری کوشش

ڈاکٹر آیا اور میری مرہم پٹی کے دوران اس نے کہا کہ میرے لئے جو کچھ وہ کر سکتا تھا، اس نے کر دیا، لیکن اب وہ مجبور ہے، اس نے کہا کہ آج Thursday (جمعرات) ہے اور پرسوں یعنی ہفتے کی شام کو مجھے انٹرویویشن کیلئے لے جایا جائے گا۔ انٹرویویشن کے دوران وہ بھی موجود ہوگا۔ اس نے کہا کہ جنرل کے حکم پر Intelligence Corp (انٹیلیجنس کور) سے سچ اور جھوٹ پرکھنے کی مشین اور ماہرین بلوائے گئے ہیں۔ تمہیں خاص انجکشن لگا کر کچھ سوال پوچھے جائیں گے۔ انجکشنوں کے اثر سے تمہارا دماغ تمہارے جسم کو کنٹرول کرنے کے قابل نہیں رہے گا اور نہ چاہتے ہوئے بھی تم بولنے لگو گے اور جو بولو گے اس کا فیصلہ مشین کرے گی کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔ اسکے بعد تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا وہ تم خود بہتر سمجھتے ہو۔ ڈاکٹر نے چلتے وقت ایک ایسی بات کہی کہ میرا منہ کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے سرگوشی میں کہا کہ کرل ٹنگر کا میں دوست بھی ہوں اور معالج بھی۔ اسی کی ہدایت پر میں نے اپنی طرف سے جو بھی ممکن سہولت تھی تمہیں دی۔ He is very fond of you. (وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہو۔) یہ کہہ کر ڈاکٹر چلا گیا۔ گرفتاری کے بعد پہلی مرتبہ معلوم ہوا تھا کہ کون سا دن ہے۔ میرے پاس صرف دو راتیں تھیں جن میں فرار کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی میں کوشش کر سکتا تھا۔ اب میں مزید تشدد سہنے کے ناقابل تھا خاص انجکشن اور مشین کے آگے تو میں بالکل بے بس ہو جاتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کچھ یوں دیتا تھے چھپانے کے لئے میں نے اتنی اذیتیں سہی تھیں۔ اس سے بچنے کا صرف ایک حل تھا کہ میں فرار کے منصوبے پر عمل ان دو راتوں میں ہی کروں۔ فرار میں کامیابی کی اگرچہ بہت ہی موہوم امید تھی لیکن پہرے داروں کی گولیوں سے مرنے کا پورا یقین تھا۔ دونوں صورتوں میں جیت میری تھی اور ہمارا DMI کی۔

اسے حسن اتفاق کہیں یا اللہ پاک کی مدد۔ اس رات بارہ بجے ڈیوٹی پر برہمن اور اس کا ساتھی گاڑ آئے۔ دنیا بھر کے فوجیوں کو سکھایا جاتا ہے کہ دشمن کو مارو، اس سے پہلے کہ وہ تمہیں مار دے (Kill your enemy before he kills you) اور دوسری اہم بات مقصد بیت ہے۔ فتح مکہ سے قبل جنگ بدر اور جنگ احد میں بھائی کے مقابل بھائی اور بیٹے کے مقابل باپ تھا۔ دوران جنگ نہ باپ کے ہاتھ بیٹے کو قتل کرتے وقت لڑاں ہونے اور نہ بھائی کا گانا گانے وقت بھائی کے ہاتھ رکے۔ کیونکہ مسلمان اس جنگ میں ایک واضح مقصد کے لئے لڑ رہے تھے۔ فوجی کے دل میں جب بھی دشمن کے لئے ترحم کا جذبہ آیا وہ خود ہی مارا گیا۔ میں نے آج رات ہی فرار کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا۔ Now or Never پر دل جم گیا۔ میں نے گاڑ کی ڈیوٹی شروع ہونے سے آدھے گھنٹے بعد برہمن کو اشارے سے کہا کہ مجھے لیٹرین جانے کی ضرورت ہے۔ اس نے میری کلائی کے کڑے میں رسی باندھی۔ دوسرے گاڑ نے رائفل میری طرف تان لی۔ برہمن نے نیل کا دروازہ کھولا اور رسی کا سرا پکڑ کر مجھے لیٹرین کی طرف لے گیا۔ میں نے لیٹرین میں پانچ چھت گرا کرے اور باہر آ گیا اور دونوں گاڑ زہنے نیل کی طرف لے چلے۔ اب دونوں نے اپنی رائفیں اپنے کندھوں پر لٹا رکھی تھیں۔ میں نے درد کا ہانا نہ کرتے ہوئے خود کو کچھ جھکا یا۔ دونوں گاڑ زہیر سے دائیں اور بائیں چل رہے تھے میں نے دانستہ چھوٹے قدم لینے شروع کئے۔ چار پانچ قدموں میں ہی میں ان سے ایک فٹ سے زیادہ پیچھے رہ گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں نے بجلی کی تیزی سے دائیں طرف والے گاڑ کی بیونٹ (جو اس کے بائیں کولہے پر لٹکی تھی) کا ہاتھ لیتی بن کھولا۔ بیونٹ نکالی اور پورے زور سے اس کی پیٹھ میں گھونپ دی۔ اتنے زور سے گھونپی ہوئی بیونٹ اس کے جسم کے آگے آ رہی ہوگی۔ اس کے منہ سے کراہ تک نہ نکلی۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی میں نے بیونٹ واپس کھینچی اور اپنے بائیں جانب والے برہمن گاڑ کی پشت میں گھونپ دی۔ یہ سارا عمل 5 سیکنڈ میں مکمل ہو چکا تھا۔ برہمن نے چیخ ماری اور اس سے پہلے کہ میں بیونٹ باہر کھینچتا ڈھیر ہو گیا۔ میں اپنی زخمی ٹانگ کے باوجود پوری رفتار سے بیرونی دیوار کی طرف بھاگا۔ رسی میری بائیں کلائی میں بندھی ہوئی تھی۔ ہوائی چیل میں نے لیٹرین کی طرف پھینکے اور دیوار کے پاس پہنچ کر اچھلا۔ میرا قدم 6 فٹ اونچ ہے۔ دونٹ سے زیادہ اونچا میرا بازو ہے اور اچھلنے سے تقریباً ایک فٹ میں نے مزید بلندی (Gain حاصل) کی۔ میرا ہاتھ تیسری خاردار تار پر پڑا۔ اسے مضبوطی سے تھام کر میں نے اپنا بائیں ہاتھ بھی بلندی کیا اور اس کی تار کو تھام لیا۔ بازوؤں کے زور پر میں نے اپنا جسم بہ ہزار دقت اوپر اٹھایا اور پاؤں دیوار میں اٹکا کر تھوٹے سے چوٹی اور پھر پانچویں تار تھامی۔ میرا جسم بھی ساتھ ساتھ اوپر اٹھتا رہا۔ سب سے اوپر والی تار دونوں ہاتھوں سے تھام کر میں نے اسے نیچے دیا اور میرے دونوں پاؤں دیوار کے اوپر آ گئے۔ اب میرے سامنے تین فٹ اونچی خاردار تاروں کی 6 پاؤں تھیں جنہیں پھلانگ کر میں دیوار کی دوسری جانب جا سکتا تھا۔ عام حالات میں یہ تین فٹ اونچی رکاوٹ پھلانگنا میرے لئے بہت معمولی بات تھی۔ لیکن جسمانی کمزوری، چوٹوں کے درد اور زخمی ٹانگ کی وجہ سے یہاں تک پہنچنے ہوئے میرا سانس پھول چکا تھا۔ گاڑ ڈکڑ مارنے سے لیکر یہاں تک پہنچنے میں مجھے پندرہ سے بیس سیکنڈ لگے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی ٹانگ کو اپنے دائیں ہاتھ کا سہارا دے کر اوپر اٹھایا اور باڑھ کی دوسری طرف رکھا۔ اسی وقت مجھے درد اندرونی حصے سے سیٹھاں بچنے کی آوازیں آئیں۔ اب ضائع کرنے کو ایک سیکنڈ بھی نہ تھا۔ میں نے جلدی سے بائیں ٹانگ باڑھ کی دوسری طرف کی۔ جلدی میں باڑھ کا ایک کاٹھامیری بائیں ران میں ٹھس گیا اور پھلانگتے وقت ایک فٹ کے قریب ران کو چیرتا چلا گیا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نے دیوار سے پھلانگ لگائی۔ زخمی ٹانگ کی وجہ سے میں سنسبل نہ پایا اور زمین پر گر گیا۔ کودنے کی وجہ سے غالباً میری ٹانگ کا زخم بھی کھل گیا تھا۔ میں نے حواس بحال رکھے اور بائیں ٹانگ پر کبھی اچھلنے اور کبھی دائیں پاؤں کا سہارا لیتے سڑک کی طرف تیزی سے بڑھنے لگا۔ اندر سے سیٹھاں بچنے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ”جائے حادثہ“ کا سب کو علم نہ ہونے کے باعث اندر کی سب نفری گاڑ اور امین گیٹ کے قریب جمع ہو رہی تھی۔ سڑک کی دوسری جانب جھاڑیاں تھیں۔ میں ان کی اوٹ میں بندھال بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد سانس بحال ہوتے ہی میں نے سڑک پر اپنے سیدھے ہاتھ کی جانب بھاگنا شروع کیا۔ اب مجھے ٹانگ کے زخم اور ران سے تیزی سے بہنے والے خون کی پرواہ نہیں تھی۔ زندہ رہنے کی خواہش میں اب سب درد بے وقعت ہو چکے تھے۔ سڑک پر میں ہیشٹل سو فٹ ہی بھاگا ہوں گا کہ سامنے سے آنے والی گاڑی کی تیز روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں سڑک کے ایک جانب ہو گیا۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں گاڑی قریب پہنچنے پر میں نے دیکھا، وہ جیسی تھی۔ جب وہ جیسی میرے اتنے قریب آئی کہ اسے مجبوراً رکنا پڑے تو میں بھاگ کر سڑک کے پیچ آ گیا۔ ڈرائیور نے بیک لگا لی اور سڑک پر ناز گھسنے کی آواز آئی۔ جیسی مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رکھی تھی۔ میں ڈرائیور کی طرف بڑھا۔ جیسی خالی تھی۔ میں نے بغیر وقت ضائع کئے ڈرائیور کا دروازہ کھولا۔ میری حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ آدھی رات کے بعد نسان سڑک پر ایک زخمی شخص جس کے سر پر اور چہرے پر بٹیاں بندھی ہوں اچانک سڑک پر آ کر گاڑی روکے ڈرائیور کی جو حالت ہو سکتی ہے اس کا بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے۔ دروازہ تو میں پہلے ہی کھول چکا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر ڈرائیور نے مجھے لے جانے سے انکار کیا تو اسے گردن کی نہیں دبا کر ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہلاک کر دوں گا۔ اس کی ٹریننگ میں پاکستان میں لے چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو کہا میں زخمی ہوں اور غڈے میرے پیچھے ہیں۔ مجھے فوراً یہاں سے لے چلو۔ اس نے کہا ”آپ پیچھے بیٹھیں۔“ یہ بھی ممکن تھا کہ میں کچھلی سیٹ کی جانب جاؤں اور وہ گاڑی بھاگ لے جائے۔ میں نے فوراً ہی ڈیش بورڈ سے گاڑی کی چابی نکالی اور بجائے پیچھے بیٹھنے کے اس کے ساتھ والی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسے کہا کہ وہ اپنا دروازہ بند کر کے لاک کر لے۔ وہ اتنا گھبرا ہوا تھا کہ چپ چاپ میرے کہنے پر عمل کرتا رہا۔ میں نے چابی اسے دی اور اپنا دایاں ہاتھ اس کی پشت کی طرف سے اس کی گردن پر لے آیا اور کہا کہ اگر کوئی ٹھنڈی دکھانے کی کوشش کی تو گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا۔ چپ چاپ چلو تو کوئی گزند نہ پہنچے گی۔ اس نے اچھا کہنے کیلئے سر ہلایا۔ میں نے اسے پرانی دلی چلنے کہا۔ اس نے گاڑی موڑی اور تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگنے لگا۔ جلد ہی ہم ایسے علاقے میں جا نکلے جسے میں پہچانتا تھا۔ وہ واقعی پرانی دلی کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اسے محلہ فراش خانہ چلنے کو کہا۔ محلہ فراش خانے کا علاقہ آگیا تو میں نے اسے ایک گلی کے قریب روکا میں نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے اسے کہا کہ میری حالت تم دیکھ رہے ہو۔ تمہارا کر یہ دینے کو میرے پاس بیٹھے نہیں ہیں۔ وہ تو مجھ سے چھپا چھڑانا چاہتا تھا۔ کہنے لگا کوئی بات نہیں، اگر آپ کو سو بچاس درکار ہوں تو میں دینے کو تیار ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا اور گاڑی سے اتر آیا۔ میں دروازہ بند بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اس نے گاڑی بھاگائی اور جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں اس گلی سے بخوبی واقف تھا۔ اندر لگیوں میں سے ہوتے ہوئے ساتھیوں کے گھر تک ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ میں اٹھتا بیٹھتا، دیواروں کا سہارا لیتا تقریباً ایک گھنٹے میں ساتھیوں کے پاس یعنی مذیر کے گھر پہنچا۔ میں بالکل بندھال ہو چکا تھا۔ میں نے مسلسل گھنٹی بجانی شروع کر دی۔ چند منٹ کے بعد مذیر نے دروازہ کھولا۔ کچھ اندھیرے کی وجہ سے اور کچھ میری بڑی داڑھی اور برے حال کی وجہ سے چند لمحے تو وہ مجھے پہچان نہ پایا۔ جب میں نے اس کا نام لیا تو وہ چونک اٹھا اور مجھے فوراً اندر کھینچ کر کئی گالی۔ چند رسی کلمات کے بعد میں نے اس سے ساتھیوں کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ سب بخیریت اور اوپر سو رہے ہیں۔ مذیر کے سہارے بیڑھیوں جھڑھ کر میں مکان کے اوپری حصے میں پہنچا۔ مذیر نے ساتھیوں کو جگایا۔ مجھے اور میری حالت کو دیکھ کر وہ اتنے حیران تھے کہ ان کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ سب نے باری باری مجھے گلے لگایا۔ فرار کے وقت مجھ میں جو ہمت آگئی تھی وہ منزل پر پہنچ کر ختم ہو گئی۔ میں ایک ساتھی کے بستر پر گیا۔ میں نے نمبر نو کو جواب بقیہ ساتھیوں کا گروپ لیڈر تھا کہ میری ران اور ٹانگ سے بہنے والا خون سڑک سے لیکر فراش خانے کی گلیوں سے ہوتا ہوا یہاں تک میری نشاندہی کر سکتا ہے۔ اس نے فوراً باقی ساتھیوں کو خون کے سبب نشان صاف کرنے کا کہا۔ اسی وقت وہ دو بلتیاں اور یوریوں کے ٹکڑے لے کر ناپوں کی روشنی میں خون کے دھبے صاف کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ مذیر چائے اور گھر میں موجود کٹکٹ اور سوپیاں بنا کر لے آیا۔ میں بات کرنے کے قابل نہ تھا۔ میں نے بالکل مختصر انہیں بتایا کہ میں DMI سے فرار میں کامیاب ہوا ہوں اور وہ میری زبان کھولنے میں اپنے تمام جربے آزمانے کے باوجود کام ہوئے۔ مذیر نے جا کر عارف کو میرے متعلق بتایا۔ عارف میرے زخمی ہونے کا سن کر اسی وقت اپنے ایک قریبی اور انتہائی بھروسے کے ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔ چائے اور سوئیوں نے مجھے کچھ تقویت دی اور میں چند ہی لمحوں میں آزادی کی نیند سو گیا۔

ایک ماہ اور 6 دن پہلے 6 جون 74ء کو میں گرفتار ہوا تھا اور آج 12 جولائی جمعہ المبارک تھا۔ گرفتاری کے دوران میں مجموعی طور پر زیادہ سے زیادہ پندرہ میں گھنٹے سو با تھا۔ ورنہ بیشتر وقت تشدد اور اس کے نتیجے میں بے ہوشی کی حالت میں ہی گزارا تھا۔ تشدد کے دوران مجھ پر جو بھتی، میں تقصیلاً آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں۔ 23 سال بعد بھی بھارتی ہندوؤں کے مجھ پر توڑے گئے ظلم و ستم تحریر کرتے وقت میری جو بھتی کیفیت ہوئی ہے۔ اسے میں ہی جانتا ہوں۔ میں نے ہندو کو اس کے اصلی روپ میں دیکھا ہے۔ خطہ ہند کے قدیم اصل باشندوں کو حملہ آور آریں نے جنوب میں دھکیل کر کول، دراوڑ اور اچھوت کا نام دے کر ہزاروں برس ان پر بے رحمانہ طور پر حکومت کی اور انہیں جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ پھر مکافات عمل کا وقت آیا تو جذ بہ شہادت سے اپنے سینوں کو سونور کے چند ہزار مسلمانوں نے مغرب سے آکر ان مغروں کو آریوں پر جو خود کو سب سے برتر نسل انسانی سمجھتے تھے، ہزار برس تک حکومت کی اور انہیں بتایا کہ کوئی بھی انسان محض اپنی نسل کی بنا پر برتر اور کمتر نہیں ہوتا۔ یہ اس کے اعمال ہوتے ہیں جو اسے برتر اور کمتر بناتے ہیں لیکن ہندو نے اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا انہوں نے خود کو مختلف ذاتوں میں تقسیم کر لیا۔ سب سے افضل برہمن پھر راجپوت اور پھر کھشتری اور مزید تقسیم در تقسیم میں وہ سینکڑوں ذاتوں میں بٹ گئے لیکن ان سب ہندو ذاتوں میں ایک قدر مشترک تھی اور وہ تھی مسلمان سے نفرت۔ مسلمان کا ہندو پر سایہ بھی پڑ جائے تو وہ بھڑٹ (ناپاک) ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں سے انتہائی حد سے بھی بڑھ کر نفرت کرنے والی ہی قوم اتنی بزدل ہے کہ ان کے سورج و نسی راجپوت راجہ، مہاراجاؤں نے مسلمان حکمرانوں کی ہیبت سے لرزاں اپنی بہنیں اور بیٹیاں ان کے نکاح میں دیں۔ راجہ بے جنو جہلم سے پشاور تک کا حکمران تھا۔ چار بار احمد شاہ ابدالی سے پوری تیاری کے ساتھ لڑا اور ہر بار احمد شاہ ابدالی اسے شکست دے کر کاہل لے جاتا۔ راجہ بے جنو سے اپنے پاؤں دھلوانا اور اسے رھا کر کے واپس بھیج دیتا۔ برصغیر میں مسلمانوں کے بعد انگریزوں کی حکومت آئی تو ہندوؤں نے انگریزوں سے مل کر مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پھاڑ توڑے۔ وہ تو چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو کبھی عرب میں پھینک دیا جائے اور سارا بھارت شدہ ہو جائے لیکن عقاب مر جانا پسند کرے گا۔ بنجرے میں قید ہونا اسے گوارا نہیں مسلمان بے لوث قادیان کی جدوجہد نے اپنا اثر دکھایا اور قادیان کا عظیم کے ہاتھوں برصغیر میں مسلمانوں کی دنیا میں سب سے بڑی سلطنت وجود میں آئی۔ بھارتی ہندو حکومت جھلا یہ صدمہ کیسے سہہ سکتی تھی۔ لاکھوں مسلمانوں کو پاکستان کی طرف ہجرت کرنے کے دوران شہید کر دیا گیا۔ نوزائیدہ پاکستان کو معاشی طور پر ختم کرنے کیلئے پاکستان کے حصے کا سرکاری روپیہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کے حصے میں آنے والی فوج کا اسلحہ ضبط کر لیا اور حصے کا گولہ بارود دینے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کی انتہائی مختصر ایئر فورس کے جو اسٹر اور ہاروڈ جہاز تقسیم ہند کے وقت بھارت میں تھے، انہیں لانے کے لئے جب پاکستانی پائلٹ بھارت گئے تو ان جہازوں کے پیٹرول ٹینکس میں چینی ڈال دی گئی چنانچہ وہ جہاز بھارتی حدود میں ہی گر کر تباہ ہو گئے۔ کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کر لیا اور کشمیری مسلمانوں پر ایک نذم ختم ہونے والی ظلم و تشدد کی خونی داستان رقم کی جانے لگی۔ پاکستان میں سیاسی بحران کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 71ء میں مشرقی بارت کو علیحدہ کر دیا حالانکہ پاکستان 62 میں انڈیا چنانچہ جنگ کے دوران کشمیر پر بڑی آسانی سے قبضہ کر سکتا تھا لیکن پاکستان نے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اب بھارتی مسلمان بھارت میں نچلے درجے کے شہری بن کر رہ گئے ہیں۔ بھارتی مسلمانوں کو زک پہنچانے کا کوئی موقع نہیں گویا جاتا۔ میں نے بھارت میں 3 برس سے زیادہ ہندو بن کر اور ہندوؤں کی مظلوموں میں جا کر مسلمانوں کے متعلق ان کی دلی نفرتوں اور ناپاک ارادوں کا بخوبی مشاہدہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں کئی بار میں نے بھارتی ہندوؤں اور حکومت کے اصل عزائم کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

میں گہری نیند میں تھا کہ میرے ساتھیوں نے مجھے جگایا۔ عارف ڈاکٹر کو لے کر آ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے میری ٹانگ کے زخم کو دیکھا۔ ہڈی سے ٹوٹے ہوئے ہارک کھڑے اور گوشت کو علیحدہ کیا۔ زخم والی جگہ پر ہڈی بالکل تنگی ہو چکی تھی۔ اس کی مرہم پٹی کی۔ تازہ ترین زخم میری بائیں ران میں خاردار تار پھلانگتے وقت آیا تھا۔

غازی

ڈاکٹر نے زخم کو صاف کیا۔ میری کھوپڑی کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی اور کھوپڑی کے گوشت کا کچھ حصہ دونوں ٹکڑوں کے بیچ چلا گیا تھا اور کچھ حصے نے سر کے اوپر اسپینڈ بریکر کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ ڈاکٹر عارف کا انتہائی بااعتماد دوست تھا لیکن یہ جنرل پریکٹس کرنے والا تھا۔ جبکہ میرے زخموں کو آپریشن تھیٹر اور Specialist سرجن کی ضرورت تھی۔ اس ڈاکٹر سے جو کچھ پڑا اس نے کیا اور ہر روز صبح آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ میرے ساتھیوں نے میری شیوہ بنائی اور سارے جسم کو کٹھن کیا۔ میرے تمام کپڑے اور سامان تو لوٹھی ہوئے میں تھا۔ میرے جوڑو کرائے والے ساتھی نے بتایا کہ میری جنس حالات میں گرفتاری ہوئی تھی اس سے وہ سمجھ گیا تھا کہ مصیبت بہت بڑی ہے لہذا وہ سیدھا لوٹھی ہوئے آیا۔ ہوئے کے اشاف نے اسے میرے ہمراہ دیکھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے اوپر میرے چیک آؤٹ ہونے کا کہا اور میرے کمرے کی چابی بھی لے لی۔ اس نے میرا سارا سامان اور سائیکل سوار والا پمفل پیک کیا۔ ہوئے میں ہم دونوں نے کیم جون کو لایڈ وائس میں سینے بھر کی ادائیگی کر دی تھی۔ چنانچہ ہوئے والوں نے ہم دونوں کی بقیہ رقم واپس کی۔ میرے متعلق اس نے ہوئے والوں کو بتایا تھا کہ اچانک بہت ضروری کام سے مجھے کھٹکے جانا پڑ گیا ہے اور وہاں تین چار ماہ سے قفل ممکن نہیں۔ میرا یہ ساتھی چونکہ میری وساطت سے ہی ہوئے میں ٹھہرا تھا لہذا ہوئے والوں نے کوئی تعرض نہ کیا اور لایڈ وائس دی گئی رقم کے ساتھ ساتھ میرا ساتھی اپنے سامان کے ہمراہ میرا سامان بھی لے آیا۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے اپنے نمبر ٹو (حبیب) سے میری گرفتاری کے بعد کے حالات پوچھے تو اس نے بتایا کہ انہوں نے میری گرفتاری کی اطلاع دوسرے دن پاکستان ٹرانسمٹ کر دی تھی۔ وہاں سے دوسرے روز پیغام ملا کہ تمام سرگرمیاں معطل کر دی جائیں اور نئے احکام تک حبیب ہی گروپ لیڈر ہوگا۔ اس نے بتایا کہ بیٹھنت سے معمول کے مطابق ڈاک لی جاتی ہے لیکن ڈاک لانے، لے جانے والا کوئی نہ تھا۔ 5 جولائی کو پاکستان سے پیغام ملا کہ اگلے دن کیپٹن ارشد حبیب سے وہیں ملے گا جہاں اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی (یہ سبزی منڈی کی مین روڈ کا ہوئے تھا) 6 جولائی کو وہ ساتھیوں کے کور میں اس کے ہوئے میں پہنچا اور کیپٹن ارشد کو تفصیلاً میری گرفتاری کا بتایا۔ ڈاک کا تبادلہ کیا۔ کیپٹن ارشد اپنے ہمراہ نیا کوریئر لایا تھا۔ آئندہ اس سے ملنے کا وقت اور مقام طے کیا۔ ابھی اس کے آنے میں 4 روز باقی ہیں۔ لڑکے میری گرفتاری کا پتہ چلنے کے بعد مشتعل تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں DMI کی حراست میں ہوں تو انہوں نے وہاں بسوں کے تین دھماکے کئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنی گرفتاری کے حالات تفصیلاً بتائے۔ میرا DMI ہیڈ کوارٹرز سے زندہ سلامت بچ نکلنا ایک معجزہ تھا۔ مجھ گنہگار بندے پر اللہ پاک نے اپنا رحم و کرم کیا تھا۔ میرے ساتھیوں نے میرے کامیاب فزاکار کا مختصر الفاظ میں بیچ ٹرانسمٹ کر دیا تھا اور اب تفصیلی رپورٹ میں اپنے ایک ساتھی سے لکھوا رہا تھا تاکہ کوریئر کے ذریعے پاکستان بھجوا سکوں۔ میری تیمارداری کا کام میرے ساتھیوں نے سنبھال لیا جبکہ مذہب نے ڈاکٹر کے مشورے سے میرے لئے مرغن غذا کیں یکوائن شروع کر دیں تاکہ میری جسمانی کمزوری جلد دور ہو سکے۔ ڈاکٹر بلانڈ آتا اور میری مرہم پٹی کے علاوہ انجین اور دو روٹیاں دیتا۔ میری ٹانگ کا زخم صرف اس حد تک ٹھیک ہو سکا کہ گنگی ہڈی پر ایک نہایت باریک جھلی بن گئی۔ آج بھی حالت یہ ہے کہ اگر اتھاقتا صابن بھی اس جگہ پر زور سے گھس دوں تو جھلی پھٹ جاتی ہے اور خون بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ دائیں ٹانگ کی چپٹی (Stepney) تشدد سے ٹوٹ چکی تھی اور بیچ نہ جڑی اور پٹھے اس بری طرح مجروح ہوئے تھے کہ دائیں ٹانگ کا جوڑ ہمیشہ کے لئے سوچ گیا اور اس ٹانگ پر میں آج تک نہ بوجھ ڈال سکتا ہوں اور نہ ہی کوئی معمولی رکاوٹ چھلانگ سکتا ہوں۔ معدے میں شیشے کے ذرات اس طرح پیوست ہو چکے ہیں کہ منتقلہ معدے کا اور پاکستان کے سول اور فوجی ڈاکٹر بھی ٹھیک نہ کر سکے۔ میرے فزار کے چوتھے روز بھارتی ہندی اور انگریزی اخبارات میں میری تصویروں کے ساتھ نمایاں طور پر یہ خبر شائع ہوئی کہ یہ پاکستانی جاسوس قید سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی گرفتاری میں مدد دینے والے دو ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ گزشتہ نئے سال کی رات لوٹھی ہوئے میں تقریب کے دوران میری ایک بھارتی بریگیڈیئر کی بیوی کے ساتھ کسی فری لانس فوٹو گرافر کی کھینچی ہوئی تصویر بھی اخبارات میں شائع ہوئی۔ یہ تمام اخبارات حبیب نے کوریئر کے ذریعے پاکستان بھجوا دیئے۔ میں اب اپنے ساتھیوں کا لیڈر نہیں بلکہ مہمان تھا اور ان کے پاس صرف صحت یاب ہونے تک ٹھہرا ہوا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ مجھے اپنی آئندہ Movement کے احکام ملیں اور میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ میرا سائیکل سوار والا ہسپتال چونکہ میرے لئے تھکا ہوا تھا اس لئے میں نے اسے لے لیا اور ہمیشہ لوڈ اپنے سر ہانے رکھتا تھا تاکہ اگر DMI کے کتے میری تلاش میں یہاں تک پہنچ گئے تو ساری گولیاں ان پر برس کر آخری گولی سے خود کو ہلاک کر دوں۔ گیرج کے لڑکے بھی ایک یاد کو ٹوٹی میں مجھ سے ملے آتے رہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ان کے پیچھے ہونے تینوں ہوں سے تقریباً سو میٹر کے فاصلے پر سیل میں بند تھا اور دھماکوں کی آواز میں نے سنی تھی تو فخر سے ان کے چہرے گل اٹھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ بشیر کے شروع کے ہونے مشن اور ہماری تربیت کو وہ آگے بڑھائیں گے۔

میرا ادبلی میں ساتھیوں کے ہمراہ رہنا نہ صرف میرے لئے بلکہ میرے ساتھیوں اور مذہب اور عارف کیلئے بھی خطرناک تھا۔ میرے زخم اور صحت بتدریج ٹھیک ہو رہے تھے۔ اسی دوران پاکستان سے ڈاک موصول ہوئی اور مجھے ہمیں جانے کا حکم ملا۔ ہمیں میرے لئے نسبتاً بہت محفوظ تھا۔ پاکستانی سرحدوں کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اول تو بھارت نے سرحدیں سیل (Seal) کر دی تھیں۔ دوئم میری جسمانی حالت ایسی تھی کہ بشکل لنگڑا کر چل سکتا تھا۔ ٹریننگ کے دوران گیارہ میل تک مجھے دوڑنے کی پریکٹس کروانی گئی تھی اور اب حالت یہ تھی کہ بغیر سہارے کے چند قدم چلنا بھی دشوار تھا۔ میرے سینئرز کی طرف سے مجھے ہمیں دو ہمدردوں کے نام بھیجے گئے تھے جو میری مکمل صحت یابی تک میری نگہداشت اور میزبانی کر سکتے تھے۔ میرے پاس اپنے سامان کے دو سوٹ کیس تھے۔ میں نے ہمیں گرم مرطوب موسم کے پیش نظر دو تین جوڑے لباس اور دوسرا ضروری سامان ایک ایئر بیگ میں الگ رکھ لیا۔ میرے دونوں سوٹ کیس عارف نے ہمیں میں وکٹوری ٹرمینس (Terminus) اسٹیشن کے لئے ریلوے ہلٹی کروا دیئے۔ میرے ساتھی اور لڑکے دہلی کے حالات مجھے ہر شام بتاتے تھے۔ سول اور فوجی جاسوسی حکموں کے لوگ پوری دہلی میں پھیل کر مجھے تلاش کر رہے تھے۔ شاید انہیں بتا دیا گیا تھا کہ میری جسمانی حالت ایسی ہرگز نہ تھی کہ دہلی سے باہر جاسکو۔ نتیجاً میں دہلی میں ہی کہیں رو پش تھا۔ اگرچہ پورے بھارت میں میرے پکڑے جانے کا احتمال تھا لیکن دہلی کی ناکہ بندی تو ڈرنا ایک دشوار کام تھا۔ عارف نے مجھے دہلی کی حدود سے باہر چھوڑنے کی پیشکش تو کی تھی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ساتھی بھی میرے ساتھ محفوظ مقام تک جانے کو تیار تھے لیکن میں اپنی خاطر انہیں کسی مصیبت میں پھنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے قیصر کو بلوایا اور اسے اپنی مشکل بتائی۔ قیصر نے مجھے کہا کہ آپ ہر روز رات 12 بجے بالکل تیار رہا کریں۔ میں دو تین دن کے اندر گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔ اب حالت یہ تھی کہ مذہب، عارف اور میرے ساتھی ہر روز رات ایک بجے تک میرے پاس بیٹھے رہتے۔ قیصر سے بات ہوئے تیسری رات ساڑھے گیارہ بجے گھنٹی بجنے کی آواز آئی مذہب نے دروازہ کھولا تو لفٹیننٹ کی وردی میں ملبوس قیصر تھا۔ کہنے لگا جلدی کیجئے۔ دو فوجیوں کو ہلاک کر کے جیپ حاصل کی ہے۔ تین لڑکے فوجی سپاہیوں کی وردی پہننے جیپ میں بیٹھے ہیں۔ ہمیں اس سے پہلے کہ سپاہیوں کی ہلاکت اور جیپ کی گمشدگی کا پتہ چلے آپ کو چھوڑ کر وہاں آنا اور جیپ کو ٹھکانے لگانا ہے۔ یوں اچانک روٹنگی کے پروگرام کا سن کر میرے سمیت میرے ساتھیوں، مذہب اور عارف کی آنکھیں پھٹک اٹھیں۔ سب نے گل گل کر مجھے اوداع کیا۔ میں نے انہیں کہا کہ مجھے چھوڑنے کے لئے گھر سے باہر کوئی نہ آئے۔ قیصر کا سہارا لئے میں بڑی سڑک پر آ گیا جیپ میں بیٹھے لوگوں نے مجھے سہارا دے کر پھیلے حصے سے میں سوار کروایا۔ ڈرائیونگ ایک دوسرا لڑکا کر رہا تھا جبکہ قیصر اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور جیپ تیزی سے انڈسٹریل ایریا کی طرف روانہ ہوئی۔ راستے میں دو جگہ پر ناکے لگے ہوئے تھے جنہیں فوجی جیپ اور قیصر کی وردی نے آسانی سے عبور کر لیا۔ انڈسٹریل ایریا ختم ہونے کے بعد ایک چھپر ہوئے ٹرک ڈرائیوروں کے لئے بنا ہوا تھا۔ میرے پروگرام کے مطابق مجھے یہاں سے اپنا سفر اکیلے جاری رکھنا تھا۔ چھپر ہوئے سے ڈرا آگے قیصر اور لوگوں نے مجھے گرجوشی سے اوداع کہا اور تیزی سے پلٹ گئے۔

اس سڑک پر ٹریفک کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں سڑک سے ڈراہٹ کر ایسی جگہ کھڑا ہوا گیا جہاں آنے جانے والی گاڑیوں کی روشنی مجھ پر نہ پڑے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی ٹرک میں لفٹ لوں۔ بسوں اور موٹر کاروں سے میں بچتا تھا۔ مجھے وہاں کھڑے آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔ اس دوران کسی ٹرک گزرے لیکن میرے اشارے پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ بالآخر ایک ٹرک رکا۔ اس کا ڈرائیور ایک کچھ تھا۔ اس نے کہا کہ وہ صرف ہوڈل تک جا رہا ہے۔ میں نے غیبت جانا اور اس میں سوار ہو گیا۔ میں نے ہوڈل کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ رات کے اندھیرے میں دہلی سے جتنا دور ممکن ہو چلا جاؤں۔ تقریباً پون گھنٹے کے سفر کے بعد ہوڈل کا قصبہ آیا۔ ڈرائیور کو میں نے کہا تھا کہ ایک ایئر لائن کی وجہ سے مجھے تھرا جانا ہے۔ سردار جی نے مجھ سے 10 روپے کرایا لیا تھا۔ وہ مجھے قصبہ کے ٹرکوں کے اڈے پر لے گیا۔ اور مجھے کوئی جانے والے ایک ٹرک پر بٹھا دیا۔ اس نے کہا کہ تھرا کے لئے بس باڈک صبح سے پہلے نہیں مل سکتا۔ میں ٹرک میں کوئی چلا جاؤں جو یونی کا سرحدی قصبہ ہے۔ وہاں سے تھرا جانے والی بسیں اور ٹرک مل جائیں گے۔ یہ ٹرک کوئی قصبہ میں داخل ہوئی رہا تھا کہ ڈرائیور نے ٹرک کی لائٹوں کا اشارہ دے کر آنے والی بس کو روک لیا۔ اس وقت صبح کی ہلکی روشنی پھیل چکی تھی۔ ڈرائیور نے بس پر ہندی میں لکھا تھرا پڑھ کر ہی اسے روکا تھا۔ ڈرائیور کو دس روپے دے کر میں بس میں جا بیٹھا۔ صبح کے 9 بجے ہو گئے جب بس تھرا کے مضافات میں داخل ہوئی۔ سڑک کے دائیں جانب مغلیا طرز تعمیر کی ایک وسیع مسجد تھی جس کے بہت بڑے صحن میں اونچی اونچی گھاس اگی تھی اور وہاں دو ہاتھی کھڑے تھے۔ بس شہر میں داخل ہوئی تو میں نے بس سے اتر کر ایک سائیکل رکشہ لیا اور اسے ریلوے اسٹیشن چلنے کو کہا۔ میں بسوں کے اڈوں اور پرچوم سڑکوں سے چٹا چاہتا تھا۔ دہلی سے روٹنگی سے پہلے ہی میں نے پلان بنایا تھا کہ تھرا تک بذریعہ سڑک اور تھرا سے ہمیں بذریعہ ٹرین جاؤں گا۔ ریلوے ٹائم ٹیبل کے مطابق پنجاب میل ٹھیک ساڑھے نو بجے تھرا پہنچتی اور 20 منٹ بعد روانہ ہو جاتی تھی۔ مجھے اسٹیشن پہنچے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ پنجاب میل آگئی میں نے پلیٹ فارم سے باہر کھڑے ایک قلی سے ہمیں کالوں کلاک منگوایا تھا۔ میں پلیٹ فارم کے باہر اوتار میں کھڑا رہا۔ جونہی انجن نے روانگی کا عمل دہلی میں جلدی سے پلیٹ فارم میں داخل ہوا اور لوہڑا کلاس کا جوڑہ سامنے دکھائی دیا، اسی میں سوار ہو گیا۔ ڈبہ کچھ بھرا ہوا تھا۔ بہت سے مسافر ڈبے کے فرش پر بیٹھے تھے۔ میں بھی کھڑکی کے ساتھ سٹنگل سیٹ کے ساتھ فرش پر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ ہی ایک فوجی سپاہی بیٹھا تھا اور سیٹ پر سفید ساڑھی پہنے ایک باوقار عورت بیٹھی تھی۔ اس نے ایک پاؤں سے چپل اتار رکھی تھی جو ٹرین کے مختلف اسٹیشنوں پر رکے اور چلنے کے دوران سیٹ کے نیچے سے کافی پیچھے چلی گئی تھی۔ اس عورت نے جب چپل تلاش کی تو میں نے نیچے بیٹھے ہونے کی وجہ سے اس کی چپل پیچھے سے اٹھا کر اس کے دوسرے پاؤں کے قریب رکھ دی۔ اس خدمت کا صلہ اس خاتون نے یوں دیا کہ اگلے اسٹیشن پر اترنے سے پہلے اس نے اپنی سیٹ مجھ سے دی۔ مجھے سیٹ پر بیٹھنے دیکھ کر فوجی مجھے کہنے لگا کہ اس سیٹ پر تو میرا حق ہے کیونکہ میں تم سے پہلے ہی اس سیٹ کے خالی ہونے کے انتظار میں تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ چھٹی پر ہمیں جا رہا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ حق کی بات چھوڑو۔ چونکہ سفر لمبا ہے اور مجھے بھی ہمیں جانا ہے اس لئے ہم باری باری اس سیٹ پر بیٹھیں گے۔ مجھے بھی اس لکڑی کی سیٹ سے زیادہ فرش پر ٹانگیں پھیر کر بیٹھنے میں زیادہ آرام تھا۔ پھر میرے بیگ میں دس ہزار روپے تھے، ٹو اٹلٹ جانے کے دوران اس کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی۔ قصہ مختصر یونی کھی سیٹ اور کبھی فرش پر بیٹھے گاڑی۔ ہمیں کی مضافات میں داخل ہوئی۔

کلیان اسٹیشن سینٹرل ہمیں سے ستر میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ ہمیں کی لوکل ٹرین کا آخری اسٹیشن ہے۔ میں کلیان میں پنجاب میل سے اتر گیا اور لوکل ٹرین میں بیٹھ گیا۔ پنجاب میل چونکہ ایک پریس ٹرین ہے۔ اس لئے کلیان کے بعد وکٹوری ٹرمینس پر ہی رکتی تھی جہاں پولیس اور انٹیلی جنس کے لوگوں کی موجودگی ضروری تھی۔ ان سے ہی کچھ کیلئے میں نے کلیان سے لوکل ٹرین پکڑی اور "مسجد" نامی اسٹیشن پر اتر گیا۔ ہمیں نے مجھے جھنڈی بازار پہنچا دیا۔ جھنڈی بازار ہمیں میں مسلمانوں کا گڑھ ہے۔ جے جے ہسپتال ناکے کے قریب میں نے شبنم گیسٹ ہاؤس میں کمرہ لیا اور سفر کی تھکان اتارنے لگا۔ ہمیں پہنچنا میرے سفر کا پہلا سٹاپ تھا۔ منزل ابھی بہت دور تھی۔ میں نے دو روز سفر کی تھکان اتاری۔ ان دو دنوں میں مجھے کئی بار اس گیسٹ ہاؤس کے مالک/مینیجر کے دفتر کے سامنے سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دفعہ میں نے دفتر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا کہ وہ ٹرانسپورٹ پر ریڈیو پاکستان کی خبریں نہایت دلچسپی آواز میں سن رہا تھا۔ میں بڑی آہستگی سے دفتر میں داخل ہو گیا۔ مالک کو جب میری موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے ٹرانسپورٹ فوراً بند کر دیا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو گا۔ چہ گیسٹ ہاؤس میں میں نے اپنا نام آصف علی لکھوایا تھا۔ لیکن مالک شاید مجھے بھی کھاتی انجینیئر سمجھے بیٹھا تھا۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کیلئے کہا کہ میں بھی ریڈیو پاکستان سننے کا خواہش مند ہوں۔ وہ کچھ اور گھبرا گیا۔ میں نے اسے کہا کہ تم جس طرح چاہو میرے متعلق اپنی نقلی کر سکتے ہو کہ میں مسلمان ہوں۔ گھبراہٹ میں اسے اور کچھ نہ سوچا کہنے لگا کہ آپ واقعی مسلمان ہیں تو مجھے سوہرا تھرا اور انارنا سنادیں۔ میں نہیں پڑا اور اسے دونوں صورتیں قرأت کے ساتھ سنادیں۔ اس کا خوف کم ہوا۔ کہنے لگا کہ آپ نے اپنا ایڈریس لکھنا کھنکھوایا ہے۔ لکھنے میں تو آپ کی شکل و شبابت کے آدی نہیں ہوتے۔ اس کا نام غفار تھا۔ میں نے اسے کہا کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بیان نہیں کیا جاسکتا صرف سمجھا جاتا ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تم سے زیادہ پاکستان کا حامی ہوں۔ تم بھی میرے متعلق زیادہ نہ سوچو۔ مجھے تم ایک اچھا دوست پاؤ گے۔ بھارت کے سب سے مشہور اور بڑے شہر میں مسلمانوں کی آبادی والے حصے میں مسلمانوں کے خوف اور دہشت کی یہ ایک معمولی سی مثال تھی۔ غفار نے ہماری اس گفتگو کے بعد سب سے پہلے تو یہ کیا کہ رجسٹر میں میری گیسٹ ہاؤس سے روانگی درج کر دی اور مجھے اپنے ذاتی رہائشی کمروں سے ملحقہ ایک کمرے میں شفٹ کر دیا۔ یہ کمرہ بڑا اور زیادہ صاف تھرا تھا اور اس کے ساتھ اٹچڈ باٹھروم بھی تھا جبکہ باقی تمام منزلوں پر آٹھ آٹھ کمروں کیلئے مشترکہ ایک غسل خانہ اور ٹوائلٹ (سڈاس) تھا۔ غفار نے بتایا کہ گیسٹ ہاؤس کے دوسرے کمروں کی طرح اس کمرے کا رجسٹر اندراج نہیں ہے اور نہ ہی دوسرے کمروں کے رہائشیوں کی طرح اس کمرے کی روزانہ رپورٹ پولیس کو بھیجی جاتی ہے۔ اس نے اپنے ذاتی ملازم کو میرے کمرے کی صفائی کرنے اور کھانا وغیرہ لانے کی ہدایت کی۔ اس طرح میری پریشانی بھی دور ہو گئی۔ پاکستان کی طرح بھارت میں بھی ہوٹلوں میں مقیم مسافروں کے کوائف ہر روز متعلقہ قوتوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ مجھے زخموں کی بنیاد بدلنے اور دوا کے لئے ڈاکٹر کی ضرورت تھی۔ غفار کے توسط سے ایک ڈاکٹر جس کا کلینک جھنڈی بازار میں ہی تھا۔ ہر روز گیسٹ ہاؤس میں آ کر میری بنیاد تبدیل کرنے لگا۔ دہلی کے ڈاکٹر نے مکمل نسخہ مجھ سے دیا تھا۔ اس ڈاکٹر نے اسی نسخے کے مطابق مجھے انجکشن اور دوا وغیرہ دینی شروع کر دی۔ میرے زخم تو آہستہ آہستہ مندمل ہو رہے تھے۔ لیکن دے کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ جب عام دواؤں سے افاق نہ ہوا تو اس ڈاکٹر نے انجکشن تجویز کئے۔ چوبیس گھنٹے میں دو انجکشن اور گولیوں سے مجھ سے دے سے عارضی طور پر Relief مل جاتی تھی۔ گیسٹ ہاؤس میں ناشتہ اور کھانا باہر کے قریبی ریسٹورنٹس سے آتا تھا۔ کھانا لانے والے لڑکوں کو باہر والے کہہ کر پکارتے تھے۔ ہمیں میں عام گفتگو ایک مخصوص ملی جلی زبان میں کی جاتی ہے۔ میں نے ناشتے میں فرائیڈ اڈے اور توس منگوانے چاہے تو غفور کے ملازم نے باہر والے کو یوں آڑ دیا۔ "دو بیڈا مسکا میں فرانی ٹیکھا کم، دو پاؤں اور ٹیکھی چائے لاؤ" مسکا کا مطلب کھن اور پاؤں تو اس اور بند کو کہتے ہیں اور ٹیکھا سرخ مچو کر۔

غازی

جھنڈی بازار سے ہے اسپتال ناکہ (چوک) سے شروع ہو کر ایرانی امام باڑے اور ایرانی مسافر خانے تک جاتا ہے۔ اس کے آگے کر فورڈ مارکیٹ ہے جہاں سے محمد علی روڈ شروع ہوتی ہے۔ پاکستان سے دہلی میں مجھے بمبئی میں ہمدردوں کے جوائڈریس دیئے گئے تھے۔ وہ بالکل نامکمل تھے۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کا صرف نام لکھا تھا جس کا لڑکا کالا ہورایف سی کالج کا طالب علم تھا۔ دوسرا ایڈریس ایرانی مسافر خانے کے سامنے ایک موٹر بیٹری مرمت کرنے والی دکان کا تھا جہاں سے مجھے ”بڑے سیٹھ“ کا پتہ مل سکتا تھا۔ اسی طرح ایرانی امام باڑے کے قریب و جوار میں یوسف ٹیل کا پتہ کرنا تھا۔ جھنڈی بازار کے تقریباً وسط میں نیازی ریٹورنٹ تھا جس کے مالک کے ذریعے میں ایک بینک کے ایم ڈی مسٹر گون والا تک پہنچ سکتا تھا۔

میں نے پہلے یوسف ٹیل کی تلاش شروع کی لیکن نام کام رہا۔ اس علاقے میں جس سے بھی یوسف ٹیل کا پوچھا تو وہ مجھے گھورتی نظروں سے دیکھتا اور ”معلوم نہیں“ کہہ کر آگے بڑھ جاتا۔ میں اب جسمانی طور پر اس قابل ہو چکا تھا کہ لنگڑا ہوا آہستہ قدموں سے کچھ فاصلے تک پیدل چل سکتا تھا۔ میں نے اب بڑے سیٹھ کو ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا اور ایرانی مسافر خانے کے سامنے بیٹری مرمت کی دکان پر جا پہنچا۔ بڑے سیٹھ کا پوچھنے پر پہلے شکر دوں اور پھر مالک نے لاٹلی کا انٹھار کیا۔ میں دکان کے اندر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور مالک سے کہا کہ مجھے بڑے سیٹھ سے ہر حالت میں ملنا ہے اور تم مجھے اس کے متعلق بتا سکتے ہو۔ میں تو کسی نہ کسی طرح بڑے سیٹھ تک پہنچ جاؤں گا لیکن جب اسے معلوم ہوگا کہ تم نے مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تو وہ تم سے بہت خفا ہوگا۔ میری یہ معمولی سی دھمکی کام کر گئی اور دکان مالک نے مجھے کہا کہ جمہرات کو شام 6 بجے یہاں آ جانا۔ بڑے سیٹھ کا ایک آدمی ہر جمہرات کو یہاں آتا ہے۔ تمہیں اس سے ملو اور وہاں جاؤ۔ میرے پاس جمہرات تک انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس لئے وہاں گیسٹ ہاؤس میں چلا گیا۔

بمبئی کا موسم بھی بڑا عجیب ہے۔ بالکل اچانک چند منٹوں میں بادل گھر آتے ہیں اور موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے۔ پیدل چلنے والے دکانوں کی اوٹ میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چندہر میں منٹ میں بارش ختم جاتی ہے۔ پانی کی نکاسی کا اتنا اعلیٰ نظام ہے کہ بارش ختم ہوتے ہی سڑکوں پر ایک بوند پانی دکھائی نہیں دیتا اور رات گیر اپنی راہ لیتے ہیں۔ لوکل ٹریبون کا نظام بھی اتنا اعلیٰ اور وسیع ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ بمبئی سینٹرل سے لیکر کلیان اور شہر کے کم و بیش 125 اسٹیشنوں مثلاً داور کولابا، اندھیری، وری، مسجد اور نامعلوم کن کن اسٹیشنوں کے لئے ہر چھ سات منٹ کے اندر گاڑی مل جاتی ہے۔ لائنوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اپنی منزل کے لئے اگر گاڑی چھوٹ جائے تو چند منٹوں کے اندر دوسری گاڑی آ جاتی ہے۔ ہر اسٹیشن پر گاڑی بہ مشکل ایک منٹ ٹھہرتی ہے۔ گاڑیوں کے انجن بجلی سے چلتے ہیں اور کوئی گاڑی ایک منٹ بھی لیٹ نہیں ہوتی۔ لوکل بسیں بھی لاتعداد ہیں اور ان سنگل اور ڈبل ڈیکر بسوں میں کبھی اور لوڈنگ نہیں ہوتی۔ ہر بس اسٹاپ پر لوگ لائنوں میں کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی دھکم پیل نہیں ہوتی۔ جب کنڈیکٹر نے Full کہہ دیا مسافر وہیں رک جاتے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لائن میں کھڑے میاں بیوی میں سے ایک کو جگہ مل گئی تو دوسرا اگلی بس کے انتظار میں وہیں رک گیا۔ ٹیکسی یا تو بڑے کاروباری لوگ لیتے ہیں جنہیں اپنی گاڑی یا پارکنگ کے لئے جگہ نہیں ملتی اور یا پھر سیر تفریح کے لئے چو پائی، جوہو اور بالابار ہلز پر جانے والے تمام سڑکوں پر خالی ٹیکسیاں ہر وقت دوڑتی پھرتی ہیں۔ ان کے میٹر بالکل صحیح کام کرتے ہیں اور ٹیکسی لیتے وقت پاکستان کی طرح ڈرائیور پہلے آپ کا Biodata منزل مقصود پوچھ کر فرعونیت سے یہ فیصلہ نہیں کرتا کہ وہ آپ کو لے کر جائے یا نہیں اور نہ ہی کرائے کے لئے آپ سے بھاؤ تاؤ کرتا ہے۔

میں نے بمبئی کی ضرورت کے مطابق ایک برساتی اور پڑھنے کے لئے چند کتابیں خرید لیں۔ پڑھنے کے خوف سے میں بلا ضرورت باہر نہیں نکلتا تھا حالانکہ بمبئی دیکھنے کی جگہ بڑی آرزو تھی۔ جمہرات کو میں ساڑھے پانچ بجے ہی بیٹری کی دکان پر چلا گیا۔ اپنا بسٹل میں ہر وقت اندرونی ٹیبل میں رکھتا تھا۔ تقریباً سات بجے شام ایک گاڑی ایرانی مسافر خانے کے پاس رکی۔ اس گاڑی کے پیشے سیاہ تھے اور پیشے ہونے لوگ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ دکاندار نے گاڑی کے ڈرائیور سے کچھ بات کی اور میری طرف اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے اندر بیٹھے لوگوں سے پوچھا اور گاڑی سے اتر کر میری طرف آیا اور مجھ سے میرا نام، پتہ اور بڑے سیٹھ سے ملنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے اپنا نام آصف اور شیم گیسٹ ہاؤس کا پتہ دیا اور کہا کہ میرا بڑے سیٹھ سے ملنا ہے۔ حد ضروری ہے اور ملنے کی وجہ میں صرف اسے ہی بتاؤں گا۔ ڈرائیور نے وہاں جا کر گاڑی میں بیٹھے لوگوں سے کچھ بات کی اور مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ گاڑی کے قریب پہنچا تو پچھلا دروازہ کھلا اور اندر بیٹھے ایک شخص نے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کے لئے کہا۔ میرے بیٹھے ہی گاڑی چل پڑی۔ کچھ سیٹ پر میرے علاوہ دو جوان آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھ سے شائستگی سے لیکن بمبئی کی عوامی زبان میں مجھ سے دوبارہ میرا نام، پتہ اور بڑے سیٹھ سے ملنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے انہیں وہی جواب دیا جو ڈرائیور کو پہلے دے چکا تھا۔ میں نے انہیں ایک بات مزید بتانی کہ میرے پاس اس وقت ایک نوڈ بسٹل اور لوڈ میٹر ہیں۔ آپ کو اس لئے بتا رہا ہوں کہ آپ میرے متعلق کوئی شک نہ کریں۔ انہوں نے بسٹل دیکھنا چاہا تو میں نے بیٹ سے نکال کر سامنے بیٹھے آدمی کے ہاتھ میں دے دیا۔ ان دونوں نے کجراتی زبان میں آپس میں کچھ باتیں کیں اور پھر مجھ سے پوچھا، ”کیا تم پاکستانی فوجی ہو؟“ میں نے جواب دیا ”میں جو کوئی بھی ہوں صرف بڑے سیٹھ کو بتاؤں گا آپ کو صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ میں بھارتی نہیں ہوں۔“ میرا جواب سن کر انہوں نے آپس میں کجراتی زبان میں بات کی اور مجھے کہا ”ہمارا ڈرائیور تمہارے ساتھ شیم گیسٹ ہاؤس میں جا کر تمہاری وہاں رہائش کی تصدیق کرے گا۔ ہم آج بڑے سیٹھ سے بات کریں گے۔ اگر اس نے اجازت دی تو کل 11 بجے ڈرائیور تمہیں لینے شیم گیسٹ ہاؤس میں آ جائے گا۔ اگر ڈرائیور ایک بجے تک تمہارے پاس نہ پہنچا تو سمجھ لینا کہ بڑا سیٹھ تم سے ملنا نہیں چاہتا۔ اس صورت میں تم بڑے سیٹھ سے ملنے کی بات بھول جانا اور دوبارہ ایسی کوشش نہ کرنا۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ اتنی دیر میں گاڑی بے جے اسپتال ناکہ کے قریب جا کر رک گئی۔ انہوں نے میرا بسٹل مجھ سے واپس لوٹا دیا۔ ڈرائیور بھی میرے ہمراہ گیسٹ ہاؤس میں آیا۔ غفور اپنے فتر میں بیٹھا تھا۔ ڈرائیور نے غفور سے میرے اس گیسٹ ہاؤس میں آمد اور رہائش کے متعلق پوچھا اور خاموشی سے چلا گیا۔ غفور اس کی باتیں سن کر کچھ پریشان دکھائی دیتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے خاموشی سے ایک کجراتی اخبار نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں کجراتی تو نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن اپنی تصویر دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ غفور نے بتایا کہ میری آمد کے دوسرے دن ہی اسے میرا چہرہ جانا پہچانا دکھائی دیا۔ اس نے کہا کہ اپنے اخبار کھنگالے اور وہ اخبار نکال لیا جس میں میری تصویر چھپی تھی۔ اب غفور سے کچھ چھپانا ہو رہا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ یہ سب درست ہے اور اب تم پر منحصر ہے کہ مجھے پناہ دیا جائے یا پکڑا دو۔ لیکن یہ ضرور یاد رکھنا کہ میں گرفتار ہونے کے بجائے موت کو ترجیح دوں گا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے بسٹل نکال کر اسے دکھایا اور کہا کہ اس کی گولیاں مجھے اپنی آخری سانس تک گرفتاری سے بچائیں گی۔ غفور نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ اگر آپ کو پکڑا دیا تو ہوتا تو کئی روز پہلے یہ کام کر چکا ہوتا۔ ایک مسلمان جاہل بزدل بھارتی کتوں کے ہاتھوں پکڑا دینے پر میں خود مر جانے کو ترجیح دوں گا۔ میری طرف سے آپ کوئی خدشہ محسوس نہ کریں لیکن آپ کا ہر جانا آپ کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ احتیاط کریں اور کم سے کم باہر جائیں۔ غفور نے مجھ سے پوچھا کہ میں تو اس آدمی کی آپ کے متعلق پوچھ گچھ سے پریشان ہو گیا تھا۔ وہ آدمی کون تھا؟ میں نے غفور کو بتایا کہ میں بڑے سیٹھ سے ملنے کی کوشش میں تھا۔ یہ ڈرائیور اس کے آدمیوں نے میری تصدیق کے لئے مجھ سے پوچھا تھا۔ غفور نے مجھ سے بڑے سیٹھ کے متعلق پوچھا تو میں نے اسے صاف بتا دیا کہ مجھے اس کے نام کا تو علم نہیں۔ مجھے ایرانی مسافر خانے کے سامنے ایک بیٹری ملکیٹ کی دکان سے اس کا پتہ لینے اور ملنے کے لئے کہا گیا تھا۔ ایرانی مسافر خانے اور بیٹری کی دکان کا نام سن کر غفور بولا۔ کیا آپ کو واقعی بڑے سیٹھ کے نام کا علم نہیں۔ میں نے جواب دیا ”جب میں نے تمہیں اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے تو بڑے سیٹھ کا نام چھپانے سے کیا فائدہ تھا۔ غفور نے چائے کا آرڈر دے رکھا تھا۔ ہماری اس گفتگو کے دوران ہی چائے آچکی تھی۔ چائے پیتے ہوئے غفور نے کہا کہ بڑے سیٹھ کا نام حاجی مستان ہے۔ وہ برصغیر کا سب سے بڑا سنگھ اور بمبئی اور ساحلی علاقوں میں مسلمانوں کی جان و مال کا محافظ ہے۔“ بمبئی کے مسلمانوں کا اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ صرف دو سہارے ہیں۔ حاجی مستان اور دیپ کمار۔ دیپ کمار مسلم اور غیر مسلم دونوں میں یکساں مقبول ہیں۔ کئی بار ہندو مسلم فساد کے دوران دیپ کمار کیلئے فساد زدہ علاقے میں چلا گیا اور اس کے احترام میں ہندو مسلم فساد ڈھل گیا۔ حاجی مستان کے بے شمار مسلم آدمی سارے بمبئی میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہندو مسلم فساد شروع ہوتے ہی مسلمانوں کے تحفظ کے لئے وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی سطح ہندو تنظیموں کے ہندو مسلم فساد میں حصہ لینے کے باوجود مسلمانوں کا جانی نقصان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم ہوتا ہے۔ اگر حاجی مستان نے آپ کو پناہ دے دی تو پھر کم از کم بمبئی میں آپ کو کوئی خطرہ نہ ہوگا۔ پولیس اور خفیہ والے اس کا نام سنتے ہی کانپنے لگ جاتے ہیں اس کا اسمگلنگ کا سامان لانچوں اور ڈکوں پر کھلے عام پولیس کے سامنے لوڈ اور ان لوڈ ہوتا ہے لیکن کسی کی جرات نہیں ہوتی کہ اس کے خلاف کارروائی کر سکے۔ یہی باتیں کرتے ہوئے رات کے دس بج گئے اور میں اپنے کمرے میں سوئے چلا گیا۔

اگلے روز وہی ڈرائیور ساڑھے گیارہ بجے مجھے لینے آ گیا۔ وہی کالے شیشوں والی گاڑی تھی جس میں ایک شخص آگے اور دوسرا کچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میں کچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تو ساتھ والے شخص نے ایک سیاہ ٹی مجھے دیتے ہوئے نہایت نرمی سے کہا کہ اسے اپنی آنکھوں پر باندھ لیں اور بسٹل مجھے دے دیں۔ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور گاڑی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

تقریباً تیس پینتیس منٹ کی ڈرائیور کے بعد گاڑی رکی۔ میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ یہ ایک بہت بڑی اور بندگان گرج تھی جہاں چاروں رگڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ اس گرج کے اندر ہی ایک لفٹ تھی جس کے ذریعے ہم ایک بندر امداری میں پہنچے اور وہیں بارہ قدم چل کر ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ کمرہ بہت اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ تھا۔ اس کمرے کی دو دیواروں کو چھت سے فرش تک موٹے پردوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یقیناً دیواروں میں کھڑکیاں ہوں گی جن سے باہر کامنڈر دیکھ کر اس جگہ کی لوکیشن کا علم ہو سکتا تھا۔

ہم صوفوں پر بیٹھ گئے تھوڑی ہی دیر میں چائے، کافی اور کھانے کے دیگر لوازمات آ گئے۔ ہمارے سامنے ایک سنگل صوفہ کے ساتھ میز پر چار ٹیلی فون پڑے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ صوفہ صاحب خانہ کے لئے مخصوص ہے۔ ہم چائے پینے میں مصروف تھے کہ ایک لمبا، دجلا اور سانولے رنگ کا شخص کمرے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے یہاں لانے والے نظمیٹا کھڑے ہو گئے۔ میں بھی کھڑا ہو گیا، وہ شخص اس مخصوص صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر خاموشی سے مجھے پرکھتا رہا، پھر کجراتی نماز دو میں مجھ سے مخاطب ہوا، ”آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے مگر مارجے کیا کام ہے۔“ میں نے جواب دیا ”میں آپ سے چند منٹ بالکل علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ ”یہ دونوں میرے قابل اعتماد ساتھی ہیں۔ ان کے سامنے آپ بلا جھجک ہر بات کہہ سکتے ہیں۔“ اس لیے آدمی نے کہا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا کہ مجھے صرف چند منٹ علیحدگی میں آپ سے بات کرنی ہے۔ اس کے بعد اگر آپ نے مناسب سمجھا تو بے شک اپنے ساتھیوں کو بتا دیں۔ اس نے دونوں کو اشارہ کیا اور وہ فوری کمرے سے باہر چلے گئے۔ اب ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی نہ تھا۔ سوایہ نظروں سے اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے کہا ”مجھے آپ کا نام معلوم نہیں۔ میں پاکستانی ہوں اور (اپنے ادارے کا نام بتاتے ہوئے) ٹریڈنگ کے دوران مجھے کہا تھا کہ اگر کسی مشکل میں بڑا جاؤ تو اس نامکمل ایڈریس پر بڑے سیٹھ سے ملو۔ میں اور میرے ساتھی دو سال سے زیادہ عرصہ دہلی میں دیئے گئے اہداف اور مشنوں کی تکمیل کرتے رہے۔ میں DMI کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور ایک ماہ جھنڈی انتہائی تشدد سہنے کے بعد DMI کے دو گارڈ زکو ہلاک کر کے فرار ہوا۔ میں نے دوران تشدد اپنی زبان نہیں کھولی۔ میرے ساتھی دہلی میں بالکل محفوظ اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ میں زخمی ہونے اور اپنے ساتھیوں کی سلامتی کی خاطر بمبئی آ گیا ہوں اور ہدایات کے مطابق آپ سے ملنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں نے اسے اپنا کوڈ نمبر بتایا اور کہا آپ کا میرے ادارے سے یقیناً رابطہ ہوگا۔ آپ ان سے میری تصدیق کر سکتے ہیں۔ اخبارات میں میرے فرار ہونے کی خبر کے ساتھ میری تصویر بھی چھپی ہے۔

میر کی باتیں وہ بڑے غور سے سن رہا تھا۔ میں نے بات ختم کی تو اس نے کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا۔ ”میرا نام حاجی مستان خان ہے۔ جن اخباروں میں تمہاری تصویریں شائع ہوئی ہیں وہ سب اخبار میں منگوا لوں گا، بھارتی پولیس، آئی بی اور فوجی جاسوسی ادارے جانتے ہیں کہ میں بھارتی مسلمانوں اور پاکستان کا نہ صرف ہاں ہوں بلکہ ان کے مفاد میں کوئی خطرناک کام کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ ہمیشہ اسی تاک میں رہتے ہیں کہ ان کے ہاتھ میرے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت آجائے اور وہ مجھے گرفتار کر لیں۔ تمہاری تمام باتوں پر یقین کرنے کے باوجود اس بات کا امکان موجود ہے کہ تم کسی بھارتی جاسوسی ادارے کے فریڈ ہوا اور تمہارے فرار کی خبر اور تصویروں کو اخبار میں اس لئے چھپوا دیا گیا ہو کہ تمہارا ادارہ مجھے اپنے جال میں پھانس سکے۔ میرا تمہارے پاکستانی ادارے سے وائر لیس پر دو ہفتے میں ایک بار رابطہ ہوتا ہے۔ تمہارے کوڈ نمبر، نام اور محلے سے میں تمہارے ادارے سے تمہاری تصدیق کروں گا، تم اپنا پورا نام کوڈ نمبر اور اپنے افسروں کے نام لکھ کر مجھے دے دو۔ تم اعلیٰ ہو یا نپلی، دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ میں گیسٹ ہاؤس سے تمہارا سامان منگوا لیتا ہوں۔ جب تک پاکستان سے تمہاری تصدیق نہیں ہو جاتی تم کو میرے آدمیوں کی گمرانی میں ایک آرام گھر میں رہنا ہوگا اور اس گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس گھر میں کوڈ نمبر تمہارا اطلاع بھی کرے گا اور تمہاری ضرورت کی ہر شے میٹھا کی جائے گی۔ میرے آدمی تمہارے ساتھ نہایت عزت سے پیش آئیں گے جب تک تم ان کے فرائض میں مداخلت نہیں کرو گے۔ پاکستان نے اگر تمہاری سچائی کی تصدیق کر دی تو تم ہمارے انتہائی قابل احترام مہمان ہو گے اور ہم تمہاری ہر خواہش پوری کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔ دوسری صورت میں یعنی پاکستان نے اگر تمہاری تصدیق نہ کی تو ہم تمہیں بغیر تشدد کے ہلاک کر دیں گے۔ تمہیں جہاں رکھا جائے گا وہاں تو میرے آدمی تمہاری اصلیت جاننے کی کوشش کریں گے اور نہ ہی تم اپنے متعلق انہیں کچھ بتانا۔ یہ ہدایات دے کر حاجی مستان نے میز میں لگی گھنٹی بجائی اور ملازم کو کافز اور پین لانے کا کہا۔ میں نے کافز پر اپنے متعلق تمام تفصیل لکھ دی۔ حاجی مستان نے مجھے یہاں تک پہنچانے والے دونوں آدمیوں کو ایک دوسری گھنٹی بجاکر بلایا اور کجراتی میں انہیں میرے متعلق ہدایات دیں۔ اس کے بعد حاجی مستان اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھ سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور بولا ”مجھے تمہاری باتوں پر پورا یقین ہے، لیکن احتیاطاً یہ ناگوار کام کرنا ضروری ہے جو نبی پاکستان سے تمہاری تصدیق ہو جائے گی، میں تم سے نہ صرف معافی مانگوں گا بلکہ اس ناخوشگوار کام کے بدلے میں میرے پاس تمہارے لئے ایسے Surprises ہوں گے جن کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ کر حاجی مستان چلا گیا۔ ان دو آدمیوں نے بڑے احترام سے مجھے چلنے کو کہا۔ گیرج پہنچنے پر گاڑی میں بیٹھے ہی میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ گاڑی تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ایک جگہ رکی۔ میری آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی۔ یہ ایک بہت اونچی دیواروں والا جگہ تھا جس سے باہر صرف ناریل کے درختوں کا اور کچھ دھکیا دھکیا اور مسند رکھروں کی آواز سنائی دیتی تھی اس جگہ میں ایک نہایت آراستہ بیڈروم اور ایک خوب صورتی سے سجاوا ڈرائنگ روم مجھے دیا گیا۔ ان دو آدمیوں نے مجھے کہا کہ وہ گیسٹ ہاؤس سے میرا سامان اور ڈاکٹروں کے لے کر چار بجے آجائیں گے۔ میں نے انہیں مختلف انگریزی اور اردو کے میگزین اور چند کتب لانے کا کہا، پاکستان سے تصدیق ہونے تک مجھے اس مکان میں ہی وقت بسر کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

اونچی چار دیواری سے گھرے اس جگہ میں مجھے گھومنے پھرنے کی پوری آزادی تھی۔ بیڈروم اور ڈرائنگ روم دونوں ایئر کنڈیشنڈ تھے۔ ڈرائنگ روم میں Grundig ریڈیو گرام، اور بہت سارے ریکارڈ اور ٹیپ کے اسپول تھے۔ بیڈروم میں بھی ایک اعلیٰ ریڈیو تھی۔ دو پہر کا کھانا بہت ہی ڈشوں پر مشتمل تھا۔ سہ پہر 4 بجے ڈاکٹروں کے لے کر ایک آدمی آ گیا۔ ڈاکٹر نے میرے زخموں کی ڈریسنگ کی۔ میں نے اسے انجکشن لکھوادیے تو اس نے کہا کہ ان انجکشنوں سے بہت زیادہ اچھے اور زود اثر انجکشن وہ لایا ہے۔ انجکشن لگانے کے بعد ڈاکٹر چلا گیا۔ اس کے ہمراہ آنے والا آدمی ڈھیر سارے رسالے اور کتابیں لے آیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اگر جینا چاہیں تو اعلیٰ اسکالچ و سکی موجود ہے، میں نے شکر کیے کے ساتھ معذرت کر لی۔ وہ کہنے لگا، جس چیز کی بھی ضرورت ہو، آپ بتا دیں، فوری میڈیا کر دی جائے گی، میں ہر روز دوسرے آپ کے پاس آؤں گا، ہر روز چار بجے ڈاکٹر آیا کرے گا، اپنی صحت کے علاوہ اس سے اور کوئی بات نہ کریں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

غازی

بہنی کی گلیوں میں

مکمل ریٹ بحفظ کے احساس، اعلیٰ ڈاکٹری علاج اور اچھی خوراک سے میں تیزی سے تندرست ہونے لگا، اسی طرح آٹھ روز گزر گئے۔ نویں روز 11 بجے وہی دونوں آدی آئے اور مجھے کہا کہ بڑے سیٹھ نے بلوایا ہے۔ میں تیار ہو کر ان کی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اس بار انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی۔ اسی بڑی گلی میں گاڑی پارک تھی۔ میں چونکہ بہنی سے ناواقف تھا اس لئے پٹی نہ ہونے کے باوجود مجھے اس علاقے کا پتہ نہ چل سکا۔ ڈرائنگ روم میں ہمیں بیٹھے تھوڑا ہی وقت گزارا، وہاں کہ حاجی مستان آ گیا۔ ہم سب اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ حاجی مستان نے آتے ہی مجھے گلے لگایا اور پوچھا کہ کیا آپ کی تصدیق ہو گئی ہے مجھے کیا علم تھا کہ اتنے محبت وطن، بڑے اور جاں فروش کی میزبانی کا شرف مجھے ملے گا۔ میں نے آج اور کل کیلئے اپنے تمام کام معطل کر دیئے ہیں۔ میں آپ کے سرانجام دیئے مشنوں کے واقعات سننے کو بہت تیار ہوں۔ آپ کیلئے اب کوئی پابندی نہیں۔ آپ جہاں جانا چاہیں۔ میرے چار محافظ آپ کے ہمراہ جائیں گے۔ یہ چاروں محافظ اور ایک گاڑی چوبیس گھنٹے آپ کے Disposal پر ہوں گی۔ آپ کو جس چیز کی بھی ضرورت ہو، بلا تھک مجھے کہہ دیں یا میرے آدی کو جو روزانہ دو بار آپ کے پاس آیا کرے گا۔ اس نے مزید کہا کہ پاکستان سے آپ کے مکمل صحت یاب ہونے تک آپ کو میرے پاس قیام کرنے کا کہا گیا ہے یا یوں کہہ لیں کہ جب تک میں آپ کے مکمل صحت یاب ہونے کی اطلاع ان کو نہ دوں اور جب تک آپ کے متعلق مزید احکام نہ آئیں۔ آپ میرے معزز مہمان رہیں گے۔

ہم نے دوپہر کا کھانا اکتھے کھایا اور تین بجے تک میں اسے اپنے مشنوں کے متعلق مختصر آہٹاتا رہا۔ حاجی مستان پوری دلچسپی اور شوق سے میری باتیں سنتا رہا۔ وہ جہاں تھا تو اس بات پر کہ بغیر کسی مادی لالچ کے میں نے اس جان جو حکم اور خطرناک مہم کے لئے خود کو اٹھایا کیا۔ کہنے لگا کہ میرے ساتھ کام کرنے والے تو آپ کے انجام دیئے مشنوں سے سینکڑوں گنا کم خطرناک کاموں کے لئے لاکھوں روپے معاوضہ لیتے ہیں۔ تین بجے میں نے اس سے اگلے روز ملنے کا وعدہ کر کے اجازت لی۔ اس نے خود بتایا کہ یہ گھر مالا بارمل پر ہے اور جہاں میری رہائش ہے۔ وہ جو وہ علاقہ ہے اور بنگلہ ساحل سمندر کے بالکل قریب ہے۔ میری روانگی سے پہلے ہی اس نے محافظوں کا انتظام کر دیا تھا اور ایک شیور لیٹ 57 ماڈل کی کار میرے لئے مخصوص کر دی تھی۔ اسی کار میں، میں محافظوں کے ساتھ جوہوا لے بیٹنگ میں پہنچا۔ حاجی مستان کو میں نے دہلی سے پیچھے گئے اپنے سامان کی بلی کی کاغذات بھی دے دیئے تھے میرا سامان اگلے روز میری نمبر موڈگی میں بیٹنگ پر پہنچ گیا۔ میں اس وقت حاجی مستان سے ملنے گیا ہوا تھا۔

میری داستان سننے کے شوق میں حاجی مستان نے واقعی دن کے بیشتر وقت کی اپنی ملاقاتیں اور دوسری سرگرمیاں معطل کر دی تھیں۔ اس کے سوال و جواب میں ایک دن اور داستان ختم کرنے میں لگا۔ ایک طرف وہ میرے، میرے ساتھیوں اور لڑکوں کے کارنامے سن کر جو حیرت تھا تو دوسری طرف میں برصغیر کے اس سب سے بڑے اسمگلر کی زندگی کے ایک نئے پہلو سے روشناس ہو رہا تھا۔ ”بڑے سیٹھ“ کو تو میں نہیں جانتا تھا لیکن حاجی مستان کے متعلق تو مجھے پاکستان میں ہی اچھا خاصا علم تھا۔ وہ بہنی کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے بھی بہنی کے انتظامی معاملات چلانے میں صوبائی حکومت کو واضح ہدایات دے رکھی تھیں کہ حاجی مستان کی خواہشات کو اہمیت دی جائے۔ دیپ کمار کو بہنی کا میسر بنانے میں بھی حاجی مستان کا ہی ہاتھ تھا۔ بہنی میں مجھے بھی معلوم ہوا کہ اس علاقے کے دوسرے تمام اسمگلنگ کے گروہ یا تو خود ہی حاجی مستان کے خوف سے ٹوٹ چھوٹ کر بکھر گئے تھے یا پھر کوئی چارہ نہ دیکھتے ہوئے اسکے گروہ میں شامل ہو گئے۔ حاجی مستان سے عذری کی سزا صرف موت تھی۔ یوسف ٹیل جسے میں پہلے ملاش کرتا رہا تھا۔ اعداد انگلر تھا جس نے حاجی مستان کی سرپرستی میں آنے سے انکار کر دیا تھا وہ ان دنوں خوف سے زیر زمین تھا اور حاجی مستان کے کارندے اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ اتنے زیادہ اثر و رسوخ کا مالک برصغیر کا سب سے بڑا اسمگلر میرے سامنے بیٹھا بالکل بچوں کی طرح میری داستان سے محظوظ ہو رہا تھا۔ مسلمانوں اور پاکستان سے اس کی محبت اس کے ہر لفظ پر ہر بات سے چھوٹ چھوٹ کر نکل رہی تھی۔ میری داستان سن کر اس نے کہا کہ ستوڑ ڈھاکہ کا جتنا صدمہ بھارتی مسلمانوں کو ہوا ہے اتنا شاید پاکستانیوں کو بھی نہیں ہوا ہوگا۔ ہم تو پاکستان کو اپنا دفاعی قلعہ اور محافظ سمجھتے تھے۔ ہر بھارتی مسلمان کی آنکھیں مشکل وقت میں پاکستان کی طرف اٹھتی تھیں۔ ستوڑ ڈھاکہ کے بعد ہمارا یہ واحد دنیاوی سہارا بھی ختم ہو گیا تھا لیکن آپ کی داستان سن کر مجھے یقین ہے کہ بھارت چاہے کتنی جنگی تیاریاں کر لے لٹخوں کے ڈھیر لگا دے سارے ہندوؤں کو فوج میں بھرتی کر لے لیکن جب بھی پاکستان اپنے زخم مندمل ہونے پر بھارت سے بدلہ لینے کے لئے دھاڑ لگائے گا تو بھارتی ہندوؤں کی دھوتیاں خراب ہو جائیں گی۔ آپ جب پاکستان واپس جائیں تو وہاں سب پاکستانیوں کو بتائیں کہ بھارت میں ہندوؤں نے بھارتی مسلمانوں کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کر کے ان میں اتنی نفرت پیدا کر دی ہے کہ اب ہر بھارتی مسلمان ایک چھوٹا پاکستان ہے۔ ہم نے کمپری کی حالت کے باوجود اتنی تیاری کر لی ہے کہ وقت آنے پر پاکستان کو پاکستانیوں سے زیادہ ہمدرد اور جاننا بھارت میں ملیں گے۔

حاجی مستان نے مجھے بتایا کہ وہ ایک انتہائی غریب گھرانے میں پیدا ہوا اور اس نے بہت ہی کم پڑھا ہے۔ چودہ برس کی عمر سے ہی اس نے والدین کی غربت کی وجہ سے عام مزدوری حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا اور اپنے زور بازو سے اس مقام تک پہنچا ہے۔ اپنی غربت کے زمانے میں ہندوؤں کے متعصبانہ اور ہنک آمیز سلوک کا بدلہ لے رہا ہے۔ ”میں جو کام کر رہا ہوں اس سے میرا واحد مقصد اس دشمن اسلام ملک کی جزیں کھوکھلی کرنا اور مسلمانوں کو ہر ممکن تحفظ دینا ہے۔“ میں حاجی مستان کے متعلق یہ باتیں اتنے کھلے طور پر اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ مسلمان اور پاکستان کا ہمدرد چند سال پہلے اپنے مالک حقیقی سے جا ملا ہے اس کی آخری رسومات کا منظر بھارتی ٹی وی پر بھی دکھایا گیا اور اس کا گروہ اب ختم ہو چکا ہے۔

حاجی مستان نے کہا کہ میں چند روز میں اپنے اکتھے کئے گئے اسلحہ کے ذخائر بھی آپ کو دکھاؤں گا۔ میں نے اسے کہا کہ پاکستان میں مجھے اپنی کوری اسٹوری (Cover Story) کے لئے نیوٹاگ پاڑہ کا ایک ایڈریس دیا گیا تھا جہاں پر میری تصدیق کرنے والوں نے میرا نام نوڈو چو پڑا اور کھلی جائے گا۔ یو پاری بتانا تھا۔ میں اس ایڈریس پر بھی جانا چاہتا ہوں۔ حاجی مستان نے کہا کہ نیوٹاگ پاڑے میں ڈائمنڈ بلڈنگ میں ایک کشمیری انسل اسمگلر خواجہ اختر رہتا ہے۔ جو ظاہری طور پر قالیوں کا بیوپاری اور اندرونی طور پر اس کے لئے کام کرتا ہے۔ میں اسے یہاں بلوا لوں گا۔ اسے اپنی اصل حقیقت نہ بتانا۔ وہ تمہیں اس ایڈریس پر میرے محافظوں کے ساتھ لے جائے گا۔ میں نے حاجی مستان کو کہا کہ بہنی میں میرا کوئی کام نہیں ہے اپنے مشنوں کی تکمیل اور بھارتی تشدد کے باعث میں بے حد ذہنی تناؤ (Tension) کا شکار ہوں۔ میرے زخم ٹھیک ہو جائیں تو میں سارے بہنی اور گردنوں کے علاقوں میں گھومنے پھرنے جانا چاہتا ہوں۔ کالج کے زمانے سے ہی بہنی کی فلم انڈسٹری کے متعلق ہوش رہا تھی سارے ہیں۔ میں تمام فلم انڈسٹریوں اور مصروف فلمی ستاروں سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔ حاجی مستان نے کہا کہ جب بھی آپ خود کو فحش محسوس کریں مجھے اطلاع بھجوادیں۔ فلم انڈسٹریوں اور فلمی ستاروں تک کام کی رسائی نہیں ہوتی لیکن میری وجہ سے آپ کو تمام فلم انڈسٹریوں اور فلمی ستاروں کے گھروں میں نہایت عزت و احترام سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ آپ کو صرف یہ احتیاط کرنا ہوگا کہ آج سے آپ کا نام آصف علی اور نیشنل ٹریڈنگ ہوگی آپ کا ”برٹش پاسپورٹ“ کل آپ کو مل جائیگا۔ آج آپ کے بیٹنگ میں فوٹو گرافر پاسپورٹ کیلئے آپ کی تصویریں اتارے گا۔ آپ مزید تندرست ہو جائیں تو آپ کی ہر پینڈیہ جگہ پر آپ کو لے جایا جائے گا۔ آج حاجی مستان سے مسلسل ملتے ہوئے یہ تیسرا دن تھا۔ سرد پیر ساڑھے تین بجے میں رخصت لے کر واپس جوہو کے بیٹنگ میں آ گیا۔ آج میرا پہلا بھی واپس کر دیا گیا تھا۔

آج کی شام ڈاکٹر کے چیک اپ کے علاوہ فوٹو گرافنگ میری تصویریں اتار کر لے گیا۔ کھانے کے بعد میں میرے لئے جوہو کے ساحل کی طرف چل دیا۔ تقریباً آدھے کلومیٹر کے بعد لوگوں کی بھیڑ بھاڑ نظر آئی۔ چاندنی رات میں چمکتی ریت اور بیسیوں ٹھیلے والے چاٹ اور ٹاریل کا پانی فروخت کر رہے تھے مختلف ٹولیوں میں سیر کیلئے آنے والے درختوں اور چٹانیاں بچھائے خوش گپیوں میں لگے ہوئے تھے جبکہ جوان جوڑے ٹاریل کے درختوں کی اوٹ میں جگہ جگہ راز و نیاز میں مشغول تھے۔ یہ سب تھینا بہنی کے ڈل کلاس کے لوگ تھے جو اپنی کھولیوں سے نجات پانے کے لئے مینے میں ایک آدھ بار کھلی فضا میں پلنگ منانے آجاتے تھے۔ میں نے یہ اندازہ اس بنیاد پر لگایا کہ کافی آگے تک جانے کے باوجود مجھے کوئی پراپیٹیٹ کا رد کھانی نہیں دی جبکہ وہاں بیسیوں بیگیاں موجود تھیں۔ میرے چاروں محافظ مجھ سے دس قدم پیچھے یوں چل رہے تھے کہ کسی کو بھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ وہ میرے محافظ ہیں۔ اوتوں اور گھوڑوں والے بھی ساحل پر سیر کرنے کے لئے جگہ جگہ موجود تھے۔ میں کافی دیر یونی گھومتا رہا۔ ٹاریل کا پانی پیا۔ بہنی کی خاص چاٹ پھیل پوری کھائی اور واپس لوٹ آیا۔ گھڑ سواری میں بچپن سے ہی کرتا آیا تھا اور شہسوار نہیں تو اچھا سوار ضرور تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ساحل پر گھوڑا بھاگاؤں لیکن زخموں کی وجہ سے میرا گھوڑا پر بیٹھنا اور بھگانا ناممکن تھا۔ دوسرے یہ گھوڑے بہت مرل اور چھوٹی قامت کے تھے اور میں وہ منہ زور گھوڑا پسند کرتا تھا جو سوار کے پیچھے کے بعد ایک آدھ منٹ اپنی اگلی ٹانگیں اٹھائے رکھتا اور اپنے سوار کی مہارت پر کھنے کے بعد ہی قابو آتا تھا۔ رات گیارہ بجے مشرگشت کے بعد ہم واپس لوٹ آئے۔ فیملیز کو دیکھ کر مجھے اپنی والدہ، بیوی اور بچے کی یاد آئی۔ جب میں پاکستان میں گھر سے آخری بار نکلنے لگا تھا تو میرا اس وقت اکھوتا لڑکا شجاع ایک سال سے بھی چھوٹا تھا۔ وہ اپنی دادی اور ماں کو لگا لگا جی اور اپنی توتلی زبان سے پکارتا تھا۔ لیکن اس نے مجھے کبھی بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ میں گھر والوں سے رخصت ہو کر جب صحن کے درمیان پہنچا تو اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے پانچ چمربہ مسلسل اہوکہ کر پکارا۔ اس وقت مجھ پر جو کیفیت گزری اس کا احساس صاحب اولاد ہی کر سکتے ہیں۔ اس کی پکار سن کر میرے قدم وہیں رک گئے لیکن میں نے واپس پلٹ کر نہ دیکھا کہ کہیں میرے قدم شفقت پداری میں لٹکھڑاند جائیں۔ میری آنکھوں میں ضبط کے باوجود آنسو بھر آئے اور میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے گھر سے باہر آ گیا۔ دہلی میں قیام کے دوران سینکڑوں مرتبہ گھر والوں کی یاد آئی لیکن اپنے فحش کی تکمیل کے احساس نے اس یاد کو پیچھے دھکیل دیا۔ اب جبکہ کوئی مشن میرے سامنے نہ تھا اس حزرہ ماحول میں، میں اپنے گھر اور گھر والوں کی یادوں سے نہ نکال سکا۔ وہ رات میں نے سوتے جاگتے انہی خیالوں میں بیٹھ کر گزار دی۔

آئندہ تیس بائیس دن میں نے زیادہ تر بیٹنگ میں ہی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہلکی ورزش کرنے خصوصاً ٹانگ پر بوجھ ڈالنے اور اسے پوری حرکت دینے میں گزارے۔ مجھے کسی وقت بھی یہاں سے Move کرنے کا حکم آسکتا تھا اس موقع کو میں نے غنیمت جانا اور خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر نارمل حالت میں لانے کی کوشش میں جت گیا۔ یہ اللہ پاک کا حکم تھا کہ اس بیٹنگ میں ایک مینے میں ہی، میں جسمانی اور ذہنی طور پر نارمل ہو گیا۔ ادویات اور انجشنوں کی وجہ سے مجھے وقتی طور پر دے اور معدے کی تکلیف سے بھی نجات مل جاتی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی مجھے فٹ قرار دے دیا تھا۔ بوقت ضرورت اس نے مجھے خود انجشن لگانا سکھا دیا اور دو ایسوں، انجشنوں اور ڈیپوزیبل سرنجوں کا اسٹاک بھی دے دیا تھا اب وہ ہفتے میں دو بار میرے چیک اپ کے لئے آتا۔ یہ بہنی میں برسات کا موسم تھا۔ تقریباً ہر روز اور بعض اوقات تو دن میں کئی مرتبہ بارش ہوتی تھی اب میرا زیادہ وقت کتابیں پڑھنے اور ریڈیو اور میوزک سننے میں صرف ہونے لگا۔ اس دوران تین مرتبہ حاجی مستان نے مجھے مالا بارمل والی ٹولی میں بلایا اور دوسرے دن وہ خود مجھے ملے جوہو کے بیٹنگ پر آیا۔ ایک بار میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دھندے کے کام کو بہنی گریج سے مائٹر کیا جاتا ہے اور اکثر و بیشتر Transaction رات کو ہوتی ہے۔ مجھ پر اتنا اعتماد ہو چکا تھا کہ اس نے مجھ سے اپنی انتہائی اٹھیا اور ذاتی زندگی کا وہاں میں بھی کہہ ڈالیں جو شاید اس کے انتہائی قابل اعتماد ساتھیوں کو بھی معلوم نہ ہو گی۔

یہ اکتوبر 74ء کا وسط تھا۔ جب میں نے حاجی مستان کو کہا کہ اب میں بالکل تندرست اور شہرگردی اور گھومنے کے لئے بالکل فٹ ہوں۔ میں نے سب سے پہلے نیوٹاگ پاڑے میں اپنے کورا اسٹوری والے مکان کو دیکھنا چاہا۔ حاجی مستان نے اپنے ایک آدی کو کہا کہ خواجہ اختر کو فون کر کے یہاں بلا لے۔ خواجہ صاحب دو گھنٹے میں آگئے۔ حاجی مستان نے اس سے میرا تعارف کروایا کہ یہ آصف علی لندن سے آئے ہیں۔ انہیں اپنے ایک واقف و نوجو پڑا سے ملنا ہے جو تمہارے علاقے میں قیام رہتا ہے۔ خواجہ اختر کو میں نے ایڈریس بتایا تو اس نے کہا کہ اچھی چلے۔ خواجہ اختر اپنی گاڑی میں اور میں چار محافظوں کے ساتھ اپنی گاڑی میں روانہ ہوا۔ نیوٹاگ پاڑے میں ٹوٹی پھوٹی سڑکوں سے گزر کر ہم ایک جگہ رکے۔ یہ ایک چار منزلہ بلڈنگ تھی جس کے دوسرے مالے (منزل) پر وہ فلیٹ تھا۔ میں اپنے چاروں محافظوں اور اختر کے ساتھ اس فلیٹ پر گیا۔ گھنٹی بجانے پر ایک گھاشن (بہنی کی زبان میں گھر بلوکام کرنے والی عورت) نے دروازہ کھولا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ”نوڈو چو پڑا“ تو کاروبار کے سلسلے میں ”اتر“ شمال کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ کئی مینے باہرہ کر یہاں چند روز کے لئے آتے ہیں۔ میرے مزید پوچھنے پر اس نے بتایا کہ نوڈو سیٹھ کا چائے کا کاروبار ہے اور ملکتے سے چائے کی پینیاں یہاں آتی ہیں، جنہیں سیٹھ کے حکم کے مطابق ہم مختلف جگہوں پر بیچ دیتے ہیں۔ اس وقت بھی پانچ پینیاں یہاں موجود ہیں۔ اس نے ہمیں فلیٹ کے اندر آئے کو کہا۔ چار کمروں کا یہ فلیٹ اچھے فنچر اور ضرورت کی ہر شے سے مزین تھا۔ ایک کمرے میں چائے کی پینیاں، لیبارٹری کا ترازو اور بہت سارے چائے کے کپ پڑے تھے (چائے کی بلڈنگ Blending کیلئے ان کی ضرورت پڑتی ہے) چائے کی بہت ساری پڑیاں بھی ایک ریک میں پڑی تھیں جن پر مختلف نمبر اور مختلف چائے کے نام Orange peccol اور Dargling flavour وغیرہ لکھے ہوئے تھے۔ گھاشن نے بتایا کہ نوڈو سیٹھ کے ایک حصہ دار آٹھ دن روز بعد یہاں آتے ہیں۔ وہی میری اور میرے پتی کی تنخواہ دیتے ہیں۔ میں نے گھاشن سے پوچھا کہ اس نے کیا نوڈو سیٹھ کو دیکھا ہوا ہے اور آخری مرتبہ وہ یہاں کب آئے تھے تو وہ پورے یقین سے بولی۔ ”واہ سیٹھ یہ بھی بجلی کٹی تم نے بھلا ہم اپنے سیٹھ کو نہ پہچانیں ہیں۔ وہ آپ ہی کی طرح لمبے اور گورے پنڈے ہیں۔ پچھلے مینے ہی تو وہ یہاں دس روزہ کر ’اتر‘ گئے ہیں۔ میں اس گھاشن کی باتوں سے حیران ہو رہا تھا۔ اسے خوب اچھی طرح سے ”پڑھایا“ گیا تھا۔ وہ پورے Confidence سے میرے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔ اس گھاشن کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نوڈو سیٹھ کا حصہ دار بھی یہاں آتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے ہی مجھے کا کوئی گروپ یہاں بھی مصروف عمل تھا اور اسے اس مکان پر نگاہ رکھنے کی ہدایت بھی کی گئی تھی۔

میں نے گھاشن کو کہا کہ میں لندن سے آیا ہوں اور تمہارے نوڈو سیٹھ کا دوست ہوں۔ انہیں میرا نمبر کاربنا۔ میرا نام آصف علی ہے۔ یہ کہہ کر میں نے گھاشن کو دو سو روپے پیسے دیئے اور ہم واپس چلے آئے۔ میرے مجھے نے میرے Cover کیلئے واقعی بہت پختہ انتظام کیا ہوا تھا۔ گاڑیوں میں بیٹھنے سے پہلے ایک 6 منزلہ بلڈنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خواجہ اختر نے بتایا کہ وہ ڈائمنڈ بلڈنگ ہے جس میں، میں رہتا ہوں۔ آپ یہاں تک آئے ہیں تو چائے پی کر جائیں۔ میں نے خواجہ اختر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ چائے پھر کبھی یہی اس سے رخصت لیکر ہم واپس جوہو چلے آئے۔

اگلے روز ہم حاجی مستان کے ترتیب دیئے ہوئے پروگرام کے مطابق میرن ڈرائیو پر پہلے اپنے وقت کی معروف ہیروئن اور گلوکارہ ثریا کے فلیٹ پر گئے۔ ثریا کو اسکول اور کالج کے دنوں میں فلموں میں دیکھا تھا۔ اس دور میں اس کی ہر طرف دھوم تھی۔ وہ ہالی ووڈ کے مشہور ہیرو گریگوری پیک سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ یہی خواہش دل میں لے کر وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھی۔ اس کی آخری فلم مرزا غالب تھی۔ ثریا ان دنوں سوشل ورکس کے کاموں میں مصروف تھی۔ اسی خدمت کے اعتراف میں بہنی کی ایک سڑک کا نام ثریا روڈ رکھا گیا۔ قدیم تہذیب کی دلدادہ ثریا کے ڈرائنگ روم میں مغربی تہذیب کے صفوں کے علاوہ ایک جانب فرشی شست کا بھی انتظام تھا۔ ثریا نے چائے اور لوازمات سے میری تواضع کی۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک وہ بہنی فلم انڈسٹری کی واحد شخصیت ہے جس کے پاس روزگار کا ڈیڑھ ہے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ثریا کے پاس گزارنے کے بعد میں واپس چلا آیا۔ نیچے گاڑی میں میرے چاروں محافظ میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اس کے بعد ہم میرن ڈرائیو سے ہی ایک اونچائی کو جاتی سڑک پر گھومے اور Hill Top ہاؤس کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک پرانی وضع کے چھوٹے سے بیٹنگ میں گئے۔ یہاں فلم ایکٹریس ٹی ایسے شوہر (غالباً رضاعی) کے ہمراہ رہتی تھی۔ اگر کے مشہور طوائف وحیدان ہائی (جس کے گانوں کے ریکارڈ کسی زمانے میں بہت مقبول تھے) ٹی کی والدہ تھیں۔ روایتی لکھنؤی انداز سے سلام کرتی ہوئی ٹی اور اس کا شوہر میرے منتظر تھے (یہ سب حاجی مستان کے اثر و رسوخ کے باعث تھا) وہاں بھی تقریباً ایک گھنٹہ ماضی کی فلموں کی باتیں کرتے گزرا۔ ٹی بھی فلمی دنیا سے بیٹھارے ہو چکی تھی اور خالصتاً گھر بیٹھورت لگتی تھی۔ ان دنوں میاں بیوی سے رخصت ہو کر ہم واپس چلے آئے کیونکہ آج کے دن کا بھی پروگرام طے تھا۔ (جاری ہے)

غازی

دہلی میں گرفتاری کے بعد سے میرا گھر والوں کے کوئی رابطہ نہ تھا۔ میری والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر تھی۔ میں نے بالآخر انہیں اپنے محکمے کے لندن کے دفتر کی معرفت خط لکھا۔ لندن سے یہ خط میرے محکمے کو جانا تھا اور محکمے کی طرف سے یہ خط میرے گھر جاتا اور جواب اسی ذریعے سے مجھ تک پہنچتا تھا۔ بیس اکیس روز کے بعد میری والدہ اور بیوی کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے خطوط مجھے لندن سے موصول ہوئے۔ انہیں غالباً بتا دیا گیا تھا کہ وہ پاکستان کے متعلق کچھ نہ لکھیں۔ خطوں میں بھی از لندن لکھا ہوا تھا۔ یہ خطوط ملنے سے مجھے دلی سکون ملا۔ میرے بیٹے شجاع کی تصویر بھی تھی۔ وہ اب تین سال اور چند ماہ کا تھا۔ خط و کتابت کا یہ سلسلہ میرے بمبئی میں قیام تک جاری رہا۔

آئندہ ہفتے کی دوپہر کھنڈالا جانے کا پروگرام تھا جہاں سے پیر کو واپسی ہونی تھی۔ کھنڈالا بمبئی سے تقریباً 80 کلومیٹر دور ایک پرفضا نہایت خوبصورت پہاڑی مقام ہے۔ بمبئی کے روسا کی وہاں کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں اور ہوٹل بھی ہیں کھنڈالا میں بھی حاجی مستان کا بہت خوبصورت سفید بنگلہ تھا۔ لیکن میں نے ہوٹل میں قیام کیا۔ دراصل میں مسلسل تنہائی اور محافظوں کے گھیرے سے اکتا چکا تھا۔ میں نے ہوٹل میں رہنے کا ارادہ کھنڈالا پہنچ کر کیا۔ میرے محافظ میرے اس فیصلے سے گھبرا گئے۔ میں نے حاجی مستان کو فون کیا تو اس نے کہا کہ کوئی ہرج نہیں۔ وہ فوری انتظام کر دیتا ہے۔ ہم ہوٹل کی ریسپشن میں بیٹھے تھے کہ ہوٹل کا منیجر آیا اور نہایت مودب ہو کر بولا۔ ہوٹل کا بہترین کمرہ آپ کیلئے حاضر ہے۔ میں ہوٹل میں انٹری کے لئے ریسپشن پر جانے لگا تو منیجر نے کہا۔ اس کی ضرورت نہیں۔ حاجی صاحب نے یہ کمرہ اپنے نام پر بک کروا لیا ہے۔ آپ کی خواہش کے مطابق ہر شے مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ حکم کریں۔ میں نے کہانی الحال تو آپ میرے چار آدمیوں کی رہائش کا انتظام کریں۔ منیجر نے جواب دیا کہ حاجی صاحب کے حکم کے مطابق آپ کے فلور پر ہی ان کے لئے بھی ایک بڑا کمرہ بک کر دیا گیا ہے۔ محافظوں کی طرف سے مطمئن ہو کر میں اپنے کمرہ میں چلا آیا۔ یہ کمرہ واقعی Royal Suite تھا۔ ایک بیڈ روم، ایک ڈرائنگ روم اور ایک ویٹر صرف اس کمرے کیلئے مخصوص تھا۔ ہفتے کی شام تھی۔ ہوٹل میں کبیرے پروگرام بھی تھا۔ وہ شام میں نے کبیرے پروگرام دیکھنے اور فلور ڈانس کرنے میں گزاری۔ مجھے پاکستان میں تربیلہ ڈیم کے کلب، انٹرکانٹی نینٹل ہوٹلز اور دہلی میں اکبر، اشوکا اور لودھی ہوٹل میں گزری ہوئی شامیں یاد آگئیں۔ میں رات بارہ بجے تک کبیرے ہال میں ہی رہا۔ تھک ہار کر واپس کمرے میں آیا تو ایک میز کی دراز کھولتے ہی قرآن مجید، بائبل اور گیتا اکٹھی رکھی ملیں۔ قرآن مجید دیکھتے ہی مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ DMI کی قید اور تشدد کا ایک لمحہ، موت مانگنے کی دعائیں اور فرار میں کامیابی سب ایک تیز فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔ یہ محض اور محض اللہ پاک کی مجھ پر کرم نوازی تھی کہ مجھے اتنے کٹھن حالات سے گزرنے کے بعد ایک نئی زندگی ملی۔ میرا جگہ جگہ سے زخمی جسم ٹھیک ہو چکا تھا اور میں دشمن کے کتوں کی پہنچ سے دور محفوظ ہاتھوں میں تھا اور اپنے رب کی اتنی مہربانیوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے میں نے یہ شام ناچ و درنگ کی محفل میں گزار دی تھی۔ میری زخمی ٹانگ جسے ڈاکٹر کے بقول اگر دو تین دن مزید بغیر علاج کے رکھا جاتا تو کاٹنی پڑتی، جب بالکل ٹھیک اور نارمل ہوگئی تو بجائے رکوع و سجود کے ڈانسنگ فلور پر ناچتا رہا۔ تف ہے مجھ پر اور میری زندگی پر۔ اپنی غفلت اور ندامت سے مجھ پر جیسے گھروں پانی پڑ گیا۔ ندامت کے آنسو بے اختیار میری آنکھوں سے بہنے لگے۔ (جاری ہے)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

غازی

یہ سنتے ہی دلپ میرے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ”سینٹھ میں تو آپ کو ایسے لطیفے سناؤں گا کہ آپ کھانا بھول جائیں گے۔ حصہ کوتاہ ہم تقریباً دو گھنٹے اس کے بیسیوں لطیفوں سے محفوظ ہوئے۔ اس کا سنایا ہوا صرف ایک لطیفہ پیش خدمت ہے۔ بھارتی افواج کے بہادری کے تمنغے اشوک چکر، بھارت چکر، ویر چکر اور مہاویر چکر وغیرہ ہیں۔ 65ء کی جنگ میں بھارتی افواج کی ”اعلیٰ کارکردگی“ دیکھتے ہوئے بھارتی حکومت نے ایک نیا تمنغہ اپنی بہادر افواج کے لئے بنوایا جس کا نام رنو چکر رکھا گیا۔

کھانے کے بعد حاجی مستان نے اسے ایک ہزار روپے انعام دیا اور اس کے آدمی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے میلوں دور باندھ کے قریب چھوڑ آئے۔

میں نے اکثر یہ محسوس کیا کہ حاجی مستان باتیں کرتے کرتے اچانک کہیں کھوجاتا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ اسے ایسی کون سی پریشانی ہے جس کے باعث اس کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ حاجی مستان سے ملے اگرچہ مجھے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے لیکن اس مختصر مدت میں ہم ایک دوسرے کے اتنے قریب آچکے تھے کہ ذاتی باتیں بھی بڑی بے تکلفی سے کرتے تھے۔ میرے پوچھنے پر پہلے تو وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر مجھے لہجے میں بولا۔ ”میرے اس سارے غیر قانونی کاروبار کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ میں غریب اور نادار مسلمانوں کی مالی مدد کروں اور کمزور مسلمانوں کو ہندوؤں کے ظلم و تشدد سے بچاؤں۔ میرے دھندے میں پولیس اس لئے مداخلت نہیں کرتی کہ جان کے خوف کے ساتھ ساتھ میں نوٹوں سے ان کا منہ بند کئے رکھتا ہوں۔ جتنے بھی غیر مسلم اسمگلر بمبئی میں ہیں۔ ان کے گروہ بہت چھوٹے چھوٹے ہیں اور وہ یا تو میرے لئے کام کرتے ہیں یا مجھے باقاعدہ حصہ دیتے ہیں۔ صرف ایک مسلمان اسمگلر یوسف پٹیل ہے۔ جو میرے مقابلے میں ڈٹا ہوا ہے۔ چونکہ اس میں سامنے آکر مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں اس لئے وہ آج کل زیر زمین رہ کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہے۔ وہ بھی مسلمانوں کا بہت حامی ہے لیکن اپنی ایک الگ سلطنت بنانا چاہتا ہے۔ الگ سلطنت وہ بنا نہیں سکا، مارنا میں اسے چاہتا نہیں کیونکہ اس کا اور میرا مقصد ایک ہی ہے۔ اس کے بارے میں میرے اس رویے کی وجہ سے میرے گروہ میں یہ سوچ پھیلی جا رہی ہے کہ میں اس کا مقابلہ کرنے سے کتراتا ہوں۔ ہمارے دھندے کا اولین اصول یہ ہے کہ اگر لیڈر کی صلاحیت اس کی پہنچ اور اس کی دلیری کے متعلق رائی برابر بھی شک پیدا ہو جائے تو گروہ کے کارکن یہ خطرناک اور جان لیوا کام کرنے سے کترانے لگتے ہیں۔ جب یوسف پٹیل کا ذکر آ ہی گیا تو میں نے اس سے چھپانا مناسب نہ سمجھا اور اسے بتا دیا کہ یوسف پٹیل کے متعلق مجھے بھی میرے محکمے والوں نے کہا تھا کہ بوقت ضرورت اس سے بھی رابطہ کروں اور تمہارے ملنے سے پہلے میں یوسف پٹیل کو تلاش بھی کرتا رہا ہوں۔ میں نے حاجی مستان سے کہا کہ جب تم دونوں کے مقاصد ایک جیسے ہی ہیں تو انشاء اللہ صلح صفائی کی صورت بھی نکل آئے گی چونکہ تم دونوں کے گروہ کے افراد کے اپنے ذاتی مقاصد بھی ہوتے ہیں اس لئے عین ممکن ہے کہ وہ تم دونوں کے درمیان خلیج کو پاٹنے کے بجائے اسے مزید وسیع کرنے کے درپے ہوں۔ اگر تم اجازت دو تو میں یوسف پٹیل تک پہنچ کر اسے سمجھانے کی کوشش کروں۔ میرا چونکہ اس میں کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ تمہاری طرح یوسف پٹیل بھی میری اصلیت جان کر مجھ پر اعتماد کرے گا اور بہتری کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔ حاجی مستان کچھ دیر سوچتا رہا اور بولا ”مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے اگر آپ کے ہاتھوں یہ کام ہو جائے تو بمبئی کی پوری مسلم آبادی اپنے ان دیکھے محسن کی ممنون ہوگی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو تو نہیں بتایا کہ یوسف پٹیل آج کل کہاں ہے ورنہ ساتھیوں اور کارکنوں کا پھر فوری مطالبہ ہوگا کہ یوسف اور اس کے گروہ کا قلع قمع کیا جائے۔ آپ کو بتاتا ہوں کہ یوسف پٹیل آج کل محبوب اسٹوڈیوز کے عقب میں رہائشی مکانوں میں جینت فلم ایکٹر کے مکان میں رہتا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لئے آپ کو اکیلے ٹیکسی میں جانا ہوگا۔ میرے آدمی ہماری دو گاڑیوں میں دور سے آپ کی حفاظت کریں گے۔ میں نے اس کی ہامی بھری۔ بھارت میں خطروں سے کھیلنے کھیلنے اب میں اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں زندگی کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ہم نے اگلے دن صبح دس بجے کا پروگرام سیٹ کیا۔ مجھے جو ہو سے نکلتے ہی ٹیکسی لے لینی تھی اور حاجی مستان کے 10 آدمیوں نے اس کی دو گاڑیوں میں مجھ سے فاصلہ رکھ کر میری حفاظت کرنی تھی۔

اگلے روز ٹھیک دس بجے میں جو ہو والے بنگلے سے نکلا۔ گاڑی کو میں نے ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب ہی چھوڑ کر ٹیکسی لی اور اسے داور محبوب اسٹوڈیوز چلنے کا کہا۔ کچھ دور جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو دو گاڑیاں ہمارے تعاقب میں آرہی تھیں۔ مجھے محبوب اسٹوڈیوز کے عقب میں جینت کے فلیٹ پر جانا تھا۔ میں نے ٹیکسی اسٹوڈیوز کے گیٹ پر رکوائی۔ گیٹ پر فلم آرٹسٹوں کو دیکھنے اور فلم میں ہیرو، ہیروئن بننے کے شوقین جوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ اسٹوڈیوز کے چوکیدار یا کسی کارکن سے جینت کے مکان کی صحیح لوکیشن پتہ کروں۔ لیکن یہ ہیرو، ہیروئن بننے کے شوقین لڑکے، لڑکیاں تو بمبئی فلم انڈسٹری کی انسائیکلو پیڈیا نکلے۔ ان میں سے بہت سے جینت کے فلیٹ کو جانتے تھے۔ مجھے وہ کوئی فلم پروڈیوسر سمجھے۔ ایک لڑکے نے مجھے فلیٹ تک پہنچانے کی پیشکش کی۔ میں نے اسے ٹیکسی میں بٹھالیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ٹیکسی جینت کے مکان پر جا پہنچی۔ میں نے ڈرائیور کو اس لڑکے کو اسٹوڈیوز چھوڑنے اور یہاں واپس آکر انتظار کرنے کا کہا۔ ٹیکسی واپسی گھومی تو میں سڑک پر ہی کھڑا رہا تاکہ محافظ مجھ دیکھ لیں۔ ایک گاڑی آگے بڑھی اور مجھ سے دو سو قدم دور جا کر رک گئی۔ میں دونوں گاڑیوں کے درمیان تھا۔ محافظوں کو قطعاً علم نہیں تھا کہ میں یہاں کس سے ملنے آیا ہوں۔ انہیں صرف میری حفاظت کا کام سونپا گیا تھا۔ میں اس بلڈنگ میں داخل ہوا۔ لڑکے کے مطابق جینت کا فلیٹ دوسری منزل پر دائیں جانب تیسرا تھا (بعد میں معلوم ہوا کہ دائیں جانب کے پانچوں فلیٹ جینت ہی کے تھے۔ جینت کوئی بہت کامیاب اور پیسے والا اداکار نہ تھا۔ یہ اعلیٰ فلیٹ یوسف پٹیل نے جینت کے نام پر خریدے ہوئے تھے)

دوسری منزل پر دائیں طرف مڑتے ہی دو مسلح پہرے داروں نے میرا ”سواگت“ کیا۔ مجھے علم تھا کہ روپوش یوسف پٹیل سے ملنا آسان نہ ہوگا۔ میں اپنے پٹیل کے علاوہ لفافے میں بند اپنے محکمے کے نام کے Initials (نام کے پہلے حروف) اور کوڈ نمبر لکھ لایا تھا۔ اس سے پہلے کہ پہرے دار مجھ سے کوئی سوال کرتے میں نے لفافہ ایک پہرے دار کو تھمایا اور کہا کہ یہ لفافہ فوری طور پر یوسف پٹیل کو پہنچا دے۔ پہرے دار پہلے تو ہکا بکا مجھے دیکھتے رہے۔ پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک پہرے دار لفافہ لے کر آگے والے فلیٹوں کی طرف چلا گیا اور میں نے اس کے اسٹول پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیا۔ یوسف پٹیل کا حلیہ مجھے حاجی مستان نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک آدمی پہرے دار کے ہمراہ آیا اور مجھے کہا ”فرمائیے“ میں نے کہا ”مجھے صرف یوسف پٹیل سے ملنا ہے اور تم وہ نہیں ہو۔ اتنا سمجھ لو کہ اگر مجھ فوری طور پر یوسف سے نہ ملایا گیا تو اس بلڈنگ کے دونوں اطراف کھڑے حاجی مستان کے آدمی یہاں حملہ کر دیں گے۔ میرا یہ زبانی حملہ اتنا اچانک تھا کہ وہ تینوں بوکھلا گئے۔ میں اسی موقع کے انتظار میں تھا۔ میں نے فوری اپنا پٹیل نکال کر آنے والے شخص کی کینٹی پر لگا دیا اور کہا کہ دونوں پہرے داروں کو کہو کہ اپنے ہتھیار فوری نیچے رکھ دیں اور ہمارے آگے آگے چلیں۔ خلاف ورزی کی صورت میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔ اس آدمی نے بے بسی سے پہرے داروں کی طرف دیکھا۔ پہرے داروں نے اپنی اسٹین گنیں فرش پر رکھ دیں اور ہمارے آگے چل دیئے۔ اسی حالت میں چلتے ہوئے ہم ایک فلیٹ میں داخل ہوئے۔ (جاری ہے)

غازی

شروع میں ہی ڈرائنگ روم تھا۔ ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو وہ خالی تھا۔ اس آدمی نے بتایا کہ یوسف سیٹھ کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ اسے بلا کر لاتا ہے۔ میں اس کی چالاکی سمجھ چکا تھا۔ اسے یا کسی پہرے دار کو جانے کی اجازت دینے کا مطلب تھا کہ چاروں طرف سے مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو جائے۔ میں نے اس کی کنپٹی پر پستل کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ہم سب اسی طرح یوسف کے پاس جائیں گے۔ بچاؤ کی کوئی دوسری صورت نہ دیکھتے ہوئے وہ آدمی ہمیں اس ڈرائنگ روم سے واپس گیلری میں لے آیا اور اس فلیٹ سے ملحقہ اگلے فلیٹ میں لے گیا اور اس فلیٹ کے دو کمروں سے گزرنے کے بعد تیسرے کمرے میں ہم اسی پوزیشن میں داخل ہوئے۔ اس وسیع کمرے میں کئی صوفہ سیٹ اعلیٰ ایرانی قالین اور دیواروں پر پینٹنگز آویزاں تھیں۔ ایک صوفہ سیٹ پر ایک درمیانے قد و قامت کا کافی حد تک گنجا شخص بیٹھا تھا۔ مستان کے بتائے ہوئے حلے سے میں نے اسے فوری پہچان لیا کہ یہی یوسف ٹیل ہے۔

پہرے داروں کے اٹھے ہوئے ہاتھ اور اپنے آدمی کی کنپٹی پر میرا پستل دیکھ کر یوسف بوکھلا کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے لئے یہ صورت حال قطعی غیر متوقع تھی۔ میں نے کہا ”یوسف سیٹھ! آپ بیٹھ جائیں اور میری بات غور سے سنیں۔ میں نے جو کچھ لکھ کر بھیجا تھا کیا وہ آپ کے پاس ہے؟“ یوسف نے خاموشی سے لفافہ اور میرا لکھا ہوا پرچمیرے سامنے کر دیئے۔ ”اس پرچے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سو فیصد درست ہے۔ مجھے آپ تک پہنچنے کے لئے یہ ناگوار ذریعہ صرف اس لئے اختیار کرنا پڑا کہ آپ کا یہ آدمی مجھ سے وہ سوالات پوچھنے لگا تھا جن کا جواب میں صرف آپ کو دے سکتا ہوں۔“ میں یہ کہہ کر یوسف ٹیل کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں سے یقینی اور بے یقینی دونوں کیفیتیں صاف جھلک رہی تھیں۔ میں نے اپنا پستل یوسف ٹیل کے سامنے میز پر رکھ دیا اور کہا ”اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ علیحدگی میں میری بات سنیں یا میرے پستل سے ہی مجھے گولی مار دیں۔“ یہ کہہ کر میں یوسف کے برابر پڑے صوفے پر بیٹھ گیا اور اطمینان سے سگریٹ جلا کر پینے لگا۔ یہ میرا نفسیاتی حربہ تھا جس میں، میں کامیاب رہا۔ چند لمحے گولمو کی حالت میں رہنے کے بعد یوسف ٹیل نے اپنے آدمی اور پہرے داروں کو باہر جانے کا کہا۔ اس آدمی نے یوسف ٹیل کو بتایا کہ میرے کہنے کے مطابق مستان کے مسلح آدمی سڑک پر دونوں طرف موجود ہیں۔ میں نے اس کی بات کائی اور کہا کہ یہ درست ہے لیکن وہ صرف میری حفاظت کیلئے آئے ہیں۔ حاجی مستان کو آپ کے اس ٹھکانے کا بخوبی علم ہے۔ اسی نے مجھے ان فلیٹوں کا بتلایا ہے لیکن اس کے آدمی اس سے بے خبر ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یوسف ٹیل اس کے نمائندے اور پہرے داروں کی ایسی حالت تھی کہ کمانڈ اب مجھے ہاتھ میں لینی چاہئے۔ میں نے اس آدمی اور پہرے داروں کو کہا ”کیا تم نے سنا نہیں کہ یوسف سیٹھ نے تمہیں کمرے سے باہر جانے کا کہا ہے یا درکھو کہ تم نہ تو حاجی مستان کے آدمیوں کے سامنے جاؤ گے اور نہ ہی ایسی حرکت کرو گے کہ انہیں اپنے تحفظ میں کچھ کرنا پڑے۔ ان کو بالکل بھول جاؤ اور مجھے یوسف سیٹھ سے آرام سے بات کرنے دو۔ ہمارے کافی اور کھانے کے لئے کچھ بھجوادو۔ بالکل روبوٹس کی طرح انہوں نے میرے کہنے پر عمل کیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہمارے لئے کافی اور لوازمات آگئے۔“

میں نے یوسف ٹیل کو اپنے محکمے، دہلی میں اپنی گرفتاری اور فرار کے متعلق بتایا اور کہا کہ اپنے محکمہ کی ہدایت کے مطابق میں بمبئی میں پہلے اسے ہی ایرانی امام باڑے کے علاقے میں تلاش کرتا رہا ہوں تلاش میں ناکامی کے بعد میں مجبوراً حاجی مستان کے پاس چلا گیا۔ میں اپنی صداقت کے ثبوت کے طور پر دو اخبار بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا جن میں میری تصویر اور فرار کے متعلق مہیا تھا۔ یوسف ٹیل کو جب میری باتوں کا یقین ہو گیا تو اس نے کہا کہ یہ درست ہے کہ تمہارے محکمے سے میرا تعلق ہے (جاری ہے)

غازی

اور میری لانچوں کے ڈرائیور نے تمہارے محلے کے کراچی سے بھیجے ہوئے وائرلیس پیغام بھی موصول کئے ہیں جن میں تمہارے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ میں آج کل مجبوراً اپنے ٹھکانے پر نہیں جا رہا بلکہ یہیں سے اپنے کام کی نگرانی کر رہا ہوں۔ اب جبکہ تم مجھ تک پہنچ گئے ہو تو مجھے بتاؤ کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ میں اپنے تمام وسائل سے تمہاری ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ تمہاری روپوشی کی وجہ سے صرف حاجی مستان سے تمہارے اختلافات ہیں۔ حالانکہ حاجی مستان نے تمہارے اس ٹھکانے کا علم ہونے کے باوجود نہ صرف تمہارے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ اپنے آدمیوں کو بھی اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ اپنے دھندوں میں صرف "میں" کی بے معنی، بے وقعت اور لا حاصل سوچ نے نہ صرف تم دونوں کے کاروبار کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ تمہارے ہی دھندوں میں مصروف ان لوگوں کو بھی سرائٹھانے کا موقعہ دیا ہے جو پہلے تم دونوں کے سامنے ایسا سوچنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ تمہارے اختلافات کا سب سے زیادہ نقصان ان مسلمانوں کو ہو رہا ہے جو تم دونوں کی وجہ سے بمبئی میں خود کو محفوظ سمجھتے تھے۔ تم دونوں کی وہ توانائی اور طاقت جس سے یہاں کے غیر مسلم مسلمانوں کی خلاف قدم اٹھانے سے پہلے سو بار سوچتے تھے۔ اب تمہارے آپس کے اختلافات اور جھگڑوں میں صرف ہو رہی ہے۔ اسی موضوع پر حاجی مستان سے میری سیر حاصل گفتگو ہو چکی ہے اور اسی کے ایما پر میں تمہارے پاس آیا ہوں۔ خدارا نمبروں اور نمب ٹو کے جھگڑے ختم کرو۔ تم دونوں نمبروں ہو۔ دو نمبروں کیجا ہو جائیں تو گیارہ بن جاتے ہیں۔ ان سطحی اختلافات کو چھوڑو اور اپنے اصل اور عظیم مقصد کو پورا کرو۔ کئی گھنٹوں پر محیط لمبی گفتگو کے بعد میں نے یوسف ٹیل کو بالآخر اس بات پر رضامند کر لیا کہ کل شام اپنے کارندوں سے اپنی حفاظت کی پوری تسلی کروا کرو ساڑھے چار بجے حاجی علی کے مزار پر پہنچ جائیں۔ حاجی مستان کو بھی ٹھیک ساڑھے چار بجے وہاں لانے کی ذمہ داری میں نے اٹھائی۔ میرے منصوبے کے مطابق پہرے داروں کے بغیر میرے ہمراہ دونوں نے رات وہیں گزارنی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دونوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی میری یہ کوشش بار آور ثابت ہوگی۔

یوسف ٹیل سے پوری تسلی کے بعد میں 5 بجے رخصت ہوا اور سیدھا حاجی مستان کے پاس پہنچا اور اسے سارے دن کی کارروائی بتائی اور کہا کہ اس کی اجازت کے بغیر ہی میں نے دونوں کی ملاقات کا یہ انتظام کیا ہے۔ حاجی مستان نے بھی حامی بھری۔ دوسرے دن شام چار بجے ہم روانہ ہوئے۔ حاجی علی کے مزار پر پہنچے تو یوسف ٹیل بھی جو سڑک پر پہلے سے ہی اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اپنی موٹروں کے کارواں میں موجود تھا۔ بالکل اکیلا درگاہ پر آ گیا۔ مجھے وہیں معلوم ہوا کہ ان دونوں نے الگ بیٹھنے کے لئے درگاہ کے ایک جانب خواتین اور چلہ کاٹنے والوں کے بنے دو کمرے رات کے لئے بک کئے ہیں اور قالین، گاؤں کیے اور کھانے پینے کا وغیر سامان اپنے اپنے طور پر پہلے ہی بچھو دیا ہے۔

رات 9 بجے درگاہ سے اٹھ کر ہم تینوں ایک کمرے میں گئے۔ مجاوروں نے کھانا گرم کر کے تیار رکھا تھا۔ کھانے کے بعد ہم دوسرے کمرے میں گئے۔ دونوں میں گفتگو کا آغاز پہلے میری معرفت ہوا پھر تھوڑی دیر بعد دونوں ڈائریکٹ باتیں کرنے لگے۔ میرے سمجھنے کی خاطر دونوں نے ساری گفتگو کجراتی کے بجائے اردو میں کی۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کی زیادتیاں بیان کیں۔ پھر شکوے شکایت شروع ہوئے۔ اس کے بعد دونوں کے ساتھیوں کی طرف سے کی گئی غلط باتیں اور ان باتوں کی صفائی اور اپنی لاعلمی بتائی گئی۔ پھر دھندے کی باتیں شروع ہوئیں۔ مسلمانوں کے تحفظ کے لئے اپنی اپنی خدمات کا ذکر ہوا۔ میں اس دوران صرف کبھی کبھی داخل اندازی کرتا رہا ورنہ دونوں کو اپنے دلوں کا غبار نکالنے کا پورا موقعہ دیا۔ غرضیکہ صبح ہونے تک دونوں میں باعزت سمجھوتہ اپنے دھندوں کے لئے علاقوں کی تقسیم پر ہوا۔ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل اندازی نہ کرنے کے عہدو بیان ہوئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دی گئی معلومات کی روشنی میں اپنے اپنے گروہوں کے ان لوگوں کو جو یا تو خدارتھابت ہوئے تھے اور یا دونوں کے اختلافات کو ہوا دیتے تھے جانی طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ صبح جب ہم درگاہ سے باہر نکلے تو ہماری پوزیشن یہ تھی کہ رات بھر کے رت جگے کی وجہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ درمیان میں، میں تھا۔ میرے ایک طرف حاجی مستان اور دوسری طرف یوسف تھا۔ ہم سڑک کے قریب پہنچے تو دونوں کے درجنوں محافظ اور کارندے پھٹی آنکھوں سے ان دونوں کو اس طرح باہم شیر و شکر باتیں کرتے اور ہنستے دیکھ رہے تھے۔ سڑک پر اپنے ساتھیوں اور محافظوں کو دکھانے کے لئے دونوں بغل گیر ہوئے۔ یوسف ٹیل نے اگلی رات کے کھانے پر مجھے انہی فلیٹوں میں دعوت دی۔ باری باری، دونوں نے مجھ سے معاف کیا اور اپنی گاڑیوں کے کارواں میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو روانہ ہو گئے۔ میری گاڑی بھی میرے چاروں محافظوں کے ساتھ ایک جانب کھڑی تھی۔ ہم جو ہو کے بنگلے کی طرف چل دیئے۔ میں قلبی اطمینان سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جو مجھے بمبئی کے ان دو عظیم مسلمانوں کے سر پرستوں کو یکجا کرنے سے حاصل ہوا تھا۔

حاجی مستان اور یوسف ٹیل کی صلح صفائی سے دونوں کو کیا فائدہ پہنچا اور بمبئی کے مسلمانوں کا کتنا بھلا ہوا، اس کے بارے میں تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ مجھے جو فائدہ ہوا وہ یہ تھا کہ اب بجائے چار محافظوں کے میرے لئے چھ محافظ اور دو گاڑیاں مخصوص کر دی گئی تھیں۔ دوسری گاڑی اور دو نئے محافظ یوسف ٹیل کی عنایت تھے۔ ان محافظوں کے جلو میں اب میں بمبئی کے ان علاقوں میں بھی بلا کھٹکے جا سکتا تھا جو ہندوؤں کے گڑھ تھے۔

بمبئی میں بہت بڑا اور (Cosmopolitan) یعنی بین الاقوامی شہر ہے۔ لیکن ایک سیاح کے دیکھنے کیلئے بہت کم جگہیں ہیں۔ شہر بذات خود لوہے اور سیمنٹ کا جنگل ہے۔ بحیثیت پاکستانی میرے لئے بمبئی کی فلم نگری اور اس کے باسی سب سے زیادہ پرکشش تھے۔ مستان اور ٹیل نے اسٹوڈیوز اور میرے پسندیدہ فنکاروں سے میرے لئے وقت لے لئے تھے۔ ٹریا اور نی سے میں مل چکا تھا۔ اب دیپ کمار، نرگس اور سنیل دت سے سب سے پہلے ملنے کا پروگرام طے تھا۔ دیپ کمار کی رہائش پہاڑی کے دو ہموار تختوں پر دو حصوں پر مشتمل ایک بہت بڑے بنگلے (21، پالی ہل) میں تھی۔ سہ پہر چار بجے ملاقات کا وقت تھا۔ کوٹھی کے بڑے دروازے پر موجود دربان نے اتر کام پر میری آمد کی اطلاع دی۔ چند منٹوں میں ہی دیپ کمار کا چھوٹا بھائی مجھے لینے کیلئے آ گیا۔ دونوں گاڑیاں بھی گیٹ کے اندر بنگلے کے اندر جانے والی گزرگاہ میں پارک کی گئیں اور میں دیپ کے بھائی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ ڈرائنگ روم کی سادگی اور نفاست اس عظیم فنکار کے ذوق کی مظہر تھی۔ مجھے وہاں چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ اوپر کی منزل سے ڈرائنگ روم میں اترتی سیڑھیوں پر دیپ کمار نظر آئے۔ وہ سفید پینٹ قمیص اور پاؤں میں چیل پہنے ہوئے تھے۔ مجھے ایسی بے تکلفی سے ملے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ بہت ہی سادہ طبیعت اور دنیا کے تمام علوم میں گہرائی تک دسترس رکھنے والا یہ فنکار میرے ساتھ چند ہی منٹوں میں بے تکلف ہو گیا۔ کافی کے ساتھ ڈھیر سارے لوازمات تھے۔ میرے بتانے پر کہ میں برٹش نیشنل ہوں، دیپ کمار نے مسکراتے ہوئے کہا کہ میں تو سائنس کے عجوبات کا قائل ہوں۔ آپ خود ہی دیکھئے کہ آپ برٹش نیشنل ہیں لیکن آپ نے برطانیہ کی روایتی تہذیب نہیں اپنائی۔ آپ کی جگہ کوئی انگریز ہوتا تو تھری پیس ایونگ سوٹ میں ملبوس ہوتا۔ آپ کو دیکھ کر محسوس ہی نہیں ہوتا کہ آپ برٹش ہیں یا آپ نے کبھی برطانیہ دیکھا بھی ہے۔

اس کی ذمہ داری بات اور مسکراہٹ سے ظاہر تھا کہ حاجی مستان نے شاید اسے میری اصلیت بتادی ہے۔ میں اسے سمجھنے کی کوشش میں ہی تھا کہ دیپ کمار نے

مجھ پر دوسرا حملہ کیا "میرے سارے دوست مجھے یوسف لالہ کہتے ہیں (جاری ہے)"

غازی

آپ بھی مجھے اس نام سے مخاطب کر سکتے ہیں۔ پاکستانی مہمانوں کیلئے تو میرے گھر اور دل کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ یہ کہہ کر یوسف لالہ ہنسنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ عظیم فنکار اندرونی طور پر ایک ایسا بچہ ہے جو کسی کی چوری پکڑ کر اور بے ضرر طور پر اسے ظاہر کر کے خوش ہوتا ہے۔ ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ مختلف موضوعات پر چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے۔ یوسف لالہ نے مجھے کئی لطیفے بھی سنائے۔ ہر لطیفہ سنانے کے بعد وہ داد طلب نہگا ہوں سے مجھے دیکھتا۔ اب میری باری تھی۔ ہر لطیفہ سننے کے بعد کہتا "سنا ہوا ہے" میرے دو تین بار سنا ہوا کہنے پر یوسف لالہ کو احساس ہوا کہ جان بوجھ کر ایسا کہہ رہا ہوں۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بولا "نورا ہی بدلہ لے رہے ہو"۔ میں نے کہا "یوسف لالہ مزاتو اسی میں ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ جواب ملے"۔ اس تمام ہنسی مذاق اور گفتگو کے دوران میں نے اس عظیم فنکار کی آنکھوں میں چھپا ہوا درد محسوس کیا۔ یہ درد اس کے بے اولاد ہونے کا تھا۔ اس کی بے شمار دولت اور بے مثال شہرت کا کوئی حقیقی وارث نہ تھا۔ بھائی بہنوں کی ایک فوج تھی جسے وہ فراخ دلی سے پال رہا تھا وہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ دیپ کی کوئی اولاد جو انہیں اپنے متوقع ورثے سے محروم کر دے۔ چلتے ہوئے میں نے کہا "یوسف لالہ میں دل کی گہرائیوں سے دعا کروں گا کہ اللہ پاک آپ کو اولاد کی نعمت سے نوازے"۔ دیپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور زور سے دباتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "یہ دعائے مانگنا۔ اولاد نہ ہونے کا دکھ تو میں برداشت کر رہا ہوں لیکن اولاد کے قتل ہو جانے کا دکھ برداشت نہ کر سکوں گا"۔ اس نے ایک فقرے میں اپنے انتہائی قریبی خونی رشتہ داروں کے عزائم اور اپنی مجبوری اور بے بسی کا پورا اظہار کر دیا تھا۔

دیپ سے رخصت ہو کر ہم نمبر 22 پالی ہل پہنچے۔ یہ کمال امر وہی کی رہائش گاہ تھی۔ کمال نے محل اور پاکیزہ جیسی فلمیں بنائی ہیں۔ وہ گھر پر موجود نہ تھا۔ وہاں سے ہم راسی پالی ہل پر بنے نرگس اور سنیل دت کے بنگلے پر گئے۔ ان سے ملنے کے وقت میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ لیکن دونوں نے بڑی اپنائیت اور گرم جوشی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ یہ دونوں فنکار شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ نرگس نے مدرائڈیا کے بعد فلمی دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا اور مکمل گھریلو زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس نے کہا کہ مدرائڈیا میں اس کے لازوال کردار سے اس کا جو Image بن گیا تھا اسے وہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لئے اس نے درجنوں ملکی اور غیر ملکی پیشکشیں ٹھکرا دیں۔ پھر ہنستے ہوئے سنیل دت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ دت مدرائڈیا میں تو میرا نالائق بیٹا تھا۔ لیکن اب بہت ہی فرماں بردار شوہر ہے۔ انہیں میرے متعلق یہی علم تھا کہ میں برطانوی نیشنل اور حاجی مستان کا دوست ہوں۔ اگر چہ رات کا کھانا پروگرام میں شامل نہ تھا لیکن انہوں نے بزور مجھے کھانے میں شریک کیا۔ کوشی کے شروع میں ہی بائیں جانب کمروں کی ایک لائن میں سنیل دت کے فلمی دفاتر وغیرہ تھے۔ میرے محافظوں کو بھی ان کمروں میں نہایت عمدہ کھانا بھجوا دیا گیا۔ کھانے کی ایک ہی میز پر سنیل دت کیلئے ویجی ٹیرین (Vegetarian) اور نرگس اور میرے لئے نان ویجی ٹیرین (Non-vegetarian) کھانے چنے ہوئے تھے۔ بقول ان کے دونوں میں کبھی بھی مذہبی تکرار نہیں ہوتی تھی۔ اولاد کے متعلق بھی انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مسلمان یا ہندو جس مذہب کو بھی اپنانا چاہیں انہیں کھلی اجازت ہوگی۔ پاکستان میں نرگس کے انتقال کے وقت میں نے پڑھا کہ اسے اسلامی طریقے سے دفنایا گیا تھا۔

چند روز بعد میرا Elephantael (ایلیفینڈا) جزیرے پر جانے کا پروگرام تھا۔ یہ جزیرہ بمبئی سے تقریباً 10 میل کے فاصلے پر کھلے سمندر میں واقع ہے۔ یہاں جانے کے لئے لانچیں گیٹ وے آف انڈیا سے چلتی ہیں۔ ساحل سمندر پر بنی انگریزی دور حکومت کی یہ یادگار برصغیر پر ان کی حکمرانی اور بزور شمشیر حکومت کرنے کی داستان بیان کرتی ہے۔ گیٹ وے آف انڈیا کو دیکھ کر مجھے 1950ء کے عشرے کی یاد آگئی۔ میں 1951ء میں گارڈن کالج راولپنڈی میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔ (جاری ہے)

راولپنڈی صدر میں مال روڈ اور G.H.O سے آنے والی سڑک کے چوراہے پر فلیش میز ہوٹل کے بالکل قریب لارڈ کرزن کا مجسمہ نصب تھا۔ برصغیر میں برطانوی حکومت کا یہ نمائندہ برصغیر کے محکوم عوام پر اپنے ظلم و ستم اور فرعونیت کے لئے مشہور تھا۔ اس مجسمے میں اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قلم تھا۔ شروع میں مجسمے پر یہ الفاظ کندہ تھے We will rule you by sword and pen (ہم تم پر تلوار اور قلم کے ساتھ حکومت کریں گے) اس مجسمے پر یہ الفاظ دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک (تقریباً سو سال) برصغیر کے عوام کو یہ باور کراتے رہے کہ تم ہمارے غلام ہو اور ہم اپنی طاقت کے بل بوتے پر تم پر حکومت کریں گے۔ دوسری جنگ عظیم (1939-1945) کے آغاز میں برطانیہ کو ہندوستانی سپاہیوں کی اشد ضرورت پڑی۔ برطانوی سامراج میں انڈین آرمی کا اسی فیصد ایک، کیسبل پور، میانوالی، سرگودھا اور جہلم کے اضلاع سے لیا گیا تھا۔ مسلسل احتجاج اور مصلحت کی بنا پر انگریزوں نے مجسمہ تو نہ ہٹایا لیکن کندہ الفاظ میں Rule کی جگہ Serve لکھ دیا۔ اب مطلب یوں ہو گیا "ہم تلوار اور قلم سے تمہاری خدمت کریں گے"۔ انگریزوں نے پتھر بدلنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ Rule کے الفاظ میں سینٹ بھر کر اس جگہ Serve لکھ دیا گیا تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ آزادی ملنے کے بعد بھی دس سال سے زیادہ عرصہ یہ مجسمہ وہیں ایستادہ اپنے سابقہ محکموں کا منہ چڑاتا رہا اور کسی بھی صاحب اختیار نے اسے ہٹانے کی طرف توجہ نہ دی۔ بالکل یہی صورت حال مال گیٹ وے آف انڈیا کی تھی۔

یوسف ٹیل کی بھیجی ہوئی لالچ میں ہم ایلینفا کی طرف روانہ ہوئے۔ ہماری لالچ انڈین نیوی کی برتھوں کے بالکل قریب سے گزری۔ یوسف ٹیل نے ایک دور بین بھی میرے لئے بھجوا دی تھی۔ میں نے ایک دوسرے کے پیچھے بالکل جڑے ہوئے انڈین نیوی کے دو فریگیٹ جہازوں کے پیچھے اس وقت بھارت کے واحد طیارہ بردار جہاز 'وکرنت' دیکھا۔ جہاز پر اس وقت پانچ یا چھ Harrier ہوائی جہاز موجود تھے۔ باقی جہاز تھینا چلی ڈیک پر ہوں گے۔ اس طیارہ بردار جہاز کا مکمل نقشہ میرے ذہن میں نقش تھا۔ دوران تربیت اس جہاز کے ایک ایک حصے کے متعلق ہمیں تفصیلاً بتایا گیا تھا۔ میں اس جہاز کے اسلحہ خانے، پیٹرول ٹینکس چلی ڈیک اور بیٹنگ کی سو فیصد نشاندہی کر سکتا تھا۔ اگر میرے پاس وسائل یا کم از کم ایک یا دو جانناز غوطہ خور، آکسیجن ٹینکس اور مٹھناطیسی بارودی سرنگیں ہوتیں تو اس جہاز اور اس کے ساتھ کھڑے فریگیٹ جہازوں کو تباہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ میں نے بعد میں حاجی متان اور یوسف ٹیل سے اس بارے میں گفتگو بھی کی۔ وہ سب سامان مہیا کر سکتے تھے لیکن جانناز غوطہ خور ملنے ناممکن تھے ان کے اپنے کارندوں میں ایسے ماہر تیراک اور غوطہ خور تھے لیکن ان کی پیرا کی اور غوطہ خوری صرف دولت اور سونے کے حصول کے لئے ہی مخصوص تھی۔ ملک و ملت کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ بہر حال میں نے ہمت نہیں ہاری اور اس منصوبے کو حتمی شکل دینے لگا۔ حاجی متان نے بتایا کہ گوا میں سابقہ پرتگیز حکومت کے حامی اور بھارتی حکومت کے مخالف بہت سے لوگ موجود ہیں اور ان میں اچھے غوطہ خور بھی ہیں جو اگر چہ اسمگلنگ میں ملوث ہیں لیکن انہیں اس کام کے لئے آمادہ کرنا آسان ہوگا۔ حاجی متان اور یوسف ٹیل نے باہمی مشورے سے اپنے مستند ساتھی گوا بھیجے۔ کافی چھان بین کے بعد وہ تین غوطہ خوروں کو اپنے ہمراہ بمبئی لائے ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان غوطہ خوروں کو فوری ہی اپنا اصل ٹارگٹ نہیں بتائیں گے بلکہ انہیں مختلف چھوٹے چھوٹے ٹارگٹ دے کر ان کا امتحان لیں گے۔ حاجی متان کا کہنا تھا کہ یہ جہاز تو یہاں موجود ہی ہیں ہمیں پہلے ان غوطہ خوروں کی اہلیت اور خلوص کو اچھی طرح پرکھنا چاہئے۔ جب ہمیں پورے طور پر اطمینان ہو جائے تب ہی انہیں اصل ٹارگٹ بتایا جائے ورنہ بے فائدہ راز افشا ہونے پر ان جہازوں کی سیکورٹی میں دو چندا اضافہ ہو جائے گا۔ ابھی ہم کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچے تھے کہ میرے نیپال جانے کے احکامات آگئے اور یہ مشن ادھورا چھوڑ کر میں مکمل پلان لئے نیپال چلا گیا۔ ایلینفا جزیرے پر پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زائد وقت صرف ہوا۔ یہ جزیرہ 4 میل کے قطر میں پھیلا ہوا ہے۔ بے شمار درختوں، سبز اور ہزاروں ہندوؤں سے آباد یہ جزیرہ آج کل ایک بینک اسپاٹ ہے۔ اس جزیرے پر بلند چٹانوں، گہرے غاروں اور گہری کھائیوں میں چٹانوں کو تراش کر رہائشی کمرے، بڑے ہال، پانی کے حوض، سیڑھیاں اور رستے بنائے گئے ہیں۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے مطابق مہا بھارت کی جنگ سے پہلے پانڈوا اپنے ساتھیوں اور حامیوں کے ہمراہ اس جزیرے میں آئے اور چٹانوں کی یہ تراش خراش انہوں نے ہی کی اور یہیں پر وہ کورڈوں سے جنگ سے پہلے جنگی تیاریوں میں مصروف رہے۔ میں نے وہاں دو غاریں دیکھیں، جن کے منہ خاردار تاروں سے بند تھے ان کے متعلق بتایا گیا کہ یہ سرنگیں سمندر کی تہ کے نیچے سے ہوتی ہوئی کلیان کے نزدیک (کلیان بمبئی سے 80 میل دور ہے) سطح زمین پر ختم ہوتی ہیں ان سرنگوں کی حقیقت تو اللہ ہی جانے لیکن چٹانوں میں ہال اور کمرے بنانے میں کم از کم چالیس پچاس سال صرف ہوئے ہوں گے۔ بلا مقصد انہیں بنانے کی بھی کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی۔ بمبئی کی بہت ساری فیملیز بینک منانے اس جزیرے پر آئی ہوئی تھیں۔ یہاں پر بندروں کی اتنی بہتات تھی کہ اللہ کی پناہ۔ بندر اتنے بڑے تھے کہ چاروں طرف بیٹھے لوگوں کے درمیان دھڑے کھانے کو بلا خوف اٹھالیتے اور درختوں پر چڑھ کر وہ کھانا کھاتے اور لوگوں کا منہ چڑاتے تھے۔ ہمارے سامنے ایک آدمی نے زچ ہو کر ایک بندر کو پتھر مارا۔ پتھر نہ تو بندر کو لگا اور نہ کسی انسان کو لیکن بندر کو پتھر مارتے ہوئے کئی لوگوں نے دیکھا۔ بس پھر کیا تھا بیسیوں لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو گئے اور اسے "ہنومان جی" کی ہتک کرنے پر کوسنے لگے۔ اس آدمی نے غلطی سے بتا دیا کہ وہ مسلمان ہے۔ بس پھر کیا تھا اسے ہندوؤں کے دھرم پر مسلمانوں کا ڈائریکٹ حملہ سمجھا گیا اور بہت سارے ہندو اس مسلمان کو پیٹنے لگے۔ اس کی بیوی اور دو بچے سہمے ہوئے ہندوؤں کی منت سماجت کر رہے تھے لیکن ہندو اپنی فطرت سے مجبوراً کیلئے مسلمان کو دیکھ کر آپے میں نہ رہے تھے۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے اپنا مسلح نکال کر ایک ہوائی فائر کیا۔ میرے چھ محافظوں نے بھی فوراً اپنے ریوالور اور مسلح نکال لئے اور دو تین ہوائی فائر کئے ان فائرؤں نے ہندوؤں کے بلڈ پریشر کو اتنا (LOW) کر دیا کہ جس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا اور وہ اس بینک اسپاٹ سے یوں غائب ہوئے کہ اس مسلمان فیملی اور ہمارے سو اوہاں کوئی انسان دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہندوؤں کے بہادر بیٹا ہنومان جی بھی وہاں سے یوں کھسکے کہ صرف درد سے ان کی آوازیں ہی سنائی دیتی رہیں۔ ہندوستانی حکومت خود اپنے ہنومان جی کو سر جری کی عملی تعلیم اور تجربوں کی بھینٹ چڑھانے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں مغربی ممالک کو برآمد کر کے ڈالر کماتی ہے لیکن کسی ہندو کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اور اگر ایک مسلمان ہنومان جی کی حرکتوں سے تنگ آ کر اسے محض ڈرانے کے لئے پتھر اٹھا کر پھینکے اور وہ پتھر ہنومان جی کو لگے بھی نہ۔ پھر بھی اسے ہندو دھرم پر ایک پیچھے مسئلے کا ڈائریکٹ حملہ سمجھ کر ہندو مسلم فساد کی فضا پیدا کر دی جاتی ہے۔ ہم اس مسلمان فیملی کو اپنے ہمراہ اپنی لالچ میں بمبئی لے آئے۔ میں گیا تو تھا ایلینفا کے جزیرے کی سیر کو لیکن واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ ہندو چاہے بھارت کا ہویا بنگلہ دیش کا، سری لنکا کا ہویا پاکستان کا رانا چندر سنگھ سب مسلمان سے ازلی نفرت کرتے اور موقع ملنے پر انہیں ہر طرح سے نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں۔

بمبئی میں میرے شب و روز گھومنے پھرنے اور حاجی متان کے ترتیب دیئے ہوئے پروگرام کے مطابق نگار خانوں اور مشہور فلمی ستاروں سے ملنے میں گزرنے لگے۔ جن سے قارئین کو شاید دلچسپی نہ ہو۔ صرف ایک واقعہ مختصراً پیش خدمت ہے۔ بمبئی میں یونہی گھومتے ہوئے ایک روز ہم مشہور انڈین کامیڈی محمود کے ایک فلور کے اسٹوڈیو کے پاس سے گزرے۔ یہاں جانا اگرچہ ہمارے پروگرام میں شامل نہ تھا۔ لیکن میں اپنے محافظوں کی گاڑیاں سڑک پر کوا کر اسٹوڈیو کے طرف چل دیا۔ پہلے اسٹوڈیو کے دفاتر آئے۔ معلوم ہوا کہ محمود بھی وہاں بیٹھا ہے۔

(جاری ہے)

میں نے محمود کے سیکرٹری سے محمود کے فین کی حیثیت سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں بٹھا کر محمود کے پاس گیا۔ ان دونوں کمروں کے درمیان لکڑی کی پارٹیشن تھی۔ اور اس پارٹیشن میں شیشے کی ایک سلائیڈنگ چھوٹی کھڑی کی بھی تھی۔ سیکرٹری کے پاس ایک شخص آیا جس نے بتایا کہ وہ محمود کا چھوٹا بھائی الطاف ہے، اور ملنے کی وجہ پوچھی، مجھے دیکھتے ہی وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لینے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا کہ میں محمود بھائی سے پوچھ کر آتا ہوں۔ سلائیڈنگ کھڑکی شاید تھوڑی سی کھلی رہ گئی تھی یا پتلی پارٹیشن کی وجہ تھی مجھے الطاف کی محمود کے ساتھ بات صاف سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا 'الطاف محمود یہ شخص یقیناً وہی مفروور پاکستانی ہے جس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی اور میں نے آپ کو دکھائی بھی تھی۔ محمود کے پوچھنے پر کہ اب ہم کیا کریں۔ الطاف نے کہا "ہم فوراً پولیس کو اطلاع دے دیتے ہیں، اسے ہم اپنے اسٹوڈیو سے گرفتار کرانیں گے۔ یہ سب گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی الطاف نے کہا Bhai over a night you will become all india national hero (بھائی تم رات بھر میں سارے ہندوستان کے قومی ہیرو بن جاؤ گے) یہ سن کر اب میرا وہاں رکنا خود مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں اٹھا اور تیز قدموں سے سڑک کی طرف چل دیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہناتے یا مجھے روکنے کی کوشش کرتے، ہماری گاڑیوں کا کاروان وہاں سے روانہ ہو چکا تھا۔

ایسا ہی ایک واقعہ میرین ڈرائیو پر Hill top ہوٹل میں دوپہر کے کھانے کے دوران پیش آیا۔ اس ہوٹل کے فرائڈ جھینگے بہت مشہور تھے۔ میں نے پہلا جھینگا بھی اٹھایا ہی تھا کہ بمبئی پولیس کے کئی افراد درجنوں سپاہی ہوٹل میں دوڑتے ہوئے داخل ہوئے، کچھ ریسیپشن کی طرف گئے اور کچھ لابی میں ملحقہ ریستورنٹ میں آگئے جہاں میں بیٹھا ہوا تھا میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ پولیس افسروں کے پاس کچھ تصویریں تھیں جنہیں دیکھ کر وہ لابی اور ریستورنٹ میں بیٹھے لوگوں کی شناخت کر رہے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں بڑی مصیبت میں گھر چکا ہوں۔ میں نے جلدی سے اپنا بسٹل نکال کر اپنے سفاری سوٹ کی پینٹ میں اڑوس لیا۔ پولیس کو یوں ہوٹل میں آتے دیکھ کر میرے چھ محافظ بھی خطرے کی بوسو گنگھتے ہوئے ہوٹل کی لابی میں آچکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان سب کے ہاتھ کپڑوں میں چھپے اسلحے پر تھے۔ پولیس مجھے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوتی یا نہیں، لیکن اس کوشش میں بہت سے پولیس والوں کی لاشیں ضرور گرنی تھیں۔ ریسیپشن پر گئے پولیس افسروں کو لابی اور ریستورنٹ میں گئے پولیس والوں کو بلایا۔ ان میں سے کچھ تو ہوٹل کی دولفٹوں میں اور باقی بیڑھیوں سے اوپر کی منزلوں کی طرف چلے گئے اور دس پندرہ منٹ میں ہی وہ دو آدمیوں کو ہتھکڑیاں لگائے اور مارتے پٹیتے لابی میں آگئے۔ کچھ سپاہیوں نے پانچ سوٹ کیس اٹھا رکھے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے بے دلی سے تھوڑا سا کھانا کھایا۔ لابی میں ریسیپشن والوں نے بتایا کہ یہ افغانستان سے بھاری مقدار میں جعلی بھارتی کرنسی لائے تھے اور مخبری پر پکڑے گئے۔ بعد میں حاجی مستان نے مجھے بتایا کہ بل ٹاپ ہوٹل اسی طرح کے ناجائز کام کرنے والوں کا گڑھ ہے۔

بمبئی میں رہتے ہوئے اب مجھے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ دہلی میں قیام کے دوران تقریباً ہر روز ساتھیوں اور لڑکوں سے ملنا، دیئے گئے مشنوں کی تکمیل کے لئے پلاننگ کرنا، ڈاک وصول کرنا، اور بھیجنا اور آزادی سے بلا خوف ہرجگہ جانے اور خطرناک مشن انجام دینے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ بمبئی میں معذوری کی حالت میں سب سے الگ تھلگ اور پہرے داروں کے ساتھ صرف مخصوص جگہوں پر جاتے، جاتے میں اکتا گیا تھا۔ اس کیفیت کا ذکر میں نے حاجی مستان اور یوسف ٹیل سے بھی کیا۔ پاکستان سے بھارت آتے وقت میرے دل میں 71ء کی پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں پاکستان کے دلخست ہونے کا صدمہ اور اپنی اس ذلت کا بدلہ لینے کا عزم تھا۔ دہلی میں میری گرفتاری اور تشدد کے دوران تشدد کے علاوہ میرے مذہب اور میرے وطن کا تسخر اڑانے سے بھارت سے میری نفرت اور بدلہ لینے کی خواہش میں دوچند اضافہ ہو چکا تھا اور نفرت کی اس آگ کو بجھانے کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کو کہا کہ میری ذہنی کیفیت بالکل ایسی ہو چکی ہے جیسے کسی بہت ہی دلچسپ کتاب پڑھنے والے کی آخری صفحات کتاب میں نہ ہونے سے ہوتی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ واپس دہلی چلا جاؤں۔ میرے ساتھیوں کو تو اب پاکستان سے نیا گروپ لیڈر مل چکا ہوگا اور وہ میرے کسی پلان کو پورا کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ لیکن بشیر کے گیرج کے لڑکے تو میرے لئے ہر کام کرنے کو ہمہ وقت تیار ہوں گے۔ حاجی مستان نے کہا کہ بھارت صرف دہلی تک ہی محدود نہیں۔

وہاں جانے کے بجائے یہاں بھی تم اپنے دل کے ارمان پورے کر سکتے ہو۔ اگر یہاں جی اکتا گیا ہے تو کلکتہ یا مدارس چلے جاؤ۔ لیکن یہ یاد رکھنا کہ تمہاری حفاظت کی ذمہ داری ہم دونوں پر ہے اور یہاں تمہیں ہمارا اور ہمارے گروپوں کا پورا تعاون حاصل ہے۔ جس بڑے پیمانے پر تمہاری تلاش جاری ہے۔ بمبئی میں تو تم بچ سکتے ہو لیکن مدارس اور کلکتہ میں تو تم ہزاروں میں پہچان لئے جاؤ گے۔ میں نے جب جذبات کو الگ کرتے ہوئے سوچا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ ان حالات میں بمبئی سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ مجھے ایک اسٹین گن اور تین چار فالتوں بھرے ہوئے میگنیزین دیں اور پہرے دار محافظوں کو ہٹا دیں۔

غازی

میں اکیلا ڈرائیو کر کے بمبئی میں گھومنا چاہتا ہوں۔ اسی روز میری گاڑی میں ڈرائیو کی سیٹ کے نیچے بنے خانے میں ایک اسٹین گن اور چارج Extra میگزین رکھوادیئے گئے، گاڑی کی چابی مجھے دے دی گئی۔ اگلے روز میں گاڑی لے کر نکلا تو کوئی محافظ نہ تھا۔ میرا رخ سانتا کروز ایئر پورٹ کی طرف تھا۔ Back view mirror میں نے دیکھا کہ خاصے فاصلے پر محافظوں کی دونوں گاڑیاں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ مجھ سے وعدہ کرنے کے باوجود وہ اپنی ذمہ داری نہیں بھولے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کے اس اقدام کو سراہا اور اس بارے میں خاموشی کو ہی بہتر جانا۔

اس دوران میں نے دو مختلف دنوں میں اجنٹا اور ایلورا کے غار دیکھے۔ ان غاروں میں پتھروں سے تراشیدہ فن کے بہترین نمونے تھے۔ ایک فنکار کی حیثیت سے انہیں جتنا بھی سراہا جائے کم ہے لیکن ان کی تفصیل بیان کرنے کی ہماری اقدار بالکل اجازت نہیں دیتی۔ ایک روز شام ڈھلے حاجی مستان نے مجھے فون کیا اور جلد از جلد اپنے مالا بارہل کے بنگلے پر آنے کو کہا۔ میں تیار ہو کر اسکے گھر پہنچ گیا۔ یوسف ٹیل بھی وہاں موجود تھا حاجی مستان نے کہا کہ اس کے مال کی ایک بڑی کھیپ آج رات آنے والی ہے اور کھیپ اتارنے کے دوران گوا سے بلوائے گئے غوطہ خوروں کا بھی ٹیسٹ ہوگا۔ رات 12 بجے کے بعد سب کی طرح مجھے بھی ایک اوورہال پہننے کو دیا گیا اور چہرے پر گریس لگا دی گئی۔ اس حلے میں ہم سب کمانڈوز دکھائی دے رہے تھے۔ کام بھی خطرناک تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں مزید دولت جمع کرنے کی خواہش تھی اور وہاں وطن کی محبت اور مملکت کی سالمیت پیش نظر۔ دونوں کے کارکن تو پہلے ہی اپنے لئے متعین مقامات پر پہنچ چکے تھے۔ ہم تقریباً ایک بجے رات وہاں پہنچے اس جگہ کا نام گھاس بندر تھا اور یہاں مچھیروں کی سینکڑوں چھوٹی بڑی کشتیاں اور لائچیں موجود تھیں۔ ہم گاڑیوں سے اتر کر ایک لائچ میں بیٹھ گئے۔ یہ لائچ سمندر کے اندر دو میل جا کر رک گئی۔ ہماری لائچ پر میرے، حاجی مستان اور یوسف ٹیل کے علاوہ دس بارہ محافظ بھی تھے۔ اس لائچ کو صرف نگرانی کرنی تھی۔ ہماری لائچ سے کچھ ہی فاصلے پر ایک اور لائچ لنگر ڈالے کھڑی تھی۔ اس لائچ میں سے دو ننگے جسم آدمی گیس سلنڈر باندھے سمندر میں کودے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں آدمی سطح سمندر پر ابھرے اور لائچ میں سوار ہو گئے۔ وہ لائچ ساحل کی طرف چل پڑی تو ہم بھی اس کے پیچھے ہوئے۔ ہماری لائچ تیز تھی سو اس لائچ سے پہلے ہم ہی ساحل پر پہنچ گئے اور اپنی گاڑیوں میں جا بیٹھے۔ دوسری لائچ ساحل کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اس کے دونوں غوطہ خور سمندر میں اتر گئے۔ اور وہ لائچ تھوڑی دیر بعد دوبارہ سمندر میں کسی دوسری طرف چلی گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ میں یکے بعد دیگرے دونوں غوطہ خور ساحل پر نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں دو دو زنجیریں تھیں۔ ساحل پر کھڑے کارکن ان کی طرف لپکے اور ان سے زنجیریں لے کر کھینچنے لگے۔ چند منٹوں میں ہی زنجیروں کے دوسرے سرے پر بندھے ہوئے چار بڑے صندوق ساحل پر آگئے۔ ساحل پر کھڑا گھاس سے آدھا لدا ایک ٹرک الٹا چلتا ہوا ان صندوقوں کے قریب آن رکا۔ کارکنوں نے جلدی جلدی وہ صندوق اٹھا کر ٹرک میں ڈالے اور انہیں گھاس سے ڈھانپ دیا۔ چار پانچ اسلحہ برداروں کے ہمراہ ٹرک تیزی سے روانہ ہوا۔ اس کے آگے اور پیچھے پانچ چھ گاڑیاں تھیں۔ وہ ٹرک مراٹھا مندر سینما کے قریب ایک بڑی گلی میں داخل ہوا۔ ٹرک کے پیچھے چلنے والی گاڑیوں سے نکل کر کارکن ٹرک کی طرف بھاگے۔ اور چاروں صندوق چار چار آدمی اٹھائے گلی میں غائب ہو گئے۔ ہم بڑی سڑک پر اپنی گاڑیوں میں بیٹھے یہ کارروائی دیکھتے رہے۔

غازی

بس گورکھ پور پہنچی تو بارش جاری تھی۔ میں نے بس سے اترنے سے پہلے رین کوٹ کی ٹوپی سے اپنے چہرے کو اور اچھی طرح سے ڈھانپ لیا۔ گورکھ پور کے ہوائی اڈے کو تباہ کرنے کے مشن کے دوران میں ساتھیوں سمیت کئی روز رہا تھا۔ چھوٹا شہر ہونے کی وجہ سے ان دنوں کئی لوگوں نے مجھے دیکھا ہوگا۔ دونوں کاروں کے مالکان بھی جنہیں ہم بے ہوش کر کے زندہ چھوڑ آئے تھے، گورکھ پور کے رہنے والے تھے۔ جن ہونٹوں میں ہم ٹھہرے تھے ان کے ملازمین بھی اچھی طرح سے ہمارے چہرہ شناس تھے۔ میں اب تیسری مرتبہ یہاں آیا تھا۔ اس سارے سفر کے دوران یہ شہر میرے لئے سب سے خطرناک تھا۔ بس سے اترتے ہی میں نے بغیر کرایہ طے کئے ایک رکشہ لیا اور اسٹیشن پہنچ کر اسے دس روپے دیئے۔ قلی نے میرا سامان اٹھایا اور میں ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو گیا۔

گورکھ پور ایک بڑی فوجی چھاؤنی بھی ہے۔ اسٹیشن پر ایک پوری رجنٹ کے جوان اور انفرمو جوڑے تھے۔ یہ غالباً جاٹ رجنٹ تھی جس کو لے جانے کے لئے اسٹیشن ٹرین آ رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر رجنٹ کے جوانوں اور انفرمو کے علاوہ ملٹری پولیس کے چاق و چوبند جوان بھی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ میں جلدی سے ٹکٹ وٹڈو کی طرف بڑھ گیا۔ بدحواسی میں مجھ سے وہاں ایک ایسی فاش غلطی ہوئی جسے سوچ کر میں اب بھی تھرا اٹھتا ہوں۔ تربیت کے دوران مجھے بھارتی فوجی معلومات کے علاوہ نہ صرف عام ہندی بول چال سکھائی گئی تھی بلکہ بھارتی ہندوؤں کے رہن مہن، تہذیب و تمدن، ادب آداب کے علاوہ ان تمام باتوں سے تفصیلاً آگاہ کیا گیا تھا۔ جن سے مجھے بھارت میں قیام کے دوران واسطہ پڑ سکتا تھا۔ بھارت میں قیام کے دوران میں نے بیسیوں بار ٹرین کا سفر کیا لیکن مجھ سے کبھی ایسی غلطی نہ ہوئی تھی۔ اس کی وجہ غالباً تین برس تک مسلسل خوف و ہراس کے درمیان رہنے، خطرناک مشن سرانجام دینے، گرفتاری، تشدد اور فرار کے بعد اب آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی امید اور اسٹیشن پر فوجیوں کی بڑی تعداد کو دیکھ کر خطرے کے احساس کا مجموعی REACTION (رد عمل) تھا۔

ٹکٹ وٹڈو پر میں نے رسول کا اتر کلاس کا ٹکٹ مانگا۔ اتر کلاس کا سنتے ہی ٹکٹ بابو مجھے گھورنے لگا۔ آدھا منٹ وہ پلک چھپکائے بغیر ٹکٹنگی باندھے مجھے دیکھتا رہا۔ اس دوران مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ اب میں صرف ٹکٹ بابو کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر میں وہاں سے بھاگتا تو اس کی ایک ہی آواز پر ادھر ادھر پھیلے فوجی مجھے پکڑ لیتے۔ میرے لئے وہاں کھڑے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی میرے لبوں پر مہر سی لگ گئی تھی۔ میں اپنی غلطی کی تردید میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ٹکٹ بابو کو میرے چہرے پر پھیلی دہشت یقیناً صاف نظر آ رہی ہوگی وہ آدھا منٹ مجھ پر صدیوں سے بھاری گزرا۔ ٹکٹ بابو نے بالآخر کرحت لیکن دھیمی آواز میں کہا ”یہاں اتر کلاس نہیں ہوتا“ تربیت کے دوران مجھے اچھی طرح سے ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ بھارت میں کئی سال پہلے ریلوے میں انگریزوں کے دور کی درجہ بندی یعنی تھرڈ، اتر، سیکنڈ اور فرسٹ کلاس ختم کر کے لوئر کلاس اور اپر کلاس میں بدل دی گئی تھی جب کہ پاکستان میں اس وقت وہی پرانا سلسلہ جاری تھا۔ یہ غلطی میری جلد بازی اور ذہنی کیفیت کی آئینہ دار تھی۔ ٹکٹ بابو نے گھورتی آنکھوں اور ایک فقرے سے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ میری اصلیت جان چکا ہے۔ اول قدم کا ٹھہ اور رنگ سے ہی میں بھارتی نہیں لگتا تھا۔ پھر POW کیمپوں سے فرار ہونے اور ہتھیار نہ ڈالنے والے پاکستانی فوجیوں کی گرفتاری کی داستانوں سے اخبارات کے صفحے بھرے ہوئے تھے۔ کیمپوں سے جو بھی فرار ہوئے ان میں سے اکثر نے نیپال کی راہ لی اور اپنی لاعلمی کے باعث چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر ہی پکڑے گئے تھے۔ اس وقت میری حالت یقیناً دیدنی ہوگی۔ تین سال سے زیادہ مدت پر ہر لمحے زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے کے بعد جب میں آزادی کی منزل کے اتنے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس وقت ایک چھوٹی لیکن فاش غلطی کی وجہ سے پھر گرفتاری اور گھٹنا گھپ اندھیرے میں ڈوب جانے کا تصور ہی اتنا بھیانک تھا جسے بیان کرنا محال ہے۔ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھوں نے برساتی کے بٹن کھولے اور پمپل کو مضبوطی سے تھام لیا ہزاروں مسلح دشمنوں کا مقابلہ اکیلا تو نہیں کر سکتا تھا لیکن اپنی جان تو لے سکتا تھا۔ اب میری زندگی اور موت کا دار و مدار اللہ کے بعد ٹکٹ بابو پر تھا۔

میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ ٹکٹ بابو انتہائی رحم دل تھا انسان کے روپ میں فرشتہ تھا یا قادر مطلق نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ خود بھارتی مسلمانوں نے مجھے پکڑوانے کی کوشش کی تھی یہ بابو ہندو تھا یا مسلمان لیکن میرے لئے تو رحمت کافرشتہ بن گیا۔ اس نے خاموشی سے مجھے رسول کا لوئر کلاس کا ٹکٹ دیا۔ اسے پیسے دیتے وقت میری آنکھیں تشکر کے جذبات سے لبریز تھیں اور اس کی آنکھوں سے قلبی سکون اور اطمینان جھلک رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس منظر کو اگر کیمرہ فلم میں قید کر لیتا تو وہ تصویر دو مختلف جذبوں کی ترجمانی کے حوالے سے انعام کی حقدار ٹھہراتی۔

قلی نے میرا سامان اٹھا رکھا تھا۔ ہم اس پلیٹ فارم پر چلے گئے جہاں رسول جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ چھوٹی پٹری پر چلنے والی اس گاڑی کا سفر صرف گورکھ پور سے رسول اور واپسی تک محدود تھا۔ آدھ گھنٹے بعد گاڑی نے حرکت کی۔ اس دوران میری حالت بالکل ایک زندہ لاش جیسی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ پلیٹ فارم پر فوجیوں اور مسافروں کی چہل پہل تھی لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ سائے ہیں وہ جو میری آنکھوں میں پھیلنے اور سکڑتے جاتے ہیں۔

گاڑی چلنے کے خاصی دیر بعد میرے حواس کچھ بحال ہوئے اور میں نے ڈبے میں بیٹھے مسافروں کا جائزہ لیا، سات مسافروں میں ایک غیر ملکی بھی تھا۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر جا بیٹھا اور تھرموس سے کافی نکال کر خود بھی پی اور اسے بھی آفر کی۔ مغربی سیاح خود چاہے کتنی ہی اہتر حالت میں کیوں نہ ہوں، ہنسی اور خاصاً برصغیر کے باشندوں کو ہمیشہ ہیچ سمجھتے ہیں۔ ادھر ہم برصغیر کے باسی ان سے بات کرنے یا ان کی ایک مسکراہٹ کو اپنے لئے باعث صد افتخار جانتے ہیں۔ ڈبے کے دوسرے مسافروں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے اسے کافی پیش کی تھی جسے اس نے اپنی برتری کا حق سمجھتے ہوئے مسکراتے ہوئے قبول کیا۔ ادھر میرے دماغ میں ایک نئے منصوبے نے جنم لیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ جرمن نیشنل ہے اور سیر و تفریح کے لئے کھنڈو جا رہا ہے۔ ان مغربی سیاحوں کی ”سیر و تفریح“ اور کھنڈو جانے کا مقصد مجھ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ گورکھ پور میں کی ہوئی غلطی کا مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ گاڑی جیسے ہی کسی اسٹیشن پر رکتی، میں سبھی نظروں سے پلیٹ فارم پر ادھر ادھر دیکھتا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ مجھے پکڑنے کے لئے پولیس یا فوجی اچانک کسی طرف سے جھپٹ پڑیں گے۔

کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی اور وقتے وقتے سے بارش ہو رہی تھی۔ اپنے منصوبے کے مطابق میں نے جرمن کو اپنے متعلق بتایا کہ میں دہلی میں کاروبار کرتا ہوں اور اسی سلسلے میں کھنڈو جا رہا ہوں۔ میں نے اسے کہا کہ اس بارش نے تو سفر کا سارا مزہ کر کر کر دیا ہے۔ اگر ہم بذریعہ سڑک چلیں تو بہت سے دلفریب مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ جرمن نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا تو میں نے کہا کہ اگلے اسٹیشن سے میں تو گاڑی چھوڑ دوں گا اور رسول تک بس سے سفر کروں گا۔ میں نے اسے بھی بس میں چلنے کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ میرے پاس ریل کا ٹکٹ ہے اور بس سے سفر کرنے کے لئے میں مزید پیسے ضائع نہیں کر سکتا۔

اس کی انگریزی ٹوٹی پھوٹی تھی لیکن وہ اپنا مقصد بخوبی بیان کر لیتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ مختصر سے دوران سفر ساتھ نے مجھے اس کا گرویدہ کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ میں اس سے جرمنی کے متعلق معلومات بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ عنقریب ہی مجھے میونخ جانا ہے اس لئے اگر وہ میرا ساتھ دینے کو تیار ہو تو میں نہ صرف اس کا رسول تک بس کا ٹکٹ خریدنے کو تیار ہوں (جاری ہے)

غازی

گاڑی کا عقبی دروازہ میں نے پہلے ہی کھول رکھا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھ کر ان کی آنکھیں حلقوں سے باہر آرہی تھیں۔ وہ بولنا چاہتے تھے لیکن ان کے منہ بندھے ہوئے تھے۔ میں نے محافظوں کو کہا کہ ایک ایک کر کے ان کو عقبی دروازے سے داخل ہونے کی جگہ پر لے جائیں۔ محافظ میرا مطلب اور مقصد سمجھ چکے تھے۔ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر محافظ انہیں وہاں لے گئے اور میں نے دونوں کے سینوں پر عین دل کی جگہ پر پوسٹل رکھ کر ایک ایک گولی داغ دی۔ محافظوں نے دونوں کی لاشوں کو پہلی دونوں لاشوں پر ڈال دیا۔ میں نے محافظوں کو کہا کہ پہلی دونوں لاشوں کی تلاشی لو۔ ان لاشوں سے چاروں کے آئی بی کے کارڈ، دو پوسٹل اور چار بٹوے ملے۔ محافظوں نے میرے کہنے پر میری اسٹین گن اور فالٹو میگزین گاڑی کی اگلی سیٹ کے نیچے رکھ دیئے۔

مجھ پر اس وقت جنون طاری تھا۔ میں نے محافظوں کو کہا کہ میرے بیڈروم سے پوسٹل کے دو فالٹو میگزین اور اگریٹرول بھرے ورنہ خالی کین ہی مجھے لا کر دیں اور دو محافظ اور ڈرائیور میری گاڑی لے کر مجھے فالو (Follow) کریں۔ اور دو محافظ پتوں والی شاخ سے بنگلے سے اس گاڑی تک ریت پر قدموں کے نشان مٹادیں۔ بنگلے سے پیٹرول بھرے دو کین اور پوسٹل کے دو میگزین لئے ایک محافظ آگیا جسے میں نے ساتھ کی سیٹ پر بٹھا لیا۔ اس دوران میری گاڑی لے کر دو محافظ اور ڈرائیور آگئے اور دو محافظوں نے بڑے جھاڑوؤں سے ریت پر قدموں کے نشان مٹانے شروع کر دیئے اور میں نے گاڑی موڑی اور نیونگ پاڑے کا رخ کیا۔ ہمارے پیچھے ہی دو محافظ میری گاڑی میں آرہے تھے۔ نیونگ پاڑے میں، میں نے اپنے کور (Cover) والے فلیٹ کے بالکل قریب گاڑی روکی۔ پچھلی گاڑی سے دونوں محافظ بھی ہمارے پاس آگئے۔ میں ان تینوں محافظوں کے ہمراہ اپنے فلیٹ پر آیا اور ایک محافظ مسلسل تیل بجانے لگا۔ اس دوران میں نے اپنے پوسٹل میں نیا میگزین ڈال لیا تھا۔ دروازہ آدھی سوئی جاگتی گھاسٹن نے کھولا۔ اتنی رات گئے اچانک مجھے دیکھ کر گھاسٹن گھبرا گئی اور دروازہ بند کرنے لگی۔ دروازہ کھلتے ہی میں نے اپنا پاؤں اندر رکھ دیا تھا۔ ادھر محافظوں نے دروازے کو دھکا دیا۔ ہم چاروں کمرے میں داخل ہو گئے۔ محافظوں نے گھاسٹن پر اپنا اسلحہ تان لیا۔ میں دوسرے کمرے میں گیا۔ وہاں اس کا شوہر بے سدھ سو رہا تھا۔ اس کی کنپٹی پر میں نے دو فائر کئے وہ اچھلا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ باقی دونوں کمرے خالی تھے۔ میں پہلے کمرے میں آیا۔ گھاسٹن محافظوں کے حصار میں سہمی ہوئی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے بولنا یا چلانا چاہا۔ میں نے اس کا موقع دیئے بغیر دو گولیاں اس کے ماتھے پر داغ دیں۔ دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھوں والی گھاسٹن بغیر آواز نکالے فرسٹ پر گرنے لگی تو ایک محافظ نے اسے تھام کر آہستہ سے فرسٹ پر لٹا دیا۔ موٹی گھاسٹن کے گرنے کے دھماکے سے نچلی منزل والے یقیناً چونک اٹھتے۔ میں نے محافظوں کو کہا کہ ان دونوں کی لاشوں کو بھی ان ہی کی چاروں میں لپیٹ پر میری گاڑی کی ڈگی میں ڈال دی۔ دو پھیروں میں محافظوں نے یہ کام بھی کر دیا۔ اس دوران میں نے فلیٹ کا تالا ڈھونڈ نکالا اور فلیٹ بند کر کے ہم اپنی گاڑیوں میں آ بیٹھے۔ مجھ پر اس وقت فی الحقیقت خون سوار تھا۔ اس حالت میں اگر مجھے درجنوں لوگوں کو بھی مارنا پڑتا تو میں دریغ نہ کرتا۔ مجھ میں زندہ رہنے کی بے انتہا خواہش پیدا ہو چکی تھی اور اپنی زندگی کے عوض میں بلا تفریق قصوروار یا بے گناہ سینکڑوں کو مارنے کو بھی تیار تھا۔ میری یہ کیفیت کئی روز تک رہی۔ پاکستان میں CMH کے ڈاکٹروں نے اسے ایک خاص نفسیاتی بیماری بتایا جو بھارتی تشدد کے بعد مجھ میں پیدا ہو گئی تھی۔ پاکستان میں ادویات کے مسلسل ایک سال استعمال سے یہ عارضہ دور ہوا۔ (جاری ہے)

غازی

لیکن اب بھی یہ حالت ہے کہ میری ڈسپلنڈ (Disciplined) زندگی میں خلل ڈالنے اور بلاوجہ وعدہ خلافی کرنے والوں سے میں غصے میں بے قابو ہو جاتا ہوں چاہے وہ میری اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

میری گاڑی میں چھ لاشیں پڑی تھیں اور انہیں میں بے جان کتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا ان لاشوں اور گاڑی کو ٹھکانے لگانے کے لئے میں نے محمود کے اسٹوڈیو کو چنا۔ مین روڈ سے اسٹوڈیو کو جانے والی چڑھائی کے خاتمے پر گاڑیوں کی پارکنگ تھی۔ پارکنگ کے ساتھ ہی دفاتر اور اسٹوڈیو تھا۔ کلامندر اسٹوڈیو میں آج میں اپنی ”کلا“ دکھانا چاہتا تھا۔ پارکنگ میں جا کر میں نے گاڑی روکی۔ چوکیدار کے لٹھ کی کھٹ کھٹ قریب آتی سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً وہ اپنا راؤنڈ مکمل کر کے اس طرف آرہا تھا۔ میں اور میرے ساتھی محافظ نے پھرتی سے گاڑی کے اندر اور ڈیڑگی میں پڑی لاشوں پر پیٹرول ڈالا اور کچھ پیٹرول گاڑی کی فرنٹ سیٹ اور فرسٹ پرائیڈیل دیا۔ میں پیٹرول کی ایک پتلی دھا رہناتا ہوا تین میٹر کی دوری تک لے آیا اور اس دھا رکودیا سلانی دکھادی۔ آگ ایک بیک گاڑی تک جا پہنچی اور ساری گاڑی کو لپیٹ میں لے لیا۔ گورکھا چوکیدار بھاگتا ہوا گاڑی کی طرف آیا اور ادھر ہم دونوں بھاگتے ہوئے مین روڈ پر کھڑی اپنی گاڑی تک آئے اور تیزی سے جوہو کے بنگلے کی طرف روانہ ہوئے۔ میں نے محافظوں کو الٹ رہنے اور اسلحہ ہاتھ میں رکھنے کو کہا کیونکہ عین ممکن تھا کہ آئی بی کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے سچ کہا ہو اور اس کی فورس کے آدمی جوہو میں موجود ہوں۔ لیکن ایسا کچھ نہ تھا۔ مرتے مرتے بھی یہ ہندو مجھ پر جعلی عکس ڈالتا رہا۔ انعام کے لالچ اور اپنی اسپیشل ترقی کی خواہش میں اس نے گھائش کی انفارمیشن کو صرف اپنے تک محدود رکھا تھا اور اسی لالچ کی وجہ سے اپنے تینوں ماتحتوں سمیت جہنم رسید ہوا۔ گھائش بھی لالچ کی وجہ سے ہی اپنے انجام سے دوچار ہوئی۔ سو یا ہوا شخص نامعلوم اس کا شوہر تھا یا چاہنے والا۔ مخبری کرنے میں گھائش کا شریک کار تھا یا لاعلم۔ لیکن ایسے موقعوں پر گیسوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ مجھے بہر حال اپنے خلاف شواہد اور ہر ثبوت مٹانا تھا۔ چاہے اس میں کتنے ہی گناہ گار یا بے گناہ مارے جاتے۔ بنگلے میں آ کر میں نے چائے بنوائی۔ ڈاکٹر کے دیئے ہوئے Tranquilizer (مسکن دوا) کھائی اور سو گیا۔ صبح میں بالکل تازہ دم تھا۔ دل و دماغ پر گزشتہ رات چھ افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کا ذرا بھی اثر نہ تھا۔ گیارہ بجے میں حاجی مستان سے ملنے گیا اور تفصیلاً اسے رات کا واقعہ سنایا۔ حاجی مستان نے کہا کہ صبح 9 بجے سے پہلے محافظ اسے تمام تفصیل بتا چکے ہیں۔ مستان نے کہا کہ اچھا ہوا جو یہ آئی بی کا ڈپٹی ڈائریکٹر ختم ہو گیا۔ اس نے ان کے کاروبار کو بھی نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی۔ شام تک جلنے والی گاڑی کے متعلق بھی اطلاعات آگئیں۔ گاڑی بالکل جل گئی تھی اور لاشیں ناقابل شناخت تھیں۔ اور آئی بی والے تاحال اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر اور عملے کے تین ارکان کے انجام سے بے خبر تھے۔

سی بی آئی کے آدمیوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد اگرچہ جوہو کے علاقے میں ان کی تلاش کے کوئی آثار نہ ملے لیکن حاجی مستان نے بنگلے کے پہرے داروں میں اضافہ کر دیا۔ اس واقعے کو گزرے دس بارہ روز ہی ہوئے تھے کہ میں نے پونا جانے کا فیصلہ کیا۔ حاجی مستان اور یوسف ٹیل نے بے حد اصرار کر کے مجھے حفاظت کے لئے 6 آدمی ساتھ لے جانے پر مجبور کر دیا۔ پونا میں، میں بھارت کے 39 ماؤنٹین ڈویژن 39 Mountain Div اور خصوصاً 17 پونا ہارس (ٹینک رجمنٹ) کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ پہاڑی ڈویژن بھارت نے 1962ء میں چین بھارت جنگ کے بعد Raise کیا تھا۔ اس ڈویژن کے جوانوں کو پہاڑی جنگ کی خصوصی تربیت دی گئی اور اسے ہلکے خود کار امریکن اسلحے سے لیس کیا گیا تھا۔ اس ڈویژن کے پاس خصوصی طور پر تیار کی گئی جیپیں، ٹرک اور Tracks والے A.P.C (آرمرڈ پرسنل کیریئر) اور توپ خانے کے پاس خصوصی مارٹر گنوں کے علاوہ ہلکی اور زیادہ رینج والی توپیں تھیں۔ نمبر 17 پونا ہارس بھی اس ڈویژن میں شامل تھیں۔ 71ء کی پاک بھارت جنگ میں 17 پونا ہارس کی بہادری کی پاکستانی جرنیلوں نے بھی تعریف کی۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اگر پاکستان کے پاس بہترین لٹا کافوج ہے تو بھارت کے پاس بھی کم معیاری فوج نہیں۔ دونوں ممالک کی فوجوں کی تربیت کا انداز (Pattern) بھی ایک ہی ہے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی ہمیشہ ہم سے بہتر اور وافر مقدار میں رہا ہے۔ فوجوں کی تعداد بھی ہم سے کئی گنا زیادہ ہے۔ کمی ہے تو جذبہ ایمان اور شوق شہادت کی۔ بھارتی فوجیوں کو دلیر بنانے کے لئے شراب دی جاتی ہے جبکہ پاکستانی فوجیوں نے 65ء اور 71ء کی جنگوں کے دوران بیشتر وقت صرف چنے اور گڑ کھا کر دشمن کے دانت کھٹے کئے۔ پاکستانی فوجی لڑتے وقت اپنے اسلاف کی بہادری کے کارناموں کو دہراتے اور بد روئین اور قادیانہ کے مجاہدوں کی جانبازی کو پیش نظر رکھتے ہیں جبکہ بھارتی افواج کو اپنے ماضی کی جنگوں میں سوائے شکست اور محکومی کے کچھ نظر نہیں آتا۔

پونا بہت ہی سے سوکلو میٹر سے کچھ زیادہ فاصلے پر ایک پہاڑی اور صحت افزاء شہر ہے۔ دو گاڑیوں پر مشتمل ہمارے قافلے نے پونا میں ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ دوسرے روز ہم شہر کی سیر کو نکلے۔ سیر سے میرا مقصد چھاؤنی کا سروے کرنا تھا۔ میرا چھاؤنی کے اندر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں بھی چھاؤنی کے اردگرد فوجیوں کے لئے بنے شراب خانے موجود تھے۔ میں نے انہی شراب خانوں

میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ (جاری ہے)

غازی

نیپال کے سرحدی قصبے بیرگنج میں رات گزارنے کے لئے ہوٹل کا کرایہ اور کھانے پینے کا خرچہ بھی اٹھاؤں گا۔ جرمن نے کچھ دیر سوچنے کے بعد میری دعوت قبول کر لی۔ اگلا بڑا اسٹیشن مظفر آباد تھا۔ ہم ٹرین سے اتر آئے۔ جرمن نے میرا ایک سوٹ کیس اٹھایا۔ اس کا اپنا مختصر سامان اس کی پشت پر بندھا ہوا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی بڑی سڑک دکھائی دی۔ بارش نے پھر زور پکڑ لیا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک درخت تلے ہم کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہی رکسول جانے والی بس نمودار ہوئی۔ بارش کی وجہ سے گنتی کے چند ہی مسافر بس میں موجود تھے۔ ہم بس میں سوار ہوئے اور ڈرائیور کے بالمقابل خالی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ کنڈیکٹر بھی کرایہ لینے کے بعد ڈرائیور کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ ڈرائیور کوئی ٹھا کر تھا۔ دونوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ چند روز پیشتر تین پاکستانی فوجی (یقیناً یہ وہ فوجی تھے جو (REPATRIATION) پاکستان واپسی سے کچھ قبل کیمپوں سے فرار ہو گئے تھے اور خاصا وقت بھارت میں بھٹکنے اور پناہ لینے کے بعد نیپال جا رہے تھے) اسی ڈرائیور نے شک پڑنے پر بھارتی پولیس کو پکڑوائے تھے۔ وہ اپنے اس کارنامے پر اتر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ایک بڑا شکار اس کے کتنے قریب بیٹھا تھا۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے عرض ہے کہ 16 دسمبر 71ء کو مشرقی پاکستان میں تمام فوجیوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ کچھ آسام سے ہوتے ہوئے برما چلے گئے جہاں برمی حکومت نے انہیں کچھ عرصہ قید رکھ کر پاکستان کے حوالے کر دیا۔ کچھ جیسور چھاؤنی کے قریب ہی بارڈر سے بھارت میں داخل ہوئے اور چھپتے چھپاتے بھارتی پنجاب کی راہ لی اور کچھ سندھ میں بارڈر کی طرف بڑھے لیکن راستوں سے عدم واقفیت اور مضبوط بھارتی جاسوسی نظام کی وجہ سے راستے میں ہی پکڑے گئے۔ جو بارڈر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے وہ وطن کے اتنے قریب کامیابی سے پہنچنے کی خوشی اور جلد بازی کے نتیجے میں بھارتی سرحدی فوج BSF کے ہاتھوں گرفتار ہو کر کیمپوں میں بھیج دیئے گئے جہاں انہیں سخت تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور بغیر یونیفارم گرفتاری کے باعث کئی برس کیلئے جیل بھیج دیا گیا۔ نیپال جانے والوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ ایسے خوش نصیب بہت کم تھے جو بغیر گرفتار ہوئے پاکستان پہنچے۔

کئی گھنٹوں کے سفر کے بعد رکسول آ گیا۔ یقین جانئے کہ وہاں بارش کی اتنی بڑی بڑی بوندیں گر رہی تھیں جن سے جسم پر چوٹ لگنے کا احساس ہوتا تھا۔ میرا جرمن ساتھی مسلسل بارش سے جھنجلا کر بولا THIS RAIN IS HELL (یہ بارش تو عذاب ہے)۔ مجھے اسی بارش میں اپنی نجات دکھائی دیتی تھی۔ میں نے کہا FOR SOME IT IS BLESSING (کچھ کیلئے یہ نعمت ہے) اور حقیقت بھی یہی تھی۔ سخت بارش کی وجہ سے دور دور تک کوئی انسان نظر نہ آیا تھا۔ اڈے پر بس سے اتر کر میں نے رکشا والوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ نیپال کے سرحدی قصبے بیرگنج جانے والے صرف پیلے رنگ کے رکشا ہیں جنہیں دونوں جانب جانے کا خصوصی پرمٹ ملا ہوا ہے۔ میں نے دو پیلے رکشا لئے اور بارڈر کی طرف روانہ ہو گئے۔ بارڈر ایک ندی تھی جس پر تقریباً ساٹھ میٹر لمبا پل بنا ہوا تھا۔ آدھا پل بھارتی اور آدھا نیپالی تھا۔ پل کے ساتھ ہی امیگریشن آفس تھا۔ جرمن اس میں جانے لگا تو میں نے اسے کہا کہ مجھے یہاں کچھ کام ہے۔ تم سے بیرگنج کے DELUX ہوٹل میں ایک دو گھنٹے بعد ملوں گا۔ میں نے اسے سچا بھارتی روپے دیئے اور کہا کہ میرے دونوں سوٹ کیس اور تھرموس بھی وہ ہمراہ لے جائے۔ نوٹوں بھرا پیکٹ میں نے ٹرین میں ہی اپنے جسم کے ساتھ باندھ لیا تھا اور سوٹ کیسوں

میں کپڑوں اور جوتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ (جاری ہے)

غازی

جرمن کو امیگریشن دفتر بھیج کر میں نے اپنا رکشہ بھی فارغ کر دیا اور بارڈر کراس کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا اگرندی بارش کی وجہ سے چڑھی نہ ہوتی تو رات کے اندھیرے میں اسے کراس کرنا ایسا مشکل نہ تھا۔ لیکن اس وقت تو وہ بھری ہوئی تھی۔ ایک خیال آیا کہ رات رسول میں ٹھہرا جائے لیکن فوراً ہی اس کو جھٹک دیا۔ رسول جیسے سرحدی قصبے کے ہوٹل میں ٹھہرنا مصیبت کو خود دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ جرمن امیگریشن آفس سے باہر آیا اور رکشے میں بیٹھ کر پل کی جانب روانہ ہو گیا۔ میں نے اسے پل کراس کرتے دیکھا۔ نیپال کی طرف کوئی امیگریشن آفس نہ تھا (نیپال کی بھارت کے ساتھ پوزیشن بالکل آزاد کشمیر اور پاکستان جیسی ہے۔ کوئی غیر ملکی پاکستان آجائے اس کے آزاد کشمیر میں داخل ہونے کے لئے کوئی علیحدہ امیگریشن نہ ہوگی)۔ بارش اور تیز ہو گئی اور رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں پھر پل کے قریب چلا آیا آزادی مجھ سے صرف تیس میٹر دور تھی۔ پل کے شروع میں ایک کیونوی میں ایک اکتایا ہوا مٹھی سا گارڈ کھڑا تھا۔ میں نے کوئی اور صورت دکھائی نہ دینے پر اسے ہی آزمانے کا فیصلہ کیا۔ میں اس کے پاس چلا گیا نہایت عاجزی سے پر نام کیا اور کہا ”مہاراج میں اپنے ایک جرمن دوست کو چھوڑنے یہاں تک آیا تھا جو ابھی ابھی رکشے میں بیرگج گیا ہے۔ میرے قدم آج تک دھرتی ماتا سے باہر نہیں گئے۔ اپنے متروں میں شرط لگا کر آیا تھا کہ ویدیش دھرتی میں ضرور جاؤں گا۔ مجھے وشو اش ہے کہ آدھا پل ہمارے دیش کا ہے۔ اگر آپ آگیا دیں تو میں اپنے حصے کے پل کے آخر جا کر ایک پاؤں نیپال دھرتی پر رکھ کے واپس آ جاؤں اس طرح میری شرط پوری ہو جائے گی اور میں سو گند کھا کر کہہ سکوں گا کہ میں ویدیش ہو آیا ہوں۔“ یہ کہتے کہتے میں نے پچاس روپے اس گارڈ کی مٹھی میں دے دیئے۔ اس نے سر ہلا کر مجھے اجازت دے دی۔ میں نے پل پر آہستہ قدمی سے چلنا شروع کیا۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ آزادی مجھ سے قدم بقدم قریب آتی جا رہی تھی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں آدھا پل طے کر چکا ہوں تو پہلے تو میں نے اپنی رفتار تیز کی اور پھر بھاگنے لگ گیا۔ بھارتی گارڈ نے یہ کیفیت دیکھی تو اسے رشوت کے پچاس روپے بھاری پڑتے دکھائی دیئے۔ پل پر بارش کے قطروں کی آواز میں شامل پہلے مجھے ہالٹ، ہالٹ کی آواز سنائی دی اور پھر رائل کے دو فائر ہوئے۔ اس اثنا میں سارا پل کراس کر کے میں نیپال کی سر زمین میں داخل ہو چکا تھا۔ نیپالی پولیس نے بھارتی گارڈ کے فائروں سے چونکا ہوا کر مجھ پر رائفلیں تان لیں۔ میں ہاتھ اٹھائے ان کے پاس چلا گیا اور زور زور سے کہنے لگا۔ ”نو فائر، نو فائر۔ پاکستانی ریفلو جی۔ پاکستانی ریفلو جی۔“ نیپال کا پاکستان سے معاہدہ تھا کہ کسی بھی پاکستانی ریفلو جی کو بغیر سفری کاغذات کے نیپال میں داخل ہونے کی اجازت ہوگی۔ کھٹمنڈو میں پاکستانی سفارت خانے نے اگر اس کی تصدیق کر دی تو اس ریفلو جی کو یو این او کے افغان ایئر کے چارٹرڈ جہازوں میں سیٹ ملنے تک نیپال میں قیام کی اجازت ہوگی۔ تصدیق نہ ہونے کی صورت میں اس ریفلو جی کو واپس بھارت میں دھکیل دیا جائے گا۔

نیپالی پولیس کے دو سپاہی مجھے حراست میں لئے قریب ہی بنے تھانے لے گئے۔ تھانیدار کو میں نے پاکستانی ریفلو جی والی بات دہرائی تو اس نے کہا کہ دو تین دنوں میں تھانے کی حوالات میں بند دیگر پاکستانی ریفلو جیوں کی کھیپ کے ساتھ مجھے بھی کھٹمنڈو میں پاکستانی سفارت خانے میں بھیج دیا جائے گا اور اس وقت تک مجھے حوالات میں رہنا ہوگا۔ یہ کہہ کر تھانے دار نے اپنے حوالدار کو مجھے

لاک اپ میں بند کرنے کا حکم دیا۔ تھانیدار تھوڑی انگریزی اور خاصی بھارتی ہندی جانتا تھا۔ (جاری ہے)

غازی

میں نے چہرے کو ذرا بگاڑ کر امریکن لہجے میں انگریزی میں کہا کہ میں ایک باعزت پاکستانی شہری ہوں۔ نیپال اور پاکستان کے معاہدے کے مطابق مجھے آپ کے ملک میں حوالا نہیں بلکہ پناہ ملنی چاہئے۔ میں نے خود اپنے کو آپ کے حوالے کیا ہے۔ آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے بیرنگ میں کسی ہوٹل میں قیام کی اجازت دے دیں۔ میں خود کل صبح آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا اور اپنے خرچ پر ٹیکسی لے کر پولیس کے ہمراہ کھٹمنڈو پاکستانی سفارتخانے جاؤں گا۔ تھانیدار تو سوچ میں پڑ گیا اور ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے کمرے کے کونے میں لے جا کر کہا کہ 500 روپے تھانیدار کیلئے اور بارہ سو اس کی ٹیکسی کیلئے دے دو تو تمہاری بات مان لی جائے گی۔ میں نے فوراً دو ہزار روپے نکال کر اسے دیئے اور کہا کہ مدد کرنے کے عوض تین سو روپے تمہارے لئے ہیں۔ دو ہزار روپے دونوں کی جیب میں جانے کی دیر تھی کہ مجھے ہوٹل میں ٹھہرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ اجازت ملنے میں سارا روپے کا ہی نہیں بلکہ امریکن لہجے میں انگریزی بولنے کا بھی حصہ تھا جس سے برصغیر کے بسنے والے خواجواہ احساس کمتری کا شکار ہیں۔ ہیڈ کانسٹیبل مجھے ہوٹل چھوڑنے کے لئے ہمراہ چل پڑا۔

بہی سے روانگی سے قبل میں نے خصوصی طور پر بھارت نیپالی سرحد اور نیپال کے تفصیلی اور جامع نقشے اور ٹورسٹ گائیڈ بکس لی تھیں۔ کیونکہ میں اگر رسول سے سرحد عبور کرنے میں ناکام ہو جاتا تو پھر کسی دوسری جگہ سے مجھے یہ سرحد کراس کرنی تھی۔ گائیڈ بک کے مطابق بیرنگ میں ڈی لکس ہوٹل سب سے بہتر تھا اور یہاں سے سالم ٹیکسی صرف چار سو میں کھٹمنڈو جاتی تھی۔ جس کے بارہ سو روپے تھانیدار صاحب نے وصول کئے تھے۔ ہم ہوٹل پہنچے تو جرمن لابی میں بیزار بیٹھا دکھائی دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ریسیپشن پر جا کر میرے کہنے پر ڈبل کمرہ میرے لئے بک کیا اور سنہالی زبان میں نیچر کو میرے متعلق ہدایات دیں۔ وہ واپس جانے لگا تو مجھ سے سو روپے مزید اینٹھ لئے۔ رجسٹر میں ENTRY کروا کے میں جرمن کولے کر کمرے میں آ گیا۔ ہم دونوں نے اگرچہ رین کوٹ پہن رکھے تھے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کپڑے جسم سے چپک گئے ہوں۔ بوٹ تو من من بھروزنی معلوم ہوتے تھے۔ ویٹرنے آتشدان میں آگ سا گادی تو ہم نے سارے کپڑے اتار دیئے اور صرف انڈرویئر پہن کر آگے گئے۔ اگرچہ رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا لیکن میں نے پہلے کافی اور لوازمات کا آرڈر دیا۔ دراصل میں آزادی کی خوشی میں پاگل ہو رہا تھا اور رات بھر اس خوشی کو CELEBRATE کرنا چاہتا تھا۔ میری خوشی کی اس حالت کو قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ میں اپنے مقصد میں اللہ پاک کے کرم سے مکمل کامیاب ہوا تھا۔ اپنی ہمت سے بہت بڑھ کر میں نے بھارت کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ میرے ساتھیوں اور دہلی میں میرے تربیت یافتہ لڑکوں نے گورکھپور کے ہوائی اڈے کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا اور بھارت کے کروڑوں کے جہاز بھسم کر دیئے تھے۔ میں نے آرمی ہیڈ کوارٹرز دہلی میں سیکورٹی کو توڑ کر انتہائی اہم معلومات کے حصول کے لئے پل بنا دیا تھا۔ میں نے بھارت کے جدید ترین ٹینکوں کی پاکستان کی سرحدوں پر خفیہ DEPLOYMENT کو طشت از بام کر دیا تھا اور پاکستان میں بھارتی جاسوسوں کی مکمل فہرست اپنے محکمے کو پیش کر دی تھی۔ میں نے بھارت کی ایٹمی قوت کے انتہائی اہم اور خفیہ راز حاصل کئے تھے۔ میں نے بھارتی تشدد کی انتہا کو برداشت کیا اور اپنی زبان نہ کھولی اور DMI کی سیکورٹی کے حصار کو توڑ کر ان کے منہ پر ذلت کے طمانچے مارے تھے اور یہ ثابت کر دیا

غازی

کافی آئی تو میں نے کپ بنا کر جرمن کو دیا اور ٹوسٹ کرتے ہوئے کہا IN THE NAME OF MY FREEDOM اور گرم کافی حلق میں اٹھیل لی۔ جرمن نے میرا ساتھ تو دیا لیکن ٹوسٹ کا مقصد نہ سمجھتے ہوئے پوچھا کہ فریڈم سے میری مراد کیا ہے۔ میں خوشی میں اتنا بے سدھ ہو رہا تھا کہ ہر قسم کی احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے بتایا کہ میں بھارتی نہیں بلکہ پاکستانی ہوں اور بھارت میں بہت سے خطرناک مشن انجام دے کر اور ان کی حراست سے فرار ہو کر بمبئی سے یہاں آیا ہوں اور بھارت میں میری گرفتاری پر انعام مقرر ہے۔ میں نے اپنی رو میں بہتے ہوئے اسے وہ اخبار بھی دکھا دیئے جن میں میری تصویر اور انعام کی رقم شائع ہوئی تھی۔ جرمن کی حالت کھیاتی بنی جیسی تھی۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں کہنے لگا۔

(میں کتنا احمق ہوں کہ میں تمہیں اس وقت بھی نہ سمجھ سکا جب تم نے مجھے بلا وجہ بس کا ٹکٹ اور بیرنگ میں ہوٹل میں رہائش کی پیشکش کی تھی اور میں تمہیں اس وقت بھی نہ سمجھ سکا جب رکسول میں، میں نے کہا تھا کہ اتنی شدید بارش ایک زحمت ہے اور تم نے کہا تھا کہ کسی کے لئے یہ رحمت ہے۔ تم نے مجھے سارا وقت بے وقوف بنایا لیکن میں تمہیں آزادی کی مبارک باد دیتا ہوں۔ لیکن میں یہ اقرار کروں گا کہ اگر بھارت میں مجھے معلوم ہو جاتا کہ تمہارے اوپر انعام مقرر ہے تو میں تمہیں ضرور گرفتار کروادتا)۔ جرمن نے میری خوشی میں بھرپور ساتھ دیا۔ ہم اپنی اپنی زبانوں میں گیت گانے لگے۔ دیر تک خوشی کے یہ نغمے گونجتے رہے پھر ہم نے لذیذ کھانے کھائے اور مدہوشی کی نیند سو گئے۔ میں تو سمجھا تھا کہ نیپال میں داخل ہو کر میرا کام ختم ہو گیا ہے اور میں اب چین کی بانسری بجاؤں گا لیکن مجھے کیا علم تھا کہ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں جن سے مجھے بہر طور گزرنا ہے۔

اگلی صبح ہم دن چڑھے تک سوتے رہے۔ تین سال سے زیادہ عرصہ بھارت میں قیام کے دوران میں کبھی بھی بھرپور نیند نہ سو سکا تھا۔ سوتے ہوئے آدھا دماغ جاگتا رہتا۔ ہر وقت ایک انجانا خوف طاری رہتا تھا ذرا سی بھی آواز آتی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ اب آزاد سرزمین میں آزادی کی پہلی رات ایسی مدہوشی کی نیند آئی کہ ویٹر کے کافی دیر دروازہ پٹینے کے نتیجے میں پہلے جرمن جاگا اور اس نے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر مجھے جگایا۔ ویٹر نے بتایا کہ کٹھمنڈو جانے کے لئے ٹیکسی اور دوپا ہی آگئے ہیں۔ رات بھر کی بھرپور نیند کے باوجود میرا جسم ٹوٹ رہا تھا اور بے حد تھکاؤٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میری حالت اس مسافر جیسی تھی جو تین برس تک مسلسل دشوار گزار راستوں پر اپنی لو اور جذبات کے سہارے چلتے چلتے بالآخر منزل پر پہنچ کر نڈھال ڈھے جاتا ہے۔ بیڈٹی پینے کے بعد میں نے جرمن کو کہا کہ میں آج تو کٹھمنڈو کا سفر کرنے کے قابل نہیں اگر وہ جانا چاہتا ہے تو میں اسے بس کا کرایہ دینے کو تیار ہوں۔ ورنہ میرے ساتھ کل کٹھمنڈو چلے۔ جرمن جس کا نام سائل تھا کہنے لگا "میں تمہارے ساتھ کل جانا بہتر سمجھتا ہوں اگر تم مجھے کچھ حشیش منگوا دو تو میں تمہارا بہت مشکور رہوں گا"۔ میں نیچے ریسپشن پر گیا اور نیچر سے کہا کہ مجھے تھانے کے انچارج سے بات کرنی ہے۔ نیچر نے ٹیلی فون ملایا اور ریسپور مجھے دیتے ہوئے کہا کہ تھانیدار لائن پر ہے۔ تھانیدار کو میں نے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے میں آج کے بجائے کل صبح کٹھمنڈو جاؤں گا۔ آج کے انتظامات کے لئے آپ کو جو تکلیف ہوئی ہے۔ اس کے عوض میں ایک ہزار روپیہ آپ کو دونوں سپاہیوں کے ہاتھ بچھ رہا ہوں۔ ہزار روپے کا سنتے ہی تھانیدار کہنے لگا۔ "سر کوئی بات نہیں آپ ایک رات تو کیا، چھتئی راتیں چاہیں، یہاں قیام کر سکتے ہیں۔ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بتائیں۔ آپ ہمارے معزز مہمان ہیں"۔ (جاری ہے)

غازی

اس کے رویے میں تبدیلی کی وجہ محض نوٹوں کی گرمی تھی۔ میں نے سپاہیوں کو بلا کر تھانیدار سے ان کی بات کروائی اور اپنے کمرے سے روپے لاکر ہزار روپیہ تھانیدار کے لئے اور سو روپیہ دونوں سپاہیوں کو دیا۔ وہ دونوں بھی خوشی خوشی مجھے سیلوٹ مار کر چلے گئے۔ کمرے میں واپس آ کر میں نے ویٹر کو ناشتہ لانے کا کہا اور ساتھ ہی پوچھا کہ کیا حشیش مل سکتی ہے؟ حشیش کا نام سنتے ہی ویٹر کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ خود حیران تھا کہ دو غیر ملکی (مجھے بھی وہ مغربی سیاح ہی سمجھ رہا تھا) جب سے آئے ہیں انہوں نے حشیش کیوں نہیں طلب کی۔ ویٹر نے جواب دیا۔ جتنی چاہئے ابھی لادتا ہوں۔ میں نے اسے پچاس روپے دیئے اور وہ چند منٹوں میں ہی چرس کے کئی ٹکڑے لے کر آ گیا۔ جرمن تو حشیش دیکھتے ہی اس پر ایسے جھپٹا جیسے بھوکے بلی چھپڑوں پر۔ ناشتے سے پہلے ہی وہ چرس بھرے سگریٹ بنا کر پینے لگا۔ میں نے کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں تاکہ یہ تلخ دھواں باہر جاسکے۔ ناشتے کے بعد میں لابی میں آیا تو کئی نیپالی اور غیر ملکی وہاں کھلے عام چرس پی رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر نیپال نے بتایا کہ نیپال کے قانون کے مطابق چرس رکھنا اور پینا ممنوع نہیں۔ صرف چرس بیچنا ممنوع اور خلاف قانون ہے۔ اس عجیب و غریب قانون کا کیا مقصد اور فائدہ ہے اسے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ بالکل ویسا ہی قانون ہے جیسا پاکستانی جیلوں میں قیدیوں کو کھانا پکانے کے لئے گوشت سبزی، دالیں اور گھی وغیرہ لانے کی اجازت ہے۔ ہر اقسام کے سگریٹ بھی وہ جیل میں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن ماچس یا لائٹر رکھنے کی اجازت نہیں۔

ناشتے کے بعد میں نے جرمن کو کہا کہ چرس تو میں نے تمہیں منگوا دی ہے لیکن آئندہ تم کمرے میں چرس نہیں پیو گے بلکہ لابی یا سڑک پر جا کر پیو۔ یہاں کا قانون اس کی کھلی اجازت دیتا ہے۔ جرمن نے گزشتہ رات دہکتے آتشدان کے پاس ہمارے جوتے رکھ دیئے تھے۔ میں نے ویٹر کو کپڑے دھونے اور جوتے پالش کرنے کے لئے دیئے اور تھوڑی دیر بعد ہم نہادھو کر بیرگنج کی مٹرگشت کو نکل کھڑے ہوئے۔ آسمان بالکل صاف اور سورج کی تپش بھلی محسوس ہو رہی تھی بیرگنج ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور اس کی اہمیت صرف یہ تھی کہ یہاں سے کٹھمنڈو کے طویل اور خطرناک سفر کے لئے بسیں صبح صرف 9 بجے تک اور ٹیکسیاں گیارہ بجے تک ملتی تھیں۔ ان اوقات کے بعد پہنچنے والے مسافروں کو بقیہ دن اور رات کو یہاں قیام کرنا پڑتا تھا جس کیلئے معمولی سرائیں اور منجی بستر والے ہوٹلوں سے لیکر DELUX جیسے اعلیٰ معیار کے ہوٹل بنے ہوئے تھے۔ سیسنا اور نو کرفرینڈ شپ جیسے جہازوں پر مشتمل بیرگنج اور کٹھمنڈو کے درمیان ایک برائے نام ہوائی سروس بھی تھی۔ جو شیڈول کے مطابق تو دن میں ایک بار چلتی تھی لیکن عملی طور پر دو تین روز بلکہ کئی بار ایک ہفتے تک موسم کی خرابی کے باعث معطل رہتی تھی۔ بیرگنج میں گھومتے پھرتے ہم بارڈر کے پل کی جانب ہوئے۔ پل کی دوسری جانب اب موسم صاف ہونے کی وجہ سے چہل پہل دکھائی دیتی تھی میں سوچنے لگا کہ یہ پل تو میرے لئے ایک طرح سے پل صراط ثابت ہوا۔ جس کے دوسری جانب بھارتی مسلمانوں اور خصوصاً میرے لئے جہنم تھا۔ میں دیر تک وہاں کھڑا ماضی کے درپچوں میں جھانکتا رہا۔ وہیں پر مجھے معلوم ہوا کہ ستوڑ ڈھا کہ سے قبل بھارت اور نیپال کے درمیان امیگریشن کا کوئی دفتر نہ تھا۔ بھارتی اور نیپالی بلا روک ٹوک دونوں ممالک میں آتے جاتے تھے۔ بھارت نے مشرقی پاکستانی مہاجروں اور پاکستان افواج کے مفرور جوانوں کو پکڑنے کے لئے یکطرفہ طور پر امیگریشن آفس کھول دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھارتی سی بی آئی کا ایک بڑا فعال دفتر بھی رکسول میں تھا۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ طوفانی بارش کی وجہ سے سی بی آئی کا کوئی کارندہ اس طرف موجود نہ تھا۔ نیپال میں پہنچ کر میں یہ سمجھ بیٹھا کہ میں جنت میں آ گیا ہوں لیکن نیپال میرے لئے جنت نہیں بلکہ اعراف ثابت ہوا جہاں جنت کی ہواؤں کے ساتھ ساتھ جہنم کے شعلوں کی شدید حدت کا بھی مجھے سامنا پڑا۔

بعد دوپہر تک ہم گھومتے پھرتے رہے۔ ہوٹل واپس آ کر ہم نے کھانا کھایا۔ میں آرام کرنے کیلئے بستر میں گھس گیا۔ جبکہ جرمن چرس بھرے سگریٹ پینے کیلئے لابی میں چلا گیا۔ (جاری ہے)

غازی

شام تک میرے کپڑے دھل کر آچکے تھے۔ نو بجے تک جرمن نہ آیا تو میں نے اکیلے کھانا کھایا۔ رات 11 بجے کے بعد جرمن آیا تو اس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ لڑکھڑاتا ہوا وہ اپنے بیڈ پر آ کے ڈھیر ہو گیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ لابی میں بیٹھے کچھ نیپالی سے تیز تر نشے کا کہہ کر اپنے ہمراہ کہیں لے گئے۔ وہاں ایک کمرے میں چھوٹے حلقے کی چلم جیسی کسی چیز میں جس پر آگ رکھ کر بڑا پائپ کے ساتھ جس کا دھواں کھینچا جاتا تھا۔ اسے بہت لطف آیا لیکن پھر حواس ساتھ چھوڑ گئے جب وہ بالکل بے سدھ ہو گیا تو اسے رکشے میں ڈال کر یہاں چھوڑ گئے۔

9 بجے ٹیکسی اور دونوں سپاہی آگئے بارش نہ ہونے کے باوجود میں نے برساتی ٹوپی پہن لی کیونکہ کٹھمنڈو کے راستے میں بھی دو تین چیک پوسٹیں تھیں جہاں سرسری چیکنگ ہوتی تھی۔ ٹیکسی میں، میں فرنٹ سیٹ پر اور جرمن اور سپاہی پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے چیک پوسٹوں سے ہم آسانی سے گزر گئے سڑک گیارہ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ کر پھر ڈھلوان میں ہو جاتی تھی۔ راستے میں ہم کئی جگہ چائے اور خوب صورت مناظر دیکھنے کے لئے رکے ایک جگہ ایک بڑی ٹیلی اسکوپ (دوربین) لگی ہوئی تھی۔ وہاں سے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی صاف دکھائی دیتی تھی۔ غرضیکہ چلتے رکتے ہم شام 7 بجے کٹھمنڈو میں داخل ہوئے۔ جرمن کو میں نے راستے میں ہی اتار دیا اور پاکستانی سفارتخانے کی راہ لی۔ یہ ایک درمیانے درجے کی کوچھی تھی جس کے گیٹ کے اندر پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اپنے ہلالی پرچم کو دیکھ کر میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اس پرچم کی آن کی خاطر میں پرخطر اور سنگناخ وادیوں سے گزرا تھا۔ میں نے اسی پرچم کی خاطر انتہائی خطرناک مشن انجام دیئے تھے۔ اسی پرچم کو شان اور وقار سے لہراتے دیکھنے کے لئے میں نے تھرڈ ڈگری سے بھی زیادہ تشدد برداشت کیا اور نہ زبان کھولی اور نہ ہی آنکھ میں ایک آنسو بھی آنے دیا اور اب اسی پرچم کلہراتے دیکھ کر میرے ضبط کی قوت جواب دے گئی تھی میری آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہ رہے تھے۔ میں دھاڑیں مار کر رو رہا تھا اور میرا دایاں ہاتھ اپنے پرچم کو مسلسل سلامی دے رہا تھا۔ نجانے میں کتنی دیر اسی کیفیت میں رہا کہ سفارت خانے کے بوڑھے چوکیدار نے دروازہ کھولا۔

سفیر صاحب تو مجھے ہوٹل پہنچا کر چلے گئے۔ سیکنڈ فلور پر میرے لئے کمرہ ریزرو تھا۔ ریسپشن پر میں ENTRY کرنے لگا تو اتھری کارڈ پر کمرے کے کرائے کے کالم میں کمرے کا کرایہ اور ادائیگی بدمہ پاکستانی سفارت خانہ درج تھا۔ یہ پہلی غلطی تھی جو سفیر صاحب نے میرے بارے میں کی۔ میں نیپال میں ایک سو یلین پاکستانی مہاجر کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ اپنی مالی حیثیت کے مطابق میں سب سے مہنگے ہوٹل یا سب سے کم کرائے والے گیٹ ہاؤس میں ٹھہرتا لیکن پاکستانی سفارت خانے کی مہمان نوازی کا تحریری ثبوت نیپال میں میری حیثیت کو مشکوک بنانے کے لئے کافی تھا۔ میں نے وہ کارڈ پھاڑ دیا اور دوسرا کارڈ لے کر ادائیگی کے خانے میں 5 ہزار روپے ایڈوانس میں جمع کروائے اور کمرے میں آ گیا۔ دوسرے دن گیارہ بجے میں سفارت خانے گیا تو وہاں حشر کا سماں تھا۔ چار پانچ سو پاکستانی مہاجر سفارت خانے کے کپاؤنڈ اور سڑک پر مختلف گروہوں میں کھڑے سفارت خانے کی بے حسی کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔ میں مختلف گروہوں کے پاس تھوڑی تھوڑی دیر ٹھہرتا ہوا سفارت خانے کی عمارت میں داخل ہونے لگا تو ایک گارڈ نے مجھے زور سے دھکا دیا اور انتہائی کرخنگی سے کہا کہ کس سے ملنا ہے۔ گارڈ کے رویئے سے مجھے بخوبی احساس ہو گیا کہ پاکستانی مہاجروں سے یہاں کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں دھکے سے سنبھل کر پھر گارڈ کے قریب گیا اور ایک زوردار ٹھنڈا اس کی ناف کے نیچے مارا۔ درد کی شدت سے دہرا ہو کر وہ فرس پر گر کر پھڑکنے لگا۔ میرا یہ رویہ اس گارڈ اور وہاں کھڑے دوسرے دو گارڈز کے لئے انتہائی غیر متوقع تھا۔ اپنی شکل و صورت اور قد سے یہ تینوں مغربی پاکستانی لگتے تھے۔ وہ لٹے پٹے بے بس بہاری اور مغربی پاکستانی مہاجروں کو بلاوجہ ڈبل و خوار کرتے تھے۔ مغربی پاکستانی مہاجروں کے تو پاکستان میں اپنے گھر اور عزیز واقارب تھے انہیں صرف پاکستان پہنچانا مقصود تھا۔ اصل بے کس تو بہاری مہاجر تھے جو دوسری مرتبہ بے گھر ہوئے تھے اور پاکستان پہنچنے کے بعد بھی ان کا نہ کوئی گھر تھا اور نہ ہی روزگار انہیں اپنی زندگی کو پھر ابتدا سے شروع کرنا تھا۔ آج بھی بنگلہ دیش میں 4 لاکھ کے قریب پاکستانی بہاری 26 سال سے کمپوں میں کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا صرف یہ تصور ہے کہ وہ پاکستانی ہیں۔ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کی غالباً یہ واحد مثال ہے کہ چار لاکھ انسان ایسے ہیں جن کی کوئی نیشنلٹی نہیں وہ پاکستانی ہیں لیکن پاکستان انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں۔ بنگلہ دیش انہیں اپنی شہرت نہیں دیتا۔ 26 سال میں آدھے تو اپنے "گمشدہ وطن" جانے کی آرزو میں انتقال کر چکے ہیں اور نئی نسل کا وطن ان کے کیمپ اور وطن کی سرحدیں خاردار تاریں ہیں۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ صرف کراچی میں غیر قانونی رہائش پذیر برمی، سری لنکن اور بنگلہ دیشیوں کی تعداد ان پاکستانیوں سے دو چند ہے جو بنگلہ دیش کے کمپوں میں دکھ بھری زندگی کی گھڑیاں گن رہے ہیں اور ان پاکستانیوں کے حال زار پر حکمرانوں اور صاحب اقتدار کے کانوں پر جوں تک نہیں رہتی۔

گارڈ کی بدتمیزی پر اسے ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر ایمپیس کے احاطے میں کھڑے سارے لوگ ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے پڑمردہ چہروں پر اطمینان اور آسودگی سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان سب کی آرزو اور حسرت کو میں نے پورا کر دیا ہے۔ میں ایمپیس کی عمارت میں داخل ہوا تو دوسرے دونوں گارڈ ایک طرف خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ میں میٹرھیاں چڑھ کر سفیر کے پی اے کے کمرے میں گیا۔ اس سے بغیر کوئی بات کئے، اس کی ٹیبل سے ایک کاغذ اٹھا کر اس پر "گزشتہ رات کا مہمان" لکھا اور پی اے کو کہا کہ یہ چٹ سفیر صاحب کو دے دو۔ ملاقاتی چٹ پر یہ انوکھی عبارت پڑھ کر پی اے کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ میں نے غراتے ہوئے خالص فوجی لہجے میں کہا۔ ANY DOUBT ANY QUESTION (کوئی شک کوئی سوال) پی اے جس کے متعلق بعد میں معلوم ہوا کہ ایمپیس کا فرعون ثانی تھا۔ ہرکلاتے ہوئے بولا نومر اور ایمپیسڈ رصاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ تین چار منٹوں میں وہ واپس آیا اور دروازے پر کھڑے ہوئے ہی بولا "آئیے سر ایمپیسڈ رصاحب بلا رہے ہیں"۔ ایمپیسڈ ریز سے پرتپاک طور پر ملاخیریت دریافت کی اردلی کو کافی لانے کا کہا اور پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا "اچھا کیا جو گارڈ کی مرمت کر دی۔ اب اسے تمیز آگئی ہوگی کہ کس کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہئے" میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اسے میرے اس کے کمرے تک پہنچنے سے پہلے ہی گارڈ والے واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔ آج سفارت خانے میں میرا پہلا دن تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ پہلے دن ہی جھگڑا مول لے لوں۔ کافی پینے کے بعد سفیر صاحب نے چایوں کا سربمہر پیکٹ مجھے دیا۔ اس کے ساتھ ایک چار مختلف جگہوں پر لاکھ کی مہریں لگا لگانے بھی تھا۔ میں نے دونوں کی مہریں چیک کر کے وصولی کی رسید پر دستخط کر دیئے۔ سفیر صاحب لفافے میں خط کے مندرجات جاننے کے خواہش مند تھے۔ لیکن میں نے لفافہ حبیب میں رکھ لیا اور پوچھا کہ ڈاک کس روز پاکستان جاتی اور کب آتی ہے پھر جیسے اچانک کچھ یاد آ گیا، سفیر سے پوچھا "آپ نے یہ کیا غضب کر دیا جو ہوٹل میں کرائے اور دوسرے بلوں کی ادائیگی سفارت خانے کے ذمے لکھوادی آپ کو تو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ یہاں سو یلین ریفیو جی کی حیثیت سے آیا ہوں پھر بھلا ایمپیس کو میرے اخراجات ادا کرنے کا تحریری ثبوت دینے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے وہ کارڈ پھاڑا اور نیا کارڈ بھر کر 5 ہزار ایڈوانس ادا کیا ہے۔ آپ نے بلا سوچے سمجھے جو کیا وہ میرے اور سفارت خانے کے حق میں بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا تھا" سفیر صاحب تو اپنی اس حماقت کا انجام سوچ کر گھبرا گئے اور بولے "واقعی مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ آپ یوں کیجئے کہ ہوٹل میں 20 ہزار ایڈوانس جمع کروادیں اور 5 ہزار اپنے خرچ کیلئے رکھیں" یہ کہہ کر اس نے اکاؤنٹ کو کہا کہ 15 ہزار روپے اور سادہ پے منٹ واؤچر لیکر آجائے اکاؤنٹ نے مجھے 15 ہزار روپے دیئے اور 25 ہزار کا واؤچر بنا کر سفیر سے پوچھنے لگا "سر کیا نام لکھوں" اس سے پہلے کہ سفیر جواب دے میں نے کہا کہ UNDER CODE CAT EYES SUSPENCE لکھ دے۔ سفیر صاحب نے نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلا کر ہاں کہا۔ اکاؤنٹ نے واؤچر بھر کر پہلے سفیر کو اور پھر مجھے دستخط کرنے کو دیا۔ میں نے اپنے اصلی نام کے INITIALS لٹے لکھے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے جانے کی اجازت چاہی اور پوچھا کہ کونسا اہم مشن مجھے سونپا گیا ہے۔ سفیر نے مجھے بتایا کہ میرے سربمہر لفافے کے ساتھ ایک خط اسے بھی ملا تھا جس میں لکھا تھا کہ مشن کی تفصیلات میرے لفافے میں موجود ہیں اور میں آپ کے ساتھ پورا تعاون کروں تاکہ مشن بخوبی پورا ہو سکے۔ میں نے جانے کی اجازت چاہی تو سفیر صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے کہ وقت ہو گیا ہے۔ آپ لنچ میرے ساتھ ہی کریں۔ میں آپ کو یہاں کے حالات بتانا چاہتا ہوں۔ لنچ کے بعد میں دفتر نہیں آؤں گا۔ گھر پر ہی باتیں کریں گے۔ وہ تو مجھے اپنی مرسیڈیز 200 میں ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے کہا کہ آپ جائیں آپ کی کوچھی نزدیک ہی ہے۔ میں پیدل آ جاؤں گا۔ آپ کے ساتھ آپ کی گاڑی میں دیکھ کر یہاں پر موجود لوگ نا معلوم مجھے کیا سمجھ بیٹھیں جبکہ میں یہاں ریفیو جی کے COVER میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔

سفیر صاحب کی گاڑی چلی تو میں بھی نیچے اترا آیا۔ ایمپیس کے لان میں کھڑے ریفیو جی مجھے دیکھتے ہی میرے آگے پیچھے ہوئے۔ کئی نے براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر مجھے اپنی پریشانیوں اور سفارت خانے کی بے حسی کے متعلق بتانا شروع کر دیا۔ سفارت خانے کے بیرونی گیٹ پر پہنچ کر میں نے انہیں کہا کہ میں بھی ان کی طرح ریفیو جی ہوں بھارت میں ایک عزیز کے گھریناہ لے کر اب تک چھپا رہا۔ اب حالات کچھ بہتر ہوئے ہیں میں تو پاکستان جانے کے لئے کل ہی کٹھمنڈو پہنچا ہوں۔ (جاری ہے)

غازی

سفیر چونکہ میرے آبائی علاقے کا رہنے والا ہے اس سے رجسٹریشن اور اس سے ملنے میں دقت نہ ہوئی۔ جہاں تک گارڈ کا معاملہ ہے تو اس کی بدتمیزی کے باعث اسے سبق سکھانا پڑا۔ ویسے کچھ قصور آپ لوگوں کا بھی ہے جو سفارتی عملے کو اتنا سرچڑھا رکھا ہے ورنہ سفارت خانے کی چار دیواری کے اندر نیپال نہیں بلکہ پاکستان ہے۔ یہاں پاکستان کا قانون ہے اور سارا سفارتی عملہ آپ کا ہم وطن اور آپ کی خدمت کے لئے ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ اس عملے کو اپنا حاکم سمجھیں یا ان کی اصل حقیقت بتا کر ان سے کام لیں۔ میری اس گفتگو کا شاید ہی کسی پر اثر ہوا ہو۔ پے در پے مصائب اور مشکلات کا شکار یہ ریٹائرمنٹ جی ہزاروں عزیزوں کی قربانی دے کر جب نیپال پہنچے تو ان سے جو سلوک کیا جا رہا تھا۔ اس کے باعث وہ بے جان اور بے حس ہو چکے تھے ان کے لبوں سے شکایتی الفاظ بھی سہمے سہمے سے لگتے تھے میں نے انہیں دلاسا اور حوصلہ دیا اور ہر ممکن مدد کرنے کا وعدہ کر کے ایمپیسڈ ر کے گھر چلا گیا۔ قریب ہونے کے باعث یقیناً بہت سے ریٹائرمنٹ جی نے مجھے ایمپیسڈ ر کے گھر داخل ہوتے دیکھا ہوگا۔ میں نے انہیں سفیر کو اپنے آبائی علاقے کا بتا کر قیاس آرائیوں کو کنٹرول کرنے کی ٹھوس کوشش کی تھی۔ بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ میری کوشش خاصی حد تک کامیاب رہی۔ کھانا حسب معمول پر تکلف تھا کھانے کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ سفیر صاحب نے بتایا کہ کٹھمنڈو میں سقوط ڈھاکہ کے وقت پاکستانی ایمپیسڈ ر بنگالی تھا۔ وہ DEFECTIVE ہو گیا اس نے پاکستانی سفارت خانے پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لگا دیا اور سفارت خانے کے مغربی پاکستانی تمام ملازمین نکال باہر کئے۔ پاکستان کے دنیا بھر کے سفارتخانوں میں پاکستانی وزارت خارجہ اور دوسرے سفارت خانوں سے ٹرانسمیٹر پر رابطے کے لئے ایک ہی کوڈ استعمال ہوتا ہے اور کوڈ ٹوٹ جانے کی صورت میں STAND BY کے طور پر ایک دوسرے کوڈ پر سفارت خانے میں موجود رہتا ہے۔ بنگالی DEFECTOR سفیر نے دونوں کوڈ بکس بھی اپنے قبضے میں کر لیں اور دنیا بھر میں پاکستان کے سفارتی راز کھلی کتاب بن گئے۔ مغربی پاکستانی عملے نے کسمپرسی کی حالت میں ایک کوشھی کرائے پر لے کر اپنا سفارت خانہ قائم کیا اور کئی مہینوں بعد پاکستان نے انہیں نئے ٹرانسمیٹر سیٹ اور نئی کوڈ بکس فراہم کیں۔ تمام سفارت خانوں کو پرانی کوڈ اور ڈی کوڈ بکس ضائع کر کے نئی کوڈ بکس دی گئیں یہاں پاکستان سے نیا عملہ بھیجا گیا۔ اس دوران بنگلہ دیش سے پاکستان جانے کے خواہشمند مہاجرین کا یہاں سیلاب آ گیا۔ UNO نے پاکستان مہاجرین کے لئے دنیا کی سب سے چھوٹی افغان ایئر کے چند چھوٹے جہاز چارٹر کئے اس وقت افغانستان کے بھارت سے بہت قریبی روابط تھے اس لئے افغان ایئر کے جہاز جان بوجھ کر تیل لینے کا عذر کر کے دہلی میں اترتے تھے۔ جہاں بھارتی DMI اور CBI والے جہاز کے اندر جا کر مہاجرین کو چیک کرتے اور کسی پر ذرا سا بھی شک پڑنے پر اسے پاکستانی فوجی کہہ کر اتار لیتے۔ سردیوں میں چار ماہ تو برف باری کا عذر گھڑ کر جہاز آتے ہی نہیں جبکہ نیپال ایئر کے علاوہ دوسری ایئر لائنز کے جہاز بارہ مہینے پرواز کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ شیڈول کے مطابق ہفتے میں ایک بار آنے کے بجائے افغان ایئر کے جہاز تکنیکی خرابی کا بہانہ بنا کر مہینوں نہیں آتے اور جہاز میں سیٹوں کی تعداد سے صرف نصف تعداد لے کر پرواز کرتے ہیں۔ اس بارے میں ان کا کہنا ہے کہ رن وے کے اطراف پہاڑوں کی وجہ سے وہ مقررہ لوڈ سے نصف لوڈ لے کر ہی پرواز کر سکتے ہیں۔ ان کا یہ عذر بھی بالکل بے معنی ہے۔ کیونکہ دوسرے جہاز فل لوڈ کے ساتھ پرواز کرتے ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر نیپال میں پاکستانی مہاجرین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے (جاری ہے)

غازی

اور ہمارا سفارت خانہ اپنے محدود وسائل کی وجہ سے ان مہاجروں کی توقعات پر پورا نہیں اترتا۔ نتیجتاً ہر روز سفارت خانے میں مہاجروں کا ہجوم رہتا ہے۔ سفیر صاحب نے ایسی ہی کچھ تفصیلات بتا کر مجھے پھر لفافہ کھولنے کا کہا۔ طوہاؤ کرہا میں نے لفافہ کھولا تو اس میں ایک بڑے سفید کاغذ کی پیشانی پر انگریزی میں صرف دو ٹائپ شدہ سطریں تھیں۔ CONGRATULATIONS ON YOUR ARRIVAL IN NEPAL WE HOPE YOU HAVE NOT FORGOTTEN YOUR TRAINING (نیپال آمد پر مبارکباد۔ ہمیں امید ہے کہ تم نے اپنی ٹریننگ بھولی نہیں ہوگی) میں نے کاغذ سفیر کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ بھی یہ دو سطریں دیکھ کر حیران ہو گیا کہ ان میں ایسی کیا بات تھی جو لفافہ چار جگہوں پر لاکھ کی مہریں لگا کر بھیجا گیا۔ میں یہ پڑھتے ہی اس کاغذ کی اہمیت سمجھ چکا تھا۔ کاغذ واپس لے کر میں نے حفاظت سے جیب میں رکھ لیا اور تھوڑی دیر بعد سفیر سے اجازت لے کر ہوٹل چلا گیا۔

کمرے میں لگے ہٹ سے میں نے کاغذ کو گرمی پہنچائی تو دونوں طرف حروف ابھرنے لگے اور چند منٹوں میں ہی خفیہ روشنائی سے لکھا ہوا خط کا مکمل مضمون میرے سامنے تھا۔ اس خط میں مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ سفارت خانے کی ”اعلیٰ کارکردگی“ کی تفصیلاً چھان بین کروں اور مفصل رپورٹ بھیجوں۔ مجھے جو مشن سونپا گیا تھا اس کے متعلق مختصراً عرض کرتا ہوں۔ بھارت نے اپنے تربیت یافتہ ایجنٹ مہاجروں کے بھیس میں نیپال بھیج دیئے تھے جن میں سے کئی پاکستان پہنچ کر تخریبانہ کارروائیاں کر رہے تھے۔ مجھے نیپال میں ان بھارتی ایجنٹوں کا پتہ چلانا اور غیر محسوس طریقے سے انہیں ایم بی سی کے ذریعے جلد از جلد پاکستان بھیجنا اور ان کے تفصیلی کوائف پاکستان بذریعہ ڈاک یا ایمر جنسی کی صورت میں ٹرانسمیٹ کروانے تھے۔ خط میں لکھا تھا کہ ٹرانسمیٹر آپریٹر ہی CODE اور ڈی کوڈ کرتا ہے اور ہمارے ہی محکمے کا آدمی ہے۔ میں اس پر پورا بھروسہ کر سکتا اور اپنے پیغامات بھیج سکتا ہوں جس کی ایم بی سی کے کسی دوسرے ملازم کو خبر نہ ہو۔ مشن کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ مشرتی پاکستان سے آنے والے مہاجرین کی بہت کم تعداد سیدھی نیپال آئی تھی۔ تقریباً 90 فیصد مہاجر بھارت میں اپنے عزیز واقارب کے پاس مہینوں بلکہ برسوں قیام کر کے نیپال آئے تھے۔ بھارت میں ان کے قیام کے دوران ان کے میزبانوں کے ہندو ہمسایوں یا دیگر ذرائع سے سی بی آئی والوں کو ان کی بھارت آمد کی اطلاع مل جاتی تھی۔ لہذا سی بی آئی اور پولیس والے ان کے گھر جا دھمکتے، اور میزبانوں کو انہیں پناہ دینے اور مہمانوں کو سفری دستاویزات کے بغیر بھارت داخل ہونے کے جرم میں گرفتار کر لیا جاتا تھا۔ بالآخر فیصلہ یہ ہوتا تھا کہ بھارتی میزبان یہ جرم لکھ کر قبول کریں کہ انہوں نے دشمن ملک کے شہریوں کو بغیر سفری دستاویزات کے جانے بوجھتے غیر قانونی پناہ دی اور مہمانوں کو اس بات پر مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ پاکستان پہنچ کر بھارت کو مطلوبہ اطلاعات اپنے میزبانوں کے توسط سے پہنچائیں۔ بصورت دیگر میزبانوں کے تحریر شدہ اقبال جرم کے تحت انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ پاکستان پہنچنے والے مہاجروں کی خاصی بڑی تعداد بہ امر مجبوری یہ نتیجہ نکل کر رہی تھی۔ پاکستان میں تو ایسے بہت سے لوگ تلاش بسیار کے بعد پکڑے گئے تھے۔ میرے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ مہاجروں میں گھل مل کر ایسے لوگوں کا پتہ چلاؤں جو انڈیا کے PLANTED تھے اور ایم بی سی کے ذریعے انہیں جلد از جلد پاکستان بھیجاؤں۔ نیپال میں تو حکومت پاکستان کا بس نہ چلتا تھا لیکن لاہور ایئر پورٹ پر ایسے PLANTED مہاجروں کے ”استقبال“ کے لئے میرے محکمے کے افراد موجود ہوں گے۔ میں نے اس خط کو اپنے سوٹ کیس میں سنبھال کر رکھ لیا تاکہ اگر سفیر صاحب تعاون سے انکار کریں تو انہیں خط کا یہ حصہ دکھلا سکوں۔ (جاری ہے)

غازی

اگلے روز میں پھر سفارت خانے گیا لیکن عمارت کے اندر جانے کے بجائے لان میں موجود سینکڑوں مہاجروں کے درمیان ہی گھومتا رہا۔ گزشتہ روز گاڑی کی مرمت کا چرچا ہر ایک کی زبان پر تھا۔ ان میں سے بیشتر کا خیال تھا کہ مجھے حکومت پاکستان نے سفارت خانے کی دھاندلیوں کی انکوائری کے لئے بھیجا ہے۔ میں نے انہیں دوبارہ سمجھایا کہ میں بھی ان کی طرح ایک مہاجر ہوں۔ میں نے ان میں سے چند پڑھے لکھے لوگوں کو چنا اور انہیں کہا کہ مجھے شام 5 بجے اپنا پورنا ہوٹل میں ملیں تو باہم صلاح و مشورہ کر کے بہتری کی کوئی تدبیر کرتے ہیں۔

شام 5 بجے میں لابی میں آیا تو ان لوگوں کے علاوہ میں چالیس مہاجر ہوٹل کے وسیع لان میں کھڑے تھے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ باوجود ہزار منع کرنے کے یہ آپ سے ملنے چلے آئے ہیں۔ سردی سے ٹھٹھرتے میلے کھیلے کپڑوں میں ملبوس ان مہاجروں کو ہوٹل کی انتظامیہ لابی میں بھی داخل نہ ہونے دیتی۔ نسبتاً بہتر لباس میں لابی میں بیٹھے مہاجروں سے میں نے پوچھا کہ کیا کوئی ایسا ہوٹل یا ریسٹورنٹ ہے جہاں ہم سب چائے پی سکیں۔ انہوں نے بتایا کہ شیر پنجاب نامی ایک سکھ کار ریسٹورنٹ ہے۔ وہاں جگہ بھی کافی ہے اور وہ مہاجر دوست بھی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ ان سب کو اپنے ساتھ لے کر وہاں چلیں۔ میں بھی ان کے پیچھے ہی وہاں پہنچتا ہوں۔ وہ سب شیر پنجاب کو چلے اور تھوڑی دیر بعد میں نے رکشہ پکڑا دھر کی راہ لی۔ ہم تقریباً ساتھ ساتھ ہی اس ریسٹورنٹ میں پہنچے۔ ریسٹورنٹ کا مالک خود ہی گدی پر بیٹھا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور پنجابی میں کہا کہ میرے ان مہمانوں کو چائے اور کیک رس دیں۔ مجھے پنجابی بولتے دیکھ کر وہ گدی سے اٹھ کر نیچے آیا اور بڑی بے تکلفی سے مجھے گلے لگاتے ہوئے بولا۔ ”بلے بلے آج تے شیر پنجاب وچ پنجاب دا شیر آیا ہو یا ہے۔“

سردار جی کی یہ بے تکلفی صرف پنجابی زبان بولنے کی وجہ سے تھی، وہ غالباً اپنی مادری زبان بولنے اور سننے کو ترسا ہوا تھا۔ ورنہ اسے میری اصلیت کا ہرگز علم نہ تھا۔ میرے چائے کے آرڈر دینے پر اس نے ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے لڑکوں کو سارے ٹیبل اور کرسیاں صاف کرنے اور مہمانوں کو چائے اور کیک رس پیش کرنے کا حکم دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں پاکستانی مسلم اور سابقہ مشرقی پاکستان سے جان بچا کر بھارت میں کئی برس چھپتا چھپاتا یہاں پہنچا ہوں۔ سردار جی مسکراتے ہوئے میری بات سنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو بولے ”بادشاہو! ساڈے کولوں اصلی گل نہ چھپاؤ، سن سب پتہ ہے تسی کون او، میں چھ مہینے جالندھر رہ کر ہنی واپس آیاں ہاں، تے او اخباروی نال لایاں آں جس وچ تو ہاڈی فوٹو چھپی ہے۔ تسی نے پنجابیاں داناں روشن کردتاے“ میں نے سردار جی کو کہا ”واہگودے واسے چپ کرتے ہوئے بولو، میں پن دی دشمنان وچ پھسیا ہو ہاں آں“ سردار جی خوشی سے بے حال ہو رہے تھے کہنے لگے کہ تمہارا راز صرف مجھ تک ہی رہے گا اور میری کرپان تمہارے دشمنوں کا سرتار دیگی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سردار جی جذبات سے بے قابو ہو کر وہیں کرپان نکال کر اسے ہوا میں ہرانے نہ لگ جائیں۔ میں نے انہیں سمجھا بھجا کر گدی پر بیٹھنے کو کہا تو وہ کہنے لگے کہ پہلے میرے ساتھ کچن میں چلو، میں مجبوراً ان کے ساتھ ہولیا۔ کچن میں انہوں نے زندہ مرغوں کے ڈرے سے ایک مرغ ناکالا اور چھری میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ اسے ذبح کروں۔ میں نے مرغ ذبح کیا تو انہوں نے کہا کہ اب میں اسے آپ کیلئے روٹ کروں گا۔ سارے بھارت اور نیپال میں مسلمانوں کے طریقے سے ذبح جانور کا گوشت نہیں ملتا۔ اسے آپ

(جاری ہے) اگلے صفحے پر جانے کے لئے یہاں کلک کریں

غازی

اس کے دیئے ہوئے دن اور وقت کے مطابق بذریعہ جہاز حاجیستان کا ایک آدمی جس نے مجھے بمبئی میں بخوبی دیکھا ہوا تھا ہوٹل آیا اور پچاس لاکھ روپے مجھے دیتے ہوئے بتایا کہ تمیں لاکھ حاجیستان اور بیس لاکھ یوسف ٹیل نے بھیجے ہیں۔ وہ جلدی میں تھا کیونکہ اسے جہاز سے واپس بمبئی جانا تھا۔ ان دونوں کے خطوط بھی تھے جن میں اور باتوں کے علاوہ یہ تحریر تھا کہ اگر مزید ضرورت ہو تو فون کر دیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ حاجیستان اور یوسف ٹیل مجھے گیارہ بجے رات کے لگ بھگ فون کریں گے۔ رات کو ان دونوں کی مجھ سے فون پر بات ہوئی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہوں نے مزید امدادی رقم بھیجنے کا وعدہ کیا۔ اب میرے پاس اتنی رقم تھی کہ میں کھلے ہاتھ سے امدادی کام شروع کر سکتا تھا اور مہاجرین سے اپنے مشن کیلئے معلومات بھی باآسانی حاصل کر سکتا تھا۔ آئندہ دو تین دن ضرورت مند مہاجروں کی فہرستیں تیار کرنے میں لگ گئے۔ ان فہرستوں میں کھٹمنڈو میں مقیم سب مہاجروں کے نام درج نہیں تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ دوسو سے زیادہ ایسے مہاجر کنبے ہیں جو فارغ البال ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ مجھے ان مہاجروں کے محلے داروں یا کم از کم اسی شہر کے رہنے والوں اور یہاں پر ان سے زیادہ ربط ضبط رکھنے والوں سے ملنا ہے۔ فہرست بنانے والوں نے کہا کہ وہ دو تین روز میں ان مطلوبہ لوگوں سے مجھے ملا دیں گے۔ اگلے روز میں سفارت خانے گیا۔ وہاں گیٹ کے دونوں اطراف میری ہدایت پر فہرست بنانے والے مہاجروں نے دو بڑے گتوں پر چلی حروف میں یہ لکھوا کر لٹکا دیا تھا کہ مالی امداد، ادویات اور کپڑوں کے ضرورت مند فہرست میں اپنا نام پتہ اور رجسٹریشن نمبر درج کروائیں۔ تصدیق کے فوری بعد ان کی ضرورت پوری کر دی جائے گی۔ فہرست میں دھڑا دھڑا نام درج ہو رہے تھے۔ میرے منع کرنے کے باوجود فہرست تیار کرنے والوں نے مجھے اٹھ کر سلام کیا۔ میں آئیمپسی میں داخل ہونے لگا تو مجھ سے مار کھائے ہوئے گارڈ سمیت سب گارڈز نے مجھے سیلوٹ کیا۔ سفیر کے پی اے کے پاس گیا تو اس نے اٹھ کر خیر مقدم کیا اور سفیر کو میری آمد کی اطلاع دی۔ سفیر نے مجھے فوری بلوایا۔ اس کے پاس فرسٹ اور سیکنڈ سیکریٹری بیٹھے ہوئے تھے سفیر نے ان سے میرا بحیثیت مہاجر تعارف کروایا۔ یہ محض مجھے دکھانے کیلئے تھا مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گارڈ کو مارنے والے روز ہی سفیر نے انہیں میری اصلیت بتا دی تھی۔ سفیر تو خاموش بیٹھا رہا لیکن سیکنڈ سیکریٹری جس کا اصل عہدہ میں بوجہ نہیں بتا سکتا، بولا "یہ کیا تماشہ ہو رہا ہے، اس روز تم نے گارڈ کو مارا اور آج مہاجروں کو امداد دینے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ یہ آئیمپسی کے کاموں میں صریحاً دخل اندازی ہے" میں نے جواب دیا کہ گارڈ کو تو میں نے اس کی بدتمیزی پر مارا ہے اور جو بھی بدتمیزی کرے گا اس کا بلا تخصیص براہ کسر کروں گا۔ جہاں تک مہاجروں کی امداد کا سوال ہے، تو امداد دینے والے کا نام کہیں بھی نہیں لکھا ہے لیکن درحقیقت چند مخیر لوگ میری وساطت سے یہ امداد کر رہے ہیں۔

سیکنڈ سیکریٹری بولا "وہ مخیر لوگ آئیمپسی کی معرفت امداد کیوں نہیں دیتے؟" میں نے جواب دیا کہ اس سوال کا جواب تو ان سے ہی پوچھو تو بہتر ہے۔ ویسے میری اطلاع کے مطابق آئیمپسی کو مہاجروں کیلئے پہنچنے والی امداد سیدھی کھٹمنڈو کے بازاروں میں پہنچ جاتی ہے۔ میری یہ بات سنتے ہی فرسٹ اینڈ سیکنڈ سیکریٹری اس الزام کی پر زور تائید کرنے لگے ان کی آواز میں کبھی کبھی سفیر کی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی۔ جب وہ ذرا خاموش ہوئے تو میں نے تینوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اب تک آئیمپسی میں جو بھی دھاندلیاں ہوئی ہیں میں نے ان کے ٹھوس ثبوت حاصل کر لئے ہیں۔ سیکنڈ سیکریٹری جو زیادہ ہی جوشیلا دکھائی دیتا تھا۔ کہنے لگا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم کہاں بیٹھے ہو اور میں کون ہوں؟" میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "میں پاکستانی سفارت خانے یعنی پاکستانی سرزمین میں بیٹھا ہوں اور تم جس محکمے سے سفارشوں کے ذریعے سفارت خانے میں آئے ہو اسے بھی بخوبی جانتا ہوں اور تمہارے یہاں پر بھی جو ذاتی کثوت ہیں ان سے بھی بخوبی واقف ہوں۔ (جاری ہے)

غازی

اور ان سب کی رپورٹ اپنی پہلی ڈاک میں پاکستان بھجواؤں گا اور تمہیں میں چیلنج کرتا ہوں کہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہوں تو بگاڑ لو۔ یہ کہہ کر میں اٹھا اور دروازے کو اتنے زور سے بند کیا کہ اندر بیٹھے تینوں کرسیوں سے اچھل پڑے ہوں گے۔

میرے تلخ رویے اور ایمپسڈ کی سیاست کے باعث یا کسی نامعلوم وجہ سے یہ دونوں سیکریٹری شام کو میرے ہوٹل پہنچ گئے۔ لابی میں مجھے ملنے کیلئے چند مہاجر بھی بیٹھے تھے۔ میں نے مہاجروں کو پہلے Attend کیا اور قریباً ایک گھنٹہ ان کے ہمراہ رہا۔ اس دوران دونوں سیکریٹری بار بار اپنی گھڑیاں اور مجھے مہاجروں سے جو گفتگو دیکھتے رہے۔ میں نے ان کیلئے کافی بھجوا دی تھی۔ مہاجروں سے فارغ ہو کر میں ان کے پاس آیا تو دونوں اٹھ کر مجھ سے ملے اور بغیر وقت لئے آنے کی معذرت چاہی۔ قصہ مختصر ان کے آنے کی وجہ دن کو سفیر کے کمرے میں ہونے والی تلخ گفتگو کو بھلا دینے اور آئندہ میرے ساتھ پورے تعاون کا وعدہ تھا۔ میں نے انہیں صاف کہہ دیا کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے نہ تو ان کے درشت رویے کو کوئی اہمیت دی ہے اور نہ ہی کوئی اثر لیا ہے۔ جہاں تک مہاجروں کیلئے آنے والے سامان کی خورد برد اور بازار میں فروختگی کا سوال ہے تو اس کے متعلق تفصیلی رپورٹ میں نے بہر حال اپنی ڈاک میں بھیجی ہے۔ سامان کی فروختگی اور مہاجروں میں تقسیم نہ ہونے کے ثبوت میرے پاس ہیں۔ اگر آپ فوری تفتیش کر کے خورد برد کرنے والوں کے نام اور تحقیقاتی رپورٹ مجھے دیں تو وہ بھی میں اپنی ڈاک میں بھیج دوں گا۔ دو روز بعد ان دونوں نے مجھے اپنی تحقیقاتی رپورٹ اور دو گارڈز اور چوکیدار کے نام دیئے جو ان کی تفتیش کے مطابق سامان بیچنے اور خورد برد کے ذمہ دار تھے۔ میں نے اپنی تفصیلی رپورٹ پورے ایک ہزار مہاجروں کے دستخطوں اور رجسٹریشن نمبروں کے ساتھ بھیجی۔ ساتھ ہی دونوں سیکریٹریوں کی رپورٹ پر اپنے Comments میں لکھا کہ اگر صرف گارڈز اور چوکیدار ہی چوری میں ملوث تھے تو آج سے پہلے مال کی گمشدگی اور چوری کی تفتیش کیوں نہ کی گئی۔ UNO کے کھٹمنڈو کے دفتر سے سفارت خانے کے سامان وصول کرنے کی رسید کی کاپی بھی میں نے اپنی رپورٹ کے ساتھ تھی کر دی تھی میں نے اپنے Comments کے آخر میں لکھا کہ ایک بچہ بھی اس نتیجے پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے کہ خورد برد میں گارڈز اور چوکیدار نہیں بلکہ اوپر والے ملوث ہیں۔ بہر حال میرا کام صرف رپورٹ بھیجنا ہے۔ فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔ 20 ہزار کمبلوں کی فروخت کا بھی تفصیلی ذکر کیا۔

میں نے اپنی ڈاک کے مخصوص تھیلے کو بند کر کے تالا لگایا اور اسے اپنے سامنے سفارتی ڈاک کے تھیلے میں رکھوا کر سفارت خانے میں بیٹھا رہا جب سفارت خانے کی گاڑی ڈاک لیکر ایئر پورٹ جانے لگی تو میں ایئر پورٹ جانے کا بہانہ کر کے اسی گاڑی میں ایئر پورٹ پہنچا اور اپنے سامنے ڈاک کارگو سیکشن کے حوالے کروائی۔ بھارتیوں سے تو خیر کی توقع ہی عبث تھی لیکن انہوں نے کارو یہ دیکھ کر میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ ایئر پورٹ سے واپسی پر میں اپنے ہوٹل چلا گیا جہاں مہاجروں کے علاوہ ایمپسی کا وائز لیس آپریٹر بھی ایک کونے میں

بیٹھا میرا منتظر تھا۔

(جاری ہے)

غازی

یہ وہی شخص تھا جس کے متعلق میرے محکمے نے خفیہ خط میں 'اپنا آدمی' ہونے کا لکھا تھا۔ میں اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچھ رسمی گفتگو کے بعد میں نے اسے محکمے کا خفیہ خط دکھایا۔ خط دیکھنے کے بعد تو وہ پھٹ پڑا اور اس نے مجھے میرے خلاف ہونے والی اپنوں کی دو ایسی خفیہ سازشوں کا بتایا کہ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس نے بتایا کہ سفیر صاحب نے ایک پیغام وزارت خارجہ کو ٹرانسمیٹ کروایا ہے کہ میں سفارت خانے کے سرکاری کاموں میں رخصت اندازی کر رہا ہوں اور مہاجروں کو سفارت خانے پر حملہ کرنے اور سفارتی نمائندوں کو ہلاک کرنے کی ترغیب دے رہا ہوں جس کیلئے بھارت سے بہت سارے روپے بھی لایا ہوں اور مہاجروں میں تقسیم کر کے انہیں اپنا ہم نوا بنا رہا ہوں۔ سفیر نے سوالیہ نشان کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ بھارتی حکومت نے مجھے یہ روپیہ اس کام کیلئے دیا ہو۔ دوسری سازش یہ ہے کہ سفیر نے دو نیپالی جرائم پیشہ افراد کو گھر پر بلا کر کچھ ہدایات دی ہیں۔ ہدایات کیا ہیں اس کا تو علم نہیں لیکن آج جب آپ سفارتی ڈاک والی گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو ان دونوں نیپالیوں نے سیکنڈ سیکریٹری کے کمرے سے نکل کر آپ کی خفیہ طور پر تصویریں اتاری تھیں۔ انہیں تصویریں اتارتے میں نے خود دیکھا ہے چونکہ آپ کے متعلق مجھے محکمے سے ہدایات مل چکی ہیں اس لئے میں آپ کو ان باتوں سے آگاہ کرنے کیلئے چلا آیا میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے ہوٹل کی پچھلی جانب سے واپس بھیج دیا۔ نیپالی جرائم پیشہ افراد سے سفیر کا ملنا اور میری تصویریں اتارنے کا مقصد واضح تھا کہ مجھے بے خبری میں ہلاک کر دیا جائے۔ اپنی دھاندلیوں پر پردہ ڈالنے کیلئے سفیر کو صرف یہی رسوا نظر آیا تھا کہ مجھے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ان سازشوں کی تفصیلی رپورٹ پاکستان ٹرانسمیٹ کروادوں لیکن فوراً ہی دوسری سوچ آئی کہ سفارت خانے کے ٹرانسمیٹ کا رابطہ صرف پاکستانی وزارت خارجہ سے تھا اور وزارت خارجہ سے ہو کر ہی میرے محکمے سے متعلقہ رپورٹس میرے محکمے کو بھیجی جاتی تھیں۔ براہ راست محکمے سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ اگلی ڈاک جانے میں بہت دن پڑے تھے۔ میں اپنے اور انجانے دشمنوں میں گھر چکا تھا۔ جب دنیاوی کوئی راستہ نظر نہ آئے تو انسان رب جلیل سے رجوع کرتا ہے جو ہر شے کا مالک اور خالق ہے اور ہر شے پر قادر ہے۔ اسی ذات پاک کی رحمت پر پورا یقین انسان کو بڑی سے بڑی مصیبت سے نکال دیتا ہے میں نے بھی اپنے خالق حقیقی سے مدد مانگی اور ان مشکلات کا خود ہی سامنا کرنا فیصلہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری بھیجی گئی رپورٹس کی روشنی میں میرا محکمہ میرے خلاف سفیر کی رپورٹ کو جیتھڑے سے زیادہ اہمیت نہ دے گا۔ بہر حال میں اب چونکہ رہنے لگا کہ ہمیشہ تین چار ہمدرد مہاجروں کے ساتھ ہی باہر نکلتا۔ سفارت خانے جانا بھی میں نے بہت کم کر دیا۔

غداروں سے دو دو ہاتھ

آئندہ چند روز میں مجھے نہ صرف ان مہاجروں کی لسٹ مل گئی جو مالی اعتبار سے مستحکم تھے اور بعض ضرورت مند مہاجروں کی خاطر خواہ امداد بھی کرتے تھے بلکہ ان کے قدیم جاننے والے مہاجروں سے بھی رابطہ ہو گیا انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ان مہاجروں میں سے کچھ تو سابقہ مشرقی پاکستان میں بھی صاحب حیثیت تھے اور فرار خ دلی سے ضرورت مندوں کی امداد کرتے تھے۔ 25 مارچ 71ء سے پہلے اور بعد میں خانہ جنگی کے دوران انہوں نے بہت سے بہاری اور پاکستانی مہاجروں کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ ان میں سے ایک شاہی مرزا بھی تھے جو آج کل پاکستان میں ٹی وی ڈراموں میں کام کرتے ہیں یہ اپنے ہمراہ جو کچھ بھی نیپال لاسکے وہ انہوں نے باوجود کثیر الاولاد ہونے کے ضرورت مندوں میں بانٹ دیا تھا۔ کچھ مہاجر ایسے تھے جن کے سابقہ جاننے والوں نے بتایا کہ مشرقی پاکستان میں ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی لیکن نیپال پہنچنے کے بعد وہ اچھے مکانوں میں رہتے اور کھلا خرچ کرتے تھے۔ ان لوگوں نے نیپال میں ضرورت مند مہاجروں کے اپنے اپنے حلقے بنا رکھے تھے جن کے ساتھ کم و بیش ہر روز محفلیں جمتی تھیں۔ ان فارغ البال مہاجروں کی تیسری قسم وہ تھی جنہیں سابقہ مشرقی پاکستان (ان کے بتائے ہوئے ایڈریس کے مطابق) کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے شہر، محلے اور گلی میں رہنے والوں کیلئے بھی وہ بالکل اجنبی تھے۔ سفارت خانے سے مجھے رجسٹرڈ مہاجرین کی فہرستیں مل چکی تھیں۔ ان کے علاوہ مہاجروں نے بھی اپنے طور پر مکمل فہرست تیار کی ہوئی تھی۔ دونوں فہرستوں میں ان تیسری قسم کے مہاجروں کے مکمل کوائف اور پتے درج تھے لیکن ان کو جاننے اور پہچاننے والا کوئی نہ تھا۔ ایک بڑی ہی عجیب بات یہ تھی کہ ان تیسری قسم کے مہاجروں کے کوئی افراد خانہ نہ تھے۔ بقول ان کے ان کے گھر والے تو مشرقی پاکستان میں فسادات کے دوران مارے گئے یا سقوط ڈھاکہ کے بعد کیتی باہنی کے ہاتھوں شہید ہوئے اور وہ بالکل اکیلے نیپال پہنچے تھے۔ مجھے سوچنے کے مطابق میری سب سے زیادہ 'دلچسپی' ان مہاجروں میں تھی۔ اس مشن کیلئے میں نہ تو سفارت خانے کے ارکان کو اعتماد میں لے سکتا تھا اور نہ ہی کسی اور پر اندھا بھروسہ کر سکتا تھا۔ میں نے اس کا حل یہ ڈھونڈا کہ روزانہ پانچ چھ ایسے مہاجروں کو ملنے اور اپنے ہمراہ ان کے شہر، محلے اور گلی میں رہنے والوں کو ساتھ لے جانے کا پروگرام بنایا تاکہ ان کی اصلیت معلوم ہو سکے۔ پہلے روز ہم اللہ کا نام لے کر ایسے مہاجر کے گھر گئے جس نے خود کو کھلنا میں سلیم ہوٹل سے ملی ہوئی عمارت کا رہائشی بتایا تھا۔ میرے ہمراہ کھلنا کے تین مدبر مہاجر تھے۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو اس نے بڑی رکھائی سے ہم سے بات کی۔ اس نے تین چار کمروں پر مشتمل گھر کرائے پر لے رکھا تھا اور اس کا فرشی ڈرائنگ روم خوب آراستہ تھا۔ میں نے اسے اپنی آمد کا یہ سبب بتایا کہ میرے ہمراہی مہاجر مجھ سے بطور قرض کچھ رقم لینا چاہتے ہیں۔ چونکہ آپ بھی کھلنا کے رہائشی ہیں۔ اس لئے اگر آپ ان کی تصدیق کر دیں تو میں انہیں رقم قرض دے دوں۔ اس مہاجر کا مجھے دیکھتے ہی رنگ توفیق ہو چکا تھا لیکن اس نے خود پر قابو پائے رکھا اس نے تصدیق کرنے سے انکار کر دیا تو میں نے کہا کہ کھلنا تو میں کبھی گیا نہیں آپ صرف اتنا بتا دیں کہ جو ایڈریس یہ بتا رہے ہیں وہ درست بھی ہے یا نہیں۔

(جاری ہے)

غازی

ان مہاجروں کو میں نے جیسے کہا تھا، انہوں نے اپنے ایڈریس اور محلہ، گلی وغیرہ وہ بتائے جو کھلنا میں موجود ہی نہ تھے۔ صاحب خانہ نے بڑی بے رخی سے یہ ایڈریس سنے اور کہا کہ ہاں ٹھیک ہے ٹھیک ہے اب آپ جائیں۔ میں نے اس کے رویے پر کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے اس سے پوچھا کہ آپ کا کھلنا میں کیا کام تھا اور آپ تو ریکارڈ کے مطابق سلیم ہوٹل سے ملحقہ بلڈنگ میں رہتے تھے۔ اس بلڈنگ کے مالک کا کیا نام تھا۔ میرے سوالات سن کر تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور ہمیں فوراً گھر سے نکل جانے کا کہا۔ میرے ساتھ آئے ہوئے مہاجروں کے بھی رنگ اڑے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرا ارادہ سمجھ سکتا، میں نے اسے گردن سے پکڑ کر فرش پر گرا دیا۔ میں نے اس کی گردن ایسے طریقے سے پکڑی تھی کہ اسکے منہ سے سوائے خرخر کے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ مجھے اس پر شک تو پورا تھا لیکن اسے یقین میں بدلنے کیلئے میں نے پھل نکالا اور اس کے سینے پر رکھ کر اپنے ساتھی مہاجروں کو کہا کہ اس کا لباس اتار کر مسلمان ہونے کی تصدیق کریں۔ وہ غیر مسلم نکلا۔ میں نے اس کے ہاتھ پاؤں بندھوا دیئے اور کہا کہ اب شرافت سے اپنی حقیقت بتاؤ گے یا میں دوسرا طریقہ استعمال کروں۔ اس کا راز کھل چکا تھا وہ ادھر ادھر کی ہانکنے لگا لیکن دو تین تھپڑ کھاتے ہی سیدھے راستے پر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کلکتے کا رہنے والا سویلین اور کتی یا ہنی میں شامل رہا ہے۔ مشرقی پاکستان میں تخریبی کارروائیوں میں پاک فوج کے زیر استعمال رہنے والے پل اڑانے میں اس کا نمایاں کردار تھا کیونکہ وہ ہوڑا برج کلکتہ کے نزدیک بارود بنانے کی فیکٹری میں کام کرتا رہا ہے۔ اس کا نیپال آنے کا مقصد پاکستان جانا نہیں بلکہ یہاں سے مہاجروں کی ایک ٹیم تیار کرنا ہے جو پاکستان جا کے تخریبی کارروائیاں کر سکے۔ قارئین یقیناً سوچتے ہوں گے کہ اتنی آسانی سے اس نے اپنے راز کیسے اگل دیئے۔ اس کی وجہ (اول) یہ تھی کہ ہم دونوں ایک نیوٹرل ملک میں تھے جہاں دشمن ہونے کے باوجود قانونی طور پر ایک دوسرے کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے (دوئم) اسے میری اصلیت کا علم نہ تھا۔ میرے نیپال آنے سے بہت پہلے سے وہ اپنی کارروائیوں میں مصروف تھا۔ اس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اس کے علاوہ آٹھ اور بھارتی مہاجروں کے بھی میں یہاں موجود ہیں اور اپنے اپنے فیلڈ میں پاکستان کے خلاف مہاجروں کو Plant کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ سب کچھ بتا کر اس نے اسی کرخت لہجے میں مجھے کہا کہ تم چاہے کوئی بھی ہو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہو کہ اپنی ایمپسی کو ہمارے متعلق بتا کر ہماری رجسٹریشن ختم کروادو۔ ایسی صورت میں بھی ہم جتنا عرصہ چاہیں، نیپال میں رہ سکتے ہیں۔

وہ اپنی بکواس کئے جا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے اور اس جیسے آٹھ دوسرے بھارتیوں کو زندہ چھوڑ دینا ہمارے لئے کتنا خطرناک ہوگا۔ یہاں پر حاجی مستان اور یوسف پنیل جیسے دہنگ دوست بھی نہ تھے جو میرے مددگار ثابت ہوتے۔ ان کم بختوں نے یہاں مہاجروں کی کسمپرسی سے فائدہ اٹھا کر یقیناً بہت سوں کو اپنا ہم نوا بنا لیا ہوگا۔ میں تو اپنے ساتھ آنے والے مہاجروں پر بھی پورا اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو مار دینے کے بعد اس کی لاش کو ٹھکانے لگانا بھی بڑا دشوار تھا۔ نہ تو کھٹمنڈو بڑا شہر تھا اور نہ ہی میرے پاس اپنی یا کسی ہمدرد کی گاڑی تھی۔

(جاری ہے)

غازی

سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کے بقول آٹھ اور بھارتی یہاں پاکستان دشمن سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ سوچ سمجھ کر میں نے ایک فیصلہ کیا۔ عام حالات میں یہ ایک انتہائی کمزور پلان تھا لیکن حالات کے تقاضے کے مطابق مجھے فوری طور پر اس سے بہتر کوئی تجویز سمجھ میں نہ آئی۔

میں نے اپنے ساتھ آنے والے تینوں مہاجروں کو رخصت کیا اور سختی سے ہدایت کی کہ کسی سے بھی حتیٰ کہ اپنے گھر والوں کو بھی یہاں آنے کا نہ بتائیں۔ میں نے سارا پلان پہاڑی کونسل سے بھری اس انگیٹھی کو دیکھ کر بنایا تھا جو مکتی باہنی کے اس کارکن کے فرشی ڈرائنگ روم میں پڑی تھی۔ کھٹنڈو کی ہڈیوں میں جم جانے والی سردی میں کونسل کی انگیٹھی جلانے کا رواج عام تھا۔ میں نے وہ دکتی انگیٹھی اٹھا کر اس کے سونے کے کمرے میں رکھی جہاں ویسی ہی ایک ان جلی انگیٹھی پڑی تھی جسے اٹھا کر میں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ مکتی باہنی کا یہ ایجنٹ سابقہ مشرقی پاکستان میں اپنی کامیابی، پاکستان کے دوخت ہونے اور نوے ہزار پاکستانی افواج کے بھارتی قیدی بننے کے زعم میں ابھی بھی بے خوف نظروں سے مجھے دیکھتا اور دھمکا رہا تھا۔ پاکستان میں ٹریننگ کے دوران مجھے گردن کی مخصوص نسوں کو دبا کر ہلاک کرنے کی ٹریننگ دی گئی تھی لیکن یہ ٹریننگ صرف چارٹوں سے ان نسوں کو دکھانے اور دبانے کے طریقے بتانے تک محدود تھی میں ہاتھوں پیروں بندھے اس ایجنٹ کے سینے پر بیٹھ گیا اور ٹٹول کر ان نسوں کو اپنے دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے اور انگشت شہادت سے زور سے دبایا۔ دو منٹ تک اسی کیفیت میں رہنے کے بعد میں نے اس کی گردن سے ہاتھ اٹھائے تو اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ کافی دیر میں اسی حالت میں اس کے سینے پر سوار بیٹھا رہا۔ ہر لمحے مجھے یہی شک گزرتا کہ وہ ابھی سانس لے گا یا حرکت کرے گا لیکن وہ تو واقعی مر چکا تھا۔ میں نے مزید تسلی کیلئے اس کی نبض ٹٹولی۔ اسی کمرے میں پڑا ایک آئینہ اس کے نتھنوں کے ساتھ لگائے رکھا۔ جب اس میں زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے تو میں نے اسکے ہاتھ اور پاؤں کھولے۔ اسے اٹھا کر اس کے کمرے میں لے جا کر پلنگ پر ڈال دیا جلتی انگیٹھی جس کا زہریلا دھواں کمرے میں پھیل رہا تھا اس کے پلنگ کے قریب رکھی۔ اس کے دو سوٹ کیسوں کی تلاشی لی۔ جن سے مجھے اس کا بھارتی حکومت کا جاری کردہ شناختی کارڈ اور ہندی میں ٹائپ شدہ کچھ کاغذات ملے۔ پلنگ پر پڑے دو کمبل میں نے اس کے اوپر ڈالے اور بتی بجھا کر دروازہ اچھی طرح سے بند کر دیا۔ ڈرائنگ روم میں آ کر اس کی بتی بجھائی۔ باہر کا دروازہ کھول کر اچھی طرح سے دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ رہا ہو۔ پوری تسلی کے بعد میں نے باہر آ کر دروازہ بند کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس گھر سے خاصا دور نکل آیا اور ایک رکشہ لے کر اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی آسانی سے اس دشمن ملک کو میں نے واصل جہنم کر دیا ہے۔

دوسرے روز دوپہر کے قریب میں سفارت خانے پہنچا تو وہاں ہر طرف ایک ہی بات ہو رہی تھی کہ ایک مہاجر پتھر یلے کونسل کے زہریلے دھویں سے گزشتہ رات ہلاک ہو گیا۔ اسے غسل دینے والوں کو بھی اس کے غیر مسلم ہونے کا پتہ نہ چلا۔ بعد دوپہر جب بہت سے مہاجر اس کی نماز جنازہ میں شریک ہوئے اور شہر سے دور قبرستان میں اسے دفنا دیا گیا شام کو ہوٹل میں روزمرہ کے ملاقاتی مہاجروں کے بعد گزشتہ شام والے تینوں مہاجر بھی ملنے آئے۔ ان تینوں کو اس ایجنٹ کی موت کی وجوہات کا تو علم تھا لیکن وہ یہ نہ جان سکے کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی۔ نہ تو انہوں نے اس کی موت کا تذکرہ کیا اور نہ ہی میں نے کوئی بات چھیڑی۔ اگلے روز سے میں نے فی مہاجر کنبہ ایک ہزار روپیہ دینے کا پروگرام بنایا تھا۔ میں نے ان تینوں کو 3 ہزار روپے دیئے اور کہا کہ وہ اس کام میں میری مدد کریں۔ فہرستیں میرے پاس تھیں اور روپیہ لینے کیلئے مہاجرین نے مجھے رجسٹریشن نمبر دکھانے تھے۔ ان کو رخصت کر کے میں لباس تبدیل کرنے ہی والا تھا کہ ریسپشن سے فون آیا کہ ایک آدمی آپ سے ملنے کیلئے بضد ہے اور کہتا ہے کہ اگر آپ ابھی نہ ملے تو وہ ساری رات لابی میں بیٹھا رہے گا۔ میں لابی میں آیا تو اس سے پہلے کہ ریسپشن والے مجھے بتاتے ایک آدمی لپکتا ہوا میرے پاس آیا۔ اور بولا "جناب میں نے آپ کو اس وقت ملنے کی تکلیف دی ہے۔"

(جاری ہے)

غازی

میں چٹا گانگ (سابقہ مشرقی پاکستان کا ایک شہر) کا رہنے والا ہوں۔ ریلوے میں گڈز کلرک تھا۔ 25 مارچ 71ء کے فوری بعد میں البدر میں شامل ہو گیا اور افواج پاکستان کے شانہ بشانہ خدایوں سے لڑتا رہا سقوط ڈھاکہ کے بعد جب ہم بالکل بے آسرا رہ گئے تو پاکستان کے خدایوں اور ملتی باہنی والوں نے میرے سامنے میرے تین بچوں، بیوی اور والدہ کو شہید کر دیا اور مجھے اذیتیں دے کر دو گولیاں ماریں اور مردہ سمجھ کر چلے گئے۔ مجھے جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ ایک محب وطن بنگالی مجھے اپنے گھر اٹھالایا تھا۔ مجھ میں زندگی کی کچھ رمت باقی تھی۔ اس نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی اور خفیہ طور پر میرا علاج کرتا رہا۔ دو برس کے علاج کے بعد میں اس قابل ہوا کہ چل پھر سکوں۔ ہم دونوں ریلوے کالونی میں رہتے تھے اور دوست تھے۔

اس نے مجھے زادراہ دی اور چھپتا چھپتا قریب ایک برس تک بھارت میں بھٹکنے کے بعد چند ماہ پہلے یہاں پہنچا ہوں۔ آپ کی یہاں آمد کے بعد مہاجروں میں طرح طرح کی چٹگوئیاں ہو رہی ہیں۔ میں یہاں اکیلا اور تنہا ہوں اور ایک پڑھے لکھے بزرگ جو شاعر بھی ہیں کہ ہمراہ ایک کمرے میں رہتا ہوں۔ چونکہ دن میں آپ کے گرد مہاجروں کا ہجوم ہوتا ہے یا آپ ایمبسی میں ہوتے ہیں جہاں ہمارا داخلہ ممنوع ہے اس لئے اس وقت ملنے کو چلا آیا۔ میں اس بے وقت کی ملاقات کی وجہ سے چڑچڑاسا ہو رہا تھا۔ ایسی کہانیاں تقریباً ہر مہاجر کی زبان سے ہر روز سنتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر تمہیں پیسے کی ضرورت ہے تو کل صبح اپنا رجسٹریشن کارڈ لے کر ایمبسی چلے آنا وہیں سب کوئی کارڈ ایک ہزار روپے دیئے جائیں گے۔ ”جناب یہ درست ہے کہ میں آپ سے مالی امداد لینے آیا ہوں لیکن میرے ساتھ جو بیتی ہے وہ کہانی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔“ اس کی آنکھوں میں بے خونی اور سچائی کی چمک تھی جسے میں نے دیکھا لیکن تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ میں نے اسے کہا کہ میرے ساتھ واش روم میں چلو اور مجھے اپنے جسم پر تشدد کے نشان دکھاؤ۔ میں سمجھتا تھا کہ اب وہ اپنی فرضی کہانی کا بھانڈا پھوٹنے سے بچنے کیلئے یا بہانے گھڑے گا یا چلا جائے گا لیکن وہ واش روم میں میرے پیچھے پیچھے چلا آیا۔ اس نے سخت سردی میں پھٹی ہوئی قمیص اور میلا سا پانچامہ پہن رکھا تھا۔ واش روم میں اس نے اپنی قمیص اتار کر مجھے اپنی پیٹھ اور سینہ دکھایا۔ یقین جانیئے اس کی ساری پیٹھ اور سینہ زخموں کے ایسے درجنوں گہرے گھاؤ سے بھر پڑھا تھا جنہیں دیکھ کر میں تھرا اٹھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا اس نے اپنا پانچامہ نیچے کیا۔ اس کے دونوں HIPS پر رائفل کی گولیوں کے تقریباً چھ چھانچ پر پھیلے دو ایسے گھاؤ تھے جن سے خاصا گوشت اڑ چکا تھا۔ رانوں پر ان کے عین سامنے رائفل کی گولیاں جسم میں داخل ہونے کے ایک ایک انچ گہرے نشان تھے (تھری ناٹ تھری کی گولی رائفل کی نال کے Groves کی وجہ سے گھومتے ہوئے نکلتی ہے۔ جہاں سے جسم میں داخل ہو وہاں گولی کا نشان چھوٹا ہوتا ہے لیکن گھومنے کی وجہ سے جہاں سے نکلتی ہے وہاں بہت بڑا زخم بناتی ہے) اس کے جسم پر تشدد کے ہولناک نشان ایسے تھے جن کے مقابلے میں مجھے خود پر کیا گیا بھارتی تشدد، پہاڑ کے مقابلے میں رائی محسوس ہونے لگا میں تو حیران تھا کہ وہ زندہ کیسے بچا۔ اس ذات پاک پر میرے یقین کا مل کا ثبوت اس کا زندہ رہنا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ ”موت تمہاری زندگی کی محافظ ہے“ کی سچائی کا وہ جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ اس نے کپڑے درست کئے تو میں نے اسے گلے لگایا جتنا ظلم و ستم اس پر آدھ گھنٹے میں کیا گیا تھا۔ اتنا کوئی شاید سو برس میں بھی برداشت نہ کر سکے۔ اس آدھ گھنٹے میں اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے تین معصوم بچوں، جوان بیوی اور ضعیف والدہ کو شہید کیا گیا اور اسے جس ظلم، تشدد اور بربریت کا نشانہ بنایا گیا اس کی مثال ملنا دشوار ہے (اس رات سے وہ میرا گہرا دوست بن گیا۔ کھٹمنڈو میں اس نے میرے مشنوں میں میری بھرپور مدد کی۔ وہ بفضل خدا ابقیہ حیات فیصل آباد میں ریلوے میں ملازمت کر رہا ہے۔ پاکستان آ کر اس نے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ شادی کی اور اب چار بچوں کا باپ اور بھرے پرے گھر میں آسودگی کی زندگی گزار رہا ہے۔ سیکورٹی کی بنا پر میں آئندہ اسے محسن کے نام سے مخاطب کروں گا)

اس نے مجھے بتایا کہ اس وقت اس کے آنے کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ تیس گھنٹوں سے وہ اور اس کا بزرگ ساتھی بھوکے ہیں اور بھوک اور بیماری کے باعث اس کے ساتھی کی حالت نازک ہو چکی ہے۔ میں نے ری اسپشن کے ذریعے ہوٹل کے ڈاکٹر کو فوری بلوایا اور ہوٹل سے دودھ اور کھانا لے کر ڈاکٹر کے ہمراہ ہوٹل کی ٹیکسی میں ہم سب اس کے گھر گئے۔ ایک کمرے کے اس گھر میں فرس پر دو پھٹی پرانی دریاں اور دو بوسیدہ کمبل تھے۔ کمرہ سردی سے بچ ہو رہا تھا اس کا ساتھی ایک درمی پریٹن بخار میں پھنک رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشن اور دوا دی اور بتایا کہ سردی اور بھوک کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو رہی تھی اس وقت بازار بند ہو چکے تھے جہاں سے میں ان کیلئے گرم کپڑے اور بستر وغیرہ لیتا۔ میں انہیں ہمراہ لے کر اپنا پورنا ہوٹل کے قریب ہی ایک گیسٹ ہاؤس میں گیا اور ان کیلئے ایک کمرہ اور ایکسٹرا پے منٹ پر بیٹریا۔ ہیٹر سے کمرہ جلد ہی گرم ہو گیا اور گرم بستروں نے دونوں کو گرم کر دیا۔ میں نے محسن کو دس ہزار روپے دیئے اور کہا کہ کل صبح وہ اپنے اور بزرگ ساتھی کیلئے گرم کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان خریدے۔ ڈاکٹر کو میں کہہ دوں گا کہ وہ صبح اور شام بزرگ ساتھی کے علاج کیلئے گیسٹ ہاؤس میں آئے۔ آئندہ شام میں خود بھی دونوں کو ملنے اس گیسٹ ہاؤس میں آؤں گا۔ یہ کہہ کر میں ان سے رخصت لے کر اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ رات کا خاصا حصہ میں یہ سوچتا رہا کہ ہر انسان اپنی مشکل اور مصیبت کو بہت بڑی سمجھتا ہے لیکن اگر ایسا ممکن ہو کہ ہر انسان کی مشکلات اور مصیبتوں کو الگ الگ ڈھیر کی صورت رکھ دیا جائے اور ان انسانوں کو کہا جائے کہ جو ڈھیر پسند ہوا سے اٹھالے تو یقیناً ہر انسان دوسرے کے ڈھیر کے بجائے اپنا ڈھیر ہی اٹھائے گا یہ انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنی مصیبت اور مشکل کو بہت بڑی اور دوسروں کی بہت کم سمجھتا ہے جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔

دوسرے روز صبح ہی میں نے بازار سے بریف کیس خریدی اور اس میں 5 لاکھ انڈین کرنسی ڈال کر بینک سے نیپالی روپوں میں تبدیل کروائی۔ اس کے عوض مجھے 5 لاکھ پچاس ہزار نیپالی روپے ملے۔ ایمبسی پہنچا تو وہاں مہاجروں کا ایک ہجوم تھا ان کے 10 نمائندوں نے انہیں فہرست کے مطابق ترتیب سے بٹھایا ہوا تھا۔ میں پہلے سیدھا سفیر کے کمرے میں گیا۔

(جاری ہے)

غازی

”میں حکمران پارٹی سے تعلق رکھتا ہوں۔ پاکستان میں تمہیں دیکھ لوں گا“ سفیر نے اپنے ترکش کا آخری تیر چھوڑا۔ ”میں عوام سے تعلق رکھتا ہوں اور تمہیں پاکستان میں ہی نہیں بلکہ یہیں دیکھنے اور سبق سکھانے کا اہل ہوں“ میرے اس جواب سے سفیر صاحب نے حوصلہ بالکل ہی چھوڑ دیا۔ اونچی آواز میں ہماری گفتگو اور نمائندوں کی آواز احاطے سے باہر کھڑے ہزاروں مہاجرین تک صاف پہنچ رہی تھی۔ چارنٹ اونچی چار دیواری کے اندر کیا ہو رہا تھا۔ اسے بھی باہر کھڑے مہاجر دیکھ رہے تھے ان میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں جذبات کی رو میں بہہ کر یہ مہاجر سفارت خانے پر دھاوا ہی نہ بول دیں اور سفیر کی وزارت خارجہ کی بھیجی گئی رپورٹ اور اندیشہ سچ ثابت ہی نہ ہو جائے۔

میں نے نمائندوں اور ملٹری اتاشی کو ساتھ لیا اور چار دیواری کے اندر سے ہم نے باہر کھڑے مہاجرین کو پہلے اشاروں اور پھر باتوں سے خاموش ہونے کی تلقین کی۔ وہ ذرا ٹھنڈے ہوئے تو میں نے کہا ”خدا را دنیا کو تماشہ نہ دکھائیں۔ آپ کے ساتھ جو بھی زیادتیاں ہوئی ہیں وہ بجا سہی لیکن یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے۔ گرد و نواح میں دنیا بھر کے سفارت خانے ہیں۔ وہ ہماری ایک ایک بات کی تفصیلی رپورٹ اپنے ممالک کو بھیجیں گے اور ہم جگ ہنسائی کا موجب بنیں گے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ آپ کے ساتھ انصافی اور دھاندلی نہ ہوگی“ میری اس مختصر سی تقریر سے سب خاموش ہو گئے۔ میں نے ملٹری اتاشی سے جو کرٹل تھے اور سفارت خانے کے افسران کی دھاندلیوں سے خاصے نالاں دکھائی دیتے تھے کہاں کہ وہ امدادی رقوم کی تقسیم کے دوران ہمارے ساتھ رہیں۔ اللہ کے بعد اب افواج پاکستان پر ہی بچے کچھے پاکستان کی سالمیت کا انحصار ہے۔ شکست کھانے کے باوجود پاکستانی عوام کو آپ پر مکمل اعتماد ہے۔ قصہ کوتاہ ہم نے کرسیاں اور میز وہیں رہنے دیئے اور ملٹری اٹاشی کی موجودگی میں فہرستوں کے مطابق ایک ہزار روپیہ فی کنبہ ادائیگی شروع کی۔ ادائیگی اتنے سلجھے ہوئے اور منظم انداز میں ہوئی کہ روپیہ کم پڑنے لگا۔ بیٹوں کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں ٹیکسی لے کر بھاگ بھاگ ہوٹل پہنچا اور مزید دس لاکھ بھارتی کرنسی لے کر ایم بی سی پہنچا۔ بھارتی اور نیپالی کرنسی کا آپس میں مچھل مچھل ہی معلوم ہو چکا تھا میں نے بقیہ مہاجرین کو سو روپیہ بھارتی کرنسی میں دینا شروع کیا اور دو روز میں ہم نے چودہ سو سے زائد کنبوں میں روپیہ تقسیم کیا اس کے علاوہ میں نے ملٹری اتاشی کے توسط سے نیپالی بازاروں میں بکے ہوئے کنبل واپس لینے کی کوشش کی ہمیں ہر شکل چار ہزار کنبل بکنے والے ریٹ پر واپس ملے۔ میں نے دو ہزار مزید کنبل بازار سے خریدے اور سارے کنبل مہاجرین میں تقسیم کر دیئے۔ بیمار مہاجرین کیلئے 6 نیپالی ڈاکٹروں نے معاہدہ کیا کہ وہ مریض کی حالت کے مطابق کلینک یا گھر جا کر ان کا علاج کریں گے اور دو کیمسٹ اور ڈرگ اسٹورز میں ایڈوانس رقم جمع کروادی کہ ڈاکٹروں کی Prescription اور مہاجرین کے رجسٹریشن نمبر نوٹ کر کے دوا فریم کی جائے۔ میں نے سارا روپیہ اس لئے تقسیم نہ کیا کہ مجھے اور ان مہاجرین کو نامعلوم کتنا عرصہ نیپال میں گزارنا تھا اور اس دوران روپے کی ہمیں کتنی اور کب ضرورت پڑ جائے اس کا علم نہ تھا۔

سفیر صاحب نے میرے متعلق کسی کسی رپورٹیں اپنے محکمے اور اپنے پارٹی لیڈروں کو بھیجیں۔ یہ تو معلوم نہ ہو سکا لیکن پاکستان واپس آنے پر اور کچھ عرصے بعد محکمے سے علیحدگی پر مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر نیپال میں ”اپنے جرائم“ کی سزا کی وجہ سے ہر قسم کی ملازمت کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے خفیہ والوں نے میری مستقل نگرانی شروع کر دی اور مجھے بلاوجہ تنگ کیا جانے لگا تھا یہ سب اس محبوب اور ہر لحاظ پر لیڈر کے دور حکومت میں ہوا جو پاکستان کو دولت کرنے کا ذمہ دار تھا جو قوم کو جھوٹے نعروں سے بہلا کر حکمران ہی نہیں بلکہ پہلا سول مارشل لاء انسٹریٹ بنا۔ مجھے دو برس تک ملک کے باہر جانے کی اجازت نہ ملی۔ میرے محکمے نے اپنے وسائل اور حدود سے بڑھ کر میری مدد کی اور 78ء کے اواخر میں بے حد کوشش کے بعد مجھے پاسپورٹ ایٹو کیا گیا۔

اس مصروفیت میں تین روز گزر گئے۔ مہاجرین کے روپ میں 8 ملٹی باہنی والے میرے دل و دماغ میں کیلوں کی طرح ٹھکے ہوئے تھے میں اکیلا انہیں ختم نہ کر سکتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے مذکورہ دہلی فون کیا۔ میری آواز سن کر وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے اس سے ساتھیوں عارف اور لڑکوں کی خیریت دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ سب ٹھیک اور خوش خرم ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ عارف کو بلا لائے میں آدھے گھنٹے میں دوبارہ فون کروں گا۔

مذکورہ نے مجھے بتایا تھا کہ نیا گروپ لیڈر آچکا ہے اسی لئے میں نے باوجود بے انتہا خواہش کے ساتھیوں سے بات کرنا مناسب نہ سمجھا کہ مبادا نیا گروپ لیڈر ساتھیوں سے میرے رابطے کو اپنے کام میں مداخلت سمجھے اسی لئے میں نے ان کی خیریت دریافت کی تھی ٹھیک آدھے گھنٹے بعد کھٹنڈو سے انتہائی اہم فون کال پر دہلی سے دوبارہ رابطہ ہوا تو مذکورہ کے ساتھ عارف بھی موجود تھا میں کھلے طور پر انہیں یہاں کے حالات اور اپنی ضرورت کے بارے میں بتا نہیں سکتا تھا۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں انہیں کہا کہ یہاں کھٹنڈو میں اکیلا بہت بور ہو رہا ہوں اور دوستوں سے ملنے کی بہت خواہش ہے۔ آپ قیصر (اب بشیر مرحوم کی گیرج کے انچارج اور گورکھ پور کے مشن کے انتہائی اہم کردار) کو کہیں اپنے تین چار ساتھیوں سمیت فوراً کھٹنڈو آجائے اور پوری تیاری سے آئے۔ یہاں بہت سردی ہے ان کی آمد سے ماحول گرم ہو جائے گا۔ عارف میرا مطلب سمجھ چکا تھا اس نے جواب دیا کہ کل صبح ہی وہ قیصر سے ملے گا اور انشاء اللہ اگلے روز تمہارے دوست کھٹنڈو کیلئے روانہ ہو جائیں گے۔ اس نے مجھے کل اسی وقت دوبارہ فون کرنے کو کہا۔ میں نے انہیں پھر اپنے سابقہ ساتھیوں کو میرا سلام کہنے اور Compartmentation کی وجہ سے فون پر گفتگو نہ کرنے کی وجہ سے معذرت کی۔ اگلے روز شام کو جب میں نے دہلی فون کیا تو قیصر بھی موجود تھا۔ قیصر نے بتایا کہ کل صبح ہی وہ اپنے چار ساتھیوں سمیت بذریعہ ٹرین کھٹنڈو کیلئے روانہ ہو رہا ہے۔ جہاز سے اس لئے نہیں آرہے کہ کھٹنڈو کی سردی کی وجہ سے پوری تیاری سے آنا ہے۔ بین اسٹور گفتگو سے ہم نے ایک دوسرے کو وضاحت سے سب باتیں سمجھادی تھیں۔

دہلی میں قیصر سے بات ہونے کے پانچویں روز شام کو قیصر اپنے چار ساتھیوں سمیت کھٹنڈو پہنچا۔ ہم یوں گلے ملے جیسے برسوں کے چھڑے بھائی اچانک ملتے ہیں۔ میں ان سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن مسلسل سفر سے تھکاوٹ کے آثار ان کے چہروں پر نمایاں تھے۔ میں نے ان کیلئے انا پورنا ہوٹل کے قریب ہی ایک اعلیٰ درجے کے ٹورسٹ ہوٹل میں کمرے بک کروائے تھے۔ انہیں ہوٹل میں چھوڑ کر میں واپس آ گیا اور مفصل گفتگو اگلے روز دوپہر کے کھانے کے دوران کرنے کا فیصلہ کیا۔ شام کو حسب معمول محسن آ گیا۔ میں اسے بھی اپنے Confidence (اعتماد) میں لینا چاہتا تھا۔ چھوٹا شہر، بادشاہ کی رہائش اور دارالحکومت ہونے کے باعث کھٹنڈو کی پولیس ہر نووارد پر کڑی نگاہ رکھتی تھی۔ محسن چونکہ کئی ماہ سے یہاں مقیم تھا اس لئے اسے سب مہاجرین اور ان کے روپ میں چھپے پاکستان دشمن عناصر کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور ان تک رسائی میں نسبتاً کم دشواری تھی۔ میں نے محسن سے اس بارے میں بات کی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ کہنے لگا ”آصف بھائی۔ اگرچہ جسمانی طور پر اب کمزور ہوں لیکن ملٹی باہنی کے وحشی دزدوں سے انتقام لینے کی خواہش اس شدت سے میرے دل میں ہے کہ موقع آنے پر آپ کو مجھ میں انشاء اللہ شیر جیسی طاقت دکھائی دے گی۔ (جاری ہے)

غازی

” میں نے محسن سے کہا کہ مکتی باہنی کے آٹھ آدمی یہاں مہاجروں کے روپ میں موجود ہیں۔ وہ اکیلے رہتے اور مہاجروں کو مالی لالچ کے دھوکے میں پھنسا کر پاکستان کے مفاد کے خلاف کام کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔

میرے پاس ایک فہرست ہے لیکن اس میں ایسے لوگوں کی زیادہ تعداد درج ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بے گناہ مہاجر مسلمان مارا جائے۔ میں اس لسٹ میں درج تمام لوگوں کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس لسٹ میں درج لوگوں میں بے گناہ بھی ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے علاوہ بھی مکتی باہنی کے کچھ لوگ یہاں موجود ہوں جن کے نام لسٹ میں نہ ہوں۔ محسن میری تمام گفتگو کے دوران خاموش رہا۔ مشرقی پاکستان میں اس پر توڑے گئے ظلم و ستم کے بدلے کی خواہش اس کی آنکھوں کی سرخی سے صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ کہنے لگا ”آپ کو تو یہاں آئے چند روز ہی گزرے ہیں جبکہ میں مہینوں سے یہاں مقیم ہوں۔ اس دوران میں بھی یہاں پاکستان کے دشمنوں کی کھوج میں رہا ہوں۔ مجھے جن کا پتہ چلا ہے، ان کے نام، پتے اور دیگر کوائف مجھے ازبر ہیں۔ آپ اپنی لسٹ نکالیں اور مجھے نہ دکھائیں۔ میں نام لیتا جاؤں گا اور آپ دیکھیں کہ آپ کی لسٹ میں ان کے نام ہیں یا نہیں۔

میں نے لسٹ نکالی۔ محسن میرے سامنے ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے نام لینے لگا۔ میں حیران تھا کہ اس کے بتائے ہوئے تمام نام لسٹ میں موجود تھے۔ لسٹ کے سارے نام ختم ہو گئے لیکن وہ نہ رکا۔ میں نے ایک علیحدہ کاغذ پر وہ سب نام اور پتے لکھ لئے۔ یہ ان مہاجروں کے نام تھے جنہیں مکتی باہنی والے Plant کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ محسن نے بتایا کہ ان میں سے 3 مہاجر اپنی فیملی یہیں چھوڑ کر پاکستان جا چکے ہیں اور ان سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ جب وہ پاکستان سے مطلوبہ معلومات کھنڈو بھیج دیں گے تو ان کی فیملی کو بھی پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ میں نے محسن کو ٹوکا اور سوال کیا کہ پاکستان بھیجنے کے تمام انتظام جانے والوں کی لسٹیں اور شیڈول تو پاکستانی سفارت خانے کے ہاتھ میں ہے۔ پھر مکتی باہنی کے یہ ایجنٹ اپنی مرضی سے کیونکر پوری فیملی میں سے ایک فرد کو پاکستان بھجواتے اور بقیہ فیملی کو رکوا سکتے ہیں۔ محسن ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ ”آصف بھائی۔ سب کچھ ممکن ہے۔ ایک بیسی میں دس ہزار روپے دے کر اگلے روز جانے والی فلائٹ پر جانے والوں کی فہرست سے کسی کا بھی نام کٹوا کر اپنا نام لکھوایا جاسکتا ہے اور اسی طریقے سے میرے بتائے تینوں مہاجر پاکستان جا چکے ہیں، میرا اگلا سوال تھا کہ جب دس ہزار سے کہیں کم روپوں میں نیپال سے بینک اک اور پھر کراچی پہنچا جاسکتا ہے۔ پھر ان مہاجروں کو افغان ایئر سے ہی کیوں بھیجا گیا۔ میں نے سوال تو کر دیا لیکن فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ افغان ایئر کے جہاز UNO نے مہاجروں کیلئے چارٹر کئے تھے۔ ان پر جانے والوں کو پاسپورٹ کی ضرورت نہ تھی جبکہ کسی دوسری ایئر لائن اور کسی دوسرے روٹ سے پاکستان جانے کے لئے پاسپورٹ لازمی تھا اور سفارت خانہ ملکی پالیسی کے تحت پاسپورٹ ایٹھ نہیں کرتا تھا۔

مجھے محسن پر پورا بھروسہ تھا لیکن جب تک میں اسے عملی طور پر کام سرانجام دیتے دیکھ نہ لیتا میں اسے دلی سے آئے ہوئے لڑکوں سے ملوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی وجہ وہ خوف اور بے اعتباری تھی جو پاکستانی کوریئر کی غداری کے سبب میری گرفتاری کا موجب بنی۔ میں نے محسن سے پوچھا اگر میں اس کے ہمراہ رہوں تو کیا وہ ان مکتی باہنی والوں میں سے کسی ایک کو انجام تک پہنچانے کو تیار ہے؟ محسن کہنے لگا ”آصف بھائی ایک تو کیا میں ان سب کو عبرت ناک طریقے سے ہلاک کرنے کو تیار ہوں۔ کھکھڑی سے وار کرنے کی میں نے یہاں کافی پریکٹس کر لی ہے۔ میں نے بہت پہلے ہی انہیں ٹھکانے لگا دیا ہوتا لیکن اپنی جسمانی کمزوری کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکا آپ ساتھ ہوں اور اگر میں کہیں کمزور پڑ جاؤں تو میری مدد کریں تو یہ کام بلا توقف کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے محسن کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر اسے آئندہ رات 8 بجے اپنی کھکھڑی ساتھ لانے اور اپنا پہلا شکار خود منتخب کرنے کا کہہ کر رخصت کر دیا۔

دوسرے روز دوپہر کو میں ٹورسٹ ہوٹل گیا۔ قیصر اور چاروں لڑکے میرے انتظار میں تھے۔ کھانے کے بعد ہم سب قیصر کے کمرے میں گئے اور وہاں میٹنگ شروع ہوئی۔ میں نے انہیں یہاں کے تمام حالات تفصیلاً بتا کر کہا کہ مکتی باہنی کے آٹھ آدمی یہاں پوری آزادی سے اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ انہیں ٹھکانے لگانا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ایک بہاری مہاجر بھی ہمارے ساتھ اس کام میں شریک ہوگا اور پہلا شکار وہی کرے گا۔ لڑکے اپنے ساتھ ریوالور، پستول اور بڑے چاقو لائے تھے۔ میں نے انہیں کہا یہاں صرف چاقو استعمال کئے جائیں کیونکہ بارودی اسلحہ کی آواز سے ہمسائے فوراً بیدار ہو جائیں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر ہم نے ہر روز ایک دو شکار کئے تو پولیس چونکا ہو جائے گی۔ اس لئے ایسا پروگرام بنانا چاہئے کہ ایک رات میں ہی سب کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ پولیس کے علاوہ چونکہ مکتی باہنی والوں کا بھی آپس میں رابطہ ہے۔ اس لئے اگر ہر روز ان کی ایک یا دو لاشیں گرنے لگیں تو باقی خوفزدہ ہو کر غائب ہو جائیں گے اور مشن ادھورا رہ جائے گا۔ بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ اس رات کے مشن کو جسے محسن نے سرانجام دینا تھا، ملتوی کر دیا جائے۔ آج رات محسن سب کے گھر اور اگر ممکن ہو تو ان کی شکلیں دکھلا دے اور لڑکے ان گھروں سے بھاگ نکلنے کے محفوظ راستے بھی دیکھ لیں۔ مکتی باہنی والوں کے ٹائمنگ بھی نوٹ کی جائے کہ کب وہ اپنی محفلیں درخواست کرتے ہیں اور جب سب تیاریاں مکمل ہو جائیں تو محسن کو ملا کر 6 افراد کے دو گروپ بنائے جائیں اور ایک رات میں ہی دونوں گروپ مشن مکمل کر لیں۔ میں دونوں گروپوں کی نگرانی کروں اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اسلحہ استعمال کروں۔ پہلا گروپ رات 9 بجے اپنا کام شروع کرے گا جبکہ دوسرا گروپ اس کی نگرانی کرے گا۔ پہلے گروپ کے کام ختم کرتے ہی دوسرا گروپ اپنے ٹارگٹس کو جانے گا جبکہ پہلا گروپ اس کی نگرانی کرے گا۔ سب لازماً دستاویز نہیں گئے اور کام کے بعد اپنے چاقو ایک تھیلے میں ڈال کر مجھے دیں گے۔ جنہیں میں شہر سے باہر کسی پہاڑی کھوہ میں پھینک دوں گا۔ ان سے تمام تفصیلات طے کر کے میں اپنے ہوٹل چلا آیا اور لڑکے دو دو ٹولیوں میں شہر کی سیر کو نکل گئے۔ قیصر مجھ سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں اسے اپنے ہمراہ ہوٹل میں لے آیا۔

ہوٹل کے کمرے میں آکر میں نے کافی کا آرڈر دیا اور قیصر سے دہلی کے حالات پوچھے۔ اس نے بتایا کہ لڑکوں کی سرگرمیاں اور جوش بالکل ختم ہو کے رہ گئے ہیں۔ گیرج میں جہاں بلاناغہ ہر شام لڑکے اکٹھے ہوتے تھے۔ اب کبھی بکھار ہی آتے ہیں اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلے جاتے ہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو پہلے وہ جواب دینے سے کترانے لگا لیکن میرے زور دینے سے آخر وہ پھٹ پڑا۔ ”کیا کہوں“ آپ نے جس محبت اور جذبے سے سب کو اکٹھا کیا اور تربیت دی تھی وہ اب سرے سے مفقود ہے۔ آپ کے جانے کے بعد جب تک حبیب گروپ لیڈر رہا۔ وہ ہم سے بالکل آپ کی طرح گھل مل کر رہتا تھا ہمیں آپ کی کمی ضرور محسوس ہوتی تھی لیکن اس نے ہمارے جذبے، جرات اور ولولے میں کوئی فرق نہ آنے دیا لیکن جب سے نیا گروپ لیڈر آیا ہے۔ اس کے رویے سے حالات بالکل بدل گئے ہیں اس نے حبیب اور دوسرے ساتھیوں کو ہم سے ملنے سے روک دیا ہے اس نے اپنی رہائش بھی نذیر صاحب کے ہاں باقی ساتھیوں کے ہمراہ رکھی ہے ہم پہلے کی طرح جب بھی حبیب اور دوسرے ساتھیوں سے ملنے گئے وہ بڑی رکھائی سے پیش آیا۔

(جاری ہے)

غازی

اس کے رویے سے لڑکے بہت بددل ہو چکے ہیں یہ سب کچھ بتا کر قیصر نے مجھے مذہب کا خط دیا۔ مذہب نے لکھا تھا کہ وہ اپنی جوان بچیوں کے ہمراہ گھر میں رہتا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ آپ لوگ کون تھے اور دہلی میں کیا کر رہے تھے اس نے ہر طرح کا خطرہ مول لیا اور اپنے گھر کو آپ کیلئے پناہ گاہ بنا دیا لیکن آخر تک وہ اور اس کے گھر والے خوف و وحشت کی حالت میں رہیں گے۔ میری گرفتاری کے دوران اور فرار کے بعد انہیں ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نجانے کس وقت فوج اور پولیس والے دھاوا بول دیں۔ میرے ہمبھی جانے کے بعد اس نے حبیب کو اپنے خدشات بتائے تو اس نے نئے گروپ لیڈر کے آنے تک کی مہلت مانگ لی۔ نیا گروپ لیڈر آ گیا تو اس سے بات کی اور اسے سرائے بیرم خان میں ایک متبادل جگہ بھی دکھائی لیکن ابھی تک انہوں نے گھر خالی نہیں کیا۔ مذہب نے بڑے درد بھرے انداز میں لکھا تھا کہ مسلمان ہونے کے ناطے اس نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا لیکن اب اس بات کا انتظار کیا جا رہا ہے کہ کب بھارتی ہندو فوجی اس کی بیٹیوں کی رسوائی کریں۔ مذہب نے خط کے آخر میں لکھا تھا "خدا را ہمیں اس اذیت سے نجات دلانے کی کوئی تدبیر کریں اور ہمیں اس "جرم" کی سزا نہ دیں کہ ہم نے اپنے مسلمان بھائیوں کو بے پناہ خطرات کے باوجود پناہ دی" خط پڑھ کر میں نے قیصر کی طرف بڑھا دیا۔ وہ میرے چہرے سے تاثرات کا اندازہ لگا رہا تھا کہ کہنے لگا "مذہب نے یہ خط مجھے پڑھا کر ہی لفافے میں بند کیا تھا۔ ہم نے حبیب سے بھی یہاں آنے سے پہلے اس مسئلے پر بات کی تھی۔

وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مجبور ہے۔ ڈاک کا پیکٹ گروپ لیڈر اپنے سامنے بند کرواتا ہے۔ اسی گھر میں رہنے کی وجہ سے ٹرانسمیٹر پر مختصر پیغام بھی اسی کی موجودگی میں بھیجا جاتا ہے مذہب نے آپ کو یہ خط اپنی آخری کوشش سمجھتے ہوئے بھیجا ہے۔ اگر جلد ہی کوئی مثبت جواب نہ ملتا تو پھر ہم گریج والے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ ہمارے متعلق تو آپ جانتے ہیں کہ ہم نے کبھی اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ پاکستان کی خاطر اگر ہم فوج اور DMI والوں سے بھڑکتے ہیں تو اپنی بہنوں کی عزت بچانے کیلئے ایک لاوارث پاکستانی جاسوس کو ٹھکانے لگانا ہمارے لئے بچوں کا کھیل ہوگا۔

میں نے اسے تسلی دی اور یقین دلایا کہ میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ یہ مسئلہ جلد از جلد سلجھ جائے۔ تین روز بعد میں نے پاکستان جانے والی ڈاک میں اپنے تھیلے میں مذہب کا خط اور قیصر کے ارادوں کے متعلق تفصیلاً لکھ کر بھیجا۔ نتیجتاً اس گروپ لیڈر کو واپس بلا کر حبیب کو گروپ لیڈر بنا دیا گیا۔ جس نے سرائے بیرم خان میں شفٹ ہو کر دہلی میں بنائے ہوئے ہمدرد جانوروں کے نیٹ ورک کو کھرنے سے بچالیا۔ یہ تفصیلات مجھے بعد میں قیصر اور مذہب کے خطوط سے ملیں جن سے کھٹنڈو قیام کے دوران میں نے مستقل رابطہ رکھا۔

آئندہ تین روز ہم سب نے محسن کی رہنمائی میں کئی باہنی والوں کی نگرانی، ان کے گھروں سے باہر جانے اور واپس لوٹنے اور ان کی محفلوں کے ختم ہونے کے اوقات اور مشن کی تکمیل کے بعد واپس لوٹنے کے راستوں کے تعین میں گزارے۔ ہم نے بازار سے دستاویز اور جہیز بنا کر بھی خرید لیں۔ دستاویز تو ہاتھوں کے نشان نہ پڑنے کیلئے تھے۔ جوتوں کے نشان پڑنے کی ہمیں کوئی فکر نہ تھی کیونکہ کھٹنڈو کی ساری زمین پتھر پٹی تھی۔ میں نے شیر پنجاب ریستورنٹ کے مالک سردار جی سے ان کی گاڑی بھی مانگ لی تھی۔ غرضیکہ سب تیاریاں مکمل تھیں۔ ہمیں اب صرف ایکشن کی رات کا تعین کرنا باقی تھا کہ اچانک ایک مسئلہ سامنے آ گیا جس کی طرف میں نے پہلے توجہ نہ دی تھی۔ کھٹنڈو کے ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں ننانوے فیصد غیر نیپالی ہی قیام کرتے تھے جن میں سے بیشتر یورپین، امریکی اور خال خال جاپانی ہوتے تھے یہ ٹورسٹ اکثر کھٹنڈو کے اطراف کے پہاڑوں پر HIKING (چڑھنے) کیلئے علی الصبح نکل جاتے۔ کھٹنڈو اور اطراف کے دیہاتوں کے وارداتی ان کی تاک میں رہتے تھے اور جو نیپالی کوئی ان کے ہاتھ چڑھتا تو ان کے پیسے، گھڑی اور کمپاس تک چھین لیتے اور ذرا سی مزاحمت پر کھٹنڈو کے وار سے ہلاک کر کے گہری کھائیوں میں پھینک دیتے تھے۔ جب ایسی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا تو حکومت نے ہوٹل اور گیسٹ ہاؤسز والوں کو پابند کیا کہ ہر رات 9 بجے مہمانوں کی واپسی کی رپورٹ بنا کر پولیس کو بھیجیں۔ سردیوں میں ویسے بھی کھٹنڈو رات آٹھ بجے ہی ویران ہو جاتا تھا۔ ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارا مشن رات 8 بجے کے بعد شروع ہو کر معلوم کب تک جاری رہتا۔ ایک ہی رات میں آٹھ "مہاجروں" کے کھٹنڈو جیسے پرامن شہر میں قتل ہونے کی خبر نہ صرف کھٹنڈو بلکہ پورے نیپال کی پولیس کو ہلا کر رکھ دیتی۔ ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز کی اس رات کی رپورٹ کے مطابق جو مہمان اس رات 9 بجے تک واپس نہ آئے ہوتے وہ پولیس کی نظر میں ضرور مشتبہ بن جاتے۔ پولیس اگر ذرا بھی ہوشیاری دکھاتی تو تان لڑکوں اور بلا خر مجھ پر ان کی ٹوٹی۔ میں پہلے ہی مہاجروں میں "بلاوجہ" روپے تقسیم کرنے سے موضوع گنگو بن چکا تھا۔ شیر پنجاب کے مالک سردار جی کی طرح نامعلوم کتنے ہی لوگ بھارتی اخباروں نے میری تصاویر اور خبریں پڑھ کر میری اصلیت جان چکے تھے۔ بھارتی سفارت خانے میں یقیناً میرے متعلق اطلاعات موجود تھیں۔ نیپالی پولیس کو میری اصلیت کا پتہ چل جاتا تو بھارت کے ساتھ معاہدے کے مطابق مجھے پابند سلاسل کر کے مجھے بھارت کے حوالے کر دیا جاتا اور میرے ساتھ قیصر اور لڑکے بھی مارے جاتے۔

یہ مسئلہ سامنے آیا تو ہم نے عارضی طور پر مشن ملتوی کر دیا۔ میرا ہوٹل وسیع رقبے پر پھیلا ہوا اور دو منزلہ تھا۔ میں اپنے کمرے کی عقبی کھڑکی سے ریسے کے ذریعے باہر آ سکتا تھا اور شام کو واپسی کے اندراج کے بعد کھڑکی سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو سکتا تھا۔ میں نے ہوٹل کے چاروں طرف گھوم کر اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ میرے فلور پر جتنے کمرے تھے ان کی عقبی کھڑکیاں میرے کمرے کی کھڑکی کی طرح ہمارے کام کیلئے موزوں تھیں۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں نے قیصر سے مشورہ کیا اور اگلے دن یہ پانچوں انا پورنا ہوٹل میں CHECK-IN ہو گئے۔ اب دوسرا مسئلہ ہمارے سامنے یہ تھا کہ ہوٹل سے نکلنے وقت سارے ہوٹل کی بجلی بند کی جائے ہوٹل کی بلڈنگ کے علاوہ اس کے دونوں لانوں (LAWNS) میں نیلگوں روشنی کے گارڈن لیمپس تھے۔ ان کی روشنی میں ہوٹل کے گارڈن ہمیں کھڑکیوں سے اترتے ہوئے ضرور دیکھ لیتے۔ بجلی گل ہونے کے باعث ایک تو اندھیرا ہو جاتا دوسرا گارڈن نے فطری طور پر مرکزی بلڈنگ کے مین گیٹ کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا اور ہمیں نکل بھاگنے کا باہانی موقع مل جاتا۔ اب ہمیں ہوٹل کے سوچ روم کی تلاش تھی جو ہمیں جلد ہی مل گیا۔ لابی کے آخری کونے میں واش روم کے ساتھ بغیر دروازوں کے ایک کمرہ نما جگہ میں دیوار پر تین بڑے مین سوچ لگے ہوئے تھے۔ دن کے وقت سوچ آن اور ایک آف رہتا تھا۔ آف سوچ یقیناً ہوٹل کی بیرونی لائٹیں اور لان کی کیتوں کا تھا جبکہ دوسرے دو سوچ دونوں فلورز کے تھے۔ قیصر نے لابی میں ٹھکانا شروع کر دیا جبکہ چاروں لڑکے ایسی مختلف جگہوں پر کھڑے ہو گئے جہاں سے قیصر کو اشاروں سے پیغام دیا جاسکے۔ میں نے ریسپشن پر جا کر ان سے نیپال کے مختلف بروشر مانگ کر انہیں اپنی طرف الجھالیا۔ لابی میں بیٹھے چند لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے ایک لڑکا یا ایک زور زور سے چلانے لگا کہ اس نے فرش پر بچھے کارپٹ کے اندر ایک سانپ کو گھستے دیکھا ہے۔ سب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی اور قیصر سوچ روم میں داخل ہو گیا اور ایک منٹ کے اندر ہی باہر آ گیا ہم ابھی "سانپ" دیکھنے والے لڑکے سے سوال ہی کر رہے تھے کہ قیصر نے اشارہ کیا اور ہم ایک ایک کر کے باہر آ گئے۔ قیصر نے بتایا کہ اس نے بیرونی روشنی والے مین سوچ کا ایک فیوز نکال لیا ہے اور بازار سے ویسے ہی دو فیوز خریدنے ہیں۔ باقی لڑکے واپس ہوٹل چلے گئے اور قیصر اور میں بازار سے ایک گھنٹے میں دو فیوز خرید لائے۔ قیصر نے موقع ملتے ہی سوچ روم میں اصل فیوز لگا دیا اب ہم نے اپنے مشن کی باقی جزئیات پر سوچنا شروع کیا۔ چھوٹا شہر ہونے کے باعث کھٹنڈو میں دہلی اور بمبئی کی نسبت مشن کامیابی سے پورا کرنا بہت زیادہ دشوار تھا۔ بجلی گل کرنے کا ذمہ قیصر نے لیا۔ ایک فیصلہ یہ ہوا کہ اگر ایک کمرہ گراؤنڈ فلور پر لے لیا جائے تو نہ تو ہم کوریسیوں کے ذریعے کھڑکیوں سے اترنا پڑے گا اور نہ ہی قیصر کو اندھیرے میں سوچ روم میں اپنی کارروائی کر کے اوپر اپنے کمرے تک جانے اور پھر کھڑکی کے ذریعے اترنے میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت ہوگی۔ شام کو محسن آیا تو میری ہدایت پر وہ اپنے گھر گیا اور نئے کپڑوں سے بھرنا یا سوٹ کیس لے کر ہوٹل میں آ کر گراؤنڈ فلور میں ایک کمرہ لے لیا۔ اگلے روز ہم بازار گئے اور میں نے سب کیلئے خاکی رنگ کے اور کوٹ خریدے جیسے کھٹنڈو کی پولیس سردیوں میں پہنتی ہے۔ قیصر نے نیپالی روپے کے چوتھائی اور آدھی قیمت کے (ہمارے 25 اور 50 پیسے جیسے) کئی سکے لئے۔ میں شام کو شیر پنجاب ریستورنٹ گیا اور سردار جی کی گاڑی لے آیا۔ اب ہم مشن کیلئے پوری طرح سے تیار تھے اور ہمیں آج رات ہی اسے سرانجام دینا تھا۔

ہم نے اپنے آپریشن کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلا حصہ ہوٹل کی تمام روشنیاں گل کرنا اور ہوٹل سے نکلنا۔ دوسرا حصہ دو ٹولوں میں تقسیم دو گروپوں کا کئی باہنی والوں کو ٹھکانے لگانا اور تیسرا کسی کی نظروں میں آئے بغیر ہوٹل میں داخل ہونا تھا۔ آپریشن شروع کرنے کا وقت 2200 HRS یعنی رات 10 بجے رکھا گیا پونے دس بجے ماسوائے ایک لڑکے کے جس نے اپنے کمرے سے اوپر کے فلور کی لائٹ اڑانی تھی۔ باقی سب نے اپنی مکمل تیاری کے ساتھ محسن کے کمرے میں اکٹھے ہونا اور تمام لائٹس اڑانے کے بعد اسی کمرے کی کھڑکی سے باہر نکلنا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

سردار جی نے ان کی طرف سے مطمئن ہو کر داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اشارے سے انہیں باہر چلنے کا کہا۔ سردار جی نے ملازموں کو سب کیلئے چائے بنانے اور کیک لانے کا کہا اور خود میرے اور قیصر کے ہمراہ باہر آ گئے۔ باہر آ کر قیصر نے سرگوشی میں مجھے کہا کہ سب کام بخوبی مکمل ہو گیا ہے اور چاقوؤں کا تھیلا گاڑی کے پچھلے پاسیان میں پڑا ہے۔ اسی میں سب کے دستانے بھی ہیں کیونکہ کئی دستانوں پر خون کے داغ لگ چکے ہیں میں نے قیصر کو واپس ریستورنٹ میں بھیجا اور سردار جی کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سردار جی کو میں نے کہا کہ اس طرف گاڑی لے چلیں جہاں گہری کھائیاں ہوں۔ سردار جی کو اصل واقعے کا علم نہ تھا۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے ہنستے ہوئے کہنے لگے۔ ”کہو جی کیسی ایکٹنگ کی۔ سب ڈر گئے تھے نا!“۔ میں نے بھرپور داد دی اور کہا کہ آپ کو تو فلموں میں کام کرنا چاہئے۔ سردار جی کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ کھائیوں میں کچھ پھینکنا ہے۔ کھائیوں میں، میں نے چاقو نکال کر الگ الگ دور دور پھینک دیئے۔ سردار جی نے جب خون آلود چاقو دیکھے تو ان کی ہنسی فوراً غائب ہو گئی۔ پوچھنے پر میں نے کہا کہ واپس ریستورنٹ میں جا کر بتاؤں گا۔

ہم ریستورنٹ میں پہنچے تو لڑکے اور محسن بجائے آرام کرنے کے چائے پینے اور خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے تھکے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اور کھوکھلے تھے۔ محسن کی آواز ان میں سب سے نمایاں تھی اور اس کی وجہ بھی میں سمجھ چکا تھا۔ کسی بے ہتھیار انسان کو مارتے وقت قدرتی طور پر دل و دماغ پر بوجھ سا چھا جاتا ہے۔ انہوں نے ڈھائی گھنٹوں میں آٹھ کتی باہنی والوں کو ہلاک کیا تھا جو سب کے سب قتل ہوتے وقت نہتے تھے۔ ان لڑکوں کے دل و دماغ پر جو اثر ہوا تھا وہ اسے اپنے قہقہوں سے زائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے انہیں سر کی جنبش سے بتا دیا کہ میں بھی اپنا کام مکمل کر آیا ہوں۔ سردار جی سے میں نے کہا کہ میں گاڑی سے تھیلا لاکر کچن کے چولہوں میں جلاتا ہوں۔ آپ ملازموں کو کہیں کہ گاڑی کو اندر اور باہر سے اچھی طرح دھولیں۔ سردار جی کے حواس ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے۔ وہ گم سم سے میری ہر بات مانتے جا رہے تھے۔ تھیلے میں خون سے بھرے ہوئے دستانے تھے۔ میں نے چولہے میں ایک ایک کر کے دستانے ڈالے اور پھر تھیلا اور جب تک سب راکھ نہ بن گئے، میں وہاں سے نہ ہٹا۔ اس دوران سردار جی کے ملازموں نے گاڑی کو پانی کے پائپ سے اندر اور باہر سے دھو کر بالکل صاف کر دیا تھا۔ دو لڑکوں کے اوور کوش پر بھی خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ ان دھبوں کو بھی لڑکوں نے دھو کر بالکل صاف کر دیا۔ ملازم میرے لئے اور سردار جی کیلئے بھی چائے لے آیا تھا۔ چائے پینے کے دوران سردار جی نے مجھ سے پھر پوچھنا چاہا۔ میں نے انہیں سرگوشی میں کہا کہ سب کے سامنے نہیں بلکہ کل دن کو آپ کو بتاؤں گا۔ صبح چار بجے میں نے سردار جی سے کہا کہ ہمیں انا پورنا ہوٹل کے قریب چھوڑ آئیں۔ ہم آٹھ بندے گاڑی میں ایک دوسرے کے اوپر ٹھس ٹھسا کر بیٹھے۔ ہوٹل کے قریب آنے پر میں نے گاڑی رکوائی اور سردار جی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں دوبارہ تنبیہ کی کہ گزشتہ شام میرے آپ سے گاڑی لینے سے اب تک کی کسی بات کا ذکر کسی سے بھولے سے بھی نہ کریں۔ سردار جی کو ابھی تک رات کے آپریشن کی سگیٹی کا علم نہ تھا۔ وہ خاموشی سے چلے گئے۔ ہوٹل کی باؤنڈری وال سے ہم نے اندر کا جائزہ لیا، اس وقت صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے اور سخت سردی اور اندھیرا تھا۔ ہم ایک ایک کر کے مین گیٹ سے ذرا پرے باؤنڈری وال سے کود کر ہوٹل کی حدود میں داخل ہوئے۔ پہرے دار بھی رات کی ڈیوٹی یا شاید سردی کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ پھر بھی ہم چھپتے چھپاتے سنگل فائل میں محسن کے کمرے کی کھڑکی تک پہنچے اور خاموشی سے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہمارے جانے کے وقت اس کمرے کی لائٹ بھی چلی گئی تھی اب کمرہ پوری طرح سے روشن تھا۔

(جاری ہے)

غازی

سارے مہاجر بہت مشتعل ہیں اور سفارت خانے کے باہر نعرہ بازی کر رہے ہیں۔ سفارت خانے نے مدد کیلئے پولیس بلوائی ہے۔ جس نے مہاجروں کو سفارت خانے سے باہر نکال کر سڑک کی دوسری طرف اور دائیں بائیں دھکیل دیا ہے۔ مہاجر سفارت خانے پر تحفظ مہیا نہ کرنے اور بلاوجہ نیپال میں روکے رکھنے کے خلاف نعرہ بازی کر رہے تھے۔

اصل حقائق اور مہاجروں کے احتجاجی مظاہروں کا سن کر مجھے ایک انوکھی تجویز سوچھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میری تدبیر کارگر ہوئی تو مہاجروں کا احتجاجی مظاہرہ یکلخت التارخ اختیار کر لے گا۔ میں نے محسن کو کہا کہ وہ فوری طور پر کشمیری مسجد میں جائے جہاں بقول اس کے گزشتہ رات "شہید ہونے والے مہاجروں" کی تجہیز و تکفین کے انتظامات ہو رہے تھے اور نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے یہ بات پھیلا دے کہ مرنے والے نہ تو مسلم تھے اور نہ مہاجر۔ اس سے زیادہ کچھ نہ کہے اور مسجد کے قریب ہی میرا انتظار کرے۔

محسن کے جانے کے آدھ گھنٹہ بعد میں لڑکوں کو ہوٹل میں ٹھہرنے یا بازار کی سیر کرنے کا کہہ کر خود سائیکل رکشہ لے کر کشمیری مسجد کی طرف چل دیا۔ کشمیری مسجد پہنچا تو دور ایک گوشے میں محسن کو کھڑے دیکھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے بات تو اچھی طرح پھیلا دی ہے لیکن لاشیں پوسٹ مارٹم نہ ہونے کے باعث بھی یہاں نہیں پہنچی ہیں۔ قریب تین ہزار مہاجر ان کے انتظار اور جنازہ پڑھنے کیلئے وہاں موجود تھے۔ کھٹمنڈو میں کشمیری مسجد کا ہونا عجیب سی بات تھی درحقیقت تقریباً اسی برس پہلے کشمیر کا ایک تاجر خاندان ڈوگروں کے تشدد کے باعث کھٹمنڈو میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس خاندان کے باقی افراد اور کئی دوسرے کشمیری تاجر بھی کھٹمنڈو ہجرت کر گئے۔

یہاں ان کا کاروبار خوب چکا اور وہ یہیں کے ہوئے۔ ان کشمیریوں کا کھٹمنڈو کے خاصے وسیع حصے میں اپنا محلہ اور اپنی مسجد تھی۔ یہ بلا تفریق قومیت اور وطن کے ہر مسلمان کی حتی المقدور مدد کرتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے مہاجروں میں ان کی سخاوت کا چرچا تھا اور

آج انہوں نے ہی ان "لاوارث مسلمان مہاجروں" کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کئے تھے۔ ان میں سے چند معتبر مسجد کے قریب ہی اپنی کوشی کے لان میں بیٹھے تھے۔ میں شکل و صورت سے بھی پٹھان یا کشمیری لگتا تھا۔ میں لان میں ان کے پاس چلا گیا۔ اگرچہ ہمارا پہلے کبھی تعارف یا آ مناسا منا نہیں ہوا تھا لیکن انہوں نے بڑے تپاک سے میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں چٹا گانگ میں

ملازم تھا۔ بڑی مشکل سے کھٹمنڈو پہنچا ہوں اور اب پاکستان جانے کے انتظار میں ہوں چونکہ گزشتہ رات بہت بڑا وقوعہ ہو چکا تھا۔ اس لئے گفتگو کا موضوع جلد ہی اس طرف پھر گیا۔ میں نے باتوں کے درمیان کہا کہ یہاں آ کر میں نے ایک عجیب بات سنی ہے کہ مرنے والے غیر مسلم تھے۔ وہ سب میری بات سن کر ہنسنے لگے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ بے شک یہ افواہ ہی ہو لیکن تصدیق کرنے

میں کیا حرج ہے۔ غرضیکہ میرے زور دینے پر اس بات پر رضامند ہو گئے کہ غسل کو کہہ دیں گے کہ میتوں کو غسل دیتے وقت اس افواہ کی اصلیت جانچیں۔ میتیں آئیں تو مہاجروں میں جوش و خروش بہت بڑھ گیا۔ یہاں بھی پاکستانی، سفارت خانے اور نیپالی پولیس کے خلاف نعرے بازی شروع ہو گئی۔ دو غسل تھے۔ دونوں نے بیک وقت دو میتوں کو غسل دینا شروع کیا۔ غسل دیتے وقت یکے بعد

دیگرے دونوں لاحول و لاقوہ پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مہاجروں کے پوچھنے پر انہوں نے سرگوشی میں انہیں کچھ کہا۔ مہاجروں کو ان کی بات پر یقین نہ آیا۔ دو بزرگ اور معتبر مہاجروں نے خود تصدیق کی تو وہ بھی حیرت میں ڈوب گئے۔ انہوں نے ساری میتوں کو دیکھا اور اعلان کر دیا کہ یہ آٹھوں غیر مسلم تھے۔ اب غسل دینا تو ایک طرف رہا میتوں کو ہندوؤں کے حوالے کرنے کی تدبیر ہونے

لگیں۔ میں نے ان دو بزرگ مہاجروں کو کہا کہ آپ میرے ہمراہ سفارت خانے چل کر وہاں مشتعل مہاجروں کو حقیقت حال سے آگاہ کریں ورنہ وہاں کے حالات خراب ہو جائیں گے۔ وہ میرے ہمراہ فوراً کشمیری خاندان کی موٹر میں سفارت خانے پہنچے اور پولیس کے میگافون پر مہاجروں کو اصلیت بتائی۔ مشتعل مہاجر جو سفارت خانے پر حملہ کرنے کو تیار تھے، اصل حقیقت جان کر ٹھنڈے ہوئے اور کشمیری مسجد کو چل دیئے تاکہ خود یہ تماشہ دیکھ سکیں۔ اب یہ چہ گوئیاں شروع ہو گئیں کہ مرنے والے کون تھے اور

انہیں ہلاک کس نے کیا۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ میرا مشن بخوبی مکمل ہو چکا تھا۔ اب مجھے لڑکوں کو فوری نیپال سے باہر کرنا تھا چنانچہ میں اپنے ہوٹل چلا آیا۔

میں قیصر کے کمرے میں گیا اور اسے کہا کہ تمام لڑکوں کو یہیں بلا لے۔ جب سب جمع ہو گئے تو میں نے انہیں آج کی ساری صورتحال بتائی اور کہا کہ نیپالی پولیس اب تک تو انہیں مہاجر سمجھی ہوئی تھی انہوں نے تفتیش کی محض خانہ پری کی لیکن پاکستان کے سفارتخانے کو بچانے کیلئے میں نے اصلیت ظاہر کر دی

غازی

جس کے نتیجے میں اب نیپالی پولیس ان مقتول نام نہاد ہندو مہاجروں کی اصلیت جاننے کیلئے تفتیش کا دائرہ کار بڑھا دے گی۔ بھارتی سفارت خانہ بھی حرکت میں آجائے گا اور ان مکتی باہنی والوں کو یہاں بھیجنے والے بھی خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ ان حالات کے پیش نظر اب انہیں نیپال سے جلد از جلد چلا جانا چاہئے۔ میں نے قیصر سمیت تمام لڑکوں کو دس دس ہزار بھارتی کرنسی دی اس کے علاوہ ان کے سفر کے اخراجات اور کھنڈو میں شاپنگ کیلئے دو دو ہزار روپے علیحدہ دیئے انہوں نے یہ رقم لینے سے پہلے تو انکار کیا لیکن میرے اصرار پر مان گئے۔ میں نے انہیں شاپنگ کرنے کیلئے بھیجا اور محسن کے ذریعے اگلے روز صبح پہلی بس پر بیرگنج کیلئے 6 سیٹیں بک کروالیں مذہب اور عارف کیلئے علیحدہ علیحدہ خط بھی قیصر کو دیئے۔ میں نے مذہب کو لکھا تھا کہ میں پوری کوشش کروں گا کہ ایک ماہ کے اندر آپ کام کالی خالی کر دیا جائے اگر میں کوشش میں ناکام ہو جاؤں تو آپ کو مکمل آزادی ہے کہ مکان خالی نہ کرنے والوں سے جیسا چاہیں سلوک کریں ایک خط حبیب کے نام دیا جس میں مکان خالی نہ کرنے کی صورت میں ان کے ارادوں کا بھی اشارہ دے دیا۔ میں نے قیصر سے کہا کہ دہلی پہنچ کر فوری طور پر اپنی اور لڑکوں کی خیریت سے آگاہ کرے۔ دوسری صبح 8 بجے کی بس پر چھ مجاہدوں کا یہ قافلہ بیرگنج کو روانہ ہو گیا۔ چوتھے روز دہلی سے مذہب اور عارف نے ٹیلی فون پر مجھ سے بات کی اور بتایا کہ قیصر کا گروپ بخیر و عافیت دہلی پہنچ گیا ہے میں نے مذہب کو کہا کہ اس کے گھر کو خالی کرنے کی اہمیت اور وجہ میں نے تفصیلی طور پر اپنے محکمے کو بھیج دی ہے اور مجھے یقین ہے کہ جلد از جلد اس کا گھر خالی ہو جائے گا۔ متبادل جگہ سرائے بیرم خان سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتی اس لئے وہ سرائے بیرم خان میں انہیں محفوظ گھر لیکر دے اور انہیں وہاں SET کرنے میں ان کی مدد کرے۔

کھنڈو میں اب تک مہاجروں کے بھیس میں چھپے 9 مکتی باہنی والوں کو نہایت قلیل وقت میں ٹھکانے لگایا گیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ابھی اور بھی طاعونی چوہے یہاں موجود ہوں گے جو یا تو ہماری نظروں میں آنے سے رہ گئے یا وہ یہاں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہوں گے۔ ابھی تک ہم نے جن کو اصل جہنم کیا تھا وہ اکیلے رہتے تھے اور مہاجروں کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مکتی باہنی یا بھارتی انٹیلی جنس کے اور بہت سے افراد یہاں موجود ہوں گے۔ بھارتی سفارت خانے کا حجم بہت بڑا اور اس کے عملے کی تعداد دو سو سے اوپر تھی جس کے مقابلے میں پاکستانی سفارت خانے کا عملہ صرف اٹھارہ افراد پر مشتمل تھا۔ بھارتی سفارت خانہ یہاں سے صرف پاکستان کی ہی نہیں بلکہ چین کی بھی جاسوسی کرتا تھا۔ چین نے کھنڈو سے اپنے بارڈر تک 134 میل لمبی سڑک بنائی تھی جو چین کی انجینئرنگ کا شاہکار تھی۔ بلند پہاڑوں سے گزرتی یہ سڑک بالکل سیدھی تھی اور اس میں کوئی ZIG ZAG نہ تھا جہاں پہاڑ کو چیرا نہ جاسکا وہاں سرنگ بنادی گئی تھی۔ اس سڑک پر بڑے بڑے ٹرالے بڑی آسانی سے چل سکتے تھے۔ یہ سڑک بنانے کے دو مقاصد تھے اول یہ کہ اگر بھارت اپنی فطرت سے مجبور ہو کر نیپال پر حملہ آور ہو تو چین کی افواج کو نیپال کے دفاع میں پہنچنے میں دشواری نہ ہو۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نیپال کی چھوٹی سی پہاڑی ریاست کو بھارت بلا وجہ دھمکا تا رہتا تھا کہ وہ اس کی درآمد اور ضروری اشیا کی سپلائی روک دے گا۔ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ نیپال کی بھارت کے ساتھ جنغرافیائی حالت بالکل ایسی تھی کہ جیسے آزاد کشمیر کی پاکستان کے ساتھ، بھارت کی نیپال کو سپلائی روک دینے کی صورت میں چین اس سڑک کے ذریعے نہایت سرعت سے نیپال کی ضروریات پوری کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیپال میں سب سے فعال چین اور بھارتی سفارت خانے تھے۔

میرے کہنے پر لڑکوں نے انا پورنا ہوٹل میں اپنے نام، ایڈریس اور شہر بھی علی گڑھ، لکھنؤ اور الہ آباد لکھوائے تھے۔ ہوٹل میں مل بھی انہوں نے خود ادا کئے ان کی روانگی سے پہلے میں نے ان بلوں کی رقم بھی انہیں ادا کر دی۔ بعد دوپہر محسن بھی ہوٹل چھوڑ کر گیٹ ہاؤس چلا گیا۔ محسن کو بھی میں نے 12 ہزار روپے دیئے۔ پیسے کی لاچاری انسان کو بزدل بنا دیتی ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ محسن جس میں ہمت اور حوصلہ دوبارہ عود کر آیا تھا پھر لاچاری کا شکار ہو جائے نیپال میں میرے مشن کا ابھی صرف آغاز ہوا تھا۔ مجھے ایک قابل اعتماد ساتھی کی ضرورت تھی اور کھنڈو میں محسن سے زیادہ نڈر، جرات مند، انتقام کے جذبے سے لبریز، قابل اعتماد ساتھی ملنا ناممکن تھا۔ میں نے اگلا ایک ہفتہ نہایت خاموشی میں گزارا۔ میں اس واقعے پر مہاجروں، بھارتی سفارت خانے اور نیپالی حکومت کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ محسن ہر روز دن چڑھے پاکستانی سفارت خانے اور مہاجروں کے ٹھکانوں پر چلا جاتا اور ہر روز شام ڈھلے میرے پاس آکھتا اپنے ساتھی شاعر کے ہمراہ آجاتا اور تنہائی میں مجھے سارے دن کی رپورٹ دیتا۔ اسی کے ذریعے معلوم ہوا کہ بھارتی سفارت خانے نے اپنے ہمدرد نیپالیوں کے ذریعے ان لاشوں کو شمشان گھاٹ میں چتا کے سپرد کیا ہے۔ ان کا سامان بھی نیپالی پولیس لے گئی تھی جسے بعد میں بھارتی سفارت خانے کے حوالے کر دیا گیا۔ پاکستانی سفارت خانے نے رجسٹریشن سے ان کے نام خارج کر دیئے تھے اور کھنڈو میں مقیم سارے رجسٹرڈ مہاجروں کی نئے سرے سے رجسٹریشن شروع کر دی گئی تھی اس بار رجسٹریشن سے پہلے سفارت خانے کے ایک کمرے میں انہیں بے لباس ہو کر مسلمان ہونے کا ثبوت دینا پڑتا تھا۔ فیملی کے بغیر اکیلے مہاجروں کیلئے رجسٹریشن کو خصوصی طور پر بہت سخت کر دیا گیا اور ایسے مہاجروں کو شہر قریب پاکستان میں اپنے شہر یا گاؤں میں مقیم تین رجسٹرڈ مہاجروں سے تصدیق کروانی لازمی تھی۔ محسن اور بزرگ شاعر بھی اسی زمرے میں آتے تھے۔ میں کئی روز سے سفارت خانے نہیں گیا تھا ایک روز محض یہ دیکھنے کیلئے کہ ہمارا سفارت خانہ مجھ پر کس حد تک اعتماد کرتا ہے میں ان دونوں کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ یہ دونوں تو ایمبسی کے لان میں دوسرے مہاجروں کے ساتھ رک گئے۔

(جاری ہے)

غازی

میں ان کے سابقہ رجسٹریشن کارڈ لے کر سیدھا سفیر کے پاس گیا۔ سفیر صاحب سیاسی آدمی تھے۔

روپے تقسیم کرتے وقت ہونے والی تلخی کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے ملے۔ کئی روز نہ آنے کا گلہ کیا۔ کافی اور بسکٹ منگوائے۔ میں نے دونوں کے رجسٹریشن کارڈ انہیں دیتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں کی فینلی نہیں ہے۔ کیا میری ضمانت پر ان کی رجسٹریشن ہو سکے گی؟“ سفیر صاحب نے بڑی اپنائیت سے جواب دیا صرف ان کی ہی نہیں، آپ بے شک دو ہزار مہاجر لے آئیں۔ آپ کی ضمانت پر سب کی فوری طور پر رجسٹریشن کر دوں گا سفیر صاحب نے یہ کہتے ہوئے اتر کام پر اپنے پی اے کو بلایا اور دونوں کارڈ اسے دے کر کہا کہ فوری طور پر ان کی نئی رجسٹریشن لادے۔ پندرہ منٹ میں ہی تمام پروسیجر بالائے طاق رکھتے ہوئے دونوں کیلئے رجسٹریشن کارڈ بن کر آگئے۔ میں نے پوچھا کہ ضمانت نامے میں کیا لکھ کر دوں۔ تو سفیر صاحب نے کہا ”آپ کا کہنا ہی ضمانت ہے“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اجازت چاہی تو سفیر صاحب نے پر زور اصرار سے اپنے گھر رات کھانے کی دعوت دی۔ میں نے معذرت کی تو انہوں نے کہا ”آپ کو لازماً آنا ہوگا۔ آپ سے کئی ایسی ضروری باتیں اور اہم باتیں کرنی ہیں جو یہاں مناسب نہیں“ میں نے کھانے پر آنے کی حامی بھر لی۔ دراصل ہم دونوں مکتی باہنی والوں کے متعلق گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ سفارت خانہ تو نئی رجسٹریشن شروع کر کے پہلے ہی اپنی کوتاہی تسلیم کر چکا تھا اس لئے اب سفیر صاحب مجھ سے کچھ اگلوانا اور ہم نوا بنانا چاہتے تھے۔ ادھر میری حالت یہ تھی کہ میں کالے چور پر تو بھروسہ کر لیتا لیکن سفیر اور اس کے حواریوں کو اپنا راز کبھی نہ دیتا۔

کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں کافی آگئی۔ سفیر صاحب نے مجھے ہوانا سگار کے دو خوش نما ڈبے عنایت کئے۔ جن پر حکومت پاکستان کا سرکاری نشان کھدا ہوا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور ایک ڈبہ کھولنا چاہا تو سفیر صاحب نے بڑی بے تکلفی سے کہا ”نہیں، انہیں یہاں نہ کھولیں۔ یہاں پر میرے ڈبے کے سگار پیکیں“ سفیر صاحب نے یہ کہتے ہوئے اپنے ڈبے میں سے ایک سگار مجھے دیا۔ ہر سگار سلور کی ٹیوب میں بند تھا جس پر بھی اوپر والے الفاظ کندہ تھے۔ ”اب بتائیے یہ سب کیسے کیا؟“ سفیر صاحب نے مسکراتے اور گہری نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا، کیا ”یہ سب کیسے ہوا؟“ میں نے انجان بنتے ہوئے ان سے ہی سوال کر دیا۔ سفیر صاحب شاید یہ جان کر کہ میں ان کی بات سمجھ نہیں سکا، بولے ”بھئی، میں ان آٹھ غیر مسلموں کی بات کر رہا ہوں جو گزشتہ دنوں ایک ہی رات میں مار دیئے گئے“۔ میں نے جواب دیا ”سنا تو میں نے بھی ہے میں تو یہ سمجھتا تھا کہ یہ کارروائی آپ نے کروائی ہے کیونکہ یہ غیر مسلم مہاجروں کے بھیس میں ہمارے سفارت خانے میں رجسٹرڈ تھے اور ان کے Expose ہونے کے بعد آپ کو نئے سرے سے رجسٹریشن کرنی پڑ رہی ہے۔ میرا اس سارے واقعے میں کوئی عمل دخل نہیں۔ میرے پاس تو صرف پائل ہے اور میری اطلاع کے مطابق انہیں خجروں اور کھکھڑیوں سے مارا گیا ہے میں اکیلا بھلا اتنے افراد کو ایک رات میں کیسے مار سکتا ہوں“ میرا نفی میں اور مدلل جواب سن کر سفیر صاحب مجھے میں پڑ گئے اب میرا وار کرنے کا موقع تھا میں نے کہا ”چلیئے چھوڑیے۔ وہ بد بخت اسی سزا کے مستحق تھے وہ تو مر گئے لیکن آپ کیلئے مصیبت کھڑی کر گئے۔ نئے سرے سے رجسٹریشن سے آپ آئندہ تو شاید ایسے جاسوسوں سے بچ جائیں لیکن جن مہاجروں کو آپ پہلے ہی پاکستان بھجوا چکے ہیں ان میں کتنے غیر مسلم جاسوس ہوں گے، اس بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جب ان آٹھ غیر مسلم جاسوسوں کی سفارت خانے میں بحیثیت مسلم مہاجر رجسٹریشن کے حوالے سے میں اس واقعے

(جاری ہے)

غازی

مہاجر اپنی اپنی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے اور ان کا کوئی ایسا گروپ بھی نہ تھا جس پر قتل کرنے کا شبہ کیا جاسکتا۔ پولیس نے کھٹمنڈو کے سارے ہوٹل اور گیسٹ ہاؤس کھنگال ڈالے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ انا پورنا ہوٹل کے رجسٹر بھی دیکھے گئے لیکن کسی گروپ کا وہاں ٹھہرنا ثابت نہ ہوا۔ اس ہوٹل میں ہر روز پندرہ سے بیس مہمانوں کا آنا (CHECK-IN) اور جانا (CHECK-OUT) ہونا روز کا معمول تھا۔ قیصر اور لڑکوں کا اس ہوٹل میں اندراج مختلف ناموں اور ایڈریس سے تھا۔ ہر روز پانچ چھ بسیں بھر کر رسول سے کھٹمنڈو آتی اور جاتی تھیں۔ دنیا بھر سے ٹورسٹ اور چرس کے رسیا یہاں آتے تھے جن میں بھارتی بھی شامل تھے۔ کوئی بھی خلاف معمول بات سامنے نہ آئی تو پولیس تھک ہار کر خاموش ہو بیٹھی۔ اس دوران میں نے محسن کے ساتھ نہایت احتیاط سے ان متمول مہاجروں کی تفصیلات اکٹھی کر لیں جو ان کے مشرقی پاکستان جانے والے مہاجروں کے مطابق مفلوک الحال تھے لیکن کھٹمنڈو میں مالی فراغت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور انہوں نے اپنے پیسے کے زور پر مہاجروں کے چھوٹے چھوٹے گروہ اپنے گرد جمع کر رکھے تھے۔ میں نے ان پر ڈائریکٹ ہاتھ ڈالنے کے بجائے محسن کو ان متمول مہاجروں کے گرد جمع ہونے والی منڈلیوں سے روابط بڑھانے اور ان کے ذریعے اصلیت کی تہہ تک پہنچنے کی ذمہ داری سونپی۔ میری ہدایت کے مطابق محسن نے اپنا معمول بنالیا کہ جہاں بھی چند مہاجر جمع ہوتے وہ پاکستان کے خلاف بولنا شروع کرتا۔ اگر کوئی اس کی گفتگو پر اعتراض کرتا تو وہ فوراً اپنی قمیص اوپر کر کے انہیں اپنی پیٹھ دکھاتا اور کہتا کہ میں نے بیوی بچوں اور ماں کو اذیتوں سے مرتے دیکھا ہے اور میرا یہ حشر کیا گیا۔ کس لئے! صرف پاکستان کا نام لیوا ہونے کے جرم میں اور جب مصیبتیں اور مشکلات اٹھا کر یہاں پہنچا تو امید تھی کہ پاکستانی حکومت سر آنکھوں پر بٹھائے گی لیکن یہاں تو کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا۔ ایسی باتوں سے وہ معترض ہونے والوں کو چپ کر دیتا اور سب اس سے الٹا اظہار ہمدردی کرنے لگتے۔ محسن کو اسی طرح پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے آٹھ دس دن گزر گئے تو ایک روز ایک مہاجر نے اس سے ہمدردی جتاتے ہوئے اسے شام کو اپنے ساتھ کسی کے پاس چلنے کی دعوت دی۔ شام کو محسن اس کے ساتھ ہولیا۔ اسے ایک اچھے خاصے سجے سجائے گھر میں لے جایا گیا جہاں کئی مہاجر پہلے سے ہی بیٹھے تھے۔ بقول محسن کے میزبان بڑی تمکنت اور شان سے فرشی ڈرائنگ روم میں گدوں پر بیٹھا تھا۔ چائے اور مقامی شراب کے دور چل رہے تھے۔ محسن کو میزبان نے خوش آمدید کہا اور شریک محفل کر لیا۔ جب سب کے معدے گرم ہو گئے تو میزبان نے محسن کو کہا کہ اس کے متعلق جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ بہت ہی افسوس ناک ہے محسن نے جھٹ قمیص اٹھا کر اسے اپنی پشت دکھائی اور پاکستان کے خلاف رٹی رٹائی نازیبا گفتگو کرنے لگا۔ میزبان نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کا باعث پاکستان (مغربی پاکستان) والوں کی ہٹ دھرمی تھی ہم سب اسی وجہ سے دوسری بار بے گھر ہوئے ہیں اور یہاں ہمارے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے اسے تم بخوبی جانتے ہو۔ ہم نے اپنے پیاروں کو اپنے سامنے اذیتوں سے ہلاک ہوتے دیکھا، خود گہرے زخم کھائے، ہمارے گھر یا لوٹ لئے گئے۔ ان سب کا دوا یہ نہیں کہ ہم پاکستان جانے کی آس لگائے یہاں خاموشی سے بیٹھے رہیں بلکہ ہمیں چاہئے کہ ہم یہاں ہم خیال لوگوں کا گروپ بنائیں اور جہاں تک ممکن ہو، یہاں اور پھر پاکستان جا کر ان ظالم حکمرانوں اور بے حس پاکستانیوں کا جینا حرام کر دیں جو ہمارے پیاروں کی لاشوں پر اپنے محل تعمیر کرتے ہیں۔

(جاری ہے)

غازی

ہمیں وہ ایک کٹیا اور دو وقت کا کھانا بھی دینے کو تیار نہیں ہیں محسن کے بیان کے مطابق اس نے بڑی جذباتی تقریر کی اور ہمیں اس بات پر اکساتا رہا کہ ہم پاکستان کو ہر طبقے سے نقصان پہنچائیں۔ محسن نے بتایا کہ اس کے پاس بیٹھے مہاجر بچے یا جھوٹے دل سے اس کی ہاں میں ہاں ملتا رہے تھے۔ وہ فوری ہی اپنے اصل مقصد اور ٹاسک تک نہیں پہنچا۔ بلکہ بتدریج برین واشنگ کے مرحلے طے کر رہا تھا۔ محفل برخواست ہونے سے پہلے اس نے وہاں موجود سب مہاجروں کو پچاس پچاس روپے دیئے اور محسن کو آئندہ باقاعدگی سے اپنی محفلوں میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ میں نے محسن کو کہا کہ وہ بلا ناغہ اس کے گھر جائے اور وہاں جمع ہونے والے مہاجروں کے کوائف معلوم کرے اور خصوصی طور پر اس متمول مہاجر کے سابقہ مشرقی پاکستان میں کاروبار اور رہائش کے متعلق تفصیلاً معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ محسن اپنے کام میں جت گیا اور میں نے محسن جیسے اور مہاجروں کی تلاش شروع کر دی۔ کیونکہ اکیلے محسن سے ان تمام لوگوں کو کور کرنا مشکل تھا، جو اس گھناؤنے کام میں کافی عرصے سے مشغول تھے۔

چند دنوں سے میں محسوس کر رہا تھا کہ غیر محسوس طریقے سے میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ ہوٹل کی لابی ہو یا سفارت خانے کا کمپاؤنڈ، شیر پنجاب ریسٹورنٹ ہو یا بازار، ہر جگہ مختلف لوگ بلاوجہ میرا پیچھا کرتے دکھائی دیتے۔ تربیت کے مطابق میں نے ان پیچھا کرنے والوں کو "جھکنے" اور ان سے جان چھڑانے کے بجائے ان کی اصلیت اور ارادے جاننے کی کوشش شروع کر دی۔ میں بعد دوپہر ہوٹل سے نکلتا تو لابی میں بیٹھے چند ایسے لوگ جو اس اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کسی صورت بھی رہنے والے یا کسی مہمان سے ملنے والے دکھائی نہ دیتے تھے۔ میرے باہر نکلتے ہی میرے پیچھے چل دیتے بعض اوقات ہوٹل کے باہر کھڑے چند اجنبی جس طرف اور جس سواری (کھنڈو میں خال خال ہی ٹیکسیاں نظر آتی تھیں جو صرف غیر ملکی مغربی سیاحوں کی تاک میں گھنٹوں بلاوجہ کھڑی رہتیں اور ملکی یا بھارتی مسافروں کو لے جانے سے احتراز کرتیں۔ سائیکل رکشاؤں کی یہاں بہتات تھی) پر میں جاتا میرے پیچھے لگ جاتے۔ میں نے نگرانی کے شبہ کو جانچنے کیلئے کئی بار ایسا کیا کہ سائیکل رکشہ پر سفارت خانے کے آدھے رستے تک گیا اور پھر رکشہ والے کو واپس اسی راستے سے بازار کی جانب چلنے کو کہا۔ (انا پورنا ہوٹل کے سامنے کی سڑک بائیں طرف پاکستانی سفارتخانے اور دائیں طرف بازار کو جاتی ہے) میرے آدھے رستے سے اچانک واپس پلٹنے سے میرا پیچھا کرنے والے بھی اپنے رکشاؤں کو واپس میرے پیچھے لے آئے۔ اس سے میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میں اپنا پمفل تو لباس کے نیچے چھپا کر رکھتا لیکن ایک کھکھڑی کمر کے گرد ہمیشہ باندھے رکھتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ مختلف اوقات میں میرا پیچھا کرنے والے آٹھ نو افراد تھے۔ ان میں سے تین تو قد و قامت اور رنگ سے بنگالی لگتے تھے جبکہ باقی پانچ چھ مضبوط جسم والے قد اور تھے ایک روز میں نے انہیں جانتے ہوئے راستے میں اپنا رکشہ اچانک رکوا دیا۔ میرا پیچھا کرنے والے اتنے نا اہل تھے کہ بجائے سیدھا آگے جانے کے انہوں نے بھی اپنا رکشہ رکوا دیا۔ میں رکشے سے اتر کر ان کے پاس چلا گیا اور کھنگلی سے پیچھا کرنے کی وجہ پوچھی وہ اس اچانک صورت حال کا سامنے کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ لگے ادھر ادھر کے بے مقصد جواز دینے۔ میں نے کھکھڑی نکال کر حملہ کرنے انداز میں پکڑ لی اور کہا کہ بکواس مت کرو۔ آئندہ اگر میں نے تمہیں دیکھا تو یا درکھنا تمہارا وہ حشر کروں گا جو تمہارے نو ساتھیوں کا ہو چکا ہے۔ انہوں نے خاموشی سے میری بات سنی اور اپنے رکشے میں واپس چلے گئے۔ یہ دو تھے اور غیر بنگالی لگتے تھے۔ اس واقعے کے بعد میں نے ان کی صورت دوبارہ نہیں دیکھی۔ یقینی طور پر وہ بھارتی سفارت خانے کے نچلے درجے کے ملازم تھے جنہیں اصولی طور پر اس لئے دوبارہ نہ بھیجا گیا کہ میں ان کی اصلیت جان چکا تھا۔ جاسوسی کی اصطلاح میں اسے "چہرہ ہو جانا" کہتے ہیں۔

اسی شام ہوٹل کی لابی میں تین افراد بیٹھے تھے جنہیں میں پہلے بھی اپنا پیچھا کرتے دیکھ چکا تھا۔ میں ریسپشن پر گیا اور نیچر کو کہا کہ اس اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں جسے آپ فائیو اشار کہتے ہیں۔ بھانت بھانت کے لوگ بلاوجہ لابی میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر ایسے ہی لوگوں کے درمیان یہاں ٹھہرے ہوئے Guests کو رہنا ہے تو پھر اتنا کرایہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ تین افراد یہاں اکثر نظر آتے ہیں ان سے پوچھیں کہ یہ کسے ملنے آئے ہیں۔ نیچر میرے ساتھ ان کے پاس آیا اور پوچھا کہ کس سے ملنا ہے۔ معقول جواب نہ ملنے پر نیچر نے گورکھا گیٹ کیپرز کو کہا کہ انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیں۔ ان کے ساتھ ہی میں بھی ہوٹل سے باہر آ گیا اور انہیں کہا کہ تم میرا کئی دن سے پیچھا کر رہے ہو۔ یہاں میری آمد و رفت کے اوقات دیکھتے ہو اور مجھ سے ملنے والوں کی بھی نگرانی کرتے ہو۔ تمہاری اصلیت میں جان چکا ہوں۔ اس دفعہ تو تمہیں چھوڑ رہا ہوں۔ آئندہ اگر ایسی حرکت کی تو بلا وارننگ گولیوں سے بھون ڈالوں گا۔ یہ بھی دوبارہ کبھی نظر نہ آئے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میری Surveillance (نگرانی) ختم کر دی گئی تھی۔ اب مجھے ہوئے تجربہ کار اور ریٹائرڈ آدی میرے پیچھے لگائے گئے۔ یہ سب بھارتی سفارت خانے کی طرف سے ہو رہا تھا۔ بھارت کے مقابلے میں یہاں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ وہاں میں اور میرے ساتھی چھپ کر وار کرتے تھے لیکن یہاں دو دشمن کھلے طور پر آمنے سامنے تھے۔ دونوں میں صرف ایک فرق تھا۔ بھارتی مقابلے پر سینکڑوں کولا سکتے تھے اور ان کے وسائل بھی بے پناہ تھے دوسری طرف میں اکیلا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

میرے دنیاوی وسائل میرا اکلوتا بھل اور کھکھڑی تھے لیکن میں نہتا اللہ کی مدد اور صبح مقصدیت کے سہارے ان کے دو بدو آ گیا۔

اب بھارتی سفارت خانے نے ایک نئی چال چلی۔ میری نگرانی کے بجائے مجھے اپنے جال میں پھانسنے کیلئے ایک تجربہ کار اور انتہائی چالاک بھارتی ایجنٹ کو میرے پیچھے لگا دیا گیا۔ یہ ایجنٹ اپنی خفیہ سرگرمیوں کے کور Cover دینے کیلئے کھٹمنڈو میں ایک کاروباری کی حیثیت سے رہتا تھا۔ اسی میں روڈ پر دو دکانیں تھیں۔ ایک دکان دیوی کی محل نما حویلی کے قریب اور دوسری اسی سڑک کے شروع میں مسلمان کشمیریوں کی شالوں کی دکانوں سے ملحقہ کیمسٹ کی دکان تھی۔ اس کے متعلق مجھے ملنے والے مہاجروں نے بتایا کہ یہ شخص مہاجروں کا ہمدرد ہے۔ بھارتی ہندو ہے لیکن بڑا دردمند اور انسان دوست ہے۔ جنرل مرچنٹ کی دکان پر صرف رجسٹریشن کارڈ کا نمبر لکھ کر مہاجروں کو مختلف برانڈ کے سگریٹ، چیونگم اور دوسری اشیاء تھوک سے بھی کم قیمت پر بیچنے کو دیتا ہے۔ لکڑی کی ٹرے جس سے چمڑے کے بیٹ گلے میں ڈالنے کیلئے بندھی ہوتی ہے، مفت فراہم کرتا ہے۔ مہاجران ٹریوں میں سامان رکھ کر شہر کے مختلف علاقوں اور خصوصاً ان گھٹیا اور کم کرائے والے گیٹ ہاؤس کے قریب یہ سامان بیچتے ہیں جہاں مغرب سے آنے والے یہی ٹھہرتے ہیں۔ وہ صحیح ضرورت مند مہاجروں کی مالی امداد کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ مہینے میں ایک آدھ بار بھارت جاتا اور فرنگی کیلئے سامان لاتا ہے۔ جب سے اسے آپ کے مہاجروں میں نقد رقم کمبل اور ادویات تقسیم کرنے کا علم ہوا ہے وہ آپ کا پرستار بن گیا ہے۔ ہر وقت آپ کی تعریف کرتا ہے۔ آپ سے ملنے کا بے حد شائق ہے لیکن کہتا ہے کہ میں بھارتی ہندو ہوں۔ ممکن ہے وہ مجھ سے اچھا برتاؤ نہ کریں۔

مہاجروں نے کچھ اس انداز سے اس کے قصیدے پڑھے کہ میں اس سے ملنے کو تیار ہو گیا اور ان ہی کے ذریعہ اسے ایک شام اپنے ہوٹل میں اسے مدعو کر لیا۔ ٹھیک وقت پر وہ آ گیا اور میں اسے کافی شاپ میں لے گیا۔ شکل و صورت اور لب و لہجے سے وہ بھارتی پنجاب کا لگتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام وجے کمار ہے اور وہ انبالے کا رہنا والا ہے۔ شرمناکھی (مہاجر) ہے تقسیم ہند سے پہلے وہ گوجرانوالہ میں محلہ گورونانک پورہ میں رہتے تھے۔ وہیں اس نے میٹرک پاس کیا اور اپنے پتا کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگ گیا۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باعث ماں باپ کا بہت لاڈ لگتا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ انبالہ آ گئے۔ جہاں اس کے پتا کے کاروبار نے بہت ترقی کی۔ انبالے میں ہی اس کی شادی ہوئی اور دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس کا گھرانہ نہایت آسودہ اور خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا۔ گوجرانوالہ سے آتے ہوئے اس کے پتا کے مسلمان دوستوں نے ان کی بہت مدد کی اور سوائے مکان اور دکان کے ان کا تمام سامان انہی مسلمان دوستوں نے خرید لیا تھا اور اسی سرمائے سے اس کے پتا نے کاروبار شروع کیا آج سے چھ سال پیشتر تیر تھ یا تیرا سے واپسی پر اس کے گھر کے تمام افراد کا ریکسیڈنٹ میں ہلاک ہو گئے۔ وہ اس لئے بچ گیا کہ کاروبار کی دیکھ بھال کیلئے انبالے میں رہ گیا تھا۔ اتنے بڑے حادثے اور بھرے پرے گھر کے یوں اجڑنے سے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ کئی ماہ کے علاج و معالجے کے بعد اسے کچھ افاقہ ہوا۔ انبالہ اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ ایک دوست نے اسے کھٹمنڈو جانے کا مشورہ دیا تا کہ حادثے کی تلخ یادوں کو بھلا سکے۔ وہ کھٹمنڈو آیا تو یہیں کا ہو کر رہا گیا اور انبالے کا کاروبار بند کر کے یہاں دو دکانیں کرائے پر لے کر روزی کمانا شروع کی۔ اس نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ اکیلا رہتا اور ماضی کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ مہاجر آئے تو ان کی کسمپرسی دیکھ کر اس کے اپنے زخم تازہ ہو گئے۔ اپنی محدود آمدنی سے چونکہ وہ تمام مہاجروں کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا تھا لہذا اس نے انہیں Street Hawker (پھیری والا) بننے کی ترغیب دی وہ تھوک ریٹ پر ادھار میں سامان انہیں دیتا ہے جس سے وہ پچیس تیس روپے روزانہ کماتے ہیں۔ آپ کے متعلق سنا کہ بہت بڑی رقم سے آپ نے مہاجروں کی مدد کی آپ کا ان دیکھا بچاری بن گیا اور آج آپ کے چرنوں میں بیٹھا ہوں۔

وجے نے اپنی داستان بڑے دکھ بھرے لہجے میں سنائی۔ مہاجروں کے ساتھ اس کی بے لوث ہمدردی اور حسن سلوک بھی بڑا متاثر کر دینے والا تھا۔ اس نے مہاجروں کو ایک طرح سے روزگار پر لگا دیا تھا۔ اس نے اور بعد میں مہاجروں نے بتایا کہ گزشتہ سالوں سے وہ ان کی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے اس کا لہجہ اور انداز ایسا بے ساختہ تھا کہ جس پر بے اختیار یقین کرنے کو جی چاہا۔ میں نے اس کی بے حد تعریف کی اتنے بڑے گھریلو صدمے کو سہنے اور اپنے زخموں کا علاج دوسروں کے زخموں پر مرہم لگانے سے کرنے پر داد دی۔ بہت سی باتیں ہوئیں غرض یہ کہ جب وہ جانے لگا تو میں اسے ہوٹل سے باہر تک چھوڑنے آیا۔ اس کے کردار نے مجھ پر گہرا اثر کیا تھا۔ مذہب و ملت سے بالاتر ہو کر انسانیت کی خدمت کرنے والا وجے کمار واقعی قابل تحسین تھا۔ آئندہ دس بارہ دنوں میں کئی بار میں اس کی دکان پر گیا اور اسے مہاجروں کے بیچنے کی اشیاء دیتے دیکھا۔ وہ بھی کئی دفعہ میرے بلانے پر میرے ہوٹل آیا اور ہم غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے کافی قریب آ گئے۔ شام کا وقت کاٹنا میرے لئے کافی تکلیف دہ ہوتا تھا۔ محسن پر گو مجھے پورا اعتبار تھا لیکن ذہنی طور پر وہ میرا دوست نہ بن سکا۔ وہ اپنے دیئے گئے مشن کو نہایت خوش اسلوبی سے پورا کر رہا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

اس نے شام کی محفلیں سجانے والے کئی ایجنٹوں کی اصل سرگرمیوں کو بے نقاب (uproot) کیا تھا میرے لئے وہ بہت ہی کارآمد تھا لیکن صرف مشن کی حد تک۔ ایک بے تکلف دوست کی کمی کو وجے نے پورا کیا اور ہماری اکثر شاخیں اکٹھی گزرنے لگیں۔ وجے چند روز کیلئے بھارت سامان لینے گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ تمام سامان لکھنؤ کی تھوک مارکیٹ سے خریدتا ہے جو رسول تک ٹرین اور آگے ٹرک پر کھٹنڈو آتا ہے۔ میرے لئے وہ میرے بغیر کہے بہت سارا نمکین کا جو لے آیا جو مجھے خشک فروٹ میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ میرے استفسار پر کہ اسے میری پسند کا کیسے پتا چلا اس نے کہا کہ ایک روز باتیں کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا کہ کا جو کھاتے ہوئے میں کبھی سیر نہیں ہوتا۔ آپ کی اسی بات سے مجھے آپ کی پسند کا پتہ چلا اور میں لے آیا۔ وجے میں ایک خاص خوبی تھی جو ہر انسان کی فطری کمزوری ہے یعنی وہ کبھی نہ بحث کرتا اور نہ ہی دوران گفتگو اس کا اپنا کوئی خاص موضوع ہوتا۔ میں جو بھی بات کرتا وہ میری ہاں میں ہاں ملاتا۔ میں نے جس موضوع پر بھی بات کی اس نے اسی کو پسند کیا اور گفتگو کا رخ کبھی نہ بدلا۔ میں بھی فطرت کی خامیوں سے بھرا ہوا انسان تھا۔ بھارت میں تشدد سہنے کے باعث مجھ میں نفسیاتی طور پر اپنی مخالفت برداشت نہ کر سکنے کی خامی پیدا ہو چکی تھی اور میرے لئے وہ انسان بہت قابل قبول تھا جو مجھ سے بحث نہ کرے۔ وجے کی ایک اور خاص بات میں نے نوٹ کی کہ اس نے اپنا ماضی تو میرے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا لیکن میرے ماضی اور حال کے متعلق کبھی کچھ نہ پوچھا۔ اس کی اس خوبی نے بھی مجھے اس کے زیادہ قریب کر دیا تھا۔ ایک شام وہ میرے پاس آیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا کہ انبالے سے اس کے چند دوست آئے ہیں جو کھٹنڈو میں چند روز ٹھہریں گے۔ اگر چہ وہ اس کے پرانے اور گہرے دوست ہیں لیکن متعصب ہندو ہیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ ان سے میرا تعارف کرائے۔ اس لئے یہاں ان کی موجودگی کے دوران اگر میرا اس سے آنا سا منا ہو جائے تو میں لاتعلقی ظاہر کروں۔ وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔ وجے کی اس صاف گوئی سے اس کی قدر و منزلت میرے دل میں اور بڑھ گئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرے خلاف سازش کا جو جال بنایا جا رہا ہے وجے اس کا مرکزی کردار ہے۔

وجے کے دوستوں کی موجودگی کے دوران میں نے اپنے سفارت خانے کے ملٹری اتاشی سے فون پر رابطہ کیا اور کہا کہ کچھ اہم معلومات ملی ہیں جو میں انہیں بتانا چاہتا اور ان پر مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایمپسی میں اگر ان سے ملوں تو باقی افراد چوکننا ہو جائیں گے۔ میرا ہوٹل بھی اس ملاقات کیلئے موزوں نہیں کیونکہ یہاں پر بھی میری نگرانی ہو رہی ہے۔ ملٹری اتاشی نے کچھ سوچ کر جواب دیا کہ ایسی صورت میں سب سے بہتر جگہ 'چنگ وا' چائیز ریسٹورنٹ ہے۔ آج رات 8 بجے میں وہیں آ جاؤں۔ یہ ریسٹورنٹ کھٹنڈو کے پوش علاقے میں تھا۔ میں رات آٹھ بجے وہاں پہنچ گیا۔ اتاشی صاحب بھی تقریباً اسی وقت وہاں پہنچے۔ ہم ایک کیبن میں بیٹھ گئے اور کھانے کا آرڈر دیا۔ میں نے محسن کی اکٹھی کی ہوئی معلومات انہیں بتائیں اور کہا کہ پاکستان بھیجنے کیلئے جاسوسوں کی ٹیم تیار کی جا رہی ہے۔ کئی مکانوں میں ان کی برین واشنگ کا سلسلہ جاری ہے۔ میرا Planted آدمی ان میں سے کچھ جگہوں پر خود برین واشنگ کی ان محفلوں میں شریک ہوا ہے۔

(جاری ہے)

غازی

مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جب افغان ایئر کی فلائٹس کا دوبارہ آغاز ہوگا تو انجانے میں سفارتخانے کے ذریعے جاسوسوں کی ایک بڑی کھیپ پاکستان پہنچ جائے گی۔ ملٹری اتاشینے میری ساری بات غور سے سنی اور جواب دیا۔ میرے اپنے مخبروں نے بھی مجھے ایسی اطلاعات دی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مہاجروں کے بھیس میں چھپے مکتی باہنی کے جاسوسوں کو ٹھکانے لگانے میں تمہارا ہاتھ ہے۔ فی الوقت تو تمہیں ان سے نجات مل گئی ہے لیکن ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان برین واش کرنے والے مہاجروں کا کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ مسلمان ہیں اور سقوط ڈھاکہ کے بعد مشرقی پاکستان سے آئے ہیں۔ بھارت میں قیام کے دوران ان کی کسی مجبوری یا کمزوری کے باعث بھارتی جاسوسی ایجنسیوں نے انہیں یہ مذموم کام کرنے پر آمادہ کیا ہے اور وہی انہیں مالی امداد بھی کر رہے ہیں۔ ملٹری اتاشینے اپنی مجبوری بتادی۔

اسے ہر کام اپنی حدود اور قانون کے دائرے میں رہ کر کرنا پڑتا تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ملٹری اتاشی نے یہ وعدہ کیا کہ اگر اس کے علم میں کوئی نئی بات آئی تو وہ مجھے ضرور آگاہ کرے گا۔ ہماری یہ میٹنگ ختم ہوئی تو میں افسردہ دل لے کر اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ میرے سامنے میرے بچے کچھ گھر کو جلا ڈالنے کے اسباب ہو رہے تھے اور میں اکیلا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ ایسے حالات میں مجھے قانون کے دائروں میں کام کرنے والوں کی نہیں بلکہ ایسے سر پھرے دیوانوں کی ضرورت تھی جو میرے گھر کو بچانے کیلئے بے خطر میرے دشمنوں سے بھڑ جاتے۔ دہلی سے قیصر اور لڑکوں کو دوبارہ بلانا ان کیلئے خطرے کا موجب بن سکتا تھا۔ نیپال پولیس نے ظاہراً مکتی باہنی والوں کے قتل کی تفتیش داخل دفتر کر دی تھی لیکن مجھے علم تھا کہ ان کا جاسوسی کا محکمہ خاموش نہیں بیٹھا ہے۔ اگر معاملہ صرف برین واشنگ کرنے والوں تک ہی محدود ہوتا تو اس کا حل یہ تھا کہ فلائٹس شروع کرنے کے بعد انہیں پہلی پرواز سے پاکستان بھجوا دیا جاتا جہاں ایئر پورٹ پر میرا محکمہ ان کے استقبال کیلئے موجود ہوتا اور وہ ان سے سب کچھ اگلا لیتا۔ لیکن فلائٹس شروع ہونے کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ جب تک فلائٹس شروع ہوتیں۔ یہ برین واشنگ کرنے والے نامعلوم کتنے مہاجروں کو اپنے چنگل میں پھانس چکے ہوتے۔ پاکستان پہنچنے والے تمام مہاجرین کی جانچ پڑتال کرنی ناممکن تھی۔ میں بڑے مخمضے میں پھنس گیا۔ یہ مہاجر اکیلے نہیں بلکہ اپنی فیملیوں کے ساتھ یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور انہیں ہلاک کرنے کی صورت میں ان کے بال بچے بے یار و مددگار رہ جاتے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اسی سوچ میں کئی دن گزر گئے لیکن کوئی حل نہ ملا۔

میں ایک روز رات کے کھانے کیلئے چنگ و ار ریستورنٹ میں گیا۔ اس ریستورنٹ کے مالک چینی مسلم تھے اور شام کو کاؤنٹر پر ان کی جوان لڑکی بیٹھتی تھی۔ سر کو مسلم انداز سے ڈھانپنے سے ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔ کھانے کے بعد میں قہوہ پی رہا تھا کہ کاؤنٹر والی لڑکی میرے پاس آئی اور انگریزی میں کہا کہ تین چینی مسلم مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ کھٹمنڈو میں تو میرا کوئی چینی واقف نہ تھا پھر یہ کون تھے۔ میں نے لڑکی کو کہا کہ میں یہاں کسی چینی کو نہیں جانتا۔ تمہارے ریستورنٹ میں بھی صرف چند مرتبہ آیا ہوں۔ بہر حال میں ان انجانے لوگوں سے ملنے کو تیار ہوں۔ لڑکی جو میرے جواب کے انتظار میں خاموش کھڑی تھی، مسکراتی ہوئی بولی "ریستورنٹ کے ساتھ ہی ہمارا گھر ہے۔ وہاں پر ملنا بہتر اور محفوظ ہوگا" محفوظ لفظ سن کر میں چونکا۔ گویا یہاں بھی میری وجہ شہرت پہنچ چکی تھی۔ لڑکی کی راہنمائی میں ان کے گھر گیا۔ مجھے ایک چائینز انداز کے سبے ہوئے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ اس کی دیواروں پر لگی خانہ کعبہ اور روضہ رسول مقبول کی تصاویر سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ مسلمان گھر ہے۔ لڑکی نے مجھے بتایا کہ ملنے کے خواہش مند آدھے گھنٹے کے اندر یہاں پہنچ جائیں گے کیونکہ انہیں ان کے گھروں سے بلایا گیا ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ وہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو میں مترجم کا کام کرے گی کیونکہ وہ لوگ انگلش نہیں جانتے۔ اس نے بتایا کہ کئی روز پہلے ان لوگوں نے ریستورنٹ میں میرا پیچھا کیا تھا لیکن چونکہ میرے ساتھ پاکستانی سفارت خانے کا افسر تھا۔ اس لئے بات نہ ہو سکی انہوں نے لڑکی سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ جب بھی میں ریستورنٹ میں آؤں وہ انہیں فوری اطلاع کر دے۔ میرے مزید کرید نے پر لڑکی نے صرف یہ بتایا کہ وہ میرے دشمن نہیں بلکہ خیر خواہ ہیں۔ آدھا گھنٹہ پورا ہونے سے پہلے ہی جوان اور ورزشی جسم کے تین چینی آگئے۔ انہوں نے چینی لہجے میں السلام و علیکم کہا اور مجھ سے مصافحہ کر کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہی گفتگو کا آغاز کیا اور کہا کہ انہیں محکمے کی طرف سے میری حفاظت کرنے اور میری مدد کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ میں ان کی بات نہ سمجھ سکا اور پوچھا کہ میں نے تو کبھی بھی اپنی حفاظت اور مدد کیلئے کھٹمنڈو میں کسی سے نہیں کہا۔ وہ تفصیلاً بتائیں کہ وہ کون ہیں اور کس محکمے نے انہیں یہ کام سونپا ہے۔ لڑکی مترجم بنی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ میرا سوال صاف صاف انہیں سمجھائے اور یہ بھی کہے کہ وہ شاید کسی دوسرے کے مغالطے میں مجھ سے بات کر رہے ہیں۔ لڑکی نے انہیں میرا سوال سمجھایا تو انہوں نے آپس میں گھس پھس کی اور پھر لڑکی کو جو کچھ کہا اس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ مجھے اپنے محکمے کا نام نہیں بتا سکتے۔ میری حفاظت اور مدد کرنے کے احکام انہیں ان کے محکمے نے دیئے ہیں اور اپنی سچائی اور میرے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی صورت میں یہ لفافہ مجھے دینے کی ہدایت کی ہے۔ میں نے لفافہ لے کر چاک کیا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک چھوٹے سے کاغذ پر میرے محکمے کا نام، میرا اصل نام اور میرا بنیادی کوڈ نمبر لکھا ہوا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

بھارت میں قیام کے دوران کھٹمنڈو میں، میں نے یہ کوڈ نمبر کسی کو بھی نہیں دیا تھا۔ وہ ایک دوسرا کوڈ تھا جو دہلی میں اپنے ہمدردوں، بمبئی میں حاجی مستان اور کھٹمنڈو میں سفیر کو دیا تھا۔ یہ میرا بنیادی کوڈ تھا جس کا علم صرف مجھے اور میرے محکمے کو تھا۔

پرچہ میرے ہاتھ میں تھا اور میں بڑی حیرانی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان چینوں کے چہرے بالکل سپاٹ تھے اور لڑکی کی نگاہیں بھی میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں کاغذ کے اس ٹکڑے پر لکھے الفاظ سے صاف ظاہر تھا کہ میرے محکمے نے اپنے وسائل سے ان کے محکمے سے رابطہ کیا اور میرے تحفظ اور مجھ سے تعاون کرنے کیلئے اسے اعتماد میں لے کر ان کے آدمی حاصل کئے۔ چین جیسے عظیم ملک سے پاکستان کے برادرانہ تعلقات روز روشن کی طرح عیاں تھے۔ 65ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران چین نے بھارت کو مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے سے روکنے کیلئے جس طرح دباؤ ڈالا تھا اس پر ساری دنیا حیران تھی۔ جنگ کے دوران چین نے بھارت کو 24 گھنٹے کا الٹی میٹم دیا تھا کہ اس کی ملکیت جو بھیڑیں بھارت نے بارڈر پر چوری کی تھیں اگر ہو بہو وہی بھیڑیں واپس نہ کی گئیں تو وہ بھارت پر حملہ کر دے گا۔ اسی دھمکی کی وجہ سے بھارت کو مشرقی پاکستان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ ہوئی۔ شاید بعض قارئین کو یہ علم نہ ہو کہ چین اور مشرقی پاکستان کے بارڈر کے درمیان ایک جگہ پر بھارتی زمین کی صرف 18 میل چوڑی پٹی ہے جسے سرعت سے عبور کر کے چینی فوجیں مشرقی پاکستان میں اس کے دفاع کیلئے داخل ہو سکتی تھیں۔ بھارت جرائی ہوئی بھیڑیں تو واپس نہ کر سکا لیکن ان کے عوض ہزاروں بھارتی بھیڑیں پیش کیں لیکن چین صرف اپنی چوری شدہ بھیڑیں لینے پر ہی مصررہا۔ 62ء میں چین بھارت چند روزہ جنگ نے بھارت پر چین کی ایسی دہشت طاری کر دی تھی کہ 65ء میں بھیڑوں کی واپسی کے مطالبے میں چھپی ہوئی وارننگ کو وہ بخوبی سمجھ گیا اور مشرقی پاکستان اس جنگ کے دوران بھارتی ہاتھوں سے بالکل محفوظ رہا۔

مجھے ان تینوں چینی ہمدردوں سے مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہ تھی۔ صرف ایک دشواری تھی کہ میں ان سے زبان کی ناواقفیت کے باعث ڈائریکٹ بات نہ کر سکتا تھا اور یہ بیس بائیس سالہ چینی لڑکی کس حد تک قابل اعتماد تھی۔ اس کا مجھے کچھ علم نہ تھا میں نے کوئی اور چارہ نہ دیکھتے ہوئے لڑکی سے سوال کیا کہ کئی اہم اور خفیہ معاملے ہیں جن کی رازداری اولین شرط ہے۔ بطور مترجم کے کیا میں اس پر بھروسہ کر سکتا ہوں۔ لڑکی کا چہرہ بچھ گیا۔ شاید اسے میرے اس سوال پر اپنی تحقیر دکھائی دی تھی۔ اس نے چند لمحوں میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری بے اعتباری کا شکوہ کیا اور پھر Please wait one moment کہہ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور چند منٹوں میں ہی تین مختلف بھارتی انگریزی اخبار لا کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ ان تینوں اخباروں میں میری تصاویر، انعامی رقوم اور تفصیلات درج تھیں۔ اس نے مجھے میرے اصلی نام سے جو اخباروں میں درج تھا مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ”کیا یہی کافی ہے یا کسی مزید تصدیق کی ضرورت ہے؟“ میں ہنس پڑا۔ اس کے سوال پر بھی اور اپنی اس شہرت یا بدنامی پر بھی جو بھارت سے نکل کر نیپال اور نامعلوم کہاں کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ میری ہنسی میں سب شریک ہو گئے اور لڑکی کے چہرے سے ناگواری کے تاثرات بھی ختم ہو گئے۔ نیپال میں قیام کے آخری روز تک میرے یہ نئے ساتھی میری ہر طرح سے حفاظت کرتے رہے بلکہ ان کے ذریعے مجھے اپنے مشن کی تکمیل کیلئے کئی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تینوں چینی ہانگ کانگ کے رہنے والے تھے اور چین کی حکومت سے ان کا ظاہری کوئی رابطہ نہ تھا۔ لڑکی جو چہرے سے کم عمر دکھائی دیتی تھی دراصل 26 سال کی تھی۔ (جاری ہے)

غازی

اس نے مترجم کے علاوہ اپنے ریسٹورنٹ میں آنے والے گاہکوں کی خصوصاً بھارتی سفارت خانے کے ارکان کی گفتگو کو خفیہ طور پر ریکارڈ کرنے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ اس کے والدین چین کے صوبے یوہان سے ہجرت کر کے نیپال میں آئے تھے۔ والدین کی یہ اکلوتی بیٹی اپنے نڈر پن، صاف گوئی اور ذہنی ہم آہنگی سے غیر محسوس طور پر میرے خاصے قریب آ گئی۔ اس کے والدین نے مجھے کھٹمنڈو میں مستقل قیام یا نکاح کے بعد اپنی بیٹی کو پاکستان بھیجنے کی پیشکش بھی کی۔ میں نے بہت سنجیدگی سے اس بارے میں سوچا۔ میں اگر چہ شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ تھا لیکن اس لڑکی میں جو خوبیاں تھیں میرے ساتھ اس کی جو ہم آہنگی تھی اس سے میں اپنی ازدواجی زندگی میں یکسر محروم تھا۔ ہم دونوں مثبت فیصلے پر پہنچنے کے بالکل قریب تھے کہ یہ لڑکی تیزی سے موڑ کاٹتے ہوئے اسٹیرنگ پر قابو نہ رکھ سکی۔

کار سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں جاگری اور لڑکی اپنی والدہ سمیت اس حادثے میں ہلاک ہو گئی۔ ہمارے سارے پروگرام ادھورے کے ادھورے رہ گئے۔ اگر انسان کی سب ہی خواہشات پوری ہو جائیں تو وہ خود کو خدا سمجھ بیٹھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے ”میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اللہ کو پہچانا“ واقعی انسان بے حد مجبور اور محدود ہے۔ بے حد و حساب قوتوں اور ہر شے کی خالق اور مالک صرف ذات باری تعالیٰ ہے جو ہر بات پر قادر ہے ہم فانی انسان اپنی کامیابیوں کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں حالانکہ ہماری ہر کامیابی اور ناکامی اس ذات باری تعالیٰ کی رضا کی محتاج ہے۔ جو کسی کا محتاج نہیں (د)۔

میں نے ان چینی ہمدردوں کو کہا کہ ٹھیک ایک ہفتے بعد آج ہی کے دن اسی وقت وہ مجھے ملیں تاکہ اس دوران میں اپنے مشن کو آخری شکل دے سکوں۔ اس طرح انہیں یہ بتانے میں آسانی ہوگی کہ وہ میرا کس حد تک ساتھ دے سکتے ہیں۔ وہ ملنے کا وعدہ کر کے بڑی گرمجوشی سے رخصت ہوئے۔ میں نے لڑکی سے اس پر شک کرنے کی معذرت کی اور اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ اب مجھے یہ تسلی ہو گئی تھی کہ کھٹمنڈو میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں، میں تنہا نہیں بلکہ بے لوث ہمدرد بھی میرے ہمراہ ہیں۔ ہوٹل پہنچا تو محسن میرے انتظار میں لابی میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ محفلیں جمانے اور برین واش کرنے والوں کی رہائش گاہوں اور ان تک جانے کے مکمل نقشے مجھے بنا کر دے۔ ان کے نام اور محفلیں ختم کرنے کے اوقات بھی نوٹ کرے اور یہ سب تفصیلات مجھے 6 دنوں میں لازماً پہنچا دے۔ محسن نے اپنی ڈائری میں ان کے متعلق پہلے ہی بہت کچھ نوٹ کر رکھا تھا۔ باقی مطلوبہ تفصیلات اس نے تین چار روز میں اکٹھی کر کے مجھے دے دیں۔ پانچ افراد ایسے تھے جن کے گھروں میں برین واشنگ ہوتی تھی۔ ان کی مزید تصدیق کیلئے میں نے ملٹری اتاشی سے اس کو فراہم شدہ لسٹ مانگی تو اس میں بھی صرف انہی پانچ لوگوں کے نام تھے پورے طور پر اپنی تسلی کر لینے کے بعد بھی میں اس کے تذبذب میں تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ مجھے بار بار ان کی فیملیز کا خیال آتا کہ ان کا کیا بنے گا اور وہ بے سہارا رہ جائیں گے اور ان کو ڈھیل دینے کا مطلب تھا کہ پاکستان کے مفاد کے خلاف کام کرنے والوں سے صرف نظر کیا جائے اور اپنی آنکھوں کے سامنے دشمنان پاکستان کو بے ضرر مہاجروں کو پاکستان دشمنی کے انجکشن لگاتے دیکھوں اور چپ رہوں۔ اس صورت میں، میں اپنے وطن سے غداری اور اپنے فرض سے جان بوجھ کر چشم پوشی کا مرتکب ہوتا۔ اگر میں ان کی سرگرمیوں پر خاموش رہ کر ان کے پاکستان پہنچنے اور وہاں اپنے محکمے کو ان سے نبٹنے کیلئے چھوڑ دیتا تو اس عرصے میں نامعلوم کتنے سادہ اور نا سمجھ مہاجروں کو چنگل میں پھنسا چکے ہوتے۔

(جاری ہے)

غازی

پاکستان میں بھی ان کا یہی حشر ہونا تھا جو میں یہاں کر سکتا تھا لیکن یہاں پر میں برائی کو مزید پھیلنے سے روک سکتا تھا۔ میں نے بالآخر یہ طے کر لیا کہ ان سے یہاں ہی نمٹا جائے۔

ساتویں روز میں ان کے متعلق پوری تفصیلات لے کر چنگ وار ریسٹورنٹ میں گیا اور چینی ہمدردوں کو ان کے گھروں اور راستوں کی تمام تفصیل بتادی۔ انہوں نے آئندہ شام ملنے اور اسی رات ایکشن لینے کا فیصلہ کیا۔ ان کے گھروں تک پہنچانے اور ان خدایوں کو پہچاننے کی ذمہ داری محسن کے سپرد تھی۔ واپسی پر میں نے محسن کو آئندہ رات کا سب پروگرام سمجھایا۔ اسے صرف چینی دوستوں کو ان کے گھروں تک لے جانا اور دروازے کھلوا کر ان کی نشاندہی کرنی تھی۔ باقی کام چینی دوستوں نے کرنا تھا۔ شام کو میں محسن کے ہمراہ ریسٹورنٹ تک گیا۔ محسن کو باہر چھوڑ کر میں چینی دوستوں سے ملا۔ ان کا طریقہ واردات بڑا انوکھا اور نیا تھا۔ ان کے پاس ایئر ریفلیکشنز کے سائز کے تین سلنڈر تھے جن میں انتہائی زہریلی گیس بھری ہوئی تھی۔ ان کے بقول یہ گیس کسی کے چہرے پر خارج کرنے سے سیکنڈوں میں ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ گیس سے محفوظ رہنے کیلئے وہ 5 گیس ماسک بھی لائے تھے۔ رات گیارہ بجے ایکشن کا وقت مقرر ہوا۔ جب سب باتیں طے ہو گئیں تو میں نے محسن کو ان سے ملوایا۔ اس مشن میں چونکہ عملی طور پر میرا کوئی حصہ نہ تھا۔ اس لئے میں محسن کو ان کے سپرد کر کے اپنے ہوٹل واپس چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی فون کی گھنٹی بجی۔ لائن پر لڑکی تھی اس نے کہا کہ میں فوراً ریسٹورنٹ آ جاؤں۔ ہوٹل میں میری اتھری درج ہو چکی تھی۔ میں ٹہلنے کے بہانے باہر نکلا اور رکشے پر ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔ لڑکی نے بتایا کہ ایک تو محسن کو انگریزی نہیں آتی۔ دوسرے گاڑی چاہئے۔ پروگرام چونکہ اچانک تھا اس لئے گاڑی کا انتظام کرنا ہم سب بھول گئے تھے۔ اب مجھے سردار پرنام سنگھ شیر پنجاب ریسٹورنٹ کے مالک سے گاڑی لینی تھی۔ لڑکی نے میری یہ مشکل اپنی گاڑی دے کر آسان کر دی۔ رات ساڑھے دس بجے ہم پانچوں اپنے ہدف کی طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے محسن کے کہنے کے مطابق گاڑی مین سڑک پر روک دی اور محسن ان تینوں کے ساتھ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ واپس لوٹے۔ محسن نے بتایا کہ کام ہو گیا ہے اب ہم دوسرے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ مجھے یہ واقعہ تحریر کرتے ہوئے بھی بڑی ذہنی کوفت اٹھانی پڑ رہی ہے مجھے ان بد بختوں کے بیوی بچوں کا پردیس میں بے یار و مددگار رہ جانے کے خیال نے پریشان کر رکھا تھا۔ یہ انتہائی اقدام میں نے بہت مجبوری کی حالت میں اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ دوسری کوئی بھی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ان موذیوں سے پیچھا چھڑانا بھی لازمی امر تھا۔ تین گھنٹے میں ان پانچوں کو ٹھکانے لگا کر ہم واپس لوٹے۔ چینی راستے میں ہی اتر گئے۔ ان کے جانے سے پہلے بہت ہی مشکل سے میں انہیں صرف یہ سمجھا سکا کہ دس روز بعد شام کو وہ مجھے ریسٹورنٹ میں ملیں۔ بہت بوجھل دل کے ساتھ میں ریسٹورنٹ تک پہنچا۔ محسن کو بھی میں نے راستے میں ہی اس کے گیسٹ ہاؤس کے قریب اتار دیا تھا۔ لڑکی اور اس کے والدین ابھی تک ہماری راہ دیکھتے ہوئے جاگ رہے تھے۔ اس وقت رات کے اڑھائی بج رہے تھے۔ میرے سر میں سخت درد ہونے لگا۔ اس وقت ہوٹل جانا بھی مناسب نہ تھا۔ لڑکی نے میری حالت دیکھتے ہوئے چائے بنائی اور اپنے والدین کی ایما پر مجھے بقیہ رات وہیں گزارنے کا کہا۔ میں بھی بے حال ہو رہا تھا۔ ان کا گھر خاصہ بڑا تھا۔ ایک کمرے میں میرے سونے کا انتظام کیا گیا۔ لڑکی نے چائے کے ساتھ مجھے اسپرو دی اور میں نے پریشان دل و دماغ کے ساتھ چند گھنٹے سوتے جاگتے گزار دیئے۔ بادی انظر میں میرا یہ قتل و غارت کا سلسلہ وحشت و بربریت کی داستان دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اگر قارئین اس وقت کھٹمنڈو کے حالات، مہاجرین کی بے بسی اور ان کی بے بسی کا فائدہ اٹھانے والے بھارتی ایجنٹوں کی پاکستان دشمن کارروائیوں اور مہاجرین کے ورغلانے کے واقعات کو پیش نظر رکھیں تو وہ میرے اس انتہائی اقدام کو میری مجبوری سمجھ کر جاہل قرار دیں گے۔ سانپ کو اس لئے زندہ چھوڑ دینا کہ اس کے بچے ہیں خود اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جنگ کے دوران زد میں سامنے آئے دشمن کے بیوی بچوں کا خیال اگر ایک سیکنڈ کیلئے بھی لمبی پرانگی کی گرفت کو کمزور کر دے تو دشمن کے ہاتھوں اپنی ہلاکت لازمی ہے۔

دشمن کو اس سے پہلے ہلاک کر دو کہ وہ تمہیں ہلاک کر دے محض محاورہ نہیں بلکہ وہ ٹھوس حقیقت ہے، جس پر دنیا میں سب سے پہلی لڑی جانی والی جنگ سے لے کر آج تک عمل ہو رہا ہے۔ بھارت اور کھٹمنڈو میں میرے اور میرے ساتھیوں کے ہاتھوں جتنے لوگ بھی مارے گئے، ان سے ہماری نتو ذاتی دشمنی تھی اور نہ ہی کوئی مذہبی جھگڑا تھی سب ہی بال بچوں والے تھے۔ گورکھ پور کے ہوائی اڈے پر بھی کام کرنے والوں میں بھی کئی مسلمان ہوں گے جو آگ میں جل کر رکھ ہو گئے۔ ہم نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ اپنے وطن کی آبرو اور سالمیت کی بقا کی خاطر کیا۔ جس پر ہمیں کوئی پشیمانی اور ندامت نہیں۔ اسی تناظر میں کھٹمنڈو میں کئے گئے مشنوں پر بھی مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ کیونکہ یہ بھی وطن عزیز کے وسیع تر مفاد میں انجام دیئے گئے تھے یہ اسی زنجیر کی کڑیاں تھیں جسے توڑنے کیلئے میں اور میرے ساتھی پاکستان میں اپنے اہل و عیال کو سپرد خدا کر کے تین سال سے زیادہ عرصے سے دن رات بھارت اور کھٹمنڈو میں موت سے کھیل رہے تھے۔

اگلے روز دن چڑھے میں اپنے ہوٹل گیا۔ شام کو محسن آ گیا اور گزشتہ رات کی کارروائی تفصیلاً بتائی۔ مرنے والوں کے گھروں میں ات کوئی واویلا شروع ہو گیا تھا ان گھروں کے باقی افراد کو کچھ علم نہ تھا کہ دروازے کس نے کھٹکھٹائے اور وہ کیونکر موت سے ہمکنار ہوئے اس بار پولیس میں بھی کوئی رپورٹ درج نہ کی گئی چونکہ لواحقین کے پاس نہ تو کوئی چشم دید گواہ تھا اور نہ ہی مرنے والوں کے جسم پر کوئی ایسا نشان جس سے انہیں ہلاک کئے جانے کا ثبوت مل سکے۔ ہر کوئی قیاس کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔ لیکن تہہ تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ مجھے بھارتی جاسوسی ایجنسیوں کی پست ذہنیت سے پوری توقع تھی۔

(جاری ہے)

غازی

اپنے ضمیر اور غیرت کو بیچنے والے ان وطن فروشوں کے مرنے کے بعد ان ایجنسیوں نے مالی امداد تو دور کی بات ہے ان کے پسماندگان سے اظہار تعزیت بھی نہ کیا ہوگا۔ اس واقعے کو دس بارہ روز گزر گئے تو میں نے مہاجروں کے نمائندوں کے ذریعے ان پانچوں کے اہل خانہ کو دس دس ہزار روپے بھیجے اور پاکستانی سفر کے ذریعے پانچوں کے اہل خانہ کو فلائٹس شروع ہونے کے بعد ابتدائی پروازوں میں پاکستان بھجوانے کا انتظام کروایا۔ کھٹمنڈو میں اب کم از کم میرے علم کے مطابق مہاجروں کے روپ میں نہ تو کوئی ملتی باہنی والا باقی تھا اور نہ ہی کوئی وطن فروش۔ ان کی محفلوں میں شریک ہونے والے مہاجر بھی تتر بتر ہو چکے تھے۔ محسن کا ان سے کئی بار آنا سامنا ہوا بھی تو وہ کئی کئی گھنٹے گئے۔ وطن فروشوں کا انجام دیکھ کر بھی شریک کے محفل کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ یہ ہمیں تھے جو جان ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے۔

ان کی طرف سے فراغت ملی تو میں نے دن کو بوجے کمار اور شام کو چنگ ریٹورنٹ میں جانا شروع کر دیا۔ بوجے کمار کی کسرتھی ویسی ہی تھی۔ اس کے ہمراہ میں جتنا وقت بھی گزارتا، مجھے اک گونا اطمینان قلب اور سکون ملتا۔ اس کی باتیں ہی تھیں کہ ہر کسی کا دل موہ لیتیں۔ میرا کئی بار جی چاہا کہ اسے چنگ وار ریٹورنٹ میں لے جاؤں یا اس آگ کے بارے میں بتاؤں جس کی تپش میں اور چینی لڑکی مریم دونوں محسوس کر رہے تھے۔ لیکن ہر بار اس لئے رک جاتا کیونکہ دلوں کا یہ معاملہ ابھی بالکل ابتدائی مرحلوں میں تھا۔

سفارت خانے بھی اکثر جانا ہوتا۔ سفیر صاحب میری طرف سے بے فکر ہو چکے تھے اور کسی حد تک ممنون احسان بھی تھے۔ اکثر مجھے کھانے کی دعوت دیتے جسے میں اپنی مصروفیات کا بہانہ بنا کر معذرت کر لیتا۔ ایک دن دفتر میں بڑی رازداری سے کہنے لگے کہ تمہارے متعلق وزارت خارجہ نے کہا ہے کہ تمہیں جلد از جلد پاکستان بھیج دیا جائے۔ کہو کیا خیال ہے۔ میں ابھی کھٹمنڈو سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ابھی کچھ فیصلے کرنے تھے۔ ذاتی بھی اور مشن کے متعلق بھی میں نے کہا کہ ابھی تو میں کچھ عرصہ یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ جب تک میرا محکمہ مجھے واپس نہیں بلاتا، میں واپس نہیں جاسکتا۔ اگر وزارت خارجہ میرے اخراجات ادا نہیں کر سکتی تو میں اپنے ذاتی وسائل سے یہاں رہوں گا۔ میں اصل حقیقت جانتا تھا۔ سفارت خانہ مجھ پر اٹھنے والے خرچ کے ایک ایک پیسے کی تفصیلی رپورٹ وزارت خارجہ کو بھیجتا تھا جسے میرے محکمے سے وصول کر لیا جاتا تھا۔ میں نہ تو وزارت خارجہ کے ماتحت تھا اور نہ ہی ان کے حکم کا پابند۔ میری خصوصی ڈاک میں میرے محکمے نے میری واپسی کے متعلق کوئی اشارہ تک نہیں کیا تھا۔ بلکہ چینی ہمدرد بھیج کر مجھے اپنا مشن مکمل کرنے میں سہولت میسر کی تھی۔ سفیر صاحب میرا جواب سن کر خاموش ہو گئے۔ آئندہ آنے والے دنوں میں مجھے معلوم ہوا کہ سفیر صاحب میری کھٹمنڈو سے روانگی کیوں چاہتے تھے۔ UNO کی طرف سے ادویات، کپڑوں اور خشک دودھ کی ایک بڑی لاٹ آنے والی تھی۔ میری موجودگی میں اس امداد کی ایک رائی بھی بازار میں فروخت کرنا ان کیلئے ناممکن تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ UNO کا ایک سینئر نمائندہ بھی آنے والا ہے۔ جو امدادی سامان اور قوم کی تقسیم کا جائزہ بھی لے گا۔ ایمبسی کی طرف سے مہاجرین کو ابھی تک امدادی الاؤنس صرف تیس روپیہ مہینہ فی کنبہ ملتا تھا۔ جب کہ قوم سو روپیہ فی خاندان کے حساب سے بھیجی گئی تھیں۔ سفیر صاحب اور سفارت خانے کے ان افراد کو جو اس بندر بانٹ میں شریک تھے۔ میرے ذریعے اس راز کے طشت از بام ہونے کا خطرہ تھا۔ میں نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اور سفیر صاحب کی سیاسی اور سفارتی چالاکیوں سے بچنے کیلئے ایک فیصلہ کیا اور رجسٹرڈ ڈاک سے ایک خط سفیر صاحب کے نام بھیجا جس میں، میں نے لکھا تھا کہ چند ذاتی وجوہات کی بنا پر میں کھٹمنڈو میں مزید قیام کرنا چاہتا ہوں۔

بہت سے واقعات ایک ساتھ ہو رہے تھے اس لئے کچھ کو ادھورا چھوڑ کر مجھے باقی لکھنے پڑتے ہیں پھر بھی میری کوشش ہے کہ تسلسل برقرار رہے۔ چینی دوست مجھے ٹھیک دسویں روز چنگ وار ریٹورنٹ میں ملے۔ مریم نے بتایا کہ بھارتی سفارت خانے کی گاڑی میں کچھ لوگ ریٹورنٹ میں گزشتہ دنوں آئے تھے۔ وہ ہندی میں بات چیت کر رہے تھے جسے وہ سمجھ تو نہ سکی لیکن تمام گفتگو ریکارڈ کر لی۔ مریم کے گھر اپنے چینی دوستوں کے ہمراہ میں نے یہ ساری گفتگو سنی۔ گفتگو میں تین افراد شامل تھے اس ساری بات چیت کا موضوع کسی کام کو انجام دینے کی تاریخ طے کرنا تھا۔ دو آوازیں تیسرے کو قائل کرنے اور دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کے مطابق ساری منصوبہ بندی ہو چکی تھی بھارت سے آئے ہوئے لوگ کئی دنوں سے بھارتی سفارت خانے میں بیکار پڑے ہوئے تھے مزید تاخیر کسی طرح بھی مناسب نہ تھی۔ تیسری آواز والا اپنی صفائی دتا اور مجبور ظاہر کر رہا تھا 'سر آپ بالکل درست فرماتے ہیں میں اسے اپنے ہمراہ پکنک پر چلنے کی دعوت تو دے سکتا ہوں لیکن زبردستی ہمراہ نہیں لے جاسکتا۔ میں نے ہر طرح سے اس کے دل میں گھر کر لینے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہوا ہوں وہ ہر دو تین دن کے بعد دکان پر آتا تو ہے لیکن اس کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ جب جی چاہا آگیا میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ اس کو ایسا کروں کہ وہ میرے ساتھ باہر جانے سے انکار نہ کر سکے۔ میری دکان کے علاوہ وہ اور بھی کہیں جاتا ہوگا اگر اس کی نگرانی کی جائے تو اس کے دوسری جگہوں پر جانے کے راستوں میں کئی سنسان جگہیں بھی آتی ہوں گی۔ کیا وہاں کارروائی نہیں ہو سکتی؟'

(جاری ہے)

غازی

اس کے جواب میں کہا گیا کہ ہمارے نگرانی کرنے والے لوگوں کو اس نے پہچان لیا تھا لہذا وہ لوگ اس کام کیلئے بیکار ہو گئے۔ سنسان جگہوں پر اسے ہلاک کرنا تو کوئی مشکل نہیں لیکن اوپر کے احکام کے مطابق ہمیں اسے زندہ DMI کے حوالے کرنا ہے۔ چھوٹے کنٹینر والی پک اپ ہر وقت تیار رہتی ہے ہمارے آدمی بیٹھے بیٹھے اکتا گئے ہیں۔ ہماری آرمی کے سامنے سے وہ کئی بار گزرتا ہے لیکن اس کے گزرنے کے اوقات معلوم نہ ہونے کے باعث اب تک وہاں بھی کوشش نہیں کی گئی۔ کیونکہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری ناکامی کی صورت میں وہ چوکننا ہو جائے۔ اسی گفتگو کے دوران بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ تیسری آواز والا ایک رکشہ دو تین روز کیلئے کرائے پر لے۔ جسے رکشہ چلانے والے کے بجائے ان کا آدمی رکشہ ڈرائیور کے روپ میں میرے ہوٹل کے سامنے میرا انتظار رہے جبکہ دوسرا آدمی واکا کی ٹاکی کے ذریعے میرے اس رکشے پر بیٹھتے ہی بھارتی آرمی کو اطلاع دے۔ جیسے کہ پہلے بھی کسی قسط میں عرض کر چکا ہوں کہ بھارتی سفارت خانہ پاکستانی آرمی کو جاتے ہوئے راستے میں عین اس جگہ واقع تھا جہاں سڑک 45 کا زاویہ بناتے ہوئے بائیں جانب گھومتی تھی۔ واکا کی ٹاکی پر پیغام ملتے ہی بھارتی سفارت خانے کے دروازے کھول دیئے جائیں اور رکشہ ڈرائیور تیزی سے سیدھا سفارت خانے کے اندر جائے۔ سفارت خانے کے اندر پہنچتے ہی میں بھارتی سر زمین میں ہوتا اور وہاں مجھے بڑی آسانی سے قابو کر کے بے ہوش کیا جاتا اور کنٹینر والی پک اپ میں بھارت بھیج دیا جاتا۔ یہ پروگرام طے ہو گیا کہ اگلے روز تیسری آواز والے نے رکشے کا انتظام کرنا تھا اور اس کے آئندہ دن سے اس پلان پر عملدرآمد شروع ہو جانا تھا۔ مریم اور چینی دوست بے بصری سے اس گفتگو کا ترجمہ سننے کو بے تاب تھے۔ میں نے شروع سے آخر تک مریم کیلئے ساری گفتگو کا انگریزی میں ترجمہ کیا جسے مریم نے چینی زبان میں دوستوں کو سمجھایا۔ اس ساری گفتگو میں میرا نام کہیں نہ لیا گیا تھا۔ صرف ”مسلے، ہوٹ اور DMI“ کے لفظوں نے سب کچھ واضح کر دیا تھا کہ پلان میرے خلاف تھا۔ چینی دوستوں نے کہا کہ آج بلکہ ابھی سے وہ بطور گارڈز کے یا میرے ہمراہ اور یا تعاقب میں رہیں گے۔ مریم یہ سب پلان سن کر پریشان ہو گئی اور والدین سے اجازت لے کر مجھے اپنی گاڑی مستقل استعمال میں رکھنے کی آفر کی۔ میں نے انکار کیا تو اس نے بڑے پرزور دعوئی سے پوچھا کہ آخر کیوں نہیں۔ کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو۔ میں نے اسے سمجھایا کہ مستقل طور پر گاڑی اپنے استعمال میں رکھنے سے میں اور زیادہ غیر محفوظ ہو جاؤں گا۔ گاڑی میں بم بھی پلانٹ کیا جاسکتا ہے۔ اس پر گریڈ بھی پھینکا جاسکتا ہے اور گولی بھی چلائی جاسکتی ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے سمجھایا ورنہ وہ تو مانتی ہی نہ تھی۔ چینی دوستوں نے بھی صبح 10 بجے سے رات جب تک کہ میں اپنے ہوٹل پہنچ جاؤں گا رڈز کے طور پر میری حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی۔ باری باری ایک گارڈ نے چھٹی کرنی اور دو نے میری حفاظت کرنی تھی۔ ہمارا Counter plan بالکل تیار تھا ایک بات میرے دماغ میں اٹکی ہوئی تھی۔ یہ تیسری آواز والا کون تھا جو باقی دونوں کو سر کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور جس کی دکان پر بھی میں اکثر جاتا تھا۔ قارئین تو اب تک سمجھ چکے ہوں گے کہ وہ کون تھا کیونکہ گزشتہ صفحات میں اس کے حوالے سے میں نے خاصے صاف اشارے دیئے ہیں لیکن مریم کے گھر میں ریکارڈ شدہ گفتگو سن کر اس تیسرے شخص کو فوری پہچاننا دشوار تھا۔

(جاری ہے)

غازی

میں کئی دکانوں پر اکٹرا جاتا تھا۔ ریکارڈ میں آواز بھی جانی پہچانی لگتی تھی۔ میں نے ٹیپ دوبارہ چلوائی اور جب تیسری آواز کے یہ الفاظ کہ ”میں نے ہر طرح سے اس کے دل میں گھر کر لینے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہوا ہوں“ دوبارہ سنے تو یکبارگی میری آنکھوں کے سامنے وہ شخص آگیا جس کی دکان پر اکٹرا جاتا تھا اور جس کی موہ لینے والی باتوں اور انکساری نے مجھے اس کا دوست بنا لیا تھا یہ وجہ کماز بھی بھارت کی کسی جاسوس ایجنسی کا رکن تھا ہر کوئی اپنے اپنے رنگ میں میرے ساتھ دشمنی میں رنگا ہوا تھا۔ بھارت اور کھٹمنڈو میں اپنے سارے قیام کے دوران میں نے کسی کو سمجھنے میں پہلی بار غلطی کی تھی میں نے دل میں کہا ”وجہ کماز۔ دوستی کے روپ میں مجھے دھوکہ دے کر تو نے جو جال مجھے پھانسنے کیلئے بنا تھا۔ اسی جال میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ایسا جکڑوں گا کہ سانس بھی رک جائے گی۔“

کھکھڑی تو پہلے ہی میری بیلٹ میں لٹکی رہتی تھی اب میں نے اپنا پمفل بھی لباس کے اندر سے نکال کر جیکٹ کی جیب میں رکھنا شروع کر دیا۔ میرے چینی محافظ صبح کے ٹھیک دس بجے لابی میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے ہوٹل انتظامیہ کو کہہ دیا کہ یہ میرے مہمان ہیں چند روز میں، میں نے محسوس کیا کہ لابی میں مسلسل بیٹھے رہنے سے ان کے چہروں پر اکتاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ میں نے ان کیلئے اپنے کمرے کے ساتھ والا کمرہ لے لیا جہاں وہ آرام کر سکتے اور اپنی ٹیپ پر پسندیدہ گانے سن سکتے تھے کھٹمنڈو میں میرے قیام کے آخری دن تک وہ اسی ہوٹل میں رہ کر میری حفاظت کرتے رہے۔ شام کو مریم نے مجھے فون پر بتایا کہ وہ مجھے لینے کیلئے گاڑی لے کر آ رہی ہے۔ میرے اترایا انکار کرنے سے پہلے ہی اس نے فون بند کر دیا اس طرح کے رویے کو شاید اب وہ اپنا حق سمجھتی تھی۔

اگلے روز میں گیا رہ بجے ہوٹل سے باہر آیا تو کئی رکشے کھڑے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بھارتی ایجنٹ والا رکشہ کونسا تھا۔ میں نے ایک رکشہ لیا اور اسے شہر کی جانب چلنے کا کہا۔ شہر کی مین روڈ پر میں نے اسے چھوڑ دیا اور کچھ دیر دوسرا رکشہ لے کر اپنے سفارت خانے چلا گیا۔ سفیر صاحب نے روپوں کی تقسیم کے دوران کھینچی گئی تصویریں دکھائیں۔ وہ بہت خوش تھے انہوں نے ان تصویروں میں روپے دیتے ہوئے صرف اپنی مسکراہٹ ہی دیکھی تھی۔ مہاجروں کے چہروں پر پھیلی ہوئی بیزاری نہیں دیکھی جو ہر تصویر پر عیاں تھی

ہوٹل سے نکلنے وقت میں نے وہاں کھڑے سارے رکشہ ڈرائیوروں کے چہرے ذہن نشین کر لئے تھے دوسرے روز بھی چار پانچ رکشے کھڑے تھے۔ ان میں دو کل والے اور باقی نئے تھے۔ میں نے کل والے دونوں رکشاؤں میں سے ایک رکشہ لیا اور شیر پنجاب ریستورنٹ چلا آیا۔ میرے پیچھے دونوں چینی دوست تھے۔ ہم نے رکشے چھوڑ دیئے۔ ایک گھنٹہ وہاں سردار ہر نام سنگھ سے گپ شپ لگانے کے بعد میں باہر نکلا تو وہاں صرف ایک رکشہ موجود تھا۔ یہ اجنبی چہرہ تھا میں کچھ دور پیدل جا کر مین روڈ پر آگیا اور وہاں سے رکشہ لے کر ہوٹل آگیا ہوٹل کے باہر اب صرف ایک رکشہ تھا کل والے دونوں میں سے ایک۔ ہم ہوٹل کے اندر گئے وہاں محسن میرا منتظر تھا میں نے محسن سے کہا کہ وہ فوراً جائے باہر ایک رکشہ کھڑا ہے اسے لے کر شیر پنجاب ریستورنٹ تک جائے اور 5 منٹ بعد ہوٹل واپس آجائے۔ محسن کے پیچھے پیچھے میں باہر نکلا۔ رکشے والے نے محسن کو لے جانے سے انکار کر دیا تھا وہ دوسرے رکشے کی تلاش میں ذرا آگے بڑھا تو میں نے اس رکشے والے سے چلنے کو کہا وہ فوراً رضامند ہو گیا۔ اس نے میرے کہے بغیر پاکستانی ایمپیسسی کی راہ لی۔ میں نے اسے روکا اور کہا کہ مجھے بازار جانا ہے۔ واپس چلو۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر بیزاری کے اثرات پھیل گئے۔ (جاری ہے)

غازی

ہم ہوٹل سے بمشکل سپاس فٹ سے ہی واپس لوٹ پڑے۔ محسن اور میرے چینی دوست ابھی تک سواری کی تلاش میں تھے میں نے محسن کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر میں نے رکشہ پھر رکوا یا اور محسن کو دکان سے سگریٹ لانے کو بھیجا۔ دراصل میں چینی دوستوں کے انتظار میں تھا۔ ادھر محسن دکان سے باہر نکلا ادھر دور سے چینی دوست آتے دکھائی دیئے۔ ہمارے رکشے والا بالکل اناڑی تھا۔ اسے رکشہ کنٹرول کرنا خصوصاً موڑ کا ٹنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ آج اسے رکشہ ڈرائیوری کی سزا دی جائے۔ ہم چار گھنٹے سے زیادہ بلاوجہ ادھر ادھر گھومتے رہے۔ رکشہ چلاتے چلاتے وہ بے حال ہو رہا تھا۔ واپسی پر ہم وجہ کار کی دکان پر اتر گئے۔ رکشے والے کو میں نے جو کچھ دیا وہ اس نے بغیر کسی بحث کے لے لیا۔ حالانکہ میں نے اسے تمام سفر کے جائز پیسوں سے بھی آدھی رقم دی تھی میرے چینی دوست بھی ہم سے کچھ دور رکشہ چھوڑ کر ایک بیکری میں چلے گئے۔ وجہ کار نے مجھے مخصوص رکشے سے اترتے دیکھ لیا تھا اس نے بڑی آؤ بھگت سے میرا خیر مقدم کیا میں بھی بڑی بے تکلفی سے اسے ملا۔ دکان کے سفری گوشے میں چند کرسیاں پڑی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ہم انہی پر جا کر بیٹھ گئے اور باتیں شروع کر دیں۔ وجہ کار اپنی عادت کے مطابق میری ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس کا راز جان چکا ہوں۔ بظاہر دوست لیکن دل میں ایک دوسرے کی جان لینے کے درپے ہم دونوں اپنے اپنے مہرے بڑی احتیاط سے چل رہے تھے۔ وجہ کار سوچ رہا ہو گا کہ وہ جلد ہی مجھے زیر کرے گا لیکن وہ اس حقیقت سے لاعلم تھا کہ میں نے اسے شاہ مات ہی نہیں بلکہ پوری بسات الٹ دینے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔

دو گھنٹے سے زیادہ میں وجہ کار کے پاس بیٹھا رہا۔ اب چونکہ میں اس کی اصلیت جان چکا تھا اس لئے اس کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کو غور سے سن رہا تھا۔ جتنی روانی اور بے ساختگی سے وہ مجھ سے اپنی چاہت اور عقیدت کا اظہار کر رہا تھا کوئی بڑے سے بڑا ایکٹر بھی اس کی گرد کو نہ پہنچ سکتا۔ واقعی ہندو کی سرشت میں یہی لومڑی جیسی مکاری بھری ہوئی ہے۔ چالکیہ ان کا گروہ تھا جس کے قول گیتا کے اشلوکوں میں یہ جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں۔ چالکیہ کا ایک قول یا نصیحت یہ بھی ہے کہ اگر تمہارا دشمن تم سے کمزور ہے تو جھپٹ کر اسے زیر کر لو اور اگر وہ تم سے تگڑا ہے تو اس کے سامنے بیٹھ کر بلی بن جاؤ اور جو نبی وہ تمہاری طرف سے ذرا غافل ہو تو پیچھے سے اس پر وار کرو۔ بغل میں چھری، منہ میں رام رام اسی کا دیا ہوا درس ہے جس پر ہندو آج تک اسے اپنا مذہبی فرض جان کر عمل کر رہے ہیں۔ بھارت اور نیپال میں قیام کے دوران وجہ کار پہلا غیر مسلم تھا جس پر میں نے اعتبار کیا اور اس اعتبار کی وجہ اس کی اتنی اونچے درجے کی ایکٹنگ تھی جس سے میں بھی دھوکہ کھا گیا۔ اس کی آتمازک میں ہو یا سو رنگ میں۔ اس کی کامیاب ایکٹنگ پر میں اسے داد دیتا ہوں۔

وجہ کار کی دکان سے اٹھ کر میں اپنے ہوٹل میں آیا تو وہی رکشے والا اپنی ”خاص“ سواری کے انتظار میں کھڑا تھا۔ یہ تو نیپالی تھا اور نہ ہی اس کا لب و لہجہ نیپالی تھا اس نے مجھے پر نام کیا اور پوچھا کہ کہیں جانا ہے میں نے کہا کہ آج تو نہیں البتہ کل 11 بجے پاکستانی سفارت خانے جاؤں گا۔ میں نے اسے اپنا پروگرام محض اس لئے بتایا تھا کیونکہ میں اس چوہے بلی کے کھیل سے اکتا چکا تھا اور اب میرا پہلا شکار یہ رکشے والا تھا۔ رات کو میں اپنے چینی ساتھیوں کے ساتھ چنگ و ار ریستورنٹ گیا اور مریم کے ذریعے چینی دوستوں سے زہر بلی گیس کا سلینڈر مانگا۔ وہ سلینڈر لینے چلے گئے تو مریم نے مجھ سے پوچھا کہ اگر پھر مار دھاڑ کا کام کرنا ہے تو میں یہ کام چینوں کے ذریعے کیوں نہیں کرواتا۔ وہ دراصل پرسکون زندگی کے خواب دیکھ رہی تھی اور چاہتی تھی کہ اس خون خرابے کی دلدل سے باہر نکل آؤں۔ میں نے اسے کہا کہ اب زیادہ وقت باقی نہیں۔ صرف سامنے آئے ہوئے چند دشمنوں کو ختم کرنا ہے اور اس کے بعد میں خود بھی پر امن زندگی گزارنے کا خواہشمند ہوں۔ کھٹنڈو میں مجھے زندہ رہنے کیلئے انہیں ہلاک کرنا ضروری ہے۔ جونہی مجھے محکمے نے واپس بلایا میں اس کے ہمراہ سکون اور امن کی وادیوں میں چلا جاؤں گا۔ چینی ساتھی میرے لئے دو سلینڈر لے کر واپس لوٹے۔ ہر سلینڈر دس افراد کیلئے کافی تھا اور گیس کے موثر ہونے کی زیادہ سے زیادہ رینج 3 فٹ تھی۔ میں نے ایک سلینڈر مریم کے پاس چھوڑا اور واپس ہوٹل لوٹ آیا چینی دوست مجھے ہوٹل چھوڑ کر اپنی رہائش گاہ پر چلے گئے۔

اگلے دن ٹھیک گیارہ بجے میں ہوٹل سے باہر آیا۔ وہاں کئی رکشے کھڑے تھے۔ مجھے نکلنے دیکھتے ہی وہ مخصوص رکشے والا آگے بڑھا۔ میں نے اس کے رکشے کے پاس کھڑے ہو کر سگریٹ نکالنے اور جلانے میں اتنا وقت لگایا کہ میرے چینی دوست بھی دوسرا رکشہ لے لیں۔ میری جیکٹ کی ایک جیب میں پستل اور دوسری میں سلینڈر تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ میرا رکشہ رکنے کے 20 سیکنڈ بعد وہ مجھے پاس (pass) کرتے ہوئے مجھ سے پستل اور سلینڈر لے کر آگے بڑھ جائیں گے اور پاکستانی سفارت خانے کے پاس میرا انتظار کریں گے۔ سیدھی سڑک پر دور بھارتی سفارت خانے کے لوہے کی سلاخوں والے دروازے کھلے دکھائی دے رہے تھے۔ رکشہ ڈرائیور اپنی کامیابی کو اتنا قریب دیکھ کر اپنی پوری طاقت سے رکشہ چلا رہا تھا۔ میں نے سلینڈر جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور رکشے والے کو کمر پر ٹھوکا دیا۔ جونہی اس نے گردن پھیری میں نے اس کے چہرے پر گیس چھوڑ دی۔ گیس اس کے نٹھوں میں گھسی تو وہ لڑکھڑایا اور چلتا رکشہ ڈولنے لگا۔ اس سے پہلے کہ رکشہ الٹ جاتا میں چھلانگ مار کر سڑک پر آ گیا۔ عین اسی وقت چینی ساتھیوں کا رکشہ پہنچ گیا۔ میرا رکشہ الٹ چکا تھا جس کے ساتھ ہی رکشہ ڈرائیور کا بے جان جسم پڑا تھا۔ چینی ساتھیوں کا رکشہ ڈرائیور یہ منظر دیکھ کر رکھا اور اس دوران میں نے سلینڈر اور پستل انہیں دے دیا۔ انہوں نے چینی زبان میں اپنے رکشہ ڈرائیور کو آگے بڑھنے کو کہا۔ اس دوران وہاں سڑک کے دونوں جانب آنے جانے والے رکشے رکنے لگے۔ دو تین کاریں بھی وہاں آ کر ٹھہر گئیں۔

غازی

سب یہی سمجھے کہ بچا راڈرائیور رکشے کو کنٹرول نہ کر سکا رکشہ الٹ گیا اور ڈرائیور اس کے نیچے کر بے ہوش ہو گیا۔ دوسرے رکشہ ڈرائیوروں نے اس کے رکشے کو سیدھا کیا اور ڈرائیور کی ہتھیلیاں اور تلوے مساج کرنے لگے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ شخص مرچکا ہے۔ میں نے اپنی ایمپسی کی جانب جانے والے ایک گاڑی والے سے لفٹ لی اور بھارتی سفارت خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے پاکستانی سفارت خانے کے قریب اتر گیا۔ گاڑی کا مالک کوئی نیپالی تھا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں افسوس کر رہا تھا کہ غربت کے مارے ہوئے یہ ڈرائیور اپنی ہمت اور طاقت سے زیادہ کام لینے کے باعث چڑھائی پر اکثر اسی طرح بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ بھارتی سفارت خانے کے کھلے دروازوں کے اندر دس پندرہ افراد کھڑے تھے اور سب کی نگاہیں اس رکشے اور زمین پر پڑی ڈرائیور کی لاش پر تھیں جسے ”ہوش“ میں لانے کیلئے کئی ڈرائیور اس کے جسم کا مساج کر رہے تھے۔

پاکستانی سفارت خانہ بند ہونے تک میں وہیں رہا اور واپسی پر بجائے اپنے ہوٹل آنے کے میں نے چنگ وارر ریسٹورنٹ کا رخ کیا۔ ہم سب کا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ مریم نے خاص طور پر میرے لئے پکوڑے اور چینی ساٹیوں کیلئے نوڈلز Noodles بنوائے۔ ہم نے سیر ہو کر کھایا۔ چینی دوستوں نے میرا پمپل اور سلینڈر مجھے واپس کر دیا۔ میں نے انہیں اگلے دن دس بجے آنے کا کہا لیکن انہوں نے مجھے میرے ہوٹل چھوڑنے تک وہیں رہنے پر اصرار کیا رات کو نوبے میں اپنے ہوٹل واپس لوٹا۔ میں نے مریم سے اپنا پمپل لے لیا اور دونوں گیس سلینڈر اسی کے پاس رہنے دیئے۔

اگلے دن میں گیا رہ دن بجے و بے کمار کی دکان پر گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک نہیں آیا۔ ادھر ادھر گھوم کر میں اپنے ہوٹل واپس آ گیا اور شام 5 بجے پھر و بے کی دکان پر گیا اس بار و بے مل گیا۔ اس کا چہرہ بچھا ہوا اور آنکھوں سے خوف صاف عیاں تھا اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ آج میری وہ پہلے والی آؤ بھگت بھی نہ ہوئی۔ میرے پوچھنے پر اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا۔ میں نے اسے عمد اکل والے رکشہ ڈرائیور کے اچانک بے ہوش ہو کر گرنے کا واقعہ سنایا۔ اس کے چہرے کی رنگت اور پھکی پڑ گئی تھی۔ میں اس کی کیفیت سے حقیقی معنوں میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب میں نے اسے یہ کہا کہ یہ واقعہ بھارتی سفارت خانے کے قریب پیش آیا تھا اور اس وقت خلاف معمول سفارت خانے کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور دس پندرہ آدمی دروازوں کے ساتھ یوں کھڑے تھے جیسے کسی اہم شخصیت کے استقبال کیلئے جمع ہوں۔ وہ میری باتیں سنتا جا رہا تھا اور اس کے چہرے کی رنگت سیاہ ہوتی جا رہی تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا واقعی کوئی اہم شخصیت اس وقت آنے والی تھی تو جواب میں وہ ہاں یا نہ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کے ہونٹوں پر پڑی جم چکی تھی۔ میں وار پروار کئے جا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کل بعد دوپہر سے تم دکان سے ایسے غائب ہوئے کہ آج شام کو ملے۔ میں نے تو یونہی کل کا کہہ دیا تھا لیکن اس نے بتایا کہ کل دوپہر سے اس کی طبیعت خراب ہے وہ گھر چلا گیا تھا اور ابھی تھوڑی دیر پہلے دکان پر آیا ہے۔ میرے وار جاری تھے۔ میں نے کہا آج صبح یہاں آتے ہوئے ایک رکشہ والے نے بتایا کہ کل والا رکشہ ڈرائیور موقع پر ہی مر گیا تھا۔ بالکل اچانک میں نے و بے کو ہمارا بنا تے ہوئے آہستہ سے کہا کہ کل اس رکشے پر میں سوار تھا۔ جب یہ حادثہ پیش آیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے و بے کو کہا کہ بہت جلد اس کے گھر بغیر اطلاع دیئے آؤں گا تاکہ Surprise رہے اور اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی ماش کی دال کھاؤں گا۔ جس کی وہ ہمیشہ تعریف کرتا ہے و بے کی جو کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ دیکھنے کے لائق تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے جسم کا سارا خون نچر گیا ہو۔ میں اس کی اس کیفیت سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔

غازی

و جے نے دوستی کا لبادہ اوڑھ کر مجھے بے وقوف بنانا چاہا تھا یہ تو اللہ پاک کا کرم تھا کہ بروقت اس کی اصلیت مجھے معلوم ہو گئی۔ ورنہ میں تو دوستی کے بھروسے اس پر اندھا اعتماد کرنے والا تھا۔

و جے کو اسی ذہنی اذیت میں چھوڑ کر میں اس کی دکان سے چلا آیا، اپنے ریسٹورنٹ میں مریم نے جو ریکارڈنگ کی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ مجھے اغوا کرنے کا مشن بنیادی طور پر و جے کو سونپا گیا تھا۔ رکشے کے ذریعے مجھے بھارتی ایمپیسی میں لے جانے کی کوشش یقیناً ان کا Stand by attempt جس پر و جے کو Rileif دینے کیلئے پہلے عمل کیا گیا۔ یہ منصوبہ فیل ہونے کے بعد و جے پر اسے مکمل کرنے کی پوری ذمہ داری آچکی تھی۔ میری و جے سے گفتگو اسے نفسیاتی طور پر زیر اور مایوس کرنے کیلئے تھی۔ میں چاہتا تھا کہ و جے کو نفسیاتی طور پر اس مقام پر لے آؤں جہاں وہ انتہائی Desperate (مایوس) ہو کر ایسا قدم اٹھائے جو غلطیوں سے بھرا ہوا اور مجھے اس کو انجام تک پہنچانے میں دشواری پیش نہ آئے۔

میں نے محسن کی یہ ڈیوٹی لگا دی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت و جے اور اس سے سامان لینے والے مہاجروں کی اس کی دکان پر آمد کی نگرانی (Surveillance) کرے۔ اس نگرانی کے فوری ہی مثبت نتائج سامنے آنے شروع ہو گئے اس نے پہلے تو مہاجروں سے بدزبانی کی اور پھر سامان دینا بند کر دیا۔ وہ گھبرا ہوا اور انتہائی پریشان رہنے لگا اسے مزید پریشان کرنے کیلئے میں نے محسن کے ذریعے نئے شادی شدہ چھ مہاجروں کی خدمات معقول معاوضے پر حاصل کر لیں انہیں صرف یہ کرنا تھا کہ وہ و جے کا ہر وقت پیچھا کریں اور خصوصی طور پر جب وہ گھر جائے تو اس کے گھر کے دروازے تک اس کا پیچھا کریں اور اپنی حرکات سے اس پر یہ ظاہر کریں کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ محسن اور ان چھ مہاجروں نے اپنا کام اتنی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ چند روز بعد جب میں و جے کی دکان پر گیا تو اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ برسوں کا مریض ہو ہر وقت چپکنے والے و جے نے کئی روز سے شیو نہیں بنائی تھی۔ ذرا سے کھٹکے پر وہ چونک جاتا۔ سڑک پر سے گزرنے والے جس شخص کو بھی وہ اپنی دکان کی طرف دیکھتا پاتا اس کی نگاہیں دیر تک اس کا تعاقب کرتیں۔ نگرانی کرنے والے مہاجر ہر پانچ سات منٹ بعد اس کی دکان کے سامنے سے اسے گھورتے ہوئے گزرتے۔ وہ اتنا گھبرا ہوا تھا کہ بے اختیار بول اٹھا۔ نامعلوم یہ لوگ بار بار میری دکان کے سامنے سے کیوں گزرتے ہیں؟ یہ میرے گھر تک میرے پیچھے جاتے ہیں میں نے ان کا کیا باگاڑا ہے؟ میں و جے کے ساتھ بیٹھا تھا میں نے اس کی پشت پر ہاتھ سے تھپکی دینے سے پہلے اپنی شہادت کی انگلی اٹھا کر ایسی رکھی جیسے پستول کی نال ہو۔ انگلی پشت سے لگتے ہی و جے کی چیخ نکل گئی اور اس نے بے اختیاری میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ میں نے ہنستے ہوئے اس کی پیٹھ کو سہلایا اور پوچھا کہ اسے کیا ہوا ہے و جے کی حالت ایسی ہو چکی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اسے چاروں طرف موت ہی موت دکھائی دیتی تھی میں یہی چاہتا تھا کیونکہ ایسی حالت میں ہی انسان انتہائی مایوس ہو کر Desperate قدم اٹھاتا ہے۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ دہلی میں DMI کے ہاتھوں گرفتاری کے بعد سبزی منڈی اسٹیشن پر دوسری بار جا کر میرے فرار کی کوشش اور DMI ہیڈ کوارٹر میں گارڈز کو ہلاک کر کے میرا زخمی حالت میں فرار ہونا ایسی ہی کیفیت کے زیر اثر تھا۔ مجھے توقع تھی کہ ایک آدھ روز میں ہی و جے کا رد عمل سامنے آجائے گا۔ لیکن یہاں پھر غلطی کر گیا میں نے ہندو کی بزدلانہ ذہنیت کو فراموش کر دیا تھا۔

غازی

موت اور چتا کی آگ سے ڈرنے والی یہ قوم آسانی سے موت کا نٹو سامنا کرتی ہے اور نہ ہی اسے قبول کرتی ہے۔ دوسرے روز مجھے محسن اور دوسرے مہاجروں سے معلوم ہوا کہ وجے صبح پہلی بس پر کھٹمنڈو سے پیرگنج چلا گیا ہے کھٹمنڈو سے وجے دو مہینے غائب رہا اور جب واپس لوٹا تو خاصا سنہجھل چکا تھا اس بار وہ نئے ارادوں اور نئی چالوں کے سہارے آیا تھا۔ کھٹمنڈو سے بھاگنے سے پہلے اس کی موت کا وقت نہیں آیا تھا اور واپسی پر موت خود اس کے تعاقب میں تھی جس سے وہ اس بار نہ بچ سکا۔

وجے سے جو مہاجر سامان لیتے تھے ان کا کام بند ہو چکا تھا میں نے محسن کے ذریعے انہیں بلوایا اور انہیں ایک ایک ہزار روپیہ دیا کہ وہ تھوک کی دوسری دکانوں سے سامان خریدیں میں نے انہیں کہا کہ وہ مجھے یہ روپیہ واپس نہ لوٹائیں بلکہ اسے اپنی پونجی سمجھ کر کام کریں رزق حلال کمانے والے یہ مہاجر بہت خوش ہوئے کیونکہ وجے انہیں صرف تین سو کا سامان ہی کس دیتا تھا انہوں نے بتایا کہ تھوک کی دوسری دکانوں پر سامان وجے کے سامان سے مقابلتا سستا ملتا ہے۔ وجے کے بقول وہ مہاجروں کو سامان کا خیر سمجھ کر بغیر منافع کے دے رہا تھا لیکن لالہ جی اس کا خیر میں بھی ڈنڈی مارنے سے نہیں چو کے۔ وجے کے جانے کے بعد دشمن ظاہری طور پر سامنے نہ تھے۔ بھارتی سفارت خانے میں یقیناً کئی لوگ سر جوڑ کر بیٹھے مجھے زندہ گرفتار کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے جن سے میں بے خبر تھا اپنی حفاظت کیلئے مجھے قادر مطلق کی ذات پاک پر یقین کامل اور اپنے پائل پر بھروسہ تھا۔ زندگی کے گزشتہ تین برس کے حالات نے میری ذہنی حالت میں یہ تبدیلی کر دی تھی کہ یکسوئی اور بغیر ہنگامے کے زندگی مجھے بہت گراں گزرتی۔ لپکنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا میری عادت بن چکا تھا میں نے جب بھی اپنی اس بیزاری کا مریم سے ذکر کیا اس نے غصے بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا کہ مجھے اپنا موضوع بدلنا پڑا۔ وہ ہر وقت میری حفاظت اور سیکورٹی کے پلان بناتی رہتی اور میری باتیں سن کر اسے طیش آجاتا۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو ایسے موقعوں پر پسپا یا خاموش ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی بات منوانے کی اہل تھی اس کی یہی بات مجھے اچھی لگتی تھی۔ مجھے اکثر خیال آتا کہ دنیا بھر میں میری والدہ کے علاوہ ایک اور ایسی ہستی بھی ہے جسے میری زندگی عزیز ہے۔ ورنہ جس سے توقع ہونی چاہئے تھی وہ تو میری والدہ کے سامنے میری موت کی دعائیں مانگتی تھی۔ اب میرا روز کا معمول صرف یہ رہ گیا کہ دن میں کبھی مین بازار (راجہ بازار) کبھی شیر پنجاب ریسٹورنٹ اور کبھی سفارت خانے چلا جاتا۔ شام کو چنگ و ار ریسٹورنٹ جانا لازمی تھا بلکہ لازمی بنا دیا گیا تھا وہاں سے واپسی پر محسن اکثر میرے انتظار میں ہوتا۔ اس سے دن بھر کی خبریں ملتیں اور گپ شپ رہتی۔ میرے پندرہ سولہ شب و روز اسی طرح بسر ہوئے۔ اس دوران UNO کی بھیجی ہوئی امداد ہمارے سفارت خانے کو موصول ہوئی۔ مہاجروں کی شکایات اور بھارتی سفارت خانے کے پروپیگنڈے کی وجہ سے UNO کا ایک افسر بھی آیا جس نے کپڑے اور دودھ کے ڈبے اپنے سامنے تقسیم کروائے اور مالی امداد کی تین ماہوار قسط پر بھی مہاجروں کو یک مشت دے دی گئیں۔ میرے متعلق بھی مہاجروں کے ایک وفد نے اسے بتایا۔ لہذا مجھے اپنے سفارت خانے میں طلب کیا گیا جہاں مجھے ایک بہت متمول ایسے پاکستانی کے طور پر UNO کے افسر سے متعارف کروایا گیا جو مہاجروں کی ہمدردی میں یہاں اپنی خوشی سے رکھا ہوا تھا۔ سفیر صاحب اور دونوں سیکریٹری اس ملاقات کے دوران موجود تھے مجھے انہوں نے بادل ناخواستہ بلوایا تھا کہ کہیں میں ان کے پول نہ کھول دوں۔ میرا جی تو بہت چاہتا تھا لیکن محض اس لئے خاموش رہا کہ ایک غیر ملکی کے سامنے اپنے ملک کے نمائندوں کی ذلت کو میں اپنے ملک کی اور اپنی ذلت سمجھتا تھا۔

اسرائیلی ایجنٹ بھی سرگرم ہو گئے

انہی دنوں میں نے محسن اور اپنے چینی ساتھیوں کے ہمراہ کھٹمنڈو سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر شہونا تھ کے مندر جانے کا پروگرام بنایا۔ اس مندر سے متعلق بہت سی روایات مشہور تھیں جن کا ذکر آگے کروں گا۔ اس بار میرے جانے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ جیسے ماؤنٹ ایورسٹ دنیا کی سب سے بلند چوٹی ہے ویسے ہی یورپین اور امریکی نشے بازوں کی منزل کی انتہا کھٹمنڈو ہے۔ ان دنوں افغانستان بالکل محفوظ تھا۔ چرس اور افیون کے رسیا ہی امریکہ اور یورپ سے بھری جیبوں کے ساتھ روانہ ہوتے تھے ان کی پہلی منزل ترکی ہوتی جہاں مہنگے داسوں وہ چرس اور افیون خریدتے۔ وہاں سے افغانستان پہنچتے جہاں انہیں یہ نشہ آور چیزیں بہت سستی مل جاتیں۔ یہ یہی مرد اور عورتیں اپنی تقریباً تمام پونجی سے انہیں خرید لیتے۔

(جاری ہے)

غازی

وہاں کے معاشرتی ماحول سے ڈرتے ہوتے یہ وہاں قیام نہ کرتے بلکہ پاکستان اور بھارت سے ہوتے ہوئے کھٹمنڈو پہنچ جاتے۔ کھٹمنڈو کا موسم اور معاشرہ انہیں موافق آتا اور یہ وہیں کے ہو جاتے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ نیپال میں چرس اور دوسرے نشے کرنے کی کھلی اجازت ہے۔ صرف خرید و فروخت ممنوع ہے اور یہ بھی رسمی طور پر۔ یہ کھٹمنڈو میں آزادی سے چرس اور مدھک کے دھوکے اڑاتے اور اپنے گرو راہبیش کے گن گاتے (راہبیش ایک اتریشی نیشنل فراڈ یا تھا جس نے امریکہ، یورپ اور بھارت میں بھی ایک نئے مذہب کا آغاز کیا جس کے ماننے والے ہر بات میں مادر پدر آزاد ہوتے۔ نہایت سرعت سے یہ مذہب پھیلا۔ اس کے ماننے والوں میں امریکہ، یورپ اور بھارت کی بڑی مشہور ستیاں اور خصوصی طور پر فلموں کے سپر اسٹار مل جاتے تھے، آج سے چند برس پہلے گرو راہبیش جو فریڈ کے ایک بڑے کیس میں ملوث تھا اچانک منظر سے غائب ہو گیا لیکن امریکہ، یورپ اور بھارت میں اس کے بنائے گئے آشرم یا گناہ کے مراکز بھی ابھی تک بھر پور انداز میں چل رہے ہیں) کھٹمنڈو کے گیسٹ ہاؤسز میں ٹھہرے ہوئے ان پیوں کی چرس اور پیسے ختم ہو جاتے تو یہ شہبونا تھ کے مندر کا رخ کرتے۔ ایک پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے اس مندر تک پہنچنے کیلئے تقریباً 85 پتھروں کی بنی ہوئی بڑی سیڑھیاں چڑھنی ہوتی ہیں۔ ان پیوں کی آخری منزل سیڑھیاں ہوتی ہیں جہاں یہ بھوک اور نشے سے سوکھ کر کانٹا بنے ہر گزرنے والے کو دیکھ کر Charity- charity (بھیک، خیرات) کی صدائیں لگاتے، (ان مشرقی اقوام کو مغرب کو خود سے افضل سمجھتی ہیں، انہیں کھٹمنڈو میں شہبونا تھ کے مندر کی سیڑھیاں ضرور یاد رکھنی چاہئیں تاکہ ان کا احساس کمتری ختم ہو) اس مندر میں میرے جانے کا مقصد ان تین اسرائیلی لڑکیوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا تھا جو بظاہر تو یہی کے روپ میں یہاں آئی تھیں لیکن خاصے مہنگے گیسٹ ہاؤس میں رہتی تھیں۔ ان میں میری دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ چار مہاجر جوان لڑکے کھٹمنڈو سے غائب ہو چکے تھے ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا اور ان کے متعلق مصدقہ اطلاعات یہ تھیں کہ یہ چاروں آخری بار ان اسرائیلی لڑکیوں کے ساتھ دیکھے گئے تھے اس کے بعد زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا یہ کسی کو پتہ نہ چلتا تھا یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ یہ چاروں مہاجر لڑکے گریجویٹ تھے۔

شہبونا تھ کے مندر کی سیڑھیوں پر میں نے پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ ہر سیڑھی پر بیٹھے ایک یا دو پیوں نے Charity- Charity کی صدائیں لگانا شروع کر دیں۔ آپ یقین جانئے کہ ان کی حالت بند روڈ پر صابری ریسٹورنٹ کے قریب فٹ پاتھ پر ڈیرے ڈالنے والے ہیر و نیچوں سے کچھ مختلف نہ تھی۔ بڑھے ہوئے شیو، الجھے گندے بال، میلے بدبودار کپڑے پہنے یہ یہی ”ہرے راماہر کرشنا“ کا ورد اپنے اپنے لہجے اور سر میں مسلسل کرتے جاتے۔ اس وقت میں مغربی ممالک میں نہ گیا تھا اور نہ ان کی اصلیت جانتا تھا ان ”بدتر“ مغربی اقوام کے لوگوں کو اس حالت میں بھیک مانگتے دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی اور یہ خوشی دو چند اس وقت ہوئی جب میں نے ان سب میں پچاس پچاس روپے بانٹنے شروع کئے۔ اوپر کی سیڑھیوں پر بیٹھے سارے یہی نیچے آ کر میرے ارد گرد اکٹھے ہو گئے وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر مجھ سے جوتے اور چیرٹی مانگتے، اسی دوران کسی یہی نے مجھے بازو سے پکڑ لیا، مجھے اس کی یہ حرکت ناگوار گزری میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا چہرہ جانا پہچانا دکھائی پڑا، میں نے ذہن میں اسے لانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس نے کہا Friend we travelled to Gorakh pur to Nepal (دوست۔ ہم نے گورکھ پور سے نیپال تک اکٹھے سفر کیا تھا) یہ وہی جرمن تھا، لیکن نشے اور بھوک نے اس کی ایسی بری حالت کر دی تھی کہ میں اسے فوری طور پر پہچان بھی نہ سکا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ میرا انتظار کرو، میں ان سے فارغ ہو کر تم سے ملتا ہوں۔ یہی نے مجھ سے پیسے لے جاتے اور نیچے ایک جانب بھاگتے ہوئے چلے جاتے، میں ان سے فارغ ہو کر جرمن کے پاس آیا اور اس سے حال احوال پوچھا اس نے جواب کیا دینا تھا۔ اس کی حالت میرے سامنے تھی، کہنے لگا مجھے جو کچھ دینا ہے جلدی سے دے دو ورنہ یا تو چرس ختم ہو جائے گی یا اس کے دام یکدم بڑھ جائیں گے۔ میں نے اس کو دو سو روپے دیتے ہوئے کہا کہ میں ان تین اسرائیلی لڑکیوں سے ملنا چاہتا ہوں جو تم لوگوں میں شامل ہیں، ان کے متعلق اگر تم مجھے معلومات دو گے تو میں تمہیں ڈھیر سارے روپے دوں گا، نشے سے ٹوٹے ہوئے جرمن کیلئے 2 سو روپے اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھے۔ کافی ہیں کافی ہیں۔ تم ان کتیاؤں کو ٹورسٹ ان میں رات کو تلاش کرو یہ کہتے کہتے یہ جرمن بھی بقایا پیوں کی طرف بھاگ گیا۔ ہم لوگ کچھ دیر ادھر ادھر گھومنے کے بعد ہوٹل واپس لوٹ آئے۔ شام کو حسب معمول میں چنگ و ار ریسٹورنٹ گیا۔ میں نے مریم کو بتایا کہ مجھے ان لڑکیوں کی تلاش میں جانا ہے۔ مریم نے حسب عادت میرے وہاں جانے کی مخالفت کی۔ میرے کافی دیر اسے سمجھانے اور اس تلاش کی اصل حقیقت بتانے پر وہ بادل نا خواستہ رضامند ہوئی اور مجھے جانے کی اجازت دی۔

ٹورسٹ ان ایک معمولی گیسٹ ہاؤس تھا، جس کے اندر ایک بڑا ہال چرس نوشی کیلئے مخصوص تھا۔ میرے ہمراہ دونوں چینی ساتھی تھے۔ یہ یہاں چرس کی بو سے بھر پڑا تھا اور کم و بیش چالیس ہی عورتیں اور مرد چرس کے نشے میں ڈوبے ہر چیز سے بے نیاز بے ہنگم ناچ گانے میں مصروف تھے، اسی ہال کے گوشوں میں یہ ہی عورتیں اور مرد شرم و حیا کی تمام حدود کو پھلانگ کر ان حرکات میں مصروف تھے۔ جنہیں قلم لکھنے سے عاجز ہے، اس ماحول اور چرس کے دبیز دھوکے میں میرا دم گھٹنے لگا۔ میں اپنے چینی دوستوں کے ہمراہ باہر آ گیا، اتنی بہت ساری عورتوں میں ان اسرائیلی لڑکیوں کو تلاش کرنا بھی ناممکن تھا۔ میں نے ریسپشن پر ان لڑکیوں کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ دن کے بارہ سے دو کے درمیان یہ لڑکیاں اپنے کمروں سے باہر آتی ہیں۔ میں اپنے ہوٹل واپس لوٹ آیا اور مریم کو فون پر ساری روداد سنائی، کیونکہ مجھے اس شرط پر ٹورسٹ ان میں جانے کی ”اجازت“ ملی تھی کہ واپسی پر فوری اپنی خیریت کی اطلاع دوں رات چاہے کتنی ہی کیوں نہ بیت چکی ہو۔

جس ماحول میں لڑکیاں رہتی تھیں میرا وہاں جانا اور ان سے کچھ منگوانا ناممکن تھا۔ اگر یہ اسرائیلی جاسوس ادارے موساد کیلئے کام کر رہی تھیں تو ان کی جرات پر میں حیران تھا کیونکہ انہوں نے اپنے ایڈریس اسرائیل کے ہی لکھوائے ہوئے تھے۔ ہوٹلوں میں غیر ملکیوں کیلئے پاسپورٹ جمع کروانا لازمی تھا۔ موساد تو دنیا بھر کی جانی پہچانی ایجنسی تھی، کوئی معمولی جاسوسی ادارہ بھی اپنے ایجنٹوں کو اپنے ملکی پاسپورٹوں پر غیر ممالک میں کام کرنے کیلئے نہیں بھیجتا۔ موساد کیلئے ان کیلئے کسی دوسرے ملک کے پاسپورٹ حاصل کرنا بہت معمولی کام تھا۔

غازی

میری اطلاع کے مطابق موساد کے ہیڈ کوارٹرز میں دنیا بھر کے ممالک کے جعلی پاسپورٹ موجود تھے۔ کھٹمنڈو میں موساد کیلئے پاکستان کے خلاف کام کرنے کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ یہاں پاکستان کا چھوٹا سفارت خانہ اور چند ہزار پاکستانی مہاجر تھے جو انگریزی اور عربی بولنے پر قادر نہ تھے۔ نیپال جیسے چھوٹے اور بے ضرر ملک میں دنیا بھر کے سفارت خانے موجود تھے اور کوئی یورپی ممالک اور خصوصاً امریکہ کی جاسوسی ایجنسیاں یہاں بھرپور طور پر سرگرم تھی، ان کا مشترکہ ٹارگٹ چین تھا جو بہت تیزی سے عالمی طاقت بن کر ابھر رہا تھا۔ ان اسرائیلی لڑکیوں (اگر وہ موساد کیلئے کام کر رہی تھیں) کے پاسپورٹ اسی لئے اصل تھے کہ بوقت ضرورت وہ دوسرے ممالک کی جاسوسی ایجنسیوں سے مدد حاصل کر سکیں یا انہیں اطلاعات فراہم کر سکیں۔ کیونکہ چین کی جاسوسی کرنا ان سب کا مشترکہ مقصد تھا، ان تمام پہلوؤں پر اچھی سے طرح غور کر کے میں نے اپنی مائیگی کو دیکھا۔ میں اور میرے تین محافظ کسی طرح بھی ان بے پناہ وسائل کی حامل ایجنسیوں سے الجھنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ چاروں مہاجر لڑکے اپنی مرضی سے ان لڑکیوں تک پہنچے اور پھر غائب ہوئے تھے۔ انہیں سڑک سے جبراً اغوا نہیں کیا گیا تھا اور اس کا ابھی کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا کہ آخری بار وہ ان لڑکیوں کے ساتھ دیکھے گئے، سب سے زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ لڑکوں کے والدین اور لواحقین نے پاکستانی سفارت خانے میں بھی اس واقعہ کی کوئی اطلاع دی تھی اور نہ ہی مدد مانگی تھی۔ میں نے اس معاملے میں خاموشی ہی بہتر سمجھی اور اسے دل و دماغ سے نکال دیا۔

ٹورسٹ ان میں جانے کے تیسرے روز رات کو جب میں چنگ واریسٹورنٹ سے اپنے ہوٹل واپس آیا تو ریسپشن والوں نے بتایا کہ کافی شاپ میں ایک مرد اور عورت میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میری جان پہچان کے حلقے میں کوئی ایسا نہ تھا جو رات کے گیارہ بجے بغیر اطلاع دیئے مجھے ملنے آتا۔ میں نے اپنا سٹائل اندرونی بیلٹ سے نکال کر جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا اور کافی شاپ میں چلا گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے کافی شاپ کے خاصے بڑے ہال میں صرف ایک ٹیبل OCCUPIED دیکھا۔ جس پر ایک اسرائیلی لڑکی اور ایک مرد بیٹھا تھا مجھے دیکھتے ہی لڑکی مسکرائی اور میرے اصلی نام سے مخاطب کر کے مجھے اپنے پاس آنے کا کہا میں حیرتوں کے سمندر میں غرق اس کے ٹیبل پر گیا تو لڑکی نے اس مرد سے میرا تعارف کرایا اور ٹیبل پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا تو لڑکی نے اس مرد سے میرا تعارف کرایا اور ٹیبل پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا تو لڑکی نے بغیر تمہید باندھے مجھے کہا ”آپ میری تلاش میں پہلے شہو ماتھ کے مندر اور پھر ٹورسٹ ان میں آئے۔ میں اور میرے ساتھی آپ کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں اور مجھے بڑی حیرت ہوئی جب آپ نے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کی۔ پاکستان سے بے شک ہمارے بڑے اختلاف ہیں لیکن یہاں کھٹمنڈو میں ہمارا پاکستان کے خلاف کوئی مشن نہیں۔ جاسوسی کے بین الاقوامی اصولوں کے تحت ہمیں بلاوجہ ایک دوسرے کے کاموں میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے اور اسی وجہ سے ہم آپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ حالانکہ آپ کی کھٹمنڈو آمد کے تیسرے روز ہی ہمیں آپ کے متعلق پوری معلومات مل چکی تھیں۔ یہاں بھی آپ نے جو کچھ کیا ہمیں اس کا پورا علم ہے۔ اگر آپ آپ ہمارے ساتھ یہاں معلومات کا تبادلہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں شمال (چین) سے دلچسپی ہے اگر ایسی کوئی بات نہیں تو آپ نہ ہمارے متعلق سوچیں اور نہ ہی ہم آپ کے متعلق سوچیں گے بھارت اور کھٹمنڈو میں آپ کے کامیاب مشنوں پر میں ذاتی طور پر آپ کو مبارکباد دیتی ہوں۔ ہماری ہمیشہ یہ خواہش رہے گی کہ کھٹمنڈو میں ہمارا ٹکراؤ نہ ہو۔“ یہ کہہ کر لڑکی اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ساتھی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑکی نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”مجھے امید ہے کہ آئندہ جب کبھی بھی ہمارا اچانک آمنا سامنا ہو تو ہم بالکل اجنبیوں کی طرح BEHAVE کریں“ میں نے اسے جواباً کہا ”میں تمہاری دلیری پر ابھی تک حیرت میں ڈوبا ہوں۔ میری تم سے ملنے کی خواہش تمہارے کاموں میں مداخلت کرنے کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ میں ان چار مہاجر لڑکوں کی وجہ سے تم سے ملنا چاہتا تھا جو کھٹمنڈو سے یکا یک غائب ہو گئے اور میری اطلاعات کے مطابق انہیں آخری بار تمہارے یا تمہاری ساتھی لڑکیوں کے ساتھ دیکھا گیا“ اسرائیلی لڑکی مسکرائی اور کہنے لگی ”تم بہت چالاک ہو۔ نہ نہ کرتے ہوئے بھی مجھ سے اپنے مطلب کی بات پوچھ لی۔ مزید کوئی سوال نہ کرنا۔ میں صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ وہ چاروں اپنی مرضی سے بھارت چلے گئے ہیں اور وہاں کسی بھارتی کیمپ میں جاسوسی کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ کہہ کر اس لڑکی نے دوبارہ مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولی ”کافی شاپ میں ہمارا مل تم ادا کرنا۔ اسے اس معمولی سی اطلاع کی قیمت سمجھ لینا جو میں نے تمہیں دی ہے۔“ وہ دونوں تو چلے گئے لیکن میں دو گھنٹے تک کافی شاپ میں حیران و غلطاں بیٹھا رہا۔

رات دو بجے میں اپنے کمرے میں گیا اور دن چڑھے تک سوتا رہا، اسرائیلی لڑکی کی بے باک اور کافی حد تک صحیح گفتگو نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

میں کھٹمنڈو میں درحقیقت بالکل تنہا تھا۔ میرے تینوں چینی ساتھی بالکل روبوٹس کی طرح تھے۔ وہ میری حفاظت کرتے تھے اور میرے کہنے پر کسی کو بھی ٹھکانے لگانے کو ہر دم تیار تھے لیکن میں ان سے کسی بھی مشن کے متعلق مشورہ نہیں کر سکتا تھا۔ پاکستانی سفارت خانے کے ارکان اول تو تعداد میں اتنے کم تھے کہ اپنے سفارتی فرائض ہی بمشکل پورے کر سکتے تھے دوسرے انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ پاکستان کے خلاف جو سازشیں کھٹمنڈو میں ہو رہی تھیں اور جنہیں ان کے علم میں بھی لایا گیا تھا ان کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھاتے۔

مجھے یقین تھا کہ 9 مکتی باہنی والوں اور 5 خداریوں کو جنہیں میری ٹیم نے میری ہدایات پر ٹھکانے لگایا تھا، ان کی رپورٹ بھی ہمارے سفارت خانے پاکستان نہیں بھیجی ہوگی۔ اپنے سفارت خانے کے متعلق میرا مجموعی تاثر یہ تھا کہ وہ پیسے بنانے اور سفارتی حقوق کی آڑ میں ڈیوٹی فری گاڑیاں اور ایسا سامان جس کی سفارت خانے کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی ضرورت نہ تھی غیر ممالک سے سستے داموں منگوانے کے لئے یہاں آئے تھے۔ ان اہم کاموں کے بعد جو فالتو وقت بچ جاتا اس میں وہ بادل ناخواستہ سفارتی فرائض بیگار سمجھ کر انجام دیتے۔ کھٹمنڈو میں میری موجودگی اور سرگرمیوں کو انہوں نے کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ صرف ایک ٹرانسمیٹر آپریٹ تھا جو میرے محکمے سے آیا تھا۔ سفارت خانے میں اس کی پوزیشن اتنی محدود تھی کہ وہ میرے لئے نیک خواہشات کے سوا کچھ اور نہ کر سکتا تھا۔ بھارت میں گورکھ پور کا مشن اور کھٹمنڈو میں ساری کارروائیاں میں نے اپنے ذاتی فیصلے سے کی تھیں۔ مجھے اپنے محکمے سے ان کے متعلق کوئی ہدایات نہیں ملی تھیں۔ یہ سب بھارت سے میری نفرت اور سقوط ڈھاکہ میں اٹھائی گئی ذلت کیخلاف انتقامی جذبے کا رد عمل (REACTION) تھا۔ اگر میں بھارت میں گرفتار نہ ہوتا اور مجھے وہاں مزید کام کرنے کا موقع ملتا تو میں وہاں اپنے انتقام کے جذبے کو ٹھنڈا کرتا، لیکن گرفتاری کے بعد میرے ساتھ جو سلوک کیا گیا اور جس طرح میرے وطن اور میرے مذہب کے متعلق مجھے زنجیروں میں جکڑ کر جو بے ہودہ بکواس کی گئی اس سے میری بھتیجی ہوئی انتقامی آگ دوبارہ مزید شدت سے بھڑک اٹھی تھی۔ پڑھنے والوں کو یاد ہو گا کہ میں نے بھارت میں گرفتاری سے پہلے جتنے بھی مشن انجام دیئے ان میں کسی کو خود ہلاک نہیں کیا۔ گورکھ پور میں ان دو شہریوں کو بھی میں نے محض انسانیت کی بنا پر مارنے سے گریز سے کیا تھا لیکن گرفتاری سے فرار کے بعد میں نے صرف بمبئی میں خود 6 افراد کو پھسل سے ہلاک کیا۔ فرار کی کوشش کے دوران میں گارڈز کو زخمی کر سکتا تھا لیکن میں بیونٹ ان کے جسموں کی ایسی جگہوں میں داخل کی جس سے ان کا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ کھٹمنڈو میں بھی میں ہلاکت سے کم درجے کا قدم اٹھا سکتا تھا لیکن یہ انتہائی اقدام میری بھارت سے نفرت کا مظہر تھے۔ اسرائیلی لڑکیوں کی باتوں نے مجھے ایک نئی راہ دکھائی۔ وہ اپنے ملک کے مفاد میں اس حد تک آگے جا چکی تھیں کہ نشے کی لت اور جسم کی آبروتک کی پرواہ نہ کی لیکن اس کے سامنے ایک واضح مقصد اور مقررہ ٹیم نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ میں وقتی طور پر تو دشمنوں پر غالب آیا تھا لیکن ایک کی جگہ دس دشمن آجاتے تھے۔ ان دشمنوں اور دوسرے ممالک کی پاکستان دشمن ایجنسیوں سے بلاوجہ بھڑجانا کسی طور مناسب نہ تھا۔ مجھے اپنی توانائیاں محفوظ رکھنے کی ضرورت تھی تاکہ صحیح ضرورت پڑنے پر ان کا بھرپور استعمال کر سکوں۔ مریم بھی بار بار مجھے یہی بات سمجھاتی تھی انہی چار مہاجر لڑکوں کے بارے میں اس نے مجھے کہا تھا کہ جب ان کے والدین کو ان کی فکر نہیں تو تم کیوں ان کے غم میں گھلے جا رہے ہو۔

(جاری ہے)

غازی

تم پولیس نہیں ہو، فوج نہیں ہو، صرف ایک فرد واحد ہو اور دشمن کی قید میں سختیاں جھیلنے کے بعد نیم شکستہ حالت میں کھٹمنڈو پہنچے ہو۔ یہاں تم نے موت کا جو کھیل کھیلا ہے وہ قطعاً تمہارے فرائض میں شامل نہیں۔ اب بس کرو اور اپنی طاقت اور ہمت کو یوں بیکار ضائع نہ کرو، پاکستان دشمن کارروائیاں تو ہمیشہ جاری رہیں گی۔ تم بہت کرو گے تو مزید دس بیس دشمن مار لو گے یا ان کے ہاتھوں مارے جاؤ گے تمہارے سفارت خانے والے تو تمہاری لاش لینے سے بھی انکار کر دیں گے اور تم لاوارثوں کی طرح یہاں دفن کر دیئے جاؤ گے۔ یہ سب باتیں سوچ کر میں نے بالآخر فیصلہ کیا کہ میں آئندہ بلاوجہ ایسے کاموں میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا اپنی زندگی کو سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے کے مصداق بیکار میں داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔ پہلے سے مارک شدہ وجے کمار کو بلاشبہ اس کو ملتے ہی ضرور ہلاک کروں گا لیکن اس کے علاوہ اپنا بسمل اور گیس سلنڈر اس وقت تک استعمال نہیں کروں گا جب تک دشمن خود سامنے نہ آجائے اور بچنے کا کوئی چارہ نہ رہے۔

میں نے مریم کو اسرائیلی لڑکی سے ملنے کا سارا واقعہ سنایا اور اپنے فیصلے کا بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی کہنے لگی مجھ سے تو وہ اسرائیلی لڑکی بہتر رہی جس نے ایک ملاقات میں ہی تمہارے ارادے بدل دیئے کہیں وہ تمہیں بھانپ لیں گی اور کہیں اسرائیل جانے کے پروگرام تو نہیں بن گئے؟ یہ مریم نہیں بلکہ عورت کی فطری کمزوری بول رہی تھی۔ میں نے خود کو مصروف رکھنے کیلئے کھٹمنڈو میں مختلف ممالک کی جاسوس ایجنسیوں اور ان کے ٹارگٹس کے متعلق اپنی ممکنہ معلومات پر تفصیلی رپورٹس پاکستان بھیجنے کا پروگرام بنایا اس کے علاوہ بھارت میں انجام دیئے مشنوں کی تفصیلاً رپورٹ لکھنی شروع کر دیں ان رپورٹس کی تیاری میں دن کا خاصا وقت صرف ہو جاتا۔ شام کو مجھے بہر حال جنگ واریسٹونٹ جانا ہوتا تھا۔ مریم کے بے حد اصرار پر میں اس بات پر راضی ہو گیا کہ رپورٹس کی تیاری میں ایک دن اپنے ہوٹل اور دوسرے روز اس کے گھر میں قیام کروں اس نے اس کا جواز یہ بتایا کہ ہوٹل کے کمرے میں ہر روز سارا دن گزار دینے سے اول تو میں بور ہو جاؤں گا اور حفاظتی نقطہ نظر سے بھی یہ ٹھیک نہیں کیونکہ اس طرح ان دیکھے دشمنوں کو وار کرنے کا بہت اچھا موقع مل جائے گا میرے لئے یہ پروگرام اس لئے بھی بہتر تھا کہ ہوٹل میں محسن کے علاوہ کئی مہاجر بھی ہر روز ملنے آجاتے تھے جن کی وجہ سے لکھنے کیلئے یکسوئی میں خلل پڑتا تھا۔

بھارت میں قیام کی رپورٹس تو میں دہلی اور بمبئی سے دو مرتبہ پاکستان بھیج چکا تھا اس لئے انہیں تیسری بار تفصیلاً لکھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ کھٹمنڈو میں قیام کے دوران اپنے مشن کی رپورٹس تفصیلاً لکھنے میں مجھے اس لئے دشواری پیش آرہی تھی کہ یہ مشن میں نے مجھے کی ہدایت کے بغیر اپنی صوابدید پر کئے تھے۔ چینی محافظوں کو بھی صرف میری حفاظت کے لئے بھیجا گیا تھا جن سے میں نے انہیں تفویض کئے گئے فرائض سے زیادہ کام لیا تھا۔ ان مشنوں کے معقول جواز لکھنے کیلئے میرے پاس ٹھوس ثبوت نہ تھے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی پوری چھان بین اور مکمل تسلی کے بعد میں نے کھٹمنڈو میں 9 مکتی باہنی والوں اور 5 خداریوں کو ہلاک کیا تھا لیکن ان دونوں الزامات کا میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا میرے خیال میں بھارتی ایجنسی والوں نے ان واقعات کو اس پس منظر میں لکھا ہوگا کہ میری ان حرکات کی وجہ سے ایجنسی کو اپنے فرائض انجام دینے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ مہاجروں میں بھی سوائے محسن کے کوئی ایسا نہ تھا جو میری تائید میں کچھ لکھ کر دینے کو تیار ہوتا۔ مرنے والوں کی اصلیت جاننے کے باوجود وہ ایسی تحریر دینے سے کتراتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اکیلا تھا اور انہیں پاکستان پہنچنے کے لئے پہلے ہمارے سفارت خانے سے اور پاکستان پہنچ کر وزارت خارجہ اور وزارت داخلہ سے اپنی بحالیات سے واسطہ پڑتا تھا۔ میں نے اس ذہنی پریشانی سے نکلنے کے لئے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال کھٹمنڈو کی رپورٹس کی تفصیلات لکھنی چھوڑ دوں جب پاکستان جاؤں گا تو وہاں ان کی تفصیل زبانی بتاؤں گا اور انہیں قائل کروں گا کہ میرے اقدام جائز تھے میں نے یہ فیصلہ تو کر لیا لیکن اس کی سوچ کو دماغ سے جھٹک نہ سکا۔

میں انہی دنوں میں ایک رات جنگ و اسے رکشے پر واپس اپنے ہوٹل آ رہا تھا۔ میرے چینی دوست میرے پیچھے دوسرے رکشے میں تھے۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ میرا رکشہ چلتے چلتے اچانک الٹ گیا اور میں لڑھکتا ہوا درجا پڑا اسی وقت پانچ چھ فائر ہوئے۔ دو گولیاں تو میرے بالکل قریب سڑک سے ٹکرائیں باقی میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ میرے چینی ساتھی سڑک کی ہلکی روشنی میں پہلے ہی غائب ہو چکے تھے۔ میرے رکشے والا سڑک پر ابھی تک گرا پڑا تھا میں نے اسے اٹھایا اور ہم دونوں نے رکشہ سیدھا کیا۔ چینی ساتھیوں کے رکشے والا گولیوں کی آواز سنتے ہی اپنا رکشہ لے کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ میں ابھی واقعے کو پوری طرح سمجھ نہ سکا تھا کہ میرے دونوں چینی ساتھی دو آدمیوں کو گردن سے اس سختی سے دوپچے لے کر آئے کہ ان کی آواز تک نہ نکلتی تھی ان کے ہاتھوں میں خنجر چمک رہے تھے اس سے پہلے کہ وہ خنجر انہیں بھونک دیتے میں نے انہیں روکا اور اشاروں سے کہا کہ انہیں زندہ چنگ و اٹیل لے جانا ہے۔

میرا مطلب سمجھ کر انہوں نے ان دونوں اجنبیوں کی کنپٹیوں پر جوڈو کے دو ایسے ہاتھ رسید کئے کہ دونوں فوراً بے ہوش ہو گئے۔ انہیں رکشے میں ڈال کر میں نے رکشے والے کو سو روپے دیئے اور اسے واپس چنگ و اٹیل لے کر کہا۔ ریٹسٹونٹ سے کچھ آگے جا کر ایک نسبتاً سنسان جگہ تھی۔ وہاں رکشے سے ان دونوں کو اتار کر چینی دوستوں کو اوٹ میں لٹا دیا اور میں نے ریٹسٹونٹ جا کر مریم کو ساری روداد سنائی۔ مجھ پر قاتلانہ حملے کا سننے ہی مریم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا میں نے اسے سمجھایا کہ یہ وقت جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے کام لینے کا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے قابو کیا اور کہا کہ مجھے اپنی گاڑی میں شیر پنجاب ریٹسٹونٹ لے چلے۔ شیر پنجاب ریٹسٹونٹ پہنچ کر میں نے سردار ہرنام سنگھ سے چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کر کے ان کی گاڑی مانگی وہ کچھ گھبرا گیا اور پوچھنے لگا کہ آج پھر کسی کا جھکا کرنا ہے میں نے کہا کہ سردار جی یہ بات نہیں باہر گاڑی میں ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ یہ گاڑی اس کی سہیلی کی ہے جسے اس نے اب واپس کرنا ہے اور میں مزید دو چار گھنٹے اس لڑکی کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں اس لئے تمہاری گاڑی کی ضرورت ہے سردار جی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا کہ ذرا ہم بھی اسے دیکھ لیں پھر موٹیں لولو۔ یہ کہتے ہوئے سردار جی نے گاڑی کی چابی مجھے دی اور گدی سے اٹھے۔ میں نے جلدی سے باہر نکلتے ہوئے مریم کو اشارہ کیا اس نے گاڑی اشارت کی اور جب سردار جی باہر پہنچے وہ گاڑی چلائی مریم کی صرف معمولی سی جھٹک دیکھ سکے۔ سردار جی کی گاڑی لے کر میں چینی ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ انہوں نے دونوں بے ہوش آدمیوں کو گاڑی میں ڈالا۔ اتنی دیر میں مریم بھی اپنی گاڑی پارک کر کے آگئی اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ چینی ساتھی بھی پیچھے بیٹھ گئے اور میں نے گاڑی چین کی تعمیر کردہ سڑک کی طرف موڑ دی۔ مریم کے مطابق اس سڑک پر چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک تنگ سڑک نیچے گھاٹی میں اترتی تھی جو بڑی سڑک پر بنے پل کے ستونوں تک جاتی تھی۔ پل کی تعمیر کے دوران سامان اسی تنگ سڑک کے ذریعے نیچے گھاٹی میں لایا جاتا تھا۔ ہماری منزل اس تنگ سڑک کا آخری حصہ تھا جس پر دو دروازے کوئی انسان دکھائی نہ دیتا تھا۔

تنگ سڑک سے اتر کر ہم گھاٹی میں اس مقام پر پہنچے جہاں بجری کے چند ڈھیر ابھی تک پڑے ہوئے تھے جو پل کی تعمیر کے دوران استعمال ہوئی تھی میں نے گاڑی روکی اور باہر نکل آیا میرے ساتھ ہی مریم اور دونوں چینی ساتھی بھی گاڑی سے باہر آ گئے۔

(جاری ہے)

غازی

ابھی تک مجھے اور مریم کو اس واقعے کے متعلق صرف اتنا علم تھا کہ مجھ پر گولیاں چلائی گئیں۔ گولیاں چلنے سے چند سیکنڈ پہلے میرا رکشہ الٹا اور پھر چینی ساتھی دو اجنبیوں کو دیوے ہوئے لے آئے۔ میں نے مریم کے ذریعے ان چینی ساتھیوں سے سارا واقعہ پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ میرے رکشے کے پیچھے ان کا رکشہ تھا انہوں نے میرے رکشے سے آگے سڑک کی دوسری جانب دو آدمیوں کو مجھے اپنے اسلحے کی شست میں لیتے دیکھا۔ مجھے بچانے کے لئے ان کے پاس بہت کم وقت تھا سو پہلے تو ان دونوں نے میرے رکشے کو دھکا دے کر الٹ دیا۔ اسی دوران فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ دونوں فائر کرنے والوں کی طرف لپکے جنہیں غالباً یہ علم نہیں تھا کہ یہ دونوں چینی میرے محافظ ہیں۔ اس سے پہلے کہ فائر کرنے والے ان کی طرف متوجہ ہوتے، انہوں نے ان کے نازک اعضا پر ایسی کلکس لگائیں کہ وہ بے حال ہو گئے۔ دونوں کے پاس دو ریوا لورا اور میسوں فالتو گولیاں تھیں۔ ان سے اسلحہ لے کر اور دونوں کی گردن کی نسیں دبا کر ان کی قوت گویائی ختم کر کے وہ انہیں میرے پاس لے آئے جہاں وہ رکشہ سیدھا کر کے کھڑا ہوا ہی تھا آگے کے واقعات مجھے معلوم تھے۔ مریم کے پاس ٹارچ تھی روشنی میں یہ دونوں بھارتی دکھائی دیتے تھے ٹارچ لے کر میں نے مریم سے کہا کہ وہ ذرا ہٹ کر کھڑی ہو جائے اور چینی دوستوں کی مدد سے میں نے چیک کیا وہ دونوں ہندو تھے۔

میں نے چینی دوستوں سے کہا کہ انہیں ہوش میں لانا ہے۔ مارشل آرٹ انسانی جسم پر اس قدر حاوی اور قدرت رکھتا ہے کہ مختلف حصوں پر ضرب پہنچا کر ہلاک یا بے ہوش بھی کیا جاسکتا ہے اور بعض حصوں پر یہی ضرب بے ہوش کو ہوش میں بھی لاسکتی ہے۔ چینیوں نے انہیں گاڑی سے باہر نکال کر بحری پر ڈال دیا اور ان کے ماتھوں پر اس ڈھب سے پاؤں سے ضرب لگائی کہ چند لمحوں میں ہی وہ ہوش میں آ گئے۔ میرے کہنے پر ایک کو ایک چینی ساتھی گردن سے پکڑ کر کھائی میں ہم سے دور لے گیا۔ میں چاہتا تھا کہ ان حملہ آوروں سے الگ الگ انکوائری کروں۔ بحری پر لیٹے حملہ آور پر میں نے اپنا سائیکسرو والا پستل تان لیا اور کہا کہ اگر 5 منٹ کے اندر اس نے سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھیک نہ بتایا تو پستول کی ساری گولیاں اس پر خالی کروں گا۔ میں نے اسے یہ وارننگ بھی دی کہ اگر اس کا بیان اس کے ساتھی سے مختلف ہو تب بھی وہ دونوں نہ بچ سکیں گے۔ یہ آدمی اس سنسان جگہ پر خود کو اس حالت میں دیکھ کر ڈر سے کانپنے لگ گیا اور ہاتھ جوڑ کر میا نے لگا کہ اس کی جان بخش دوں۔ اس کے بیان کے مطابق وہ جے کمار نے لکھنؤ سے ان دونوں کو مجھے مارنے کے لئے HIRE کیا تھا۔ یہ دونوں لکھنؤ کے بڑے بد معاشوں میں شمار ہوتے تھے اور وہ جے نے ان کے استاد کے ذریعے چالیس ہزار میں یہ سودا کیا تھا۔ ریوا لورا اور گولیاں بھی وہ جے نے ہی انہیں دی تھیں۔ وہ جے گزشتہ رات ہی ان کے ہمراہ کھٹمنڈو پہنچا تھا اور اپنے گھر میں موجود تھا۔ چینی دوست اسے لے کر دور اندھیرے میں چلا گیا اور دوسرا چینی دوسرے حملہ آور کو لے آیا۔ اس کا بیان بھی بالکل پہلے والے حملہ آور جیسا تھا۔ میں نے انہیں زندہ تو چھوڑنا تھا نہیں کیونکہ مجھ پر حملہ کرنے کے علاوہ انہوں نے مریم اور چینی دوستوں کو بھی دیکھ لیا تھا اور میں کسی صورت بھی مریم اور چینی دوستوں کو اس قتل و غارت میں ملوث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ان دونوں کے نام پوچھے اور بحری پر انہیں الٹا لپٹنے کو کہا۔ ان کے لپٹتے ہی میں نے اپنے پستل کی ساری گولیاں ان دونوں پر ایک ایک کر کے داغ دیں۔ سائیکسرو کی وجہ سے گولیوں کی آواز بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

(جاری ہے)

غازی

جب چینی دوستوں نے ان کی نبضیں ٹٹول کر ان کے مرنے کی تصدیق کر دی تو میں نے پمپل میں دوسری میگزین ڈالی اور گاڑی لے کر میں روڈ پر آ گیا۔

مریم نے زندگی میں پہلی بار اس طرح لوگوں کو ہلاک ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی ساری دلیری اس وقت ایک خوفزدہ عورت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ تحفظ کے احساس کیلئے اس کا ایک ہاتھ بے اختیار میرے بائیں ہاتھ کو تھامے ہوئے تھا جس سے میں گاڑی کے گیر بدل رہا تھا۔ شہر پہنچ کر جب میں نے گاڑی ایک نئی سڑک پر موڑی تو مریم نے پوچھا کہ اب ہم کہاں جا رہے ہیں میں نے کہا ”کام مکمل کرنے“ مریم اتنی ڈری ہوئی تھی کہ بجائے لمبے لمبے لیکچر دینے کے اس نے صرف یہ کہا AS YOU LIKE (جیسے تم چاہو)۔

وہ جے کے گھر سے تھوڑی دور میں نے گاڑی روکی۔ مریم گاڑی میں ہی بیٹھی رہی اور میں دونوں چینی دوستوں کے ہمراہ و جے کے گھر پر جا پہنچا۔ دو منزلہ بلڈنگ کی دوسری منزل پر اس کا کارنر فلیٹ تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے تیل بجائی تو تھوڑی دیر بعد و جے کی دروازے کے قریب سے آواز آئی ”کون ہے“ میں نے آواز بدل کر اور کھانتے ہوئے ایک حملہ آور کا نام لیا۔ ”کام ہو گیا؟“ و جے نے اندر سے پوچھا ”ہاں، لیکن میرا بازو زخمی ہو گیا ہے دروازہ کھولا تو باہر فرش پر دھبے پڑ جائیں گے“۔ میں نے حتی الامکان اپنی آواز کو چھپاتے ہوئے کہا۔ و جے نے دروازہ کھولا تو میں ذرا پیچھے ہو گیا لیکن میرے چینی دوست یکبارگی دروازے کو زور سے دھکا دے کر اندر داخل ہوئے اور و جے کو مدد کیلئے چلانے کا موقع دیئے بغیر اسے فرش پر گرا کر اس کے منہ میں رومال ٹھونس دیا۔ میں نے اندر آ کر دروازہ بند کیا۔ انتہائی وحشت زدہ و جے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کچھ بولنے کیلئے اوں آں کی تو میں نے کہا ”مسٹر و جے کما آج تم نہیں صرف میں بولوں گا اور تم سنو گے تم نے مجھے دوست بن کر اپنے جال میں پھانسا جا ہا اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ میں تم پر اعتبار کرنے لگا اور اگر چنگ واریسٹورنٹ میں تمہاری اور بھارتی سفارتکاروں کی آواز کی خفیہ ریکارڈنگ سے مجھے تمہاری اصلیت کا پتہ نہ چلتا میں تم پر دوستی کے اعتبار میں جانے کہاں سے کہاں چلا جاتا۔ یہ سب کچھ میں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم نے میرے اعتماد اور بھروسے کو دوستی کے پردے میں ٹھیس پہنچائی۔ چنگ واریسٹورنٹ اور اپنے چینی دوستوں کا بھی اس لئے تمہیں بتایا ہے کہ تم کسی سے ان کا ذکر کرنے کیلئے زندہ نہیں رہو گے۔ لکھنؤ سے تمہارے لائے ہوئے دونوں بد معاش بھی اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔ تمہاری دوستی کے بہروپ میں گزارے ہوئے چند دنوں کی وجہ سے تمہیں گولی سے ہلاک نہیں کروں گا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے ایک چینی دوست سے گیس سلنڈر لیا ہم نے اپنے ناک رومالوں سے بند کر لئے۔ میں نے سلنڈر و جے کے چہرے کے بالکل قریب لے جا کر گیس خارج کی۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس کے نتھنوں میں گیس چھوڑی۔ چند لمحوں کیلئے و جے کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں اس کا جسم ایک دو بار پھڑکا اور پھر بے جان ہو گیا۔ ہم تینوں اسے وہیں اسی حالت میں چھوڑ کر اندرونی دو کمروں میں گئے۔ ایک الماری سے ہمیں ساٹھ ہزار سے زیادہ بھارتی کرنسی اور ایک بڑا بریف کیس ملا جس میں سرکاری کاغذات اور فائلیں تھیں۔ کاغذات کو ایک نظر دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ دہلی سے و جے کے رابطے اور ہدایات سے متعلق تھے میں نے کرنسی چینی دوستوں کو دے دی۔ بریف کیس خود اٹھایا و جے کی آنکھیں بند کیں اس کے منہ سے رومال نکال کر اور دروازہ بند کر کے ہم آہستہ قدموں سے چلتے سڑک پر آ گئے۔ گاڑی میں مریم بے چینی سے ہماری منتظر تھی۔ اس پر یہ ایک ایک لمحہ قیامت کا گزرا ہو گا۔ میرے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے چینی دوستوں کی موجودگی سے بے پرواہ ہو کر میرے سینے پر سر ٹکا دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بہنے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کا رونا بند کیا۔ میں نے حملہ آوروں کے دونوں پمپل بھی چینی ساتھیوں کو دینے چاہے تو انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس پستولوں کے علاوہ کئی قسم کا خطرناک اسلحہ موجود ہے۔ چنگ واریسٹورنٹ میں مریم نے اپنی گاڑی نکالی۔ دونوں گاڑیاں شیر پنجاب ہوٹل کے قریب روک کر چینی دوست مریم کی گاڑی میں بیٹھ گئے میں گاڑی لے کر شیر پنجاب پر آ گیا۔ سردار جی ریسٹورنٹ بند کروا کے صفائی کروا رہے تھے۔ کہنے لگے: ”بہت جلدی واپس آ گئے“۔

میں نے کہا ”کچھ جھگڑا ہو گیا تھا“ سردار جی نے ہنستے ہوئے کہا ”بادشاہ، عورت کو کیسے راضی رکھا جاتا ہے۔ یہ گرا آپ ہم سے سیکھنا۔ ہم تو اس علم کے استاد ہیں“۔ میں نے سردار جی سے گریسٹ کا وعدہ کیا۔ گاڑی کی چابی واپس کی اور شکر یہ ادا کر کے واپس چل دیا رات خاصی بیت چکی تھی مریم نے میرے اصرار کے باوجود مجھے میرے ہوٹل میں اتارنے سے انکار کر دیا۔ راستے میں چینی دوستوں کو اتارا اور ہم مریم کے گھر چلے آئے جہاں ایک کمرہ میرے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ مریم نے میرے پہننے کیلئے چائینز اسٹائل کے کئی جوڑے سلوائے تھے یہ آرام دہ کپڑے پہن کر میں بستر میں دراز ہو گیا اور مریم اس دوران کافی بنا کر لے آئی۔ حملہ آوروں کے دونوں پستول اور گولیاں میں نے مریم کو دیں تاکہ محفوظ کر لے۔ مریم نے مجھے شب بخیر کہا تو میں بڑا حیران ہوا کہ اس نے اردو کیسے بولی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ایک پڑھی لکھی پاکستانی مہاجر لڑکی سے اس نے ٹیوشن لینے شروع کر دی ہے۔ (جاری ہے)

غازی

مریم تو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں مستقبل کے سہانے خیالوں میں کھویا بہت جلد نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلے روز دن چڑھے ناشتہ کر کے میں اپنے ہوٹل پہنچا تو محسن میرے انتظار میں لابی پر بیٹھا تھا۔ وہ گزشتہ شام مجھے ملنے آیا تھا اور اس کے بقول وہ رات بارہ بجے تک میری راہ دیکھتا رہا۔ میرے نہ آنے سے وہ فکر مند تھا اس لئے صبح ہی وہ ہوٹل میں چلا آیا۔ میں نے اسے گزشتہ رات کے واقعات کے متعلق کچھ نہ بتایا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ رات کے واقعے کی خبریں اس کے ذریعے مجھ تک پہنچیں۔

محسن کو لابی میں چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں آیا۔ نہاد دھو کر دوسرا لباس پہنا اور لابی میں آ کر محسن کو کافی شاپ میں لے گیا۔ ہمیں وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ نیپالی پولیس کے دو انسپلر آ گئے۔ وہ مجھے اور میرے چینی ساتھیوں سے گزشتہ رات کی فائرنگ کے متعلق پوچھنا چاہتے تھے۔ ان کو یہ رپورٹ چینی دوستوں کے رکشہ والے نے دی تھی جو فائرنگ کی آواز سنتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے انہیں کہ کوئی فائرنگ وغیرہ نہیں ہوئی۔ میرے رکشے کے پہنچنے سے پہلے پتھر آ جانے سے رکشہ الٹ آ گیا تھا جسے ہم نے سیدھا کر لیا۔ چینیوں کے متعلق میں بالکل انجان بن گیا اور کہا کہ میں کسی ایسے چینی کو نہیں جانتا جو میرے پیچھے رکشے میں آ رہا ہو۔ وہ مجھ سے مزید سوال کرنا چاہتے تھے، کافی پینے کے دوران میں نے انہیں کہا کہ میں نے اپنے سفارت خانے جانا ہے میں ایک معزز شخص ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ ایک رکشہ ڈرائیور نے جس کے نشے میں آپ سے جو غلط بیانی کی ہے اس کی بنا پر آپ مجھ سے بلا جواز سوال کریں یہ کہتے ہوئے میں نے ایک ہزار روپے کے نوٹ ٹیبل پر رکھ دیئے اور ان سے پوچھا کہ آپ یہ روپیہ لے کر رکشہ ڈرائیور کی غلط رپورٹ کو بھول جانا چاہیں گے یا مجھ سے سوال و جواب کا بیکار اور بے فائدہ سلسلہ جاری رکھنا چاہیں گے۔ میں نے بڑے اعتماد سے یہ روپے ٹیبل پر رکھے تھے۔ ہیر گنج میں پولیس کے روپے کو میں دیکھ چکا تھا۔ کھٹمنڈو میں جس ممانعت کے باوجود کھلے عام فروخت ہوتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق جس فروخت کرنے کے کئی اڈے پولیس والوں کی ملکیت تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان کی مطلق العنان سینکڑوں ریاستوں میں نظم و نسق کا جو فقدان تھا نیپال میں بھی تقریباً وہی حالت تھی دونوں پولیس افسروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا نوٹ اٹھا کر جیب میں ڈالے مجھ سے ہاتھ ملا کر سیلوٹ کیا اور چلے گئے۔ ان سے پیچھا چھڑا کر میں نے محسن کو کہا کہ وہ مین بازار میں کشمیری شالوں کی دکان پر جائے اور دکان کا ٹیلی فون نمبر لائے۔ میرا اسے بازار بھیجنے کی وجہ ٹیلی فون نمبر لینا نہیں بلکہ وجہ کی موت کا رد عمل دیکھنا تھا۔ محسن کو میں قابل اعتبار تو سمجھتا تھا لیکن اس میں ایک خامی تھی راز کی کوئی بات اس کے پیٹ میں ٹھہرتی نہیں تھی اور میں چاہتا تھا کہ حتی الامکان خود کو وجہ کے قتل ہونے کے واقعے سے دور رکھوں۔ قتل ہونے کی کوئی نشانی وجہ کے جسم پر نہ تھی۔ اس کی موت ہارٹ فیل ہونے کے سبب بھی ہو سکتی تھی۔ زہریلی گیس کی موجودگی عام پوسٹ مارٹم سے معلوم نہ ہو سکتی تھی اور کھٹمنڈو میں ایسی کوئی لیبارٹری نہ تھی جہاں اس گیس کا تجزیہ ہو سکے۔ مجھے یقین تھا کہ بھارتی انٹیلی جنس والے اپنے ایک منجھے جاسوس کی ہلاکت کو آسانی سے ہضم نہ کریں گے۔ ابھی لکھنؤ کے دو بد معاشوں کے لاشوں کی دریافت بھی باقی تھی۔ دشمنوں کی نظروں میں تو میں پہلے روز سے ہی تھا لیکن کھٹمنڈو میں میری موجودگی کے دوران پے در پے مکتی باہنی اور بھارتی ایجنٹوں کی ہلاکت میں میرا ہاتھ ہونے کا کوئی ثبوت نہ تھا لیکن اگر بھارت میں میرے قیام کے دوران کے واقعات اور پھر کھٹمنڈو میں میری آمد کے بعد کے واقعات کا ایک ساتھ تجزیہ کیا جاتا تو یہ حقیقت سامنے آتی کہ جہاں جہاں میں گیا پاکستان دشمن ایک ایک کر کے ختم ہوتے گئے۔ میرا یہ سب تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قارئین کو بتا سکوں کہ گو کہ میرے ظاہری دشمن تو ختم ہو رہے تھے لیکن پوشیدہ دشمنوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ DMI نے مجھے زندہ گرفتار کرنے کی جو پابندی عائد کی تھی اس کی وجہ سے میں اب تک بچا ہوا تھا۔ ورنہ کہیں سے ایک گولی آتی اور میرا کام تمام کر دیتی۔ وجہ نے صرف اپنی جان کے خوف سے لکھنؤ کے بد معاشوں کی خدمات ذاتی طور پر حاصل کی تھیں اور اگر اس کی پلاننگ کامیاب ہو جاتی تو وہ اس سے اپنی لائق ظاہر کرتا۔

محسن شام کو لوٹا۔ ٹیلی فون نمبر دینے کے ساتھ ہی اس نے بتایا کہ وجہ کا گزشتہ رات انتقال ہو گیا ہے اور اس کی لاش کو بذریعہ جہاز دہلی بھیج دیا گیا ہے۔ محسن کو گزشتہ رات میری ہوٹل سے غیر حاضری کی وجہ یقیناً سمجھ میں آ چکی ہوگی لیکن اس نے اس سلسلے میں کوئی

غازی

گزشتہ رات رکشے پر فائرنگ اور وجے کی ہلاکت پر بھارتی سفارت خانہ یقیناً بھناٹھا ہوگا اور بدلے کی آگ میں جلتے ہوئے وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا میں نے مریم کو فون پر اپنے خدشات سے آگاہ کیا تو اس نے بھی ان کی تائید کی اور یہ فیصلہ ہوا کہ میں آئندہ شام کو کبھی جنگ واریٹورنٹ میں ڈائریکٹ نہیں جاؤں گا بلکہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا وہاں پہنچوں گا اور واپسی پر مریم مجھے اپنی گاڑی میں ہوٹل چھوڑ جایا کرے گی۔ میں نے وقتی طور پر تو اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا لیکن آئندہ چارپانچ دنوں میں برٹش بیہوشی کی ایک وین خرید لی تھی جسے وہ پیسے ختم ہونے پر سستے داموں فروخت کر رہے تھے۔ ہوٹل کے ایک گارڈ کو میں نے معقول معاوضے پر گاڑی کی خصوصی دیکھ بھال، صفائی اور نگرانی پر رضامند کر لیا اس وین کے باعث رکشاؤں کے سفر سے میری اور میرے چینی محافظوں کی جان چھوٹ گئی اور میرا کہیں آنا جانا بھی نسبتاً زیادہ محفوظ ہو گیا۔

آئندہ چند روز بڑے سکون اور خاموشی سے گئے۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ سکون اور خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہے یہ بالکل حقیقت ہے کہ مریم اور میں اس خاموش اور سکون کے دوران بڑی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ میرے چینی دوستوں نے مریم کے ذریعے میرے اصرار پر اپنے وہ خطرناک ہتھیار مجھے دکھائے جن کی وجہ سے انہوں نے وہ ریوالور لینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ عام سائز کے سگریٹ کیس جتنا بڑا اور موٹائی میں کچھ زیادہ تھا۔ لمبائی کے رخ اس کے کونے میں ایک چھوٹی سے تاب لگی ہوئی تھی جس میں سوئیاں تھیں۔ تاب کھینچنے سے 14 انچ تک باہر آجاتی اور ایک زہریلی سوئی تاب کی سلاح کے اندرونی سرے پر بنے پوائنٹ پرنٹ ہو جاتی۔ پستل کی میکانیکی کے اصول پر کام کرنے والے اس ڈبے میں بنے ایک ٹن کو دبانے سے ناپ زہریلی سوئی کو پورے زور سے باہر دھکیلتی اور اس سوئی کی رنچ بیس فٹ تک تھی۔ چہرے، گردن، ہاتھ یا جسم کے کسی بھی کھلے حصے میں یہ سوئی داخل ہو کر آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں اپنے شکار کو ہلاک کر دیتی۔ اس کے چلنے کی نیت کوئی آواز آتی اور نہ ہی اس کا شکار جب تک ہلاک نہ ہو جاتا کسی کو بھی اس کی ہلاکت آفرینی کا علم ہوتا۔ چینی دوستوں نے اس ہتھیار کا ایک ڈبہ مجھے تحفے میں دیا۔ اس وقت مجھے علم نہ تھا کہ اس ہتھیار کو ٹیسٹ کرنے کا موقع بہت جلد ملنے والا ہے۔

آئندہ چند روز بڑے امن اور سکون میں گئے۔ موسم میں تبدیلی کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ UNO کے نمائندے نے اپنی نگرانی میں امدادی سامان کی تقسیم کی تھی۔ واپسی سے پہلے اس نے مہاجروں کی رہائش گاہوں کو بھی دیکھا تھا۔ اس نے مہاجروں کی حالت زار کی ایسی رپورٹ لکھی کہ افغان ایئر کے جہازوں کی پرواز کا شیڈول بھی سفارتخانے میں آ گیا۔ اس خبر نے مہاجروں میں خوشی کی لہر دوڑادی۔ پروازیں شروع ہونے میں اگرچہ ابھی تین ماہ باقی تھے۔ لیکن جہازوں میں جگہ حاصل کرنے کیلئے مہاجروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ سفارت خانے میں جمع ہونے لگے اور ایمپیسس والوں کیلئے پھر روپیہ کمانے کے ذرائع پیدا ہو گئے۔ ٹرانسمیٹر آپریٹرنے مجھے بتایا کہ اس بار جہاز میں سیٹ حاصل کرنے کا ریٹ دو ہزار روپے رکھا گیا ہے دو سال سے کھنڈوں میں بے یار و مددگار مہاجروں کو تو ٹالا جا رہا ہے کیونکہ وہ جو کچھ بھی سابقہ مشرقی پاکستان سے لانے میں کامیاب ہوئے تھے ان دو سالوں میں ختم کر بیٹھے ہیں لیکن بالکل نئے آنے والے مہاجروں کو جن کے پاس کچھ جمع پونجی ہے انہیں سیٹیں الاٹ کی جارہی ہیں۔ اس سکھاشاہی کے خلاف پرانے مہاجروں نے سخت احتجاجی رویہ اپنایا ہے۔ وہ نہ صرف سفارت خانے بلکہ سفیر کے گھر کے باہر بھی نعرے لگاتے ہیں۔ مہاجروں کے ایک گروپ نے سفارت خانے کے باہر بھوک ہڑتال شروع کی تو سفارت خانے نے نیپالی پولیس کے ذریعے بھوک ہڑتالیوں کو لاشی چارج سے منتشر کروا دیا۔ اس سارے معاملے پر افسوس کرنے اور اپنی بے بسی کا اظہار کرنے کے علاوہ ایک ایسی خبر تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔

مایوں مہاجروں کو انسانی ہمدردی کے لبادے میں بھارتی سفارت خانہ اپنی طرف راغب کر رہا تھا اور اس کے کارکن دیوالی کے تہوار کی آڑ میں مہاجروں میں خوردنی اجناس کے علاوہ روپے بھی تقسیم کر رہے تھے درجنوں مہاجر یہ امدادی سامان لینے ہر روز بھارتی سفارت خانے میں جاتے تھے جہاں مصدقہ اطلاع کے مطابق ان کا برین واش کرنے کے علاوہ انہیں ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ نا انصافیوں کے خلاف اپنی آواز دنیا میں پہنچانے کیلئے پاکستانی اور بنگلہ دیشی سفارت خانوں کو نذر آتش کر دیں۔ یہ باتیں سن کر میری پہلی سوچ تو یہ تھی کہ اچھا ہوا گر مہاجروں کی طرح کریں۔ اس طرح کم از کم ان کی آواز تو بین الاقوامی میڈیا تک پہنچے گی۔ اس بارے میں بعد میں جوں جوں میں سوچتا گیا۔ بھارت کی اس سازش کے نقوش واضح ہونے لگے۔ وہ ایک تیر سے بیک وقت تین شکار کرنا چاہتا تھا۔ پاکستان کی رسوائی، پاکستان اور بنگلہ دیش کے حال ہی میں اچھے تعلقات کی ابتدا کو سبوتاژ کرنا اور مہاجروں کو نظم و نسق توڑنے اور جلاؤ گھیراؤ کے جرم میں نیپالی حکومت کے قانون کے مطابق لمبی مدت کیلئے جیلوں میں سڑوانا اور نیپال میں نئے مہاجروں کی آمد پر پابندی لگوانا۔ بھارت کو یہ گھناؤنی چال چلنے کا موقعہ صرف پاکستانی سفارت خانے کی دھاندلیوں کے باعث ملا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ان مکالمے پیش آنے والے حالات کی رپورٹ اپنے محکمے کو بھیجنے کے سوا میں کچھ نہ کر سکا۔

محسن نے اپنے ساتھ نئے شادی شدہ لڑکے بھی شامل کر لئے تھے۔ یہ بھارتی سفارت خانے جانے والے مہاجروں کی ٹوہ میں رہتے تھے انہوں نے ان کے نام پتے بھی حاصل کر لئے اور بھارتی اشاروں پر ان کے آئندہ ارادوں کے بارے میں بھی جان کاری حاصل کی۔ ان مہاجروں کا قطعاً کوئی ایسا ارادہ نہ تھا کہ پاکستانی اور بنگلہ دیشی سفارت خانوں کو آگ لگائیں۔ یہ محض اپنی مالی ضروریات پوری کرنے کیلئے بھارتی سفارت کاروں کی ہاں میں ہاں ملادیتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں لکتی باہنی اور بھارتی فوج کے ہاتھوں زخم خوردہ یہ مہاجر خود پر بیٹے ظلم و رسوائی کے واقعات کو ہرگز نہیں بھولے تھے۔ پھر بھی حالات کی نزاکت کے پیش نظر میں نے محسن اور لڑکوں کے ذریعے ان مہاجروں میں بھارت کے اصل مقصد اور نتیجتاً مہاجروں کی گرفتاری کی بات ان میں پھیلا دی۔ اپنی طرف سے یہ اضافہ بھی کر دیا کہ بھارتی سفارت خانے جانے والے مہاجروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک ایک بات کی رپورٹ پاکستانی سفارت کاروں کو پہنچا دیتے ہیں۔ اس رپورٹ کی روشنی میں سفارت خانہ ان کی رجسٹریشن کینسل کر دے گا اور ان مہاجروں کو لامحالہ بھارت میں دھکیل دیا جائے گا۔ یہ سن کر مہاجروں کے تو ہوش اڑ گئے ان کی مالی ضروریات کے متعلق انہیں کہا گیا کہ اپنی جائز ضروریات کی فہرست بنا کر اپنا پورا ہونٹل میں مجھ سے ملیں جہاں میں حتی الوسع ان کی مدد کروں گا اب ان مہاجروں نے بھارتی سفارت خانے جانا چھوڑ دیا اور میرے ہوٹل کا رخ کیا۔ الگ الگ مہاجروں سے ملنے کے بجائے میں نے انہیں محسن کے ذریعے مشورہ دیا کہ اپنے پہلے دس نمائندوں کو اپنی ضروریات بتا کر میرے پاس بھیجیں یہ نمائندے آئے تو پہلے تو میں نے انہیں بھارتی سفارتخانے جانے پر بہت شرمندہ کیا اور بعد میں ان مہاجروں کی جائز مالی ضروریات پوری کیں جو پچیس ہزار روپے سے بھی کم تھیں قارئین کرام میں ان واقعات کو بلاوجہ تفصیلاً نہیں لکھ رہا میرا مقصد آپ کے یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ مالی مجبوری انسان کو کس حد تک صحیح راستے سے ہٹا سکتی ہے۔ میری یہ کوشش ان مہاجروں کو بے خبری کے عالم میں خداری سے روکنے کیلئے تھی جن کا خیازہ آخر کار مجھے بھگتنا پڑا۔ انہی میں سے ایک مہاجر کو اپنی بیوی کے اچنڈکس کے فوری آپریشن کیلئے بھارتی سفارت خانے نے چار ہزار روپے دیئے تھے جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں نے اسے روپے دے کر بھارتی سفارت خانے بھیجا کہ شکریے کے ساتھ روپے لوٹا دے اس کے جی میں نجانے کیا آئی اس نے روپے تو نہ لوٹائے لٹا سفارت خانے والوں کو یہ بتا دیا کہ مہاجروں کی مالی ضروریات پوری کر کے میں نے انہیں سفارت خانے جانے سے روک دیا ہے۔ روپے لے کر جب وہ سفارت خانے جا رہا تھا تو میں نے محسن اور چار لڑکوں کی ڈیوٹی لگائی کہ سفارت خانے سے باہر نکلتے ہی اسے گھیر لیا اور میرے ہوٹل میں لے آئیں جب اسے ہوٹل میں لایا گیا تو میرے پوچھنے پر اس نے کہا کہ روپے اس نے لوٹا دیئے ہیں میں نے چینی دوستوں کو کہا کہ اس کی حلاشی لیں حلاشی پر میرے دیئے ہوئے نشان زدہ نوٹ اس کی اندرونی جیب سے برآمد ہوئے۔ مجھے بے حد طیش آیا کہ ایک طرف تو میں ان کی بھلائی اور بہتری کیلئے اپنی زندگی کو ہر طرف خطرے میں ڈال رہا تھا اور اس کے بدلے میں یہ میرے ساتھ منافقانہ سلوک کر رہے تھے اسی غصے کی حالت میں اسے میں نے پانچ سات چپٹ لگا دیئے اس نے اور تو کچھ نہ کیا موقع ملتے ہی تیر کی سی تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا میں نے بھی اسے جانے دیا اور سوچا کہ اتنا سبق ہی کافی ہے۔

(جاری ہے)

غازی

اس نے اپنے دل میں گرہ باندھ لی وہ مجھ سے بدلہ لینے کیلئے بھارتی سفارت کاروں سے ملا اور اپنی وفاداری کے وعدے کر کے انہیں ایسا رام کیا کہ ان کے مشورے سے یہ شخص دو روز بعد میرے ہوٹل آیا اور فی الحقیقت میرے پاؤں پکڑ کر مجھ سے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ میں نے بھی اس کی مالی مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے اسے صدق دل سے معاف کر دیا اور چند روز میں ہی یہ میرے اردگرد منڈلاتے ہوئے بالآخر میرا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ سارا دن میرے ہوٹل کی لابی میں بیٹھا رہتا اور میرے پوچھنے پر کہتا کہ آپ کی وطن پرستی کا معتقد ہو چکا ہوں اور آپ سے ملے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس سے پیچھا چھڑانے کیلئے میں نے کئی بار بے رخی سے ہوٹل میں آنے سے منع کیا لیکن وہ باز نہ آیا۔ ہوٹل کی لابی سے نکلوا یا تو ہوٹل کے باہر کھڑا رہنے لگا میرے دماغ پر وہ ایک بوجھ سا بن گیا تھا اس کی انہی حرکات نے مجھے اس کے بارے میں شک میں مبتلا کر دیا میں نے محسن اور لڑکوں کو اس کی نگرانی پر لگا دیا صبح سے لے کر اس کے اپنے گھر پہنچنے تک اس کی نگرانی ہوتی تھی لیکن کوئی ایسا سراغ نہ ملا جس سے اس کا بھارتی سفارت خانے سے اس کے رابطے کا ثبوت ملتا۔

میں حسب معمول ہر شام چنگ وار ریستورنٹ جاتا اور رات گئے واپس لوٹتا۔ مریم نے اب خالصتاً مشرقی لباس اپنالیا تھا۔ اس کی ٹیوٹ نے اسے مشرقی اسلامی رسم و رواج بھی ذہن نشین کروا دیے تھے۔ شلو اور قمیض یا چست پاجامہ اور کرتہ پہنے مجھے دیکھ کر جب وہ ذرا جھک کر اور دایاں ہاتھ پیشانی تک لے جا کر آداب کرتی تو بہت بھلی دکھائی دیتی۔ انک انک کر جب وہ اردو کے چھوٹے چھوٹے فقرے بولنے میں کوئی غلطی کرتی اور میں اس کی تصحیح کرنا چاہتا تو وہ فوراً انگلش میں مجھے ٹوک کر خود تصحیح کرنے کی کوشش کرتی اور تب تک اس فقرے کا پیچھا نہ چھوڑتی جب تک اسے خود ہی ٹھیک نہ کر لیتی۔

حسب معمول ایک روز میں رات دس بجے مریم کے گھر سے واپس لوٹ رہا تھا۔ وین میں میرے ساتھ میرے دونوں چینی ساتھی بھی تھے۔ میں نے اپنے ہوٹل سے ریستورنٹ اور واپسی کا سیدھا راستہ چھوڑ کر ایک لمبا روٹ اپنالیا تھا تا کہ بھارتی سفارت خانہ راستے میں نہ پڑے۔ جس روز سے وین خریدی تھی میں اسی نئے روٹ سے آتا جاتا تھا اس روٹ پر خاصا راستہ بے آباد اور سنسان تھا گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں، میں نے جنیفر پہنے ایک عورت کو بھاگتے اور اس کا پیچھا کرتے تین پیوں کو دیکھا۔ وین عورت کے قریب پہنچی تو عورت بے حد خوفزدہ انداز میں چلا رہی تھی۔ میں نے وین روکی تو وہ عورت Help- Help چلاتے ہوئے وین کے قریب آگئی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ بھاگنے سے بال اس کے چہرے کو ڈھانپنے ہوئے تھے۔ اس عورت نے مجھے میرے اصلی نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ پلیز میری جان بچاؤ یہ جرمن نازی پارٹی کے ممبر ہیں یہ وہی اسرائیلی جاسوس تھی جو میرے ہوٹل میں رات کو آئی تھی صورت حال کو نہ سمجھتے ہوئے بھی میں وین سے اتر آیا اور میرے ساتھ ہی میرے چینی دوست بھی وین سے باہر آگئے۔ یہ سب کچھ پانچ چھ سیکنڈ میں ہوا اتنے میں پیچھا کرنے والے تینوں مرد بھی وہاں پہنچ گئے ان تینوں کے ہاتھ میں خنجر تھے اور سب سے آگے وہ جرمن ٹورسٹ تھا جو گورکھپور سے کھٹمنڈو تک میرا ہمسفر رہا اور شہونا تھ کے مندر کی سیڑھیوں پر روپے دیتے ہوئے جب میں نے اس سے ان اسرائیلی لڑکیوں کے متعلق پوچھا تو ان کا پتہ بتاتے ہوئے اس نے ان لڑکیوں کیلئے Bitces (کتیا) کا لفظ استعمال کیا تھا۔ (جاری ہے)

غازی

جرمن ٹورسٹ اور اس کے دونوں ساتھی میرے قریب آ کر رک گئے۔ مجھے پہچانتے ہوئے وہ بولا "یہی وہ یہودی جاسوس ہے جس کے متعلق تم نے مجھ سے پوچھا تھا یہ تمہارے ملک کی دشمن ہے یہ ہماری قوم کی بھی دشمن ہے آج یہ اکیلی ہمارے ہتھے چڑھ گئی ہے ہم اسے مار ڈالیں گے تمہارے اور ہمارے دشمنوں میں ایک کی کمی ہو جائے گی"۔ یہ جرمن ہاتھ میں خنجر پکڑے میرے اتنے قریب آچکا تھا کہ مجھے اپنے ہتھیار نکالنے سے پہلے ہی ہلاک کر سکتا تھا میں نے صورتحال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اسے زبانی سمجھانے کی کوشش کی اور کہا "تم بے شک اسے مار دینا لیکن پہلے اپنا خنجر جیب میں ڈالو اور میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تمہارے ملک نے تو نہ صرف اسرائیل کو تسلیم کیا ہوا ہے بلکہ اس سے گہری دوستی بھی ہے اور بڑی مالی امداد اور ہتھیار بھی دیئے ہیں پھر یہ تمہاری دشمنی کیسے ہوئی؟" جس کا مارا یہ سوکھا سر جرمن عام حالات میں میرے ایک گھونسے سے ہی چیت ہو جاتا لیکن اس وقت مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر کھڑا یہ مدقوق ایک ہی وار سے میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ اس نے نہ تو خنجر جیب میں ڈالا اور نہ ہی میرے سوال کا جواب دیا۔ میری پشت وین سے لگی ہوئی تھی اپنے بچاؤ کیلئے میں پیچھے ہٹ نہیں سکتا تھا۔ میری اس کمزوری کا اسے بھی علم تھا۔ "ہم تمہیں بھی مار ڈالیں گے تم پر بھی انعام ہے" یہ کہتے ہوئے اس جرمن نے مجھے اپنے خنجر کی زد میں لے لیا اور اپنا وارپوری طاقت سے کرنے کیلئے ایک قدم پیچھے ہٹا اب سمجھنے سمجھانے کا وقت نہیں تھا یہ ایک لمحہ تھا جسے اگر میں ضائع کر دیتا تو اس کا وارنشا نہ ضرور بن جاتا۔ مجھے اپنے بچاؤ کیلئے اپنے اور جرمن کے درمیان دو فٹ سے زیادہ فاصلہ درکار تھا وہ جو نہیں مجھ پر وار کرنے کیلئے پیچھے ہٹا میں نے بیک وقت اس کے نازک اعضا پر کک جمائی اور خنجر والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی۔ جرمن کک لگنے کے درد سے دہرا ہوا ہاتھ اس کی کلائی کو میں اس کی پشت کی طرف لے جا رہا تھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمن پیٹھ کے بل سرک پر چیت ہو گیا۔ میں ڈی ایم آئی کی حراست سے نکلنے کے بعد اپنی ذہنی حالت کے بارے میں تحریر کر چکا ہوں کہ مجھے اپنی زندگی سے پیار ہو گیا تھا اور مجھے گرفتار ہلاک کرنے کی کوشش کرنے والوں کو دیکھ کر میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا تھا اسی کیفیت سے میں اس وقت دو چار تھا میں نے جو دھپوری جوتے پہن رکھے تھے سرک پر گرے جرمن کی خنجر والی کلائی پر میرا ایک پاؤں تھا اور گردن پر دوسرا۔ جب یہ حواس بحال ہوئے تو جرمن مر چکا تھا اس کی گردن پر میں نے اتنا دباؤ ڈالا تھا کہ اس کی گردن پچک گئی تھی۔ اس جرمن کے دونوں ساتھی غائب تھے اور وین کے پیچھے اندھیرے میں میرے چینی دوستوں کے ہولے دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جلدی سے ہسپتال نکالا اور چینی دوستوں کے قریب گیا سرک پر دونوں جرمن بے سدھ پڑے تھے۔ میں نے ہسپتال سے ان پر فائر کرنا چاہتا تھا تو چینی دوستوں نے نونو کہتے ہوئے اور ہاتھوں کے اشارے سے مجھے روک دیا اور گیس سلنڈر مجھے دکھا دکھا کر جرمنوں کی طرف اشارے کرنے لگے وہ جرمنوں کے بازو اوپر اٹھا کر چھوڑ دیتے اور ان کے بے جان بازو دھڑام سے نیچے گر جاتے اس طرح وہ مجھے یقین دلارہے تھے کہ گیس سے وہ دونوں ہلاک ہو چکے ہیں۔ ہم نے ان تینوں کی جیبوں کی تلاشی بھی لی اور ان کے پاسپورٹ اور بٹوے وغیرہ نکال لئے تاکہ ان کی آسانی سے شناخت نہ ہو سکے۔ اسرائیلی جاسوسہ اس وقت جاسوسہ نہیں بلکہ ایک ڈری ہوئی خوفزدہ لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

(جاری ہے)

غازی

موقعہ واردات سے جلد از جلد دور ہونے کیلئے میں نے چینی دوستوں اور اسرائیلی لڑکی کووین میں بیٹھنے کو کہا اور اپنے ہوٹل آ گیا۔ لابی میں بیٹھنے کے بجائے میں انہیں کافی شاپ میں لے گیا۔ میں نے مریم کو فون کر کے اسے بھی بلا لیا۔ تھوڑی دیر میں ہی مریم بھی آ گئی وہ حیران تھی کہ کچھ دیر پہلے میں اس کے گھر سے بخیریت چلا تھا پھر ایسی کیا بات ہو گئی جو اسے بلایا ہے فون پر میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا اتنے دنوں کی قربت سے وہ میری اس عادت کو اچھی طرح سے جان چکی تھی کہ اپنی کسی بھی مشکل میں کسی کو اور خصوصاً اسے شامل نہیں کرتا تھا۔ مریم کو آتے دیکھ کر میں اسے لابی میں لینے کیلئے چلا گیا اور کافی شاپ تک پہنچنے کے دوران اسے صرف اتنا کہہ سکا کہ وہاں بیٹھی عورت کو دیکھ کر وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو اور بھڑک نہ اٹھے، پہلے ساری بات سنے اور حقیقت جان لے جس سے میں بھی خاص حد تک ناواقف تھا۔ مریم خاموشی سے میرے ساتھ بیٹھ گئی میں نے اسرائیلی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”میں تم سے تمہارا نام نہیں پوچھوں گا کیونکہ یہ ہمارے پیشہ ورانہ اصولوں کے خلاف ہے۔ لیکن آج کے واقعے کی تفصیل ضرور جاننا چاہوں گا کہ جس کے نتیجے میں ہمارے ہاتھوں تین ان انسانوں کا خون ہوا جن سے ہماری نہ تو ذاتی عداوت ہے اور نہ ہی ملکی دشمنی۔ میں نے محض انسانیت کے نام سے تمہاری مدد اس لئے کی کیونکہ جب تم مدد کیلئے چلا رہی تھیں اس وقت تم میرے لئے ایک ماساڈی جاسوس نہ تھیں بلکہ صرف ایک عورت تھیں جسے ہلاک کرنے کیلئے تین درندہ صفت مرد بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ میرے مذہب میں تمہاری مدد کرنا میرا فرض بنتا ہے میں تمہیں مجبور تو نہیں کر سکتا لیکن حقیقت بتا کر تم مجھے اس احساس سے نجات دلا سکتی ہو کہ ہم نے تین انسانوں کا ناحق خون کیا۔“

ملکی باندھے مجھے دیکھتے ہوئے اسرائیلی لڑکی خاموشی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں جذبات کے دو سمندر آپس میں ٹکرا رہے تھے۔ وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر یوں گویا ہوئی ”میرے ماں باپ جرمن یہودی تھے۔ بون (BONN) میں میرے والد کی کیمرے کی کئی دکانیں تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب جرمنی کی نازی پارٹی اور ہٹلر کے یہودیوں پر مظالم انتہائی سے بڑھ گئے یہودیوں کیلئے یہ لازم ہو گیا کہ وہ اپنی شناخت کیلئے اپنے لباس پر پیلا پھول لگائیں۔ بغیر کسی جرم اور خطا کے یہودیوں کا قتل عام ہونے لگا اور انتہا یہ کہ لاکھوں یہودیوں کو گیس چیمبرز میں ڈال کر ہلاک کیا گیا اور ان کی چربی سے جنگی ہتھیار کیلئے گریس بننے لگی تو میرے والدین اپنے اکلوتے بیٹے کے ہمراہ چھپتے چھپاتے پہلے آسٹریا اور پھر فرانس سے ہو کر 1951 میں اسرائیل پہنچے۔ میں 1955 میں حیفہ میں پیدا ہوئی۔ نقل مکانی کے دوران میرے والد کی ساری پونجی جان بچانے کی رشوت اور سفری کاغذات کے حصول میں ختم ہو چکی تھی۔ میرے والد اور بھائی نے حیفہ میں بندرگاہ پر مزدوری کر کے اور ماں نے مالٹوں کے باغوں میں کام کر کے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اسرائیل ہمارے لئے امن کا گہوارہ ثابت ہو گا لیکن یہ خوش فہمی بھی سراپا ثابت ہوئی مسلم عرب ممالک جن کی سرحدیں اسرائیل سے ملتی تھیں ہمیں ختم کر دینے کے درپے تھے۔ اسرائیل میں ہر مرد اور عورت کیلئے فوجی تربیت لازمی قرار دی گئی تھی۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے وقت اسرائیل کی کل آبادی سے زیادہ ان مسلم ممالک کی افواج تھی جن سے ہمیں بیک وقت لڑنا پڑا۔

(جاری ہے)

غازی

ہم بے جگری سے لڑے اور کامیاب ہوئے کیونکہ یہ ہماری Survival (زندگی اور موت) کی جنگ تھی۔ ہمارے سامنے مسلح افواج اور پیچھے سمندر تھا۔ اس جنگ میں میرے والد اور بھائی وطن کے تحفظ میں ہلاک ہوئے اور کچھ ہی عرصے بعد میری والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ اس وقت میں اسرائیلی فوج میں دوسری دفاعی لائن میں تھی۔ ہماری جاسوسی ایجنسی موساد ان دنوں روز بروز طاقت پکڑ رہی تھی اور اس کا دائرہ کار ہمسایہ ممالک سے بڑھ کر لیبیا، الجزائر، سوڈان اور مشرق میں پاکستان انڈونیشیا اور ملائیشیا تک پھیل چکا تھا۔ سخت تربیت کے بعد مجھے موساد میں فیلڈ ایجنٹ کے طور پر شامل کر لیا گیا۔ میں عربی نہایت روانی سے بول سکتی ہوں اور اسی زبان دانی اور جوانی کے سہارے میں نے اور میرے جیسی فیلڈ ایجنٹوں نے مسلم عرب ممالک کے عیاش افسران سے ان کے انتہائی خفیہ ملکی راز اس حد تک حاصل کئے کہ یہ ملک اور ان کے دفاعی راز اب ہمارے لئے ایک کھلی کتاب کی طرح ہیں۔ اپنے متعلق اس سے زیادہ بتانا میرے لئے اپنے وطن سے غداری کے مترادف ہوگا جس کی میں کسی صورت میں مرتکب نہیں ہو سکتی۔ اب میں کھٹمنڈو کی طرف آتی ہوں۔ آپ کی یہاں آمد کے تیسرے روز ہی مجھے اور میرے ساتھیوں کو آپ کی اصلیت کے بارے میں مکمل اطلاع مل چکی تھی۔ ببئی میں آپ کے میزبانوں کے کارندوں کے قہر دان ہیں چاہے وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ کھٹمنڈو میں آپ کی سرگرمیوں سے ہم نے واقف ہونے کے باوجود اس لئے تعرض نہیں کیا کیونکہ ہمارے ٹارگٹ مختلف تھے اور ان میں کوئی ٹکراؤ نہ تھا۔ یہ تینوں جرمن جو آج آپ کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے، جرمنی کی زیر زمین نازی پارٹی کے ممبر تھے جرمنی میں بظاہر نازکی پارٹی اور یہودی دشمنی ختم ہو چکی ہے لیکن جس طرح پاکستان کے دشمن نئے لہادے اوڑھ کر پاکستان کے دو ٹکڑے کرنے کے بعد بچے کچے پاکستان کو بھی ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بالکل اسی طرح جرمنی میں بھی زیر زمین نازی پارٹی کے بے شمار ارکان، نازکی کو اپنا آئیڈل جانتے اور جرمن قوم کو افضل ترین سمجھتے ہیں اور یہودیوں کو صفحہ ہستی سے ختم کرنا ان کا اولین مقصد ہے۔ آج شام میں اپنے مشن کے سلسلے میں اکیلی گئی تھی یہ تینوں جرمن نامعلوم کب سے میری تاک میں میرا پیچھا کر رہے تھے اور آج میں ان کے ہتھے چڑھ گئی۔ جوڈو کی ماہر ہونے کے باوجود میں ان تینوں مسلح نازیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ہتھیار میں اس لئے ساتھ نہیں رکھتی کیونکہ یہاں ہمارا کسی سے ڈائریکٹ ٹکراؤ نہیں بلکہ صرف اپنے ٹارگٹ کے حصول کیلئے ایسے لوگوں کو تیار (Cultivate) کرنا ہے جو باسانی شمال میں جا سکیں۔ ایسے لوگوں میں میل جول بڑھانے کیلئے مجھے اور میرے ساتھیوں کو تقریباً ہر روز حشیش کی محفلوں میں جانا اور حشیش پینی پڑتی ہے جس سے میرا اسٹیمنا (Stamina) بہت کم رہ گیا ہے۔ بھاگتے ہوئے میں بے حال ہو چکی تھی اور گرنے کے قریب ہی تھی کہ آپ پہنچ گئے۔ آپ کی بروقت مدد سے میری جان بچ گئی ورنہ آج میری ہلاکت یقینی تھی۔ وہ دم لینے کو رکی تو میں نے مریم کو بعد کے واقعات اور جرمنوں کے مجھ پر حملے اور ان کی ہلاکت کے متعلق بتایا۔ میں نے اسرائیلی لڑکی سے مریم کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ ہم جلد ہی شادی کرنے والے ہیں کسی دوسرے کے سامنے پہلی بار میرے اس انکشاف سے مریم شرمائی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسرائیلی لڑکی نے ہم دونوں کو مبارک دی اور ہمارے ممالک میں کتنا ہی اختلاف سہی، لیکن آپ نے آج جس طرح خطرے میں کود کر میری جان بچائی اس سے ان باتوں کی نفی ہوئی ہے جو میں نے اپنی کتابوں میں پاکستانیوں کے پست کردار کے متعلق پڑھی ہیں۔ (جاری ہے)

غازی

آپ کا آج کا احسان مجھ پر ادھار ہے جسے میں موقع آنے پر چکانے کی پوری کوشش کروں گی۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوئی ہم نے پہلے اس لڑکی کو اس کے گیسٹ ہاؤس میں چھوڑا۔ مریم، میں اور وہ لڑکی مریم کی گاڑی اور چینی دوست میری وین چلا رہے تھے۔ واپسی پر ہم مریم کو چھوڑنے اس کے گھر گئے۔ میں نے مریم کو آج رات کی واردات اپنے والدین کو بتانے سے منع کر دیا۔ اس کے گھر جانے اور واپسی پر ہم نے بھارتی ایمپسی والا راستہ اختیار کیا تا کہ اگر جرمنوں کی لاشیں موقع واردات پر پڑی ہوں تو دیکھ کر دماغ پر اگندہ نہ ہو۔ واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ اسرائیلی عورتیں تو سخت تربیت لے کر جاسوسی اور جنگ میں حصہ لیتی ہیں جبکہ ہماری پاکستانی خواتین ان دونوں شعبوں میں انتہائی ماہر ہیں۔ یقین نہ آئے تو پاکستان کے کسی بھی شہر، قصبے اور دیہات میں جا کر دیکھ لیں۔ گھروں کے دروازوں، کھڑکیوں اور چھتوں اور گلیوں میں کھڑی ہماری خواتین ہمسایوں کے ساتھ ایسی خوفناک جنگ لڑتی ہیں کہ کسی بھی ملک کی باقاعدہ فوج ان کے طریقہ جنگ سے گھبرا کر دم دبا کر بھاگ جائے اور اس جنگ کے دوران جاسوسی کیلئے ایسے ایسے ”انکشاف“ ہوتے ہیں کہ جاسوسی کے دنیا بھر کے ماہر دانتوں میں انگلیاں داب کر رہ جائیں یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارا یہ بیش قیمت Talent (صلاحیت) بے فائدہ ضائع ہو رہا ہے۔

اگلے روز دن چڑھے محسن آیا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ تین غیر ملکی چرسی ایک سڑک پر مردہ پائے گئے چونکہ ان کے لباس سے پاسپورٹ یا کوئی ایسے کاغذات نہیں ملے جن سے ان کی شناخت ہو سکتی۔ اس لئے پولیس نے ان کی لاشوں کو سرد خانے میں رکھوا دیا ہے۔ ان کی موت کی بظاہر کوئی وجہ بھی معلوم نہیں ہو سکی۔ حالانکہ تینوں کی لاشوں کے قریب تین کھلے چاقو بھی پڑے تھے۔ پولیس ان چاقوؤں سے فنگر پرنٹ لے کر قاتلوں کو تلاش کرے گی۔ عام خیال یہی ہے کہ ان چرسیوں نے مالی تنگدستی سے مجبور ہو کر رات کے اندھیرے میں کچھ لوگوں کو لوٹنے کی کوشش کی اور چاقو بھی انہی کے تھے لیکن خود ہی اس کوشش میں ہلاک ہو گئے۔ قیاس آرائیوں کا سلسلہ اس سوال پر آ کر ٹوٹ جاتا تھا کہ انہیں ہلاک کیونکر کیا گیا ان کے جسموں پر کسی بھی قسم کے ہتھیار استعمال کرنے کے نشان نہ تھے۔ نیپال میں گورکھپور کا ایک قبیلہ ابھی تک موجود ہے جو دو سو سال قبل کے لٹیروں کی طرح اپنے شکار کو ہلاک کرنے کا پرانا طریقہ اب بھی استعمال کرتا ہے۔ ایک رومال میں سکہ باندھ کر شکار کے گلے کے گرد رومال اس طرح کس دیا جاتا ہے کہ سکے کا پورا زور گلے کے منکے پر پڑتا ہے۔ منکا اتنا دباؤ برداشت نہ کر سکنے کے باعث ٹوٹ جاتا ہے اور شکار ہلاک ہو جاتا ہے۔ مجھے ان نیپالی لٹیروں کے متعلق مریم نے بتایا تھا۔ میں محسن کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا اور کوئی تبصرہ نہ کیا کیونکہ جب کسی واقعے کے متعلق ایک سے زیادہ آرا ہو جائیں تو معاملہ عموماً unsolved (غیر حل شدہ) رہ جاتا ہے۔

قارئین کے ذہن میں یہ سوال یقیناً اٹھتا ہوگا کہ بھارت میں تین سالہ قیام کے دوران سوائے گورکھپور کے ہوائی اڈے کے جہاں سینکڑوں افراد جل کر جھسم ہو گئے تھے، ہم نے ہمیشہ دشمنوں کو ہلاک کیا اور یہ انتہائی اقدام صرف اسی وقت کیا جب کوئی دوسری صورت باقی نہ رہی۔ لیکن نیپال میں تین ماہ سے بھی کم عرصے میں میں نے اور میرے ساتھیوں نے اتنے لوگوں کو ہلاک کیا کہ ان کی لائن لگ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بھارت میں اپنے محکمے کی طرف سے ہمیں ٹارگٹ دیئے گئے تھے۔ گورکھپور کا مشن بھی ہمیں دیئے گئے ٹارگٹس کی لسٹ میں نہیں تھا۔ بھارت میں ہم نے روپوشی اور کور (cover) میں وقت گزارا تھا اور ہم Hit and run (حملہ کرو اور بھاگ جاؤ) کی حکمت عملی سے کام لے رہے تھے۔

(جاری ہے)

غازی

ہماری تلاش میں بھارتیوں کی کامیابی میری گرفتاری کی صورت میں سامنے آئی۔ لیکن کھٹمنڈو میں صورت حال بھارت سے بالکل مختلف تھی۔ یہاں بھارتی جاسوس اپنے پورے وسائل کے ساتھ موجود تھے۔ وہ میرے متعلق پوری معلومات رکھتے تھے۔ میں ان کے سامنے موجود اور میرے ساتھ عملی طور پر صرف تین چینی دوست تھے۔ یہاں ہمارے مقاصد بھی مختلف تھے۔ بھارتی مجھے زندہ گرفتار کرنے یا اس میں ناکامی کی صورت میں ہلاک کرنا چاہتے تھے اور میں ان کی نفی اور ان کے planted آدمیوں کو زیادہ سے زیادہ ہلاک کر کے ان کے پلان (plan) کو ناکام اور انہیں خوفزدہ کر رہا تھا۔ اس آسنے سامنے کی جنگ میں جو بھی رکاوٹ میرے سامنے آئی تھی۔ اسے میں ختم کرتا جاتا تھا۔ چاہے وہ غدار اور Planted مہاجروں کی صورت میں سامنے آئے یا جرمن ٹورسٹوں کی شکل میں غرض کہ بھارت کی نسبت کھٹمنڈو میں مجھے جانی خطرہ بہت زیادہ تھا اور اسی خطرے کو کم کرنے کیلئے یہاں میرے ہاتھوں پے درپے ہلاکتیں ہو رہی تھیں۔

آئندہ تین چار روز میں جرمنوں کے متعلق یہی معلوم ہوا کہ ان کی Identity (شناخت) کا کوئی ثبوت نہ ملنے کے باعث کسی سفارت خانے نے بھی پولیس سے رجوع نہیں کیا۔ انہیں لاوارث سمجھتے ہوئے اور شہریت کا تعین نہ ہو سکنے کے سبب نیپال کے قانون کے مطابق ان کی لاشوں کو جلا دیا گیا۔ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ جس کے رسیا ہی کھٹمنڈو میں اکثر سردی اور بھوک سے ہلاک ہو جاتے تھے۔ میں نے ان کے پاسپورٹ اپنے کمرے کے آتش دان میں جلا دیئے تھے چند روز میں ان جرمن پیوں کی ہلاکت بھی ماضی کا قصہ بن گئی۔ میری فوری ذہنی پریشانی وہ مہاجر تھا جو کسی صورت میں اچھپا نہ چھوڑتا تھا۔ محسن اور لڑکے اس کی مکمل نگرانی کرتے رہے تھے لیکن بھارتی سفارت خانے سے اس کے ظاہری رابطے کا کوئی ثبوت نہ مل سکا۔ سڑک پر ہوٹل کے سامنے کھڑے ہونے سے میں اسے روک نہیں سکتا تھا لیکن اس کے دن کا بیشتر حصہ وہاں گزارنے سے وہ میرے ذہن کا بوجھ بن گیا تھا اس سے چھٹکارے کی کوئی اور صورت نہ دیکھتے ہوئے میں نے ایک روز ہوٹل سے نکلنے سے اپنی وین میں بیٹھنے کی دعوت دی وہ گھبرا گیا اور وین میں بیٹھنے سے انکار کرتے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس سے میرا شک یقین میں بدل گیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے اس سے پیچھا چھڑاؤں یا کم از کم صحیح صورت حال ہی معلوم ہو جائے تاکہ اس کا سدباب کر سکوں۔

ایک رات مریم کے گھر میں اسے میں اپنی عملی زندگی کے اولین دور کے واقعات سنارہا تھا جو میں نے چٹاگانگ میں اصفہانی ٹی کمپنی کی ملازمت میں گزارا تھا اسے بنگال ٹائیگر کے شکار کا ایک واقعہ سناتے ہوئے جب شیر کو راغب کرنے کیلئے ”چارہ باندھنے“ کے مقام پر پہنچا تو اسے میری بات پوری طرح سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے اسے تفصیلاً بتایا کہ گائے کے پھڑے کو جنگل میں کسی کھلے مقام پر باندھ کر شکاری درختوں پر چڑھ جاتے ہیں اور شیر پھڑے کی بو پر اس تک آجاتا اور شکاریوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا ہے میں مریم کو یہ سمجھا ہی رہا تھا کہ اچانک میرے دماغ میں بجلی سی کوندی اور اس مہاجر کی وہاں موجودگی کی وجہ سمجھ میں آنے لگ گئی۔ بھارتی سفارت کار بھی اسے چارے کے طور پر استعمال کر رہے تھے انہیں بخوبی علم تھا کہ کھٹمنڈو میں کتنی باہنی کے 9 غدار مہاجروں اور بچے کمار کی اموات میں میرا عمل دخل تھا لیکن کوئی ایسا ثبوت انہیں نہ مل سکا۔ جس کے ذریعے وہ مجھے ان اموات کا ذمہ دار ٹھہرا سکیں۔ میرے خیال میں انہیں پورا یقین تھا کہ اس مہاجر کی ہر روز کی نگرانی سے تنگ آکر میں جھنجلاہٹ میں اسے ختم کر دوں گا۔ اگر ایسا ہوتا اور انہوں نے اس مہاجر سے پہلے ہی ایسی کوئی تحریر لے لی ہوتی کہ اسے مجھ سے اپنی جان کا خطرہ ہے یا اس کی موت کا ذمہ دار میں ہوں تو وہ بڑی آسانی سے مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کروا سکتے تھے اگر ان کے پاس ایسی تحریر موجود تھی تو وہ خود بھی اسے ہلاک کر کے اس کا قتل میرے سر منڈھ سکتے تھے۔ ابھی تک یہ صرف مفروضہ تھا لیکن ہر تحقیق اور تفتیش مفروضوں سے ہی شروع ہوتی ہے۔ ان حالات میں یہ مہاجر میرے کچھ کام نہ آنے کے باوجود میرے لئے فوری خطرے کا باعث تھا میں نے مریم کے مشورے سے فوری طور پر ایک پلان بنایا جس پر اگلے روز صبح ہی سے عمل کرنا تھا۔ مریم کے گھر سے میں معمول کے خلاف جلد اٹھ آیا اور محسن کے گھر پہنچا۔ محسن کو میں نے کہا کہ مہاجروں کے دس نمائندوں کو لے کر وہ کل دو بجے میرے ہوٹل میں پہنچ جائے۔ اسے میں نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا اگلے دن صبح دس بجے اپنے چینی ساتھیوں کے ہمراہ میں وین میں ہوٹل سے باہر آیا۔ وہ مہاجر حسب معمول ہوٹل کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ میں نے چینی دوستوں کو اس سے چند قدم پہلے ہی اتار دیا اور وین مہاجر کے بالکل قریب کھڑی کر دی۔ وہ ابھی میرے اس اقدام کی وجہ سے متعلق سوچ ہی رہا ہوگا کہ میرے چینی دوستوں نے دونوں طرف سے اسے زرنے میں لے کر انتہائی پھرتی سے وین میں ڈالا۔ منہ پر ٹیپ چسپاں کی اور اس کی آنکھوں پر ٹیپ باندھ کر اسے وین کے فرش پر ڈال دیا ادھر ادھر کے بلاوجہ چکر کاٹ کر ہم اسے شیر پنجاب ریستورنٹ لے آئے۔ ابھی ریستورنٹ کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔ سردار جی سے چند باتیں کر کے ہم اسے چنگ وا ریستورنٹ لے آئے۔ وہاں بھی مناسب جگہ نہ ہونے کے باعث ہم پاکستان ایمبیسی پہنچے۔ میں نے وین خاصی آگے لے جا کر کھڑی کی اور ٹرانسمیٹر آپریٹر کے کمرے میں چلا گیا۔ ٹرانسمیٹر اور دوسرے آلات پچھلے کمرے میں تھے۔ آپریٹر کچھ دیر پہلے ہی گھر سے آیا تھا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں چند گھنٹوں کیلئے اس کے گھر کی ضرورت ہے۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور میرے ساتھ ایمبیسی سے باہر آ گیا اور وین میں بیٹھنے سے پہلے بولا ”میرا گھر حاضر ہے صرف یہ خیال رکھیں کہ میں سفارت خانے کا ملازم ہوں اور افسران مجھے پسند نہیں کرتے۔ کوئی ایسی بات نہ ہو۔ جس سے انہیں میرے خلاف کوئی موقع مل جائے“ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ وین میں میرے ساتھ بیٹھ گیا (جاری ہے)

غازی

اس کا گھر سفارت خانے سے تین کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر تھا اس نے دور سے مجھے اپنا مکان دکھایا۔ چابیاں دیں اور وہیں سے اتر گیا میں نے وہیں اس کے چھوٹے سے گھر کے دروازے کے بالکل سامنے کھڑی کی۔ مکان کا دروازہ کھولا اور میرے چینی ساتھی اس مہاجر کو لے کر اندر داخل ہو گئے۔ میں نے باہر آ کر وہیں مکان سے ذرا پرے ایک کھلی جگہ پر کھڑی کی اور مکان کے اندر چلا گیا پہلے کمرے کو چھوڑ کر ہم پچھلے کمرے میں چلے گئے۔ میرے ساتھیوں نے اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی۔ مہاجر خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا میں نے اپنا پستل اور ہتھکڑی نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ میرے کہنے پر چینی ساتھیوں نے اسے فرس پر اکڑوں بٹھایا، میں نے اسے مزید خوفزدہ کرنے کیلئے پستل کے چیمبر سے گولی باہر نکالی پھر میگزین علیحدہ کی۔ اس کے سر کا نشانہ لیا۔ پھر پستل کی نال پر سائیلنسر لگایا میگزین میں گولی ڈال کر پستل میں فٹ کی۔ میں یہ سب کچھ اسے خوفزدہ کرنے کیلئے کر رہا تھا۔ میں نے پستل دوبارہ میز پر رکھا۔ چینی ساتھیوں نے میرے اشارے پر اسے کھڑا کر دیا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ لگی تھی۔ چینی دوستوں نے اشارے سے مجھے دکھایا۔ خوف کے مارے اس کی یہ حالت تھی کہ اس نے فرس بھی گندا کر دیا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب اس سے سب کچھ اگلا لیا جاتا۔ چینی دوستوں نے اسے دونوں طرف سے پکڑا، ہوا تھا ایک نے میرے اشارے پر اس کے سر کے بال کھینچ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا اور میں نے اوپر تلے آٹھ دس زوردار تھپڑا سے رسید کئے۔ اسے گرنے سے چینی دوستوں نے روک رکھا تھا۔ منہ پر ٹیپ لگی ہونے کے باعث وہ نہ تو بول سکتا اور نہ ہی شور مچا سکتا تھا۔ صرف غوغوں کی آواز اس کے منہ سے نکل رہی تھی۔ میں نے پستل اٹھا کر اس کی طرف کرتے ہوئے کہا "خاموش ہو جاؤ ورنہ گولی تمہارے سینے کے آر پار کر دوں گا" وہ یکدم خاموش ہو گیا۔ "مجھے سب معلوم ہو چکا ہے کہ تم کس لئے میری نگرانی کر رہے ہو۔ جن لوگوں نے تمہیں اس کام پر مامور کیا ہے ان میں میرا ایک آدمی بھی شامل ہے۔ مجھے ان سے تمہارے رابطے کی مفصل رپورٹ مل چکی ہے۔ میں تمہیں کبھی کا اور پھر بھیج چکا ہوتا اور آج بھی اسی ارادے سے تمہیں اٹھا کر یہاں لایا ہے۔ میں تمہیں صرف ایک موقع دیتا ہوں کہ سب کچھ اپنی زبان سے بتا دو۔ اگر تمہارے بیان اور مجھے ملی ہوئی رپورٹ میں ذرا سا بھی فرق ہو تو تمہاری لاش ان کھائیوں میں پھینک دی جائے گی جہاں جنگلی جانور تمہاری ہڈیاں تک چبا جائیں گے۔ اپنا سر ہلا کر مجھے ہاں اور نہ میں جواب دو کہ تمہیں میری بات منظور ہے یا نہیں" میں نے محض ہوا میں تیر چلاتے ہوئے اس سے یہ بات کہی تھی۔ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے کہا کہ اسی طرح سر ہلا کر میرے سوالوں کا جواب دو۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے منہ سے ٹیپ ہٹانے سے پہلے ان بنیادی باتوں کا ہاں اور نہ میں جواب لے لوں جن سے وہ بعد میں مکر نہ سکے۔ "بھارتی سفارت کاروں نے تمہیں میری نگرانی کرنے کا کہا ہے" اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ تم ہر روز ان سے رابطہ کرتے اور رپورٹ دیتے ہو" اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا "تم سے انہوں نے تحریر بھی لکھوائی ہے اور تمہاری آواز بھی ریکارڈ کی ہے" اس نے ایک بار ہاں میں اور ایک بار نہ میں جواب دیا "تمہیں اس کا معاوضہ بھی مل رہا ہے" اس کا جواب ہاں میں تھا۔ مجھے بنیادی باتوں کا جواب مل چکا تھا اور انہی جوابوں کی روشنی میں مجھے اس سے تفصیلات حاصل کرنا تھیں۔ اس کی حالت اتنی ناگفتہ ہو چکی تھی کہ اسے ہوش میں رکھنے اور سوالوں کا جواب دینے کیلئے میں دوسرے کمرے سے اس کیلئے پانی لے کر آیا اور اسے کہا کہ منہ سے ٹیپ اترنے کے بعد بالکل مدہم آواز میں میرے سوالوں کا جواب دے۔ اگر اس نے چیختے چلانے یا بھاگنے کی کوشش کی تو میں بے دریغ اسے گولی مار دوں گا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کے باعث وہ بھاگ تو نہیں سکتا تھا لیکن شور مچا کر ہمسایوں کو متوجہ کر سکتا تھا اس لئے پیش بندی کے طور پر میں نے اسے وارننگ دی تھی۔

چینی دوستوں نے اسے پھر اکڑوں بٹھا دیا۔ میں نے اس کے منہ سے ٹیپ اتاری، پانی پلایا اور کہا کہ شروع سے ہر بات سچ سچ تفصیلاً بتائے۔ جو کچھ اس نے بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ جب وہ بھارتی سفارت خانے چار ہزار روپے واپس کرنے گیا تو سیکنڈ ملٹری انٹاشی میجر باسو (Basu) نے اس سے کہا کہ وہ یہ روپے خود رکھ لے اس کے علاوہ اسے مزید دو ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا اور کہا کہ وہ صرف اتنا کرے کہ مجھ سے قریب ہو کر میری نقل و حرکت کی مفصل رپورٹ ہر روز انہیں دیا کرے۔ اس روز سفارت خانے سے واپسی پر ہی جب میں نے اس کی جیب سے چار ہزار روپے برآمد کر لئے اور اسے طمانچے مارے تو اسی روز اس نے پھر بھارتی سفارت خانے جا کر سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اب اسے نئی ہدایات ملیں کہ میرے پاؤں پر کر خوشامد اور چالپوسی سے مجھ سے معافی مانگے اور مجھ سے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرے اور ساتھ ہی میری نقل و حرکت کی نگرانی کرے۔ معافی تو اسے مل گئی لیکن میرے قریب ہونے کی اس کی ہر کوشش رائیگاں گئی۔ اس نے جب یہ صورت میجر باسو کو بتائی تو اسے اگلے روز آنے کا کہا گیا۔ اگلے روز اسے پانچ ہزار روپے دیئے گئے اور اس سے یہ تحریر لکھوائی گئی کہ اسے مجھ سے جان کا خطرہ ہے کیونکہ میں نے کھنڈو میں بہت سے آدمیوں کو ہلاک کیا ہے۔ جن میں سے دو کی میرے ہاتھوں ہلاکت کا وہ چشم دید گواہ ہے۔ اس نے اتفاقاً دونوں کو قتل کرتے وقت مجھے دیکھا تھا ایک دن غلطی سے میں نے ان دونوں کی ہلاکت کے بارے میں اسے بتا دیا۔ آصف چونکہ قتل کرتے وقت کوئی ثبوت پیچھے نہیں چھوڑتا اس لئے اسی دن سے وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے اور مجھے ہلاک کرنا چاہتا ہے آصف مہاجر نہیں بلکہ پاکستانی انٹیلی جنس کا آدمی ہے اور تین چینی جاسوس ان وارداتوں میں اس کے ساتھ شامل ہیں پاکستانی سفارت خانہ بھی اس کی پشت پناہی کرتا ہے۔ خوف کے مارے میں نے بھارتی سفارت خانے سے مدد مانگی ہے اور یہ تحریر اس لئے دے رہا ہوں کہ اگر مجھے ہلاک کیا گیا یا کوئی گزند پہنچا تو اس کا کلی طور پر ذمہ دار آصف ہوگا۔

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میری نگرانی کی ہر روز کی رپورٹ لکھ کر وہ اپنی بیوی کو دے دیتا ہے جسے اس کی بیوی اگلے روز ایک سبزی فروش کو دے دیتی ہے جو دراصل بھارتی ایجنٹ ہے اور گھوم پھر کر سودا بیچتا ہے۔ اپنے قیام کے سو فیصد درست ہونے اور اس مہاجر سے اتنی جلد سچ اگلاوانے پر میں بڑا خوش تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اسے معاف کر دوں گا لیکن پہلے اسے یہ سب باتیں مہاجر نمائندوں کے سامنے دہرائی اور تحریر کرنی ہوں گی۔ اس نے خوشی سے حامی بھری۔ میں نے چینی دوستوں سے کہا کہ اس کے ہاتھ کھول دیں ہاتھ کھلے تو کھڑے ہوتے وقت اس کے منہ سے بے اختیار ہائے رام نکلا۔ گاڑی کے فرس پر ڈالتے وقت شاید اس کے گھٹنے پر چوٹ آگئی تھی جس میں درد کے باعث اس سے وہی غلطی ہوئی جو مجھ سے دہلی سے آگرہ جاتے ہوئے ریل کے انجن سے نکلنے والے کوئلے کے دھویں کے باعث چھینکنے پر بے ساختہ الحمد للہ کہنے سے ہوئی تھی۔ ہائے رام کی غلطی کو "مہاجر" اور میں نے بیک وقت محسوس کیا۔ وہ میرے پستول کی طرف جھپٹا جو میز پر پڑا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پستول تک پہنچے میں نے اس کی کینٹی پر زوردار مکہ مارا۔ وہ تیور کر نیچے گرا اور میری دو تین ٹھوکروں سے بے ہوش ہو گیا۔ چینی دوست حیران تھے کہ بیک ایسی کیا بات ہوگئی جو میں نے پہلے اس کے ہاتھ کھلوائے اور پھر اسے مار کر بے ہوش کر دیا۔ میں نے مزید تسلی کیلئے اس کا زیریں لباس اترا یا وہ مسلمان نہیں تھا۔ میرا گزشتہ رات کا مفروضہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔ واقعات اتنی تیزی سے پیش آرہے تھے کہ میں ان کی جزئیات پر توجہ نہ دے سکا۔ منہ ٹیپ سے بند ہونے کی وجہ سے وہ میرے ہر سوال کا جواب سر ہلا کر دے رہا تھا۔

غازی

اس کا دماغ اتنا تیز تھا کہ میرے سوالات کے گرد اس نے فوری طور پر ایک کہانی بنالی۔ جو میرے مفروضے کے عین مطابق تھی۔ اپنی ”کامیابی“ کی خوشی میں اس کی کہانی کے اس حصے کو بھی میں بغیر چبائے نگل گیا تھا۔ جس میں اس نے میرے ہاتھوں دو ہلاکتوں کا خود کو چشم دید گواہ بتایا تھا۔ اس کے بقول یہ تحریر بھارتی سفارت کاروں نے لکھوائی تھی لیکن اب جبکہ اس کی اصلیت معلوم ہوگئی تو یہ ساری داستان بھی اس کی ذہنی اختراع ہی بنتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ بھارتی سفارت خانہ کسی اصل مہاجر کو میرے مفروضے کے مطابق استعمال کر رہا ہو۔ جس کا علم اس نعلی مہاجر کو بھی ہو اور اپنی جان بچانے اور میرا اعتماد حاصل کرنے کیلئے اس نے اس کردار کا سہارا لیا ہو، میرے چاروں طرف سازشوں کا جال بنا جا رہا تھا۔ ہندوؤں کی مکارانہ چالوں کا مقابلہ میں چالوں سے نہیں کر سکتا تھا۔ کھٹمنڈو میں بھارتی حکومت نے مہاجروں کے روپ میں اپنے ایجنٹ بھیجے، مہاجروں کی برین واشنگ کرنے اور انہیں پاکستان دشمنی پر آمادہ کرنے میں اپنا پورا زور صرف کر دیا تھا۔ ایسا ناموقع نہیں پھر کبھی نہیں ملنا تھا اور اس موقع کا وہ پوری طرح فائدہ اٹھا رہے تھے۔ کھٹمنڈو میں میری آمد سے تین برس پہلے ہی سے مہاجر آنے شروع ہو گئے تھے۔ بھارت نے اس دوران اپنی جاسوسی کی جڑیں اس قدر پھیلا رکھی تھیں جنہیں جاسوسی کے مروجہ اصولوں سے اکھاڑنا میرے اکیلے کے بس میں نہ تھا۔ ادھر پاکستانی سفارت خانے نے ایسی چپ ساڈھی ہوئی تھی جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ ان کی مجبوری کی بھی ایک وجہ تھی جو کافی بعد میں مجھے اپنے ملٹری اٹاشی سے معلوم ہوئی۔ بے انتہا سیاسی دباؤ کے باعث نیپال گورنمنٹ پاکستانی مہاجروں کو پناہ دینے پر رضامند ہوئی تھی۔ ادھر بھارت ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر نیپال کی درآمدات کو معطل کرنے کی دھمکیاں دیتا تھا۔ پاکستانی سفارت خانہ اس لئے دم سادھے بھارت کی ساری کارروائیاں خاموشی سے دیکھے جا رہا تھا کہ کہیں کسی چھوٹی سی بات کو جواز بنا کر بھارت نیپال پر اس قدر دباؤ نہ بڑھا دے کہ نیپال گورنمنٹ کو مجبوراً پاکستانی مہاجروں کی آمد کو روکنا پڑے۔ ملٹری اٹاشی کے مطابق سفارت خانہ اگر ایک طرف میری کارروائیوں سے خوش تھا تو دوسری طرف خوفزدہ بھی تھا کہ کہیں ان کی وجہ سے مہاجروں کی آمد کا سلسلہ نہ رک جائے (اندرونی طور پر اس لئے کہ ان کی ”آمدنی“ کا سلسلہ رک جائے گا) میرے پاس بھارتی سازشوں کا ایک ہی جواب تھا کہ جو بھی جاسوس اور خدائے نظر آئے اسے ختم کرتا جاؤں۔ یہ صرف میرا ذاتی فیصلہ نہیں تھا بلکہ میرے محکمے کی رضامندی بھی اس میں شامل تھی۔ اسی لئے مجھے واپس نہیں بلایا جاتا تھا اور میری مدد کیلئے تین چینی دوستوں کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔

اس بھارتی جاسوس کو میرے چینی دوستوں نے زہریلی سوئی کے ذریعے وہیں پر انجام تک پہنچایا سوئی فائر کرنے کا عملی مظاہرہ بھی میں نے دیکھا۔ اب لاش کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ درپیش تھا بھارتی نمایاں سفارت کاروں کے نام مجھے معلوم تھے۔ بھارتی سیکنڈ ملٹری اٹاشی میجر باسو مسلمانوں سے اپنے تعصب اور پاکستان دشمنی میں سب سے آگے تھا۔ اس بھارتی ایجنٹ نے بھی اسی کا نام لیا تھا میں نے کمروں میں تلاش کر کے ایک سفید کاغذ لیا اور خط بگاڑ کر بڑے Capital حروف میں Gift For Major Basu (میجر باسو کیلئے تحفہ) لکھ کر لاش کے ساتھ نتھی کر دیا۔ وین لے کر میں دروازے کے سامنے آ گیا۔ چینی ساتھی لاش کو اٹھا کر دونوں طرف سے سہارا دے کر اس طرح باہر لائے جیسے کسی لڑکھڑاتے شرابی کو تھاما ہو۔ پچھلی سیٹ پر لاش کو بٹھا کر دونوں جانب وہ بیٹھ گئے۔ میں نے مکان کو لاک کیا اور پاکستانی میسجی کے پاس گاڑی کھڑی کر کے چابی ٹرانسمیٹر آپریٹر کو واپس کی۔

(جاری ہے)

غازی

لاش دن کوٹھکانے نہیں لگائی جاسکتی تھی اور میرا جو پروگرام تھا اس کیلئے بھی رات کے اندھیرے کی ضرورت تھی۔ ہم سارا دن شہر کی بیرونی سڑکوں پر وین کبھی دوڑاتے اور کبھی ریست کرتے رہے۔ دوپہر کا کھانا بھی اسی وجہ سے گل ہوا۔ بسکٹ کے تین پیکٹ ہم نے شہر کے نواحی علاقے کی ایک دکان سے خریدے اور بھوک مٹائی۔ جب رات خاصی گہری ہوگئی تو میں وین بھارتی سفارت خانے کے عقب میں لے گیا جہاں سفارت خانے کی حدود کے اندر افسران کے فلیٹ تھے اور آمدورفت کیلئے ایک گیٹ تھا۔ تھی تو یہ خطرناک اور جنونی بات لیکن میں نے چل سوچل کے مطابق اب کھلے طور پر میدان میں آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سڑک پر آنے جانے والوں سے ہوشیار اور نظر بچا کر میرے ساتھیوں نے لاش کو وین سے اتارا اور بند گیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے کی پوزیشن میں رکھ کر آگے۔ وین پر چکر لگا کر ہم مخالف سمت سے انا پورنا ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ریسپشن سے معلوم ہوا کہ بعد دوپہر بہت سے مہاجر مجھے ملنے آئے تھے اور شام گئے تک انتظار کے بعد واپس چلے گئے۔ مریم نے بھی کئی بار فون کیا تھا چینی دوستوں کیلئے کمرہ تو میں نے بہت پہلے سے لیا ہوا تھا میں نے انہیں وہیں رکنے کیلئے کہا لیکن وہ واپس جانا چاہتے تھے بھوک اور تھکن سے میرا برا حال ہو رہا تھا کمرے میں جا کر میں نے مریم کو فون کیا اور کہا کہ اگر آج کی روادار سنی ہے تو کھانا لے کر تیار ہو جاؤ چینی دوست تمہیں لے کر ہوٹل آجائیں گے اور واپسی پر میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔ آدھ گھنٹے میں ہی مریم آگئی اس دوران میں گرم پانی سے نہا کرتا زہ دم ہو چکا تھا کھانا کھاتے ہوئے میں نے مریم کو صبح سے اب تک کے تمام واقعات سنا دیئے۔ اس کا رد عمل اس کے جذبات کے مطابق تھا۔ کہنے لگی مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہارا یہ زندگی اور موت کا کھیل شاید کبھی ختم نہ ہو اور میں نے پرسکون مستقبل کے جو خواب دیکھے ہیں وہ شاید کبھی بھی پورے نہ ہوں۔ میں نے مریم کو دل لاسہ دیا اور کہا کہ یہ کھیل میں خوشی سے نہیں کھیل رہا کسی کی ہلاکت پر مجھے کبھی خوشی نہیں ہوتی۔ ایک انسان کو مارنا ایک دنیا کو ختم کرنا ہے۔ مجھے اس پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ بہر حال میں پوری کوشش کروں گا کہ جہنم کی وادی سے ہم جلد از جلد نکل جائیں۔ مریم کو واپس چھوڑ کر جب میں ہوٹل آیا تو نیند میری آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کھٹمنڈو میں تو ہر روز نئی مصیبتوں میں گھرتا جا رہا ہوں اور ان کا خاتمہ دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ کھٹمنڈو میں مجھے جو مشن سونپا گیا تھا اس میں مجھے صرف Planted مہاجروں کے متعلق معلومات پاکستان بھیجنی تھیں یا اگر کسی بھارتی جاسوس کا پتہ چل جاتا تو اپنے سفارت خانے اور محکمے کو اس کی اطلاع دینی تھی لیکن میں غیر دانستہ طور پر ان فرائض کی انجام دہی میں اس قدر Involve ہو گیا کہ چاروں طرف سے دشمن میری زندگی کے درپہ آزار ہو چکے تھے اور حالت یہاں تک بگڑ چکی تھی کہ ایک طرف تو پاک بھارت دشمنی کو دوستی میں بدلا جا رہا تھا اور ہمارا برسر اقتدار طبقہ بھارت سے محبت کی پیٹنگیں بڑھا رہا تھا اور میں یہاں بھارت دشمنی اور اپنی جان بچانے کیلئے قتل پر قتل کئے جا رہا تھا۔ اپنے وطن کی محبت اور سالمیت کے تحفظ کیلئے دنیا بھر میں لاکھوں لوگوں نے خوشی خوشی اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے ہیں اور ان کے ملک اور قوم نے انہیں بے حد سراہا ہے لیکن پاکستان میں صورت حال مختلف تھی۔ سقوط ڈھاکہ کے فوری بعد اندرا گاندھی نے اپنی تقریر میں دو قومی نظریے کو خلیج بنگال میں ڈبو دینے اور ہزار سالہ بدلہ لینے کا نعرہ یہ ذکر کیا تھا اور پاکستان میں بھارت سے ہزار سال تک لڑنے اور شکست کا بدلہ لینے کی قسمیں کھانے والے اقتدار کے نشے میں ڈوب کر اپنی کرسی کی سلامتی کیلئے بھارت سے دوستی کر رہے تھے۔ یہ دوستی مسلسل بڑھتی گئی اور آج نوبت یہاں آن پہنچی ہے کہ خانہ جنگی اور اندرونی بغاوت کو فرو کرنے والوں کو مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ان کے جذبہ حب الوطنی پر ندامت کا اظہار کیا جا رہا ہے اور ہزاروں لاکھوں بے گناہ پاکستانیوں کے قاتلوں کی قبروں اور یادگاروں پر پھول چڑھائے جا رہے ہیں۔ یاد رکھئے کہ جس قوم نے بھی وطن کی خاطر جان دینے والوں کی قربانیوں کو فراموش کر کے دشمن اور خدایان وطن کو سراہا وہ قوم ذلت کی گہرائیوں میں ایسی گری کہ پھر کبھی بھی سر نہ اٹھ سکی۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے اور اس سے مفر نہیں۔ 71ء میں سیاست دانوں کی ریشہ دونوں کے باعث پاکستان کی شکست کو افواج پاکستان کے سرمنڈھا جا رہا تھا۔ افواج پاکستان کی مسلسل تذلیل کر کے اس کے جذبہ حب الوطنی اور Moral کو تباہ کرنے کی بھرپور کوششیں کی جا رہی تھیں تا کہ بھارت سے بدلہ لینے کا وہ کبھی سوچ بھی نہ سکیں اور حکمران چین کی ہنسی بجاتے ہوئے آرام سے حکومت کے مزے لوٹیں۔ پاکستان سے جو اخبار سفارت خانے میں آتے تھے وہ سب حکمرانوں کے ہاتھوں بکے ہوئے ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے تھے۔ صحیح حالات کا علم مجھے برطانوی اخباروں سے ہوتا تھا جنہیں میرے ہوٹل کی انتظامیہ بڑے اہتمام سے بہنئی سے منگواتی تھی۔ بعد میں میری کوششوں سے مجھے برطانوی اور امریکی سفارت خانوں سے بھی پرانے اخبار ملنے لگ گئے جنہیں ان سفارت خانوں کے نیپالی ملازم معقول معاوضے کے عوض مجھے پہنچا دیتے۔ اپنے ملکی حالات کی بہتری کا پڑھ میں اتنا دل گرفتہ ہو چکا تھا کہ میرے پاس اگر پاسپورٹ ہوتا تو میں مریم کو اپنی زوجیت میں لے کر کسی تیسرے ملک میں جا کر Settle ہو جاتا۔ لیکن سفارت خانہ یک طرفہ اور صرف پاکستان جانے کا اجازت نامہ جاری کرتا تھا۔ اگر میں اس اجازت نامے پر پاکستان چلا آتا تو میرا محکمہ مجھ سے بغیر اجازت واپس آنے پر سختی سے باز پرس کرتا۔ ایسے حالات میں مریم کی دیکھ بھال کون کرتا جس کا پاکستان میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ کھٹمنڈو میں میری حالت ایک قیدی سے بھی بدتر تھی۔

غازی

قیدی کو جیل کی سلاخوں کے اندر زندگی کا تحفظ مل جاتا ہے لیکن میرے لئے نیپال ایک ایسی جیل تھی جس میں اپنی جان بچانے کیلئے مجھے خون پر خون کرنے پڑے تھے۔ چاروں طرف سے دشمن مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے آخر کب تک میں ان کا مقابلہ کرتا۔ مجھے اپنا انجام صاف دکھائی دے رہا تھا کہ کسی روز دشمن کی گولیاں میرے سینے میں پیوست ہو جائیں گی اور لاوارثوں کی طرح مجھے کھنڈوں میں دفن کر دیا جائے گا۔ یہاں صرف ایک ہستی ہی میری مونس اور راز دار تھی بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ پوری دنیا میں میری خیر خواہ صرف میری والدہ اور مریم ہی تھیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اللہ پاک کے حضور گڑگڑا کر میری سلامتی کیلئے دعائیں مانگنے والی میری والدہ کی دعاؤں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج میں زندہ سلامت اپنی آپ بیتی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ مریم سے بھی میں اپنی مایوسی چھپاتا تھا وہ بہت حساس تھی اور ایسی باتیں سن کر وہ فوراً آزرہ ہو جاتی۔ وہ پہلے ہی میرے لئے بہت متفکر تھی اور میں اسے دلاسہ دتا رہتا تھا۔ اگر میں ہی اس سے مایوسی کی باتیں شروع کرتا تو وہ حوصلہ بالکل ہی ہار دیتی۔

آئندہ چند روز میں نے بھارتی سفارت خانے کے رد عمل کے انتظار میں گزارے لیکن اس طرف تو یکسر خاموشی چھائی ہوئی تھی میں نے میجر باسو کو تحفہ بھیج کر اسے چیلنج کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے اشتعال دلانے سے بھنا کر وہ کھل کر سامنے آجائے اور اپنا سارا زور مجھے زیر کرنے پر لگا دے۔ اس طرح اس کے گرگے اور ایجنٹ میری نظر میں آجائیں گے جنہیں میں چن چن کر ہلاک کر دوں گا یا ان کے ہاتھوں مارا جاؤں گا۔ کچھ نہ کچھ فیصلہ تو ہو جائے گا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی دوسری صورت بھی نہ تھی۔ میں اس راستے پر اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ واپسی بھی ناممکن تھی۔ انہیں دنوں پاکستانی سفارت خانے نے 23 مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ مجھے بھی دعوتی کارڈ دیا گیا۔ اس تقریب میں نیپالی وزیر خارجہ اور اعلیٰ حکام کے علاوہ اسرائیل کے سوا تمام سفارت کاروں کو مدعو کیا گیا تھا۔ میرے لئے کی سرکاری تقریب میں شریک ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اچکن وغیرہ تو میرے پاس نہیں تھی اسلئے میں نے ایونٹنگ سوٹ پہنا۔ تقریب میں رسمی کلمات کے بعد مدعوئین کو مشروبات پیش کئے گئے۔ سارے مدعوئین اپنے ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ ٹولیوں میں کھڑے تھے۔ نیپالی کمانڈر انچیف اور سفارتی فوجی عہدے دار فوجی ڈنر جنیکٹس میں اپنے کندھوں پر اپنے عہدوں کے تمغے BRASS اور سینوں پر CEREMONIOUS تمغے لگائے اپنی محفلیں جمائے کھڑے تھے۔ میں ایک عراقی سفارت کار سے محو گفتگو تھا کہ کرنل کے اشارے لگے ایک فوجی میرے قریب آیا اور کرنل آئندہ اور بھارتی ملٹری اتاشی کہہ کر اپنا تعارف کروایا۔ جواباً میں نے آصف علی اور ریٹائرمنٹ جی کہا۔ کرنل آئندہ کو میں نے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا لیکن تعارف آج پہلی بار ہوا۔ کرنل آئندہ نشے میں چور تھا MR. ASIF, YOU ARE AN ASSEST OF PAKISTAN (مسٹر آصف تم پاکستان کا سرمایہ ہو) کرنل آئندہ نے یہ کہتے ہوئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں جواباً کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کرنل آئندہ نے مسکراتے ہوئے کہا MAJOR BASU IS REALLY NOT HAPPY WITH YOUR GIFT (میجر باسو تمہارے تحفے سے خوش نہیں ہے) I THINK YOU ARE MISTAKEN. I NEVER SENT ANY GIFT TO BASU (میرے خیال میں تمہیں مغالطہ ہوا ہے۔ میں نے باسو کو کوئی تحفہ نہیں بھیجا) میں نے اس شرابی کرنل سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا NO-NO WE INDIANS ARE NEVER MISTAKEN. IN 67 WE CHOSE TWO PERSONS FROM YOUR COUNTRY. ONE FROM EAST AND ONE FROM WEST WING. WE WORKED ON THEM AND THEY FULFILLED OUR DESIRES MORE THEN OUR EXPECTATION. WE ARE NEVER MISTAKEN. (نہیں نہیں، ہم بھارتی کبھی دھوکہ نہیں کھاتے۔ 67ء میں ہم نے تمہارے ملک کے مشرقی اور مغربی بازوؤں سے ایک ایک آدمی چنا، ان پر محنت کی اور انہوں نے ہماری امیدوں سے بڑھ کر ہماری خواہشات کی تکمیل کی۔ ہم کبھی مغالطے کا شکار نہیں ہوئے) کرنل آئندہ کو میں ایسا جواب دے سکتا تھا کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا لیکن یہ پاکستان کی تقریب تھی اور میں کوئی بد مزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل آئندہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: WELL IF YOU INSIST, I AGREE THAT I SENT THE GIFT TO MAJOR BASU. I THINK HE IS NOT ARTISTIC MINDED. AS A TOKEN OF GESTURE NET TIME I WILL SEND A GIFT TO YOU AND I AM SURE THAT YOU WOULD DEFINITELY LIKE IT. (اگر تم اصرار کرتے ہو تو میں مان لیتا ہوں کہ باسو کو تحفہ میں نے بھیجا تھا۔ میرے خیال میں وہ فنکارانہ ذہن نہیں رکھتا۔ اگلی بار ایک تحفہ میں تمہیں بھیجوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں وہ ضرور پسند آئے گا مد ہوش کرنل آئندہ بھٹی ہوئی آنکھوں سے میری بات سن رہا تھا۔ ازلی بزدل ہندوؤں نے چالاکی سے ہمارا ملک دو لخت تو کر دیا تھا لیکن ایک پاکستانی مسلمان کی کھری باتیں سن کر یہ CELEBRATED کرنل اتنا خوفزدہ ہو گیا تھا کہ اس کے تمغے کا پٹنے لگے۔ یہ کہہ کر میں تقریب سے چلا آیا۔ قارئین ہماری ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی اور دوسرے تمام واقعات کی طرح یہ بھی مجھے حرف بحرف یاد ہے۔ جس طرح بھارت میں DMI والوں کے دیئے ہوئے زخموں کے نشان آج بھی میرے جسم پر واضح طور پر موجود ہیں۔ اسی طرح تمام واقعات اور ان کی تفصیل بھی میرے ذہن پر نقش ہے۔

یوم پاکستان کی تقریب میں کرنل آئندہ سے ملاقات ہوئے پانچواں دن تھا۔ میں سہ پہر کو کافی شاپ میں اکیلا بیٹھا تھا مجھ سے تین چار ٹیبل پرے میرے چینی دوست بیٹھے تھے۔ اچانک کسی نے مجھے میرے اصلی نام سے پکارا اپنا نام سن کر میں چونک تو اٹھا لیکن کوئی رد عمل ظاہر کئے بغیر کافی پینے میں مشغول رہا۔ دوبارہ نام پکارے جانے پر بھی میں نے کوئی دھیان نہ دیا۔ چند لمحوں بعد مجھے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ کرنل آئندہ تھا۔ میں اخلاقاؤں سے اٹھ کر ملا۔ چند رسمی کلمات کے بعد میں نے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ میں اس کے ٹیبل پر آ جاؤں کیونکہ وہاں اس کے دوست بھی بیٹھے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اس کے ساتھیوں کے لئے میرے ٹیبل کی باقی کرسیاں حاضر ہیں۔ آئندہ نے یہ کہتے ہوئے کہ تم بہت ضدی ہو، اپنے دونوں ساتھیوں کو جو ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے اشارے سے بلایا۔ وہ دونوں میری ٹیبل پر آئے تو میں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ کرنل آئندہ نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ میجر باسو ہیں سیکنڈ ملٹری اتاشی اور یہ کیپٹن مان ہیں تھرڈ ملٹری اتاشی اور یہ ہیں مسٹر (میرا اصلی نام) اوہ! مجھے فسوس ہے (OH-I AM SORRY) مسٹر آصف علی میں نے انہیں بیٹھنے کی دعوت دی اور ان کے لئے کافی منگوائی۔ میجر باسو بنگالی اور شکل سے ہی متعصب لگتا تھا۔ کیپٹن مان نوجوان اور موٹا سکھ تھا۔ ہم خاموشی سے کافی پینے لگے۔ بڑا عجیب منظر تھا ایک دوسرے کے جانی دشمن ایک دوسرے کے خطرناک ارادوں کو جانتے ہوئے بھی ایک ہی ٹیبل پر اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ گفتگو کا آغاز دوسرا کرے۔ اس خاموشی کو آخر کار میجر باسو نے توڑا۔ میرا اصلی نام لیتے ہوئے وہ بولا کیا تم سمجھتے ہو کہ اس قسم کی حرکتوں سے جیسے تم نے چند روز پہلے لاش کے ساتھ چٹ لگا کر کی، ہمیں خوف زدہ کر دو گے؟

(جاری ہے)

غازی

میں نے جواب دیا میجر باسو سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا نام آصف علی اور میں غلط نام سے پکارے جانے کو پسند نہیں کرتا۔ دوسری بات کہ لاش کے ساتھ تمہارے نام کی چٹ لگی تھی تو اس بارے میں تم کو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرا اصول ہے کہ میں مخالف قبول نہیں کرتا اور انہیں بھیجنے والوں کو واپس کرتا ہوں۔ تم نے ایک تحفہ میری نگرانی کے لئے بھیجا تھا۔ اپنے اصول کے مطابق میں نے تمہارا تحفہ تمہیں لوٹا دیا۔ لوٹانے کے عمل میں صرف یہی فرق پڑا کہ اس کی سانس بند ہوگئی۔ ”تم نے ہمیں بہت UNDER ESTIMATE کیا ہے ہم جب چاہیں تمہیں ختم کر سکتے ہیں“۔ میجر باسو نے جھلاتے ہوئے کہا ”تم نے میرے منہ کی بات چھین لی“۔ میں نے کہا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ تم نے مجھے بھی بہت UNDER ESTIMATE کیا ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں ابھی بیٹھے ہوئے ختم کر سکتا ہوں“۔ میجر باسو بے یقینی کی کیفیت سے دوچار میرے چینی ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ان دو تین چینی لوگوں کے ساتھ تم ہمارا مقابلہ کرو گے؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ ”میجر باسو، میں نے تو سمجھا تھا کہ بنگالی دماغ کے تیز اور بڑے ہوشیار ہوتے ہیں لیکن اب مجھے اپنے اس خیال پر نظر ثانی کرنی پڑے گی میں اور یہ چینی تو محض نمائشی طور پر تمہارے سامنے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بھارت میں میرے قیام DMI کے ہاتھوں گرفتاری فرار اور بھئی میں میری کارروائیوں کے متعلق تم جانتے ہو گے۔ کٹھمنڈو میں تو سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ گورکھ پور کا ہوائی اڈہ کیا میں اکیلے اڑا سکتا تھا؟ میں تو DMI کے CELL میں تھا۔ پھر بیرونی دیوار کس نے اڑائی تھی۔ وہ دو گارڈز جنہیں ہلاک کر کے میں فرار ہوا تھا کس نے ان کے ہاتھ پکڑے اور منہ بند کئے تھے تا کہ ان کی آواز نہ نکل سکے۔ کن کے ساتھ میرے TIMING SET تھے جن کی گاڑیاں مجھے لینے کے لئے بیرونی دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں، میری تو ٹانگ زخمی تھی کس نے مجھے سہارا دے کر دیوار پر چڑھایا۔ میں فرار کے بعد کہاں روپوش رہا۔ کٹھمنڈو میں وہ کون تھے جنہوں نے ملتی باہنی والوں کو تلاش کیا اور انہیں مرگھٹ پہنچایا۔ میجر باسو تم تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ تمہارے آدمی DMI ہیڈ کوارٹرز اور تمہارے آرمی، نیول اور ایئر فورس ہیڈ کوارٹرز میں بھی ہمارے PAY ROLL (تنخواہ دار) پر ہیں۔ تمہارے سفارت خانے کی کوئی بات ہم سے پوشیدہ نہیں۔ تم چاہو تو میں تمہارے فیملی ممبروں کے نام، عمریں اور تعلیم کے متعلق بھی سب کچھ بتا سکتا ہوں کہ تو تمہارے ڈرائنگ روم کے فرنیچر کی تفصیل میں تمہیں بتا دوں۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارے والدین کا کیا نام ہے۔ تمہارے جس ایجنٹ کو تختے میں، میں نے تمہیں واپس بھیجا ہے۔ اس کے متعلق مجھے کوئی خواب نہیں آیا تھا۔ تمہارے سفارت خانے کے تین آدمی بھی ہمارے PAY ROLL پر ہیں جو ہمیں پل پل کی خبریں دیتے ہیں۔ میں تو ایک معمولی کارکن ہوں اور یہ چینی میرے محافظ ہیں۔ صرف ہم ہی تمہارے سامنے ہیں۔ ہم تو ان ڈمی جہازوں کی طرح ہیں جو فوجی ہوائی اڈوں پر حملہ آوروں کو دھوکہ دینے کے لئے PANS میں رکھے جاتے ہیں یہاں مجھے اور میرے چینی محافظوں کو ہلاک کرنا تمہارے لئے ناممکن ہے۔ اس وقت بھی کم از کم بیس آنکھیں تمہیں دیکھ رہی اور میرے اشارے کی منتظر ہیں۔ بھارت اور کٹھمنڈو میں ہماری جڑیں بہت گہری اور پھیلی ہوئی ہیں۔ 65ء میں ہم تم سے آمنے سامنے مردانہ وار لڑے اور تم نے دیکھ لیا کہ اسلحے کی برتری، پانچ گنا زیادہ نفری اور بغیر اعلان کے رات کے پچھلے پہر اچانک حملہ کرنے کے باوجود تمہاری بہادر افواج سترہ روز میں بارڈر سے صرف 14 میل کا فاصلہ طے کرنے میں ناکام ہو گئیں اور تمہارے کمانڈر انچیف جنرل چوہدری کی لاہور جیم خانہ میں چھوٹا پیگ پینے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ اس جنگ کے دوران تم پاکستان سے اتنے خوف زدہ تھے کہ دہلی سے اپنا دار الخلافہ الہ آباد منتقل کر دیا۔ UNO میں تمہارا نمائندہ بار بار دہائی دیتا رہا کہ ہم ابھی اور اسی وقت جنگ بند کرنے کو تیار ہیں۔ معاہدہ تاشقند کے وقت ہمارے صدر ایوب خان سے ہاتھ ملاتے وقت تمہارے وزیراعظم لال بہادر شاستری کو خوف سے دل کا جان لیوا دورہ پڑا۔

65ء کی جنگ کے بعد تمہاری وزیراعظم اندرا گاندھی نے تمہاری وزارت خارجہ کے سیکریٹری ڈی پی دھر کو خصوصی طور پر اسپین بھیجا کہ وہ لائبریریوں میں پرانی کتابیں کھنگالے اور ان مسلمانوں کے زوال کے اسباب معلوم کرے جنہوں نے اسپین پر آٹھ سو سال دھڑلے سے حکومت کی۔ ڈی پی دھر کی رپورٹ کی روشنی میں تم نے اپنی حکمت عملی بدلی اور پاکستان کے دونوں بازوؤں میں ایسے خدائے ڈھونڈے جو فوری مالی لالچ اور اقتدار کے وعدے پر تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے 71ء میں جب ہم خانہ جنگی کو ختم کرنے میں مصروف تھے تو تمہاری حکومت نے موقع غنیمت جانا اور مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے پاکستان کو دو لخت کر دیا۔ یہ ہماری فوجی نہیں بلکہ سیاسی شکست تھی جس میں خدایان وطن نے بھرپور حصہ لیا۔ ہماری صفوں میں میر صادق اور میر جعفر جیسے خدائے ہمیشہ شامل رہے ہیں جن کی وجہ سے ہی ہمیں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ ہم تو میدانوں، پہاڑوں، دریاؤں اور صحراؤں میں لڑنے والے تھے لیکن تمہارے محکمہ جاسوسی نے ہمارے ملک میں نہ صرف خدائوں سے رابطہ کیا بلکہ یونیورسٹیوں میں اساتذہ کے روپ میں اپنے جاسوس بھیجے۔ جنہوں نے طلبہ کے نا پختہ ذہنوں کو برین واش کر کے وطن سے خداری پر آمادہ کیا۔ اب ہم نے بھی تمہارا طریقہ اپنا لیا ہے۔ سارے بھارت میں بکھرے ہوئے ہمارے ہزاروں تربیت یافتہ جاسوس اپنا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں بھارتی مسلمان ذہنی اور دلی طور پر ہمارے ساتھ ہیں (جاری ہے)

غازی

وہ بھارتی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں اور تم نئیوان سب کو جیل میں ڈال سکتے ہو اور نا ہی ختم کر سکتے ہو۔ ہم جو بھی کام کرتے ہیں، دل و جان سے کرتے ہیں۔ میری طرف ہی دیکھو۔ ساڑھے تین سال سے زیادہ وقت میں نے بھارت میں گزارا اور درجنوں مشن کامیابی سے انجام دیئے۔ DMI والے مجھے میرے ایک ہم وطن خدار کی وجہ سے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئے تو ایک لفظ تک نہ اگلا سکے۔ الٹا ان کے دو گارڈز مارے گئے۔ کھٹمنڈو میں تم میری کارکردگی سے واقف ہو۔ بیس سے زیادہ مکتی باہنی والے اور خدار ہم نے ہلاک کئے یہاں تم پر یہ ہماری پہلی ضرب ہے تم اب تک اس کا کیا جواب دے سکے۔ ہماری ٹیم یہاں پر بہت مربوط اور طاقت ور ہے میں نے یہ سب باتیں تمہیں صرف اس لئے بتائی ہیں کہ تم کسی مغالطے کا شکار نہ رہو اور بھول میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ جس کا خمیازہ تمہیں بہت بڑی قیمت دے کر اٹھانا پڑے۔ ہندو یا مسلمان چاہے کوئی بھی ہو۔ اسے ہلاک کرتے وقت ہمیں دکھ ہوتا ہے لیکن تم نے ان ہلاکتوں کو ہماری مجبوری بنا دیا ہے۔ تم یہاں پر اپنی جاسوسی کی کارروائیوں سے باز آ جاؤ تو ہم بھی تمہیں تھکے بھیجنے بند کر دیں گے۔ اپنے چینی دوستوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا ”ان کے متعلق مجھ سے زیادہ تم جانتے ہو۔ 1962ء کی جھڑپ میں تم ان سے خوف زدہ ہو کر محاذ چھوڑ کر اس طرح بھاگے تھے کہ تری پورہ سے اپنی سرکاری فائلیں اور خزانہ تک نہ اٹھا سکے اور نہ ہی انہیں نذر آتش کر سکے۔ جیسے کہ میں نے پہلے کہا ہے۔ تمہارے سامنے صرف یہ دو ہیں لیکن ان کے درجنوں ہم وطن یہاں پر ہمارے دست و بازو ہیں۔“

قارئین آپ جانتے ہیں کہ ان سفارتی نمائندوں کے سامنے میں نے بہت سی غلط بیانی کی۔ خصوصاً اپنے وطن کے محکمہ جاسوسی اور نیپال اور بھارت میں اس کی بالادستی کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ یہ میری گفتگو سے اس حد تک سراسیمہ ہو جائیں کہ انہیں اپنے چاروں طرف پاکستانی جاسوس ہی نظر آئیں۔ سفارت خانے DMI تینوں افواج کے دفاتر میں بھی انہیں پاکستانی جاسوس دکھائی دیں انہیں میری باتوں کا یقین اس لئے آ گیا ہو گا کیونکہ کھٹمنڈو میں میرے آنے کے بعد بیس سے زیادہ افراد کی پراسرار اموات کا ذمہ دار وہ مجھے سمجھ رہے تھے اور ان میں سے تین جرموں کو چھوڑ کر باقی سارے بھارتی ایجنٹ یا پاکستان کے خدار تھے۔ میری بات ختم ہوئی تو یہ تینوں منہ کھولے اور آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں سے پریشانی اور خوف صاف عیاں تھا اور اس منظر سے میں بڑا لطف اندوز ہو رہا تھا اس وقت مجھے کسی کا یہ مقولہ یاد آ گیا کہ چوہے کو جنرل کی وردی پہنا کر بہادری کے تمغوں سے لادو لیکن وہ کبھی بھی بلی کا سامنا نہیں کرے گا۔

بھارت اور کھٹمنڈو میں میرے قیام کے دوران آج پہلی بار مجھے ایسا موقع ملا تھا کہ ان بھارتی فوجی افسران کے ساتھ جو میری حقیقت سے آگاہ تھے پوری آزادی کے ساتھ گفتگو کروں اور آئینے میں ان کا اصلی چہرہ انہیں دکھا سکوں اس کوشش میں، میں نے اپنا پورا زور بیان صرف کر دیا تھا میری یہ کوشش اس حد تک کامیاب رہی کہ کیپٹن مان نے ایک بار مجھے ٹوکنا چاہا تو میں نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا ”کیپٹن کیا تمہاری اکیڈمی اس حد تک ناقص ہے جہاں تمہیں یہ بھی نہیں سکھایا گیا کہ جب دو سینئر زبات کر رہے ہوں تو جو نیئر ز کو اپنا منہ بند رکھنا چاہئے“ میری بات سن کر کیپٹن مان کو تو ایسی چپ لگی کہ اس SITTING کے دوران وہ ایک لفظ تک نہ بولا صرف رخصت ہوتے وقت گڈبائی کہا۔ میری بات ختم ہونے کے بعد خاصی دیر تک یہ تینوں چپ رہے ان کی حالت صاف بتا رہی تھی کہ میں پوری طرح ان پر غالب آچکا ہوں۔ اس خاموشی کو بالآخر کرنل آئند نے توڑا۔ ”مسٹر آصف ہمیں آج پہلی بار آپ کی زبانی معلوم ہوا کہ گورکھپور کے ہوائی اڈے کی تباہی میں بھی آپ شامل تھے۔ مجھے آپ کا رینک تو معلوم نہیں لیکن میں آپ کی دلیری اور جرات پر آپ کو سیلوٹ کرتا ہوں ITAKE (OFF MY HAT ON YOUR BRAVERY AND COURAGE) غیر ارادی طور پر ہماری آج کی پہلی SITTING میں ہی کشیدگی پیدا ہو گئی جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ رخصت ہونے سے پہلے میں آپ سے اپنی اس دلی خواہش کا اظہار ضرور کروں گا کہ میں آپ سے ایک بار نہیں بلکہ بار بار ملنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ ہماری آئندہ ملاقاتیں دوستانہ ماحول میں ہوں گی۔ میجر باسوا بھی تک ہم پنجابیوں کی یگانگت اور وسعت قلب کو نہیں سمجھ سکا۔ جس طرح بارڈرز کی لائن ہو اور بادلوں کو آنے جانے سے نہیں روک سکتی، اسی طرح ہم پنجابیوں کی آپس میں محبت کے جذبے کو بھی تقسیم نہیں کر سکتی۔“ یہ کہہ کر کرنل آئند اٹھ کھڑا ہوا۔

(جاری ہے)

غازی

اس کے ساتھ ہی میجر باسو اور کیپٹن مان بھی کھڑے ہو گئے سب نے مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں محبت کی گرمی نہیں بلکہ غصے اور بدلے کی آگ کی تپش تھی۔ واپس جاتے ہوئے وہ کافی شاپ اور لابی میں چاروں جانب اور اوپر کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے اچانک کہیں سے گولیاں چلیں گی اور انہیں چھلنی کر دیں گی۔ کرنل آرنڈ فوجی تھا لیکن سفارت خانے کے ماحول نے اسے سیاسی زبان سکھا دی تھی جس میں جھوٹ اور تصنع کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اگلے روز ہی میں نے اس ملاقات کے بارے میں مفصل رپورٹ لکھ کر اور اس کی تین کاپیاں بنا کر ایک اپنے سفیر کو دی اور دوسری پر اس سے وصولی کے دستخط کروائے۔ اصل رپورٹ میں نے اپنے محکمے کو بھیجنے کیلئے اور تیسری کاپی اپنی فائل کے لئے رکھی۔ مجھے اپنے سفیر پر کبھی بھی اعتماد نہیں ہوا کیونکہ اس کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سفارتی اور سیاسی مبہم زبان میں ہوتا جس سے میں بے حد لر جک تھا۔

کھٹمنڈو کا موسم تیزی سے بدل رہا تھا۔ تکلیف دہ سردی اب خوش گوار خشکی میں بدل چکی تھی۔ میں نے ہوٹل انتظامیہ کے ذریعے اپنے کمرے کے دونوں کھڑکیوں پر مضبوط گرل اور جالی لگوائی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ میں اپنے کمرے کو دستی بم کے حملے سے محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ میرے فلور پر باہر سے پٹیل یا رائفل سے حملہ کرنا تو ناممکن تھا لیکن دستی بم کا گرہا ہو سکتا تھا یہ احتیاطی تدبیر بھی میں نے مریم کی ضد سے مجبور ہو کر کی تھی مہاجروں کیلئے افغان ایئر کے جہازوں کا حتمی شیڈول بھی آگیا تھا۔ پہلا جہاز 10 اپریل کو آنا تھا اور پھر باقاعدگی سے ہفتے میں دو پروازیں آنی تھیں۔ پہلی پرواز پر جانے والے مہاجر خوشی سے پھولے نہ سمارہے تھے۔ پاکستانی سفارت خانے میں گہما گہمی بہت بڑھ گئی تھی مہاجروں نے میرے پاس بھی ٹولیوں کی شکل میں آنا شروع کر دیا۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ میں اپنے اثر و رسوخ سے سفارت خانے کی جاری کردہ لسٹ میں ان کے نام لکھوا سکتا ہوں۔ میں نے انہیں صاف بتایا دیا کہ سفارت خانے میں میرے اثر و رسوخ کا یہ عالم ہے کہ میرے سفارتی مہاجروں کو تو شاید آخری فلائٹ پر بھی جگہ نہ دی جائے۔ ان مہاجروں میں بہت سے ایسے بھی تھے جو مہینوں نہیں بلکہ برسوں سے یہاں مقیم تھے۔ جب وہ آئے تھے تو رجسٹریشن کے وقت اگر ان کے افراد خانہ کی تعداد 4 تھی تو اب وہ پانچ یا چھ ہو چکے تھے اپنی غفلت یا سفارت خانے کی سرد مہری کے باعث وہ نومو لوڈ کی رجسٹریشن نہ کروا سکے۔ سفارت خانے نے اسی کو بنیاد بنا کر انہیں اب تک کھٹمنڈو میں روک رکھا تھا۔ بعض مہاجروں کو کھٹمنڈو کی پر امن زندگی اتنی پسند آئی کہ انہوں نے وہیں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا اور جتنے عرصے تک نیپال حکومت نے انہیں پاکستان جانے پر مجبور نہ کر دیا وہ کھٹمنڈو میں ہی مقیم رہے۔ میں نے محسن اور بزرگ شاعر سے جواب ماشاء اللہ عیال دار ہو چکے تھے پوچھا کہ اگر وہ چاہیں تو میں شروع کی چند پروازوں میں ان کے جانے کا انتظام کر دوں۔ محسن نے تو صاف انکار کر دیا۔ بزرگ شاعر نے شرماتے ہوئے کہا کہ بیگم امید سے ہیں اس لئے بچے کی پیدائش کے بعد ہی وہ پاکستان جائیں گے ان دونوں کے انکار کی اصل وجہ یہ تھی کہ پاکستان پہنچنے کے بعد انہیں اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا تھا۔ یہاں کھٹمنڈو میں کوئی اور نہ سہی، مجھ پر انہیں یہ یقین تو ضرور تھا کہ میں ان کی دیکھ بھال اور ضروریات کا خیال رکھوں گا۔ میں نے ان دونوں کے پاکستان پہنچنے کے بعد کی فوری ضروریات کے لئے دس دس ہزار روپیہ مریم کے والد کے پاس جمع کروا دیا اور ان دونوں کو بھی بتایا کہ پاکستان روانگی سے پہلے وہ یہ رقم حاصل کر لیں۔ میرا یہ اقدام اس لئے تھا کہ میں خود اپنے متعلق کوئی بات بھی حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا اچانک ہی میری پاکستان واپسی کا حکم بھی آسکتا تھا اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ میں دشمنوں کی اندھی گولیوں کا نشانہ بن جاؤں۔ مریم کو اپنی زوجیت میں لینے میں بھی صرف دوسری بات مانع تھی۔ حاجی مستان اور یوسف پٹیل سے بھی ہر دس چندرہ روز بعد فون پر بات چیت ہوتی تھی۔ میں نے انہیں مریم کے متعلق بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور بالضرور اس مبارک موقع پر کھٹمنڈو آئیں گے۔

(جاری ہے)

غازی

میں اپنے محلے کو بھیجی جانے والی ڈاک میں اپنے گھر والوں کے لئے خط ضرور بھیجتا تھا جن کا جواب بھی اسی ذریعے سے مجھے ملتا تھا جن میں ہمیشہ خطوط کا کچھ حصہ سیاہی سے مٹایا ہوا ہوتا تھا۔ پاکستانی مہاجروں کی دیکھا دیکھی میں نے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک کئی خط ڈائریکٹ اپنے گھر بھیجے تھے۔ جن کا کوئی بھی جواب مجھے موصول نہ ہوا۔ ایک روز خلاف معمول دن کے دس گیارہ بجے محسن میرے ہوٹل آیا۔ اس نے بتایا کہ تمام غیر ملکیوں کے خطوط بڑے ڈاک خانے میں ایک میز پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ جہاں سے سب اپنے اپنے خط چھانٹ کر لے جاتے ہیں رجسٹرڈ خط بھی ڈاک خانے کے ایک کمرک کے پاس ہوتے ہیں جو رجسٹریشن کارڈ یا پاسپورٹ دکھا کر حاصل کئے جاتے ہیں آج جب وہ اپنا رجسٹرڈ خط لینے اس کمرک کے پاس گیا تو اس کے پاس آصف علی کے نام کے چار خط تھے مجھے یہی بتانے کے لئے وہ آیا تھا۔ میں فوراً ہی تیار ہو کر محسن کے ساتھ ڈاک خانے پہنچا اور چاروں بھاری بھارے خط وصول کئے۔ اسی تیزی سے میں اپنے ہوٹل واپس پہنچا۔ پردیس میں کٹھن حالات میں زندگی گزارنے والے کو گھر سے خط ملنے سے جو خوشی اور مسرت ہوتی ہے اس سے قارئین بخوبی واقف ہوں گے۔ میں نے محسن کو رخصت کیا اور اپنے کمرے میں جا کر خط جیب سے نکالے۔ میں اپنی والدہ اور بیوی کی تحریر کو بخوبی پہچانتا تھا۔ دو خط میری والدہ کے اور دو بیوی کے تھے میں نے پہلے والدہ کے خط کھولے۔ دونوں خطوں میں ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ یہ شکوے تھے کہ میں واپس کیوں نہیں آتا۔ میرے لڑکے شجاع کے متعلق لکھا تھا کہ وہ وا کر کے ذریعے بہت جلد بغیر سہارے کے چلنے لگ گیا ہے اور اکثر پوچھتا ہے کہ میرے ابو کہاں ہیں والدہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ کوئی ایسی ہی مجبوری ہوگی جس کے باعث میں اتنے سالوں سے گھر نہیں آیا۔ ان کے اس فقرے سے میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے کہ جلد واپس آنے کی کوشش کرو کہیں تمہیں سینے سے لگانے کی حسرت لئے ہی میں قبر میں نہ چلی جاؤں اور پھر جب تم آؤ تو ”روڈ گے تم مزار پر، روئیں گے ہم مزار میں“ والی بات نہ ہو۔

قارئین۔ میری یہ ذاتی باتیں گو کہ آپ بیتی سے ڈائریکٹ تعلق نہیں رکھتی لیکن ان ڈائریکٹ تعلق ضرور ہے جس کا انتہائی مختصر الفاظ میں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میری والدہ اپنے زمانے کی میٹرک اور اردو اور فارسی یکساں روانی سے بولتی لکھتی اور پڑھتی تھیں۔ وہ انتہائی حساس اور شوہر پرست تھیں ان کی انہی صفات کے باعث میرے والد نے اپنی تمام جائیداد اپنی زندگی میں ہی ان کے نام منتقل کر دی تھی۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میری والدہ نے بھی اپنے شوہر کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچائی اور شہر کی رہنے والی اس خاتون نے میرے والد کے انتقال کے بعد پورے 34 برس گاؤں میں گزارے اور سوائے میرے ہمراہ ہونے کے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا اسی گاؤں سے ان کا جنازہ اٹھا اور میرے والد کے پہلو میں دفن ہوئیں۔ میرے پاس ابھی تک وہ خطوط موجود ہیں جو میرے والد اور والدہ ایک دوسرے کو لکھا کرتے تھے ان کے خطوط کا آدھے سے زیادہ حصہ تو حافظ اور اقبال کے اشعار سے بھرا ہوتا تھا۔

جب میں نے اپنی بیوی کے خط کھولے تو پہلا شہ دہ تو یہ پڑھا کہ اس نے گھر میں اپنا چولہا لگ کر لیا ہے ”میرا تمہاری ماں کے ساتھ گز نہیں ہو سکتا اور آئندہ اپنی تنخواہ مجھے علیحدہ بھیجنے کا انتظام کرو“ جب میں خط کے ان الفاظ پر پہنچا تو جہاں میری بیوی نے میری والدہ کو ”بڑھیا“ کہہ کر مخاطب کیا تھا تو مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا اور بغیر پڑھے میں نے اس کے خطوط پھاڑ دیئے۔ میری والدہ کے متعلق ایسے گھٹیا الفاظ والے خطوط میں پڑھنا تو کجا، اپنے پاس رکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ جیسا کہ میں شروع کے صفحات میں عرض کر چکا ہوں۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت میں تربیلہ ڈیم بنانے والی غیر ملکی کمپنی تربیلہ جوائنٹ ونچر میں بحیثیت PRO (پبلک ریلیشن آفیسر) ملازم تھا اور میں نے خود اس حساس محلے کو اپنی خدمات پیش کی تھیں اس انتہائی خطرناک کام کیلئے والمیئر کرنے میں اگر نوے فیصد وجہ میری اپنے وطن سے محبت اور شکست کا بدلہ لینے کی خواہش تھی تو دس فیصد وجہ گھر کی بے سکونی اور اس کا کوئی حل نہ ملنے پر اس سے فزیر حاصل کرنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان واپسی کے بعد میں نے صرف چند ماہ بمشکل گھر میں گزارے۔ دو سال پشاور میں ملازمت کی اور پھر سات سال سے زیادہ عرصہ سعودی عرب اور 8 سال سنگاپور میں بسر کئے اور ان چند سالوں کے دوران میں مجموعی طور پر 5 ماہ گھر میں رہا۔ میں جب بھی گھر آیا ملکی سامان اور تحفے تحائف سے بھری ہوئی ویگن لایا اور ہمیشہ ہنستے ہوئے گھر میں داخل ہوا لیکن وقت سے پہلے واپس جاتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو ہوتے تھے اور زبان پر دو بارہ کبھی واپس نہ آنے کا عہد جسے میں اپنی والدہ کی آہ و زاری کے باعث کبھی پورا نہ کر سکا۔

آئندہ کئی روز کوئی خلاف معمول بات نہ ہوئی۔ صبح شام بھی خاموشی اور روزمرہ کی مصروفیت میں گزرے۔ میرے پاس حاجی مستان اور یوسف ٹیل کی بھیجی ہوئی رقم میں سے ابھی خاصے روپے موجود تھے۔ اس رقم میں سے میں نے پاکستان جانے والی ہرنیملی کو تین ہزار روپے دینے کا فیصلہ کیا۔ گو کہ یہ بہت کم رقم تھی لیکن پاکستان پہنچتے ہی ان کو فوری مالی پریشانیوں سے بچا سکتی تھی۔ میرے سامنے صرف ایک مشکل تھی۔ پاکستان میں بھارتی کرنسی کا لین دین سختی سے ممنوع تھا اور نیپالی کرنسی کی کوئی ویلیو نہ تھی۔ کھٹمنڈو میں امریکی ڈالر بلیک میں بہت اونچے داموں ملتے تھے۔ حکومت پاکستان اور میرے محلے کیلئے بھارتی کرنسی خاصی کٹش رکھتی تھی۔ (جاری ہے)

غازی

دنیا بھر میں پاکستانی سفارت خانوں کے اخراجات کیلئے حکومت پاکستان امریکی ڈالر بھجوتی تھی اور ان میں نیپال میں ہمارا سفارت خانہ بھی شامل تھا۔ حکومت پاکستان کو تو اس نہایت معمولی بھارتی کرنسی سے دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی لیکن میں نے جب اپنے محلے کو اپنی ڈاک میں 15 لاکھ بھارتی کرنسی بھجج کر یہ لکھا کہ اس کے عوض 15 لاکھ پاکستانی روپے مجھے بھجج دیں تو واپسی ڈاک میں ہی پاکستانی کرنسی مجھے مل گئی۔ بھارت میں رہائش کے دوران مجھے بخوبی علم ہو چکا تھا کہ میرا محکمہ بھارت میں کام کرنے والے اپنے متعدد گروپس کو جو بھارتی کرنسی بھججتا تھا اور جو روپیہ بھارت میں ہمدردوں سے یہ گروپ حاصل کرتے تھے ان سب کی ادائیگی پاکستان کے قیمتی زرمبادلہ کے ذخائر سے امریکی ڈالر اور برٹش پاؤنڈ میں کی جاتی تھی۔ یہ پاکستانی روپیہ ملنے سے پانچ سو مہاجر خاندانوں کیلئے زادراہ کا انتظام ہو گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق افغان ایئر کے فلائٹ شیڈول کے مطابق پانچ سو سے کم ہی مہاجر خاندان اس سیزن میں جاسکتے تھے۔ مریم اور میں نے پانچ سو لافونوں میں تین تین ہزار روپے رکھے۔ ہم نے یہ پروگرام بنایا کہ ہر فلائٹ سے پہلے ایئر پورٹ پر ہم دونوں یہ لفافے جانے والے مہاجروں کو بطور تحفہ دیں گے اور پہلے سے کسی کو اس بارے میں نہیں بتائیں گے۔ نئے مہاجروں کی آمد بھی ابھی جاری تھی اگرچہ ان میں خاصی کمی آچکی تھی۔

ابھی فلائٹس شروع نہیں ہوئی تھیں اور یہ اپریل کی غالباً چار یا پانچ تاریخ تھی۔ میں حسب معمول رات کو مریم کے گھر سے واپس آیا تو میرے ہوٹل کی کافی شاپ میں اسرائیلی جاسوس میری منتظر تھی۔ ریسپشن سے مجھے اس کے متعلق پتہ چلا وہ کافی شاپ کے ایک کونے میں بیٹھی تھی، سر پر رنگ برنگی پٹیاں باندھے، گلے میں بڑے منکوں کے ہار پہنے اور چہرے پر مختلف رنگوں کی لکیریں لگائے اس نے خود کو پہچانے نہ جانے کی کافی حد تک کامیاب کوشش کی تھی۔ میں اس کی ٹیبل پر گیا اور اس کی آمد کی وجہ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بولی "میرے پاس بہت کم وقت ہے سب سے چھپ چھپا کر یہاں پہنچی ہوں۔ بھارتی سفارت کاروں نے تمہیں اغوا کرنے کیلئے ہمارے سفارت خانے سے مدد مانگی ہے۔ ہمارے دو ایجنٹ آئندہ دو تین روز میں امریکیوں کے بھیس میں تمہارے ہوٹل میں ٹھہریں گے اور تم سے بے تکلف ہونے کی کوشش کریں گے ان کے پاس اسلحے کے علاوہ بے ہوش کرنے والی گیس بھی ہے، ان سے بچ کے رہنا" یہ کہتے ہوئے اس نے فلم کا ایک رول مجھے دیا "رول میں ان کی کئی تصویریں ہیں جو میں نے خفیہ طور پر اپنے سفارت خانے میں اتاری ہیں۔ میں اپنے سفارت خانے سے سیدھی یہاں آئی ہوں۔ فلم خود دھلو الینا۔ تمہارے احسان کا سارا تو نہیں لیکن کچھ بدلہ میں نے اتار دیا ہے" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کافی اور سینڈویچز کا بل تم ادا کر دینا" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور نشے میں ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے "ہرے رامہ۔ ہرے کرشنا" کا چاپ کرتی ہوئی ہوٹل سے باہر جا کر اندھیروں میں غائب ہو گئی۔ میں نے اپنے لئے کافی منگوائی اور خاصی دیر تک وہاں بیٹھا اس اسرائیلی لڑکی کے کردار کے متعلق سوچتا رہا۔ اپنے وطن اور قوم کیلئے جاسوسی کرنا اس کا پیشہ تھا بالکل میری طرح لیکن ہم دونوں اپنے پیشوں کے علاوہ انسان بھی تھے اور انسانی ہمدردی کے تحت احسان کرنا اور احسان کا بدلہ چکانے کا جذبہ دوسرے انسانوں کی طرح ہماری فطرت میں بھی شامل تھا۔ انسان تو انسان جانور بھی اس جذبے سے عاری نہیں۔ کتے سے لے کر ہاتھی اور چڑیا سے لے کر باز تک سب جانوروں اور پرندوں میں یہ جذبہ موجود ہے۔ صرف بتوں کے پجاری ہندوؤں میں ہی مسلمانوں کے خلاف اس قدر بغض اور عناد بھرا ہوا ہے جس نے ان میں انسانیت کی یہ حس بھی ختم کر دی ہے۔

اگلے روز میں نے محسن کو یہ فلم رول دیا جسے ڈیویپ اور پرنٹ نکلا کر وہ شام کو آ گیا۔ دونوں اسرائیلی ایجنٹوں کی 6 واضح تصاویر تھیں۔ محسن کو ان کے بارے میں نے کچھ نہیں بتایا کیونکہ وہ اپنی غیر معمولی حرکات اور خود پر قابو نہ رکھ سکنے کی وجہ سے ان اسرائیلیوں کو چونکنا کر دیتا اور پجاری اسرائیلی جاسوسہ مفت میں ماری جاتی۔ مریم کی محبت، خلوص اور میری سلامتی کیلئے ان کے متفکر رہنے کے باعث میں اس کے سامنے اتنا بزدل بن گیا تھا کہ میں نے اس نئی آفت کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا میں مسلسل نوٹ کر رہا تھا کہ پاکستانی لباس پہنے، اردو سیکھنے اور ہر روز مستقبل کے پلان بنانے کے باوجود اس کے چہرے کی شادابی کم ہو گئی تھی میں جب بھی مستقبل کے متعلق اس سے باتیں کرتا وہ خلاؤں میں گھورنے لگتی، جیسے اسے میری باتوں پر یقین نہ ہو اور وہ خلاؤں میں کسی سے میری باتوں کی تصدیق چاہتی ہو۔

اسرائیلی لڑکی کے مطابق دونوں اسرائیلی جاسوس مسلح تھے اور ان کے پاس بے ہوش کرنے والی گیس بھی تھی۔ میں نے اس جنگی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے Kill your enemy before he kills you (دشمن کو اس سے پہلے ہلاک کرو کہ وہ تمہیں ہلاک کرے) خود پہلے حملہ کرنے کا پلان بنایا جس دن انہوں نے ہوٹل میں Check-In ہونا تھی، اسی رات میں نے انہیں ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ سامینا نڈوا لے میرے سلنڈر مریم کے پاس تھے اسے میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے چینی دوستوں کو سمجھایا کہ مجھے ان کا ایک گیس سلنڈر درکار ہے اور وہ مریم کو اس بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ وہ گیس سلنڈر لے آئے۔ گیس ماسک پہلے ہی میرے پاس موجود تھی اپنی طرف سے مکمل تیاری کر کے اور منصوبے کو آخری ٹچ دے کر میں نے اسرائیلی جاسوسوں کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں نے اپنے روز کے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ دو دن بعد میں نے ان اسرائیلیوں کو کافی شاپ میں بیٹھے دیکھا۔ ان کے قریب ہی ایک ٹیبل پر میں بیٹھ گیا۔ کافی کا آرڈر دے کر میں نے سگریٹ نکالا اور "جیبوں میں ماچس تلاش" کرنے کے بعد میں ان کے پاس گیا اور ماچس مانگی۔ سگریٹ سگا کر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنا تعارف آصف علی نام سے کروایا اور انہیں بتایا کہ میں پاکستانی مہاجر ہوں اور گزشتہ کئی ماہ سے اس ہوٹل میں مقیم ہوں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ امریکن ٹورسٹ ہیں اور آج ہی اس ہوٹل میں آئے ہیں اپنے شکار کو اتنے قریب پا کر انہوں نے مجھے اپنے ٹیبل پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ویٹر میری آرڈر دی ہوئی کافی اسی ٹیبل پر لے آیا۔ میں نے بلا جھجک یہ کافی پی اس میں کسی چیز کی ملاوٹ کا اس لئے احتمال نہیں تھا کیونکہ اس کا آرڈر میں نے اپنی ٹیبل سے دیا تھا۔ اسرائیلی سفارت خانے نے محض خانہ پری اور بھارتی مطالبے کو پورا کرنے کیلئے اپنے تھرڈ کلاس جاسوس بھیجے تھے۔ ان بظاہر امریکنوں کی نیو انگریزی امریکی تلفظ میں تھی اور نہ ہی امریکہ کے متعلق ان کی معلومات کسی پاکستانی اسکول کے طالب علم سے زیادہ تھیں۔ ہم باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تول بھی رہے تھے۔ ان کے متعلق میرا اندازہ یہ تھا کہ یہ جاسوسی کے علم سے کافی حد تک نابلد اور صرف قتل کرنے والے تھے۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد آج رات ہی ان کا کام تمام کرنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ ان سے رخصت ہو کر میں ریسپشن پر چلا آیا اور ان "امریکیوں" کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ ان کا کمرہ میرے فلور پر ہی 15 نمبر تھا۔ میں حسب معمول شام کو مریم کے گھر گیا لیکن جلد ہی لوٹ آیا اور لابی میں بیٹھ کر مختلف رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔ میں چاہتا تھا کہ انہیں اپنے کمرے میں جاتا دیکھ لوں تو پھر اپنے کمرے میں جاؤں۔ رات 10 بجے کے قریب یہ باہر سے واپس لوٹے اور سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ بیس منٹ کا وقفہ دے کر میں بھی اپنے کمرے میں چلا آیا۔

(جاری ہے)

غازی

اپنا گیس سلنڈر اور زہریلی سویوں والا ڈبہ چیک کیا۔ ہوٹل میں آتشیں اسلحے کے استعمال سے سو فیصد قتل کی واردات بنتی تھی۔ ٹھیک 11 بجے گیس ماسک لگا کر اور گیس سلنڈر ہاتھ میں لئے میں نے اپنے کمرے کی بتیاں بجھائیں اور دروازے سے باہر جھانکا۔ ہر طرف خاموشی تھی میں بے آواز قدموں سے چلتا ان کے کمرے کے دروازے تک گیا اور دستک دی۔ اندر سے آواز آئی "Who is there (کون ہے)" "Waiter Sir" میں نے حتی الامکان اپنی آواز بدلتے ہوئے کہا "ONE MESSAGE FOR YOU SIR" میں نے ویٹروں جیسی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ "ONE MOMENT" اندر سے آواز آئی میں بائیں دروازے کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا کیونکہ دایاں دروازہ پہلے کھلتا تھا۔ گیس سلنڈر میں نے اس طرح پکڑا ہوا تھا کہ گیس نکالنے کے بٹن پر میری انگلی تھی میں یہ دعاما نگ رہا تھا کہ دروازہ کھلنے سے پہلے کوئی اور گیسٹ اس فلور پر نہ آجائے۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ساتھ ہی ایک اسرائیلی "ویٹر" سے پیغام لینے کیلئے دروازے سے تھوڑا سا باہر نکل آیا۔ سامنے کسی کونہ دیکھتے ہوئے اس نے بائیں طرف دیکھا جہاں میں کھڑا تھا ماسک والا چہرہ دیکھ کر اسے فوری خطرے کا احساس ہوا۔ ادھر میں نے اس کے اپنی طرف دیکھتے ہی سلنڈر سے گیس خارج کرنے کا بٹن دبا دیا تھا۔ بیک وقت دو کام ہوئے۔ گیس اس کے نٹھوں میں گھسی اور وہ اپنے بچاؤ کیلئے ہٹا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی اس کے گرنے سے پہلے ہی میں نے اسے دھکا دے کر اندر پھینکا اور اسے پھلانگتے ہوئے دوسرے اسرائیلی کے بیڈ پر جا پہنچا۔ دروازہ کھلنے سے اب تک صرف سات یا آٹھ سیکنڈ ہی گزرے تھے۔ دوسرے اسرائیلی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی خطرے کو پھانپتے ہوئے تکیے کے نیچے سے ریوالور اٹھانا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی میں اس کے چہرے پر گیس پھینک چکا تھا۔ وہ چند لمحوں بستر میں ہی پھڑ پھڑایا اور ٹھنڈا ہو گیا میں نے پہلے دروازہ اندر سے لاک کیا اور دونوں کھڑکیاں کھول دیں تاکہ گیس نکل جائے۔ دروازے کے قریب پڑے اسرائیلی کی لاش کو میں نے اس کے بیڈ پر ڈالا۔ دونوں نے سلپنگ سوٹ پہن رکھے تھے۔ میں نے ان کے ہینگروں پر لٹکے لباس، مختصر سامان اور بیڈز کے ساتھ جڑی سائیڈ ٹیبلر کی تلاش لی۔ تکیوں کے نیچے سے دو بھرے ہوئے ریوالور سامان میں سے فالتو گولیاں، دو سلنڈر اور دونوں کے بٹوں کے ملے۔ جن میں امریکی پاسپورٹ اور تھوڑے سے ڈالر تھے۔ دونوں کے بٹوں سے میری ایک ایک تصویر بھی ملی۔ یہ تصویریں اخباری نہیں بلکہ کیمرے سے کھینچی ہوئی تھیں۔ پس منظر میں انا پورنا ہوٹل تھا۔ گویا کسی نے ہوٹل سے میرے باہر نکلتے وقت کی تصویر اتاری تھی۔ میں نے کھڑکیاں بند کر دیں۔ یہ سب سامان اٹھایا اور کمرے کی لائٹ بند کر کے نائٹ بلب جلا کر دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ ان کا سب سامان اور اپنا ہسٹل، گولیاں زہریلی سویوں کا ڈبہ، سلنڈر اور گیس ماسک ایک ایئر بیگ میں ڈالے اور دروازہ لاک کر کے نیچے لابی میں آ گیا۔ ہوٹل میں میری اس رات داخلے کی اتاری ہو چکی تھی۔ اس لئے ریسیپشن پر کسی کو بتائے بغیر میں آنکھ بچا کر ہوٹل سے باہر آ گیا اور وین لے کر سیدھا مریم کے گھر پہنچا۔ وہ میری آمد کا سن کر ہڑبڑا کر اٹھی۔ میں نے بیگ اس کے حوالے کیا اور کہا کہ ہوٹل میں مجھ سے دو اسرائیلی جاسوس مارے گئے ہیں۔

(جاری ہے)

غازی

بیگ کو وہ کسی محفوظ جگہ پر چھپا کے رکھ لے۔ مجھے فوری واپس ہوٹل پہنچنا ہے۔ کیونکہ میری IN کی اتھری ہو چکی ہے۔ سارا واقعہ تفصیلاً کل اسے بتاؤں گا۔ مریم نے بھی مجھے اس وقت روکنا مناسب نہ سمجھا۔ میں اپنے ہوٹل واپس پہنچا۔ میری غیر حاضری کسی نے محسوس نہ کی تھی۔ کافی شاپ میں کافی پینے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا آیا اور لمبی تان کر سو گیا۔ میری ذہنی حالت ایسی ہو چکی تھی کہ دشمن کو مارتے وقت مجھے اتنا بھی افسوس نہیں ہوتا تھا جتنا کسی کو چوہا مارنے پر ہو۔

اگلے روز بعد دوپہر ہوٹل کی انتظامیہ کو ان (امریکنوں) کی ہلاکت کا پتہ چلا۔ ان کا دروازہ میں نے باہر نکلتے وقت اندر سے لاک کر دیا تھا اور دروازے پر DO NOT DISTURB کا بورڈ پہلے ہی سے لٹکا ہوا تھا وہ تو HOUSE KEEPING (کمرے کی صفائی) والوں نے کئی بار ان کے کمرے کے چکر لگانے کے بعد بالآخر صفائی کیلئے ماسٹر چابی سے دروازہ کھولا اور انہیں سوتے پا کر بیڈ شیٹس تبدیل کرنے کیلئے انہیں جگانا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ ابدی نیند سو چکے تھے۔ ہوٹل میں شور مچ گیا۔ انتظامیہ نے پولیس کو فوری طور پر اطلاع دی۔ پولیس نے آکٹیفیشن شروع کی تو انہیں بتایا کہ کمرہ اندر سے بند تھا اور HOUSE KEEPING والوں نے اسے کھولا پولیس کو فوری طور پر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ان کی لاشیں اٹھوا کر سرد خانے میں بھجوا دی گئیں۔ رسمی کاغذی کارروائی اور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کی لسٹ اور مرنے والوں کا سامان لے کر پولیس واپس چلی گئی۔ ان کے شناختی کاغذات اور پاسپورٹ بھی پولیس کو نہ ملے اس لئے ہوٹل میں "تفتیش کے دوران امریکن سفارت خانے سے بھی پولیس نے رجوع نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ پولیس کوئی سراغ نہ ملنے پر خاموشی سے واپس تو چلی گئی ہے لیکن اس کی فائلوں میں اندھے قتلوں کی فہرست میں دو اور کا اضافہ ہو گیا ہے۔ جسے وہ یونہی ہضم نہیں کرے گی اور یہی ہوا۔ مریم کو ساری واردات کا تفصیلاً بتا کر اور اس سے یہ عہد کر کے کہ آئندہ اس کو جاننے بوجھنے لا علم رکھ کر میں کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جب میں رات گئے اپنے ہوٹل واپس لوٹا تو معلوم ہوا کہ پولیس کی خاصی بڑی نفری ہوٹل میں ایس پی کی سربراہی میں موجود ہے اور ایس پی اپنے ماتحتوں کے ساتھ ہوٹل کے ملازمین کے علاوہ وہاں ٹھہرے ہوئے مہمانوں سے پوچھ گچھ کر رہا ہے اور سب کے کمروں کی تلاشی بھی لی جا رہی ہے۔

ہر کمرے کی طرح میرے کمرے کے باہر بھی ایک سپاہی کھڑا تھا۔ دروازہ کھولنے پر وہ میرے ساتھ ہی کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے چند منٹ یونہی گزارے اور کمرہ بند کر کے کافی شاپ میں آ بیٹھا۔ کئی مہمانوں سے تفتیش کر کے جب میری باری آئی۔ تو S.P نے کافی شاپ میں ہی نہایت شرافت سے مجھ سے تفتیش کا آغاز کیا۔ میں نے اسے گھڑی گھڑائی کہانی سنائی کہ میں مشرقی پاکستان میں چٹاگانگ میں تھا جب سقوط ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا۔ میں کئی برس چٹاگانگ کے پہاڑی سلسلے میں چکمہ قبائل کے مرکزی گاؤں رانگامائی میں رہا کیونکہ چکمہ قبائل کا سردار راجہ تری دیورائے میرا گہرا دوست تھا۔ چند ماہ پہلے ہی میں کھٹمنڈو پہنچا ہوں اور پاکستانی سفارت خانے میں رجسٹرڈ پاکستانی مہاجر ہوں۔ ایس پی نے میری ساری روداد خاموشی سے سنی۔ اب سوال، جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایس پی "آپ اتنے مہنگے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں جبکہ پاکستانی مہاجر تو ایک خستہ حالی میں زندگی گزار رہے ہیں" میں "مہاجر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ مالی طور پر بھی لازمی کمزور ہو۔ میں اپنا تمام سرمایہ ہمراہ لایا ہوں اور اپنے معیار کے مطابق رہ رہا ہوں۔ میں ضرورت مند مہاجروں کی مالی امداد بھی کرتا ہوں" S.P جب آپ مالی طور پر خوشحال ہیں تو اپنا ٹکٹ خرید کر پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ میں "میرا چھوٹا بھائی بھی ڈھاکہ میں تھا۔ میں اسی کے انتظار میں ہوں۔ آخری اطلاعات کے مطابق اس نے بھی ڈھاکہ میں کہیں پناہ لے رکھی ہے۔ وہ یہاں آجائے تو میں اسے لے کر فوری یہاں سے چلا جاؤں گا۔ S.P ہمیں معلوم ہوا ہے کہ پاکستانی سفارت خانے میں آپ کے ساتھ خصوصی طور پر اچھا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ میں "یہ درست ہے اور اس کی وجہ محض میری مالی خوشحالی ہے۔ آپ نے بھی اس ہوٹل میں اپنی تفتیش کے دوران میرے ساتھ جو رویہ اپنایا ہے۔ وہ ہر مہاجر کے ساتھ یقیناً نہیں ہوگا" S.P ہمیں آج ہی کسی ذریعے سے ایک بھارتی اخبار ملا ہے۔ جس میں آپ کی تصویر کے ساتھ یہ لکھا ہوا ہے کہ آپ مہاجر نہیں بلکہ پاکستانی جاسوس ہیں" میں نے ہنستے ہوئے جواب "ایس پی صاحب، بھارت ہمارا دشمن ہے۔

(جاری ہے)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹھیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

✧ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

غازی

حکومت سوچنے کے بجائے اسے گرفتار کر کے مغربی پاکستان لے جایا گیا۔ کیا آپ آج کے ڈیموکریٹک ورلڈ (DEMOCRATIC) میں کوئی ایک بھی ایسی مثال دے سکتے ہیں کہ اکثریتی پارٹی کے لیڈر کو (CHIEF EXECUTIVE) بنانے کے بجائے جیل میں ڈال دیا جائے۔ یحییٰ خان کے اس عمل کو مشرقی پاکستان کے ووٹروں نے انتہائی سنجیدگی اور جذباتی طور پر محسوس کیا۔ ہمارے لئے یہ سنہری موقع تھا ہم نے انہیں اس بات کا بھرپور یقین دلایا کہ مشرقی پاکستان والے چاہے ہاریں یا جیتیں، حکومت ہمیشہ مغربی پاکستان والے ہی کریں گے، یحییٰ خان کے فوجی ہونے اور مارشل لاء کو بنیاد بنا کر ہمیں مشرقی پاکستانیوں کو پاکستانی فوج کے خلاف بھڑکانے کا بھی اچھا موقع مل گیا۔ ان دنوں پاکستان میں ایسے عموماً ہوتے ہیں جن کی دنیا بھر میں مثال نہیں ملتی۔ اکثریتی پارٹی کے لیڈر کو جیل میں ڈالا گیا۔ لاکھوں بنگالیوں (مشرقی پاکستانیوں) کو محض اس جرم میں گولیوں کا نشانہ بنایا گیا کہ وہ بنگالی بولتے تھے۔ بھٹو کو سول چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنایا گیا۔ یہ ”نیا عہدہ“ بھی دنیا میں پہلی بار معرض وجود میں آیا تھا مسئلہ کشمیر پر پاکستان اور بھارت کے درمیان تین جنگوں نے دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا رکھا تھا۔ پاکستان کی سالمیت اور دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کو ٹکڑے کرنے کیلئے جب بھٹو، مجیب اور یحییٰ خان ہی درپے تھے تو ہم کیوں خاموش رہتے۔ ہم نے تینوں کی پیٹھ پھکی، مالی اور مادی امداد دی اور جب ضرورت پڑی تو اپنی فوج بھی جھونک دی۔ مسٹر آصف غیر جانبدار ہو کر سوچئے۔ مجیب کو ہم نے نہیں بلکہ یحییٰ خان نے جیل میں ڈالا تھا۔ سلامتی کونسل میں بھٹو صاحب کو پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے عین اسی وقت ”شدید فلو“ ہو گیا جب پاکستان بھارت جنگ فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ پولینڈ کی قرارداد (جس میں فوری جنگ بندی، دونوں ملکوں کی افواج کو واپس اپنی سرحدوں میں جانے اور مشرقی پاکستان کا سیاسی تصفیہ کرنے کا کہا گیا تھا اور اس قرارداد کو دونوں سپر پاور یعنی روس اور امریکہ کی تائید حاصل تھی) کو ہمارے نمائندے نے نہیں بلکہ بھٹو صاحب نے پھاڑا تھا۔ حالانکہ اس قرارداد کے مطابق بھارتی افواج کو جوڈھا کے مضامین میں پہنچ چکی اور یقینی فتح سے ہمکنار ہونے والی تھی۔ واپس بھارتی سرحدوں پر لوٹنا پڑتا۔ جبکہ پاکستانی افواج مشرقی پاکستان میں ہی رہتی۔ مغربی پاکستان کا پانچ ہزار مربع میل علاقہ بھی پاکستان کو واپس مل جاتا۔ نوے ہزار پاکستانی افواج کو بھی ہتھیار ڈالنے نہ پڑتے اور نہ ہی وہ جنگی قیدی بنتے۔ بھٹو نے یہ سب ذلت و خواری منظور کر لی کس لئے؟ صرف مغربی پاکستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کی خواہش میں۔ مسٹر آصف میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ پاکستان اور بھارت دونوں کے لیڈروں کو جب اپنی کرسی ڈگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو وہ اسے سہارا دینے کیلئے پاک بھارت جنگ کی باتیں شروع کر کے عوام کی توجہ ملکی مسائل سے ہٹا دیتے ہیں لیکن ہمارے اور آپ کے لیڈروں میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ پاکستان اور بھارت کو آزادی ملے آج 28 سال ہو چکے ہیں ہمارے پہلے پردھان منتری (وزیر اعظم) چندت جو ہر لال نہر تھے وہ سورگباش ہوئے تو دوسرے پردھان منتری لال بہادر شاستری بنے۔ انہوں نے چندت جی کی ملکی سیوا کو بہت سراہا اور کہا وہ چندت جی کے TRACKS پر ہی اپنے ملک کی سیوا کریں گے اور یہی الفاظ شری متی اندرا گاندھی جی نے لال بہادر شاستری کے سورگباش (مرنے) پر، پردھان منتری بننے پر شاستری جی کے متعلق کہے۔ ہمارے ملک میں ان 28 برسوں میں تین حکومتیں بدلیں اور وہ بھی پردھان منتریوں کے سورگباش ہونے کی وجہ سے ان دوران آپ کے ملک میں گیارہ حکومتیں بدلیں ہر حکومت کا تختہ الٹا گیا ہر نئے اقتدار سنبھالنے والے نے پچھلوں کو کوسا نہیں بے حد برا بھلا کہا اور ان پر ملک دشمنی کے بدترین الزام لگائے گئے۔ ہمارے اور آپ کے لیڈروں میں فرق یہ ہے کہ اپنی ذاتی کمزوریوں کے باوجود ہمارے لیڈر اپنے ملک کے وفادار ہیں جبکہ آپ کے لیڈر اپنے ملک کے بھی وفادار نہیں۔ اگر ہمیں مجیب اور بھٹو کی آشر دار میسر نہ ہوتی تو ہم کبھی بھی جنگ میں نہ کودتے ہم پاکستانی فوج کی دلیری اور حب الوطنی سے 65ء کی جنگ میں بخوبی واقف ہو چکے تھے یہیں علم تھا کہ پاکستانی فوج کس تو سکتی ہے پیٹھ نہیں دکھا سکتی۔ یہ صرف آپ کے مقبول ترین لیڈروں کی شد اور سبز جھنڈی تھی جس نے ہمیں پاکستان کی سیاسی بے چینی سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ دیا۔“

کرنل آنند اور اس کے ساتھیوں سے میری گفتگو کافی دیر جاری رہی۔ جب وہ رخصت ہوئے تو میرے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئے تھے جسے میں آج تک اپنے دل و دماغ سے کھریج نہ سکا۔ شاید قارئین اس سوال کا مناسب جواب دے سکیں۔

کافی شاپ میں کافی دیر تک بیٹھا میں بھارتی فوجی افسران سے آج کی گفتگو کے متعلق سوچتا رہا۔ کرنل آنند نے دراصل گزشتہ ملاقات کے دوران میری کہی ہوئی باتوں کا آج جواب دیا تھا۔ سقوط ڈھاکہ سے پہلے پاکستان کے سیاسی حالات، ہمارے لیڈروں کی خود غرضی اور پاکستان کی سالمیت کے خلاف ان کی سازشوں جن کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہوا کو دہرا کر مجھے بلکہ پوری قوم کو آئینہ دکھایا تھا۔ اس نے سب کچھ سو فیصد صحیح کہا تھا اور کسی حقیقت کو محض اس لئے جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ وہ دشمن کے منہ سے نکلی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ بھارت کو خود ہم نے موقع فراہم کیا کہ ان حقائق کی روشنی میں ماہیتہ ذہن (IMMATURE BRAIN) نوجوانوں کی برین واشنگ کرے جس میں وہ سو فیصد کامیاب رہا۔ بھارت نے پاکستانی جوانوں کی برین واشنگ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا اور آج 1998ء میں بھی پاکستان کے داخلی انتشار اور سیاسی کمزوری اور اپنے مضبوط پروپیگنڈے کے باعث وہ اس حد تک کامیاب ہو چکے ہیں کہ 65ء کی پاک بھارت جنگ میں ایک جان ہو کر لڑنے والی قوم آج بیسویں سیاسی، مذہبی اور لسانی جماعتوں میں بٹ چکی ہے۔ سب کا اپنا اپنا علیحدہ راستہ ہے ان میں نفرت کی دیواریں اتنی اونچی ہو چکی ہیں کہ انہیں ان دیواروں کے پار کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ لالہ اللہ اللہ کی بنیاد پر معرض وجود میں آنے والے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سیاسی، لسانی اور مذہبی اختلافات کو دشمن نے اتنی ہوا دی ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں اور اس حقیقت کو بالکل فراموش کر چکے ہیں کہ ان کی شناخت پاکستان ہے۔ اگر خدا نخواستہ پاکستان ہی نہ رہا تو ان کی شناخت بھی باقی نہ رہے گی۔ میں آپ کو حلفیہ کہتا ہوں کہ بھارت میں DMI کی قید کے دوران مجھ سے ایک بار بھی مجھ سے میرا مسلک، سیاسی نظریات اور آبائی وطن یا صوبے کا نہیں پوچھا گیا۔ مجھ پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑنے کیلئے میرا صرف پاکستانی اور مسلم ہونا ہی کافی تھا۔ آج پاکستانی قوم کے بیشتر افراد مسئلہ کشمیر کو ایک DEAD ISSUE سمجھتے ہیں۔ یہ بھی بھارتی پروپیگنڈے کا کمال ہے ورنہ اگر کشمیر ایک DEAD ISSUE ہوتا تو 48ء میں مقبوضہ کشمیر میں تعینات 20 ہزار بھارتی فوج کی تعداد آج بڑھ کر 7 لاکھ نہ ہوتی۔

کرنل آنند اس ملاقات کے بعد کئی مرتبہ مجھے ملنے آیا ہر ملاقات میں اس کی باتیں میں خاموشی سے سنتا رہتا اور اگر جواب دیتا تو وہ بھی انتہائی مختصر اور اس کی توقع کے مطابق۔ کرنل آنند یہ سمجھ رہا تھا کہ میری خاموشی کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کی برین واشنگ کے زیر اثر آچکا ہوں جب کہ میں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بولے تاکہ میں بھارتی پروپیگنڈے کی وسعت اور گہرائی کے آخری سرے تک پہنچ سکوں۔

کرنل آنند سے اپنی ہر ملاقات کی تفصیلی رپورٹ میں اپنے سفارت خانے اور محلکے کو باقاعدگی سے بھیجتا تھا۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے دوران کرنل آنند نے یہ سوچتے ہوئے کہ میں اس کے دلائل سے متاثر ہو چکا ہوں، ایک قدم آگے بڑھایا اور مجھ سے پوچھا کہ بھارتی سفارت خانے میں ہم نے کن لوگوں کو PLANT کر رکھا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ بحیثیت ملٹری اٹاچی کے اس کے فرائض میں شامل ہے کہ اپنے سفارت خانے کو ایسے لوگوں سے پاک رکھے اور یہ میرا اس پر ذاتی احسان ہوگا اگر میں اس معاملے میں اس کی مدد کروں۔ ہوٹل میں پہلی ملاقات کے دوران میں نے کرنل آنند اور اس کے جونیئر زپر ان کے سفارت خانے، DMI اور تینوں افواج کے ہیڈ کوارٹرز میں LEAKAGE اور پاکستانی پے رول پر کام کرنے والوں کا ایسا مدلل ذکر کیا تھا کہ انہیں میری باتوں پر یقین آ گیا۔ ویسے بھی یہ انسانی فطرت ہے کہ کسی راہ چلتے کو آپ اگر یونہی کہہ دیں کہ تمہاری قمیص یا شلوار پھٹی ہوئی ہے تو وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا نہیں ہو سکتا، ضرور بالضرور اپنے لباس کو چیک کرے گا۔ میں جانتا تھا کہ میری اس روز کی گفتگو ضائع نہیں اور ان تمام محکموں میں جن کی میں نے ”نشانہ ہی“ کی تھی یقیناً سرا سیمگی پھیل گئی ہوگی اور ان جگہوں پر کام کرنے والا ہر شخص دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہوگا۔ میں نے کرنل آنند کو کہا THIS IS TOO EARLY TO TOUCH THIS SUBJECT (اس موضوع کو اس وقت چھیڑنا بہت قبل از وقت ہے) میں نے ہنستے ہوئے کہا ”کرنل تم ہی پہل کر دو تا کہ میں تمہارے زیر احسان ہو جاؤں۔“ (جاری ہے)

غازی

اس ہوٹل میں تمہارے پلانٹڈ PLANTED آدمی کو اگرچہ میں پہچان چکا ہوں اور اس کا براہِ شکر کرنے والا ہوں لیکن تمہارے منہ سے اس کا نام سن کر مجھے یہ یقین ہو جائے گا کہ تم مجھ سے سچائی اور دیانت داری سے میل ملاقات بڑھا رہے ہو، جو آگے جا کر اعتماد کا وہ مقام بھی حاصل کر سکتی ہے۔ جہاں میں تم کو ایسے سربستہ راز بھی بتا دوں جنہیں سن کر تم انگشت بدنداں ہو جاؤ۔ لیکن ہمارا تو کوئی آدمی بھی اس ہوٹل میں نہیں ہے، کرنل آنند نے جواب دیا "اتنی معمولی بات کو جسے میں جان بھی چکا ہوں، تم اگر مجھ سے چھپانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ میں تم سے اس بارے میں مزید بات نہیں کروں گا۔ لیکن تمہیں یہ یقین دلانے کیلئے کہ میں اس آدمی کو پہچان چکا ہوں، اس کے بے جان جسم کا تحفہ تمہیں ضرور بھیجوں گا" میں نے لاپرواہی برتتے ہوئے کرنل آنند کو جواب دیا۔ کرنل آنند نے "سربستہ رازوں" تک پہنچنے کی سیڑھی پر پہلا قدم ہی الٹا پڑتے دیکھا تو فوراً اینٹریٹر ابدل کر بولا "بہت ممکن ہے کہ میری لاعلمی میں میجر باسو نے یہ کام کیا ہو۔ مجھے بھگوان کی سوگند ہے میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اس بارے میں تمام جانکاری حاصل کر کے تمہیں بتاؤں گا۔ کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھانا کل شام تک تمہیں صحیح حقیقت بتا دوں گا اور اگر میجر باسو نے کوئی آدمی اس کام کیلئے ENGAGE کر رکھا ہے تو اسے فوراً ہٹا دیا جائے گا۔ کرنل آنند میری تحفہ بھیجنے کی دھمکی سے بھی گھبرا گیا تھا۔ اس کی باتوں سے میرا یقین اور پختہ ہو گیا کہ ہوٹل میں ضرور کوئی آدمی PLANT کیا گیا ہے۔ میں نے تو اندھیرے میں تیر چلایا تھا لیکن وہ ٹھیک نشانے پر جا کر لگا۔ کرنل آنند کے جانے کے بعد میں ٹہلتے ٹہلتے ٹیلی فون آپریٹر کے کمرے میں گیا۔ بغیر کسی تمہید کے میں نے اسے پانچ سو روپے دیئے۔ اور کہا کہ مجھے امریکیوں کے ہلاک ہونے والے دن بعد دوپہر کی جانے والی تمام OUT GOING CALLS اور کرنے والوں کی لسٹ چاہئے روپے میں بڑی کشش ہے۔ آپریٹر نے پیسے جیب میں رکھے۔ اور اس روز رات کے بارہ بجے تک کی جانے والی کالوں کی لسٹ جس میں کال کرنے والوں کے کمروں کے نمبر ہوٹل اسٹاف کے نام جنہوں نے اس روز فون کئے تھے اور تمام کالوں کے نمبر درج تھے مجھے دے دی۔ اس کی ڈیوٹی سیکنڈ شفٹ میں بعد دوپہر سے رات 12 بجے تک تھی۔ میں نے اسے یہ لسٹ اگلے روز اس کی ڈیوٹی کے دوران لوٹانے کا وعدہ کیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔

بھارتی سفارت خانے کے نمبر میں نے ڈائریکٹری سے نکالے اور لسٹ سے ملانے لگا۔ اس روز بعد دوپہر سے لے کر رات 11 بجے تک بھارتی سفارت خانے کو تین فون کئے گئے تھے اور یہ فون کسی گیسٹ نے نہیں بلکہ ہوٹل کے ایک ملازم نے کئے تھے جو HOUSE KEEPING میں ملازم تھا۔ یہ معلومات مجھے دوسرے روز ملیں۔ اس کی ڈیوٹی سیکنڈ شفٹ کی تھی۔ سیکنڈ شفٹ کے دوران میں نے اس کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ نہیں آیا اور میرے کھنڈو میں قیام کے آخری دن تک وہ نہ تو ڈیوٹی پر آیا اور نہ ہی اپنے واجبات لینے کیلئے اس نے ہوٹل انتظامیہ سے رابطہ کیا کرنل آنند سے اگلی میٹنگ کے دوران میں نے کہا کہ تم نے مجھے تحفہ بھیجنے کی زحمت سے بچا دیا اور اس ہاؤسنگ کیپنگ کے ملازم کی جان بھی بچ گئی۔ تو کرنل آنند نے کھسانے لہجے میں جواب دیا کہ ہماری اتنی تعریف تو کرو کہ بعض باتوں میں ہم بہت تیز ہیں۔

میں کھنڈو میں رہتے ہوئے بہت تنگ آچکا تھا۔ پاکستان جانے والی ہر ڈاک میں بلاناغہ میں اپنے محلے سے درخواست کرتا تھا کہ مجھے واپس آنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن ہر بار مجھے یہی جواب ملتا کہ بہت جلد ہی واپس بلایا جائے گا۔ لیکن اس بہت جلد میں دنوں سے ہفتے اور ہفتوں سے مہینے بنتے جا رہے تھے۔ ادھر میری حالت یہ تھی کہ دشمن کا میرے گرد گھیرا روز بروز تنگ ہو رہا تھا۔ میری کیفیت بالکل اس بھیڑیے کی تھی جو شکاری کتوں کے گھیرے میں آچکا ہو۔ بھیڑیے کے خوف سے کتے قریب بھی نہیں آتے۔ اور اس امید میں بھاگنے کی راہ بھی نہیں دیتے تھے کہ بھیڑیا کسی جانب سے ذرا غافل ہو تو وہ یکبارگی اس پر حملہ کر دیں۔ میں چوکھی جنگ لڑ رہا تھا اور میرا حوصلہ اور قوت مدافعت روز بروز کم ہو رہی تھی صرف مریم تھی جو ان حالات میں مجھے حوصلہ دیتی لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مجھے درپیش خطرات سے وہ خود اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ مجھ سے ذہنی وابستگی اور ہم آہنگی اور چاہت کے علاوہ مریم کو میرے بغیر اپنا مستقبل بالکل تاریک دکھائی دیتا تھا۔ صرف ایک چائینز فیملی کھنڈو میں رہتی تھی جو غیر مسلم تھی۔ مریم کے والد کھنڈو میں آکر آباد ہو گئے تھے لیکن ان کی بیٹی کا مستقبل اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ 26 برس کی عمر ہونے کے باوجود اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ کھنڈو میں صرف ایک نمایاں مسلم خاندان تھا جو کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوا تھا۔ وہ خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے تھے۔ اس پس منظر میں مریم نے یہ سمجھتے ہوئے کہ زندگی بھر اس کی شادی نہیں ہو سکتی اور والدین کے بعد اسے اکیلے ہی ریٹائرمنٹ چلانا اور زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنا ہے، اپنی ذات میں خود اعتمادی، جرات اور حوصلہ پیدا کر لیا تھا۔ مجھ سے ملنے کے بعد اسے پھر گھر بیوی زندگی گزارنے کے آثار نظر آنے لگے اس کی نسوانیت، جسے اس نے سلا دیا تھا، پوری شدت سے جاگ اٹھی تھی، اس کا میرے ساتھ وہاں نہ پین روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ذہنی طور پر اس نے مجھے اپنا شوہر تصور کر لیا تھا اور ایک باوقار اور عنخواری بیوی کی طرح وہ میری سلامتی کیلئے مجھ سے زیادہ متفکر رہتی۔ میں بھی ایک پرسکون اور نئی زندگی گزارنے کیلئے بے تاب تھا۔ اسی لئے جب میری محکمانہ ڈاک میں ہر بار بہت جلد کی "خوشخبری" ملتی تو میں بھناٹھتا۔

دن یونہی بے کیفی کے عالم میں گزرتے جا رہے تھے۔ اس دوران مجھ سے ملنے کیلئے مہاجروں کے نمائندے کئی بار آئے اپنی روزمرہ کی پریشانیوں کے علاوہ ایک بار دبی زبان میں انہوں نے مجھے بتایا کہ جو مہاجر افغانی ایئر کے جہازوں سے عنقریب پاکستان پرواز کرنے والے ہیں وہ بیک وقت خوشی اور پریشانی کی حالت سے دوچار ہیں۔ انہیں پاکستان جانے کی خوشی کے ساتھ ساتھ یہ پریشانی بھی ہے کہ پاکستان پہنچتے ہی انہیں رہائش اور روزمرہ کی ضروریات کیلئے روپیہ درکار ہوگا۔ جو ان کے پاس نہیں ہے۔ یہاں کھنڈو میں تو دو وقت کی روٹی کی فراہمی کیلئے وہ اسٹریٹ ہا کر بن کر اور مختلف جگہوں پر اشیا بیچ کر جیسے تیسے زندگی گزار رہے ہیں۔ دکاندار انہیں ادھار پرفروختگی کیلئے سامان بھی دے دیتے ہیں لیکن پاکستان پہنچنے پر انہیں آگے کچھ سمجھائی نہیں دیتا۔ مفادات خانہ بھی اس مسئلے پر بالکل خاموش ہے اور کسی قسم کی یقین دہانی کر رہا۔ مہاجرین کے اس مسئلے کو میں نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہر پرواز پر روٹنگی سے پہلے ہر مہاجر کنبہ کو دینے کیلئے میں نے تین ہزار پاکستانی روپوں کے لفافے تیار رکھے ہیں یہ رقم گو کہ ان کی ضروریات کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن انہیں فوری پریشانی سے بچا سکتی ہے۔ میرے اس انتظام سے مہاجر نمائندے بہت خوش ہوئے۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ وہ پاکستان جانے والے سارے مہاجروں کو یہ بتادیں اور یہ بھی کہیں کہ پاکستانی حکومت اور عوام بھی ان کے بے سروسامانی سے غافل نہیں اور وطن پہنچنے پر انہیں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ انہی دنوں معلوم ہوا کہ پاکستانی مہاجروں کے ایک گروپ نے سفارت خانے کے باہر مظاہر کیا ہے۔ یہ وہ مہاجر تھے جو بیرون گنج سے لے کر کھنڈو کے نواحی قصبہات اور دیگر شہروں میں مقیم تھے۔ سفارت خانے نے صرف اپنے نوٹس بورڈ پر نلائٹ شیڈول اور ان پروازوں پر جانے والے مہاجروں کی لسٹ لگائی تھی اور یہ احکامات بھی تھے کہ اگر ایک مقررہ تاریخ تک لسٹ میں درج مہاجروں نے سفارت خانے میں رپورٹ کر کے FINAL COFIRMATION نہ کرائی تو ان کی جگہ دوسرے مہاجروں کو ان پروازوں پر بھیج دیا جائے گا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس میں نہ تو سفارت خانے کا کوئی قصور تھا اور نہ مہاجروں کا۔

(جاری ہے)

غازی

ان پروازوں پر ہی ہاف لوڈ اور جہاز کی PASSENGER CAPACITY سے آدھے مہاجر لے کر جاتی تھیں۔ ان کی محدود نشستوں کو بھی خالی تو نہیں بھیجا جاسکتا تھا۔ سفارت خانے میں ان مہاجروں نے اپنے رابطے کیلئے کوئی ایڈریس بھی نہیں چھوڑا تھا۔ جس پر سفارت خانہ انہیں بذریعہ ڈاک ہی مطلع کر سکتا۔ مہاجر اپنی جگہ سچے تھے کہ وہ ایسے قصبوں میں اور ایسی غیر نمایاں جگہوں پر رہتے تھے جہاں ڈاک کا ملنا ناممکن تھا۔ کھنڈو جیسے مرکزی شہر اور دار الحکومت میں ڈاک کا اتنا ناقص نظام تھا کہ ڈاک لینے کیلئے ڈاک خانے جانا پڑتا تھا اور میزوں پر بکھرے ہزاروں خطوط میں سے اپنے خط تلاش کرنے آتے تھے۔ مہاجرین کے مظاہرے کی بات سن کر میں خاموش رہا کیونکہ خاموش رہنے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ کھنڈو میں مجھے میرے مگلے نے ایک نہایت محدود ڈاک گٹ دیا تھا میں اگر صرف اسی حد تک محدود رہتا تو میرا کام صرف رپورٹس بھیجنے اور سفارت خانے کو اطلاع دینا تھا۔ یہ تو کھنڈو میں مہاجروں کی بے بسی اور بھارتی سازشوں کے بچھے ہوئے ان گنت جال دیکھ کر میں اس جھنجھٹ میں کود پڑا تھا۔ مہاجروں کو تو میں نے ان جالوں سے نکال لیا لیکن خود ان میں پھنس گیا۔ سفارت خانہ لگ میرا مخالف ہو رہا تھا کسی طرف سے مجھے بھی کوئی مدد یا کمک ملنے کی توقع نہیں تھی۔ چینی دوست بے شک میری حفاظت کیلئے موجود تھے۔ میرے کہنے پر وہ بڑے سے بڑا جو کھم کام کرنے کو تیار تھے۔ لیکن بھارتی سازشوں کو سمجھنا ان سے نسا اور ان کا توڑ کرنا میرے چینی دوستوں کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ سارا بوجھ مجھے اکیلے ہی اٹھانا تھا۔

انہی دنوں ایک شام جب میں ہوٹل کی لابی میں مہاجر نمائندوں سے بات چیت کر رہا تھا کیپٹن مان خلاف توقع اکیلا آکر کافی شاپ میں چلا گیا اور ویٹر کے ہاتھ ایک چٹ مجھے بھیجی جس پر لکھا تھا کہ فوری اہمیت کے معاملے پر آپ سے ملنے آیا ہوں۔ مہاجروں سے معذرت کر کے میں اس کے پاس گیا تو بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں وہ بغیر کسی تمہید کے بولا "آپ کی وین میں بم نصب کیا گیا ہے جو گاڑی اشارت کرتے ہی پھٹ جائے گا۔ مجھے جو یہی معلوم ہوا میں آپ کو بتانے کیلئے بھاگا آیا۔ میں نے آرٹنل اور اسلحہ ڈمپ کرنے کے علاوہ بم ڈسپوزل کرنے کی ٹریننگ بھی لی ہوئی ہے اگر آپ چاہیں تو میں بم نکال کر اسے DEFUSE کر سکتا ہوں۔" میں حیران تھا کہ میرے دشمنوں میں سے ایک یہ بھارتی سفارت کار ایسا کیسی میرا اتنا ہمدرد بن گیا کہ میری جان بچانے کیلئے اپنے ملک سے غداری پر بھی آمادہ ہو گیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ چلو اور نکالو وہ میرے ساتھ وین کی طرف آیا اور مجھے قدرے فاصلے پر کھڑا ہونے کا کہہ کر وین کے نیچے چلا گیا اور پانچ چھ منٹ EXPLOSIVE STICKS (بارودی سلاخوں) کا ہانا ہوا بم اور اس کے ساتھ لگی تاروں کو لے کر باہر آ گیا۔ چھوٹا کٹروہ اپنے ہمراہ لایا تھا اس نے تاروں کو بم سے علیحدہ کیا اور بولا "اب یہ محفوظ ہے" بم کو چھپانے کیلئے اس نے مجھ سے کپڑا مانگا اور فوراً ہی بولا "اب تو یہ بے ضرر ہو چکا ہے میں اسے کوٹ کی جیب میں ڈال لیتا ہوں۔ مجھے یہاں سے فوری جانا ہے تاکہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے" اس نے بم جیب میں ڈالا اتنی دیر میں، میں نے تاریں اٹھائیں اور ان کا گچھا بنالیا۔ کیپٹن مان نے مجھ سے تاریں مانگیں تو میں نے کہا "تم ان کا کیا کرو گے انہیں میرے پاس رہنے دو" تاریں میں نے اپنی جیب میں ڈال لیں اور کیپٹن مان کا شکریہ ادا کیا۔ مان گھبرایا ہوا تھا وہ تیزی سے پارکنگ سے باہر چلا گیا اور میں خیالوں کے ہجوم میں کھڑا لابی میں واپس آ گیا۔ مہاجر نمائندوں کو میں نے جلد ہی رخصت کیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری وین میں بم کس نے لگایا ہے میرے ظاہری دشمنوں میں بھارت سفارت خانہ اور ان کے حواری تھے اگر یہ کام ان کا تھا تو کیپٹن مان کو کیا ضرورت تھی کہ مجھے بچانے کیلئے آگے آتا۔ اگر یہ کسی دوسرے کی کارروائی تھی تو کیپٹن مان کو اس کی اطلاع کیسے ملی اس کا اپنے ہمراہ کٹروہ لانا بھی اس بات کی دلیل تھی کہ اسے سو فیصد یقین تھا کہ بم وین میں لگا ہوا ہے۔ اگر بم کی نوعیت اور ساخت کا اسے علم نہیں تھا تو یہ نام بم بھی ہو سکتا تھا جسے DEFUSE کرنے کیلئے بیچ کس کے علاوہ کئی ٹولز TOOLS کی ضرورت تھی۔ اس نے کافی شاپ میں یقینی طور پر کیسے کہا تھا کہ وین اشارت کرتے ہی بم پھٹ جائے گا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ بم پلانٹ کا واقعہ سازش در سازش ہے۔ میں نے تاروں کا گچھا نکالا۔ ڈبل تاریں دونوں طرف سے کٹی ہوئی تھیں بم کے ساتھ لگی تاریں تو کیپٹن مان نے میرے سامنے کاٹی تھیں لیکن وین کی کرنٹ والی تاروں کے ساتھ لگی۔ بم کی تاریں بھی کٹی ہوئی تھیں اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وین کی تاروں کے ساتھ بم کی تاروں کا کچھ حصہ ضرور لگا ہونا چاہئے۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے تاریں چیک کرنا اگلی صبح تک ملتوی کر دیا اور مریم کو فون پر کہا کہ آج وہ ہوٹل آجائے کیونکہ وین کے انجن میں کچھ خرابی ہے میں نے اس سے یہ بات اس لئے چھپائی کیونکہ میں اسے مزید سراسیمہ کرنا نہیں چاہتا تھا

اگلی صبح میں وین کو ایک سروس اسٹیشن پر لے گیا۔ وین سروس بھی کرائی اور لفٹ پر چڑھی وین کا اچھی طرح جائزہ بھی لیا۔ وین کا نچلا حصہ لوہے کی ایک بڑی چادر نے ڈھانپ رکھا اور سوائے ریڈی ایٹر کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا نہ ہی کوئی تار دکھائی دی۔ سروس کے دوران ہی میں نے انجن کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا کوئی ایسی تار دکھائی نہ دی جس سے بم والی تاروں کا کوئی ٹکڑا منسلک ہو۔ ساری گیم مجھے سمجھ میں آ گئی۔ کیپٹن مان بارودی سلاخیں نہیں بلکہ ان کی ڈمی ہمراہ لایا تھا جسے اس نے اسی طرح کوٹ کے جیب میں چھپایا ہوا تھا جسے واپسی پر لے گیا۔ وین کے نیچے گھس کر اس نے ڈمی نکالی اور باہر نکل کر مجھے دکھائی اور کوٹ کی جیب میں ڈال کر فریو چکر ہو گیا۔ یہ مجھے ہراساں کرنے کی ایک ناکام اور کمزور کوشش تھی۔ میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ انہیں سبق سکھانے کیلئے ان کی گاڑی میں اصلی دھماکہ کروں گا۔

اس واقعے کے تیسرے دن ہی کرنل آندو اور کیپٹن مان میرے پاس آئے۔ گوکہ کیپٹن مان نے مجھے بم کی بات صرف اپنے تک رکھنے کا کہا تھا لیکن کرنل آندو نے کافی شاپ میں بیٹھتے ہی کہا "آصف دیکھو تمہاری جان بچانے کیلئے میں نے اپنی ملازمت اور اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا۔ تم یقین نہیں کرو گے کہ جب ہم سفارت خانے کے غیر پنجابی لوگوں سے بات کرتے ہیں تو فخر یہ تمہارا ذکر کرتے ہیں کہ کیا ہوا جو آصف پاکستانی ہے لیکن اس نے اپنے جرات مندانہ کارناموں سے پنجابیوں کا نام روشن کر دیا ہے۔ پنجابی چاہے بارڈر کے دوسری جانب کا ہو یا ہماری طرف کا، جب کوئی کارنامہ انجام دیتا ہے تو ہمارا فخر سے اونچا ہو جاتا ہے" کرنل آندو نے اب باقاعدہ میری برین واشنگ شروع کر دی تھی۔ گزشتہ ملاقاتوں کے دوران میں زیادہ تر خاموش رہا اور اس کی باتیں سنتا رہتا تھا، میری خاموشی سے اس نے یقیناً یہ نتیجہ اخذ کیا ہوگا کہ اس کی گفتگو مجھ پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ بم کے ڈرامے کے بعد یہ اس کا اگلا قدم تھا کہ مجھ سے اپنی ہمدردی کی وجہ "پنجابی" ہونے کو بنائے، اور اسی طرح غیر محسوس طور پر میرے ذہن اور خیالات کو بدلے۔ ادھر میرے ذہن میں کبھی پاکستان سے ہٹ کر صوبائی یا لسانی بنیادوں پر سوچ کا سایہ تک نہ پڑا تھا۔ میری نگاہ میں پاکستان کی سرحدوں کے اندر کوئی اور لکیر نہیں تھی۔ ایک آندو تو کیا ہزاروں آندو بھی آجاتے اور میری برین واشنگ کرتے تو ان کی ساری کوشش مجھ پر سے اڑ کے بغیر یوں گزر جاتی جیسے بارش میں برساتی پر سے بارش کی بوندیں گزر جاتی ہیں۔ میں کرنل آندو اور کیپٹن مان کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا گیا تاکہ وہ پورے طور پر کھل کر میرے سامنے آجائیں۔

یونہی دن گزرتے جا رہے تھے کہ افغان ایئر کا جہاز پہلی پرواز کیلئے آ گیا۔ مریم اور میں جہاز پہنچنے سے پہلے ہی ہوائی اڈے پر پہنچ گئے تھے۔ ہوائی اڈے پر عجب گہما گہمی تھی۔ جانے والے مہاجروں کے چہروں سے خوشی اور مسرت پھوٹ رہی تھی۔ (جاری ہے)

غازی

انہیں رخصت کرنے والے اپنی حسرت و یاس کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ہم ایگریگیشن کے ساتھ ہی کھڑے کلیئر نس ملتے ہی انہیں خیریت سے پاکستان پہنچنے کی دعاؤں کے ساتھ روپوں کا لفافہ تھماتے جاتے۔ سفارتخانے کا نچلے درجے کا ایک ملازم بھی وہاں موجود تھا اور بڑی بیزارگی سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ افغان ایئر ان دنوں دنیا کی گھٹیا ترین ایئر لائنز میں شمار ہوتی تھی۔ ان پروازوں کیلئے UNO نے معقول معاوضے پر ان کے جہاز چارٹر کئے تھے۔ اس کے باوجود ان کے عملے کی فرعونیت عروج پر تھی۔ مہاجروں کے سامان کو وہ اس بے دردی سے اٹھا کر پھینکتے اور لے جانے سے انکار کر رہے تھے جیسے یہ پروازیں وہ مفت میں چلا رہے ہوں۔ دوسری طرف مہاجروں نے بھی احتجاج کر دی تھی۔ گھر کی جھاڑو تک وہ ساتھ لے جا رہے تھے۔ سامان انہوں نے اس طرح باندھا ہوا تھا جیسے جہاز پر نہیں کسی تیل گاڑی پر سفر کرنے والے ہوں۔ کسی دل جلے مہاجر نے جس کا نام شاید ان پروازوں میں شامل نہیں تھا، ایک کاغذ پر جلی حروف میں ”خوش رہو اہل وطن ہم تو SUFFER کرتے ہیں“ لکھ کر جہاز پر چسپاں کر دیا تھا۔ ان دنوں ہوائی اڈوں پر سیکورٹی کا نظام برائے نام ہی تھا۔ الوداع کہنے والے جہاز کے بہت قریب بلا روک ٹوک چلے جاتے تھے۔ جہاز کا عملہ محض زیادہ پروازوں کے بہانے UNO سے روپیہ بٹورنے کیلئے آدھی خالی سیٹوں کے ساتھ پرواز کرتا تھا جبکہ دوسری ایئر لائنز والے فل لوڈ کے ساتھ اڑتے تھے۔ شروع میں ہفتے میں اور بعد میں تین پروازیں شروع ہو گئیں۔ یہ سن 75ء کے اپریل کا مہینہ تھا۔ ایک طرف مہاجروں کی پاکستان روانگی شروع ہو چکی تھی۔ دوسری طرف ہر روز پانچ، دس نئے مہاجر کھٹمنڈو پہنچ رہے تھے۔ بنگلہ دیش سے نکلنے کے بعد کم و بیش تین سال کا عرصہ نامعلوم انہوں نے بھارت میں کیسے گزارا ہوگا اور یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس تمام عرصے میں بھارتی جاسوسی ایجنسیوں اور پولیس سے ان کا کبھی پالانہ پڑا اور کھٹمنڈو آتے ہوئے ایئر پورٹ پر چڑھتے ہوئے بھی CBI والوں کی نظر سے وہ بچ گئے۔ اتنے اتفاقات کسی ایک کے ساتھ پیش آنا تو ممکن ہو سکتے ہیں لیکن سب ہی کے ساتھ نہیں۔ ہر نئے مہاجر کی آمد پر شکوک و شبہات میں مزید اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پروازیں جاری تھیں کہ مجھے پاکستان سے آنے والی سرکاری ڈاک میں ایک ہدایت نامہ اور ایک شخص کی دو تصاویر ملیں۔ ہدایت نامے میں لکھا تھا کہ یہ شخص بہاری اور DMI کا تجربہ کار جاسوس ہے۔ اس نے جسمانی طور پر مسلمان دکھائی دینے کے تقاضے بھی پورے کر رکھے ہیں۔ دو خاصی خوبصورت اور پر بھی لکھی عورتیں جو تربیت یافتہ بہاری جاسوسہ ہیں، اس کے ہمراہ بحیثیت بیوی اور بیٹی کے ہم سفر ہوں گی۔ تمہارے متعلق تمام تفصیلات ان کو DMI نے مہیا کر دی ہیں۔ تمہیں دیکھتے ہی یہ تمہیں پہچان جائیں گے۔ بہاری جاسوس حلیہ بدلنے کا ماہر ہے اور کبھی کلین شیو، کبھی نقلی داڑھی لگا کر، کبھی پاجامہ قمیص اور کبھی تھری پیس سوٹ پہن کر نیاروپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی شکل و صورت نہ بالکل بہاری ہے اور نہ بنگالی اور نہ یہ پورا پنجابی یا پٹھان لگتا ہے۔ یہ تینوں عنقریب کھٹمنڈو پہنچنے والے ہیں۔ ہدایت نامے کے آخر میں لکھا تھا ”Give them a good treat“۔ ہمیشہ کی طرح میری واپسی کو بہت جلد کہہ کر مجھے ٹر خا دیا تھا۔ ”بہت جلد“ پڑھ کر مجھے اتنا غصہ آیا کہ ایک بار تو یہ سوچ بھی آئی کہ اب میں انہیں ٹر خا نہ شروع کروں لیکن اس سوچ کو اس خیال نے فوراً ہی ختم کر دیا کہ میں افراد کے مفاد کیلئے نہیں بلکہ وطن کی محبت اور آبرو کیلئے آگ کے سمندر میں کودتا تھا۔ خدا وطن کو قائم و دائم سلامت اور تابندہ رکھے، حکومتیں اور اچھے برے افراد تو آئی جانی چیزیں ہیں۔ ممکن ہے کھٹمنڈو میں مجھے مزید رکھنے کا فیصلہ کرنے والا کوئی ایسا شخص ہو جو میرے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نکالنا چاہتا ہو۔ وہ شخص چاہے میرے لئے کتنا ہی بے رحم کیوں نہ ہو لیکن اس کا یہ عمل بھی وطن کی محبت میں ہی ہے کیونکہ اسے مجھ سے کوئی ذاتی دشمنی تو ہے نہیں۔ میں نے بھی بھارت اور کھٹمنڈو میں خون کی جو ہولی کھیلی تھی وہ کسی سے ذاتی دشمنی کیلئے نہیں بلکہ وطن دشمنوں کے ساتھ کھیلی تھی۔ اپنے وطن کی محبت میں انسانی سوچ میں اگر ذرا سا بھی ذاتی مفاد شامل ہو جائے تو وہ وطن پرستی کو فعداری میں بدل دیتا ہے۔ وطن پرستوں کو اس وادی میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ میں نے مریم کو اس آنے والی نئی مثلث مصیبت کے بارے میں بتایا۔ چونکہ اس میں دو عورتیں بھی شامل تھیں۔ اس لئے مریم نے مجھ سے وعدہ لیا کہ اسے بھی کسی حد تک ان سے نمٹنے میں حصہ لینے دوں گا۔ میں نے یہ وعدہ محض اس حد تک کیا تھا کہ وہ کبھی بھاران سے الجھنے میں میرے ہمراہ رہے گی۔ ورنہ میں بخوبی جانتا تھا کہ DMI کا جو کارکن اس حد تک Committed ہو کہ اپنے دھرم کے خلاف مسلمان دکھائی دینے کیلئے جسمانی تبدیلی بھی مان جائے اور تجربہ کار اتنا ہو کہ ہر بہروپ دھار لے۔ اس کا جو شبلی لیکن سیدھی سادی مریم بھلا کیا مقابلہ کر سکے گی۔ غرضیکہ میں نے ان تینوں کے ”استقبال اور Good Treat“ کیلئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔ میں نے محسن اور نئے شادی شدہ لڑکوں کی ڈیوٹی لگادی کہ ہر نئے آنے والے مہاجر کے متعلق مجھے مکمل معلومات دیں۔ ادھر سفارت خانے میں سفیر صاحب کے ذریعے میں نے گزشتہ دو ماہ میں رجسٹر ہونے والے نئے مہاجروں کی مکمل لسٹ دوبارہ لے لی۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ جاسوس پہلے ہی کھٹمنڈو پہنچ چکے ہوں اور بحیثیت ایک کے یا علیحدہ علیحدہ طور پر رجسٹریشن بھی کروا چکے ہوں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بھارتیوں کی حیثیت سے کھٹمنڈو آچکے ہوں اور کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہوں کہ پاکستانی سفارت خانے میں رجسٹریشن کروا کر اور مٹھی گرم کر کے انہی پروازوں پر پاکستان چلے جائیں۔ ان کی منزل بہر طور پاکستان تھی اور کھٹمنڈو میں ان کا مہاجر بن کر قیام کرنا ان کے مفاد میں نہ تھا۔

میں نے پاکستان سے آنے والے ہدایت نامے کو کئی بار پڑھا اتنی مفصل ہدایات اور تینوں جاسوسوں کی تفصیلات اور تصاویر بھیجنے کا مطلب تھا کہ میرے محکمے کا رابطہ DMI کے کسی ایسے اہم رکن سے ہو چکا تھا جس نے انہیں اس قدر مفصل تفصیلات مہیا کی تھیں دوسری بات جو میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی کہ نارٹل پروسیجر کے مطابق یہ معلومات بھارت سے پاکستان پہنچی۔ اس کے Analysis (تجزیہ) ہونے اور پھر انہیں مجھ تک پہنچنے میں کم و بیش ایک ماہ لگا ہوگا دونوں تصویریں بھی اسٹوڈیو کی بنی ہوئی نہیں بلکہ چلتے پھرتے کھینچی گئی تھیں۔ ان تمام باتوں سے میں اس نتیجے میں پہنچا کہ بھارت میں ہمارے کسی گروپ کو یہ معلومات دینے والے کو خود اس کا علم ڈیڑھ ماہ قبل ہوا ہوگا۔ پاکستان جانے والی پروازیں چونکہ شروع ہو چکی تھیں اور ان تینوں جاسوسوں نے پروازوں کے اسی شیڈول (Schedule) میں پاکستان جانا تھا۔ سفارت خانے کی فائل لسٹ تیار ہو کر نوٹس بورڈ پر لگ چکی تھی اس لئے ان کے نام اس لسٹ میں ہونا چاہئیں۔ میں نے لسٹ کو کئی بار پڑھا لیکن کوئی مہاجر فیملی ایسی دکھائی نہ دی جو ایک مرد اور دو خواتین پر مشتمل ہو۔ میں صرف مفروضوں پر کام کر رہا تھا۔ لیکن اکثر مفروضے ہی حقیقت ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ کھٹمنڈو پہنچ چکے ہیں اور ان پروازوں پر نہیں جانا بھی ہے ان دو باتوں کو Base بنا کر میں نے امکانات پر سوچنا شروع کیا تو دو باتیں سامنے آئیں اول یہ کہ سفارت خانے کی فائل لسٹ میں کھٹمنڈو کے گرد نواح کے رہنے والے کئی مہاجر کنبے لیٹ ہونے کی وجہ سے شامل ہونے سے رہ گئے تھے اور ان کی جگہ پر دوسرے مہاجروں کو بھیجنے کے صوابدیدی اختیارات ہمارے سفارت خانے کو اور اسے مزید Shrink اور Definite کرتے ہوئے سفارت خانے کے کسی ایک شخص کے پاس تھے۔ لیکن وہ شخص بھی صرف رجسٹرڈ مہاجروں کو ہی بھیج سکتا تھا۔

(جاری ہے)

غازی

گزشتہ دو ماہ میں رجسٹر ہونے والے مہاجروں کی لسٹ کو بھی میں نے کئی بار پڑھا لیکن کوئی سراغ ہاتھ نہ لگا۔ اس عقدے کو حل کرنے میں کسی حد تک میرا ذاتی مفاد بھی تھا اپنے محکمے کی طرف سے کھٹنڈو میں مجھے پہلی بار ایک خاص مشن سونپا گیا تھا اور نہ ہمیشہ عام ہدایت ہی ملتی تھی۔ میں نے کھٹنڈو میں پاکستان کے مفاد میں اب تک جو کچھ بھی کیا تھا یہاں کے حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی صوابدید پر ہی کیا تھا اگر میں اس مشن کو کامیابی سے مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر پاکستان واپسی کیلئے میں اپنے محکمے کو زیادہ زور دے سکتا تھا۔

محسن اور لڑکے کھٹنڈو بھر میں پھیل گئے تھے لیکن انہیں بھی ناکامی ہوئی۔ ہر روز شام کو محسن مجھے آکر رپورٹ دیتا۔ انہوں نے سارے کھٹنڈو کو کھنگال ڈالا تھا۔ راجہ بازار کے علاوہ ڈھول کھولا، ہنومان ڈھوکا اور کشمیری مسجد کے گرد فوج کے تمام رہائشی علاقوں میں ان کو تلاش کیا۔ دیوی کی حویلی اور کاٹھ کے مندر کے پیچھے کی گلیوں میں بھی رہنے والوں کے کوائف لئے لیکن ہر جگہ انہیں ناکامی ہوئی۔ (ابھی ان کا آغاز تھا اور ہفتے میں صرف دو فلائٹس تھیں) دن کا بیشتر وقت اسی گھنٹی کو سلجھانے میں گزار دیتا۔ شام کو کرنل آندا اور کیپٹن مان کی برین واشنگ سے فیضیاب ہوتا ان کے جانے کے بعد محسن کی ناکامی کی رپورٹس سنتا اور پھر مریم کے گھر چلا جاتا اور دن بھر کی پریشانی اور دماغی بوجھ کو اس سے باتیں کر کے دور کرتا۔ مریم نے ریٹورنٹ کے کاؤنٹر پر بیٹھنے کے لئے ایک پڑھے لکھے نیپالی کا انتظام کر لیا تھا اور خود وہ دن بھر اردو سیکھنے اور پاکستانی رسم و رواج اور معاشرے میں خود کو ڈھالنے کی کوشش میں مصروف رہتی۔ اس کی اردو دانی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر شام وہ مجھے اردو کے نئے سیکھے ہوئے فقرے سناتی۔ مجھے ملتے وقت السلام علیکم کہتی کئی بار اس نے دایاں ہاتھ ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے سلام بھی کیا۔ انہی دنوں ایک شام جب میں اس کے گھر گیا تو اس نے ہاتھ ماتھے تک لے جاتے ہوئے مجھے آداب کیا اور انک کر بولی "قدم رنج فرمائیے" میں نے اسے اتنی جلد اردو سیکھنے پر داد دی اور کہا کہ اگر تمہارے شوق کا یہی عالم رہا تو پاکستان جا کر تم خود کو اجنبی ہرگز محسوس نہیں کرو گی۔ مریم کے ساتھ میں باتیں تو کر رہا تھا لیکن میرے دماغ کے ایک گوشے میں یہ سوال کلبلانے لگا کہ ہماری مہاجر تو ایسی سلیس اور لکھنؤی انداز کی اردو نہیں بولتے ان کی اردو کا ایک اپنا ہی انداز ہوتا ہے اور گزشتہ اٹھائیس سالوں میں انہوں نے 24 سال مشرقی پاکستان میں بنگالیوں کے ساتھ گزارے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی اردو پر بنگالی رنگ بھی چھا چکا ہے۔ پھر مریم کسی بہاری خاتون سے اتنی سلیس اردو کیسے سیکھ رہی ہے۔ میں نے مریم سے پوچھا کہ اس کی ٹیوٹر کی عمر کیا ہے اس نے بتایا کہ اکیس بائیس سال ہو گی میں حیران تھا کہ جو لڑکی مشرقی پاکستان میں پیدا ہوئی اور جس کے گھر میں بھی بہاری اور بنگالی ملی جلی اردو بولی جاتی ہوئی وہ کیسے اتنی صحیح اردو بول سکتی ہے میں نے مریم سے پوچھا کہ اس کا رنگ اور قد کاٹھ کیسا ہے؟ میرے اس سوال پر مریم نے کچھ اور ہی سمجھا اور مجھ سے سوال کرنے لگی کہ تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو تمہیں اس لڑکی سے کیا دلچسپی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ میری اس لڑکی سے جسے میں نے دیکھا تک نہیں، کوئی بھی ذاتی دلچسپی نہیں صرف ایک شک سا ہے جسے میں دور کرنا چاہتا ہوں میری طرف سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد مریم نے بتایا کہ اس کا رنگ صاف اور قد نارمل ہے۔ "نارمل سے تمہاری مراد یہاں کی بہادی خواتین جیسا" میں نے پوچھا "نہیں ان سے تو وہ خاصی لمبی ہے" مریم نے جواب دیا۔ "پندرہ بیس روز پہلے ہی میں نے اس سے ٹیوشن لینا شروع کی ہے۔ وہ خود ہمارے ریٹورنٹ میں ملازمت تلاش کرنے آئی تھی۔ انگریزی بھی وہ بہت اچھی بولتی ہے۔ بڑے دکھ چھیل کر وہ اپنی ماں کے ساتھ یہاں گزشتہ ماہ ہی پہنچی ہے۔ اس کی ماں بھی دو بار اس کے ہمراہ ہمارے گھر آئی ہے وہ بھی قد آرا اور صاف رنگ کی ہے۔ یہ دونوں ماں بیٹی بہت ہی اچھی ہیں۔ ماں بھی بہت عمدہ انگریزی اور اردو بولتی ہے لیکن تم تفصیلات کیوں جاننا چاہتے ہو؟" مریم کے دل میں شکوک نے پھر سر ابھارا۔ میں نے مریم کو سمجھایا کہ ایک محکمہ گتھی کو میں کئی روز سے سلجھانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن کوئی سراہا تھا آتا ہی نہیں۔ ممکن ہے یہ محض میرا وہم ہو لیکن کل صبح تمہاری ٹیوشن کے دوران آؤں گا اور سیدھا اسی کمرے میں گھس آؤں گا جہاں تم ٹیوشن پڑھتی ہو تم اس سے میرا تعارف اپنے منگیتر کے طور پر کروانا۔ اس سے تمہاری بھی تسلی ہو جائے گی کہ میرے ارادے نیک ہیں میں اس سے بے ضرر سے چند سوال کروں گا۔ اس دوران تم بالکل خاموش رہنا تم اپنا ٹیپ ریکارڈ اسی کمرے میں چھپا کر رکھنا اور اس کا مائیک ایسی جگہ پر اوٹ میں رکھنا کہ اسے معلوم نہ ہو میرے آتے ہی تم ٹیپ چلا دینا" لیکن وہ تو پورا رقعہ پہنتی ہے اور پردہ کرتی ہے۔ تمہارے سامنے وہ کیسے آئے گی۔" مریم نے پوچھا۔ "دیکھو مریم جیسے کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ ممکن ہے یہ محض میرا وہم ہو لیکن دوسری صورت میں یہ ایک بہت تجربہ کار بھارتی جاسوسی کے گینگ کی اہم رکن بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے اس گینگ کی اطلاع کئی روز پہلے ہی پاکستان سے موصول ہو چکی ہے۔ محسن اور اس کے ساتھ اس گینگ کی تلاش میں ہر روز صبح سے شام تک سارے کھٹنڈو کی بے سود خاک چھان رہے ہیں اور میرا دماغ ان کے متعلق سوچتے سوچتے پک چکا ہے اگر یہ محض میرا شک ثابت ہو تو میں تمہارے سامنے اس لڑکی سے اس کی بے پردگی کیلئے معافی مانگ لوں گا اور اگر وہ میرے شک کے مطابق جاسوسہ نکلی تو پھر بے پردگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ وہ مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہے۔ میری دوسری بات بھی غور سے سنو آئندہ نتو اس کے ہاتھ سے کوئی چیز لینا اور نہ ہی اس کی لائی ہوئی کوئی چیز بھی کھانا پینا اور چاہے کچھ بھی ہو جائے اس کے ہمراہ کبھی بھی گھر سے باہر نہ جانا۔" میں نے مریم کو اسی سلسلے میں کچھ مزید ہدایات بھی دیں۔ جب میں نے مریم کو بتایا کہ میرے خیال میں یہ لڑکی جاسوسی کی تکنوں کا ایک خط ہے جس کے متعلق میں نے اسے کچھ دن پہلے ہی بتایا تھا اور اس نے خود اس میں حصہ لینے کا مجھ سے وعدہ کیا تھا تو مریم فوری ہی ریڈارٹ ہو گئی۔ مریم کے گھر سے واپسی پر میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ واقعی جاسوسہ ثابت ہوئی تو چراغ تلے اندھیرا کے مصداق یہ تو مریم یعنی میری منگیتر کے گھر تک پہنچ چکی تھی جبکہ ہم کھٹنڈو میں ایک ایک دروازہ کھٹکھٹا کر اور ہر پتھر اٹھا کر اسے تلاش کر رہے تھے۔

رات کو سونے سے پہلے میں نے اگلے روز ٹیوٹر لڑکی سے ملنے کے پروگرام کو آخری شکل دیدی۔ چونکہ یہاں پر معاملہ ایک لڑکی کا تھا اور محض اپنے شک کی بنا پر میں نے اس کی اصلیت جاننے کیلئے پوچھ گچھ کرنی تھی اس سے دوبارہ ملنا مشکل دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں صورتوں میں میری تفتیش کے نتیجے میں مریم کو ٹیوشن دینا بند کر دینی تھی۔ اس لئے میں نے RAPID AND SEVERE (تیز اور شدید) ایکشن لینے کا فیصلہ کیا۔ اس ایکشن کے دوران اگر وہ اصلیت اگل دیتی تو ٹھیک ورنہ مجھے دوسرا موقع ملنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔ اگلی میں میں اپنے چینی ساتھیوں کے ہمراہ پہلے بازار گیا اور تھری زیرو کی بال کاٹنے کی مشین، ایک بڑی تیز قینچی، ایک داڑھی بنانے کا اسٹرا اور درمیانی سائز کی دوخالی شیشیاں خریدیں جن میں سادہ پانی بھر لیا۔ ایک وسل (سیٹی) بھی خریدی۔ اپنے پلان کے مطابق پوری تیاری اور ساز و سامان کے ساتھ ہم مریم کے گھر کی طرف روانہ ہوئے میں نے چینی دوستوں کو سمجھا دیا کہ وہ گھر کے باہر کھڑے رہیں اور سیٹی کی آواز سنتے ہی ڈرائنگ روم میں چلے آئیں۔ پھر جو کچھ میں سمجھا سکوں یا جیسے مریم کہے۔ اس پر فوری عمل کریں۔

میں بغیر اطلاع کے مریم کے ڈرائنگ روم میں چلا گیا مریم اپنی ٹیوٹر سے اردو سیکھ رہی تھی۔

(جاری ہے)

غازی

رومن رسم الخط میں وہ عام بول چال کے اردو فقروں اور ان فقروں کا انگلش میں ترجمہ لکھتی اور مریم کا اردو تلفظ ٹھیک کر رہی تھی۔ جب تک وہ میری آمد کو محسوس کرتی، میں اس کے سر پر جا کھڑا ہوا تھا۔ مجھے یوں اچانک اپنے اتنے قریب دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور ڈوپٹے سے اپنے چہرے کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”میں پردہ دار ہوں“

میں نے بڑے سکون اور دھیمے لہجے میں کہا ”دیکھو تمہارا پردہ تو اب باقی نہیں رہا کیونکہ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے اور میں مریم کا مگنٹر بھی ہوں جسے تم پڑھاتی ہو میں تم سے بہت متاثر ہوں کہ تم نے مریم کو اردو زبان اور اسلامی کلچر سکھانے میں خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ بہاری مہاجر ہوتے ہوئے بھی تم اتنی فصیح اور لکھنوی انداز میں اردو اور وہاں کا مخصوص اسلامی کلچر کیسے سیکھا“ لڑکی نے بھرپور نظروں سے مجھے دیکھا جیسے مجھے تول رہی ہو کہ میں کتنے پانی میں ہوں اور بولی ”میرے والدین دہلی میں پھانک جس خاں میں رہے تھے۔ پارٹیشن کے وقت دہلی میں فساد شروع ہوئے تو میرے والدین نے پاکستان ہجرت کرنے کا سوچا۔ میری والدہ کی ایک بہت گہری سہیلی نے انہیں مشورہ دیا کہ مغربی پاکستان کے بجائے ہم مشرقی پاکستان ہجرت کر جائیں۔ میری والدہ کی سہیلی کا نام آمنہ تھا اور ان کی شادی چٹاگانگ میں تعینات چٹاگانگ پورٹ کے ایک افسر سے ہوئی تھی جو خود بھی علی گڑھ کے رہنے والے تھے میرے والدین ہجرت کر کے چٹاگانگ میں آن بسے اور والد نے وہیں پر آمنہ آنٹی کے شوہر ایس ایم معروف کی مدد سے پورٹ پر مزدوروں کے ٹھیکے وغیرہ لینے شروع کر دیئے۔ معروف صاحب کا عہدہ بڑھتا گیا اور وہ چٹاگانگ پورٹ کے جنرل منیجر بن گئے۔ اس دوران آمنہ آنٹی کی دو چھوٹی بہنیں رضیہ آ پا اور افسر باجی بھی چٹاگانگ آ گئیں۔ جہاں ان کی شادیاں دہلی کے مہاجر بنگلی گھر کے ایک اعلیٰ افسر اور مرچنٹ نیوی کے ایک انجینئر سے ہو گئیں۔ میں چٹاگانگ میں ہی پیدا ہوئی اور وہیں بی اے کیا۔ میرے والد کا چٹاگانگ میں ہی انتقال ہو گیا تھا اور میری والدہ بالکل تنہا رہ گئے لیکن معروف صاحب آمنہ آنٹی اور ان کی بہنوں نے ہماری اس حد تک خبر گیری کی کہ ہمیں کبھی بھی مالی پریشانی کا احساس نہ ہونے دیا۔ 71ء کے اوائل میں جب مشرقی پاکستان میں فساد پھوٹ پڑے تو ہم نے معروف صاحب کے گھر میں ہی پناہ لی۔ معروف صاحب چونکہ سرکاری افسر تھے اس لئے انہوں نے اپنا اور رضیہ آ پا کے شوہر کا تبادلہ مغربی پاکستان میں کروا لیا۔ افسر باجی شادی کے بعد پہلے ہی مغربی پاکستان جا چکی تھی۔ ہم ماں بیٹی نے سوچا کہ دہلی چلے جائیں جہاں میرے دھیال اور نیمہال تھے۔ اب تک تو ہم دہلی میں رہے لیکن آخر کب تک خوف و ہراس کی اس زندگی بسر کرتے۔ ہم نے پاکستان آنا چاہا تو معلوم ہوا کہ جب تک کھمبندو کے پاکستانی سفارتخانے میں رجسٹریشن نہ ہو ہمیں پاکستانی پاسپورٹ نہیں مل سکتا اس لئے ہم ماں بیٹی یہاں آ گئے۔ مالی طور پر ہم اپرٹل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ میری والدہ اور والدہ کے رشتہ داروں نے بھی چلتے وقت ہمیں خاصے پیسے دیئے۔ یہاں ایک متمول کشمیری فیملی نے ہمیں اپنے گھر میں رہائش کیلئے ایک کمرہ دے دیا ہے مہاجروں کی فری ہوئی سفر کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے ہم نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنے ٹکٹ خرید کر تھائی ایئر لائنز یا رائل ایئر لائنز سے پاکستان جائیں۔ ہماری ابھی تک سفارتخانے میں رجسٹریشن نہیں ہوئی ہے۔ کشمیری خاندان کے سربراہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بہت جلد ہماری رجسٹریشن کروا کر ہمیں پاکستانی ONE WAY پاسپورٹ دلوا دیں گے اور پھر ہم پاکستان چلے جائیں گے یہاں بیکار رہنے کے بجائے میں نے سوچا کہ کچھ کام ہی کر لیا جائے اسی کوشش میں اس ریستورنٹ میں آئی اور آپ کی مگنٹر کو ٹیوشن پڑھانے لگ گئی۔“

اسے حسن اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ زندگی میں اپنی پہلی ملازمت کے دوران چٹاگانگ میں معروف فیملی سے بہت اچھی طرح نہ صرف واقف ہی تھا بلکہ مجھے ان کے گھر کے ایک ممبر حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اس وقت معروف صاحب چٹاگانگ پورٹ کے ڈپٹی جنرل منیجر تھے ان کے بیگم کا نام آمنہ تھا اور ان کی منجھلی سالی رضیہ چٹاگانگ میں ہی ایک الیکٹریکل انجینئر سے بیاہی ہوئی تھی اور سب سے چھوٹی سالی افسر بھی انہیں کے ساتھ رہتی تھی اور ان دنوں اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اتنے بھرپور تعارف اور رفرنس کے بعد جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا تھا میرے لئے اس لڑکی کو اپنے ذہن میں بالکل CLEAR کر دیا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ناحق ایک پردہ دار لڑکی کو بے پردہ کیا اور اس سے بے جا سوال پوچھے ماحول کی تلخی کو کم کرنے کیلئے میں نے سب کیلئے کافی بنانے کا کہا۔ مریم کافی بنانے چلی گئی تو بغیر کسی مقصد کے محض اس یتیم لڑکی کے خوف کو دور کرنے کیلئے میں نے اس سے پوچھا کہ معروف فیملی میں تمہارے بقول شروع میں صرف افسر ہی غیر شادی شدہ تھی اور اگر چہ تم عمر میں اس سے چھوٹی تھیں لیکن وہی تمہارے زیادہ قریب رہی ہوگی۔ لڑکی نے بتایا کہ ”جی ہاں افسر باجی مجھے بہت پیار کرتی تھیں“ تو تم نے وہی اسکول جو ان کا کیا جس میں افسر پڑھتی تھی؟“ میں نے سوال کیا، ”جی ہاں، وہ نویں جماعت میں تھیں اور انہوں نے خود مجھے اپنے اسکول میں داخلہ دلویا تھا۔“

لڑکی نے پر اعتماد سے جواب دیا۔ ”تم نے بتایا ہے کہ افسر نے تمہیں جس اسکول میں داخلہ دلویا وہاں وہ خود بھی پڑھتی تھی اور تمہارے بہت قریب بھی تھی۔ تم سے پیار بھی بہت کرتی تھی یہ تو بتاؤ کہ افسر میں کون سی ایسی بات تھی جو اسے دوسروں سے نمایاں کرتی تھی۔“ لڑکی میرا یہ سوال سن کر گھبرا گئی اور کہنے لگی کہ آپ مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ صرف وقت گزاری کیلئے۔ اتفاق سے میں بھی معروف فیملی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے ان کے متعلق بالکل صحیح بتایا ہے۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ افسر نے اسکول اسپورٹس میں حصہ لینے کے لئے اپنے بال بالکل مردانہ انداز میں کٹوائے تھے؟ کیوں یاد ہے نا۔ ”جی ہاں بالکل یاد ہے بلکہ معروف صاحب نے اس حرکت پر افسر باجی کو بہت ڈانٹا بھی تھا۔“ لڑکی یہ جواب دیتے ہوئے اپنا لیڈ بیک اٹھانے کے لئے میز کی طرف بڑھی۔ میں اس کی ایک حرکت دیکھ رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ اپنا بیک اٹھائے میں لڑکی پر جھپٹا اور اسے دھکا دے کر اس کا بیک اٹھالیا۔ ساتھ ہی میں نے سیٹی بجائی۔ دونوں چینی دوست بھاگتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ اسی اثنا میں مریم بھی کافی کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔

غازی

میں نے مریم کو کہا کہ چینی دوستوں کو کہے کہ پوری طرح اس لڑکی کو اپنی گرفت میں لے لیں۔ مریم میں یہ بری عادت نہیں تھی کہ پہلے سوال جواب کر کے اپنی تسلی کرے اور پھر اگلا قدم اٹھائے۔ میں نے جو کچھ مریم کو انگریزی میں کہا۔ اس نے فوری طور پر چینی دوستوں کو کہہ دیا۔ دونوں چینی آگے بڑھے تو اس لڑکی نے اچانک اپنے پاؤں سے جوڑو کا ایک چینی دوست کے چہرے پر ایسا سخت وار کیا کہ وہ وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اب یہ لڑکی میرے اور دوسرے چینی دوست کے درمیان تھی اور جوڑو کراٹے کے پینترے بدل بدل کر ہم دونوں کو بیک وقت اپنی زد پر لئے ہوئے تھی مجھے اس کا بیگ کھولنے کا بھی ابھی تک موقع نہیں ملا تھا۔ میں لڑکی کی گھومتی ہوئی ٹانگ کے وار سے بچنا چاہتا تھا۔ جونہی اس کا دھیان اور رخ چینی ساتھی کی طرف ہوا۔ میں لڑکی کی طرف بڑھا۔ وہ مجھ سے غافل نہیں تھی۔ اس نے مجھے ہٹ کرنے کیلئے سیدھی ٹانگ اٹھائی۔ جسے میں نے اپنے جسم کو لگنے سے پہلے ہی پنڈلی سے پکڑ لیا۔ یہاں میرا لمبا قد اور اسی حساب سے بازوؤں کی لمبائی کام آئی۔ ورنہ اس کی ضرب اتنی شدید تھی کہ چینی دوست ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ پکڑی ہی تھی کہ دوسرے چینی دوست نے پیچھے سے اسے بازوؤں سے دبوچ لیا۔ بے بس ہو کر وہ قالین پر گر تو گئی لیکن ہم دو مضبوط مردوں کی گرفت بھی اس پر ہلکی پڑ رہی تھی اور وہ مچھلی کی طرح تڑپتی ہوئی خود کو آزاد کرانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ میں نے مریم کو رسی اور کپڑا لانے کا کہا تا کہ اسے باندھ دیا جائے۔ ہم نے اس کی پشت پر ہاتھ باندھے اور ٹانگیں باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تا کہ اس کا چلانا بند ہو۔ چینی دوست تو اپنے ساتھی کو ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگا۔ مریم میرے قریب آئی۔ میں نے لڑکی کا بیگ کھولا تو اس میں سے میک اپ کے سامان اور کچھ نیپالی کرنسی کے علاوہ 25 یورو کا لوڈ پمفل نکلا۔

DMI نے مکمل ٹریننگ کے بعد ایک بھرپور اور چیلنج نہ ہونے والی کورسٹوری کے ساتھ اس لڑکی اور اس کے ساتھیوں (جن کا تذکرہ بعد میں آئے گا) کو پاکستان بھیجنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ میں بھی اس کی کورسٹوری سے بالکل مطمئن ہو گیا تھا۔ بعد کے سوال میں نے محض POST SCRIPT کے طور پر پوچھے تھے۔ جن کا جواب دینے میں وہ مار کھا گئی۔ معروف کی سالی افسر کے بال اس کی آدھی پنڈلیوں تک آتے تھے۔ اس کے بال اس قدر لمبے اور گھنے تھے کہ وہ اپنے بال خود نہیں دھو سکتی تھی بلکہ دو بنگالی ملازمین اس کے بال دھوتی تھیں۔ وہ کبھی بھی چٹا گانگ میں نہیں پڑھی بلکہ دہلی سے ایف اے کرنے کے بعد چٹا گانگ آئی تھی۔ شادی کے بعد وہ کراچی آئی اور یہاں بھی ہماری اکثر ملاقاتیں ہوئیں۔ اس کے بال اسی طرح لمبے اور گھنے تھے اور اتنے عجوبہ روزگار اور خوبصورت بالوں کو کٹوانے کا وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

یہ تو محض اتفاق تھا کہ میں معروف فیملی کو اچھی طرح اور ذاتی طور پر جانتا تھا۔ ورنہ اتنی مکمل اور ٹھوس Cover Story کے ساتھ بھارتی جاسوسوں کا یہ گروپ پاکستان جانے والا تھا کہ کوئی بھی ان پر کسی قسم کا شک نہ کرتا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا جس میں اس لڑکی (مریم نے اس کا نام جہیں بتایا تھا جو کہ غلط تھا) سے کچھ اگلا سکتا۔ اس کے بیگ سے پمفل کے ملنے سے اگر اس کے جاسوسہ ہونے میں اگر برائے نام بھی کوئی شک تھا تو وہ دور ہو چکا تھا۔ چینی دوست کو جہیں نے ایسی سخت ضرب لگائی تھی کہ گو وہ اب ہوش میں تو آچکا تھا لیکن بار بار اپنا سر سہلانا اور چینی زبان میں نہ جانے کیا انا ب شناب کہے جا رہے تھے۔ میں نے دوسرے چینی دوست سے بال کاٹنے کی مشین استرا، قینچی اور پانی بھری شیشیاں لے کر جہیں کے سامنے میز پر رکھ دیں اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہاں: تمہاری بد قسمتی یہ ہے کہ تم اپنی گیم شروع کرنے سے پہلے ہی پکڑی گئیں اور خوش قسمتی یہ تھی کہ پکڑنے والا ایک مسلمان ہے۔ تمہارے اور تمہاری نقلی ماں اور تمہارے ساتھی مرد جس نے تمہارے باپ کا رول ادا کرنا تھا کے متعلق ہمیں بھارت سے تمہاری روانگی سے قبل ہی مکمل اطلاع مل چکی تھی۔ مریم کو جب تم نے پڑھانا شروع کیا اس سے پہلے ہی ہم تمہاری اور تمہارے دونوں ساتھیوں کی مکمل نگرانی کر رہے تھے۔ یہ تصویریں دیکھو۔ یہ تمہارے گروپ لیڈر کی ہیں۔ تم جوان ہو، خوب صورت ہو، اگر ہماری جگہ کوئی غیر مسلم ہوتا تو وہ سب سے پہلے تمہاری جوانی سے کھیلتے اور پھر تم سے پوچھ گچھ کرتے۔ تمہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تمہیں اس کے لئے تیار کر کے بھیجا گیا ہے لیکن ہمارے مذہبی اصولوں کے خلاف ہے۔ لیکن ایک جاسوس کا ہم جو شکر کرتے ہیں۔ شاید اس کے متعلق نہیں بتایا گیا ورنہ تم کبھی پاکستان کے خلاف جاسوس بننے کا سوچتی تک نہیں۔ اگرچہ تمہارے متعلق سب کچھ جانتے ہیں لیکن تمہاری زبان سے سب کچھ سننے کیلئے ہمارا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ پہلے ہم تمہارے بال کاٹیں گے۔ پھر تمہارے سر پر مشین چلا کر تمہیں رہے رہے بالوں سے بھی آزاد کر دیں گے۔ اگر پھر بھی تم نے سچ نہ بتایا تو اس استرے سے تمہاری ناک کاٹیں گے اور پھر ان شیشیوں میں بھرے تیزاب سے تمہارے چہرے کو اتنا بھیا تک بنا دیں گے کہ تم کبھی آئینہ دیکھنے کی ہمت تک نہ کر سکو گے۔ اگر پھر بھی تم نے ہمیں کچھ نہ بتایا تو ہم ہار مان کر تمہیں چھوڑ دیں گے لیکن چھوڑنے سے پہلے میرے چینی ساتھی تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ دیں گے۔ تاکہ تم آئندہ کبھی کسی پر اپنے جوڑو کی کلک آزمانہ سکوں۔

میں نے یہ تمام باتیں نفسیاتی طور پر اسے توڑنے اور مزاحمت نہ کرنے کے لئے کہیں تھیں۔ عورت کے لئے سب سے زیادہ قیمتی شے اس کا حسن ہوتا ہے۔ سوائے پاکباز عورتوں کے اس قماش کی عورتیں خوبصورت دکھائی دینے اور اپنے حسن کو برقرار رکھنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوتی ہیں۔ میں نے مریم کے ذریعے چینی ساتھیوں کو ہا کہ اس لڑکی کے ہاتھ پاؤں دوبارہ کس کے اچھی طرح باندھ دیں تاکہ جب ہم اپنا کام شروع کریں تو یہ حرکت نہ کر سکے۔ میں نے یہ بات بھی محض اس نفسیاتی طور پر توڑنے کے لئے کہی تھی تاکہ وہ ہمارے عزائم کو صحیح سمجھ کر مدافعت چھوڑ دے۔ چینی دوستوں نے اس کے ہاتھ پاؤں دوبارہ کس کر باندھ دیئے اور میرے اشارے پر اسے بازوؤں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔ میں نے قینچی اٹھائی اور 6 انچ کے قریب اس کے بال کاٹ کر اس کے سامنے پھینک دیئے۔ لڑکی کا منہ کپڑے سے بند تھا۔ وہ بول تو نہیں سکتی تھی، غموں غموں کرنے لگی۔ میں نے مزید تین چار انچ لمبے اس کے بال کاٹے اور وہ بھی اس کے سامنے پھینک دیئے۔ لڑکی کی غموں غموں اور بڑھ گئی۔ اب میں نے بال کاٹنے کی مشین اٹھائی جو اس لڑکی کے سامنے میز پر پڑی تھی۔ میں نے ظاہر امریم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”مریم اس طرح تو خونخوار وقت ضائع ہو رہا ہے۔ میرے ہاتھ میں مشین دیکھ کر خوف سے لڑکی کی آنکھیں پھیل گئیں اس نے زور زور سے اپنا سر ہلانا شروع کیا۔ میں نے اس سے پوچھا ”بولنا چاہتی ہو؟“ اس نے سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا میں نے مشین رکھ دی استرا اٹھایا اور مریم کو کہا کہ چینی دوستوں کو کہے کہ اگر اس لڑکی نے سچ نہ بولا تو میرا اشارہ کرتے ہی اس کا ایک کان کاٹ دیں۔ یہ کہہ کر میں نے لڑکی کے منہ سے کپڑا نکالتے ہوئے کہا کہ بالکل مدھم آواز میں بولے۔ لڑکی کی دہشت سے جو حالت ہو رہی تھی وہ ناقابل بیان ہے۔ منہ سے کپڑا نکلتے ہی وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھ پر رحم کریں میں آپ کو سب کچھ بالکل سچ بتاؤں گی لیکن بھگوان کے لئے مجھ پر یہ ظلم نہ کریں، اس کے اس فقرے سے یہ تصدیق تو ہوگی کہ وہ غیر مسلم ہے۔“ یہ تو اب تم پر منحصر ہے کہ سب حقیقت بتا کر خود کو بچا لو ورنہ ہمیں مجبوراً اگلا قدم اٹھانا پڑے گا“ میں نے یہ کہہ کر لڑکی کو کہا کہ اب بولنا شروع کرو اور بولتے وقت اپنی زبان میں یہ ضرور یاد رکھنا کہ تمہاری اصلیت سے ہم اچھی طرح واقف ہیں اور جونہی تم نے غلط بیانی سے کام لیا، میرے ایک اشارے پر تمہارا ایک کان تمہارے کٹے ہوئے بالوں پر پڑا ہوگا۔ لڑکی نے بولنا شروع کیا، میں دہلی کی رہنے والی ہوں، بنگلہ دیش کبھی نہیں گئی۔ اسکول کے زمانے سے ہی مجھے مسلمانوں سے اس لئے نفرت ہو گئی تھی کیونکہ آوارہ قسم کے مسلمان لڑکے اسکول آتے جاتے مجھے اور میری سہیلیوں کو تنگ کرتے اور فحش کلامی کرتے تھے۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ لڑکے مسلمان تھے؟“ میں نے پوچھا ”وہ مسلمان ناموں سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے تھے۔ ہم نے جب اپنی ہیڈ ماسٹریس سے شکایت کی تو اس نے شیو سینا والوں کو بتایا اور اس تنظیم کا ایک مارشل آرٹ کا ماہر ہمیں تربیت دینے اور غنڈوں سے مقابلہ کرنے کی تدبیریں سکھانے کے لئے ہر روز ہمارے اسکول آنے لگ گیا۔“

غازی

میں نے 6 سال یہ تربیت اسکول اور کالج میں حاصل کی۔ مجھ میں خاصی خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی میں نے اس دوران کئی آوارہ اور غنڈے لڑکوں کی ایسی پٹائی کی کہ وہ دوبارہ دکھائی نہ دیئے۔ ذہنی طور پر میں شیو سینا اور آریہ ویدک کو اپنا سرپرست سمجھنے لگی۔ میں کالج میں ابھی پڑھ رہی تھی کہ شیو سینا کی میٹنگز میں باقاعدگی سے جانے لگی اور جلد ہی اس تنظیم کی باقاعدہ ممبر بن گئی۔ میرے شوق اور جذبے کو دیکھتے ہوئے شیو سینا کے اس مخصوص گروپ میں مجھے شامل کر لیا گیا جس کی میٹنگز میں ہمیں اسلحہ چلانے اور جاسوسی کی تربیت دی جاتی تھی۔ میرے پتا کا دیہانت ہو چکا تھا اور میری ماما ایک آرٹ اسکول میں ٹیچر تھیں۔ ابتدائی تربیت کے بعد ہمیں دہلی کے نواح میں ایک فوجی کیمپ میں ایڈوانس تربیت کے لئے جانا پڑا جس میں فوجی افسران ہم سے اسلحہ چلانے کی مشق کراتے اور جاسوسی کے داؤ پیچ سکھاتے تھے۔ تربیت کے لئے مخصوص کمروں میں دیواروں پر ایسے نقشے لگے ہوتے تھے جن میں بھارت کے علاوہ برما، مشرقی اور مغربی پاکستان اور افغانستان بھی شامل تھے۔ بھارت کو چھوڑ کر باقی ملکوں پر سرخ لیکریں کھینچی ہوتی تھیں اور ہمیں بتایا جاتا تھا کہ اصل بھارت میں یہ سب ملک شامل تھے اور مہاراجہ اشوک کی حکومت برما سے افغانستان کی آخری حدوں تک تھی اب ہمیں یہ تمام علاقے اگنڈ بھارت میں شامل کرنے ہیں۔ اسی دوران تربیت دینے والے ایک کیمپن سے میرے تعلقات آخری حدوں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ میں نے جب کیمپن کو شادی پر زور دیا تو ایک دن اس کے کرنل نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا کہ جسمانی لذت سے بڑھ کر ایک لذت اور بھی ہے اور وہ ہے کہ اپنے پرکھوں کی جنم بھومی کو غاصبوں سے آزاد کرانے کی کوشش۔ اس سے تمہارے پرکھوں کی آتما اور تمہارے من کو شانتی ملے گی۔ ہم تمہیں اس مقصد کے لئے ایک مشن پر پاکستان بھیجیں گے اور وہاں سے واپسی پر تمہاری شادی اس کیمپن سے کروانے کی ذمہ داری میں لیتا ہوں۔ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے تمہیں اپنے دماغ کے علاوہ اپنے شری (جسم) کو بھی بھینٹ کرنا پڑے گا لیکن وطن کی سیوا میں شری کی بھینٹ دینے کے باوجود تم ہمارے لئے پوتر اور سستی ساوتری ہوگی۔ اگر تمہیں ہماری بات منظور ہے تو ہم تمہاری ماما کو یہ کہیں گے کہ حکومت تمہیں برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیج رہی ہے۔ میں نے یہ بات مان لی تو مجھے ایک برس مزید تربیت اور پاکستان کے متعلق کتابوں، فلموں اور سلائیڈوں اور لیکچروں سے اس قدر جانکاری دی گئی کہ اب میں بھارت سے کہیں زیادہ پاکستان کے متعلق جانتی ہوں۔ دو ماہ پہلے مجھے ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایک عورت سے ملوایا گیا۔ پاکستان میں ہمیں ایک گروپ کی صورت میں کام کرنے کے لئے انہوں نے میرے ماما بتا بن کر رہنا تھا۔ کھٹنڈو میں ہم اکٹھے آئے ہیں ”ماما“ کے ساتھ کشمیری خاندان میں رہتی ہوں۔ اور میرے ”پتا“ ایک علیحدہ فلیٹ میں رہتے ہیں کھٹنڈو میں مجھے اپنی عملی کارکردگی دکھانے کے لئے مریم تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ میرے ”پتا اور ماما“ کو بھی آپ سے علیحدہ علیحدہ ملنے کا کام سونپا گیا تھا۔ یہاں ہم سب کے ذمے یہ کام تھا کہ کسی صورت بھی آپ کو یا مریم کو اعتماد میں لے کر بھارتی یا بنگلہ دیشی سفارت خانے کے اندر لے جائیں اگر میں آج پکڑی نہ جاتی تو دو تین روز تک میں مریم کے ساتھ اس کی گاڑی میں ان دونوں سفارت خانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے پستول کی نوک پر یا جوڑو کے وار سے اسے بے ہوش کر کے سفارت خانے کے اندر لے جاتی۔ میں سائیکل سے ٹک تک چلانے میں مہارت رکھتی ہوں میرے گروپ کو بھارت میں آپ دونوں کے متعلق اچھی طرح سے بریف کیا گیا تھا۔ یہ دونوں سفارت خانے ہماری پشت پر ہیں اور یہاں ہماری رہنمائی بھی کرتے ہیں۔

قارئین جتنے وقت میں آپ نے اس بھارتی جاسوسہ کے بیان کو پڑھا ہوگا۔ اتنا ہی یا اس سے کچھ زیادہ وقت اس نے بیان دینے میں لگایا تھا۔ میں اسے تفصیلاً صرف اس لئے تحریر کر رہا ہوں کہ بھارت اور کھٹنڈو میں قیام کے دوران پہلی بار میں نے پوری طرح تربیت یافتہ ایسے بھارتی جاسوس گروہ کو UP-ROOT (پکڑا، ننگا) کیا تھا۔ جو خطرناک عزائم لے کر پاکستان جانے والا تھا۔ اگنڈ بھارت اور وسیع تر بھارت کے خواب دیکھنے والے اب پہلے سے بھی زیادہ زور و شور سے اپنے مقصد کے حصول میں کوشاں ہیں اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم کو ہمارے دانش ور ہی بھارت سے محبت کی پیٹنگیں بڑھانے اور بھارت کو MOST FAVOURITE NATION سمجھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ہمارے اپنے ہی بنگلہ دیش جا کر ملتی باہنی کے جنم رسیدوں کی یادگار پر پھول چڑھاتے اور اس ندامت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم نے مشرقی پاکستان میں جو 16 دسمبر 71ء تک پاکستان کا مشرقی بازو تھا، پاکستان کے دشمنوں اور خدایوں کی سازشوں کو کچلنے کے لئے طاقت کا استعمال کیوں کیا۔

بھارتی جاسوسہ اپنا بیان ختم کر کے سہمی ہوئی نظروں سے مجھے اس طرح دیکھ رہی تھی کہ آیا مجھے اس کے بیان پر یقین آیا بھی ہے یا نہیں ادر میں خود کو ان سوالوں کے لئے تیار کر رہا تھا جو ہنوز تشنہ جواب تھے۔ میرے پاس بھی بہت کم وقت تھا اور یہ یقین بھی تھا کہ اس جاسوسہ کی نگرانی اور حفاظت کے لئے ریٹورنٹ کے ارد گرد کچھ لوگ ضرور ہوں گے۔

مجھے صورت حال کے ایک لحاظ اتنے بد لئے اور گہبھر ہونے کا قطعاً خیال نہ تھا۔ بھارت کی ایک مکمل تربیت یافتہ جاسوس لڑکی رسیوں میں جکڑی ہوئی میرے سامنے تھی۔ اس نے اپنے متعلق جو انکشاف کئے تھے ان کے مطابق یہ کوئی معمولی گروہ نہ تھا۔ اگر یہ خدا نخواستہ پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے تو بہت کچھ الٹ پلٹ کر سکتے تھے۔ میرے لئے زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی عورت جاسوسہ سے گفتیش کروں۔ مجھے مرد اور عورت کے بیچ جو فطری حد ہے اسے بھی عبور نہیں کرنا تھا چونکہ بالکل غیر متوقع اور اچانک ہی سب کچھ ہوا تھا۔ اس لئے اس لڑکی اور اس کے ساتھیوں سے (اگر وہ مل جاتے) پوچھنے کیلئے میں نے کوئی سوال نامہ بھی ترتیب نہیں دیا تھا۔ اس لئے میں خود گھبرا یا ہوا تھا۔ ایک جیک پات (jack pot) میرے سامنے تھا۔ جس کے حصول کیلئے مجھے نہایت مناسب PLANNING کی ضرورت تھی۔ وقت بہت کم تھا اور اس گروہ کا گروپ لیڈر اور دوسری جاسوسہ ابھی تک آزاد اور میری پہنچ میں نہ تھے۔ میرے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ میں نہ تو پاکستان میں تھا جہاں میرا محکمہ میری مدد کر سکتا اور نہ ہی یہ بھارت تھا جہاں میں گرفتاری سے پہلے COVER میں آزادی سے سب کام کرتا تھا اور جہاں مجھے اپنے ساتھیوں بشیر کی گیرج کے لڑکوں اور ہمدردوں کا تعاون حاصل تھا۔ کھٹنڈو میں میری اصلیت اور شہرت مجھ سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ یہاں پر جتنے پاکستان دشمنوں کو ہم نے جنم رسید کیا تھا۔ گو کہ ہم نے کوئی ثبوت نہ چھوڑا تھا لیکن دشمن سفارت خانے، اپنے اور پرانے سبھی جانتے تھے کہ اس قتال کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔

وقت کی نزاکت کے پیش نظر میں نے اپنے ذہن میں فوری طور پر ایک سوال نامہ ترتیب دیا۔ میں نے مریم کو کہا کہ اپنی ٹیپ کا مائیک ہمارے درمیان رکھے اور ٹیپ پر نیا سپول چڑھالے۔ مریم نے مجھے بتایا کہ اس کی یہ ٹیوٹر دوپہر دو بجے کھانا کھا کر واپس جاتی ہے۔ میں نے وقت دیکھا تو میرے پاس صرف دو گھنٹے اور چند منٹ تھے۔ جن میں مجھے اس لڑکی سے سوال جواب بھی کرنے تھے اور اس کے گروہ کے دونوں افراد تک بھی پہنچنا تھا۔ اس واقعے کو 23 سال بیت چکے ہیں پھر بھی اپنی یادداشت کے مطابق اس لڑکی سے اپنی گفتیش کو سوال و جواب کی صورت میں ہی مذکر قارئین کر رہا ہوں۔

(س) DMI ہیڈ کوارٹر کہاں واقع ہے؟ (ج) نئی دہلی میں (س) تمہیں تربیت دینے والوں کے نام اور ریکرڈ کیا تھے؟ (ج) صحیح نام تو وہ کبھی نہیں بتاتے۔ مجھے صرف کیمپن کا اصل نام معلوم ہے۔ کیمپن ملہوترا (س) یہاں تمہارے گروہ میں کتنے افراد ہیں۔ ان کے نام اور ایڈریس بتاؤ؟..... اس کا جواب دینے میں لڑکی کچھ جھجھکی۔ اس پر میں نے چینی دوست کو اشارہ کیا۔ اس نے لڑکی کا بایاں کان پکڑا اور استرا کھول کر کان کے قریب کر دیا۔ میرے دوسرے اشارے پر اس نے کان کاٹ کر علیحدہ کر دینا تھا۔ یہ دیکھ کر لڑکی چلائی۔ ”میں بتاتی ہوں۔ میں بتاتی ہوں۔ بھگوان کیلئے میرا کان نہ کاٹیں۔ میری ساتھی عورت کشمیری مسجد کے سامنے کشمیری فیملی کے گھر میں میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ اس کا کوور (COVER) نام سعیدہ ہے جبکہ اصلی نام کوشلیا ہے ہمارا ساتھی مرد ہنومان ڈھوکا کی ایک بلڈنگ میں رہتا ہے وہاں ایک فلیٹ اسے بھارتی سفارت خانے نے دیا ہے“۔ ہنومان ڈھوکا میں ہی وجے کمار بھی رہتا تھا۔ میں نے لڑکی سے جب اس بلڈنگ اور فلیٹ کی تفصیل پوچھی تو معلوم ہوا کہ وجے کمار کا فلیٹ ہی اس جاسوس کو دیا گیا تھا۔ (س) تمہارا اصلی نام کیا ہے؟

(جاری ہے)

غازی

(ج) مالتی سکینہ (س) تمہارے مرد ساتھی کا اصلی نام اور کور نام کیا ہے؟ (ج) اصلی نام تو چمن لال ہے اور کور (COVER) نام جشید (س) پاکستان میں تمہیں کیا ٹارگٹ دیئے گئے ہیں؟ (ج) مجھے پاکستان میں HIGH BRASS آفیسرز اور ٹاپ سول بیورو کریٹس سے پاکستان کے خفیہ راز حاصل کرنے تھے (س) یہ تم کیسے کرتیں (ج) ہمیں بتایا گیا تھا کہ ان لوگوں تک میں اپنی جوانی، حسن اور اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے بہت جلد پہنچ سکتی اور مطلوبہ معلومات حاصل کر سکتی ہوں۔ (س) تم ماتا ہاری کے متعلق کچھ جانتی ہو؟ (ج) بہت کچھ پڑھا ہے اور فلمیں بھی دیکھی ہیں۔ ہمیں ماتا ہاری کو ہی اپنا IDEAL سمجھ کر کام کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔ (س) ماتا ہاری کا انجام بھی جانتی ہو؟ (ج) جی ہاں۔ (س) لیکن یہاں تو تم صرف اپنے کان اور ناک کٹنے کے خوف سے اپنی اصلیت بتا رہی ہو۔ (ج) اپنے سارے یا کچھ ٹارگٹ مکمل کر کے اگر مجھے مرنا بھی پڑتا تو مجھے بخوشی منظور ہوتا کیونکہ میں نے اپنے دیش کی کچھ سیوا تو کی ہوتی لیکن یہاں تو اڑنے سے پہلے ہی پکڑی گئی۔ (س) پاکستان میں کوئی خاص ٹارگٹ بھی تمہیں دیا گیا تھا؟ (ج) جی ہاں (یہاں پر مالتی نے اس شخصیت کا نام لیا جو ان دنوں حکمران پارٹی کا ایک اعلیٰ عہدیدار اور صوبائی انتظامیہ کا کرتا دھرتا تھا۔ آج کل اس کی متعدد شاخیاں اس کی پہچان بن چکی ہیں) مجھے بتایا گیا تھا کہ میں بہت آسانی سے اس کو اپنے قابو میں لاسکتی ہوں۔ اس پر قابو پانے کا مطلب تھا کہ پاکستانی افواج اور سول بیورو کریسی میں میرے داخلے کے سارے دروازے کھل جاتے۔ (س) پاکستان پہنچ کر اپنی حاصل کردہ معلومات تم بھارت کیسے پہنچا تیں۔ کیا کوئی ٹرانسمیٹر بھی تم لوگ اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟ (ج) مجھے اور کوشلیا کو اپنی معلومات اپنے گروپ لیڈر کو دینے کا آرڈر تھا وہ الیکٹرونکس کا ماہر ہے۔ ٹرانسمیٹر بھی اس نے پاکستان میں ہی بنانا تھا۔ (س) ٹرانسمیٹر کے علاوہ کوئی اور ذریعہ؟ (ج) مقررہ وقت پر CORRIER کا گروپ لیڈر کو بھارتی ڈاک دینے اور لینے کا انتظام بھی ہے۔ (س) پاکستان میں تمہارے ہمدرد اور ضرورت پڑنے پر تمہاری مالی اور مادی مدد کرنے والوں کے نام بتاؤ۔ (ج) ایک نہیں بیسیوں نام ہیں لیکن ان کا علم صرف گروپ لیڈر کو ہے۔ (س) پاکستان میں تمہارے مشن کا DURATION (وقت) کتنا ہے؟ (ج) میرے لئے دو سال اور دوسروں کے متعلق میں نہیں جانتی۔ (س) پاکستان میں تمہارے کتنے گروپ کام کر رہے ہیں۔ ان سے تمہارا رابطہ کیسے ہوتا تھا؟ میرا یہ سوال سن کر مالتی ذرا سی مسکرائی اور بولی ”سر ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ آپ ایک بہت مجھے ہوئے جاسوس ہیں۔ آپ کو تو یقیناً معلوم ہونا چاہئے کہ COMPARTMENTATION تو جاسوسی کا ابتدائی سبق ہے۔ ہمیں کسی دوسرے گروپ کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا۔ (س) اگر ہم تمہیں چھوڑ دیں تو تم کیا کرو گی (ج) میں نے اپنی جان کے خوف سے نہ صرف اپنے متعلق بلکہ اپنے گروپ کے متعلق بھی آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ آپ یقیناً ان کو بھی جالیں گے۔ DMI کو جب یہ پتہ چلے گا تو وہ مجھے یا تو مار ڈالیں گے اور یا اذیتیں دے کر بڑی لمبی مدت کیلئے جیل میں ڈال دیں گے۔ اگر آپ مجھے چھوڑ دیں تو واپس بھارت جانا تو میرے لئے ناممکن ہے۔ پاسپورٹ میرے پاس ہے نہیں کہ کسی دوسرے ملک چلی جاؤں۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ ان حالات میں، میں کیا کر سکتی ہوں۔

اپنی دانست میں مالتی سے میں نے تمام ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں میرا آخری سوال یہ تھا کہ کھٹمنڈو میں بھارتی سفارتخانے کا کون سا کارکن ان سے رابطہ کرتا ہے۔ مالتی نے بتایا کہ ابھی تک میجر باسو سے ہی رابطہ ہے لیکن وہ کرنل آنند سے بھی مل چکی ہے اور کیپٹن مان تو اس کے پیچھے ہی پڑ چکا ہے اور کئی بار کھلے بندوں سے ڈنر اور ILATE NIGHTS کھٹے گزارنے کی دعوت دے چکا ہے۔ میں نے مریم کو دوسرے کمرے میں بلا کر کہا کہ مجھے چینی دوستوں کے ساتھ اس لڑکی کے ساتھیوں کی ”خیر خیریت“ دریافت کرنے جانا ہے۔ اس لئے فی الحال اس لڑکی کو بے ہوش کر کے تمہارے گھر میں ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اب تک میں نے مالتی سے جو بھی گفتگو کی تھی۔ اس میں کہیں کہیں ایک ادھانگریزی لفظ کے علاوہ باقی سب اردو میں تھی۔ یہاں میں داد دیتا ہوں مریم کے ظرف، اس کے مجھ پر بے حد اعتماد اور بھروسے کی۔ اسے ہماری گفتگو کا ایک لفظ تک سمجھ میں نہ آیا تھا۔ دوران گفتگو چینی دوستوں کو میں نے جو کہنا چاہا۔ مریم نے حرف بحرف چینیوں کو سمجھا دیا۔ اب میں نے مالتی کو اس کے گھر میں بے ہوش کر کے رکھنے کا کہا تو اس نے بغیر کوئی سوال پوچھے ALL RIGHT کہا۔ میں جانتا ہوں اور بہت سے قارئین بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ اگر پاکستان میں ایسی صورت حال پیش آجاتی تو پہلے تو ”ہوم گورنمنٹ“ کے ہر معنی اور بے معنی سوال کو جو اسے مطمئن کرتا پھر اس پر تبصرے اور آخری فیصلہ بہر حال ”ہوم گورنمنٹ“ کے ہاتھ میں ہوتا لیکن آفرین ہے مریم پر کہ میرے کسی بھی کام یا عمل پر اس نے مجھ سے کبھی کوئی سوال نہیں پوچھا۔ کئی خطرناک کاموں میں بھی وہ میرے ہمراہ رہی اور اب ایک جاسوس کو اس کے گھر میں بے ہوش چھوڑ کر ہم جا رہے تھے تو اس نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی پوچھا کہ اردو میں مالتی سے میری کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس کی یہی ادا اور ذہنی ہم آہنگی نے ہی ہمیں ایک دوسرے کے اتنے قریب کر دیا تھا۔

مریم نے چینی دوستوں کو کہا۔ ایک نے ملتی کے سر پر ریوا لور کے دستے سے ضرب پہنچا کر اسے بے ہوش کر دیا۔ میرے کہنے پر اس نے دو ضربات اور پہنچائیں اور اسے اسٹور میں رکھ کر گئے۔ میں نے مریم سے کہا کہ ہماری واپسی تک ہر چندرہ منٹ بعد وہ مالتی کو جا کر دیکھے اور اگر اس کے ہوش میں آنے کے آثار دکھائی دیں تو سر پر ضرب پہنچا کر پھر بے ہوش کر دے۔ میں نے مریم کو یہ بھی کہا کہ ہماری واپسی تک وہ اپنے والدین کے ہمراہ اپنے بیڈروم میں رہیں اور گھنٹی بجنے پر دروازہ ہرگز نہ کھولیں۔ مریم کے پاس میرے دیئے ہوئے کئی ریوا لور تھے۔ میں نے اسے کہا کہ ایک ریوا لور لوڈ کر کے اپنے پاس رکھے اور اگر کوئی دروازہ توڑنے کی کوشش کرے تو بلا دروغ اسے گولی مار دے۔ مریم کے گھر کا کمپاؤنڈ خاصا وسیع تھا اور داخلے کے گیٹ پر NO TRESS PASSING لکھا ہوا تھا۔ بغیر اجازت حاصل کئے کمپاؤنڈ اور گھر تک آنے والوں پر گولی چلانا اس کا حق تھا۔ میں نے اسے کہا کہ واپسی پر میں تین باروسل بجاؤں گا۔ تمہیں تم دروازہ کھولنا۔ یہ ہدایات دے کر میں چینی ساتھیوں کے ہمراہ وین لے کر کشمیری مسجد کو چل دیا اب مجھے کوشلیا سے سامنا کرنا تھا وہ بھی کشمیری خاندان کے گھر میں ہی رہتی تھی۔

اس گھر کے سربراہ کا نام فصیح تھا۔ چینی دوست گھر کے باہر وین میں بیٹھے رہے۔ فصیح صاحب گھر میں نہیں تھے۔ میں نے گھر کی خواتین سے بات کرنے سے پہلے ان کے گورکھاچوکیدار سے پوچھا کہ دو مہمان خواتین کہاں رہتی ہیں۔ اسی گھر کا ایک بچہ جو ہماری بات سن رہا تھا، کہنے لگا ”اس طرف مہمان خانے کے دو کمرے ہیں“ میں نے بچے کو کہا مجھے سعیدہ بیگم سے بہت ضروری ملنا ہے۔ تم میرے ساتھ چل کر ان کا دروازہ کھلاؤ۔ بچے نے میرے ساتھ مہمان خانے کے ایک کمرے کے دروازے کو کھٹکایا اور بولا ”آئی دروازہ کھولنے کوئی ملنے آیا ہے“ میں نے بچے کے کان میں کہا ”کہو امی اور ان کی ایک کھلی ملنے آئی ہے“۔ بچے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے یہ بات دہرا دی۔ کمرے کا دروازہ کھلا۔ میں نے ہاسٹل جیکٹ کی جیب میں رکھا ہوا تھا۔ کوشلیا مجھے دیکھتے ہی پیچھے ہٹی اور دروازہ بند کرنے لگی۔ میں نے زور سے دھکا دے کر دروازہ کھولا اور اسے زد میں لے کر کہا ”کوشلیا، اپنا بہروپ اب ختم کرو اور خاموشی سے میرے ساتھ چل پڑو۔ ورنہ گولیوں سے تمہیں چھلنی کر دوں گا۔ سمجھاری کا ثبوت دو اور مت بھولو کہ جب میں یہاں تک پہنچ چکا ہوں تو خالی ہاتھ واپس نہ جاؤں گا۔

(جاری ہے)

غازی

چاہے مجھے تمہاری لاش ہی لے جانی پڑے۔ کوشلیا نے اپنی مثال اس حالت میں اٹھائی کہ میرے پھل کی نال اس کی کمر کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اسی حالت میں اس نے برقعہ پہنا اور کمرے سے باہر میرے ساتھ اس طرح آئی کہ نال اس کی کمر سے بدستور لگی ہوئی تھی۔ آخر کوشش کے طور پر اس نے برقعے کا نقاب اٹھایا تا کہ چوکیدار کو اشاروں سے کچھ سمجھا سکے۔ میں نے پھل کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”نقاب فوراً گرا دو ورنہ.....“ کوشلیا نے نقاب گرا دیا۔ وین میں اسے میں نے دونوں چینی ساتھیوں کے درمیان بٹھایا اور تیزی سے وین چلا کر مریم کے گھر کی طرف روانہ ہوا جہاں وہ ایک بے ہوش جاسوس کی نگرانی کر رہی تھی اور اب اسے دو کی نگرانی کرنی تھی۔

کوشلیا کو ہمراہ لئے ہم مریم کے گھر پہنچے۔ تین مرتبہ وصل بجانے پر مریم نے گھر کا دروازہ کھولا۔ وہ ہاتھ میں ریوا لور لئے گھر کے کپاؤنڈ میں کھلنے والی کھڑکی کے قریب بیٹھی کپاؤنڈ کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہم کوشلیا کو لئے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور اسے بھی اس کمرے میں لے گئے جہاں مالتی ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ کوشلیا نے مالتی کو اس حالت میں دیکھا تو اس کی رہی سہی مدافعت ختم ہو گئی اور وہ جاسوسی کے سیکھے ہوئے سارے داؤ پیچ بھول گئی۔ اس نے بولنا چاہا لیکن میرے چینی دوستوں نے میرے اشارے پر اسے اس کی مہلت نہ دی۔ انہوں نے ریوا لور کے دستے کی ضربوں سے اسے بھی بے ہوش کر دیا اور اس کے ہاتھوں پاؤں باندھ کر منہ میں کپڑا ڈال دیا۔ میں نے مریم کو بتایا کہ اب ہم گروپ لیڈر کے پیچھے جا رہے ہیں اور ہماری واپسی تک وہ پہلے کی طرح ان کی نگرانی اور اپنی اور والدین کی حفاظت کرے۔ میں چلنے سے پہلے مالتی کو پھر سر پر ضربیں لگا کر مزید دو تین گھنٹے کیلئے اس کے ہوش میں نہ آنے کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ اب ہماری منزل چمن لال کا گھر تھا۔ ہم ابھی آدھے راستے تک ہی پہنچے تھے کہ میں نے گاڑی روکی اور واپس مریم کے گھر کی طرف چل پڑا۔ ذہنی طور پر میں بہت پریشان تھا اپنے لئے نہیں بلکہ مریم کیلئے۔ اس کے گھر میں دو بے ہوش جاسوس عورتیں پڑی تھیں جو DMI اور بھارتی سفارت خانے کی کاوشوں کا شاہکار تھیں۔ مالتی کے مریم کے گھر سے بروقت نہ نکلنے اور کوشلیا کے اغوا کی خبر اگر بھارتی سفارت خانے کو ابھی تک نہیں ملی تھی تو بہت جلد ہی ملنے والی تھی۔ سفارت خانے نے یہ خبر سن کر خاموش نہیں بیٹھنا تھا۔ مجھے ان کی طرف سے فوری ردعمل کا یقین تھا۔ مالتی کی نگرانی اور حفاظت کرنے والوں نے مالتی کے مریم کے گھر سے واپس نہ آنے اور کوشلیا کو وہاں لے جانے کی رپورٹ فوراً سفارت خانے میں پہنچائی ہوگی اور اب اصولی طور پر مریم کا گھر ان کے ردعمل کا ناراگٹ ہونا چاہئے تھا۔ اکیلی مریم ان کا کیا اور کتنی دیر مقابلہ کر سکتی تھی۔ اسی سوچ کے تحت میں نے وین واپس موڑی تھی۔ جب ہم مریم کے گھر پہنچے تو گھر کے باہر کوئی غیر معمولی آواز دکھائی نہ دیے۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور چینی دوستوں کو کہا کہ فوری طور پر دونوں عورتوں کو گاڑی کے فرش پر ڈال دیں۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئے تو میں نے انہیں کہا ”گیس“ اور ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ ختم کر دو۔ مریم ابھی گھر کے اندر تھی میں نے اسے بلایا اور کہا کہ چینی دوستوں کو کہے کہ چین کے بارڈر تک جانے والی سڑک پر کم از کم پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر انہیں اسی حالت میں ایسی کھائی میں پھینک دیں جہاں کسی کی نظر نہ پڑے۔ جب مریم نے انہیں میری بات سمجھا دی تو میں نے اسے واپس گھر کے اندر جانے کا کہا۔ وہ چلی گئی تو میں نے چینی دوستوں کو وین میں پیٹرول بھرے کین کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ پہلے گیس، پھر پیٹرول اور لائٹر جلا کر دکھایا۔ وہ میرا مقصد سمجھ گئے اور وین لے کر تیزی سے چلے گئے۔ میں گھر کے اندر گیا اور مریم کو کہا کہ ایک گیس سلنڈر اور زہریلی سویوں والا ڈبہ لا کر مجھے دے۔ اور پھر میرے لئے کافی لائے۔ مطلوبہ چیزیں مجھے دے کر مریم کافی بنا کر لائی۔ میں کھڑکی کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا تا کہ گھر کے باہر اگر کوئی خلاف معمول حرکت ہو تو اسے دیکھ سکوں۔ کافی پیتے ہوئے مریم نے مجھ سے صرف اتنا پوچھا کہ کیا پیٹرول کا ایک کین دونوں کیلئے کافی ہوگا۔ میں حیران تھا کہ اسے میرے ارادوں کا کیسے پتا چلا۔ کیونکہ میں نے اشاروں میں اور نہایت آہستہ آواز میں چینی دوستوں کو صرف دو تین لفظ کہے تھے اور مریم اس وقت گھر کے اندر تھی۔ میرے پوچھنے پر مریم نے بتایا کہ اس نے کھڑکی سے مجھے دوستوں کو اشاروں سے سمجھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مزید برآں اسے مجھ سے اس حماقت کی ہرگز توقع نہیں تھی کہ پاکستان کے دشمن جاسوسوں کو میں محض اس لئے زندہ چھوڑ دوں گا کہ وہ عورتیں تھیں۔ یقین جانئے مریم نے مجھ سے اس دن کی ساری کارروائی، تفتیش اور ان عورتوں کو چینی دوستوں کے ساتھ بھیجنے کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا۔ اگلے روز خود میں نے اسے تمام باتیں بتائیں۔ پاکستان کے دشمنوں کو وہ اپنا دشمن اور دوستوں کو اپنا دوست سمجھتی تھی۔

چار ساڑھے چار گھنٹے کے بعد چینی دوست واپس آئے۔ تھکن سے ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ تمام کام خوش اسلوبی سے مکمل کر کے واپس آئے ہیں مجھے مالتی اور کوشلیا کے اس انجام پر افسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ پاکستان دشمنی میں وہ خود اس آگ میں کودی تھیں۔ میرے لئے دشمن ملک کے جاسوس چاہے مرد ہوں یا عورتیں، یکساں برابر تھے۔ وہ تو رہے ایک طرف، اپنے وطن کیلئے میں تو اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو بھی تیار تھا۔ مریم نے چینی دوستوں کو کھانا کھلایا۔ میں نے مریم کے ذریعے انہیں کہا کہ اب حالات اس نچ پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہمیں 24 گھنٹے مستعد ہوشیار اور چوکس رہنا پڑے گا۔ اس لئے ابھی سے ان تینوں کی ایک روز چھٹی اور ریست ختم۔ اس لئے ان میں سے ایک جائے اور اپنے تیسرے ساتھی کو پوری طرح سے مسلح کر کے لے آئے میں نے مریم کو کہا کہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر وہ اپنے والدین کے ہمراہ اپنا ضروری سامان اور کپڑے وغیرہ لے کر فوراً اناپورنا ہوٹل میں شفٹ کرے۔ اور جب تک حالات نارمل نہیں ہو جاتے، وہ ہوٹل میں ہی قیام کریں۔ مجھے اپنے مشن کی تکمیل کے علاوہ ان کی حفاظت بھی کرنی تھی اور یہ ضروری ہو چکا تھا کہ ہم سب اکٹھے رہیں۔ میں نے وہیں سے فون پر ہوٹل میں اپنے فلور پر دو کمرے مریم اور اس کے والدین کیلئے فوری بک کرنے اور ایک ایکسٹری بیڈ چینی دوستوں کے کمرے میں تیسرے چینی دوست کیلئے لگوانے کا انتظام کیا۔ چینی دیر میں چینی دوست اپنے تیسرے ساتھی کو لے کر آیا۔ مریم اور اس کے والدین نے اپنی تیاری مکمل کر لی تھی۔ مریم کے والدین کو پورا یقین تھا کہ ان حالات میں انہیں ہوٹل شفٹ کرنے کا میرا مشورہ ان کی سلامتی اور خیر خواہی کیلئے تھا۔ ویسے بھی وہ مریم کی کسی بات پر نہ تو اعتراض کرتے تھے اور نہ ہی بڑبڑاتے تھے۔ کیونکہ مریم ان کی وارث تھی اور کوئی نا سمجھ بچی بھی نہیں تھی۔ مجھ پر بھی انہیں پورا بھروسہ اور یقین تھا۔ شام کے 6 بجے تک سب ہوٹل شفٹ ہو چکے تھے۔ مریم نے کہا کہ اگر میں اجازت دوں تو وہ ہر روز صبح گھر جا کر اپنے والدین کیلئے چائیز کھانے بنا کر لے آیا کرے۔ میں نے اسے دو چینی دوستوں کے ہمراہ جا کر کھانا لانے کی اجازت دی۔ شام ساڑھے چھ بجے میں دو چینی دوستوں کے ساتھ چمن لال سے ملنے روانہ ہو گیا۔ آج کے دن کے واقعات کے بعد مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یا تو چمن لال نے وہ گھر چھوڑ دیا ہو گیا ورنہ اس کی حفاظت کیلئے سفارت خانے کے گارڈز ضرور موجود ہوں گے۔

چمن لال کے گھر سے قدرے فاصلے پر میں نے وین ایک ایسی بلڈنگ کی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔ (جاری ہے)

غازی

وہاں پہلے ہی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سورج کبھی کاغروب ہو چکا تھا اور اسٹریٹ لائٹس جل رہی تھیں۔ ہم اس بلڈنگ کے بالکل سامنے پہنچ گئے جس کی دوسری منزل پر وہ کمار کے فلیٹ میں چمن لال رہتا تھا۔ نیچے ایک رکشہ کھڑا تھا۔ میں اس بلڈنگ میں اوپر جانے سے کچھ گھبراتا تھا جب وہ کمار کو ہم نے ہلاک کیا تھا تو بھاگ دوڑ میں شور شرابے کی وجہ سے کئی فلیٹوں کے دروازے کھلے اور بند ہوئے تھے۔ یقیناً وہاں رہنے والے کچھ لوگوں نے ہمیں دیکھا ہوگا۔ اب پھر اسی فلیٹ میں ہم اسی مقصد کیلئے جا رہے تھے ہمیں یہ بھی علم نہ تھا کہ وہ فلیٹ میں موجود ہوگا بھی یا نہیں اور اگر وہ فلیٹ میں ہوا بھی تو کیا اکیلا ہوگا یا اس کی حفاظت کیلئے کوئی گارڈ بھی ہوگا اسی شش و پنج میں چند منٹ گزارنے کے بعد بالآخر میں نے فلیٹ میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اکا دکا لوگ سڑک پر آ جا رہے تھے۔ رکشے والے کو وہاں سے ہٹانے کیلئے میں نے اس سے پوچھا کہ کیا رکشہ خالی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کی سواری اوپر گئی ہے اور اسے واپس لے کر جانا ہے اس سے مایوس ہو کر ہم نے سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں۔ ابھی ہم پہلی اور دوسری منزل کے درمیان میں ہی تھے کہ ایک آدمی ایک بڑا سوٹ کیس اٹھائے اوپر سے نیچے آتا دکھائی دیا۔ سیڑھیاں لکڑی کی بنی ہوئی تھیں اور تنگ تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ بالکل ہمارے سامنے آ گیا تو سوٹ کیس سمیت اس کے نیچے اترنے میں ہم رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ اسے راستہ دینے کیلئے میں نے سوچا کہ ہم پہلی منزل تک واپس چلے جاتے ہیں۔ اس کی سفید داڑھی، سفید لمبے بال، سر پر جناح کیپ، پاجامہ، قمیص اور کوٹ سے میں اسے ایک بوڑھا مسلمان سمجھا۔ میرے پیچھے میرے چینی دوست تھے۔ نیچے اترنے کیلئے میں مڑنے ہی والا تھا کہ وہ بوڑھا پلٹا اور سوٹ کیس سمیت دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر کو بھاگا۔ اس کی عمر اور یہ طاقت و پھرتی میرے لئے عجیب تھی۔ بجلی کی طرح ایک خیال میرے دماغ میں کوند اور میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ میری زخمی ٹانگ اور اسی ٹانگ کے گھٹنے میں درد کی لہر دوڑ گئی لیکن اس درد سے بے پروا میں نے دوسری منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے جالیا اور اسے ٹانگ سے پکڑ لیا وہ سیڑھیوں پر منہ کے بل گرا اور میرے کھینچنے کی وجہ سے دو تین سیڑھیاں نیچے کھنچا چلا آیا۔ سوٹ کیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ اس نے سیدھا ہو کر مجھے اپنے پاؤں سے نیچے دھکیلنا چاہا۔ اسی اثنا میں، میں نے اس کی دوسری ٹانگ بھی پکڑ لی۔ سیڑھیوں پر اوندھے منہ گھٹنے کی وجہ سے اس کی آدمی داڑھی چہرے سے اتر چکی تھی۔ اس کی ٹانگیں پکڑے ہوئے ہی میں نے خود کو اٹھایا اور آگے ہو کر اس پر اس طرح لیٹ گیا کہ میرا چہرہ اس کے چہرے کے بالکل سامنے آ گیا۔ چینی دوست میرے پیچھے تھے۔ میں نے چلا کر کہا ”گیس“ اور اپنے نیچے پڑے ”بوڑھے“ یعنی چمن لال کے دونوں بازو پھیلا کر اس طرح پکڑ لئے کہ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں میری انگلیوں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ میرے چینی دوستوں میں سے ایک ہمیں پھلانگتا ہوا چمن لال کے چہرے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے چینی زبان میں میرے پیچھے کھڑے دوسرے ساتھی کو کچھ کہا۔ میرے پیچھے کھڑے ساتھی نے اپنے رومال سے میرے منہ اور ناک کو تختی سے بند کر دیا دوسرے ساتھی نے اپنے منہ اور ناک کو اپنے رومال سے ڈھانپا اور گیس چمن لال کے نتھنوں میں چھوڑ دی۔ یہ سارا عمل پانچ چھ سیکنڈ میں ہوا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا تھا۔ گیس چمن لال کے نتھنوں میں گئی تو وہ پھڑ پھڑایا۔ میرا منہ ناک بند کرنے والے ساتھی نے مجھے کھینچا اور چار پانچ سیڑھیاں نیچے لاکر میرے منہ سے رومال ہٹالیا۔ گیس چھوڑنے والا چینی دو تین سیڑھیاں اوپر چلا گیا تھا چینی دوستوں نے یہ سارا عمل مجھے اور خود کو گیس کے اثرات سے بچانے کیلئے کیا تھا۔ چمن لال سے ہماری مڈ بھٹر بالکل اتفاقیہ اور خلاف توقع تھی۔ اس نے اتنا اچھا گیٹ اپ کیا ہوا تھا کہ اگر وہ مجھے دیکھتے ہی اوپر نہ بھاگتا تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آتی کہ یہ ”بوڑھا مسلمان“ ہی چمن لال ہے۔ وہ مجھے جل دینے میں پوری طرح کامیاب ہو چکا تھا اور محض اپنی بدحواسی کی وجہ سے یہاں مارا گیا۔ یہاں میں یہ اعتراف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ گوگو کی حالت میں بغیر سو فیصد یقین کے کسی کی جان لینے کا تین چار سیکنڈ میں فیصلہ کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ اگر وہ چمن لال نہ ہوتا تو اس خون ناحق پر میں زندگی بھر کف افسوس ملتا رہتا۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ میرے یقین کامل میں اور پختگی آگئی کہ موت کا وقت اور جگہ پہلے سے مقرر ہے اور یہ سب رب ذوالجلال نے طے کر رکھا ہے اگر ہمارے اور چمن لال کے ٹائمنگ میں صرف دو منٹ کا بھی فرق ہوتا تو وہ بڑی آسانی سے فرار ہو سکتا تھا لیکن اس کی موت اس بلڈنگ کی سیڑھیوں پر عین اس وقت لکھی ہوئی تھی جسے دنیا کی کوئی طاقت بدل نہیں سکتی تھی۔

میں نے چمن لال کے چہرے پر لگی آدمی داڑھی کو بھی اتار دیا۔ میرے ساتھیوں نے اسے کھڑا کیا اور دونوں طرف سے اپنے بازوؤں کے سہارے اسے لے کر سیڑھیاں اترنی شروع کیں۔ اس کا سوٹ کیس اٹھائے میں آگے آگے تھا ہم سڑک پر پہنچے تو چینی دوست سڑک کے کنارے نسبتاً اندھیری جگہ پر کھڑے ہو گئے، میں نے رکشہ والے کو دس روپے دیئے اور کہا کہ اس کی سواری تیار ہے اور ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے ہیں۔ رکشہ والا چلا گیا تو میں جلدی سے وین لے کر دوستوں کے پاس آیا۔ کچھلی سیٹ پر چمن لال کی لاش کو درمیان میں بٹھا کر دونوں دوست اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ میں نے سوٹ کیس گاڑی میں رکھا ایک پیٹرول پمپ سے میں نے وین میں پیٹرول ڈلوایا اور خالی کین بھی بھروالیا۔ اس دوران چینی دوستوں نے اس کی جیبوں کی مکمل تلاشی لی۔ گھڑی اتاری اور اس کی جیبوں سے نکلنے والا سامان ایک رومال میں باندھ لیا اب ہماری منزل وہی جگہ تھی جہاں دونوں جاسوس عورتوں کی لاشوں کو جلایا گیا تھا۔ چمن لال کی لاش کو بھی ان کی جلی ہوئی اور ناقابل شناخت لاشوں کے ساتھ رکھ کر اور کین کا سارا پیٹرول اس پر ڈال کر ہم کھائی سے اوپر سڑک پر آگئے اور جب تک آگ بجھ نہ گئی ہم وہیں موجود رہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان کی لاشوں کو جلا کر ہم نے اتنا تو کیا کہ ان کا آتم سنسکار (آخری رسوم) ان کے مذہب کے مطابق کیا واپسی پر ہم کشمیری خاندان کے سربراہ فصیح کے گھر گئے۔ فصیح صاحب سے ملاقات ہوئی میں نے انہیں بتایا کہ ان کی مہمان دونوں خواتین مسلمان نہیں بلکہ بھارتی ہندو جاسوس تھیں اور اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گی ان کیلئے بھی یہ بہتر رہے گا کہ اس معاملے میں بالکل خاموشی اختیار رکھیں اور مجھے ان دونوں کے کمروں کی تلاشی لینے دیں۔ فصیح صاحب پہلے تو نہیں مانے لیکن جب میں نے انہیں یہ دھمکی دی کہ میری بات نہ ماننے سے انہیں اور ان کے خاندان کو جانی نقصان پہنچ سکتا ہے اور مجھے بہر حال ان کمروں کی ابھی تلاشی لینا ہے تو وہ خاموشی سے میرے ساتھ رہے۔ مہمان خانے کی ڈپلکیٹ چابیاں انہوں نے گھر سے منگوائی تھیں۔ دونوں کے کمروں سے ہمیں ان کے ذاتی سامان کے علاوہ ایک چھوٹا سا غسل اور سینکڑوں گولیاں، پاکستان میں ان کے ٹارگٹ بننے والے اعلیٰ افسران کی لسٹیں اور ان کی تصاویر، پاکستان میں اپنے بھی خواہوں کے مکمل پتے اور شناختی کوڈ، لائسنس کے سائز کے کیمرے، پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈ (جو یقیناً پاکستانی افسران کو بلیک میل کرنے کیلئے استعمال ہونے تھے) ملے۔ سب سے اہم اور خطرناک وہ مصنوعی لمبے ناخن تھے جو اونچی سوسائٹی کی خواتین استعمال کرتی ہیں اس وقت تو ہم نے یہ سب سامان انہی کے ایک سوٹ کیس میں ڈالا اور فصیح صاحب کو دھمکی آمیز یہ تنبیہ کر کے آگے کہ اگر ان عورتوں کے متعلق کوئی بھی پوچھے تو صرف یہ بتائیں کہ معمول کے مطابق وہ دونوں باہر گئی تھیں اور واپس نہیں لوٹیں۔ وہ سوٹ کیس میرے دوستوں نے گاڑی میں رکھا۔

(جاری ہے)

غازی

چلتے وقت میں نے فصیح کو ایک بار پھر تنبیہ کی اور کہا ”اس وقت تک ان عورتوں کی حقیقت کو صرف ہم جانتے ہیں یا تم۔ اگر یہ بات کسی تیسرے تک پہنچی تو وہ یقیناً تمہاری طرف سے لیک (LEAK) ہوئی ہوگی۔ اگر ایسی صورت پیش آئی۔ تو اپنے اور اپنے اہل خانہ کیلئے قبریں پہلے ہی کھدوا لینا۔ میرے متعلق تم بخوبی جانتے ہو گے کہ اپنے وطن کے دشمنوں کو ختم کرنے میں مجھے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ دو تین روز کے بعد ان کمروں کا سامان اٹھوا کر اپنے گودام میں رکھوا لینا۔ اگر بھارتی سفارت خانے والے ان عورتوں کا پوچھنے آئیں تو صرف وہی بیان کرنا جو میں نے تمہیں بتایا ہے اگر وہ سامان مانگیں تو اپنے بچاؤ کیلئے یہ کہنا کہ یہ سامان مسلمان مہاجر خواتین کا ہے اس لئے صرف انہی کو اور اگر وہ چند روز مزید نہ آئیں تو پاکستانی سفارت خانے کو بھجوا دیا جائے گا۔ اگر وہ دھمکی دیں تو پولیس کو بلو لینا“۔ فصیح کا روبرو کشمیری تھا۔ میری باتیں سن کر وہ ڈر گیا اور میرے کہے پر حرف بحرف عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ ہم نے ایک دن میں ہی سارا مشن مکمل کر لیا تھا۔ میں بڑے اطمینان قلب کے ساتھ اپنے ہوٹل روانہ ہوا۔ اب ہمیں صرف بھارتی سفارت خانے کے ردعمل کا انتظار تھا اور اپنے حفاظتی انتظام کو اور مضبوط کرنا تھا۔

ہمیں ہوٹل واپس پہنچتے پہنچتے خاصی دیر ہو گئی، مریم بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے دونوں سوٹ کیس اپنے کمرے میں رکھوائے۔ مریم نے ڈرتے ڈرتے مجھے بتایا کہ شام کو وہ پھر چینی دوست کے ساتھ ریسٹورنٹ گئی تھی اور ہم سب کیلئے کھانا لے کر آئی ہے۔ اس نے ریسٹورنٹ کے باہر یہ بورڈ بھی لگوا دیا کہ ریسٹورنٹ چند روز کیلئے بند رہے گا۔ اس نے ریسٹورنٹ کے چوکیدار کے ذریعے مزید تین نیپالی چوکیدار بھی بلوائے تھے جو کل صبح اٹرو یو کیلئے ہوٹل میں آئیں گے۔ کھانے کے بعد میں نے مریم کو بتایا کہ چمن لال کو بھی ٹھکانے لگا دیا گیا ہے۔ میں نے اسے اپنی ٹانگ کے زخم اور گھٹنے کے درد کے متعلق بھی بتایا۔ وہ فوراً اپنے کمرے سے بام لے آئی اور میری ٹانگ پر لگا کر آہستہ آہستہ مساج کرنے لگی۔ میں سارے دن کا تھکا ہوا تھا۔ درد بھی ختم ہو گیا اور بہت جلد ہی میں سو گیا۔

اگلے روز ناشتے سے فارغ ہو کر دونوں چینی ساتھیوں کی موجودگی میں ہم نے سوٹ کیس کھولے۔ چمن کے سوٹ کیس میں سے اس کے کپڑوں کے علاوہ ٹرانسمیٹر کی کوڈ اور ڈی کوڈ کی کتاب، پمفل، گولیاں، اسلام آباد میں بھارتی سفارت خانے میں اس سے CONTACT (رابطہ) کرنے والوں کے نام، بھارت سے ڈاک لانے اور لے جانے والے کے ساتھ پہلی میٹنگ کی جگہ دن اور وقت اور پاکستان میں بھارت کے ان ہمدردوں کے نام جن سے بوقت ضرورت ہر قسم کی مدد لی جاسکتی تھی، پاکستان کے حساس مقامات کی تصویریں، نقشے غرضیکہ جاسوسی کیلئے تمام ضروری اطلاعات موجود تھیں۔ دو بہت چھوٹے کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر بھی تھے۔ سوٹ کیس میں سامان رکھتے وقت مجھ سے وہ ڈبے کھل نہ سکے تھے اس لئے انہیں بھی سوٹ کیس میں رکھ لیا تھا۔ اب غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ڈبے نچلے حصے میں بنے ایک پیچیدہ میکنزم سے کھلتے تھے۔ ڈبے کھولے تو دونوں میں خواتین کے بطور فیشن لگانے کے مصنوعی ناخن کے تین تین سیٹ تھے۔ مختلف رنگوں کی نیل پالش اور تین تین ایسی شیشیاں تھیں جو شام کی نیل پالش اتارنے کے محلول کی تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ پوٹاشیم سائینائیڈ کا محلول تھا جو انہی ڈبوں میں موجود بہت چھوٹی سرنجوں کے ساتھ ان ناخنوں میں ڈالا جاتا تھا۔ یہ شیشیاں سیل (SEAL) تھیں۔ مصنوعی ناخنوں کے ہر سیٹ میں پانچ کے بجائے سات ناخن تھے۔ ہر سیٹ کے پانچ ناخن ایک لائن میں اور دو ناخن علیحدہ لائن کے گتے کے ٹکڑوں سے لگے ہوئے تھے۔

(جاری ہے)

غازی

میں حیران تھا کہ ہر سیٹ میں 5 کے بجائے 7 ناخن کیوں ہیں۔ پھر خیال آیا کہ دو فالتو ناخن شاید اس لئے ہیں کہ اگر کوئی ناخن ٹوٹ جائے تو اس کی جگہ استعمال ہو سکے۔ یہ سارے ناخن لمبے اور نوکدار تھے۔ میں نے یونہی فالتو ناخنوں میں سے ایک نکالا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ چانک ایک چینی دوست چلایا۔ ”نو۔ نو“۔ اور مجھے اشارے سے کہا کہ ناخن فوراً رکھ دو۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ بہر حال میں نے ناخن رکھ دیا۔ چینی دوست نے اپنے رومال سے وہ ناخن اٹھایا، اسے اچھی طرح سے دیکھا اور سہمی ہوئی آواز میں مریم سے کچھ کہنے لگا۔ اس کی بات سن کر مریم بھی گھبرا گئی۔ میرے دونوں ہاتھ اور انگلیاں دیکھ کر اپنی تسلی کی۔ اور کہنے لگی کہ دونوں فالتو ناخنوں میں سائینڈ کا محلول بھرا ہوا ہے۔ میں نے رومال سے ناخن پکڑ کر دیکھا تو اس کی تیز نوک میں بہت چھوٹا سا سوراخ تھا اور نوک کا سوراخ بھی اسی طرح باریک اور محسوس نہ ہونے والی تہوں سے بنا ہوا تھا۔ ناخن کے پچھلے حصے میں سوئی سے نکالے جانے والا ایک بہت چھوٹا کارک لگا تھا اور نوک کا سوراخ بھی اسی طرح کے ایک کارک سے بند تھا۔ یہ ناخن لگانے والی جب چاہتی، ناخن کے نوکیلے سرے پر لگے کارک کو ہٹا کر کسی کے جسم پر ناخن سے ذرا سے کھر ونچ ڈال کر سائینڈ جسم میں داخل کر کے اسے ہلاک کر سکتی تھی۔ یہ جاسوس عورتیں اگر پاکستان پہنچ جاتیں تو اپنے ٹارگٹس اور خصوصاً عیاش افسران کو بڑی آسانی سے ہلاک کر سکتی تھیں۔ میری نگاہوں میں وہ پورا منظر گھوم گیا کہ کس طرح اور کیسے وقت وہ اپنے شکار کو نشانہ بناتیں۔ آج بھی میں جب پاکستان کے شہروں کے پوش علاقوں، خصوصاً LOUD میک اپ، ٹائٹ لباس اور لمبے ناخنوں کے ساتھ دعوت گناہ دینے کی ادائیں دکھاتی ملکی اور غیر ملکی عورتوں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ان میں کتنی بھارتی جاسوس سائینڈ بھرے ناخنوں کے ساتھ اپنے مخصوص شکاروں کی تلاش میں ہوں گی۔ میں نے ایک چھوٹا کیمرا، ٹیپ، ایک سٹیل اور خاصی گولیاں اپنے پاس رکھ کر ساری لسٹیں اور اور تمام سامان کا ایک مضبوط پیکٹ بنایا۔ اپنے اس ASSIGNED مشن کی کامیابی کی پوری تفصیل لکھی اور ان الفاظ پر ختم کی ALL THREE WERE FINALLY GIVEN A GOOD TREET سرخ پین سے انڈر لائن کر کے یہ پرزور درخواست بھی کی کہ اب مجھے فوری طور پر واپس آنے کی اجازت دی جائے۔ یہ سب میں نے دو روز بعد پاکستان جانے والی ڈاک میں بھیجا تھا۔ آج ہی مہاجرین کی فلائٹ کو بھی پاکستان جانا تھا۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر میں مریم کو اپنے ہمراہ نہیں لے گیا اور دو چینی دوست ہوٹل میں چھوڑ کر تیسرے کے ہمراہ ایئر پورٹ چلا گیا اور حسب معمول مہاجر خاندانوں کو رخصت کیا۔ بعد دوپہر میری واپسی ہوئی۔

شام کے پانچ بجے کرنل آنند مجھ سے ملنے آیا۔ آج وہ اکیلا تھا اس کا چہرہ اترا ہوا اور سوگوار تھا اور پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ کافی شاپ میں رسمی جملوں کے بعد وہ سیدھا مطلب کی بات پر آ گیا۔ ”آصف صاحب۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہم ہار گئے اور جیت آپ کی رہی“ کرنل نے سر جھکائے یہ الفاظ کہے۔ گو کہ میں اس کا مطلب اچھی طرح سے سمجھ گیا تھا لیکن انجان بننے ہوئے میں نے پوچھا ”کرنل صاحب کوئی جیت اور کیسی ہار۔ میں ریڈیو بھی بہت کم سنتا ہوں اور اخبار بھی کبھی کبھار پڑھتا ہوں۔ کیا ہمارے ملکوں کے درمیان کوئی کرکٹ یا ہاکی کا میچ ہو رہا تھا جس کی آپ بات کر رہے ہیں“ کرنل کچھ دیر اپنی جھجھی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا اور پھر بولا ”آپ کا حق ہے کہ آپ مذاق اڑائیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں بڑی مشکل میں پھنس چکا ہوں“ میں نے سنجیدہ لہجہ بنا کر پوچھا ”آخر بتائیں تو کیا مشکل آن پڑی ہے اور میں کیسے آپ کی مدد کر سکتا ہوں“ کرنل آنند نے بڑے ندامت آمیز لہجے میں کہا ”آپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہیں“ فی الحقیقت کرنل آنند اس وقت بڑی مشکل میں پھنسا تھا۔ مسلمان مہاجرین کے بھیس میں تین اعلیٰ تربیت یافتہ جاسوس جنہوں نے ایک لمبے عرصے کیلئے پاکستان جا کر کارنامے سرانجام دینے تھے، کل رات سے غائب تھے۔ انہیں نامعلوم زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا تھا۔ کھمبندو میں میرے سوا انہیں کوئی دوسرا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جس نے انہیں غائب کیا ہو۔ کرنل آنند یقیناً انہی کے بارے میں مجھ سے پوچھنے آیا تھا لیکن شرم اور ندامت سے اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ وہ مجھے یہ کیسے بتاتا کہ جنیں، سعیدہ اور جشیدہ پاکستانی مہاجر نہیں بلکہ ماتئی، کوشلیا اور چمن لال تھے اور DMI کے قابل فخر جاسوس اور روسوں کی ٹریننگ کے بعد پاکستان جا رہے تھے کہ راستے میں ہی غائب ہو گئے۔ میں نے کہا ”کرنل آنند، کھل کر اور صاف بات کیجئے۔ میرے الفاظ تھے "COL ANAND PLEASE BE CLEAR AND COME TO THE BOTTOM LINE" کرنل آنند نے بہت ہی مجبور ہو کر کہا ”ماتئی، کوشلیا اور چمن لال کل سے غائب ہیں اور ان کا کوئی سراغ نہیں مل رہا“۔ ”لیکن میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا“ میں نے جواب دیا مگنیتیر کی ٹیوٹو جین تھی اور کل بھی وہ اسے ٹیوشن دینے آئی تھی“ میں نے جواب دیا۔ کرنل آنند پھر خاموش ہو گیا۔ آخر وہ بھی بھارتی فوج کا کرنل اور ملٹری اٹاچی تھا اور میرے سامنے اپنی گھناؤنی سازش کے پردے اٹھاتے ہوئے خفت محسوس کر رہا تھا۔ ”چلئے آپ کی بات مان لیتے ہیں۔ جنیں، سعیدہ اور جشیدہ کل سے MISSING ہیں“ کرنل نے سر جھکائے کہا۔ یقیناً جانے۔ آنند کی یہ حالت دیکھ کر مجھے روحانی خوشی ہو رہی تھی۔ اپنی بساط کے مطابق میں نے 71 کی شکست کے بدلے سن 72ء میں ہی لینے شروع کر دیئے تھے اور آج اسی بدلے کا ایک سین میرے سامنے تھا۔ ”کرنل آنند میں ابھی کچھ نہیں سمجھا۔ میری مگنیتیر نے مجھے بتایا تھا کہ جنیں ایک مسلمان مہاجر لڑکی ہے جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ پاکستان جانے کے لئے کھمبندو آئی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایک مسلمان مہاجر لڑکی سے آپ کا کیا واسطہ ہے۔ کیا اتنی مصیبتیں اٹھانے کے بعد آپ اس یتیم لڑکی اور اس کی بیوہ ماں کو سکون سے پاکستان جانے سے بھی روکنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ میں ضمیر نام کی کوئی چیز ہے بھی یا نہیں“ میں کرنل پر برس پڑا۔ اور کرنل کا یہ حال تھا کہ اس کی گردن جھکتی ہی جا رہی تھی۔

میں کرنل آنند کو نہ تو یہ بتانا چاہتا تھا کہ تینوں بھارتی جاسوسوں کو میں نے ہلاک کیا ہے یا میں ان کے متعلق کچھ جانتا ہوں اور نہ ہی اسے ان کی طرف سے بالکل مایوس کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایسی صورت میں بھارتی سفارت خانہ اپنے پورے وسائل کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوتا۔ اب تک کھمبندو میں تمام جارحانہ اقدام میں نے ہی کئے تھے۔ اللہ پاک کی رحمت پر یقین کامل کے علاوہ میرے مادی وسائل صرف تین چینی دوست تھے اور اب حالات ایسے نازک موڑ پر آچکے تھے جہاں مجھے اپنے علاوہ مریم اور اس کے والدین کی حفاظت بھی کرنی تھی۔ ان حالات میں ان بھارتیوں سے میرا مزید الجھنا ہم سب کے لئے بہت خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ کرنل آنند کو میں امید و بیم کی کیفیت میں رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے دھیمے لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ”تم تو واقعی بہت سنجیدہ اور پریشان دکھائی دیتے ہو، سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ جن تین پاکستانی یا بھارتی لوگوں کی تمہیں تلاش ہے، ان کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا، ان کی گمشدگی کے متعلق اگر تمہیں بھی کوئی علم نہیں تو پھر ایک نہیں بلکہ کئی امکان ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارے سفارت خانے کے کسی فرد یا تمہارے کسی نائب نے تم سے دشمنی کی وجہ سے انہیں غائب کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خاص مقصد سے یہ تینوں خود اپنی مرضی سے کھمبندو سے چلے گئے ہوں اور تیسرا امکان یہ بھی ہو سکتا ہے شک پڑنے پر کسی پاکستانی گروپ نے ہی انہیں اغوا کیا ہو“۔ کرنل آنند پوری توجہ سے میری باتیں سن رہا تھا وہ کہنے لگا ”میرے ماتئوں میں ممبر باسو سے میری نہیں بنتی اور میں نے اس کی خفیہ رپورٹ میں اس کی ناقص کارکردگی کے متعلق تفصیلاً لکھا ہے، اپنے سفارت خانے کے تمام افراد کو میں بخوبی جانتا ہوں وہ یہ کام کرنے کے اہل ہیں۔ پاکستانی نیٹ کے متعلق اسی ہوٹل میں ہماری پہلی ملاقات میں بھی تم نے کہا تھا کہ ہم تو صرف ڈمی ہیں۔ کام تو دوسرے گروپس کرتے ہیں تمہارا تو ان سے رابطہ ہے۔ بھگوان کے لئے ان سے ان تینوں کے متعلق پوچھو، میرا سفارت خانہ ان کی رہائی کے لئے بیس لاکھ روپے فوری ادا کرنے کو تیار ہے۔ تمہیں میں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ DMI تمہاری جرأت اور بہادری سے بہت متاثر ہے۔ اگر تم چاہو تو بھارت میں تم نے جو کچھ کیا ہے اسے بالکل بھلا کر تمہیں بھارتی شہریت کے علاوہ لاکھوں روپے اور DMI میں ہی اعلیٰ عہدہ دیا جاسکتا ہے، ایسی صورت میں، ہم تمہاری فیملی کو بھی بھارت بلوانے کے انتظامات کر سکتے ہیں جہاں تم ایک نئی اور خوش حال زندگی شروع کر سکتے ہو۔ اگر میری باتوں پر تمہیں یقین نہیں تو میں اسی ہوٹل کے فون سے تمہاری بات اپنے سفیر سے کرواتا ہوں۔ اس کی گارنٹی پر تمہارے سفارت خانے چلو اور اگر کسی وجہ سے تم سفارت خانے میں نہیں جانا چاہتے تو سفیر سے اس کی کوٹھی پر ہی مل لو۔ وہ تو سفارت خانے سے باہر ہے۔ سفیر سے تمہاری بات ہو جائے گی۔ تمہاری میزبانی سے وہ فخر محسوس کرے گا“۔ میں دل ہی دل میں کرنل آنند کی اس ’فرارخ دلانہ‘ پیشکش پر ہنس رہا تھا۔ بھارتیوں کی میزبانی سے میں DMI میں حراست کے دوران پوری طرح سے لطف اندوز ہو چکا تھا۔ جہاں تک سفیر کی رہائش گاہ کا تعلق تھا تو مجھے اچھی طرح سے علم تھا کہ کسی سفیر کی رہائش گاہ بھی جہاں جھنڈا لگا ہو، اسی ملک کا حصہ تصور ہوتی ہے۔ کرنل آنند شاید اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ جیسے اس دور کے پاکستانی حکمران اور وزارت خارجہ کے سیکریٹری لیول کے افسران بھارت سے اچھے اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی دھن میں دماغ اور سوچ سے عاری ہو چکے تھے، ویسے ہی سب پاکستانی بھی تھے۔

(جاری ہے)

غازی

میں نے کرنل آنند کو کہا ”یہ سب باتیں تو بعد کی ہیں پہلے تو ہمیں تمہارے گمشدہ لوگوں کو تلاش کرنا ہے۔ پاکستانی گروپس سے اگرچہ میرا کوئی ڈائریکٹ رابطہ نہیں ہے لیکن میں بھرپور کوشش کروں گا کہ اگر ان کا ان لوگوں کی گمشدگی میں کوئی ہاتھ ہے تو انہیں رہا کراؤں۔ ایک اور امکان بھی ہے اگرچہ بنگلہ دیش ایک آزاد ملک بن چکا ہے لیکن وہ مجبوراً تمہاری بالادستی کو قبول کرتا ہے جب وہ اپنے ہم وطن اور ہم مذہبوں کے نہ بن سکے تو تمہارے کیا بنیں گے۔ شاید یہ کارستانی انہی کی ہو“ غرضیکہ جب کرنل آنند مجھ سے رخصت ہوا تو میں اس کے ذہن میں اپنے علاوہ کئی ایسے دوسروں کے متعلق شک و شبہات ڈال چکا تھا جو یہ کارروائی کر سکتے تھے۔ یہ میری کامیابی تھی کیونکہ بھارتی سفارت خانے کے متوقع رد عمل میں مجھے کچھ مہلت مل گئی تھی اور اس دوران میں اپنے ڈیفنس کومزید مضبوط کرنے کی تدابیر کر سکتا تھا۔

اب میرا بیشتر وقت اپنے ہوٹل میں ہی گزرتا ”دوسرے پاکستانی گروپس کی تلاش“ میں دوسرے روز سے ہی میں نے دو تین گھنٹے بلا مقصد کھمبند کی سڑکوں پر گاڑی گھمانی شروع کر دی۔ دو تین بار پاکستانی سفارت خانے بھی گیا پہلے روز ہی میں نے دیکھا کہ ایک گاڑی ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔ اسی شام جب کرنل آنند کا فون آیا تو میں نے چھوٹے ہی کہا کہ اگر اسی طرح تم نے آئندہ میری نقل و حرکت کی نگرانی کرنے کی کوشش کی تو میں تمہاری مشکل حل کرنے کی کوشش ختم کر دوں گا۔ میں اسے ہرگز پسند نہیں کرتا کہ کوئی سائے کی طرح مجھ سے چمٹا رہے۔ اگر آئندہ کسی نے میرا پیچھا کیا تو نہ تو وہ گاڑی سلامت رہے گی اور نہ ہی پیچھا کرنے والے۔ کرنل آنند پھنسا ہوا تھا اس نے خاموشی سے میری بات سنی اور صرف یہ کہا IT WILL BE NOT REPEATED AGAIN (آئندہ ایسا نہیں ہوگا) پھر کسی گاڑی نے میرا پیچھا نہ کیا میرے برین واشنگ کی کوشش کرنے والے اب خود CLEAN WASH (صاف) ہو رہے تھے اسی طرح چار پانچ روز گزر گئے۔ کرنل آنند باقاعدگی سے ہر شام مجھے فون کرتا اور مجھ سے پروگریس رپورٹ لیتا۔ اسی دوران میں نے مہاجروں کی ایک فلائٹ بھی بھگتائی۔ کرنل آنند کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا، ادھر میں بھی اس ٹانگ کو زیادہ جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ مجھے ایک ترکیب سوچھی میں نے محسن کو کہا کہ کسی لڑکے کے ذریعے بنگلہ دیشی سفارت خانے سے ایک آدھ بنگالی اخبار منگوا لے۔ یہ کام بڑی آسانی سے ہو گیا۔ ڈھاکے سے چھپنے والا یہ اخبار ہماری واردات سے کئی روز پہلے کا تھا میں دو چینی دوستوں کے ساتھ وہاں گیا جہاں لاشیں جلائی گئی تھیں۔ کپڑوں اور گوشت کا تو نام و نشان تک نہ تھا۔ بکھری ہوئی کچھ انسانی ہڈیاں ضرور پڑی تھیں۔ میں نے اخبار توڑ مروڑ کر ہڈیوں سے قدرے فاصلے پر ایک جھاڑی میں ایسے پھنسا یا کہ یہاں آنے والے کی نظر اس پر پڑ جائے۔ یہ کام کر کے ہم واپس لوٹ آئے۔ اگلی صبح میں نے کرنل آنند کو فون کیا اور کہا کہ فوری مجھ سے آکر ملے آدھے گھنٹے میں کرنل آنند آ گیا۔ میں نے اسے کہا کہ ابھی تک مجھے اس کے معاملے میں کوئی کامیابی تو نہیں ہوئی ہے لیکن میرے INFORMERS نے مجھے بتایا ہے کہ چین جانے والی مین روڈ پر تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک کھائی میں انسانی ہڈیاں اور تین کھوپڑیاں پڑی ہیں۔ انہوں نے بنگلہ دیشی سفارت خانے کی ایک گاڑی کو بھی اس طرف کئی بار جاتے دیکھا ہے۔ مجھے کچھ شک سا ہوا اور تمہیں بتا دیا۔ آگے تم جانو۔ آئندہ مجھ سے اس جگہ کی صحیح لوکیشن پوچھی تو میں نے کہا کہ یہ تو میں نہیں جانتا مجھے صرف یہی معلوم ہوا ہے کہ اس سڑک پر پچاس کلومیٹر کے سنک میل سے ذرا آگے بائیں جانب گہرائی میں ہڈیاں وغیرہ پڑی ہوئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کہا کہ اڑتی ہوئی یہ خبر بھی سنی ہے کہ تین چار روز قبل جبیں اور اس کی والدہ گورکھ پور سے لکھنؤ جانے والی ٹرین میں دیکھی گئی ہیں۔ اس خبر کا SOURCE (ذریعہ) بھی میں تمہیں نہیں بتا سکتا کیونکہ وہ بھی ہمارا انفارمر ہے۔

اگلے روز شام کو کرنل آنند میرے ہوٹل آیا۔ اس نے بتایا کہ ہڈیاں اور کھوپڑیاں مل گئی تھیں جنہیں وہ اپنے ہمراہ سفارت خانے لے گیا۔ مردانہ جوتے کا ایک پیر بھی ملا ہے اور ایک بنگلہ دیشی اخبار بھی جو جھاڑیوں میں پھنسا ہوا تھا۔ ہم نے ہڈیاں وغیرہ دہلی بھیج دی ہیں تاکہ دانتوں کے لیبارٹری ٹیسٹ سے ہم کچھ تو آگے بڑھ سکیں۔ کرنل آنند نے اس ملاقات میں مجھے کئی بار کہا کہ میں پاکستانی گروپ سے پتہ چلاؤں کہ یہ تینوں ان کی حراست میں تو نہیں۔ ما معلوم کرنل آنند کو ان کے زندہ ہونے کا اتنا یقین کیوں تھا اس کی وجہ مجھے یہی محسوس ہوئی کہ وہ سوچتا ہوگا کہ DMI کے اتنے تربیت یافتہ اور قابل فخر تین جاسوس ایک ہی دن میں کیونکر ہلاک ہو سکتے ہیں؟ وقتی طور پر تو کرنل آنند سے میرا پیچھا چھوٹ گیا تھا مجھ پر مرنکز اس کی سوچ کو میں نے کئی حصوں میں منتشر تو کر دیا تھا لیکن یہ سب کچھ عارضی تھا بہت جلد اسے صحیح واقعے کا علم ہو جانا تھا جس کے بعد وہ بھرپور تیاری کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوتا اور اپنی ناکامی اور خجالت کا بدلہ لینے کی کوشش کرتا۔ میں اگر اکیلا ہوتا تو صرف اپنے چینی دوستوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتا لیکن مریم اور اس کے والدین کی وجہ سے میں نے اپنے مدافعتی حصار کو مضبوط کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے روز میں نے ان چاروں کمروں کی بیرونی کھڑکیوں میں گرل اور مضبوط جالی لگوائی اور آٹھ گورکھ سابق فوجی بطور چوکیدار بھرتی کئے۔ جو دو گروپوں میں بارہ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی دیتے دو گورکھے ہوٹل کے باہر ہمارے کمروں کی کھڑکیوں کے قریب کسی کو پھٹکنے نہ دیتے اور دو ہمارے فلور پر کسی کو ہمارے کمروں کے قریب جانے سے روکتے۔

(جاری ہے)

غازی

ہوٹل انتظامیہ نے میرے ان انتظامات پر تھوڑا بہت احتجاج بھی کیا لیکن میں نے کچھ دلائل اور کچھ پیسے دے کر ان کا منہ بند کر دیا۔ مریم جب ریٹورنٹ جاتی تو دو چینی دوستوں کے علاوہ میں خود بھی اس کے ساتھ جاتا۔ میں نے اپنے ساتھ ایک کے بجائے دو بسٹل، بھرے ہوئے فالٹو میگزین، گیس سلنڈر اور زہریلی سویوں کا ڈبہ رکھنا شروع کر دیا۔ ہم نے ہوٹل سے باہر جانا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ ایک تبدیلی میں نے اور کی۔ پاکستان جانے والے مہاجروں کو روانگی کے وقت ایئر پورٹ پر الوداع کہنے اور روپے دینے کے بجائے ان کی روانگی سے ایک روز پہلے شام کو اپنے ہوٹل میں بلوا کر ہی روپے دینے شروع کر دیئے۔ وہ بھی اس طرح کہ اگلے روز جانے والے سارے مہاجر بعد دوپہر ہوٹل کے لان میں اکٹھے ہو جاتے۔ محسن ان کے ONE WAY پاسپورٹ اور جہاز کے ٹکٹ لیکر میرے کمرے میں آ جاتا۔ انہیں چیک کر کے میں روپوں کے لفافے محسن کو دیتا جنہیں وہ مہاجروں میں بانٹ دیتا۔ میرا مقصد ذاتی تشہیر یا مہاجروں سے شکرے کے الفاظ سننے کی خواہش تو تھی نہیں میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ حقدار کو اس کا حق مل جائے۔

ایک روز میں شیر پنجاب ہوٹل گیا۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر میرا وہاں جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ ہر نام سنگھ نے میری اس ”بے مروتی“ کا جب بہت شکوہ کیا تو میں نے اسے بتایا کہ بھارتی سفارت خانہ میری جان لینے کے درپے ہے۔ میں موت سے تو نہیں ڈرتا لیکن حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر چکے ہیں کہ مریم اور اس کے والدین کی حفاظت کیلئے میرا زندہ رہنا ضروری ہے۔ ہر نام سنگھ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”بادشاہو۔ فکر کیوں کر دے ہو۔ میں چار گھور کھیاں نوں جانا آں۔ بڑے بہادر تے جان تلی تے لے کر تہاڑی حفاظت کرن گے۔ میرے دو بھتیگرے وی آج کل اتھے آئے ہوئے ہن۔ تے سارا دن روٹیاں توڑ دے رہندے نے۔ انہاں جئی کرپان تے برچھی ساڈے پنڈوچ کوئی نئی چلا سکتا۔ واگورودی کرپا ہوئی تے کل سویرتوں تہاڑی سیوا واسطے تہوڈے ہوٹل پہنچ جان گے۔ تے باراں باراں گھنٹے واری تہاڑی سیوا کرن گے“ میں نے ہر نام سنگھ کا شکر یہ ادا کیا اور کہا کہ میں نے پہلے ہی اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا ہے اور اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن سردار جی جس بات پر اڑ گئے، اڑ گئے۔ باوجود میرے کئی بار منع کرنے کے اگلی صبح سردار جی کے بھیجے ہوئے دو گورکھے اور ایک جوان بھتیجا میری حفاظت کے لئے لابی میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔

میرے پاس اب تین چینی دوستوں کے علاوہ 14 افراد ہماری حفاظت کیلئے موجود تھے۔ میں نے ان نئے چھ افراد کو اس طرح ڈیپلائے کیا کہ ہوٹل کی چار دیواری سے لے کر ہمارے کمروں تک پہنچنے کیلئے دشمنوں کو تین حصار توڑنے پڑتے۔ میں نے ان سب کیلئے ویلیں خریدیں تاکہ اگر کوئی ناخوشگوار صورت پیدا ہو جائے تو وسائل بجا کر ہمیں اور دوسرے محافظوں کو چوکنا کیا جاسکے۔ میں اپنے ان انتظامات سے مطمئن تھا۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور جو وقت مقرر ہے اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اس اٹل حقیقت کے باوجود اپنی حفاظت کرنے کا حکم بھی اللہ نے دیا ہے ورنہ رسول اللہ کافروں کی فراوانی کو دیکھتے ہوئے جنگ خندق میں خندق میں نہ کھدواتے۔

کرنل آنند کے فون آنے کی لخت بند ہو گئے تھے۔ میں نے کئی بار اسے فون کیا تو یہی جواب ملا کہ سیٹ پر موجود نہیں۔ یہ اچانک خاموشی اور لا تعلقی کسی بڑے طوفان کی آمد کا پتہ دے رہی تھی۔ بھارت میں ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے میں ان کی عادات و خصائل سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ ہندو فطرتاً اور مذہباً آمنے سامنے لڑنے سے ہمیشہ کتر اتا اور پشت پر وار کرنے کا ذہنی ہے ہم نے اپنا اسلحہ چیک کیا۔ بارودی اسلحہ کی ہمارے پاس کل ملا کر دوسو سے کم گولیاں تھیں۔ گیس سلنڈر اور زہریلی سویاں بھی ستر، اسی افراد کیلئے کافی تھیں لیکن ان کا کارآمد استعمال صرف اس وقت ہو سکتا تھا جب دشمن صرف چند فٹ کے فاصلے پر ہو۔ رائفل، اسٹین گن یا بندوق ہمارے پاس ایک بھی نہیں تھی۔ جس سے دشمن کو فاصلے پر روکا یا مارا جاسکے۔ میرے پاس جو بھی افرادی قوت اور اسلحہ تھا، اپنی دانست میں، میں نے اس سے بہترین نتائج حاصل کرنے کیلئے یہ DEPLOYMENT (ترتیب) کی تھی اور اس سے خاصا مطمئن بھی تھا۔

ایک روز تقریباً دس بجے مریم اپنے ریٹورنٹ جانے کیلئے تیار ہو کر میرے کمرے میں آ گئی۔ میں کپڑے تبدیل کر رہا تھا۔ وہ کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہیں سے اس نے مجھے بتایا کہ ایک چھوٹی ٹورسٹ بس ہوٹل میں آئی ہے اور کئی ٹورسٹ بس سے اتر رہے ہیں۔ میں بھی کھڑکی کے پاس گیا۔ ٹورسٹ ابھی بس سے اتر رہے اور اپنا سامان لے رہے تھے۔ اپنے قد، شکل و صورت سے یہ سب انڈین لگتے تھے۔ مختلف سوئیلین لباس پہنے ان ٹورسٹوں میں ایک قدر مشترک تھی۔ سب کے بال فوجی کٹ تھے۔ حالانکہ ان دنوں فلمی کٹ اور لمبے بال رکھنے کا عام رواج تھا۔ میں انہیں بس سے اترتے دیکھتا رہا۔ ایک لخت مجھے خطرہ محسوس ہوا۔ اور میں کمرے سے نکل کر کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا ریسیپشن پر جا پہنچا۔ شفٹ نیچر وہیں تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر نیچر اسے کہا کہ فرسٹ فلور پر جتنے بھی خالی کمرے ہیں۔ انہیں فوری طور پر ابھی میرے نام تک کر دے۔ نیچر میرے اس مطالبے پر حیران تھا اور کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ میں نے کہا ”DO IT AND DO IT RIGHT NOW“ (ابھی اور اسی وقت کرو) میں ہوٹل کا مستقل گاہک تھا۔ (جاری ہے)

غازی

نیجر میری اچھی یا بری شہرت سے بھی واقف تھا اس نے فوری طور پر گاہکوں کے کوائف لکھنے والے 10 کارڈ میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے ہر کارڈ کے نیچے دستخط کئے اور اب صورت یہ ہوگئی کہ فسٹ فلور پر پہلے سے ہمارے چار کمروں کے علاوہ بقیہ دس کمرے بھی ہماری تحویل میں آگئے۔ اس فلور پر صرف ایک کمرہ کسی یورپین نے لے رکھا تھا۔ میں نے نیجر کو کہا کہ جب وہ کمرہ خالی ہو جائے تو اسے بھی میرے نام پر بک کر دینا۔ کارڈوں پر دستخط کر کے نیجر کو میں گیارہویں کمرے کے متعلق ہدایت دے ہی رہا تھا کہ سارے ٹورسٹ لابی میں آگئے۔ ان کے لیڈر نے کمرے بک کرنا چاہے تو اسے بتایا گیا کہ صرف گراؤنڈ فلور پر کمرے مہیا ہیں۔ لیڈر نے ریسپشن والوں سے جھگڑنا شروع کر دیا کہ ہم نے TELEX بھیجی تھی اور یہ خصوصی ہدایت دی تھی کہ فسٹ فلور پر کمرے بک کئے جائیں تو پھر فسٹ فلور کے کمرے اوروں کو کیوں دیئے گئے نیجر نے ٹیکس نکالی اور لیڈر کو دکھا کر کہا کہ ٹیکس کے مطابق آپ گزشتہ شام متوقع تھے۔ ہم نے آج صبح تک انتظار کیا اور اب آپ کی آمد سے چند منٹ پہلے ہی کمرے بک کئے ہیں۔ لیڈر کہنے لگا کہ آپ ان نئے مہمانوں کو نیچے شفٹ کر دیں اور ہمیں لازماً فسٹ فلور پر کمرے دیں۔ نیجر نے جواب دیا کہ یہ کمرے مہمانوں نے نہیں بلکہ ایک ہی مہمان نے بک کئے ہیں جو سامنے صوفے پر بیٹھا ہے۔ ابھی تو ہم نے کمروں کی چابیاں بھی انہیں نہیں دی ہیں۔ میں سامنے صوفے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ لیڈر میرے پاس آیا اور انگریزی میں کہنے لگا کہ ہم آپ کے بہت مشکور ہوں گے اگر فسٹ فلور کے کمرے آپ ہمیں دے دیں اس کی انگریزی اور عمر سے میں نے اندازہ لگایا کہ اگر یہ فوجی ہے تو کیپٹن کے عہدے کا ہوگا۔ میں نے انگریزی میں بے تکلفی سے اسے کہا "کیپٹن مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے یہ کمرے بھارتی سفارت خانے کے کرنل آنند اور میجر باسو کے کہنے پر ان کے مہمانوں کیلئے بک کئے ہیں۔ کرنل آنند سے تو کئی روز سے رابطہ نہیں ہوا۔ میجر باسو نے آج صبح فون پر مجھے کہا تھا کہ شاید آنے والے مہمانوں کی ٹیکس ہوٹل نہ پہنچی ہو۔ اس لئے میں ذاتی طور پر یہ کمرے بک کروا دوں" میں نے بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیڈر نے کہا۔ "دراصل ہم کل شام ہی پہنچنے والے تھے لیکن ہماری بس کارڈی ایئر خراب ہو گیا۔ اس لئے رات ہمیں راستے میں بسر کرنا پڑی اور اب یہاں پہنچے ہیں۔"

اینڈ تھینک یو ویری مچ۔ ہم ہی کرنل آنند کے مہمان ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ ہی لکھنؤ کینٹ سے آئے ہیں اور انہیں سفارت خانے چھوڑ کر ہم سیدھے یہاں آرہے ہیں" ساری بات تو مجھے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ان ٹورسٹوں کے ہیئر کٹ دیکھ کر ہی سمجھ آ چکی تھی۔ جو تھوڑا بہت شک تھا۔ وہ لیڈر کی باتوں سے ختم ہو گیا۔ اب تو میں محض لطف لینے کیلئے بات آگے بڑھا رہا تھا۔ میں نے کہا "پہلے تم فون پر کرنل آنند یا میجر باسو کو یہ بتا دو کہ ان کے دوست آصف نے ان کی ہدایت کے مطابق کمرے بک کروا رکھے تھے۔ میں نے اسے بھارتی سفارت خانے کا نمبر دینا چاہا۔ تو اس نے بتایا کہ نمبر اس کے پاس ہیں وہ فون کرنے ریسپشن کی طرف گیا۔ میں نے اوپر دیکھا تو مریم فسٹ فلور کے کھینڈار کی کھڑکی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ ذرا اونچا کر کے مجھے دکھایا۔ اس میں ہنسل تھا۔ اس نے آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا تو یہ دوست نہایت مستعدی سے اپنے کوٹوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ انہوں نے جیبوں میں ہاتھوں کی حرکت سے مجھے سمجھا دیا کہ ان کے ہاتھوں میں بھی ریوا لور ہیں۔ میں نے بھی اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھے ہنسل سے سیفٹی کو ہٹایا۔ دو تین منٹ ٹیلی فون پر بات کرنے کے بعد لیڈر واپس مڑا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا بات ہوگئی؟ اب کمرے تمہارے اور تمہارے دوستوں کے لئے تیار ہیں۔" "WE DONT NEED" لیڈر نے یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کو واپس چلنے کا کہا۔ شرمندگی اور خفت اس کے چہرے سے صاف عیاں تھی لیکن اس کی آنکھوں سے شعلے بھی نکل رہے تھے۔ جب وہ لابی سے نکلنے لگا تو میں نے اونچی آواز میں کہا CAPTIAN PAY MY REGARDS TO ANAND AND BASU (آنند اور باسو کو میرا آداب کہنا) میرے یہ الفاظ جلتی پرتیل ڈالنے کے مترادف تھے۔ لیکن وہ خاموشی سے چلے گئے۔ بزدل اور ڈرپوک قوم سے جو تھے۔ ورنہ میں یا کوئی بھی جرات مند پاکستانی ہوتا تو اس بات کا جواب گولیوں سے دیتا۔

اس گروپ کے جانے کے بعد میں نے اپنے حفاظتی حصار کو دوبارہ چیک کیا کیونکہ کرنل آنند اب ریگولر بھارتی فوج کے دس جوانوں اور افسروں کی کمک اپنے ہمراہ لایا تھا۔ کرنل آنند یا بھارتی سفارت خانے کیلئے مجھے ہلاک کرنا بہت آسان تھا لیکن وہ مجھے ہلاک نہیں بلکہ زندہ گرفتار کر کے بھارت لے جانا اور وہ مجھ سے ایسا سلوک کرنا چاہتے تھے کہ میں دنیا کیلئے عبرت کا نشان بن جاؤں موت تو مصیبتوں سے چھٹکارے کا نام ہے۔ مجھے 65ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کے 6TH LANCERS (چھٹے ٹینک اسکواڈرن) کے کرنل نذیر احمد سے بھارتیوں کا سلوک بار بار یاد آتا ہے۔ یہ ٹینک اسکواڈرن اپنی انفنٹری سے کٹ کر کھیتوں کے بیچوں بیچ آگے بڑھتا رہا اور جب سڑک پر پہنچا تو سنگ میل سے معلوم ہوا کہ امرتسر صرف پانچ میل دور ہے اس اسکواڈرن کے پاس نہ تو پیٹرول تھا اور نہ پلائی لائن برقرار تھی۔ لامحالہ بھارتی فوج نے انہیں نرنے میں لے لیا۔

(جاری ہے)

غازی

اسکو ڈرن کے بہت سے جوان تو کھینٹوں میں چھپتے چھپاتے واپس بھاگے اور اپنی فوج سے جا ملے۔ کرنل نذیر کو اپنے کئی ٹینکوں اور جوانوں کے ساتھ بھارتی فوج نے گرفتار کر لیا اور دہلی لے جا کر ٹینک کے اوپر رسیوں سے باندھ کر ساری دہلی کی سڑکوں پر گھملا گیا بھارتیوں نے میرے ساتھ تو اس سے بھی کئی گنا بدتر سلوک کرنا تھا اور شہر شہر میری ذلت اور رسوائی کرنی تھی۔ اسی لئے کرنل آنند بھارتی سینا کے آٹھ دن آدمیوں کو اپنا پورا ہوٹل میں ٹھہرانا چاہتا تھا تا کہ موقع ملے ہی مجھے زندہ قابو کر کے بھارت پہنچایا جائے۔ میں ان کی چال سمجھ گیا تھا اور اسی لئے میں نے آنے والے گروپ کیپٹن سے کہا تھا کہ ٹیلی فون پر کرنل آنند یا میجر باسو کو میرے متعلق بتا دے۔ اب ان کا ہوٹل میں رہنا بے سود تھا لہذا وہ یقینی بھارتی سفارت خانے چلے گئے تھے۔

مریم بھی اس صورت حال سے بخوبی واقف تھی ہم نے فیصلہ کیا کہ کچھ عرصے کیلئے باہر نکلنا بالکل بند کیا جائے اور ہوٹل میں قلعہ بند ہو کر رہا جائے۔ جب یہ فیصلہ ہو گیا تو ہم چینی دوستوں کے ساتھ ریسٹورنٹ گئے۔ مریم نے کھانا پکانے کے کچھ برتن مصالحوں اور کھانوں کی کچی اشیا سے بھرا ہوا ڈیپ فریزر چینی دوستوں سے اٹھوا کر گاڑی کی چھت پر رکھوایا اور اپنا پورا ہوٹل لے آئے ہوٹل انتظامیہ نے ہمارے ساتھ بڑا تعاون کیا اور ڈیپ فریزر اسٹور میں رکھوا کر اپنے وسیع کچن کے دو چولہے ہمیں دے دیئے اور مریم کی والدہ نے اپنے ریسٹورنٹ کے دو خانساموں کی مدد سے بہترین کھانے تیار کرنا شروع کر دیئے۔ دن یونہی گزرتے جا رہے تھے اس دوران مجھے مریم کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا تھا اور اس کی مجھ سے اب تک چھپی ہوئی خوبیاں بھی ظاہر ہو گئی تھیں وہ وعدے کی از حد پابند کسی حال میں بھی جھوٹ نہ بولنے والی، انتہائی وفا شعار اور اپنے مرد کو خود پر فوقیت دینے والی، نڈر اور جرأت مند عورت تھی۔ قربانی اور خدمت کا جذبہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مدہم آواز میں گفتگو کر کے وہ اپنی نسوانیت کا اظہار کرتی، میری کسی بھی بات پر بھی وہ صرف مشورہ دیتی اور اپنی بات منوانے کیلئے بحث یا ضد نہ کرتی۔ میرے سوا کسی مرد سے آنکھیں ملا کر بات نہ کرتی اور میری ذرا سی شوخ بات پر اس کا چہرہ حیا سے فوراً سرخ ہو جاتا۔ میں سوچتا تھا کہ دیر سے ہی سہی لیکن میرے تصورات کے عین مطابق مجھے زندگی کی ساتھی مل گئی ہے۔ اتنے قلیل وقت میں ہی وہ میری زبان سے نہیں بلکہ میری آنکھوں اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے میرے دل کا حال سمجھنے لگی۔ ہم گھنٹوں اکٹھے بیٹھے آئندہ زندگی کے پروگرام بناتے رہتے لیکن تقدیر ہمارے مستقبل کے سہانے خوابوں اور تدبیروں پر خنداں تھی اور آخر کار 28 اپریل کا وہ منحوس دن آ ہی گیا۔ صبح ہی ریسٹورنٹ کے چوکیدار نے آ کر بتایا کہ وہ ٹرک جس میں ریسٹورنٹ کیلئے تازہ جھینگوں کا کنٹینر لدا ہوا تھا، کھٹنڈو سے ستر اسی کلو میٹر کے فاصلے پر ایکسل ٹوٹ جانے کی وجہ سے رکا ہوا ہے اور جھینگوں کو تازہ رکھنے کیلئے برف پانی بن کر کنٹینر سے بہ رہی ہے۔ مریم نے کہا کہ اگر ساری برف پگھل گئی تو جھینگے خراب ہو جائیں گے۔ اس نے مجھ سے خراب ٹرک تک جانے اور کنٹینر لانے کی اجازت مانگی۔ میں نے کوئی ہرج نہ سمجھتے ہوتے اسے اجازت دے دی اور اس کی حفاظت کیلئے دو چینی دوست اور چار گورکھے اپنی وین میں ہمراہ بھیج دیئے کنٹینر رکھنے کیلئے میں نے ہوٹل کی پک اپ بھی کرائے پر لے لی۔ مریم کے ساتھ اس کی والدہ بھی اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ یہ تینوں گاڑیاں تقریباً دس بجے روانہ ہوئیں اور اندازے کے مطابق انہیں سہ پہر تین بجے تک واپس آ جانا چاہئے تھا۔ اس روز صبح ہی سے میرا دل بلا وجہ بے چین تھا۔ دل پر انجان سا بوجھ تھا۔ تین بجے تک جب گاڑیاں واپس نہ آئیں تو میری بے چینی بڑھ گئی۔ میں بار بار کمرے کی کھڑکی میں سے باہر جھانکتا اور مایوس پلٹ جاتا۔ یونہی چار بج گئے مجھ میں اب انتظار کی مزید تاب نہ تھی۔ میں نے رکشہ لیا اور شیر پنجاب ریسٹورنٹ جا کر ہر نام سنگھ کی گاڑی لی اور اس سڑک پر تیزی سے چل دیا۔ جدھر مریم گئی تھی۔ کھٹنڈو چونکہ اونچے پہاڑوں میں گھری وادی میں واقع ہے اس لئے سورج دس بجے دکھائی دیتا اور ساڑھے چار بجے تک نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ جلد ہی سڑک وادی سے نکل کر پہاڑ تک پہنچی اور چڑھائی شروع ہوئی۔ جگہ جگہ تنگ اور خطرناک موڑ تھے۔ میں پورا ایکسپلیز دبائے اندھا دھند گاڑی چلائے جا رہا تھا۔ ایک موڑ کے بعد مجھے اگلے موڑ کے قریب اپنی وین اور پک اپ کھڑی نظر آئی لیکن مریم کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ خدشات نے یکدم سرا بھارا۔ میں ان گاڑیوں تک پہنچا۔ چند لوگ سڑک کے کنارے کھڑے ایک گہری کھائی میں جھانک رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو مریم کی گاڑی سینکڑوں فٹ گہرائی میں اٹی پڑی تھی۔ مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ سب سمجھ آ چکا تھا۔ میں کھائی میں اترا اور دوڑتا، پھلانگتا، گرتا، پڑتا گاڑی تک پہنچا۔ چینی دوست اور چاروں گورکھے گاڑی کو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چینیوں نے مجھے دیکھا تو سر جھکائے، گاڑی کے اندر مریم اور اس کی والدہ کے بے جان جسم پڑے تھے۔ گاڑی کا اسٹیرنگ اس کے سینے میں دھنسنے سے اس کا خون بہہ کر اس کے لباس سے ہوتا ہوا اس کے چہرے پر پھیل چکا تھا۔ یہی حالت اس کی والدہ کی تھی۔ میرا دماغ بالکل معطل ہو چکا تھا تو میرے منہ سے کوئی لفظ نکلتا تھا اور نہ ہی آنکھوں سے آنسو۔ بس ایک ہی دھن تھی کہ مریم کو اس موت کے پنجرے سے باہر نکالوں۔ میں نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ یہ دس کے نوٹ تھے یا سو کے۔ میں نے ایک گورکھے چوکیدار کو گڈی دی اور اسے اشارے سے کہا کہ اوپر سڑک پر کھڑے لوگوں کو بلاؤ۔ گورکھے نے بلند آواز سے اوپر والوں کو پکارا اور گڈی دکھائی۔ اوپر کھڑے پانچ چھ آدمی بھاگتے ہوئے نیچے آئے اور سب نے مل کر گاڑی کو سیدھا کیا۔ گاڑی کے دروازے، چھت آگے اور پیچھے کی باڈی پچک گئی تھی۔ سڑک سے یہاں تک پہنچتے ہوئے گاڑی نامعلوم کتنی بار الٹی اور سیدھی ہوئی ہوگی۔ بڑی مشکل سے ان لوگوں نے دروازہ کھولا۔ میں نے بڑی آہستگی سے مریم کے بے جان جسم کو نکالا۔

(جاری ہے)

غازی

اس کا جسم میرے ہاتھوں پر تھا اور میں اس کے خون سے بھرے چہرے پر اپنا چہرہ رگڑتا جا رہا تھا۔ اسی طرح ہاتھوں میں اسے اٹھائے میں آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتا گیا۔ سڑک پر آ کر میں نے مریم کو کچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ میرے دونوں ہاتھ چہرہ اور لباس مریم کے خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ مجھے اس وقت کسی اور کا خیال تھا نہ پرواہ۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسی تیزی سے چلاتا کشمیری مسجد کے سامنے فصیح کے گھر کے کپاؤنڈ میں گاڑی لے گیا۔ کپاؤنڈ میں بچے کھیل رہے تھے۔ میں گاڑی سے اترا۔ خون سے لتھڑے میرے چہرے اور ہاتھوں کو دیکھ کر بچے خوف سے چیختے ہوئے گھر کی طرف بھاگے۔ گورکھا چوکیدار بھی بچوں کی چیخیں سن کر میری طرف آیا لیکن میرا حلیہ دیکھ کر دور ہی رک گیا اور اپنی کھکھڑی نکال لی۔ میری کیفیت ایسی تھی کہ کھکھڑی تو کیا چیز ہے، دنیا کا مہلک ترین ہتھیار بھی مجھے میرے ارادے سے روک نہیں سکتا تھا۔ میں نے برآمدے میں لگی کال بیل مسلسل بجانی شروع کی اور ہاتھ اس وقت تک نہیں ہٹایا جب تک فصیح باہر نہیں آ گیا۔ میرا حلیہ دیکھ کر وہ چونک اٹھا وہ سمجھا کہ میں زخمی ہوں۔ کہنے لگا کہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ پلٹا تو میں نے اس کے بازو کو زور سے پکڑا اور کہا "فصیح صاحب مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ میری حقیقت اور اصلیت کو آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ بڑی سے بڑی مصیبت اور تکلیف کو میں نے ہنستے ہوئے اور ہمت سے جھیلا ہے۔ میں نے کبھی بھی کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگی۔ لیکن آج آپ کے سامنے بے یار و مددگار اور لاوارث شخص کھڑا ہے میں، ایک زندہ لاش ہوں جس کی روح ایک بے جان جسم کی صورت میں گاڑی کے اندر پڑی ہے اور آپ سے مدد کی بھیک مانگتا ہوں۔ مجھے مایوس نہ کیجئے گا"۔ فصیح صاحب آنکھیں پھاڑے میری بات سن رہا تھا، "فصیح صاحب مریم میری زندگی تھی، میری روح تھی جو مجھ سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو چکی ہے۔ آپ کے سوا مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا جو مجھ لاوارث کی مدد کرے اور میری لاوارث مریم کے کفن و دفن کا بھی انتظام کرے میں آج اور جلد از جلد اس کے زخموں سے چور جسم کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانا چاہتا ہوں"۔ فصیح نے چنگ وار ریسٹورنٹ میں مریم اور اس کے میرے ساتھ قرب کے متعلق یقیناً بہت کچھ سن رکھا ہوگا کیونکہ تقریباً سبھی مہاجروں کو اس بات کا علم تھا اور فصیح کے ہاں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ فصیح نے مجھ سے صرف یہ پوچھا کہ یہ کیسے ہوا۔ میں نے جواب دیا "کارا ایکسیڈنٹ" فصیح چند لمحوں خاموش رہا اور پھر بولا "اب یہ سب میری ذمہ داری ہے۔ میں فوری سبھی انتظامات کرتا ہوں" یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر مستورات کو بتانے اور مریم کے سفر آخرت کے انتظام کرنے کا کہنے چلا گیا۔ میں گاڑی کی جانب آیا اور مریم کا سراپنی گود میں رکھ کر معلوم کیا کچھ کہتا رہا۔ کیا کیا سوال میں نے اس سے نہ کئے۔ لیکن میری آنکھوں کے اشارے سمجھنے والی اور گھٹنوں مجھ سے باتیں کرنے والی مریم اب نہ تو آنکھیں کھول رہی تھی اور نہ ہی میرے کسی سوال کا جواب دیتی تھی۔ آج صرف ایک طرفہ گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے سے خون کو صاف کرنا چاہا تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہو، یہ خون صاف نہ کرو اور اس خون کے ساتھ کان لگا کر سنو، ہر بوند سے تمہارا ہی نام نکل رہا ہے۔ میں اسی کیفیت میں نجانے کتنی دیر مریم سے باتیں کرتا رہا کہ فصیح کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا کئی عورتیں ایک چارپائی اور بستر لئے کھڑی تھیں۔ میں نے مریم کے جسم کو اٹھایا اور بڑی احتیاط سے بستر پر لٹا دیا۔ اس کے ابھی زخم تازہ تھے اور ذرا سی بے احتیاطی سے ان میں درد اٹھ سکتا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے کو کئی بار چومنا، فصیح نے کھینچ کر مجھے الگ کیا اور کہا کہ جب تک میت کو غسل دیا جائے گا اور نماز جنازہ ہوگی تب تک قبرستان میں قبر بھی تیار ہو جائے گی۔ اس نے مجھے اپنے کپڑے لا کر دیئے اور کہا کہ غسل کر کے یہ کپڑے پہن لو تا کہ نماز جنازہ میں شرکت کر سکو۔ قارئین آج 23 سال کے بعد یہ لکھتے ہوئے میرے زخم پھر تازہ ہو چکے ہیں اور ان سے خون رسنے لگا ہے۔ میری اس کیفیت کا صاحب دل ہی احساس کر سکتے ہیں۔ رات ساڑھے دس بجے دو پیٹرو مسک گیٹوں کی روشنی میں ہم دس بارہ آدمی مریم کو اس کی آخری آرام گاہ میں سپرد خاک کر کے واپس لوٹے۔ لاوارثوں کے جنازے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ واپسی پر فصیح کے بے حد اصرار پر میں نے چائے کا ایک کپ پیا اور واپس ہوٹل آ گیا تو معلوم ہوا کہ چینی دوست مریم کی والدہ کی میت کو لے کر سیدھے چنگ وار ریسٹورنٹ گئے اور انہوں نے ہی مریم کے والد کو اس حادثے کی خبر بھی دی۔ مریم کا والد بھی اپنے گھر چلا گیا تھا۔ دوسرے روز مریم کی والدہ کو بھی مریم کے پہلو میں دفن کر دیا گیا مجھے بار بار ایک ہی خیال آتا تھا کہ مریم کار کے حادثے میں ہلاک نہیں ہوئی بلکہ اسے زہر کے انجکشنوں سے ہلاک کیا گیا ہے اور اسے یہ انجکشن دینے میں ہر اس مجازا تھارٹی کا ہاتھ تھا جو کھٹمنڈو میں میرے قیام کو بلا وجہ طویل تر کر رہے تھے۔ کبھی میرا دل یہ کہتا کہ شاید شادی کے بعد مریم کا رویہ مجھ سے بدل جاتا یا اس کیلئے میرے جذبات اور محبت میں وہ شدت نہ رہتی جو اب تھی۔ اور قدرت یہ چاہتی تھی کہ ہم دونوں اس وقت جسمانی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہوں جب ہماری محبت اور جذبات کی شدت انتہا پر ہو۔ مریم تو چند لمحوں کی تکلیف سہہ کر ہمیشہ کیلئے آرام کی نیند سو گئی لیکن میں بد بخت اس کی یاد میں آج تک جلتے کونوں پر سلگ رہا ہوں۔ اس معاملے میں قدرت واقعی اس پر مہربان تھی۔

30 مئی کو مریم کے والد کے گھر میں دونوں ماں بیٹی کے قتل ہوئے جس میں مہاجروں کی خاصی بڑی تعداد کے علاوہ فصیح کے گھر آنے کے بھی مرد شریک تھے۔ سب مجھ سے اور مریم کے والد سے تعزیت کر رہے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے اور تسلی دیتے۔ میں نے چینی دوستوں اور گورکھے پہرے داروں سے حادثے کی تفصیلات پوچھیں۔ (جاری ہے)

غازی

چینی دوستوں نے مریم کے والد کے ذریعے اور گورکھوں نے اپنی ٹوٹی ہندی میں بتایا کہ واپسی پر سب سے آگے وین میں وہ، ان کے پیچھے مریم کی گاڑی اور سب سے پیچھے ہوٹل کی پک اپ تھی۔ وہ خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے مریم اسٹیرنگ پر شاید قابو نہ رکھ سکی اور گاڑی لڑھکتی ہوئی کھڈ میں جا گری۔ میرے کرید کرید کر پوچھنے پر بھی انہوں نے کسی تخریب کاری یا دشمن کے حملے کو خارج از امکان قرار دیا۔ جائے حادثہ پر میں نے دوبارہ جا کر حادثے کا شکار گاڑی کا تفصیلی معائنہ کیا۔ چاروں نائٹ صحیح حالت میں تھے ونڈ شیلڈ اور گاڑی کے سارے شیشے کچھ سلامت اور کچھ ٹوٹے ہوئے تھے۔

لیکن گولی کا نشان کسی شیشے پر نہ تھا۔ بریکیں بھی درست حالت میں تھیں اگر مجھے ذرا سا بھی ثبوت مل جاتا کہ اس حادثے میں دشمن کا ہاتھ ہے تو میں بھارتی سفارت خانے اور اس کے سارے عملے کا نام و نشان تک مٹا دیتا۔ حادثے میں کسی کے لوٹ نہ ہونے کا یہ بھی ثبوت تھا کہ مریم کے روانہ ہوتے وقت کسی کو بھی علم نہ تھا کہ گاڑیوں میں کون تھے اور کہا جا رہے تھے۔ جھینگوں کے ٹرک کا ایکسل واقعی ٹوٹ گیا تھا کہیں بھی ایسا جھول دکھائی نہیں دیتا تھا جس سے یہ حادثہ دشمن کی سازش دکھائی دیتا۔ ہر نام سنگھ کو دوسرے روز پتہ چلا تو وہ میرے ہوٹل آ کر مجھ سے گلے لگ کر دیر تک چیخ چیخ کر روتا رہا۔ میری مایوسی اور دکھ انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ریسٹورنٹ کا سارا سامان واپس بھیج کر میں نے سارے گورکھاچوکیداروں کو رخصت کر دیا، ہر نام سنگھ کے بھتیجے بھی میرے مجبور کرنے پر واپس چلے گئے۔ میں نے چینی ڈوستوں کو بھی واپس بھیجنا چاہا تو وہ مریم کے والد کو لے آئے اور کہا کہ وہ واپس جانے کیلئے میرے حکم یا مرضی کے پابند نہیں۔ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تک میں کھٹمنڈو میں رہوں وہ میری حفاظت کریں۔ میں نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا اور سوائے محسن اور چینی دوستوں کے کسی سے بھی ملنے سے انکار کر دیتا۔ مہاجروں کیلئے روپے محسن ہی لیکر جاتا اور ان میں تقسیم کرتا۔ میں نے ایک بار پھر سارے مہاجروں میں ہزاروں روپے فی کنبہ تقسیم کئے۔ میں نے ہوٹل کے فرسٹ فلور پر بک کئے ہوئے کمرے بھی حادثے کے تیسرے روز کینسل کر دیئے۔ دل گھبرانے پر میں اچانک ہی کمرے سے باہر نکلتا اور چینی دوستوں کے بغیر ہی گاڑی لے کر جائے حادثہ پر چلا جاتا بہت سے پھول لے کر مریم کی قبر پر جا کے گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ آج جب میں اپنی ان دنوں کی حالت کا تجزیہ کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ بمبئی میں میری اپنی زندگی سے محبت کی وجہ DMI کی حراست سے فرار میں کامیابی تھی اس وقت میری زندگی کا ہر لمحہ میری کامیابی اور DMI کی شکست کا مظہر تھا۔ کھٹمنڈو میں میری زندہ رہنے کی خواہش کو مریم نے کئی گنا بڑھا دیا تھا اور اس کے انتقال نے میری اس خواہش کو یوں ختم کر دیا جیسے ایر پاکٹ میں آ کر جہاز یکدم ہزاروں فٹ نیچے چلتا اور بعض اوقات گرتے ہوئے پتھر کی طرح زمین سے ٹکرا جاتا ہے۔ میری اس حالت کی خبر چینی دوستوں نے مریم کے والد کو دی تو اس نے میرے ہوٹل آ کر مجھے قرآن پاک دیا اور کہا کہ زیادہ سے زیادہ وقت تلاوت کروں اور اس کا ثواب مریم کو بخشوں۔ میں نے تلاوت شروع کر دی اور میرے دل کا بوجھ کم ہونے لگا۔ مجھے سکون ملتا گیا اور تلاوت کا وقت بڑھتا گیا۔ یہ سچا کلام واقعی ہر دکھ اور مصیبت کو دور کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔

قارئین کرام، میرا اور مریم کا جذباتی رشتہ ہمارا ذاتی معاملہ تھا اور "غازی" کے سلسلے میں، میں نے ذاتی الجھنوں کو تحریر کرنے سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ لیکن اس واقعے کو تفصیلاً تحریر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں قارئین کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کوئی بھی شخص کسی اعلیٰ سے اعلیٰ نظریے اور بلند ترین مقاصد کے حصول کیلئے اگر اپنی زندگی وقف بھی کر دے اور اپنی جان داؤ پر لگا دے پھر بھی ان کی ذاتی زندگی اور فطرتی کمزوریاں اس کے دل و دماغ کے کسی گوشے میں ضرور موجود رہتی ہیں۔ اعلیٰ نظریے اور بلند مقاصد کے حصول کی خواہش ان فطرتی کمزوریوں کو وقتی طور پر دبا دیتی ہے لیکن فنا نہیں کر سکتی۔ میری آپ بیتی پر ہی ایک نظر ڈالیں۔ اپنے وطن کی خاطر اور 71ء کی جنگ میں ہزیمت کا بدلہ لینے کی خواہش میں، میں نے دہلی، گورکھپور، بمبئی اور کھٹمنڈو میں خون کی ہولی کھیلی اور دشمن کو اتنا جانی اور مالی نقصان پہنچایا جس کی تلافی وہ مدتوں تک نہ کر سکا۔ میرے پیش نظر صرف پاکستان کا دشمن بھارت اور ازلی مکار اور چالاک بھارتی ہندو تھا جس نے ہمارے نازک وقت میں جسے ہمسائے کی طرح ہماری مدد کرنے کے بجائے موقع غنیمت جانتے ہوئے ہم پر کاری وار کیا تھا لیکن جب مجھے ذاتی صدمہ پہنچا تو دکھ اور درد کا اندازہ ہوا لیکن آج پاکستان میں کیا ہو رہا ہے ایک خدائے ایک رسول اور ایک قرآن کے ماننے والے پاکستانی مسلمان ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہا رہے ہیں کیا یہ خون بہانے سے پاکستان کے دشمن کم ہو رہے ہیں ہر روز بے گناہ معصوم بچے، ضعیف بوڑھوں اور بھرپور جوانوں کی لاشیں اٹھائی جا رہی ہیں۔ میں نے تو دشمن ملک میں ہندو شہریوں کی بھی جان لینے سے احتراز کیا لیکن آج اپنے ملک میں درندگی کی جولہ اٹھی ہے اس سے کوئی بھی شہری محفوظ نہیں۔ صوبائیت، لسانیت، اور مسلک کی آڑ لے کر ہمارا ازلی دشمن بھارت ہمارے ذہنوں پر اس قدر حاوی ہو چکا ہے کہ ہم محض کٹھ پتلیاں بن کر رہ گئے ہیں جن کی تاریخ بھارت کے ہاتھ میں ہیں۔ 65ء کی جنگ میں ایک نقطے پر جمع ہو جانے والی قوم آج بے شمار مصنوعی دائروں میں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ دنیا بھر کیلئے ہم ایک تماشہ بن کر رہ گئے ہیں پاکستانیوں کیلئے آج پاکستان کی مساجد، امام بارگاہیں، اسکول، سرکاری عرصیکہ ہر جگہ غیر محفوظ ہو چکی ہیں۔

(جاری ہے)

غازی

بھارت بھی یہی چاہتا ہے اور اس میں وہ خاصا کامیاب ہو چکا ہے۔ بے کار اور بد قماش لیڈروں اور سازشی سیاستدانوں کی چکنی چڑی باتوں میں آ کر آج ہم اپنے وطن کی سالمیت کو بھی پس پشت ڈال چکے ہیں اور اس حقیقت کو بھی فراموش کر چکے ہیں کہ خدا نخواستہ اگر پاکستان ہی نہ رہا تو پھر نہ تو ہمارا کوئی وطن ہوگا اور نہ ہی شناخت اور یہ صوبائی، لسانی اور مذہبی مسلکوں کے جھگڑے دھڑے کے دھڑے رہ جائیں گے۔ خدا را ہوش کے ناخن لیجئے اور اپنے دوست اور دشمن کی پہچان کریں۔

قرآن حکیم کی آیت ہے کہ جس نے کسی کا خون ناحق کیا اس نے گویا پوری انسانیت کا قتل کیا۔ قرآن کی اس سچائی کو نہ ماننے والے بھی آخر کار اس کی حقانیت کے معترف ہو گئے۔

ہیروشیما پر ایٹم بم پھینکنے والا امریکی پائلٹ بم کی ہلاکت خیزی اور تباہ کاری کی خبر پڑھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا اس کا نام غالباً رابرٹ تھا۔ پاگل خانے میں وہ ایک ہی فقرہ دہراتا تھا ONE WHO KILLS A MAN, HE KILLS A WHOLE WORLD. DONT KNOW HOW MANY WORLDS I HAVE KILLED (جو ایک انسان کو ہلاک کرتا ہے۔ وہ ایک دنیا کو ہلاک کر دیتا ہے۔ نجانے میں نے کتنی دنیاں ہلاک کی ہیں) اور رابرٹ کا یہ کہنا بالکل درست ہے، ہلاک تو ایک شخص ہوتا ہے لیکن اس کے بچے، یتیم ہو جاتے ہیں۔ ضعیف ماں باپ بے سہارا رہ جاتے ہیں۔ بیوی بیوہ ہو جاتی ہے، بہنوں کا سہارا چھین جاتا ہے۔ ہلاک تو ایک انسان ہوتا ہے لیکن ایک دنیا ختم ہو جاتی ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کا خون بہانے والے پاکستانی مسلمانوں، ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ ہم نے کتنی دنیاں ختم کی ہیں؟

دن یونہی گزرتے جا رہے تھے۔ بیشتر وقت میں اپنے کمرے میں ہی رہتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن میں مریم کے والد کے پاس جاتا اور اسے دلا سہ دیتا لیکن بے سود اس کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ پھر انی ہوئی آنکھوں سے وہ میری باتیں سنتا اور مجھے گلے لگا لیتا۔ میں نے اسے بہت زور دیا کہ وہ ریسٹورنٹ اور گھر بیچ کر پاکستان چلا جائے لیکن وہ نہ مانا۔ وہ کہتا تھا کہ کھٹمنڈو میں میری بیوی اور بیٹی دفن ہیں۔ انہیں کیونکر اکیلا چھوڑ کر جاؤں جو زندگی میں میرے ساتھ تھیں۔ مرنے کے بعد بھی انہی کے ساتھ رہوں گا۔ میری ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ کھٹمنڈو سے جانے کی بات سن کر ہی وہ بے چین ہو جاتا اور برہمی کا اظہار کرتا۔ یہ دلوں کے معاملے تھے جنہیں دماغ سمجھ نہیں سکتا۔ میں نے بھی اسے مزید تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس بارے میں کبھی بات نہ کی۔

جون کی 16 تاریخ صبح ہی مجھے پاکستانی ملٹری اٹاچی کا فون آیا کہ آج مجھے پاکستان کیلئے روانہ ہونا ہے۔ اس لئے اپنی تیاری کر لوں اور کسی کو بھی میری روانگی کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ میں حیران تھا کہ نہ تو میرے محلے نے مجھے اس بارے میں کوئی اطلاع دی تھی اور نہ ہی سفیر صاحب نے کوئی اشارہ۔ پھر میری روانگی کو پوشیدہ کیوں رکھا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی پاکستان سفارت خانے کا ایک کارکن ہوٹل آیا اور مجھے سفیر صاحب کا خط دیا خط میں میری دو پاسپورٹ سائز فوٹو فوری طلب کی گئی تھیں اور مجھے تین بجے روانگی کیلئے سفارت خانے پہنچنے کا کہا گیا تھا اور اپنی روانگی کو راز میں رکھنے کی پر زور تلقین کی گئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹ کر دو سوٹ کیسوں میں پیک کیا۔ ہوٹل کے لا کر سے تمام رقم نکالی۔ ہوٹل والوں کے پاس ابھی میرا دو ہزار سے زیادہ ایڈوانس جمع تھا اسے ویسے ہی چھوڑا اور انتظامیہ کو چند روز کیلئے کھٹمنڈو سے باہر جانے کا کہہ کر اور تینوں چینی ساتھیوں کو لیکر ہوٹل سے رخصت ہوا۔ سب سے پہلے میں مریم کی قبر پر گیا مجھ پر اتنا بڑا سانحہ گزر گیا تھا۔

لیکن میری آنکھوں سے اب تک آنسو بھی نہ نکلا تھا۔ ضبط کی کچھ ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ اندر ہی اندر پختہ ہوتا رہتا تھا۔ لیکن مریم سے وداع ہوتے وقت ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنسو کی ایسی جھڑی لگی کہ تھمتے نہ تھمتی تھی۔ میری آہ و بکا سے سارا قبرستان گونج اٹھا۔ اپنے ساتھ میں اتنے پھول لایا تھا کہ مریم کی ساری قبر ان سے ڈھنپ گئی۔ آخری نذرانہ محبت اور فاتحہ کا ثواب پیش کر کے میں وہاں سے سیدھا شیر پنجاب ہوٹل گیا اور ہر نام سنگھ سے گلے ملتے ہوئے اسے کان میں بتایا کہ آج یہاں سے جا رہا ہوں اور میری روانگی کو وہ راز ہی میں رکھے۔ محسن بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے ساتھ لیا اور چنگ وار ریسٹورنٹ گیا۔ میں نے مہاجروں کیلئے روپوں کے بقیہ لفافے مریم کے والد کو دیئے کہ جانے والے مہاجروں میں تقسیم کر دے۔ محسن اور بزرگ شاعر کیلئے رکھے ہوئے 20 ہزار روپے لے کر محسن کے حوالے کئے اور پندرہ ہزار ڈالر اور بقیہ تمام کرنسی مریم کے والد کو دی۔ اپنی وین بھی بطور تحفہ سے دینے کی تحریر لکھ دی۔ یہ روپیہ اور وین مریم کا نعم البدل تو نہ تھا لیکن بڑھاپے میں اس کے کچھ کام ضرور آسکتا تھا۔ وہیں پر میں نے تین لفافوں میں پانچ پانچ ہزار ڈالر رکھے۔ میرے پاس اب صرف سو ڈالر رہ گئے تھے۔ وہاں سے رخصت ہو کر سفارت خانے پہنچے۔ میں نے وین باہر ہی کھڑی کی اور اپنے دو سوٹ کیس اور ایک ایئر بیگ جس میں اسلحہ، زہریلی سویوں والے ڈبے اور کیمرے وغیرہ رکھے تھے۔ (جاری ہے)

غازی

میں وہ بیگ لے کر سفیر صاحب کے پاس چلا گیا، وہ میرے منتظر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کل شام انہیں نیپالی وزارت خارجہ میں بلایا گیا تھا جہاں نیپالی وزیر خارجہ نے انہیں بھارتی وزیر خارجہ اور بھارتی سفارت خانے کے دو خط دکھائے۔ جن میں یہ تحریر تھا کہ آصف علی نام سے کھٹمنڈو میں رہنے والا سیویلیٹین اور مہاجر نہیں بلکہ پاکستان کا جاسوس ہے جو بھارت میں فوجی تنصیبات کو تباہ کرنے اور کئی فوجیوں اور شہریوں کے قتل کا ذمہ دار ہے۔ اسے فوری طور پر بھارت کے حوالے کیا جائے دھمکی آمیز لہجے میں ایسا نہ کرنے سے نیپال کو تعلقات کی خرابی اور برے نتائج بھگتنے کا مزہ دہ سنایا گیا تھا۔ نیپال اپنی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے ہر بات میں بھارت کا محتاج تھا۔ اس بارے میں نیپالی وزارت خارجہ کا خط بھی سفیر صاحب نے مجھے دکھایا۔ بقول اس کے نیپالی وزیر خارجہ کو اس نے بھارت کے مجھ پر لگائے ہوئے تمام الزامات کی تردید کی اور کہا کہ آصف علی ایک پرامن شہری ہے۔ دونوں ممالک کے خوشگوار تعلقات کی وجہ سے سفیر نے مجھے دو روز کے اندر نیپالی وزیر خارجہ کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا تا کہ وہ خود میرے متعلق چھان بین کر سکے۔ واپسی پر ہمارے سفیر نے ایک بڑے اور پاکستان کے ہمدرد ملک کے سفیر سے رابطہ کیا اور آج مجھے بحفاظت کھٹمنڈو سے نکالنے کے انتظامات کئے۔ میرا ونوے پاسپورٹ اور رائل نیپال ایئر لائنز کا ٹکٹ سفیر کی ٹیبل پر پڑے تھے۔ وہ میرے حوالے کیلئے پاسپورٹ میں میرا نام ریاست علی لکھا ہوا تھا، ملٹری اٹاچی بھی اس دوران وہاں آگئے تھے۔ ٹھیک تین بجے دوست ملک کی سیاہ شیشوں والی گاڑی ہمارے سفارت خانے آگئی۔ مجھے بتایا گیا کہ دوست ملک کے سفارت خانے کے ذریعے مجھے ایگریگیشن اور سامان چیک کئے بغیر جہاز پر سوار کر دیا جائے گا۔ میں نے یہ بات سن کر اپنا ایئر بیگ بجائے اپنی ڈاک کے تھیلے میں پاکستان بھیجنے کے ہمراہ لے جانا مناسب سمجھا۔ میں سفارت خانے سے باہر گیا۔ محسن اور تینوں چینی دوستوں سے گلے ملا اور چینی دوستوں کو پانچ پانچ ہزار ڈالر کے لفافے زبردستی دے کر سیاہ شیشوں والی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اسی سفارت خانے کا اور میرے ساتھ ہمارے سفارت خانے کا ایک ایک کارکن بیٹھا ہوا تھا۔ سفارت خانے کی گاڑی جونہی باہر نکلی، بھارتی سفارت خانے کی ایک گاڑی ذرا فاصلے پر کھڑی دکھائی دی۔ اس گاڑی میں بیٹھے میجر باسو کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ میجر باسو کی گاڑی نے کچھ دیر ہمارا تعاقب کیا اور جب ہم ایئر پورٹ کی سڑک پر پہنچے تو وہ تیزی سے مڑ کر غائب ہوگئی۔ ہم ایئر پورٹ پر پہنچے تو ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے آدمی نے میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ لیا۔ انہی کی ایک گاڑی وہاں پہلے سے موجود تھی۔ اس میں دو بیٹھے آدمیوں نے میرے دونوں سوٹ کیس اٹھائے۔ پندرہ منٹ کے اندر وہ شخص میرا بورڈنگ کارڈ اور ان دونوں سوٹ کیسوں کے بیگیج کارڈ لے کر آگیا۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ میجر باسو اپنی گاڑی پر ایئر پورٹ آدھکا ہے۔ وہ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یقیناً اس لئے واپس پلٹا تھا تا کہ اپنے سفیر کو میری روانگی کا بتائے اور مجھے روکنے کا انتظام کرے۔ چار بجنے سے ٹھیک 10 منٹ پہلے ہماری گاڑی ایئر پورٹ پر کھڑے جہاز کے قریب پہنچی۔ مسافروں کیلئے لگائی گئی سیڑھی ہٹائی جا چکی تھی۔ میں کاک پٹ کی سیڑھی کے ذریعے جہاز میں داخل ہوا۔ گاڑی کے پاس ہی کھڑے رائل نیپال لائنز کے ایک ملازم نے میرے بورڈنگ کارڈ کا آدھا حصہ الگ کیا۔ جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میں نے گاڑی کے باہر کھڑے تینوں دوستوں کو ہاتھ ہلا کر بانی بانی کیا۔ میجر باسو بھی کچھ فاصلے پر آگ برساتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے زور زور سے ہاتھ ہلا کر گڈ بانی کہا اور اس کی طرف ایک ہوائی بوسہ بھی اچھال دیا۔

رائل نیپال ایئر لائنز کے جہاز نے کھٹمنڈو ایئر پورٹ پر ٹھیک چار بجے رن وے کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ میں کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس وقت میں حقیقتاً ڈرا ہوا تھا۔ خوف کی لہریں میرے جسم کے آر پار ہو رہی تھیں۔ میری نظریں ایئر پورٹ بلڈنگ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لگی ہوئی تھی۔ ہر لمحے یہی خیال گزرتا کہ اب پولیس کی جیپ نمودار ہوگی۔ پائلٹ جہاز کو ٹیکسی وے پر ہی روک لے گا اور پولیس مجھے گرفتار کر کے لے جائے گی۔ اگرچہ ایسے مرحلے پہلے بھی کئی بار مجھ پر گزر چکے تھے۔ لیکن ساڑھے تین سال مسلسل زندگی اور موت کا کھیل کھیلتے میں اب ذہنی طور پر ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور اب تو بات یہاں آن پہنچی تھی کہ ایک طرف آزادی، اپنا وطن، اپنا گھر اور گھر والے اور دوسری طرف تھرڈ ڈگری ٹارچر کے ساتھ اذیت ناک موت اور ان دونوں کے بیچ محض چند منٹوں کا فرق تھا۔ محض چند منٹوں کا قسمت نے زندگی کی بازی کھیلتے ہوئے مجھے ہمیشہ تین اکے دیئے لیکن ہر بار تو تین اکے نہیں ملتے اور اب تو یہ آخری داؤ تھا۔ اگر بازی الٹ پڑی تو خوف کی لہر نے مجھے ایک جھکا دیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سب کچھ اس قادر مطلق پر چھوڑ دیا جس کی طاقت اور قدرت کی کوئی حد نہیں۔ انسان اس کے سوا کبھی کیا سکتا ہے۔ انسانی جدوجہد کی ایک حد ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ مجبور، لاچار اور طلب گار ہوتا ہے۔ رب ذوالجلال و کرام کی رضا کی مجھ پر ایک غنودگی چھا گئی تھی۔ اچانک ایئر ہوسٹس کی مدھر آواز مجھے باہر لے آئی۔ سیفٹی بیلٹس کھولنے اور سگریٹ پینے کی اجازت مل گئی تھی۔ میں نے سگریٹ نکال کر سگایا اور ایک لمبا کش لیا۔ جہاز ہالیوڈ کی برف پوش چوٹیوں کو نیچے چھوڑتا ہوا بلند ہو رہا تھا۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی دائیں طرف صاف دکھائی دے رہی تھی۔ جہاز کے اکثر مسافر یہ چوٹی دیکھنے کیلئے جہاز کی اس جانب کھڑکیوں کی طرف آچکے تھے لیکن میرا ذہن سگریٹ کے مرغولوں کے ساتھ ماضی کی طرف جا رہا تھا۔ ساڑھے تین سال (1185 دن) اور ان 1185 دنوں میں جیتے ہوئے ان گنت واقعات ایک تیز رفتار فلم کی طرح میرے ذہن کے پردے سے گزر گئے۔ جلد ہی پہاڑ ختم ہو گئے۔ ایئر ہوسٹس نے بتایا کہ اب ہم بنگلہ دیش پر سے گزر رہے ہیں۔

(جاری ہے)

دریائے کرنا فلی کا ڈیلٹا ہمارے نیچے ہے۔ ڈیلٹا درجنوں پاٹوں میں تقسیم میلوں تک پھیلا ہوا تھا اور شام کے ڈھلتے ہوئے سورج کی ترچھی شعاعوں نے دریائے کرنا فلی کی درجنوں شاخوں میں ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ شاید ایسے ہی کسی منظر کی وجہ سے شیخ مجیب الرحمن کو مشرقی پاکستان کو علیحدہ کر کے بنگلہ دیش بنانے کیلئے ہماردیش، تہاردیش، سناردیش کہنا پڑا۔ لیکن یہ تو محض عکس تھا فریب نظر تھا جسے سچ سمجھ کر دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو دو لخت کر دیا گیا۔ اس وقت بنگلہ دیش بننے کی سال بیت چکے تھے۔ لیکن مشرقی پاکستان کیلئے لفظ بنگلہ دیش میرے دماغ میں کہیں فٹ نہیں ہوتا تھا اور آج بھی یہی حال ہے کہ چاہے کتنوں کو برا لگے میں اس خطہ زمین کو سابق مشرقی پاکستان ہی کہتا ہوں۔ جیسے دوری اور جدائی سے خون کے رشتے نہیں ٹوٹتے۔ ویسے ہی اس خطہ زمین کو سابق مشرقی پاکستان کہنے سے اپنائیت کا ایک ان دیکھا رشتہ محسوس ہوتا ہے اپنا تھا پھر سابق ہو گیا یہ رشتہ قائم رہے تو سابق پھر اپنا ہو سکتا ہے انشاء اللہ۔

ہمارے جہاز کی منزل بنکا ک تھی اور مجھے بنکا ک کے پاکستانی سفارت خانے سے کراچی کیلئے ہوائی ٹکٹ لینا تھا۔

بیٹے دنوں کے درتپے سے میں بھارت اور کھنڈو میں اپنے قیام کے ایک ایک دن کا منظر دیکھ رہا تھا۔ ان میں کامیابیاں بھی تھیں اور ناکامیاں بھی، دشمن کو نقصان پہنچانے کی تسکین بھی تھی اور اسے مکمل نیست و نابود نہ کر سکنے کی تشنہ کامی بھی۔ بھارتوں پر ہماری 5 MEN ARMY کی ہیبت کا احساس برتری بھی تھا اور DMI میں حراست کے دوران ان کی مسلم دشمنی اور مکاری کے نقاب کے پیچھے اصلی گھناؤنا چہرہ دیکھنے کا موقع ملتا بھی۔ دشمنوں کی سازشوں اور اپنوں کی غداری کے واقعات بھی۔ مہاجروں کی بے بسی اور کسمپرسی بھی اور صاحب اختیار کی بے حسی بھی، اسمگلروں کے دلوں میں مسلمانوں کی ہمدردی میں موج زن سمندر بھی اور ظاہری طور پر مسلمان لوگوں کی سنگ دلی بھی۔ خود اپنی ذات کو بے خونی ہمت اور جرات کی چٹان کی صورت میں دیکھنا بھی اور اپنے دل کے ہزاروں لاکھوں ٹکڑے دیکھ کر اپنی بے مائیگی اور لاوارث ہونے کا احساس بھی۔ یہ ساڑھے تین سال مجھ پر صدیوں سے زیادہ بھاری تھے ان میں مجھے جو تجربات ہوئے اور میں نے جو کچھ دیکھا اگر انہیں تفصیلاً تحریر کرتا تو کئی ضخیم کتابیں تیار ہو جاتیں۔

تقریباً سات گھنٹے کی پرواز کے بعد ہمارا جہاز بنکا ک ایئر پورٹ پر اترا۔ رات میں نے ٹیکا ڈور ہوٹل میں بسر کی۔ اگلے روز پاکستانی سفارت خانے گیا۔ انہیں میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ دو روز بعد PIA کی کراچی فلائٹ پر کنفرنڈ سیٹ کے ساتھ مجھے ٹکٹ دیا گیا۔ کراچی پہنچا تو جہاز کی سیڑھیوں کے ساتھ ہی میرے محلے کا ایک افسر اور چند جوان کھڑے تھے۔ ان کی معین نما حراست میں اگلے روز ہم لاہور پہنچے جہاں مجھے سی ایم ایچ (CMH) میں داخل کر دیا گیا جہاں علاج کے ساتھ ساتھ نہایت شریفانہ اور دوستانہ ماحول میں دہلی، بمبئی اور کھنڈو سے میری بھیجی گئی رپورٹس کی روشنی میں انیورگیشن کی گئی۔ انیسویں روز مجھے ALL CLEAR (سب ٹھیک) کا مژدہ سنا کر گلے لگایا گیا۔ اسی روز ہم بصیر پور کیلئے روانہ ہوئے جہاں سیف ہاؤس کے ایک سیل میں وہ خدا کو ریز قید تھا جس نے مجھے DMI کے ہاتھوں پکڑوایا تھا۔ مجھے زندہ سلامت دیکھ کر حیرانی اور خوف سے وہ کانپنے لگا۔ سیل سے خاصی دور زہر کے قریب اسے ہماری جانب پشت کر کے کھڑا کیا گیا اور مجھے ریو اور دے کر کہا گیا کہ ساری گولیاں اس پر ختم کر دو۔ غصے اور انتقام کی خواہش کے باوجود میں گولی نہ چلا سکا اور میرا ریو اور والا ہاتھ نیچے ہو گیا۔ میں اپنے ساتھی افسر سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس کے اشارے پر ساتھ آنے والے مسلح جوانوں نے اس پر گولیوں کی ایک باڑھ ماری۔ وہ خدا رو ہیں ڈھیر ہو گیا اور اس کی لاش نہر میں بہا دی گئی۔

اگلے روز ہم اسلام آباد پہنچے جہاں مجھے "A" CLASS سرٹیفکیٹ اور انعام سے نوازا گیا اور تین ماہ کی چھٹی دی گئی۔ میں جتنے ہتھیار، گیس اور زہریلی سوئیاں ہمراہ لایا تھا وہ مجھ سے "گورنمنٹ پراپرٹی" کہہ کر لے لی گئی۔ اسلام آباد سے ہی میں نے اپنے گھر اپنی آمد کی تار دے دی تھی۔ گھر پہنچا تو والدہ نے آدھ گھنٹے تک گلے لگائے رکھا اور میرا سر، ماتھا اور چہرہ ایسے چومتی رہیں جیسے ماں اپنے شیر خوار بچے کا چومتی ہے۔ میرا بیٹا شجاع جس نے میری روانگی کے وقت پہلی بار مجھے ابو ابو کہہ کر پکارا تھا اب اسکول جانے لگ گیا تھا۔ میری بیوی نے میرے متعلق سب کچھ جاننے کے باوجود مجھ سے اتنا عرصہ دور رہنے کے شکوے اور پھر خانگی، جھگڑوں اور اپنی بے گناہی اور "معصومیت" کی داستانیں شروع کر دیں۔ حالانکہ میری والدہ نے اس بارے میں ایک لفظ تک مجھے نہیں کہا تھا۔ دس بارہ روز میں ہی میں اس ماحول سے گھبرا کر راولپنڈی چلا آیا اور اپنے کالج کے دور کے دوستوں میں اپنا غم غلط کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ تین ماہ کی رخصت کے بعد میں نے دفتر میں حاضری دی تو مجھے راولپنڈی اور لاہور میں ایسے معمولی مشن سونپے گئے جیسے کسی ایم اے کے اسٹوڈنٹ کو پرائمری کلاس میں بٹھا دیا گیا ہو۔ میں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور تین ماہ کی جدوجہد کے بعد مجھے میڈیکل گراؤنڈ زپر RELEASE دے دی گئی۔ ایک سال تک میرے ملک سے باہر جانے پر پابندی رہی۔ اس عرصے میں، میں نے پشاور میں ایک دوست کے چین آف ہوٹلز اور ریستورانٹس کے جنرل منیجر کے طور پر کام کیا۔ باہر جانے پر پابندی ختم ہوئی تو میں نے پاسپورٹ بنوایا اور برزنس وغیرہ پر سعودی عرب چلا گیا جہاں 7 سال سے زیادہ بطور ایئر پورٹ ایڈمنسٹریٹر میں نے مختلف ہوائی اڈوں مثلاً قصیم، بیج، الوجھ اور خمیس مشیط پر ملازمت کی۔ وہاں سے جی اکتیا تو سنگاپور چلا گیا جہاں تقریباً 8 برس ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بطور OVER SEAS SALES DIRECTOR کام کیا اور اس دوران مجھے آسٹریلیا سے لے کر آدھا یورپ جنوب مشرقی ایشیا اور مڈل ایسٹ کے سارے ممالک جانے کا موقع ملا۔ خانگی کینسر جب ناقابل علاج ہو گیا تو 89ء میں میری اپنی بیوی سے قانونی اور شرعی علیحدگی ہو گئی۔ بھارت سے واپسی کے بعد میرا دوسرا بیٹا وقار بھی پیدا ہو گیا تھا۔ 94ء میں میری والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ بیٹوں کی ذمہ داری چونکہ مجھ پر تھی لہذا میں سنگاپور سے بار بار پاکستان آنے لگ گیا اور پھر ایسی ہی چھٹی لی کہ آج تک واپس نہیں گیا۔ (ختم شد)